افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

طٰہٰ ۲۰ — القصص ۲۸

تدبرِ قرآن

— جلد پنجم —

كِتٰبٌ أَنزَلْنٰهُ إِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوٓا۟ ءَايٰتِهِۦ وَلِيَتَذَكَّرَ أُو۟لُوا۟ الْأَلْبٰبِ

تدبرِ قرآن

جلد پنجم

تفاسیر

سورۂ طٰہٰ (۲۰) ـــــ تا ـــــ سورۂ قصص (۲۸)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ـــــ پاکستان

اهتمام — حسن خاور

مطبع — فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

تدبّرِ قرآن

۲۰

طٰهٰ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، مخالفین کے مقابل میں، صبر اور انتظار کی تلقین ہے کہ آپ ان کے پیچھے زیادہ پریشان نہ ہوں، اگر یہ آپ کی بات نہیں سنتے تو بہت جلد یہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔ اسی مضمون سے سورہ کا آغاز بھی ہوا ہے اور اسی پر اختتام بھی۔ اس صبر کے حصول اور اس کی تربیت کے لیے نماز اور دعا کے اہتمام کی ہدایت فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی عجلت اور بے صبری کے نقصانات واضح فرمائے گئے ہیں۔ سورہ میں خطاب تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مخالفین سے اگر کوئی بات کہی بھی گئی ہے تو ان کو خطاب کر کے نہیں بلکہ منہ پھیر کر غائبانہ انداز میں کہی گئی ہے۔

پچھلی سورہ میں متعدد انبیائے عظام کا ذکر آیا ہے۔ اس میں صرف حضرت موسیٰ کی سرگزشت تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ ولادت سے لے کر دعوت و ہجرت تک جتنے اہم موڑ بھی ان کی زندگی میں پیش آئے ہیں سب اس سورہ میں نمایاں کیے گئے ہیں تاکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، دعوت کے اس مرحلہ میں بھی اور آگے کے مراحل میں بھی، جس رہنمائی کی ضرورت ہے وہ ایک عملی مثال کی صورت میں آپ کے سامنے رکھ دی جائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

مطالب کے اعتبار سے یہ سورہ تین حصوں میں تقسیم ہے۔

(۱-۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت دل نوازانہ انداز میں یہ ہدایت کہ آپ دوسروں کے ایمان کی فکر میں اپنی زندگی کو ضرورت سے زیادہ نہ کھپائیں۔ آپ کا کام صرف ان لوگوں کو یاد دہانی کر دینا ہے جن کے اندر کچھ خشیت ہے۔ جن کے دل خشیت سے خالی ہیں ان کے اندر ایمان اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں ہے بلکہ خالق ارض و سما اور مالک عرش و کرسی کا فرمان ہے اس کو اس کے شایانِ شان انداز میں پیش کیجیے۔ ناقدروں اور مغروروں کی زیادہ نازبرداری کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے رب پر بھروسہ رکھیے۔ وہ آپ کے تمام سر و علانیہ سے اچھی طرح باخبر ہے۔

۹۰ - ۹۸) آگے حضرت موسیٰ کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس کے نمایاں پہلو بالاجمال یہ ہیں۔

—— حضرت موسیٰ کا مدین سے واپسی پر وادیٔ مقدس طویٰ میں پہنچنا اور نبوت و رسالت سے سرفراز ہونا۔

—— نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت موسیٰ کو اولین ہدایت۔

—— عصا اور ید بیضا کے معجزات کا عطا کیا جانا۔

—— فرعون کے پاس انذار و دعوت کے لیے جانے کا حکم۔ شرح صدر اور حضرت ہارونؑ کے مددگار بنائے جانے کے لیے حضرت موسیٰ کی دعا اور اس دعا کی فوری قبولیت۔

—— حضرت موسیٰ کی تقویت قلب کے لیے اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس فضل خاص کی یاددہانی جو ان پر بچپن میں ہوا کہ وہ دریا میں ڈالے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ ان کو دریا سے بچا لیا بلکہ ان کے اور اپنے دونوں کے دشمن سے ان کی پرورش کرائی اور دوبارہ ان کو ان کی اس ماں کی آغوش میں پہنچا دیا جس نے فرعون کے ڈر سے، کلیجہ پر پتھر رکھ کر، ان کو دریا کی موجوں کے حوالے کیا تھا۔

—— حضرت موسیٰ کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل ہو جانے کے واقعہ کی یاددہانی۔ حضرت موسیٰ کا مدین جانا۔ وہاں مختلف آزمائشوں اور مراحل سے گزرنے کے بعد پھر خدائی پروگرام کے مطابق بالکل معین وقت پر وادیٔ مقدس طویٰ میں پہنچنا اور منصب نبوت پر سرفراز ہونا۔

—— اس فضل خاص کی یاددہانی کے بعد حضرت موسیٰ اور ہارونؑ دونوں کی حوصلہ افزائی اور یہ ہدایت کہ وہ بے خوف و خطر فرعون کے پاس انذار و دعوت کے لیے جائیں۔ خدا ان کی حفاظت فرمائے گا۔

—— فرعون کو حضرت موسیٰ کی دعوت اور فرعون کا معارضہ۔

—— فرعون کے جمع کردہ ساحروں اور حضرت موسیٰ میں مقابلہ۔ ساحروں کی شکست اور ان کا حضرت موسیٰ پر ایمان لانا۔

—— فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰؑ اور ایمان لانے والے ساحروں پر سازش اور بغاوت کا الزام اور ان کو سولی پر چڑھانے کی دھمکی۔

—— بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر حضرت موسیٰ کو ہجرت کا حکم۔ فرعون کی طرف سے ان کا تعاقب۔ بالآخر حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا بخیریت دریا کے پار ہو جانا اور فرعون اور اس کی فوجوں کی غرقابی۔

—— دریا پار کرنے کے بعد بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات فرمائے ان کا حوالہ اور بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی چند روزہ غیبت میں، جب کہ وہ کوہ طور پر تورات لینے گئے، سامری کے فتنہ میں مبتلا ہو کر جو بت پرستی کی اس کی تفصیل اور اس کے اسباب و عواقب پر تبصرہ۔

(۹۹ - ۱۳۵) حضرت موسیٰ کی سرگزشت سنانے کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب اور التفات ہے۔ اور سورہ کی تمہید میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس خاتمہ میں اس کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ ماضی

کی یہ سرگزشت جو آپ کو سنائی گئی ہے صرف قصۂ ماضی نہیں ہے بلکہ آپ کی اپنی سرگزشت بھی ہے۔ آپ کو جو کتاب عطا ہوئی ہے اس میں ہر پہلو سے لوگوں کو تنبیہ کر دی گئی ہے۔ اگر لوگ نہیں مانیں گے تو اس کا انجام دنیا اور آخرت دونوں میں خود بھگتیں گے۔ تاریخ میں ان کے لیے کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ اس وجہ سے آپ ان کے معاملے میں جلدی نہ کریں، صبر کے ساتھ خدا کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ جلدی شیطان کو دراندازی کے لیے راہ دے دیتی ہے۔ آدمؑ نے جلدی ہی کی وجہ سے شیطان سے دھوکا کھایا تو آپ صبر کے ساتھ خدا کے وعدۂ نصرت کے ظہور کا انتظار کریں اور اس صبر کے حصول کے لیے نماز کا اہتمام کریں۔ امراء و اغنیاء کے ایمان کے لیے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ ان کے ایمان سے دعوت کو قوت و شوکت حاصل ہوگی۔ آپ کی دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور اللہ نے آپ کی کفالت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔ جو لوگ آپ کو زچ کرنے کے لیے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ میرا کام آگاہ کرنا تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب اگر تم عذاب ہی کے منتظر ہو تو انتظار کرو۔ میں بھی اسی کا منتظر ہوں۔

سُوْرَةُ طٰهٰ (۲۰)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۱۳۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸
طٰهٰ ۝۱ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ
يَّخْشٰى ۝۳ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝۴
اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ
فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝۷ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ
الْحُسْنٰى ۝۸

ترجمۂ آیات ۱–۸
یہ سورۂ طٰہٰ ہے۔ ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ تم مصیبت میں پھنس جاؤ۔ یہ تو
۱ بس ان لوگوں کے لیے یاد دہانی ہے جو خدا سے ڈریں۔ یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اس ذات کی طرف
سے اتارا گیا ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ جو رحمان عرشِ حکومت پر متمکن ہے۔
اسی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، جو کچھ زمین میں ہے، جو کچھ ان کے درمیان ہے

اور جو کچھ زمین کے نیچے ہے۔ ۱-۶

خواہ تم علانیہ بات کہو یا چپکے سے، وہ علانیہ اور پوشیدہ سب کو جانتا ہے۔ اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تمام اچھی صفتیں اسی کے لیے ہیں۔ ۷-۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰہٰ (۱)

یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔ ان حروف پر مفصل بحث سورہ بقرہ کے شروع میں دیکھیے۔

مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی (۲)

تبلیغ میں حضورؐ کی محنت شاقہ اور آپ کو دل نواز تسلی

یہ نہایت دل نواز اور پُرمحبت انداز میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھایا ہے کہ قرآن کی تبلیغ و دعوت سے متعلق آپ نے اپنے سر پر جو ذمہ داری اٹھائی ہے اور جو محنت شاقہ اس کے لیے آپ جھیل رہے ہیں، اس کا مطالبہ ہرگز آپ سے نہیں ہے۔ آپ کی ذمہ داری صرف لوگوں تک اس کتاب کو پہنچا دینے کی ہے۔ جن کے اندر حق شناسی کی صلاحیت اور خشیت الٰہی کی کچھ رمق ہوگی وہ اس کو قبول کریں گے، جو ان صلاحیتوں سے عاری ہیں ان کے دلوں میں اس کو اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ ان کے پیچھے آپ اپنی زندگی کو اجیرن بنا لیں۔

یہ بات ہم اس کتاب میں متعدد جگہ واضح کر چکے ہیں کہ رات دن دعوت کے کام میں لگے رہنے کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے کہ لوگ اتنی واضح بات کو جھٹلا رہے ہیں اور کسی طرح ان کے دل نرم ہوتے نظر نہیں آتے تو آپ کو یہ پریشانی ہوتی کہ مبادا اس میں آپ ہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ اس احساس سے دعوت کے کام میں آپ کی سرگرمیاں اور بڑھ جاتیں اور سارے جتن کر ڈالنے کے باوجود آپ کو کسی طرح تشفی نہ ہوتی۔ آپ کی اسی حالت پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قرآن آپؐ پر اس لیے نہیں اتارا گیا کہ آپ کی زندگی اجیرن ہو کے رہ جائے۔ آپ کی جو ذمہ داری ہے وہ ادا کر دیجیے۔ دوسروں کے ایمان و اسلام کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔

اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی (۳)

قرآن ایک تذکرہ ہے

اس ٹکڑے سے قرآن کی حیثیت بھی واضح ہو گئی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد بھی معین ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوں گے اور کون اس سے محروم رہیں گے۔

فرمایا کہ یہ تو بس ایک 'تذکرہ' ہے۔ 'تذکرہ' کے معنی یاددہانی کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یاددہانی جس چیز کی کی جاتی ہے وہ خارج سے لائی ہوئی چیز کی نہیں کی جاتی بلکہ اس چیز کی کی جاتی ہے جو مخاطب کے خود اپنے پاس ہو لیکن وہ اس کو بھولا ہوا ہو۔ قرآن پر غور کیجیے تو اس کی اصلی نوعیت یہی ہے۔ وہ کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں ہے۔ وہ کسی خارج سے لائی ہوئی چیز کو ہمارے اوپر نہیں لادتا بلکہ انہی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو خود ہماری فطرت کے اندر موجود ہیں لیکن ہم ان سے غافل ہیں۔ قرآن ان حقائق کی یاددہانی کے لیے جو دلائل استعمال کرتا ہے وہ بھی آفاق وانفس کے وہی دلائل ہیں جو ہماری عقل کے خزانے میں موجود ہیں۔ لیکن ہم یا تو ان کو استعمال نہیں کرتے یا ان کے بدیہی نتائج کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ عبرت و موعظت کے لیے قرآن نے جو تاریخ پیش کی ہے وہ بھی ان قوموں کی پیش کی ہے جو مخاطب گروہ کی جانی پہچانی ہوئی تھیں۔ جن انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا حوالہ دیا ہے یہ بھی وہ انبیاء ہیں جن کی ذریت اور جن کے پیرو ہونے کے لوگ مدعی تھے۔

قرآن سے اثر پذیر ہونے کے لیے شرط

اس یاددہانی سے اثر پذیر ہونے والوں کی صفت "لِّمَنۡ یَّخۡشٰی" بیان فرمائی۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'یَخۡشٰی' کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ قرآن کے نظائر کی روشنی میں اس محذوف کو متعین کیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ 'لِمَنۡ یَّخۡشٰی رَبَّهٗ بِالۡغَیۡبِ' یعنی یاددہانی ان لوگوں کے لیے ہے جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ یہ دوسرے لفظوں میں وہی بات ارشاد ہوئی ہے جو بقرہ کی دوسری ہی آیت میں 'ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ وہاں ہم نے تفصیل سے واضح کیا ہے کہ یہ تقویٰ اور یہ خوف ان تمام لوگوں کے اندر موجود ہوتا ہے جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہوتی ہے۔ اس طرح کے لوگوں پر اگر غفلت ہوتی ہے تو وہ قرآن کی یاددہانی سے دیر سویر جاگ پڑتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی بداعمالیوں سے اپنی فطرت مسخ کر لیتے ہیں ان کو کتنا ہی جھنجھوڑیے وہ کروٹ نہیں لیتے۔ ان کے اوپر گدھوں کی طرح ڈنڈے کی منطق کے سوا اور کوئی منطق کارگر نہیں ہوتی۔ وہ سب کچھ سر کی آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں لیکن خدا کے ہاں ماننا صرف وہ معتبر ہے جو عقل و دل کی آنکھوں سے دیکھ کر مانا جائے نہ کہ سر کی آنکھوں سے۔

نبی مذکر ہوتا ہے نہ کہ مصیطر

قرآن کے تذکرہ ہونے سے یہ بات بھی نکلی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک 'مذکِّر' کی ہے، نہ کہ ایک 'مُصیطِر' کی۔ آپ کا فریضہ صرف یہ تھا کہ آپ لوگوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیں۔ لوگ اس سبق کو یاد کرتے ہیں یا نہیں، یہ لوگوں کی ذمہ داری تھی نہ کہ آپ کی۔ قرآن نے یہاں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اگر آپ کی قوم کے لوگ آپ کی تذکیر سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں تو آپ پریشان نہ ہوں، اس کے لیے جوابدہ عنداللہ وہ ہیں نہ کہ آپ۔

تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَالسَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی (۴)

'تنزیل' کا مفہوم

'تنزیلاً' کے معنی دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ کسی چیز کو نہایت اہتمام اور ترتیب و تدریج کے ساتھ اتارنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن چونکہ لوگوں کی یاددہانی کے لیے اُترا ہے اس وجہ سے اللہ نے صرف اتنے پر اکتفا نہیں فرمایا کہ کسی نہ کسی طرح بات ایک مرتبہ لوگوں تک پہنچ جائے بلکہ نہایت اہتمام اور تدریج اور وقفہ وقفہ کے ساتھ اس کو اتارا تاکہ لوگوں کے لیے یہ عذر باقی نہ رہے کہ بات کے سننے یا سمجھنے میں کوئی کسر رہ گئی۔

قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ خالق کا فرمان ہے

'مِمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی' یہ قرآن کی عظمت واضح فرمائی کہ یہ زمین اور بلند آسمانوں کے خالق و مالک کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ نہ یہ کوئی ہوائی بات ہے کہ یوں ہی ہوا میں اڑ جائے نہ یہ کسی سائل کی درخواست ہے کہ لوگوں نے قبول کر لی تو سائل پر ان کا کرم ہوگا، نہ قبول کی تو سائل محروم ہو کر رہ جائے گا۔ بلکہ یہ خالق ارض و سما کا فرمان واجب الاذعان ہے اگر لوگوں نے اس کو رد کیا تو اچھی طرح سوچ لیں کہ اس کے نتائج کیا کچھ ہو سکتے ہیں۔

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ اشارہ بھی ہے کہ اس کو اسی طرح لوگوں کے سامنے پیش کیجیے جس طرح آسمان و زمین کے خالق و مالک کا کلام پیش کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے نہ زیادہ استمالت کی ضرورت ہے، نہ کسی الحاح و اصرار کی۔ اس کے قبول کرنے میں لوگوں کا اپنا نفع ہے نہ کہ خدا کا۔ یہ کوئی ملتجیانہ درخواست نہیں ہے بلکہ خلق کے لیے صحیفۂ ہدایت ہے اس کو رد کرنے والے خود اپنی شامت بلائیں گے۔ آپ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔

یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۂ عبس میں یہی حقیقت یوں واضح کی گئی ہے۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ　　ہرگز نہیں! یہ تو ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے
ذَكَرَهٗ ۝ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ　　اس سے فائدہ اٹھائے۔ یہ معزز، بلند اور پاکیزہ
مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ　　صحیفوں میں ہے۔ باعزت اور باوفا کاتبوں کے
بَرَرَةٍ۔ (۱۱-۱۶)　　ہاتھ میں۔

(۵-۶) اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى

قرآن کی عظمت کا بیان اور خدا کی جن صفات کا مظہر ہے ان کا حوالہ

یہ قرآن کی عظمت کا بیان بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا یہ مظہر ہے ان کی طرف اشارہ بھی۔ فرمایا کہ وہ خالق ارض و سما رحمان ہے۔ اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ وہ خلق کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہ دے بلکہ جس طرح اس نے اس کی مادی زندگی کے اسباب و وسائل مہیا فرمائے اسی طرح اس کی ہدایت کا سامان بھی کرے، چنانچہ اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے اس کو عقل و نطق سے نوازا اور اس پر مزید فضل یہ فرمایا کہ اس کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب اتاری۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ رحمٰن میں 'اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ قرآن کو رد کر رہے ہیں وہ نہ تو خدا کا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ اس کے رسول کا بلکہ خود اپنے آپ کو خدا کی سب سے بڑی رحمت سے محروم کر رہے ہیں۔

'عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى' یہ خدائے رحمان کی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ دنیا کو پیدا کر کے الگ تھلگ کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ بالفعل اپنی کائنات کے عرش حکومت پر متمکن ہے۔ اس کائنات کا حقیقی فرمانروا وہی ہے اس وجہ سے لوگوں کو قرآن کے ذریعہ سے اس نے اپنے احکام و قوانین سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس آگاہی کے بعد جو لوگ اپنی من مانی کریں گے وہ حساب کے دن اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔

'لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى' یہ شرک کے ہر جرثومہ کی جڑ کاٹ دی۔ فرمایا کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان اور جو کچھ زیر زمین ہے سب کا خالق و مالک وہی ہے۔ سب کو خلق بھی اسی نے کیا ہے اور سب پر اختیار بھی اسی کا ہے۔ اس کائنات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس کی خدائی سے باہر ہو جس کو کسی خاص دائرے میں کوئی آزادی ملی بھی ہے وہ بھی اس کے امر و حکم کے تحت ہے۔ اس وجہ سے کوئی یہ گمان نہ کرے کہ وہ خدا سے کہیں بھاگ سکتا ہے یا کوئی دوسرا اس کو پناہ دے سکتا ہے۔

وَإِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفٰى (۷)

عربیت کا ایک اسلوب

فصیح عربی کے اسلوب کے مطابق اس میں متقابل کے الفاظ بربنائے قرینہ، حذف ہیں۔ اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آئے ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات گویا یوں ہوگی 'وَإِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ أَوْ تُخَافِتْ بِهٖ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَالسِّرَّ وَأَخْفٰى' یعنی خواہ تم بات کو علانیہ کہو یا چپکے سے کہو، خدا علانیہ، پوشیدہ اور پوشیدہ تر سب کو جانتا ہے۔

نبی صلعم کو ایک نئے پہلو سے تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دوسرے پہلو سے تسلی دی گئی ہے کہ آپ مطمئن رہیں کہ اپنی مشکلات میں جو کچھ بھی آپ اپنے پروردگار سے کہتے اور جو دعا و مناجات بھی کرتے ہیں خواہ سرًّا یا علانیۃً، اور جو پریشانی بھی آپ کو لاحق ہوتی ہے خواہ وہ زبان پر آئے یا دل کے مخفی گوشوں ہی میں رہے، آپ کا رب علیم و خبیر ہر چیز سے باخبر رہتا ہے۔ مقصود اس حقیقت کے اظہار سے ظاہر ہے کہ اس کا لازم ہے۔ یعنی جب آپ کا پروردگار ہر مخفی سے مخفی بھید سے بھی واقف ہے تو وہ آپ کی ہر مشکل کو آسان کرے گا اور ہر موڑ پر آپ کی رہنمائی فرمائے گا۔ اگر کسی امر میں کوئی تاخیر ہوتی ہے تو وہ کسی حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اسی میں آپ کے لیے خیر و برکت ہے۔ سورہ مریم کی آیت ۶۴ 'وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں مزید تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

اَللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۸)

تفویض کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل تفویض کی ہدایت ہے کہ آپ مخالفین کے رویہ سے پریشان اور ان کے پیچھے ہلکان ہونے کے بجائے اپنا معاملہ کلیۃً اپنے رب کے حوالے کیجیے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے ہوتے آپ کسی کے محتاج نہیں۔

تسلی و طمانیت کا خزانہ

'لَهُ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى' یہ ٹکڑا تسلی و طمانیت کا خزانہ ہے۔ اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

اسمائے حسنیٰ کی برکات
جو تسلی دی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کی عظمت، اس کی رحمت، اس کی حاکمیت، اس کی یکتائی اور اس کے علم کے مقتضیات کی روشنی میں دی گئی ہے لیکن خدا کی صفات اتنی ہی تو نہیں ہیں! وہ تو تمام اچھی اور اعلیٰ صفتوں سے متصف ہے تو ظاہر ہے کہ ان صفات کے مقتضیات بھی حضورؐ کے لیے حالات کے اعتبار سے ظاہر ہوں گے۔ گویا اس ٹکڑے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ تمام اچھی صفتیں خدا ہی کے لیے ہیں اور وہ سب آپ کے اوپر سایہ فگن ہیں، آپ ان میں سے جس کا سہارا بھی لیں گے اس کی برکتوں سے متمتع ہوں گے۔ ان کے سوا آپ کسی اور سہارے کے محتاج نہیں ہیں۔

اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ یہاں اسماء سے مراد صفاتِ الٰہی ہیں اس لیے کہ خدا کے تمام نام اس کی صفات ہی کی تعبیر ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹ تا ۹۸

اوپر کے مجموعۂ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تسکین و تسلی دی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی روشنی میں دی گئی ہے۔ اب آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت آ رہی ہے جس میں وہی حقیقتیں، جو اوپر علمی انداز میں بیان ہوئی ہیں، چلتی پھرتی عملی زندگی میں دکھا دی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور ان میں اللہ کی مدد نے جس طرح ان کو سہارا دیا، ان کی تفصیل اس سرگزشت میں آگئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے جو مراحل آنے والے تھے ابھی ان کا بہت بڑا حصہ پس پردہ تھا اس سرگزشت نے ان مراحل کو بھی آپؐ کے سامنے کر دیا اور ان کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت تھی ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ زندگی عملی مثالوں سے جس قدر متاثر ہوتی ہے دوسری کسی چیز سے اس قدر متاثر نہیں ہوتی۔ خاص طور پر ایک نبی کی سرگزشت دوسرے نبی کے لیے تو سمجھیے کہ بس اس کی اپنی ہی آپ بیتی ہوتی ہے۔

ـــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۹۸
وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۞ ۹ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا
اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ
هُدًى ۞ ۱۰ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۞ ۱۱ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ
اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۞ ۱۲ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا
يُوْحٰى ۞ ۱۳ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ

لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا
تَسْعٰى ﴿۱۵﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ
فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا
عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ قَالَ اَلْقِهَا
يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ
سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ
بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ وَ ع
يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ وَ
اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَ
اَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾
اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَ
لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿۳۸﴾
اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ
يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ
عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ وقف لازم
فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ
مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۣ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۚ ثُمَّ جِئْتَ

عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿٤٠﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِىْ ﴿٤١﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ
بِاٰيٰتِىْ وَلَا تَنِيَا فِىْ ذِكْرِىْ ﴿٤٢﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾
فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا
نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِىْ مَعَكُمَآ
اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا
بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ
عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِىَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ
وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿٤٩﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ
خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿٥٠﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿٥١﴾ قَالَ عِلْمُهَا
عِنْدَ رَبِّىْ فِىْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسَى ﴿٥٢﴾ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ
الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ
فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿٥٣﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ
اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى النُّهٰى ﴿٥٤﴾ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ ع ٢ ١١
وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿٥٥﴾ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ
وَاَبٰى ﴿٥٦﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٥٧﴾
فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ
نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ
يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ

لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ
وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾ فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾
قَالُوْۤا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ
بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ
ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ
تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ
وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ
نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ وَ
اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا
يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْۤا اٰمَنَّا
بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ
لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ
مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ
عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ
فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾
اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ
وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ
لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ ع ۳ ۲۲ ۱۲
اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ
لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ
مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾
يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ
الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ
عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ
هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا
قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى
اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا
حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ
بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ
اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا
هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ

قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ ع
مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ
وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ
اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا
تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ
اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ
قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ
يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ
سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ
لَا مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ
ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَآ
اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

ترجمۂ آیات ۹-۹۸

اور کیا موسیٰ کی سرگزشت تمھارے علم میں آئی ہے جب کہ اس نے دیکھا ایک شعلہ تو اس نے اپنے اہلِ خانہ سے کہا کہ تم لوگ ذرا ٹھہرو، مجھے آگ نظر آئی ہے تاکہ میں اس میں سے ایک انگارہ لاؤں یا ممکن ہے مجھے وہاں راستہ کا کچھ سراغ مل جائے۔ ۹

تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ اے موسیٰ یہ تو میں تمھارا رب ہوں تو تم اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ اور میں نے تم کو برگزیدہ کیا تو جو وحی کی جا رہی ہے اسے غور سے سنو! بیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کیجیو اور میری یاد

کے لیے نماز کا اہتمام رکھیو۔ بے شک قیامت شدنی ہے۔ میں اس کو چھپائے ہی رکھوں گا تاکہ ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔ تو نماز سے تمھیں وہ شخص غافل نہ کرنے پائے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے کہ تم ہلاک ہو کر رہ جاؤ۔ ۱۰-۱۶

اور یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے، اے موسیٰ! اس نے کہا، یہ میری لٹھیا ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ فرمایا، اس کو زمین پر ڈال دو، اے موسیٰ! اس نے اس کو ڈال دیا تو دفعتہً وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بن گئی۔ فرمایا اس کو اٹھا لو اور ڈرو نہیں، ہم اس کو پھر اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ اور اپنے ہاتھ کو اپنے بازو کی طرف سکیڑ لو، وہ وہاں سے ایک دوسری نشانی بن کر، چٹا سفید، بغیر کسی مرض کے، برآمد ہوگا تاکہ ہم اپنی بڑی نشانیوں میں سے بعض کا تمھیں مشاہدہ کرائیں۔ ۱۷-۲۳

تم فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! میرے سینے کو میرے لیے کھول دے، اور میری مہم کو آسان کر اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں اور میرے خاندان سے میرے بھائی ہارون کو، میرے لیے وزیر مقرر کر کے میری کمر کو مضبوط کر اور اس کو میری ذمہ داری میں شریک بنا کہ ہم تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح کریں اور زیادہ سے زیادہ تیرا چرچا پھیلائیں۔ بے شک تو برابر ہمارا نگرانِ حال رہا ہے۔ فرمایا، تمھاری درخواست منظور ہوئی، اے موسیٰ! ۲۴-۳۶

اور ہم نے تم پر ایک بار اور بھی اپنا فضل کیا جب کہ ہم نے تمھاری ماں کو الہام کی وہ بات جو وحی کی جا رہی ہے، کہ اس کو صندوق میں رکھ دو پھر اس کو دریا میں ڈال دو۔ پس یوں ہو کہ دریا اس کو کنارے پر ڈال دے کہ اس کو اٹھا لے وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے اور میں نے

تم پر اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا اور تاکہ تمھاری پرورش میری نگرانی میں ہو۔ جب کہ تمھاری بہن جاتی اور کہتی تھی کہ کیا میں ایسے لوگوں کا پتہ دوں جو اس بچے کی پرورش کریں۔ پس ہم نے تم کو تمھاری ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کھائے۔ ۳۷-۴۰

اور تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تم کو غم سے نجات دی اور ہم نے تم کو خوب خوب پرکھا۔ پھر تم کئی سال اہل مدین میں رہے۔ پھر ایک خاص اندازہ کیے ہوئے وقت پر تم یہاں پہنچے اے موسیٰ! اور میں نے اپنے کارِ خاص کے لیے تمھیں منتخب کیا۔ ۴۰-۴۱

تم اور تمھارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ اور میرے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑنا۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس کو نرمی کے ساتھ دعوت دو، شاید وہ یاددہانی حاصل کرے یا ڈرے۔ ۴۲-۴۴

انھوں نے عرض کی اے ہمارے خداوند، ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر تعدی کرے یا اس کی سرکشی اور بڑھ جائے۔ فرمایا تم اندیشہ نہ کرو، میں تمھارے ساتھ سب کچھ سنتا دیکھتا ہوں۔ پس اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو عذاب میں مبتلا نہ رکھ، ہم تیرے خداوند کے پاس سے ایک بڑی نشانی بھی لے کر آئے ہیں۔ اور سلامتی ان لوگوں پر ہے جو ہدایت کی پیروی کریں۔ ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ ان لوگوں پر عذاب ہے جو جھٹلائیں اور اعراض کریں۔ ۴۵-۴۸

اس نے سوال کیا اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ اس نے جواب دیا، ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کی رہنمائی کی۔ اس نے پوچھا، تو پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ان کا علم میرے رب کے پاس ایک رجسٹر میں ہے۔ نہ میرا رب بھٹکتا

ہے نہ بھولتا ہے ـــــ وہی جس نے تمھارے لیے زمین کو گہوارا بنایا اور اس میں تمھارے لیے راہیں نکالیں اور آسمان سے پانی برسایا، پس ہم نے اس سے مختلف نباتات کی گوناگوں قسمیں پیدا کردیں۔ کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو چراؤ۔ اس کے اندر اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔ اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔ ۴۹-۵۵

اور ہم نے اس کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں تو اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ اس نے کہا، موسیٰ! کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے بے دخل کردو تو ہم بھی تمھارے مقابل میں ایسا ہی جادو لائیں گے۔ تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک مقام معین ٹھہرا لو، کوئی بیچ کی جگہ، نہ ہم اس کی خلاف ورزی کریں نہ تم۔ ۵۶-۵۸

اس نے کہا، تمھارے لیے وعدے کا دن میلہ والا دن ہے اور یہ کہ لوگ بوقت چاشت جمع کیے جائیں۔ پس فرعون وہاں سے ہٹا اور اپنی ساری تدبیریں اکٹھی کر کے پھر مقابلہ میں آیا۔ موسیٰ نے کہا تمھاری ناس ہو! اللہ پر جھوٹ نہ باندھو کہ وہ تم کو کسی عذاب میں پیس دے اور جس نے خدا پر جھوٹ باندھا وہ نامراد ہوا۔ ۵۹-۶۱

پس انھوں نے آپس میں، اپنے معاملہ میں، مشورت اور سرگوشی کی۔ انھوں نے کہا یہ دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں تمھارے ملک سے بے دخل کردیں اور تمھارے اعلیٰ نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیں۔ تو اپنی ساری تدبیریں اکٹھی کرلو، پھر ان کے مقابل میں متحد ہو کر آؤ اور آج کامیاب وہی رہے گا جو غالب آئے گا۔ ۶۲-۶۴

انھوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو تم پیش کرو یا پھر ہم ہی پہلے پیش کرنے والے بنتے ہیں۔ اس نے کہا بلکہ تم ہی پیش کرو۔ تو دفعتہً ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے اس کو اس طرح

نظر آنے لگیں گویا وہ رینگ رہی ہیں تو موسٰیؑ دل ہی دل میں کچھ ڈرا۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے اور تم اس کو جو تمھارے ہاتھ میں ہے زمین پر ڈالو یہ ان کے سارے سوانگ کو جو انھوں نے رچایا ہے نگل جائے گا۔ یہ کرتب جو انھوں نے دکھایا ہے یہ تو بس ایک جادوگر کا کرتب ہے اور جادوگر جہاں بھی جائے کامیاب نہیں ہوتا۔ تو جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ پکار اٹھے کہ ہم موسٰیؑ اور ہارونؑ کے رب پر ایمان لائے۔ ۶۵-۷۰

فرعون نے کہا تم نے بدوں میری اجازت کے اس کی تصدیق کر دی بے شک وہی تمھارا گرو ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے تو میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا اور تمھیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا اور تمھیں پتہ چل جائے گا کہ ہم میں سے کس کی سزا زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہوتی ہے! انھوں نے جواب دیا کہ ہم ان روشن دلائل پر جو ہمارے پاس آئے ہیں اور اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، تم کو ہرگز ترجیح دینے والے نہیں ہیں تو تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو بس اس دنیاوی زندگی کا کر سکتے ہو۔ ہم اپنے رب پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطاؤں کو اور اس جادو کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا، بخشے اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ ۷۱-۷۳

بے شک جو شخص اپنے رب کے سامنے مجرم کی حیثیت سے حاضر ہو گا تو اس کے لیے جہنم ہے، نہ اس میں مرے گا، اور نہ جیے گا۔ اور جو اس کے پاس باایمان ہو کر جائیں گے، انھوں نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے، تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہوں گے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ ۷۴-۷۶

اور ہم نے موسٰیؑ کو وحی کی کہ میرے بندوں کو شب میں لے کر نکل جاؤ۔ ان کے لیے دریا میں ایک

خشک راہ کھول لو، نہ تمھیں تعاقب سے کوئی خطرہ ہوگا نہ ڈوبنے کا کوئی اندیشہ! تو فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا تعاقب کیا، بالآخران کو سمندر کی اس چیز نے ڈھانک لیا جس چیز نے ڈھانک لیا! اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا، اس کو صحیح راہ نہ دکھائی! ۷۷ - ۷۹

اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمھارے دشمن سے نجات بخشی اور تم سے طور کے مبارک جانب کو ایک میعاد ٹھہرائی اور تم پر ہم نے من و سلوٰی اتارا کہ ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اس نعمت کو پاکر سرکشی نہ کیجیو کہ تم پر میرا غضب نازل ہو اور جس پر میرا غضب اترا وہ تباہ ہوا! اور میں ان لوگوں کے لیے بڑا ہی غفار ہوں جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح کریں پھر ہدایت کی روش اختیار کریں۔ ۸۰-۸۲

اور اے موسیٰ یہ تم کو، اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی آنے پر کس نے ابھارا؟ اس نے کہا، وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی ہیں، اور میں، اے میرے رب! تیری خوشنودی کے لیے جلدی چلا آیا ہوں۔ فرمایا تو ہم نے تمھاری قوم کو تمھارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔ تو موسیٰ اپنی قوم کے پاس غصہ اور غم سے بھرا ہوا لوٹا اور بولا کہ اے میری قوم کے لوگو، کیا تم سے تمھارے رب نے نہایت اچھا وعدہ نہیں کیا تھا! کیا تم پر زمانہ زیادہ گزر گیا یا تم نے چاہا کہ تم پر تمھارے رب کا غضب نازل ہو کہ تم نے میری ٹھہرائی ہوئی میعاد کی خلاف ورزی کر ڈالی!! ۸۳ - ۸۶

انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے آپ سے کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی اپنی مرضی سے نہیں کی۔ بلکہ قوم کے زیورات کا بوجھ جو ہمارے حوالہ کیا گیا تھا ہم نے اس کو پھینک دیا اور اس طرح سامری نے ڈھال کر پیش کر دیا۔ ۸۷

پس اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا برآمد کر دیا۔ ایک دھڑ جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی پس انھوں نے کہا یہی تمھارا معبود ہے اور یہی موسیٰ کا بھی معبود ہے لیکن وہ بھول گیا ہے۔ کیا

یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے تھے کہ نہ وہ کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ کوئی نقصان یا نفع پہنچا سکتا ہے! ۸۸-۸۹

اور ہارونؑ نے ان سے پہلے ہی کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، تم اس کے ذریعہ سے فتنہ میں ڈال دیے گئے ہو، تمہارا رب خدائے رحمان ہے تو میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ وہ بولے کہ ہم تو اب اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے تا آنکہ موسٰی ہمارے پاس واپس آجائیں۔ ۹۰-۹۱

موسٰی نے کہا اے ہارون! جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہوئے جا رہے ہیں تو تم کو میری پیروی سے کس چیز نے روکا! کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کی۔ اس نے جواب دیا کہ اے میرے ماں جائے! نہ میری ڈاڑھی پکڑیے نہ میرا سر۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا آپ یہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا۔ ۹۲-۹۴

موسٰی نے پوچھا، اے سامری تیرا کیا ماجرا ہے؟ اس نے جواب دیا مجھے وہ چیز نظر آئی جو اوروں کو نظر نہیں آئی تو میں نے فرستادے کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور وہ اس میں ڈال دی اور اس طرح میرے نفس نے مجھے سجھایا۔ موسٰی نے کہا، چل دور ہو، اب تیرے لیے زندگی بھر یہ ہے کہ تو کہتا پھرے کہ کوئی چھوئے نہیں اور تیرے لیے ایک اور وقت موعود بھی ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں اور اپنے اس معبود کو دیکھ جس پر تو دھرنا دیے رہا ہے، ہم اس کو جلائیں گے، پھر اس کو سمندر میں بکھیر دیں گے۔ تمہارا معبود تو بس اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ ۹۵-۹۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اہل قصہ کے لیے حضرت موسٰی کی سرگزشت کی خاص اہمیت

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى (۹)

یہ اسلوب بیان قرآن میں تہدید و وعید کے لیے بھی آیا ہے اور ترغیب و تشویق کے لیے بھی۔ یہاں موقع و محل

دلیل ہے کہ یہ ترغیب و تشویق کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے موسیٰ کی سرگزشت سنی ہے؟ یہ سرگزشت ہم تمھیں سناتے ہیں۔ اس میں ان تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا جو دعوت کے اس مرحلہ میں تمھارے سامنے موجود ہیں، یا آگے کے مراحل میں پیش آنے والے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کی سرگزشت قرآن میں مختلف اسلوبوں سے جو بار بار بیان ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی امت ہی کی وراثت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو منتقل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر صاحب شریعت نبی حضرت موسیٰ ہی تھے۔ ان کو اپنی امت کی تشکیل میں جو زہرہ گداز مراحل پیش آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی جس جس طرح نصرت فرمائی وہ ساری باتیں آنحضرتؐ کے لیے نہایت سبق آموز تھیں اور بنی اسرائیل نے قدم قدم پر جو ٹھوکریں کھائیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح و تربیت کے لیے جو ہدایات دیں وہ اس امت کے لیے درس عبرت ہیں۔ اس سرگزشت کو پڑھتے ہوئے اس کی اس اہمیت کو نظر انداز نہ کیجیے۔ یہ دوسروں ہی کی نہیں بلکہ اپنی بھی حکایت ہے۔

إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (۱۰)

حضرت موسیٰ کی سرگزشت ابتدائے نبوت سے

یہ حضرت موسیٰ کی سرگزشت کا آغاز اس وقت سے کیا ہے جب ان کو نبوت عطا ہوئی ہے۔ مدین سے واپسی پر جب وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ وادیٔ طور کے پاس پہنچے تو شب کا وقت تھا۔ راستہ کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور سردی بھی معلوم ہوتا ہے کہ سخت تھی۔ اتنے میں ایک سمت سے انھیں شعلہ سا نظر آیا۔ حضرت موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو، مجھے ایک شعلہ سا دکھائی دیا ہے، میں وہاں جاتا ہوں یا تو وہاں سے تمھارے تاپنے کے لیے، جیسا کہ سورۂ قصص میں تصریح ہے، کوئی انگارہ لاؤں گا یا وہاں کچھ لوگ ہوئے تو ان سے راستہ معلوم کر لوں گا اور ہمارا سفر جاری رہ سکے گا۔

ایک شعلۂ مستعجل کا مشاہدہ

'آنَسْتُ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کو جو آگ نظر آئی اس کی نوعیت آگ کے کسی جلتے ہوئے الاؤ کی نہیں بلکہ ایک شعلۂ مستعجل کی تھی جو چمکا اور غائب ہو گیا۔ اس لیے یہ لفظ تاڑنے اور بھانپنے کے لیے آتا ہے۔ بس ایک چمک سی نظر آئی اور دفعۃً غائب ہو گئی۔ حضرت موسیٰ کے سوا اس کو کسی نے شاید دیکھا بھی نہیں۔ اگر بھڑکتی ہوئی آگ ہوتی تو حضرت موسیٰ یوں کہتے کہ دیکھو وہ سامنے آگ جل رہی ہے، میں یا تو وہاں سے راستہ معلوم کرتا ہوں اور اگر وہاں کوئی نہ ملا تو پھر تاپنے کا کچھ سامان کرتا ہوں تاکہ سردی میں بچاؤ کا کچھ سامان ہو سکے۔

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ ۝ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱۱-۱۲)

ندائے غیب

جب حضرت موسیٰ اس مقام پر پہنچے جہاں ان کو شعلہ نظر آیا تھا تو ان کو آواز آئی کہ اے موسیٰ یہ تو میں

تمھارا رب ہوں۔ یعنی تم تو آگ سمجھ کر یہاں آئے ہو لیکن یہاں آگ نہیں ہے بلکہ میں تمھارا رب ہوں۔

تواضع کی ہدایت اور اس کے آداب

'فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ' پہلی ہدایت یہ ہوئی کہ جوتے اتار دو۔ جوتے اتار کر حاضر ہونا صرف طہارت ہی کے آداب میں سے نہیں بلکہ تواضع کے آداب میں سے بھی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں مسجد کے احترام کے لیے بھی اس کو ضروری قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ مسجد خدا کے سامنے حاضری کی جگہ ہے جس کے لیے طہارت اور تواضع دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جوتے صاف ہوں تو ان کے ساتھ مسجد میں جانے میں کوئی ہرج نہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ تواضع کے خلاف ہے اور مسجد کی حاضری کے لیے جس طرح طہارت شرط ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تواضع شرط ہے۔

'إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى' یہ اس ہدایت کی علت واضح فرمائی ہے کہ تم اس وقت طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ 'طُوًى' اس میدان کا نام ہے جو جزیرہ نمائے سینا میں کوہ سینا کے دامن میں واقع ہے۔ کسی پہاڑ یا وادی یا رقبۂ زمین کا تقدس ایک امر اضافی ہے۔ زمین ساری خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس کے کسی ٹکڑے کو کسی دوسرے ٹکڑے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے تاآنکہ کسی ٹکڑے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص نسبت ہو جائے۔ اس وادی کو یہ خاص شرف حاصل ہوا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنی تجلی اور اپنے کلام سے نوازا اس وجہ سے اس کو تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا۔

وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ (۱۳)

'اِسْتِمَاع' کے معنی توجہ اور اہتمام کے ساتھ سننے کے ہیں۔ یہ جملہ اصل بات کہنے سے پہلے پوری طرح متوجہ کرنے کے لیے ہے یعنی میں نے تمھیں اپنے کار خاص، فریضۂ نبوت و رسالت کے لیے منتخب کیا ہے تو جو کچھ تم پر وحی کی جا رہی ہے اس کو غور و توجہ سے سنو۔ اس میں اس تشریف و تکریم کی طرف بھی اشارہ ہے جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے سبب سے حضرت موسیٰ کو حاصل ہوئی اور عظیم ذمہ داری کی طرف بھی جو حضرت موسیٰ پر اس منصب کی بدولت عاید ہوئی۔

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي (۱۴)

حضرت موسیٰ کو اولین تعلیم

یہ اولین تعلیم ہے جو حضرت موسیٰ کو دی گئی اور یہی تعلیم ہمیشہ تمام انبیاء کو دی گئی ہے۔ اس آیت کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں تین باتیں مذکور ہیں۔

سب سے پہلے عقیدۂ توحید اس لیے کہ یہی عقیدہ مرکزی ہے۔ جہاں تک خدا کے ماننے کا تعلق ہے دنیا نے ہمیشہ خدا کو مانا ہے۔ انکارِ خدا کی حماقت موجودہ زمانے کی پیداوار ہے۔ البتہ شرک کی ضلالت ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں انسان پر حملہ آور ہوتی رہی ہے چنانچہ ہر نبی کو سب سے پہلے توحید ہی کی تعلیم دی گئی اور ہر نبی نے سب سے پہلے شرک ہی کے خلاف جہاد کیا۔

دوسری چیز جس کی حضرت موسیٰ کو ہدایت ہوئی وہ خدا کی عبادت ہے۔ یہ عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے

اور یہ حق بلا شرکت غیرے ہے۔ جب وہ معبود ہے تو لازم ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور جب اس کا کوئی شریک نہیں تو یہ بھی لازم ہے کہ یہ عبادت بلا شرکت غیرے ہو۔ اس عبادت کے لوازم میں سے، جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں ذکر کرچکے ہیں، خدا کی اطاعت بھی ہے۔ جس طرح خدا کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں ہے اسی طرح خدا کے احکام کے خلاف طوعاً کسی کی اطاعت بھی جائز نہیں ہے۔ عبادت کی اصل روح خدا کے آگے اپنی بندگی اور غلامی کا اقرار اس کے ساتھ اپنے عہد اطاعت و وفاداری کی تجدید اور اس کا تذکر ہے۔ اس وجہ سے یہ بات خدا کی بندگی کے بالکل منافی ہے کہ تسبیح تو اس کی کی جائے اور شریعت خود تصنیف کی جائے یا کسی دوسرے کے لیے یہ حق تسلیم کیا جائے۔ یہ چیز شرک ہے۔ اس کے شرک ہونے کے دلائل ہم نے اپنے رسائل حقیقت شرک اور حقیقت توحید میں بیان کیے ہیں۔

تیسری چیز نماز ہے۔ نماز کے لیے 'اقامت' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے اندر اہتمام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ نماز کا حکم اللہ کے ذکر کو قائم و دائم رکھنے کے لیے دیا گیا ہے۔ 'اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ' نماز انفرادی ہو یا اجتماعی خدا کے ذکر کی سب سے بڑی محافظ بھی ہے اور اس کا سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ مؤثر مظہر بھی۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلے اسی کی ہدایت ہوئی۔ نماز ہی کے ذریعے سے بندہ اپنے عہد بندگی کو یاد کرتا ہے جو اس کے رب نے اس سے لیا ہے اور جو اپنے رب سے اس نے باندھا ہے اور اسی کے ذریعہ سے کوئی امت اپنے اس میثاق کو یاد رکھتی ہے جو خدا نے اس سے لیا ہے اور جس کا خدا سے اس نے اقرار کیا ہے۔ اگر کوئی فرد یا امت نماز کو ضائع کردے تو اس نے پورے دین کو ضائع کر دیا۔ اس مضمون کی وضاحت سورۂ مریم کی آیت ۵۹ کے تحت ہو چکی ہے، اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ (۱۵)

قیامت کی یاددہانی

یہ قیامت کی یاددہانی ہے اور اس کے لیے 'آتِیَۃٌ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ وہ آئے گی، بلکہ یہ فاعل کا صیغہ ہے جس کے اندر زور اور تاکید ہے کہ یہ آکے رہے گی، یہ شدنی اور اٹل ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیامت کے باب میں عام ذہن کبھی انکار صریح کا نہیں بلکہ تعجب اور استبعاد کا رہا ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کے اثبات کے پہلو بہ پہلو اس کی قطعیت پر بہت زور دیا ہے۔

قیامت کا مقصد

'لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی' یہ قیامت کا اصل مقصد بیان ہوا ہے کہ اس کا آنا اس لیے لابدی ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کا، نیک ہو یا بد، بدلہ دیا جانا ناگزیر ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک رحیم و حکیم کی بنائی ہوئی دنیا نہیں بلکہ ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور یہ بات بالبداہت خلاف عقل ہے۔ 'بِمَا تَسْعٰی' کے لفظ نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے عمل ہی کا بدلہ پائے۔ اگر کسی کے اعمال تو ہوں شیطان کے لیکن وہ کسی کی سعی و سفارش یا اپنے حسب نسب کے بل پر مرتبہ صالحین و ابرار کا حاصل کرلے یا بازپرس سے بری ہو جائے تو اس کے معنی نعوذ باللہ یہ ہوں گے کہ اللہ میاں کے ہاں بھی اصل قدر عمل اور کردار کی نہیں بلکہ

شفاعت و سفارش اور خاندان و نسب ہی کی ہے۔

ایک بلیغ جملہ معترضہ

آیت کے بیچ میں 'اَکَادُ اُخْفِیْهَا' کے الفاظ بطور جملہ معترضہ کے ہیں۔ یہ جملہ معترضہ نہایت بلیغ ہے۔ صرف یہ نہیں فرمایا کہ میں قیامت کو چھپائے رکھوں گا بلکہ فرمایا کہ قریب ہے کہ میں اس کو چھپائے ہی رکھوں، عربیت کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ لفظ 'اَکَادُ' سے جملہ کے اندر یہ مضمون پیدا ہو گیا ہے کہ ہر چند میں نے تو ابھی قیامت پر پردہ ڈال رکھا ہے اور یہ پردہ ابھی ڈالے ہی رکھوں گا لیکن خود قیامت کا یہ حال ہے کہ وہ بے نقاب ہو جانے کے لیے بالکل بے قرار ہے۔ یہی مضمون دوسرے الفاظ میں سورۂ اعراف میں یوں وارد ہوا ہے 'ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْکُمْ اِلَّا بَغْتَةً' (آسمان و زمین دونوں اس کے بوجھ سے گرانبار ہیں، وہ تمھارے اوپر بس اچانک ہی آ دھمکے گی)[1]۔

فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى (۱۶)

ایجاز بیان کی ایک مثال

'عَنْهَا' میں ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک 'صَلٰوة' ہے اور 'بِهَا' کی ضمیر کا مرجع 'السَّاعَة' ہے۔ یعنی نماز سے تمھیں وہ شخص روکنے یا غافل نہ کرنے پاوے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے۔ یہ مفہوم لینے میں اگرچہ بظاہر انتشار ضمیر کا سوال پیدا ہوتا ہے جس کو کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے لیکن انتشار ضمیر صرف اس صورت میں عیب ہے جب مرجع کے تعین کے لیے کوئی واضح قرینہ موجود نہ ہو۔ اگر واضح قرینہ موجود ہو تو یہ کوئی عیب نہیں بلکہ اس سے کلام میں ایجاز کا حسن پیدا ہوتا ہے اور فصحا کے کلام میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔

یہاں قرینہ بالکل واضح ہے۔ نماز اور قیامت کے ذکر کے بعد دو فعل استعمال ہوئے ہیں ایک 'یَصُدَّنَّ' اور دوسرا 'یُؤْمِنُ'۔ زبان کا ذوق رکھنے والا شخص بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ پہلا فعل 'صَلٰوة' سے واضح مناسبت رکھتا ہے اور دوسرا قیامت سے۔ یہی رائے اگلوں میں سے ابو مسلم کی ہے اور مجھے یہ رائے ہر اعتبار سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔

نماز اور ایمان بالآخرۃ کا باہمی تعلق

حکمت دین کے پہلو سے اس مسئلہ پر غور کیجیے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص آخرت پر پختہ ایمان نہیں رکھتا اس کے لیے نماز ایک مصیبت ہے۔ قرآن میں اس کی تصریح موجود ہے۔

وَاِنَّهَا لَکَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ الَّذِیْنَ	اور بے شک یہ بہت گراں ہے مگر ان ڈرنے والوں پر جو
یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ	یہ گمان رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور
اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ - ۴۵-۴۶)	اسی سے ان کو سابقہ پڑنے والا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی قرآن میں موجود ہے کہ اتباع ہوا اور ترک نماز میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ سورۂ مریم میں یہ آیت گزر چکی ہے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا	پس ان کے بعد ایسے برے جانشین اٹھے جنھوں نے

---

[1] اس مضمون کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو اس آیت کی تفسیر 'تدبر قرآن' جلد سوم صفحہ ۴۰۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔

الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹ - مریم)

نماز ضائع کردی اور خواہشوں کے پیرو بن گئے تو وہ عنقریب اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

یہود نماز اور ایمان بالآخرۃ دونوں ضائع کر بیٹھے

ان آیات سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت موسیٰؑ کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی تاکید ہوئی وہ نماز ہے اور خاص طور پر جس چیز کی یاددہانی کی گئی وہ آخرت ہے۔ یہی بات حضرات انبیائے کرام کی تاریخ سے، جیساکہ سورۂ مریم میں آپ معلوم کر چکے ہیں، ہم آہنگ بھی ہے لیکن یہود کی بدقسمتی قابل ماتم ہے کہ انھوں نے نماز بھی ضائع کردی اور آخرت کو بھی بھلا بیٹھے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان کے صحیفوں میں قربانی کا ذکر تو ملتا ہے لیکن نماز کا ذکر، بالخصوص ہیکل میں، صرف ایک جگہ سفر خاص باب ۲۶ میں ملتا ہے۔ ان کے بعض فقہاء کا خیال تو یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نماز کا حکم سرے سے دیا ہی نہیں، اگر تورات میں اس کا کہیں ذکر ہے تو وہ بعد کے مرتبوں کی ایجاد ہے۔ رہا آخرت کا معاملہ تو ان کے صدوقی تو حشر بعد الموت کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جزا و سزا جو کچھ ہے سب اسی دنیا میں پوری ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مرجئہ نے بھی اپنا عقیدہ معلوم ہوتا ہے کہ انہی سے مستعار لیا ہے۔

آخر میں لفظ 'فَتَرْدٰى' بطور تنبیہ ہے کہ اگر نماز اور یاد آخرت سے غفلت ہوئی تو سمجھ لو کہ بیڑا غرق ہو جائے گا۔ یہی چیزیں سارے دین کی حفاظت کرنے والی اور شیطان کے فتنوں سے امان میں رکھنے والی ہیں۔ جو ان سے غافل ہوا اس نے گویا اپنے آپ کو شیطان کے حوالہ کر دیا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (۱۷)

لفظ 'یمین' داہنے بائیں کے مفہوم سے مجرد ہو کر صرف ہاتھ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ کلام عرب میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

سوال برائے التفات و نوازش

یہ سوال ظاہر ہے کہ تحقیق کے لیے نہیں بلکہ اظہار التفات و نوازش ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔ جس طرح باپ بچے سے پوچھتا ہے کہ بیٹے یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے حالانکہ وہ اس چیز سے بیٹے سے زیادہ واقف ہوتا ہے اسی طرح رب کریم نے حضرت موسیٰؑ سے سوال کیا کہ موسیٰ! یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اور سوال اس چیز سے متعلق کیا جو آگے ان تمام خوارق کا ذریعہ بننے والی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ظاہر ہوئے۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۱۸)

'ھش' کے معنی

'ھش' کے معنی درخت سے پتے جھاڑنے کے ہیں۔ عکبری نے 'اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ' کے معنی 'اَقُوْمُ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ' کے لیے ہیں۔ یعنی اس لٹھیا سے میں اپنے ریوڑ کی چرواہی اور حفاظت کرتا ہوں۔ اگر لغت سے اس معنی کی شہادت مل جائے تو بہت خوب ہے لیکن عکبری نے کوئی شہادت نہیں پیش کی ہے۔ اس وجہ سے میں نے معروف معنی ہی کی پیروی کی ہے۔

بدیں برد حکایت دراز تر گفتم!

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ یہ میری لٹھیا ہے جس پر میں عندالضرورت ٹیک بھی لگاتا ہوں، اپنی بکریوں

کے لیے درختوں سے پتے بھی جھاڑ لیتا ہوں اور میرے دوسرے کام بھی اس سے نکلتے ہیں۔

صاف محسوس ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے سوال کا صرف سیدھا سادا جواب دے دینے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان کے جواب میں کچھ انبساطِ کلام اور سخن گستری کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ وہ صرف یہ جواب بھی دے سکتے تھے کہ یہ میری لٹھیا ہے لیکن انھوں نے سوال کے انداز سے بھانپ لیا کہ یہ محض سوال نہیں ہے بلکہ اس میں التفاتِ خاص کی دل نوازی بھی ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے جواب میں تفصیل سے کام لیا کہ شاید اس طرح کچھ مزید سوال و جواب کی راہ کھلے۔ مخاطب کرنے والا محبوب و مطلوب ہو تو گفتگو کو طویل کرنے کی خواہش ایک امر فطری ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ۔ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى (۱۹-۲۰)

عصا کا معجزہ — ارشاد ہوا کہ اس لٹھیا کو زمین پر ڈال دو اور پھر قدرتِ خداوندی کا کرشمہ دیکھو! چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے لٹھیا زمین پر ڈال دی اور وہ دفعۃً ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گئی۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ وقفه سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى (۲۱)

سانپ کو دیکھ کر ڈرنا ایک امر طبعی ہے چنانچہ حضرت موسیٰؑ اس منظر کو دیکھ کر ڈرے کہ ہاتھ کی لٹھیا جو سانپ کو مارنے والی بن سکتی تھی وہ خود سانپ بن گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلایا کہ ڈرو نہیں، اس کو بے جھجک پکڑ لو۔ تمھارے پکڑتے ہی ہم اس کو اس کی پہلی حالت پر کر دیں گے۔ یہ جیسی لٹھیا تھی ویسی ہی لٹھیا بن جائے گی۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى (۲۲)

ید بیضا کا معجزہ — ساتھ ہی دوسری ہدایت یہ ہوئی کہ اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کی طرف سکیڑ لو، پھر جب تم اس کو بغل سے نکالو گے تو وہ وہاں سے چٹا سفید، بغیر کسی مرض کے، ایک دوسری نشانی بن کر برآمد ہو گا۔

تورات کے ایک بیان کی تردید — یہ دوسرا معجزہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوا۔ یہاں 'بیضاء' کے ساتھ 'مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ' کی قید اس شبہ کے ازالہ کے لیے ہے کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی مرض کے سبب سے نہیں ہو گی بلکہ اللہ کی ایک نشانی کے طور پر ہو گی۔ اس سے تورات کی اس روایت کی تردید ہو جاتی ہے کہ جب موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ برص سے سفید نکلا۔ یہ امر بھی یاد رکھیے کہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی یہ سفیدی مستقل نہیں تھی بلکہ قرآن کے الفاظ شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ظہور کو اس شرط کے ساتھ خاص کیا تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ ایک نشانی کے طور پر دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ اپنی بغل میں ڈال کر نکالیں گے تب یہ سفید نکلے گا۔ کسی مرض کا شبہ تو خدانخواستہ اس حالت میں ہوتا ہے جب ہاتھ مستقلاً سفید ہو جاتا۔ لیکن ایسا ہوتا تو پھر معجزہ کیا ہوتا؟

'اٰيَةً اُخْرٰى' مستقل جملہ نہیں ہے بلکہ یہ دوسرا حال ہے۔ ایک حال تو یہ ہے کہ وہ بغیر کسی مرض کے چٹا سفید بن کر نکلے گا، دوسرا حال یہ ہے کہ وہ ایک دوسری نشانی بن کر نکلے گا، ہم نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى (۲۳)

یہ حضرت موسیٰؑ کے لیے مستقبل کی فتوحات کی بشارت ہے کہ بظاہر تو یہ دو ہی معجزے ہیں جن سے یہ مسلح ہیں بلکہ ان کے اندر ہمارے بہت سے دوسرے بڑے بڑے معجزے بند ہیں۔ آگے جب امتحان کے مراحل آئیں گے تو تم دیکھو گے کہ ان سے ہماری قدرت و قہرمانیت کے کیا کیا کرشمے اور خوارق ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرعون کے مقابل میں ان کے جو کرشمے ظاہر ہوئے ان کی تفصیلات تورات میں موجود ہیں۔ خود قرآن میں عصا کے جو کرشمے مذکور ہیں ان کی عظمت ظاہر ہے۔ اسی عصا نے ان کے لیے سمندر سے راہ نکالی اور اسی سے انھوں نے ایک پہاڑی سے اکٹھے بارہ چشمے جاری کر لیے۔

معجزات کے باب میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ خاص معاملہ کی وجہ

توحید اور آخرت اور نماز کی تعلیم و تاکید اور ان دو معجزات کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ وہ فرعون کے پاس فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے جائیں اور اس کو خدا اور اس کے غضب سے ڈرائیں، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزات کے باب میں معروف سنتِ الٰہی تو یہ رہی ہے کہ وہ حضرات انبیاءؑ کو اس وقت دیے گئے ہیں جب ان کی قوموں نے شدت کے ساتھ ان کا مطالبہ کیا ہے اور مقصود ان کے دیے جانے سے صرف اتمام حجت رہا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لے رہے ہیں، کسی معجزے ہی کے لیے لیند ہیں، ان کے پاس حق سے انحراف کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کے ساتھ یہ خاص معاملہ کیوں ہوا کہ ان کو منصب نبوت پر مامور کرتے ہی دو معجزے دے دیے گئے؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایک ایسے سرکش اور جابر حکمران کی طرف رسول بنا کر بھیجے جا رہے تھے جو شخصی اور قومی دونوں اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کا جانی دشمن تھا۔ ان کی بات سننا اور سمجھنا تو درکنار اندیشہ اس بات کا تھا کہ یہ علم ہوتے ہی کہ یہ حضرت موسیٰؑ ہیں فوراً ان کے قتل کا حکم دے دیتا۔ بلکہ ان کے قتل کا حکم تو اسی وقت وہ دے چکا تھا جب قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا لیکن حضرت موسیٰؑ چھپ کر مدین چلے گئے اس وجہ سے وہ اپنے ارادے میں ناکام رہا۔ ایک ایسے منتقم و جبار کے سامنے اگر حضرت موسیٰؑ ایک رسول کی حیثیت سے انذار کے لیے جاتے تو بھلا وہ ان کی بات سننے کا کب روادار ہوتا! وہ تو صرف اسی شکل میں کوئی بات سننے کے لیے تیار ہو سکتا تھا جب حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی جو اس کو مرعوب کر دیتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں ان کو دو ایسے معجزوں سے مسلح کر دیا جن کی مدد سے وہ اپنے دشمن کی ہر تعدی سے محفوظ رہے اور انھوں نے فرعون کے سامنے جاتے ہی، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہو گا، اپنے ان معجزات کا اظہار بھی کر دیا تاکہ وہ خبردار رہے کہ اگر اس نے کوئی غلط اقدام کیا تو وہ بھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہیں بلکہ ان کے ہاتھ میں بھی وہ عصا ہے جو ہر کبر و غرور کا سر پاش پاش کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۴)

فرعون کا طغیان

یہ وہ پہلی مہم ہے جس پر حضرت موسیٰؑ مامور فرمائے گئے۔ حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ فرعون کی سرکشی کی تفصیل سورۂ اعراف کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ وہ اپنے زعم میں خود رب اعلیٰ تھا اور مصریوں کے

سب سے بڑے دیوتا۔ سورج۔ کا مظہر سمجھا جاتا تھا، اس کے اسٹیچو اور بت سارے مصر میں پوجے جاتے تھے۔ خدا کے بندوں کے ساتھ اس کا جو معاملہ تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی بات کافی ہے کہ اس نے اپنی ساری مملکت میں یہ حکم جاری کر رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جتنے بیٹے پیدا ہوں وہ قتل کر دیے جائیں یا دریا میں پھینک دیے جائیں، صرف لڑکیاں لونڈیوں کی خدمت انجام دینے کے لیے زندہ رکھی جائیں۔ جس کا رویہ خالق اور خلق کے ساتھ یہ ہو اس کے طغیان میں کلام کی گنجائش کہاں رہی! حضرت موسیٰ چونکہ اس طغیان سے اچھی طرح باخبر تھے بلکہ وہ خود اس کے ستم زدہ تھے اس وجہ سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل نہیں فرمائی بلکہ صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا۔

انبیاء کی دعوت اور عوامی تحریکات میں ایک اصولی فرق

یہاں وہ بات بھی نگاہ میں رکھیے جس کی طرف ہم ایک سے زیادہ مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے انذار اور اپنی دعوت کا مخاطب سب سے پہلے اپنی قوم اور سوسائٹی کے اعیان و اکابر کو بناتے ہیں اس لیے کہ سوسائٹی کا نظام انہی کی قیادت میں چل رہا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی اصلاح کو قبول کر لیں تو ساری سوسائٹی بہت جلد اصلاح قبول کر لیتی ہے اور دعوت کی عقلیت و برتری کا رعب سب پر چھا جاتا ہے اور اگر وہ ضد و مکابرت کی وجہ سے حق کو جھٹلاتے ہیں تو یہ چیز بھی دعوت کے حق میں ایک پہلو سے مفید ہی ہوتی ہے اس لیے کہ ان کے پیرووں پر اپنے لیڈروں کی منطق کا کھوکھلا پن واضح ہو جاتا ہے اور پھر اگر وہ حق قبول کرتے ہیں تو پورے شعور اور کامل بصیرت کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور یہ بصیرت ان کے اندر وہ قوت تسخیر پیدا کر دیتی ہے کہ کل تک اگر وہ دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کی طرح صرف مچھلیوں کے پکڑنے والے تھے تو اس انقلاب حال کے بعد آدمیوں کے پکڑنے والے بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو تحریکیں عوامی پراپیگنڈے سے اپنے کام کا آغاز کرتی ہیں ان کا سارا اعتماد عوام کو بھڑکانے والے جذباتی نعروں پر ہوتا ہے۔ انہی کے بل پر وہ چلتی ہیں اور جب تک قائم رہتی ہیں انہی کے بل پر قائم رہتی ہیں۔ ان کے اندر نہ عقل کا کوئی حصہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ جذبات کے ایک مؤثر عامل ہونے سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر انہی کے ہاتھ میں زندگی کی باگ دے دی جائے تو پھر زندگی کا انجام معلوم ہے!

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ هَارُونَ أَخِي ۝ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۝ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ۝ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ۝ إِنَّكَ كُنتَ بِنَا بَصِيرًا ۝ قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ (۲۵-۳۶)

نبی اور دنیا پرست لیڈروں میں فرق

حضرت موسیٰؑ کے علم میں جونہی یہ بات آئی کہ ان پر فریضۂ رسالت کی ذمہ داریاں ڈال دی گئی ہیں اور اب انھیں فرعون کے پاس، خدا کے رسول کی حیثیت سے، انذار و تبلیغ کے لیے جانا ہے تو انھوں نے فوراً یہ دعا کی جو اوپر نقل ہوئی ہے۔ اس دعا کے لفظ لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس بوجھ کو کتنا بھاری محسوس کیا ہے اور کس دل سوزی کے ساتھ اس بارگراں کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ سے مدد و رہنمائی کے لیے التجا کی ہے۔ دنیا پرست لیڈروں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ لیڈری ہی کی ہوس میں جیتے اور اسی کے عشق میں مرتے

ہیں لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کا سینہ اس ہوس سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ جب امامت کے منصب پر مامور فرماتا ہے تو وہ اس کی ذمہ داریوں کے تصور سے کانپ اٹھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ جب اس نے ان پر یہ بوجھ ڈالا ہے تو وہی اس کے اٹھانے کے لیے ہمت و قوت بخشے اور ہر قدم پر دستگیری و رہنمائی فرمائے۔

شرح صدر کی دعا

'قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي'۔ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ نے شرح صدر کے لیے دعا فرمائی۔ اگر ذمہ داری بھاری ہو اور آدمی کو اس ذمہ داری کا کما حقہٗ احساس بھی ہو تو ہر حساس آدمی کا سینہ اس سے بھنچتا ہے۔ یہ آدمی کی کمزوری کی دلیل نہیں بلکہ یہ اس کے حساس اور فرض شناس ہونے کی دلیل ہے۔ حضرات انبیاءؑ نبوت کو مانگ کر نہیں پاتے بلکہ اس کی ذمہ داری، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے اس وجہ سے قدرتی طور پر وہ اپنے سینہ میں اضطراب و تردد محسوس کرتے ہیں کہ معلوم نہیں وہ کس حد تک اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سینہ کی یہ خلش اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے دور ہو سکتی ہے۔ وہی دل میں ہمت و عزیمت ڈالتا ہے اور وہی آگے کے مراحل کے لیے علم و یقین کی روشنی عطا فرماتا ہے تب سینہ کھلتا اور حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ یہ حقیقت یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء پر بھی سارا علم و یقین ایک ہی دن میں انڈیل نہیں دیا جاتا بلکہ وہ بھی ذرا ذرا اپنی منازل سفر کے اعتبار سے پاتے ہیں اور برابر 'رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا' کا ورد رکھتے ہیں۔

مہم کی کامیابی کے لیے دعا

'وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي' اندرونی خلش کے ازالہ کی دعا کے بعد یہ حالات کی ساعدت، راہ کی ہمواری اور مہم کی کامیابی کے لیے دعا ہے کہ ہر چند یہ مہم بہت سخت ہے لیکن تو چاہے تو ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔ تو اپنے فضل سے ہر مشکل کو آسان کر اور راہ کی ہر رکاوٹ کو دور کر۔

قوتِ اظہار و بیان عطا کیے جانے کی درخواست

'وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي'۔ یہ نہایت ادب و تواضع کے ساتھ، مقصد دعوت کے لیے قوت اظہار و بیان عطا کیے جانے کی درخواست ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دور میں ابلاغ کا واحد ذریعہ صرف کسی خطیب کی خطابت و زبان آوری ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خطیبوں کو سوسائٹی میں سب سے زیادہ عزت حاصل تھی۔ عرب میں تو یہ حال تھا کہ جو شخص قبیلہ کا خطیب ہوتا وہی اس کا زعیم اور قائد ہوتا۔ جوہر خطابت کے بغیر اس دور میں کوئی شخص قیادت و امارت کی ذمہ داریاں کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اب پریس کی ایجاد نے قلم کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے بلکہ اب تو اصلی اہمیت پریس ہی کو حاصل ہے۔ آج اگر کوئی شخص کسی طرح پریس کی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ ڈیموستھنیز سے بھی بڑا خطیب و زبان آور ہونے کا مدعی بن سکتا ہے اگرچہ وہ دو فقرے بھی صحیح بولنے پر قادر نہ ہو۔ لیکن پریس کی ایجاد سے پہلے خطابت اور زبان آوری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بالخصوص جن کے اوپر عوام کی قیادت و امارت کی ذمہ داری ہو وہ تو اس قابلیت کے بغیر اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام زبان آور خطیب نہیں تھے۔ خطابت و زبان آوری ہر چند نبوت و رسالت کے لوازم

میں سے نہیں ہے لیکن دعوت و تبلیغ کے اعتبار سے اس کی اہمیت، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بالخصوص اُس دور میں بہت تھی، اس وجہ سے جب ان پر رسالت کی ذمہ داری ڈالی گئی تو ان کو اپنی اس کمی کا احساس ہوا اور شرح صدر کی دعا کے ساتھ انھوں نے اظہار و بیان کی قوت بخشے جانے کی بھی دعا فرمائی کہ اے رب میری زبان کو قوت اور روانی عطا فرما تاکہ میں اپنی دعوت کو اس طرح پیش کر سکوں کہ لوگ میری بات کو سنیں اور سمجھیں۔

اپنی اس کمی کے احساس کی وجہ سے انھوں نے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارونؑ کو اپنا شریک کار بنائے جانے کے لیے دعا بھی کی۔ حضرت ہارونؑ تورات اور قرآن مجید دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت زوردار خطیب تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو بجا طور پر یہ توقع تھی کہ اگر ان کا تعاون حاصل ہو گیا تو جس کمی کا وہ اپنے اندر احساس کر رہے ہیں اس کی تلافی ہو جائے گی۔ سورۂ قصص میں ان کی دعا یوں مذکور ہے۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ	اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے
لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ	تو اس کو ایک معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ کیجیے
اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ۔	کہ وہ میری تائید کرے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ میری
(القصص - ۳۴)	تکذیب کریں گے۔

اس آیت سے یہ بات صاف واضح ہے کہ اصل ضرورت جس کو حضرت موسیٰؑ، مقصد دعوت کے لیے محسوس فرما رہے تھے ایک زوردار خطیب کی تھی۔ اس پہلو سے وہ اپنے اندر ایک کمی محسوس فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنے سے زیادہ ایک فصیح البیان خطیب کی ان کو مدد حاصل ہو جائے تاکہ وہ زیادہ بہتر اور مؤثر طریقے پر لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کر سکیں۔

یہی بات سورۂ شعراء میں یوں مذکور ہوئی ہے۔

وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ	اور میرا سینہ بھنچتا ہے اور میری زبان رواں نہیں ہے
فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ (۱۳ - شعراء)	تو ہارون کے پاس پیغام بھیج۔

کیا حضرت موسیٰؑ میں لکنت تھی؟

ان آیات سے یہ بات تو ضرور معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کوئی زبان آور اور زوردار خطیب نہیں تھے لیکن یہ بات کہیں سے نہیں نکلتی کہ ان کی زبان میں لکنت تھی۔ لکنت کی روایت صرف تورات میں ہے۔ وہیں سے ہماری تفسیر کی کتابوں میں داخل ہوئی اور پھر اس کو مستند کرنے کے لیے ہمارے مفسرین نے ایک عجیب و غریب واقعہ بھی گھڑ لیا۔ تورات کی روایات کا جو حال ہے ان کا اندازہ اوپر آپ کو ہو چکا کہ حضرت موسیٰؑ کے 'ید بیضاء' کو برص کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ جو لوگ اپنے نبی کو برص کا مریض قرار دے سکتے ہیں ان سے کیا بعید ہے اگر وہ اس کے اندر لکنت کا عیب بھی نکال دیں!

بہرحال قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے لکنت کا ثبوت ملتا ہو۔ 'وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ' کے الفاظ میں بھی جس بات کی درخواست ہے وہ لکنت دور کرنے کی نہیں بلکہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا،

اظہار و بیان کی وہ قابلیت و صلاحیت بخشے جانے کی درخواست ہے جو فریضۂ نبوت و رسالت کی ادائیگی کے لیے ضروری تھی۔ اور یہ درخواست نہایت متواضعانہ اسلوب و الفاظ میں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے یوں نہیں فرمایا کہ مجھے دلوں کو تسخیر کرنے والا ایک جادو بیان خطیب بنا دے بلکہ نہایت خاکسارانہ انداز میں فرمایا کہ میری زبان کو وہ روانی عطا فرما کہ لوگ میری بات سمجھیں۔ یہ دعا کرنے کے لیے لکنت کا مریض ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک قادر الکلام بھی یہ دعا کر سکتا ہے اور اسے کرنی چاہیے۔ بسا اوقات معانی و حقائق کا جوش اس طرح سینہ میں امنڈتا ہے کہ ایک قادر الکلام آدمی بھی اپنی زبان اور اپنے قلم کو اس کی تعبیر سے قاصر محسوس کرتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو عام لیڈروں کی طرح صرف نعرہ نہیں لگانا تھا بلکہ دین کے حقائق و اسرار کی تفہیم کرنی تھی اور وہ بھی ایسے لوگوں کے سامنے جو نہ صرف ان کی تکذیب پر ادھار کھائے بیٹھے تھے بلکہ ان کی جان کے دشمن تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ حضرت موسیٰؑ کو صرف چھدا اتارنے کی خواہش نہیں تھی بلکہ وہ اپنے مخالفوں کے دل میں اتر جانے کا ارمان رکھتے تھے۔ مخالفوں سے تو یہ امید نہ تھی کہ ان کے دل اور ہو جائیں گے اس لیے انھوں نے اپنے رب سے زبان ہی اور مانگی تاکہ ان کو اپنی بات سمجھا سکیں۔

الغرض ہمارے نزدیک یہ لکنت کی روایت ناقابلِ اعتبار ہے۔ قطع نظر اس سے کہ حضرات انبیاءؑ کو اللہ تعالیٰ جس طرح اخلاقی عیوب سے محفوظ رکھتا ہے اسی طرح خلقی نقائص سے بھی محفوظ رکھتا ہے، سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی بات یہ ہے کہ قرآن میں اس روایت کی تائید کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ فرعون کا طعنہ جو سورۂ زخرف میں 'لَا یَکَادُ یُبِیۡنُ' کے الفاظ سے نقل ہوا ہے اس پر انشاءاللہ ہم اس کے محل میں بحث کریں گے۔

'وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِی ۝'

حضرت ہارونؑ کو شریک کار بنانے کی دعا کی وجہ

اوپر سورۂ قصص اور سورۂ شعراء کی جن آیتوں کا حوالہ گزرا ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ ایک مددگار اور شریکِ کار کی ضرورت خاص طور پر حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوتِ بیان کی کمی کے پہلو سے فرمائی تھی اور اس کمی کی تلافی کے لیے وہ اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو نہایت موزوں آدمی سمجھتے تھے، وہ ان کے بڑے بھائی بھی تھے، ان کے اخلاق و کردار پر بھی حضرت موسیٰؑ کو پورا بھروسا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی فصاحتِ بیان کی، جیسا کہ تورات سے واضح ہے، قوم میں بڑی شہرت تھی۔ ان تمام صفات سے متصف آدمی جب اپنے ہی گھر اور خاندان میں موجود ہو تو سب سے زیادہ وہی اس بات کا حق دار ہو سکتا تھا کہ اس کے شریکِ کار بنائے جانے کے لیے حضرت موسیٰؑ درخواست کریں۔ 'مِنْ اَهْلِیْ' کے لفظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس انتخاب میں کسی خاندانی عصبیت کو دخل تھا۔ خاندانی عصبیت کا شبہ تو اس صورت میں ہوتا جب مجرد خاندان وجہ ترجیح بنتا لیکن جب وجہ انتخاب صفات ہیں تو نہ صرف یہ کہ اس شبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے جب کسی فضل و رحمت کے لیے دعا کرے تو اس میں سب سے پہلے اپنے اہل و عیال کو شریک کرے بشرطیکہ وہ اہل و صالح ہوں۔ بقرہ کی تفسیر میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

حضرت ہارونؑ کی حیثیت

'اُشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ۝' 'ازر' پیٹھ اور کمر کو کہتے ہیں۔ یعنی ہارونؑ کو

میرا وزیر اور شریک کار بنا کر میری کمر کو مضبوط کر تاکہ میں اس بارگراں کو حسن و خوبی کے ساتھ اٹھا سکوں۔ 'وَأَشْرِكْهُ فِيٓ أَمْرِي' سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی درخواست اس بات کے لیے تھی کہ حضرت ہارونؑ کی مدد صرف ایک صحابی اور ساتھی کی حیثیت سے نہیں بلکہ شریک نبوت کی حیثیت سے حاصل ہو۔ یعنی وہ بھی فرائض نبوت سے متعلق عنداللہ مسئول و ذمہ دار ہوں اور انہیں بھی براہ راست اللہ کی طرف سے رہنمائی اور عصمت حاصل ہو۔

یہ درخواست ایک بڑی اہم درخواست تھی اس لیے کہ حضرات انبیاء میں سے، جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۵۳ کے تحت ہم ذکر کر چکے ہیں، کسی نبی کے متعلق یہ بات معلوم نہیں کہ ایک دوسرا نبی اس کا وزیر بنایا گیا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو یہ شرف بخشا اور ان کی یہ درخواست منظور فرمائی۔ دنیا دار لیڈروں میں تو چھوٹے چھوٹے عہدوں کے لیے بھی رشک و رقابت کا وہ جذبہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کو اپنے اختیارات کے قریب پھٹکنے دینے کے روادار نہیں ہوتے لیکن جہاں امانت اور ذمہ داری کا صحیح احساس ہو تو ایک نبی اپنی نبوت کے منصب عظیم میں بھی دوسرے کو شریک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ رکھیے کہ تورات میں حضرت ہارونؑ کا ذکر اس حیثیت سے نہیں آیا ہے جس حیثیت سے قرآن میں آیا ہے۔ تورات میں ان کا ذکر بس حضرت موسیٰؑ کے ایک ساتھی اور ترجمان کی حیثیت سے آیا ہے اور وہ بھی ایک ایسے ساتھی کی حیثیت سے کہ سامری کی فتنہ انگیزیاں بھی انہی کے کھاتے میں ڈال دی گئی ہیں۔ یہ قرآن کا فیض ہے کہ اس نے ان شخصیتوں کی اصلی حیثیت اجاگر کی ہے۔

ذکر کا مفہوم

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ۝ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا (۳۳-۳۴)۔ یعنی ہارونؑ کو شریک کار بنائے جانے کی درخواست اس لیے ہے کہ ہم دونوں مل کر تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح اور تیرا زیادہ سے زیادہ ذکر کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں انفرادی ذکر و تسبیح ہی مراد نہیں ہے بلکہ اجتماعی ذکر و تسبیح بھی مراد ہے اور یہ تعبیر ہے فریضۂ نبوت کی ادائیگی کی۔ نبی اور انبیاء کے طریقہ پر کام کرنے والوں کی خلوت و جلوت دونوں ذکر و تسبیح ہوتی ہے۔ وہ مسجد میں جو کام کرتے ہیں وہ بھی ذکر و تسبیح ہے اور بازار میں جو کام کرتے ہیں وہ بھی ذکر و تسبیح ہے۔ ان کی رزم و بزم دونوں میں فرق عمل کا نہیں بلکہ صرف میدان عمل کا ہوتا ہے۔ اس سورہ کی آیت ۱۴ میں آپ نے پڑھا ہے کہ 'أَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِذِكْرِيٓ' (میرے ذکر کے لیے نماز کا اہتمام رکھنا) اور پھر اسی سورہ کی آیت ۴۲ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں حضرات کو فرعون کے دربار میں جانے اور ساتھ ہی اس بات کی ہدایت ہوتی ہے کہ 'وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي' (اور میرے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑنا) ظاہر ہے کہ اس ذکر سے مراد وہ انذار و تبلیغ ہی ہے جس کے لیے وہ فرعون کے پاس بھیجے جا رہے تھے۔

تسبیح اور ذکر میں ایک نازک فرق

تسبیح اور ذکر دونوں لفظوں کے ایک ساتھ ذکر کرنے میں ایک ادبی پہلو بھی ملحوظ ہے، وہ بھی نگاہ میں رہے۔ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور ذکر میں اثبات کا اور یہ نفی و اثبات دونوں خدا کے ساتھ صحیح تعلق کو استوار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ جو چیزیں خدا کی شان، اس کی صفات اور اس کی مرضیات و احکام کے منافی ہیں ان

کی نفی کی جائے اور جو چیزیں اس کی شان، اس کی صفات اور اس کے احکام کے موافق ہیں ان کا اثبات و اظہار کیا جائے۔ ان دونوں چیزوں سے مل کر مومن کا عقیدہ اور کردار بنتا ہے۔ اور نفی اثبات پر مقدم ہے۔ جب تک آپ ماسوی اللہ سے بغاوت کا اعلان نہیں کرتے اس وقت تک آپ اللہ کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ 'الا اللہ' سے پہلے 'لا الٰہ' کا اعلان ضروری ہے۔

دعا کے حق میں ایک سفارش

'اِنَّکَ کُنۡتَ بِنَا بَصِیۡرًا' یہ اپنی اس دعا کے حق میں اسی طرح کی سفارش ہے جس طرح کی سفارش حضرت زکریا نے اپنی دعا کے حق میں، 'مَا کُنۡتُ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا' کے الفاظ سے پیش کی ہے۔ سورۂ مریم کی تفسیر میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں آدمی کے لیے بہترین سفارش اس کا اپنا عمل نہیں ہے بلکہ خود خدا ہی کے فضل و کرم کا واسطہ ہے۔ جب بندہ اس اعتماد پر اپنے رب سے مانگتا ہے کہ جس نے بن مانگے سب کچھ بخشا ہے وہ بھلا مانگنے پر کس طرح محروم فرمائے گا تو رب کریم اپنے بندے کو محروم نہیں رکھتا۔ حضرت موسیٰ نے بھی اپنے اور اپنے بھائی کے ساتھ اپنے رب کے اسی معاملے کا حوالہ دیا ہے کہ جب تو ہمیشہ ہمارا نگرانِ حال رہا ہے تو اب جب کہ ہم تیرے ہی نام کی خاطر اٹھ رہے ہیں بھلا تیرے فضل و کرم سے کیوں محروم رہیں گے!

درخواست منظور!

'قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَکَ یٰمُوۡسٰی' 'سؤل' اور 'سوال' کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی درخواست اور التجا۔ ارشاد ہوا کہ موسیٰ! تمھاری درخواست منظور ہوئی۔ یہاں موسیٰ کے خطاب میں بھی بڑا پیار ہے اور منظوری کے الفاظ میں بھی بڑی شان جھلک رہی ہے۔ دعا کے الفاظ ختم ہوتے ہی بشارت سنا دی گئی کہ تمھاری عرضی منظور! گویا بیک جنبشِ قلم، بلا کسی توقف اور بلا کسی استثناء کے سب منظور! ظاہر ہے کہ اس منظوری میں ان کی وہ درخواست بھی شامل ہے جو انھوں نے اظہار و بیان کی قوت بخشے جانے کے لیے کی۔ وہ بھی ان کو عطا ہوئی اور حضرت ہارونؑ ان کے وزیر بھی بنا دیے گئے۔ دعا اگر صحیح مقصد کے لیے، صحیح وقت پر، سچے جذبے کے ساتھ کی جائے تو وہ خدا کی بارگاہ سے اسی طرح شرف قبولیت پاتی ہے!

وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡکَ مَرَّۃً اُخۡرٰۤی ۔ اِذۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّکَ مَا یُوۡحٰۤی ۔ اَنِ اقۡذِفِیۡہِ
فِی التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِیۡہِ فِی الۡیَمِّ فَلۡیُلۡقِہِ الۡیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاۡخُذۡہُ عَدُوٌّ لِّیۡ وَعَدُوٌّ لَّہٗ ؕ
وَاَلۡقَیۡتُ عَلَیۡکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیۡ ۚ وَلِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ (۳۷-۳۹)

ماضی کے ایک فضل خاص کی یاد دہانی

'وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡکَ الآیہ' حضرت موسیٰ کا اضطراب رفع کرنے کے لیے جس طرح ان کی دعا کی قبولیت کی بشارت سنائی گئی اسی طرح ان کے اوپر اپنے اس فضلِ خاص کی بھی یاد دہانی فرما دی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس وقت فرمایا جب ان کی ولادت ہوئی اور اس بات کا خطرہ تھا کہ فرعون اسرائیلی بچوں کے قتل کی جو ظالمانہ اسکیم[1]

---

[1] یہ ظالمانہ اسکیم جن سیاسی خطرات کی بنا پر فرعون اور اس کے درباریوں نے چلائی تھی ان کی وضاحت سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ اعراف آیات ۱۲۷-۱۴۱۔

حضرت موسیٰ کی حفاظت کے لیے خدائی انتظامات

چلا رہا ہے اس کی زد میں وہ بھی آجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت نہ صرف یہ کہ اپنی قدرت و حکمت سے حضرت موسیٰ کو بچایا بلکہ فرعون ہی سے ان کی پرورش کرائی۔ اس واقعہ کی یاددہانی سے مقصود یہ ہے کہ جس فرعون سے تمہاری حفاظت کے لیے خدا کی یہ شانیں ظاہر ہو چکی ہیں اس سے کوئی اندیشہ تمہارے دل میں کیوں خلجان کرے۔ تمہارا رب تمہارے ساتھ ہے۔

'اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّكَ مَا یُوْحٰٓی' یہ اس فضلِ خاص کی تفصیل بیان ہو رہی ہے کہ تمہاری حفاظت کے لیے ہم نے جو تدبیر پسند فرمائی اس کی وحی ہم نے تمہاری ماں کی طرف کی اور وہ وحی یہ تھی جو اب تمہیں وحی کی جا رہی ہے تاکہ تم پر واضح ہو جائے کہ ہم اس سے پہلے تمہارے اوپر اپنے کیسے بڑے بڑے فضل کر چکے ہیں۔ اگرچہ اس واقعہ کا اجمالی علم حضرت موسیٰ کو اپنی والدہ ماجدہ کے ذریعہ سے رہا ہوگا لیکن اس کے اندر دستِ غیب کی جو کارفرمائیاں تھیں ان کا پورا علم تو اس وحی کے ذریعہ ہی سے حضرت موسیٰ کو ہوا ہوگا۔ اسی بات کی طرف 'مَا یُوْحٰی' کا لفظ اشارہ کر رہا ہے۔

حضرت موسیٰ کی والدہ کو کیا وحی کی گئی؟

حضرت موسیٰ کی ماں کو جو وحی آئی وہ تو ظاہر ہے کہ القاء اور الہام کی نوعیت کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک بات ان کے دل میں ڈال دی اور انھیں یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ یہ خدا کی ڈالی ہوئی بات ہے 'اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ'۔ یہ وہ وحی ہے جو حضرت موسیٰ کی والدہ کو کی گئی۔ تورات کی کتاب خروج ۲: ۲-۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی ہے اس زمانے میں اسرائیلی بچوں کے قتل کی اسکیم بڑے زوروں سے چل رہی تھی۔ حضرت موسیٰ کی والدہ نے کچھ عرصہ تک (تورات کی روایت کے مطابق تین ماہ تک) تو بچے کو ظالموں سے چھپائے رکھا لیکن ان کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ اگر ظالم فرعونیوں کو پتہ چل گیا تو بچے کی خیر نہیں۔ تورات کی روایت یہ ہے کہ بالآخر انھوں نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور بچے کو اس میں ڈال کے ٹوکرے کو دریا کے کنارے پر جھاؤ کے نیچے رکھ دیا کہ شاید اس طرح کسی رحمدل کی نظر بچے پر پڑ جائے اور اس کی جان بچنے کی کوئی شکل نکل آئے۔ قرآن کا بیان یہ ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی ماں کے دل میں ڈالی کہ بچے کو ایک صندوق میں رکھ کر اس کو دریا میں ڈال دو اور اس باب میں کوئی فکر یا غم نہ کرو، ہم پھر بچے کو تمہاری طرف لوٹائیں گے اور اس کو اپنا رسول بنائیں گے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ بغیر اشارۂ غیبی کے حضرت موسیٰ کی والدہ آخر کس دل و جگر سے اتنا بڑا اقدام کر سکتی تھیں؟ اشارۂ غیبی کے بعد بھی نہ جانے ان کی مامتا پر کیا کچھ گزری ہوگی لیکن اس اشارۂ غیبی نے چونکہ یہ اطمینان بھی دلا دیا تھا کہ تم یہ کر گزرو، اللہ تعالیٰ بچے کی حفاظت کا سامان خود کرے گا، اس وجہ سے انھوں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر اس کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ سورۂ قصص آیت ۷ میں اس اشارۂ غیبی کی وضاحت یوں ہوئی ہے۔ 'فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ' (اور جب تمہیں اس کے باب میں اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو، اور نہ ڈریو نہ غم کیجیو، ہم پھر اس کو تمہاری طرف لوٹائیں گے

اور اس کو اپنے رسولوں میں سے بنائیں گے) اس اقدام کے وقت حضرت موسیٰ کی والدہ کے دل پر جو کچھ گزری ہے اس کی وضاحت سورۂ قصص کی تفسیر میں انشاء اللہ ہم کریں گے۔

'فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ': یہ اس وحی کا جزو نہیں ہے جو حضرت موسیٰ کی ماں کو ہوئی۔ اگر یہ بات بھی وحی میں شامل ہوتی تو اس کی صورت جواب امر کی ہوتی حالانکہ 'فَلْيُلْقِهِ' پر لام امر ہے اس وجہ سے یہ امر غائب ہے۔ جن لوگوں نے اس کا ترجمہ جواب امر کا کیا ہے ان کا ترجمہ بالکل غلط ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا "پس چاہیے کہ دریا اس کو کنارے پر ڈال دے" یعنی والدۂ حضرت موسیٰ کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ وحی کی کہ بچے کو صندوق میں رکھ کے دریا کے حوالہ کر دو اور دریا کو یہ حکم فرمایا کہ وہ اس کو کنارے پر ڈال دے، اس کو وہ اٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے۔ یہ حضرت موسیٰ پر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت اور اپنی شان و تدبیر کا اظہار فرمایا ہے کہ ہم نے تمھاری حفاظت و پرورش کے لیے اپنی یہ شان دکھائی کہ تمھاری ماں سے تمھیں دریا کی موجوں کے حوالہ کرایا اور پھر لوں چاہا کہ دریا تمھیں ساحل پر ڈال دے اور اس طرح میرا اور تمھارا دونوں کا جو دشمن ہے یعنی فرعون وہ تمھاری پرورش کرے۔ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

قدرت کا کرشمہ

'عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ': میں خدا کے کمال تصرف کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور حضرت موسیٰ دونوں کے دشمن سے حضرت موسیٰ کی حفاظت و پرورش کرائی۔ خدا کا دشمن تو وہ اس وجہ سے تھا کہ وہ خود خدائی کا مدعی تھا، بھلا وہ اپنے سوا کسی اور خدا کو کس طرح گوارا کر سکتا تھا اور حضرت موسیٰ کے ساتھ اس کو جو دشمنی تھی اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ پھر یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور حضرت موسیٰ دونوں کے دشمن سے حضرت موسیٰ کی پرورش کرائی بلکہ اس کی تدبیر و حکمت کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ اس نے فرعون سے اس کے اور اس کی قوم کے سب سے بڑے دشمن کی پرورش کرائی اور فرعون نے خود اپنے ہی ہاتھوں اس خطرے کا سامان کیا جس سے بچنے کے لیے اس نے نہ جانے کیا کیا جتن کیے!

حضرت موسیٰ پر محبتِ الٰہی کا پرتو

'وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي': یہ وہ خدائی تدبیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنے اور ان کے، دونوں کے دشمن کی نگاہوں میں محبوب بنا دینے کے لیے فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ ہم نے تم پر اپنی محبت کا ایک پرتو ڈال دیا۔ بچہ تو یوں ہی موہنا ہوتا ہے، ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر اس کو دیکھ کر شفقت پیدا ہوتی ہے۔ اور حضرت موسیٰ تو، تورات کی روایات سے ثابت ہے کہ نہایت خوب صورت بھی تھے[1] پھر مزید لطف خداوندی یہ ہوا کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس بچے کے موہنے پن کا جس پر محبتِ الٰہی کا پرتو ہو! ایک ایسا موہنا بچہ جب وہ سرکنڈوں کی ایک ٹوکری میں، دریا کی موجوں کا پھینکا ہوا، یکہ و تنہا، معصومیت و دل آویزی کی مورت بنا ہوا پڑا ہو تو آخر کس کا دل اس کو دیکھ کر تڑپ نہیں

---

[1] ملاحظہ ہو خروج ۲:۲۔ عبرانیوں ۱۱:۲۳۔ اعمال ۷:۲۰

جلئے گا! فرعون آخر فرعون ہی تھا، کوئی پتھر تو نہیں تھا! چنانچہ یوں ہوا کہ فرعون اور اس کی بیوی نیل کے کنارے سیر کو نکلے، ان کی نظر ٹوکرے پر پڑ گئی۔ اس میں انھوں نے ایک چاند سے بچے کو دیکھا۔ سمجھ گئے کہ یہ کسی اسرائیلی کا بچہ ہے جس کو غالباً اس کے ماں باپ نے، اس کے قتل کے اندیشہ سے، تن بہ تقدیر، دریا کی موجوں کے حوالہ کر دیا ہے کہ شاید اسی راہ سے اس کے بچاؤ کی کوئی شکل پیدا ہو جائے۔ بچہ کو دیکھ کر ان کے دل میں رحم پیدا ہو گیا۔ اس رحم میں بھی زیادہ دخل فرعون کی بیوی کو تھا۔ عورتیں یوں بھی فطرۃً بچوں کے معاملے میں بڑی رحمدل ہوتی ہیں اور فرعون کی یہ بیوی تو، جیسا کہ سورۂ تحریم کی آیت ۱۱ سے ثابت ہے نہایت خدا ترس اور رحم دل بی بی تھیں۔ بہر حال اس خدائی تدبیر سے، دریائے نیل میں پھینکے ہوئے حضرت موسیٰؑ، اسی فرعون کے محل میں پرورش کے لیے پہنچ گئے، جس کے ڈر سے ان کی ماں نے اپنی آغوش سے جدا کر کے ان کو دریا کی آغوش میں دیا تھا!

'وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ' یہاں حرفِ عطف بربنائے قرینہ دلیل ہے کہ اس کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ ہم نے تم پر اپنی محبت کا پرتو اس لیے ڈالا کہ تم سے تمھارے دشمن محبت کریں اور تمھاری پرورش خاص ہماری نگرانی میں، ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی محبت کا یہ پرتو ہی تھا جو حضرت موسیٰؑ کا محافظ بنا اور اس محافظ نے اس طرح ان کو محفوظ کر دیا کہ ان کو نہ صرف یہ کہ اپنے جانی دشمن سے کوئی خطرہ نہیں رہا بلکہ وہ دشمن ان کا گرویدہ بن گیا۔ اسی محافظِ محبت کو اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی آنکھ سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا اپنی محبت کا پرتو ڈال کر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر اپنی حفاظت کا پہرہ بٹھا دیا۔

اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی مَنْ یَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓی اُمِّكَ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّیْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۬ؕ فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ فِیْٓ اَهْلِ مَدْیَنَ ؕ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (۴۰)

اس آیت میں حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا ایک بہت بڑا حصہ سمیٹ دیا گیا ہے۔ جن باتوں کی تذکیر اس موقع پر ضروری نہیں تھی ان کو حذف کر کے صرف چند باتوں کی طرف اجمالی اشارہ ہے اور پھر آگے سلسلۂ کلام اصل موضوع بحث سے مربوط ہو گیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے اپنی ماں کی طرف لوٹائے جانے کے لیے خدائی تدبیر

'اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُكَ ...... الآیۃ' یہ اس تدبیر کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے دریا میں ڈالے جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو ان کی ماں کی طرف لوٹائے جانے کے لیے اختیار فرمائی۔ اوپر سورۂ قصص آیت ۷ کے حوالہ سے گزر

---

[1] تورات میں فرعون کی بیوی کے بجائے اس کی لڑکی کا ذکر آتا ہے کہ وہ اور اس کی سہیلیاں بچہ کو اٹھا کر لائیں۔ قرآن نے اس کی تصحیح کر دی۔ اس کی وضاحت کے لیے سورۂ قصص آیت ۹ کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔

چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی والدہ کو جب یہ ہدایت فرمائی کہ بچہ کو دریا میں ڈال دو تو ساتھ ہی یہ اطمینان بھی دلادیا کہ ہم بچے کو پھر تمہارے پاس واپس لائیں گے۔ یہ وعدہ جس شکل میں پورا ہوا یہاں اس کی طرف سرسری اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ قصص کی آیات ۹-۱۳ میں یوں آئی ہے کہ جب فرعون کی بیوی نے بچہ کو دیکھا تو انھوں نے فرعون سے کہا کہ بڑا موہنا بچہ ہے۔ اس کو قتل نہ ہونے دو۔ یہ میری اور تمہاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ ہمارے کام آئے گا یا ہم اس کو اپنا لے پالک بنالیں گے۔ ادھر والدۂ حضرت موسیٰ کا یہ حال تھا کہ انھوں نے بچے کو ایمائے خداوندی سے دریا میں ڈال تو دیا لیکن غم سے کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کی بہن سے کہا کہ وہ دیکھتی رہیں کہ صندوق کدھر بہہ کے جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظر بچا کر اس کو دیکھتی رہیں۔ بالآخر ان کو معلوم ہو گیا کہ صندوق فرعون کے محل کے پاس پہنچا اور وہاں دریا نے اس کو کنارے پر ڈال دیا اور فرعون اور اس کی بیوی نے بچہ کو اٹھا لیا۔ حضرت موسیٰ کی بہن فرعون کے محل میں پہنچیں۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ بچے کو کسی دایہ کا دودھ پلانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن بچہ مچلا ہوا ہے، وہ کسی کی چھاتی منہ ہی سے نہیں لگاتا۔ حضرت موسیٰؑ کی بہن نے فرعون کی بیوی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر آپ لوگ کہیں تو میں ایک ایسے گھر والوں کا پتہ دے سکتی ہوں جو اس بچے کی نہایت اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے اور بچے کو مانوس کر لیں گے۔ چونکہ حضرت موسیٰ کے دودھ نہ پینے کے سبب سے فرعون اور اس کے گھر والوں کو نہایت پریشانی تھی اس وجہ سے یہ تجویز مان لی گئی اور اس طرح حضرت موسیٰ پھر اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گئے۔

تورات میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔

> "تب اس کی بہن نے فرعون کی بیٹی کو کہا کہ کہیے تو میں جا کے عبرانی عورتوں میں سے ایک دائی تجھ پاس لے آؤں تاکہ وہ تیرے لیے اس لڑکے کو دودھ پلائے۔ فرعون کی بیٹی نے اسے کہا کہ جا۔ وہ چھوکری گئی اور لڑکے کی ماں کو بلایا۔ فرعون کی بیٹی نے اس سے کہا کہ اس لڑکے کو لے اور اسے میرے لیے دودھ پلا، میں تجھے اجرت دوں گی۔ اس عورت نے لڑکے کو لیا اور دودھ پلایا" خروج ۲: ۷-۹

تورات اور قرآن کے بیان میں جو فرق ہے اس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ذی فہم آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن کا بیان ہر اعتبار سے قرینِ عقل و فطرت ہے۔ افسوس ہے کہ تورات والے اپنے گھر کی باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

یہاں اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ میں صیغے مضارع کے استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی بہن کو بار بار فرعون کی بیوی کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے پاس آنا جانا پڑا تب وہ اپنی تجویز پر ان کو راضی کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ اس طرح حضرت موسیٰؑ دوبارہ اپنی ماں کے پاس پہنچے اور ماں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ میں نے ترجمہ میں مضارع کے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور عربیت کے اس قاعدہ کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ اگر اردو میں مدعا ٹھیک ادا نہ ہوا ہو

تو اس کو میرے قلم کی کوتاہی پر محمول کیجیے۔

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۥ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۥ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰي قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۴۰

قبطی کے قتل کا واقعہ

دریا سے نکالے جانے کے بعد سے لے کر عہد جوانی تک حضرت موسیٰؑ نے جن حالات میں زندگی گزاری ان میں سے یہاں صرف قبطی کے قتل اور ان کے مدین جانے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اشارہ بھی اسی مقصد کے لیے ہے جس مقصد سے اوپر والے واقعہ کی یاد دہانی کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اطمینان ہو جائے کہ جس رب نے ان کی ایسے خطرناک اور نامساعد حالات میں مدد اور رہنمائی فرمائی ہے وہ آگے کے مراحل میں بھی مدد اور رہنمائی فرمائے گا۔ یہاں چونکہ واقعات کی طرف صرف اجمالی اشارہ ہے اس وجہ سے ہم سورۂ قصص کی روشنی میں ان کی تفصیل کیے دیتے ہیں۔ یہ تفصیل ہم اپنے الفاظ میں کریں گے۔ آیات کی وضاحت اور ان کی مشکلات کی تحقیق انشاء اللہ اپنے محل میں آئے گی۔ قصص کی آیات ۱۴-۲۹ سامنے رکھیے۔ ان کی روشنی میں صورت واقعہ یوں سامنے آتی ہے۔

ان آیات کے اجمال کی وضاحت سورۂ قصص کی روشنی میں

حضرت موسیٰؑ جب جوان ہوئے اور ان کو عقل و علم کی روشنی حاصل ہوئی تو ان کو اپنی قوم کی ذلت و مظلومیت کا نہایت شدت کے ساتھ احساس ہوا۔ بنی اسرائیل کی حیثیت مصر میں غلاموں کی تھی اس وجہ سے ان کی بستی بھی اصل شہر سے الگ بسائی گئی تھی۔ اسرائیلی صرف خدمت اور بیگار کے لیے شہر جاتے اور وہاں اپنے قبطی آقاؤں کے ہاتھوں بری طرح پٹتے اور ذلیل ہوتے۔ حضرت موسیٰؑ کی غیرت ان مناظر کو دیکھ کر جوش میں آجاتی اور بسا اوقات اپنے مظلوم ہم قوموں کی حمایت میں وہ سینہ سپر ہو جاتے۔ فرعونیوں کو اندیشہ ہوا کہ اگر اسرائیلیوں کو ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی لیڈر مل گیا تو وہ دلیر ہو جائیں گے اور پھر ان کی آقائی خطرے میں پڑ جائے گی اس وجہ سے وہ حضرت موسیٰؑ کے دشمن ہو گئے اور غالباً حکومت نے ان کا داخلہ بھی شہر میں بند کر دیا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ دشمنوں کی نظر بچا کر اپنے ہم قوموں کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے شہر میں جاتے۔ ایک دن اسی طرح نظر بچا کر وہ شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور ایک قبطی آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰؑ سے فریاد کی۔ حضرت موسیٰؑ کی غیرت کو جوش آگیا۔ انھوں نے اسرائیلی کی مدد کرنی چاہی تو قبطی ان سے الجھ پڑا۔ حضرت موسیٰؑ آدمی تگڑے تھے۔ انھوں نے جو ایک گھونسا رسید کیا تو وہ کہیں بے ڈھب پڑا اور قبطی وہیں ڈھیر ہو کے رہ گیا۔

حضرت موسیٰؑ کو اس حادثہ کا بڑا غم ہوا کہ بلا قصد ان کے ہاتھوں ایک ایسا جرم صادر ہو گیا جس پر وہ عند اللہ مسئول ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے بہت استغفار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی غلطی معاف کر دی۔ اللہ تعالیٰ کے اس انعام پر انھوں نے عہد کیا کہ آئندہ میں کبھی مجرموں کا حمایتی نہیں بنوں گا۔ دوسرے دن پھر نظر بچا کر شہر پہنچے تو دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل طالب مدد ہوا تھا آج پھر ایک قبطی سے لڑ رہا ہے۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کو دیکھا تو ان سے مدد کا طالب ہوا لیکن حضرت موسیٰؑ نے اس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی معلوم

ہوتے ہوا تاہم وہ بڑھے کہ قبطی کو پکڑیں اور دونوں میں بیچ بچاؤ کرا دیں۔ اسرائیلی یہ سمجھا کہ آج وہ اسے غلطی پر سمجھ کر پکڑنا چاہتے ہیں۔ وہ ڈرا کہیں آج حضرت موسیٰؑ کا گھونسا اس پر نہ پڑ جائے ورنہ اس کی جان کی بھی خیر نہیں ہے۔ وہ چلایا کہ موسیٰؑ! کل تم نے ایک جان لی ہے، کیا آج میری جان بھی لینے کا ارادہ ہے! اگر تم نے یہ روش اختیار کی ہے تو یہ تو کسی مصلح کی روش نہیں ہوئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ملک میں ایک ڈکٹیٹر بننے کا ارادہ رکھتے ہو۔[1]

اس سے حضرت موسیٰؑ کو یہ اندازہ ہو گیا کہ قبطی کے قتل کا واقعہ راز نہیں رہا ہے۔ پھر مزید برآں یہ ہوا کہ اکناف شہر سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا اور اس نے حضرت موسیٰؑ کو یہ خبر دی کہ اعیانِ حکومت آپ کے قتل کے منصوبے بنا رہے ہیں تو میرا خیر خواہانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ یہاں سے نکل جائیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اس وقت ظالموں کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا فرمائی اور خدا کی رہنمائی و کارسازی کے بھروسہ پر مدین کا رخ کیا۔ مدین کے ایک چشمے پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرے تو دیکھا کہ کچھ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں لیکن دو عورتیں اپنے گلے کو روکے ہوئے کھڑی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے اندر جذبۂ فتوت ابھرا اور انھوں نے ان سے پوچھا کہ آخر تم کیوں اپنے گلے کو روکے ہوئے کھڑی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے باپ بوڑھے ہیں، گلے کی چرواہی ہمیں کرنی پڑ رہی ہے اور ہم اس ریل پیل میں اپنے گلے کو پانی نہیں پلا سکتیں اس وجہ سے ہمیں دوسرے چرواہوں کے فارغ ہونے تک اپنی باری کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان کی یہ بات سن کر حضرت موسیٰؑ کے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی۔ وہ اٹھے۔ ان کے گلے کو پانی پلایا اور پھر آ کر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے اور یہ دعا کی کہ اے رب اس وقت تو مجھ پر اپنی جو رحمت نازل فرمائے، میں اس کا محتاج ہوں!

یہ دونوں صاحبزادیاں حضرت شعیبؑ کی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک صاحبزادی شرماتی ہوئی حضرت موسیٰؑ کے پاس آئیں اور فرمایا کہ آپ کو ہمارے والد بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے گلے کو جو پانی پلایا ہے اس کا معاوضہ دیں۔ حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنی ساری روداد سنائی۔ حضرت شعیبؑ نے ان کو تسلی دی کہ بس اب کوئی فکر نہ کرو، اللہ نے تم کو ظالموں سے نجات بخشی۔

حضرت شعیبؑ کی ایک صاحبزادی نے باپ سے سفارش کی کہ آپ ان کو اپنی خدمت میں لگا لیجیے، یہ ایک قوی اور امانت دار آدمی نظر آتے ہیں، امید ہے کہ نہایت بہتر خدمت کرنے والے ثابت ہوں گے۔

حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ میں اپنی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمھارے

---

[1] اس سوال پر انشاءاللہ ہم سورۂ قصص میں بحث کریں گے کہ یہ بات قبطی نے کہی یا اسرائیلی ہی اپنی حماقت کے سبب سے کہہ بیٹھا۔ یہاں مقصود صرف واقعہ کو سادہ طریقہ پر پیش کر دینا ہے تاکہ آیت زیر بحث کے مضمرات روشنی میں آ جائیں۔

ساتھ اس شرط پر کر دینا چاہتا ہوں کہ تم آٹھ سال میری خدمت کرو اور اگر تم نے دس سال پورے کر دیے تو اس کا انحصار تمہاری مرضی پر ہے۔ اس معاملے میں تم پر میں کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گا اور انشاء اللہ تم مجھے ایک بہتر آدمی پاؤ گے۔

حضرت موسیٰؑ نے یہ بات منظور کر لی اور فرمایا کہ یہ معاہدہ میرے اور آپ کے درمیان طے ہے۔ یہ میری مرضی پر ہے کہ میں آٹھ سال آپ کی خدمت کروں یا دس سال۔ اس معاملے میں مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ اس معاہدے پر ہم دونوں اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں۔

معاہدہ کی یہ مدت پوری کر کے جب حضرت موسیٰؑ مصر کے لیے واپس ہوتے تب طور کی وادی ایمن میں ان کو وہ تجلی نظر آئی جس کو دیکھ کر وہ آگ لینے گئے اور نبوت لے کر لوٹے۔

سورۂ قصص کی یہ ساری تفصیل اس لیے ہم نے پیش کی ہے کہ سورۂ طٰہٰ کی زیر بحث آیت میں یہ پوری تفصیل سمیٹ دی گئی ہے۔ جب تک یہ تفصیل سامنے نہ ہو آیت کا پورا ماله و ما علیہ سامنے نہیں آتا۔ اب آیت کے اجزا پر غور کیجیے۔

حضرت موسیٰ کے غم اور ان کی لغزش کی نوعیت

'وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ' مصری کے قتل کا واقعہ جن حالات میں پیش آیا ہے وہ اوپر کی تشریحات سے واضح ہو چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ قتل کا ارادہ رکھتے تھے اور نہ مظلوم کی حمایت کے سوا ان کے اندر کوئی اور جذبہ تھا۔ یہ جذبہ ایک نہایت محمود اور اعلیٰ جذبہ ہے جو ہر اس شخص کے اندر ہوتا ہے جو فتوت و شرافت اور حمیت و غیرت سے خالی نہیں ہے۔ اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے جو کچھ کیا وہ بجائے خود حق تھا۔ لیکن قضائے الٰہی سے ان کا گھونسا کچھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ مصری اس کی تاب نہ لا سکا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ کو خیال ہوا کہ یہ فعل بلا ارادہ سہی لیکن ان سے ایسا کام صادر ہو گیا ہے جس پر عنداللہ ان سے مواخذہ ہو سکتا ہے۔ اس تصور نے ان کو ایک شدید غم میں مبتلا کر دیا۔ جن کے اندر خدا کا خوف ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو الاؤنس دینے میں بہت فیاض نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنا احتساب ان چیزوں پر بھی کرتے ہیں جن کے لیے وہ چاہیں تو آسانی سے عذر تلاش کر سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کسی بے جا قومی عصبیت میں بھی مبتلا نہیں تھے اس وجہ سے انھیں یہ غم بھی ہوا ہو گا کہ ممکن ہے جس کی حمیت و حمایت میں ان سے یہ فعل صادر ہوا، زیادتی اسی کی رہی ہو۔ چنانچہ اوپر کی تفصیلات میں آپ نے دیکھا کہ جب دوسرے دن اسی اسرائیلی کو ایک دوسرے مصری سے انھوں نے لڑتے دیکھا اور وہ پھر ان سے طالب مدد ہوا تو انھوں نے اس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی ہو۔ اگر حضرت موسیٰؑ کے اندر قوم پرستی کا پندار ہوتا تو غم تو درکنار ان کو فخر ہوتا کہ اپنی قوم کی حمایت میں انھوں نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن یہ چیز بھی نہیں تھی جو ان کے لیے وجہ تسلی بن سکے اس وجہ سے انھیں اس حادثہ کا غم ہوا اور انھوں نے اپنے رب سے معافی مانگی۔ اللہ نے ان کو معاف فرمایا اور اس معافی نے ان کو اس غم سے نجات دی۔

ہمارے نزدیک اس غم میں حکومت کے انتقام کے خوف کو اگر کوئی دخل رہا ہوگا تو صرف اس پہلو سے رہا ہوگا کہ حکومت ایک نہایت ظالم حکومت تھی جس سے کسی اسرائیلی کے لیے کسی انصاف کی توقع نہیں تھی۔ اگر کوئی عادل حکومت ہوتی تو حضرت موسیٰؑ سارا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیتے اور اس کے فیصلہ کی پابندی کرتے لیکن فرعون جیسی ظالم حکومت کے اپنے آپ کو حوالہ کرنا بالکل خودکشی کے مترادف تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال بھی حضرت موسیٰؑ کے لیے باعثِ غم ہوئی ہوگی۔ اس غم سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے بالآخر وطن کو چھوڑا اور مدین چلے گئے۔

جہاں تک اس لغزش کے صدور کا تعلق ہے، اس کے بارے میں متعدد مقامات میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاؑ سے، بعثت سے پہلے یا بعثت کے بعد اگر کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ اتباعِ ہوا کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ وہ اتباعِ حق یا طلبِ حق کے جوش میں کبھی کبھی اس کی مطلوبہ حد سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے لیکن حضرات انبیاؑ چونکہ حق کی کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت فرماتا ہے تاکہ میزان بالکل درست رہے۔ حضرت موسیٰؑ کی یہ لغزش بھی فی حقیقت ایک نیکی تھی لیکن نیکی بھی اپنے حدود سے متجاوز ہو جائے تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بعض اوقات قابلِ گرفت بن جاتی ہے، بالخصوص حضرات انبیاؑ کے بارے میں۔

حضرت موسیٰؑ کے امتحانات

وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا۔ فتن فتونا کے معنی جانچنے اور پرکھنے کے ہیں۔ سنار سونے کو کٹھالی میں ڈال کر اس کے کھوٹ کو جو الگ کرتا ہے یہ لفظ اس کے لیے بھی آتا ہے۔ یہی لفظ اللہ تعالیٰ نے ان امتحانات کے لیے استعمال کیا ہے جن میں اس نے حضرت موسیٰؑ کو ڈال کر اچھی طرح پرکھا تاکہ جس کارِ خاص کے لیے وہ ان کو منتخب فرمانا چاہتا ہے اس کے وہ پوری طرح اہل بن جائیں۔ مصر میں ان کی زندگی، جیسی پُرمحن تھی اور وہاں سے جن پُرخطر حالات میں وہ نکلے ہیں ان کا کچھ اندازہ تو اوپر کے اقتباس سے ہو ہی گیا، مدین جا کر، آٹھ یا دس سال، وہاں کے پہاڑوں اور جنگلوں میں حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں۔ وہاں سے نکلے تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ رسالت کا بارِ عظیم ان پر ڈالا گیا۔ اس کے بعد جو زہرہ گداز حالات پیش آئے وہ اعراف میں بھی آپ پڑھ آئے ہیں، اس سورہ میں بھی پڑھیں گے اور آگے قصص اور دوسری سورتوں میں بھی۔ غرض ولادت سے لے کر آخر لمحۂ زندگی تک امتحانوں ہی سے سابقہ رہا اور وہ بھی ایک سے ایک بڑھ کر!

امتحانات تربیت کا لازمہ ہیں

ان امتحانوں سے متعلق ایک حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے کہ یہ انسان کی تعلیم و تربیت کا لازمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کے ذریعہ سے انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اس وجہ سے یہ بجائے خود بھاگنے اور گھبرانے کی چیز نہیں ہیں۔ جو شخص ان سے گھبراتا اور بھاگتا ہے وہ گویا اپنی تربیت سے گھبراتا اور بھاگتا ہے۔ ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی چیز ہے تو یہ نہیں ہے کہ امتحان پیش آیا بلکہ یہ ہے کہ اس امتحان میں وہ کہیں ناکام نہ رہ جائے۔

امتحانات کے بارے میں سنتِ الٰہی

یہ امتحانات صرف مشکلات و مصائب ہی کی راہ سے پیش نہیں آتے بلکہ انعامات و افضال کی شکل میں بھی پیش آتے ہیں۔ مصائب و مشکلات کے امتحانات میں اللہ تعالیٰ بندے کے صبر کی تربیت فرمانا چاہتا ہے اور انعامات و افضال کے امتحان میں اس کے شکر کو پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ اور اسی صبر و شکر پر تمام اعلیٰ صفاتِ انسانی کا انحصار ہے۔ انہی دونوں صفتوں کی تکمیل سے دنیا میں نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی حاصل ہوتی ہے اور پھر اسی کا ثمرہ وہ ابدی بادشاہی ہے جس کو قرآن نے 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

حکمتِ قرآن کا ایک دقیق مسئلہ

حکمتِ قرآن کا ایک دقیق مسئلہ یہ بھی ہے کہ صبر اور شکر کے امتحانوں میں سے زیادہ مشکل صبر کا امتحان ہے یا شکر کا؟ اس باب میں عارفین کی رائے مختلف ہے۔ میرا اپنا رجحان، قرآن کی روشنی میں، یہ ہے کہ شکر کا امتحان زیادہ مشکل ہے۔ اس میں پاس ہونے والوں کا اوسط بہت کم ہے۔ مصائب میں حق پر ثابت قدم رہنے والے تو کچھ نکل آتے ہیں لیکن نعمت پا کر بہکنے سے محفوظ رہنے والے بہت کم نکلتے ہیں۔ 'وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ' (سبا-۱۳) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ جتنے ہی اعلیٰ مراتب پر فائز فرمانا چاہتا ہے ان کے امتحانات بھی اتنے ہی زیادہ اور اتنے ہی سخت ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرات انبیائے کرام کو جو امتحانات پیش آئے ہیں ان کی تفصیلات پڑھیے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہم اور آپ تو ان کے برداشت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے!

اصل ڈرنے کی چیز

ان امتحانوں کے معاملے میں اصل ڈرنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ امتحان پیش آئے یا پیش آئیں گے بلکہ ایک تو وہی چیز ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ انسان اس بات سے ڈرے کہ مبادا کسی امتحان میں وہ فیل ہو جائے اور دوسری بات، اس سے بھی زیادہ ڈرنے کی یہ ہے کہ مبادا وہ سرے سے امتحان ہی سے خارج کر دیا جائے اس لیے کہ سنتِ الٰہی یہ بھی ہے کہ جو شخص بار بار فیل ہی ہوتا رہتا ہے بسا اوقات اللہ تعالیٰ اس کو اپنے امتحان ہی سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کو 'امہال' کہتے ہیں اور یہ سخت ترین سزا ہے جو اس دنیا میں کسی فرد یا قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے ابد کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

مدین میں قیام کی مدت

'فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ'۔ یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ مدین میں کتنے سال رہے لیکن اوپر سورۂ قصص کی روشنی میں ہم نے جو تفصیلات پیش کی ہیں ان سے واضح ہے کہ اس معاہدے کے تحت، جو حضرت شعیبؑ کے ساتھ انھوں نے کیا، کم از کم آٹھ سال یا زیادہ سے زیادہ دس سال وہاں انھوں نے گزارے اور اس دوران میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کی بکریاں چرائیں۔

مرحلۂ نبوت

'ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ' (۴۰) اوپر کے تمام حالات و واقعات کا حوالہ دینے کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ جو کچھ ہوا ہماری سکیم اور ہمارے مقرر کیے ہوئے پروگرام کے مطابق ہوا اور ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے ٹھیک

اس وقت پر، جو ہم نے تمھاری یہاں کی حاضری کے لیے پہلے سے مقرر کر رکھا تھا، تم یہاں پہنچے اور ہم نے تمھیں اپنی نبوت و رسالت سے مشرف کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے تمھاری ولادت سے لے کر اب تک ہر مرحلہ میں تمھاری حفاظت کی ہے اور تمھارے لیے اپنے منصوبے تمھارے اور اپنے دونوں کے دشمنوں سے پورے کرائے ہیں وہ ہر قدم پر تمھارے ساتھ ہے اور جو ذمہ داری وہ تمھارے سپرد کر رہا ہے اس کے ادا کرنے کے لیے وہ خود راہیں کھولے گا اور خود اسباب فراہم فرمائے گا۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۴۱)

'اِصْطِنَاع' کا اصل مفہوم کسی کو کسی خاص مقصد کے لیے تربیت اور ٹریننگ دینے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے جو تمھیں اتنی بھٹیوں میں تپایا اور اتنے امتحانوں سے گزارا ہے تو اپنے ایک کارِ خاص کے لیے یہ تمھاری تربیت کی ہے اور اب وہ کارِ خاص میں تمھارے سپرد کر رہا ہوں سو تم اس ذمہ داری کو اٹھاؤ اور میرے اعتماد پر اس کی انجام دہی کے لیے آگے بڑھو۔

اِذْهَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ بِآيَاتِي وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي (۴۲)

یہ اس حکم کا اعادہ ہے جو آیت ۲۴ میں دیا گیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اس کو انذار کرو۔ بیچ کی آیات حضرت موسیٰ کی تسکین و تسلی کے لیے ہیں۔ ان کی دعا کی قبولیت کی بشارت اور ان پر سابق افضال و عنایات کا حوالہ دینے کے بعد پھر ہدایت ہوئی کہ میری نشانیوں کے ساتھ بے خوف و خطر، فرعون کے پاس جاؤ۔ پہلے صرف حضرت موسیٰ کو حکم ہوا تھا لیکن اب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں کو حکم ہوا اس لیے کہ حضرت موسیٰ کی درخواست پر حضرت ہارون بھی شریکِ نبوت بنا دیے گئے تھے۔

ذکر سے مراد

'وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي'۔ اسی ہدایت کی تاکید مزید ہے جو آیت ۳۴ میں دی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑنا۔ ذکر سے مراد، جیسا کہ آیت ۳۴ کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں، ذکرِ عبادت و ذکرِ دعوت دونوں ہی ہے۔ نبی کا ہر کام ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔ وہ جب نماز پڑھتا ہے تو اس کے ذریعہ سے درحقیقت اس تذکیر کے لیے اللہ تعالیٰ سے قوت و معرفت حاصل کرتا ہے جو وہ خلق کو کرتا ہے۔ دعوتِ حق کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی سرچشمہ سے اس کو غذا اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس سرچشمہ سے تعلق کمزور ہو جائے تو دعوت بے جان اور بے روح ہو جاتی ہے اور اگر اس سرچشمہ سے تعلق بالکل ہی منقطع ہو جائے تو پھر وہ دعوت بالکل شیطانی دعوت بن کے رہ جاتی ہے اگرچہ اس میں نام خدا ہی کا لیا جائے۔

اِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (۴۳)

فرعون کے طغیان کی تفصیل آیت ۲۴ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ خطاب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں سے ہے اس وجہ سے لازماً یہ بات بعد کے مرحلہ کی ہے جب حضرت موسیٰ مصر پہنچ چکے ہیں اس لیے کہ حضرت ہارون وادیٔ طویٰ میں حضرت موسیٰ کے ساتھ نہیں تھے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (۴۴)

انبیاء کا طریقِ دعوت

یہ طریقِ دعوت سے متعلق ہدایت ہے کہ دعوت بہرحال نرمی کے ساتھ دی جائے۔ اس ہدایت کی ضرورت صرف اس پہلو سے نہیں تھی کہ اب حضرت موسیٰؑ فرعون کے سامنے ایک بے بس اسرائیلی کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے ایک سفیر کی حیثیت سے جا رہے تھے اور ہاتھ میں عصائے موسوی بھی تھا بلکہ لینت اور نرمی دعوتِ حق کی فطرت ہے۔ حضرات انبیاء کی بعثت تعلیم و اصلاح کے لیے ہوئی اس وجہ سے ان کی دعوت اور ان کے انذار میں ایک معلم کی شفقت اور ایک غمگسار کی دل سوزی ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔ کسی نبی کے متعلق بھی یہ بات علم میں نہیں آئی کہ اس نے ہیکڑی جتائی اور دھونس جمائی ہو۔ سخت سے سخت حالات میں بھی ان کا طرزِ خطاب اور اندازِ جواب نہایت ہی نرم، مؤثر اور ہمدردانہ رہا ہے۔ ہیکڑی جتانا اور دھونس جمانا دنیا پرست لیڈروں کی خصوصیات میں سے ہے۔ موجودہ زمانے کے شیطانی پروپیگنڈے کی تو سمجھیے ساری بنیاد ہی اسی پر ہے۔

دعوتِ انبیاء کا اصل مقصد

'لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى'۔ حضرات انبیاء کی دعوت و تعلیم کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ مخاطب میں تذکر اور 'خشیت' پیدا ہو۔ جن کے اندر صرف غفلت ہوتی ہے وہ تو نبی کی تذکیر سے فوراً جاگ پڑتے ہیں۔ وہ گویا راستہ بھولے ہوئے ہوتے ہیں، بتانے والے نے جوں ہی ان کو بتا دیا وہ سیدھی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسرے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی گمراہی کچھ پختہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے اندر، اگر ان کے اندر قبولیتِ حق کی کچھ صلاحیت ہوتی ہے، نبی کے انذار سے خدا اور اس کی پکڑ کا کچھ خوف پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہوتی ہے تو وہ ہدایت کی راہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں 'يَتَذَكَّرُ' سے پہلی حالت کی طرف اشارہ ہے اور 'يَخْشٰى' سے دوسری حالت کی طرف۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى (۴۵)

ایک اندیشہ کا اظہار

دونوں ہی حضرات نے یہ عرض کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ معاملہ پر غور کرنے سے پہلے ہی یا تو ہم پر ہاتھ ڈال دے گا یا یہ ہوگا کہ ہماری بات سنتے ہی، برہم ہو کر، اس ظلم و ستم میں اور اضافہ کر دے گا جو وہ اب تک بنی اسرائیل پر کرتا رہا ہے۔ 'فرط' کا صلہ جب 'علیٰ' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی کے خلاف عاجلانہ اقدام کے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون تو پہلے ہی غصہ سے بھرا بیٹھا ہے۔ بھلا وہ ہمیں زبان کھولنے کی اجازت کب دے گا! وہ بات سننے سے پہلے ہی یا تو ہمیں ختم کر دینے کی تدبیر کرے گا یا اس کی سرکشی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہاں دعا میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں شریک ہیں۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے جس کا ذکر آیت ۴۳ کے تحت ہم نے کیا ہے کہ یہ ہدایات مصر پہنچنے کے بعد دی گئی ہیں جب حضرت ہارونؑ بھی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہو گئے ہیں۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى (۴۶)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی

اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں اور سب کچھ سنتا دیکھتا ہوں۔ 'میں تمہارے ساتھ ہوں' کے اجمال کے اندر جو تفصیل مضمر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں اور 'سنتا دیکھتا ہوں' کے الفاظ کے اندر جو سطوت و جلالت اور جو تحفظ و ضمانت ہے وہ بھی تشریح سے بالاتر ہے۔ جب اللہ ساتھ ہے اور وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور وہی ایک مہم پر بھیج رہا ہے تو پھر اگر ساری خدائی بھی دشمن ہو جائے تو کیا ڈر ہے!

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ۥ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ (۴۷)

'إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ'۔ اگرچہ رسول کی حیثیت صرف حضرت موسیٰ ہی کو حاصل تھی، حضرت ہارونؑ صرف ایک نبی تھے لیکن یہاں علیٰ سبیل التغلیب دونوں ہی حضرات کے لیے رسول کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

'فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ'۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ اعراف کی آیات ۱۰۴-۱۰۵ کے تحت گزر چکی ہے[1]۔ وہاں ہم نے وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے اور ان لوگوں کے خیال کی تردید بھی کی ہے جنھوں نے حضرت موسیٰ کی دعوت کو ایک قوم پرست لیڈر کی تحریکِ آزادی کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

'آیت' سے مراد

'قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ'۔ یہاں آیت سے مراد دلیل و حجت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ چنانچہ یہی مضمون سورۂ اعراف میں یوں آیا ہے 'قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ' (میں تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک واضح حجت لے کر آیا ہوں) پیچھے ہم اس سوال پر بھی بحث کر آئے ہیں کہ حضرت موسیٰ کو بالکل پہلے ہی مرحلہ میں معجزات کیوں دیے گئے اور وہ کیا خاص حالات تھے جن کے سبب سے انھوں نے بالکل پہلے ہی قدم پر ان کا اظہار و اعلان بھی کر دیا۔

خیرخواہی اور تنبیہ ساتھ ساتھ

'وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ'۔ اس فقرے میں وہ خیرخواہی اور ہمدردی بھی ہے جو انبیاء کی دعوت کی خصوصیت ہے اور جس کی حضرت موسیٰ کو آیت ۴۴ میں ہدایت ہوئی اور ساتھ ہی نہایت لطیف تنبیہ بھی ہے کہ سلامتی صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا کی ہدایت کی پیروی کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تو تم نے جو کچھ کیا وہ کیا لیکن اب جب کہ خدا کے رسولوں کے ذریعہ سے تمہارے پاس خدا کی ہدایت آ چکی ہے تو سلامتی کی راہ یہی ہے کہ اس کو سیدھے سیدھے اختیار کر لو ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ (۴۸)

یہ اوپر والی آیت کے مضمر مضمون کو نہایت نرم انداز میں کھول دیا کہ ہم پر یہ وحی آئی ہے کہ جو جھٹلائے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبرِ قرآن ج ۳، ص ۱۷-۱۸۔

اور اعراض کرے گا اس کے اوپر عذاب آئے گا۔

آیت ۴۸ کے چند لطیف پہلو

اس آیت پر تدبر کیجیے تو کئی لطیف باتیں سامنے آئیں گی۔

ایک تو یہ کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے عام لیڈروں کی طرح فرعون پر اپنی طرف سے عذاب کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ کی اس وحی کی خبر دی جو ان پر آئی تھی کہ تکذیب اور اعراض کرنے والوں پر اللہ کا عذاب آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ انھوں نے اسی لیے اختیار فرمایا کہ اپنی طرف سے فرعون کے لیے کوئی وجہ اشتعال نہ پیدا ہونے دیں۔

دوسری یہ کہ انھوں نے فرعون کو مخاطب کر کے یوں نہیں فرمایا کہ اگر تو جھٹلائے گا اور اعراض کرے گا تو تجھ پر عذاب الٰہی آدھمکے گا بلکہ بصیغۂ عام یوں فرمایا کہ جو ایسا کرے گا اس کا انجام یہ ہوگا تاکہ فرعون کے کانوں میں بات پڑ بھی جائے اور اس کی انانیت کو ٹھیس بھی نہ لگے۔

تیسری یہ کہ 'کذب' کے مفعول اور 'تولیٰ' کے متعلق، دونوں کو یہاں حذف کر دیا۔ یوں نہیں فرمایا کہ جو ہماری رسالت کی تکذیب اور ہماری لائی ہوئی ہدایت سے اعراض کرے گا اس پر عذاب آئے گا۔ اس لیے کہ یہ بات از خود واضح تھی اور اس کے اظہار سے بھی بہرحال فرعون کے پندار کو چوٹ لگتی۔

اوپر حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کو دعوت میں نرمی کی جو تلقین فرمائی گئی تھی یہ اس کا طریقہ بھی بتا دیا گیا کہ اس طرح دعوت دینا کہ بات بھی پہنچ جائے اور تمھاری طرف سے اشتعالِ طبع کا کوئی سبب بھی پیدا نہ ہونے پائے۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (۴۹)

فرعون کو دعوت اور اس کا معارضہ

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں بربنائے وضاحت یہ بات حذف کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جو پیغام دے کر فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا وہ پیغام وہ لے کر گئے اور ٹھیک ٹھیک ہدایت الٰہی کے مطابق اس کو فرعون تک انھوں نے پہنچا بھی دیا۔ یہ سن کر فرعون بولا کہ اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟ یعنی تم جو رب کے رسول بن کر آئے ہو تو آخر وہ رب کون ہے؟ رب تو میں ہوں تو آخر تم میرے دربار میں اور کس رب کے رسول بن کر آئے ہو؟ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ فرعون کی حیثیت مصر میں (KHA — ÆF) اوتار بادشاہ کی سمجھی جاتی تھی۔ وہ مصریوں کے عقیدے میں ان کے سب سے بڑے دیوتا — سورج — کا مظہر تھا اور اسی عقیدے کے تحت اس کے اسٹیچو اور بت تمام مصر میں پوجے جاتے تھے۔

فرعون کا یہ سوال محض بطور طنز و تحقیر کے تھا ورنہ خدائی کے دعوے کے باوجود وہ اس بات سے تو ناواقف نہیں ہو سکتا تھا کہ بنی اسرائیل اس کے غلام و محکوم سہی لیکن بہرحال وہ اس کو خدا نہیں مانتے۔ لیکن اب تک بنی اسرائیل کے خدا کی حیثیت مصر میں ایک بے جان خدا کی تھی جس کا نام تو بنی اسرائیل اپنے گھروں میں شاید لیتے رہے ہوں گے لیکن زندگی کے عملی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ عملی معاملات پر خدائی فرعون

ہی کی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے خدا کو فرعون کے سامنے ایک زندہ خدا کی حیثیت سے پیش کیا اور صرف پیش ہی نہیں کیا بلکہ اس کے نام سے چند نہایت اہم مطالبات بھی اس کے سامنے رکھ دیے اور وہ بھی اس تنبیہ کے ساتھ کہ اگر سلامتی چاہتے ہو تو ہماری بات مانو ورنہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہو۔ ظاہر ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے اس زندہ خدا سے اب تک واقف نہیں تھا اس وجہ سے اس کو یہ صدا عجیب معلوم ہوئی اور اس نے تعجب اور تحقیر کے انداز میں یہ سوال کیا جو اوپر مذکور ہوا۔ تورات میں اس موقع پر جو عبارت ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ خروج ۵ : ۲ میں ہے۔

"فرعون نے کہا کہ خداوند کون ہے کہ میں اس کی آواز کو سنوں کہ بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا اور نہ میں بنی اسرائیل کو جانے دوں گا؟"

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۵۰)

مختصر لیکن دندان شکن جواب

حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس کی خلقت کے اعتبار سے اس کی رہنمائی فرمائی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شے اپنے مقصدِ وجود کے اعتبار سے ایک خاص قالب و ہیئت رکھتی ہے اور پھر اس مقصدِ وجود کی تحصیل و تکمیل کے لیے اپنے اندر ایک جبلی رہنمائی بھی رکھتی ہے۔ شہد کی مکھی کو جس مقصد کے لیے خالق نے پیدا کیا ہے اس کی تکمیل کے لیے اس کے ننھے سے وجود کے اندر اس نے وہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں جو اس کے لیے ضروری ہیں اور پھر اس کی جبلت کو یہ الہام بھی فرما دیا کہ وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرے اور اپنے لیے شہد کا ذخیرہ فراہم کرے۔ یہی حال اس کائنات کی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا ہے۔ ایک چیونٹی ہو، ایک جھینگا، ایک مکڑی، ایک بکری، ایک شیر سب کو قدرت کی طرف سے ایک خاص نوع کی خلقت اور اس کی ضرورت کے اعتبار سے ایک جبلی ہدایت عطا ہوئی ہے۔ سب کو خدا نے الہام فرمایا ہے کہ کس طرح اور کس نوع کی اپنے لیے غذا حاصل کریں، کس طرح توالد و تناسل کا سلسلہ قائم کریں، کس طرح اپنی اور اپنی نسل کی حفاظت کریں، کس چیز سے بچیں اور کس چیز کو اختیار کریں اور پھر کس طرح اس کائنات کی مجموعی خدمت میں اپنا فریضہ ادا کریں۔

بلبل کی نغمہ سنجی، طوطی کی شکر فشانی اور کوئل کی کوک کس کا الہام ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کے خالق ہی کا! تو وہی خالق ان کا اور سب کا رب بھی ہے!

ہر شے پر ہدایت کا فیضان

صرف جاندار چیزوں ہی تک قدرت کا یہ فیض محدود نہیں ہے بلکہ چمن کے بیل بوٹے جو ثمر باری اور گل ریزی کرتے ہیں، سوسن، بنفشہ، گلاب اور سرو و صنوبر جو چمن آرائی کرتے ہیں، سیب، انار اور انگور جو دعوتِ شوق دیتے ہیں، آخر یہ کس کی بخشی ہوئی خلقت اور یہ کس کی عطا کردہ جبلت ہے؟ آخر کون ہے جو ان میں سے کسی ایک چیز کے بھی خلق کا دعویٰ کر سکے یا یہ کہہ سکے کہ یہ اس کا کرشمہ ہے کہ اس نے سیب کے اندر سیب کی خاصیت ودیعت کی اور کیکر کے اندر کیکر کی۔ چمن کے ہر پودے، میدان کی ہر گھاس اور جنگل کی ہر جھاڑی

میں یہ الگ الگ مزاج، الگ الگ رنگ و بو اور الگ الگ فوائد و نقصانات کون ودیعت کرتا ہے؟ جو کرتا ہے وہی رب ہے، نہ کہ ہر زر نا شخص جو سر پہ تاج اوڑھ لے اور خدائی کا دعوے دار بن بیٹھے وہ رب بن جاتے۔

زمین ہی نہیں ایک نظر آسمان پر بھی ڈالیے۔ یہ سورج، یہ چاند، یہ کہکشاں، یہ قوس قزح، یہ آسمان، یہ ابر، یہ ہوا، آخر کس نے ان کو پیدا کیا اور کون ہے جس نے ان کے فرائض ان کو الہام کیے؟ جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کو ان کے فرائض الہام کیے وہی رب ہے! سورج کا اوتار بن کر تخت پر براجمان ہو جانا تو بہت آسان ہے لیکن کون ہے جو ایک منٹ کے لیے سورج کو اس کے وقت سے پہلے نمودار کر سکے یا افق سے اس کو غائب کر سکے!

اس کائنات میں اشرف المخلوقات کی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔ اس کو قدرت نے بہترین خلقت بھی عطا فرمائی ہے اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے لیکن نہ کسی کو اپنی خلقت کے معاملہ میں کوئی دخل ہے، نہ اپنی صلاحیتوں کی تخلیق ہی میں کسی کا کوئی حصہ ہے۔ یہ خدا ہی ہے جس نے ہمیں ہاتھ، پاؤں، ناک، کان اور آنکھ کی قوتیں دیں اور اسی نے ہمیں جبلت و فطرت اور عقل و ادراک و شعور کی نعمتیں بخشیں۔ یہ انہی چیزوں کا فیض ہے کہ آج خشکی و تری، دریا اور پہاڑ سب ہمارے لیے یکساں ہیں۔ ہم سمندروں کا سینہ چیرتے اور فضاؤں میں اڑتے ہیں۔ ہماری رسائی زمین کے بعید ترین گوشوں اور کونوں ہی تک نہیں بلکہ چاند و مریخ تک ہے۔ بجلی اور ایٹم سب پر ہمارا تصرف ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ آپ کی اپنی پیدا کردہ صلاحیتوں کا کرشمہ ہے! جو اس مغالطہ میں ہے وہ احمق ہے! یہ سب خدا کی بخشی ہوئی عقل کا کرشمہ ہے جس کی بدولت انسان قدرت کے کچھ نوامیس دریافت کر کے چاند اور مریخ پر تاخت کرتا پھر رہا ہے۔ اگر یہ خدا کی بخشی ہوئی عقل کی رہنمائی سے اس کے کچھ قوانین دریافت کر لے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت پیدا کر لے تو اس پر اتنا مغرور نہ ہو جائے کہ خدا کی خدائی ہی کو چیلنج کر دے۔

حضرت موسیٰؑ نے جواب تو نہایت مختصر الفاظ میں دیا لیکن اس کے اندر تفصیل نہایت طویل مضمر ہے۔ اور اگرچہ الفاظ نہایت نرم ہیں لیکن جواب نہایت دندان شکن ہے۔ انھوں نے نہایت جامع الفاظ میں فرعون پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ رب ہونے کا حق دار تو وہی ہو سکتا ہے جس نے خلق کیا اور ہدایت بخشی، تمہارا حصہ نہ خلق میں نہ ہدایت میں تو تم رب ہونے کے مدعی کس طرح بن بیٹھے! یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی ۝ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی۔ (اپنے اس خدائے برتر کی تسبیح کرو جس نے خاکہ بنایا پھر اس کے نوک پلک درست کیے، اور جس نے صلاحیتیں ودیعت کیں پھر ان کے استعمال کا طریقہ بتایا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان پر خدا کی حجت قائم کر دینے کے لیے تو اس کی فطرت اور عقل کی رہنمائی ہی کافی

ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں اور اپنی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعہ سے بھی انسان کی ہدایت کا انتظام کیا۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (القیٰمۃ: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان اپنے اوپر خود گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذر تراشے)

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (۵۱)

فرعون کا استہزاء

فرعون نے حضرت موسیٰ کی اس تذکیر پر سنجیدہ طریقہ سے غور کرنے کے بجائے باندازِ طنز و تحقیر یہ سوال کیا کہ اچھا، اگر رب کے پاس سے آئے ہو تو ذرا پچھلی قوموں کا حال سناؤ کہ ان کا کیا بنا اور وہ کس حال میں ہیں! مطلب یہ کہ جب وہاں سے آرہے ہو تو وہاں کے سارے احوال سے تم تو واقف ہی ہو گے ذرا ہمیں بھی تو وہاں کا احوال سناؤ! یہ ملحوظ رہے کہ برخود غلط اور متکبر لوگ اسی قسم کے غیر متعلق سوال چھیڑ کر سنجیدہ باتوں کو بے اثر بنانے اور اپنے اندھے بہرے معتقدین میں اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَى (۵۲)

پُر وقار جواب اور تذکیر

فرعون کا سوال اگرچہ غیر متعلق بھی تھا اور تحقیر آمیز بھی لیکن حضرت موسیٰ نے نہ صرف جواب پُر وقار و سنجیدہ دیا بلکہ تذکیر و تنبیہ کا ایک اور نہایت پُر حکمت درس بھی اس کو سنا دیا۔ فرمایا کہ ان قوموں کا سارا ریکارڈ میرے رب کے پاس ایک عظیم دفتر میں محفوظ ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ لفظ 'کتاب' کی تنکیر یہاں تفخیم شان پر دلیل ہے۔ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی ایسی ویسی کتاب ہے بلکہ اس میں ایک ایک جزئیہ قلمبند ہے۔ جب یہ کھلے گی تو سب پکار اٹھیں گے کہ مَا لِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا (عجیب ہے یہ کتاب کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کو اس نے محفوظ نہ کر لیا ہو)

'لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَى'۔ یعنی میرے رب کا علم خطا اور نسیان سے بالکل پاک ہے۔ نہ وہ کوئی غلطی کرتا ہے نہ کسی چیز کو بھولتا ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز اس کے علم میں آنے سے رہ جائے یا آئے تو غلط شکل میں آئے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ علم میں آئی ہوئی کسی چیز کو بھول جائے۔ غور کیجیے، حضرت موسیٰ اس غیر متعلق اور طنزیہ سوال کا یہ جواب بھی دے سکتے تھے کہ مجھ سے کوئی فضول سوال نہ کرو۔ میں خدا کا رسول بن کر آیا ہوں، میں نے غیب دانی کا دعویٰ نہیں کیا ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ تمام پچھلی قوموں کا ریکارڈ میرے پاس ہے۔ لیکن انھوں نے یہ جواب دینے کے بجائے نہایت بلیغ انداز میں اس کو یہ تنبیہ کی کہ ہر چند میں تو سارے غیب کا عالم نہیں لیکن میرا رب ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور اس کا علم ہر خطا و نسیان سے پاک ہے۔ اس کے پاس سارا ریکارڈ محفوظ ہے۔ جو قومیں صفحۂ ارض سے مٹ چکی ہیں ان کی نسبت بھی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اب وہ افسانۂ ماضی ہو چکی ہیں بلکہ سب کے نامۂ اعمال خدا کے بے خطا رجسٹر میں مرقوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ایک چیز محفوظ ہے تو یہ صرف محفوظ رکھنے کے لیے تو محفوظ نہیں ہے بلکہ حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے محفوظ ہے۔ یہ بات چونکہ بالکل ظاہر تھی اس وجہ سے حضرت موسیٰ

نے اس کا اظہار نہیں فرمایا لیکن ان کا اندازِ کلام خود اس کو نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کر رہا ہے۔ بعض مواقع میں کنایہ جتنا مؤثر ہوتا ہے صراحت اتنی مؤثر نہیں ہوتی۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى (۵۳-۵۶)

ایک تضمین

قرینہ دلیل ہے کہ یہ چاروں آیتیں حضرت موسیٰؑ کے کلام کا حصہ نہیں ہیں بلکہ بطور تضمین، براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اس قسم کی تضمین کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کلام صرف ماضی کی ایک حکایت نہیں رہتا بلکہ وہ حال پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو جو جواب دیا اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اپنی بات ملا کر قریش کے فراعنہ کو بھی سنا دی کہ یہ صرف ماضی کی حکایت نہیں ہے بلکہ تمہاری بھی حکایت ہے۔ تم بھی سن لو کہ کون تمہارا رب ہے اور کون تمہاری عبادت و اطاعت کا اصلی حقدار ہے۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى

خدا کے رب ہونے کی دلیل اس کی ربوبیت کے پہلو سے

یہ خدا کے رب ہونے کی دلیل اس کی ربوبیت کے پہلو سے ہے یعنی جس ذات نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا، اس کے اندر فلک بوس پہاڑ بنائے، تو ان کے اندر تمہارے گزرنے کے لیے درّے اور دروازے بھی بنا دیے۔ آسمان سے پانی برسایا اور اس سے قسم قسم کی نباتات اور طرح طرح کے درخت اُگا دیے جن میں سے ہر چیز زبانِ حال سے دعوت دے رہی ہے کہ خود بھی کھاؤ برتو اور اپنے چوپایوں کو بھی چراؤ چگاؤ۔ درحقیقت وہی ذات اس بات کی سزاوار ہے کہ اس کو رب مانو۔ فرمایا کہ پروردگاری کے اس اہتمام و انتظام کے اندر اہلِ عقل کے لیے بہت سی دلیلیں ہیں۔ یہاں ان دلیلوں کی وضاحت نہیں فرمائی ہے لیکن اس نظامِ ربوبیت کے اندر اس کے خالق کی قدرت، حکمت، رحمت کی جو دلیلیں ہیں وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں ہو سکتیں جن کے اندر عقل ہے اور وہ اپنی عقل سے کام بھی لیتے ہیں۔ یہ نظامِ ربوبیت خدا کی توحید پر بھی شاہد ہے اور ایک روزِ جزا و سزا کی آمد پر بھی۔ ان دلائل کی وضاحت اس کتاب میں پیچھے بھی جگہ جگہ ہو چکی ہے اور آگے بھی آئے گی۔ یہاں مقصود صرف اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ رب مانے جانے کی حقدار تو وہی ذات ہو سکتی ہے جس نے پرورش کے یہ سارے سامان مہیا کیے ہیں۔ جب ان چیزوں کے مہیا کرنے میں کسی کو کوئی دخل نہیں ہے تو کوئی دوسرا رب ہونے کا حقدار کس طرح ہو سکتا ہے!

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۔

ربوبیت سے معاد پر استدلال

یہ اسی ربوبیت سے قیامت پر استدلال فرمایا ہے کہ ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا ہے اور پھر مرنے

کے بعد اسی میں تمھیں لوٹاتے ہیں اور پھر اسی سے تمھیں دوبارہ نکالیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس تمام اہتمام ربوبیت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کائنات کے رب کا عدل ظہور میں آئے۔ جنھوں نے خدا کی نعمتوں کا حق ادا کیا ہو وہ اس کا صلہ پائیں اور جنھوں نے ان نعمتوں کو خدا کی زمین میں فساد کا ذریعہ بنایا ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ فرمایا کہ یہ دوبارہ پیدا کر دینا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں۔ جب ہم نے اسی سرزمین سے تم کو پیدا کیا اور ہمیں اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو پھر اسی سے دوبارہ پیدا کرنے میں کیوں مشکل پیش آئے گی جب کہ ہم تمھیں، تمھارے مرجانے کے بعد، اسی میں واپس بھی کر رہے ہیں!

وَلَقَدْ اَرَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ؛

یعنی ہم نے فرعون کو اپنی ہر قسم کی نشانیاں دکھائیں لیکن وہ اس کے باوجود ہمارے رسولوں کی تکذیب پر اڑا ہی رہا اور ہماری ہدایت قبول کرنے سے انکار ہی کرتا رہا۔ یہاں نشانیوں سے مراد وہ تمام نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ کی دعوت کے بعد مصر میں یکے بعد دیگرے، فرعون کو متنبہ کرنے کے لیے ظاہر ہوئیں لیکن فرعون آخر وقت تک اپنی ضد پر اڑا ہی رہا۔ ان نشانیوں کی تفصیل تورات میں موجود ہے۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم نے ان کا حوالہ دیا ہے۔

ان آیتوں پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ متکلم کے صیغے استعمال فرمائے اس وجہ سے یہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، حضرت موسیٰ کے کلام کا حصہ نہیں ہیں بلکہ تضمین ہیں۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (۵۷)

فرعون کی ایک سیاسی چال

سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ اس دور میں فرعون اور اس کے ارکان حکومت کو بنی اسرائیل سے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ان کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ طاقتور ہو کر بیرونی دشمنوں کے آلۂ کار بن جائیں اور ایک دن فرعون اور اس کی قوم کو ملک سے بے دخل کر دیں۔ اسی خطرے کو پیش نظر رکھ کر اسرائیلی بچوں کے قتل کی مہم چلائی گئی لیکن یہ مہم ناکام رہی۔ بنی اسرائیل کی تعداد بڑھتی ہی گئی البتہ بنی اسرائیل کے اندر اس وقت تک کوئی ایسا لیڈر نہیں تھا جو ان کو منظم کر سکے۔ حضرت موسیٰ سے فرعون کو، جیسا کہ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں، ان کے مدین جانے سے پہلے بھی خطرہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو بیدار کر رہے ہیں وہ بنی اسرائیل کے مظلوموں کی حمایت و مدافعت میں ہمیشہ سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اسی جرم میں ان کا داخلہ بھی شہر میں بند تھا اور بالآخر ایک قبطی کے قتل کے سبب سے انھیں مدین چلے جانا پڑا۔ اب جب وہ آئے اور اس شان کے ساتھ آئے کہ انھوں نے فرعون کے سامنے چند نہایت اہم مطالبات بھی، نہایت دبدبہ کے ساتھ، رکھ دیے تو اس نے تاڑ لیا کہ اس کو جو خطرہ تھا اب وہ ایک حقیقت کی شکل میں سامنے آ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ! کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے اس جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے بے دخل کر دو! ـــــ فرعون ایک نہایت گھاگ سیاسی تھا۔ اس نے ایک تو حضرت موسیٰ

کی اس دعوت کو ایک سیاسی خطرہ کا رنگ دے کر اپنی قوم کو مشتعل کرنے کی کوشش کی، دوسرے ان کے معجزات کو سحر سے تعبیر کر کے اس اثر کو مٹانے کی کوشش کی جو لوگوں پر ان کا پڑا ہو گا۔

فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِۦ فَٱجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُۥ نَحْنُ وَلَآ أَنتَ مَكَانًا سُوًى (٥٨)

'مَوْعِد' ظرف زمان اور ظرف مکان، یعنی وقت وعدہ اور مقام موعود، دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اس آیت میں یہ دونوں معنوں کو محتمل ہے اور بعد والی آیت میں ظرف زمان کے معنی میں ہے۔ اس قسم کے ظرف کی بعض مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔

'سُوًى' کے معنی 'وسط' کے ہیں۔ 'مَكَانًا سُوًى' یعنی ایسی جگہ ہو جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لیے یکساں ہو۔ جہاں ہمارے آدمی بھی آسانی سے جمع ہو سکیں اور تمہارے آدمی بھی۔

فرعون نے حضرت موسٰیؑ کو جواب دیا کہ اگر تم جادو کے بل پر ہمیں ہمارے ملک سے بے دخل کرنے اٹھے ہو تو ہمارے پاس جادو کی کمی نہیں ہے، ہم بھی ایسا ہی جادو دکھا سکتے ہیں تو تم ہمارے اور اپنے درمیان مقابلہ کے لیے کوئی ایسی جگہ متعین کرو جو فریقین کے لیے یکساں ہو اور دونوں طرف کے لوگ ایک معین وقت پر اس جگہ جمع ہوں، نہ تم اس کی خلاف ورزی کرو اور نہ ہم ـــــ فرعون کی اسکیم یہ تھی کہ مقابلہ کھلے میدان میں پوری پبلک کے سامنے ہو تاکہ سب کے سامنے حضرت موسٰیؑ کو شکست دے کر پہلے ہی مرحلہ میں ان کے قدم اس طرح اکھاڑ دیے جائیں کہ پھر وہ سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ ٱلزِّينَةِ وَأَن يُحْشَرَ ٱلنَّاسُ ضُحًى (٥٩)

فرعون کے چیلنج کا جواب

حضرت موسٰیؑ کو چونکہ اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اس وجہ سے انھوں نے بے دھڑک فرعون کا چیلنج منظور کر لیا۔ مصریوں کے ہاں سال میں دو تین بڑے میلے ہوتے تھے۔ انہی میں سے کسی میلے کی تاریخ سامنے تھی۔ انھوں نے اسی میلے کے دن کو نامزد کر دیا اور وقت بھی مقرر کر دیا کہ لوگ چاشت کے وقت جمع ہوں۔ میلہ کا دن لوگوں کی فرصت و فراغت کا دن ہوتا ہے اور کسی پبلک اجتماع کے لیے چاشت کا وقت سب سے زیادہ موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ گویا حضرت موسٰیؑ نے بھی یہ چاہا کہ اسی مقابلے میں فرعون کے سحر و شعبدہ کا سارا طلسم باطل کر دیں۔

فَتَوَلَّىٰ فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهُۥ ثُمَّ أَتَىٰ (٦٠)

فرعون کی تیاریاں

'فَتَوَلَّىٰ' یعنی حضرت موسٰیؑ سے مذکورہ بالا قول و قرار کر کے فرعون وہاں سے ہٹا اور اپنی تدبیریں اکٹھی کرنے میں لگ گیا اور پھر پورے سروسامان کے ساتھ میدانِ مقابلہ میں آیا۔ یہاں بات مختصر کر دی گئی ہے اس وجہ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس نے کیا تدبیریں کیں لیکن قرآن کے دوسرے مقامات میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ اس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ رائے دی کہ ان کا مقابلہ معمولی جادوگروں سے کرانے

میں شکست کا اندیشہ ہے اس وجہ سے مصلحت یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ہرکارے بھیج کر تمام ماہر جادوگر بلائے جائیں اور ان سے مقابلہ کرایا جائے۔ چنانچہ اسی تجویز پر عمل کیا گیا۔ مملکت کے ہر حصہ میں ہرکارے بھیجے گئے اور تمام بڑے بڑے جادوگر بلائے گئے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُم بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ (۶۱)

'سحت' کے اصل معنی ہڈی پر سے گوشت نوچنے کے ہیں۔ اسی سے 'اسحات' ہے جس کے معنی کسی چیز کا استیصال کر دینے اور اس کی جڑ اکھاڑ دینے کے ہیں۔

میدانِ مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ کی تقریر

یہ حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے میدانِ مقابلہ میں سب سے پہلے مجمع کے سامنے کی ہے۔ انھوں نے فرعون اور اس کے تمام ہم قوموں اور جادوگروں کو مخاطب کر کے باندازِ تنبیہ فرمایا کہ تمھارا ناس ہو! تم ایک باطل کی حمایت میں حق کا مقابلہ کرنے آئے ہو۔ خدا پر جھوٹ تہمت نہ باندھو، کہ خدا تمھارا قلع قمع کر دے۔ یاد رکھو کہ جو خدا پر افترا کرتے ہیں وہ نامراد ہو کر رہتے ہیں۔

'افتراء علی اللہ' سے مراد، جیسا کہ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آئے ہیں، شرک ہے۔ شرک کو افتراء علی اللہ سے تعبیر کرنے کے وجوہ پر بھی ہم تفسیر سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اوپر کی آیات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ فرعون سے مناظرہ اسی بات پر تھا کہ وہ مدعی رب ہونے کا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے اس کے سامنے اس زعمِ باطل کی تردید فرمائی تھی کہ رب وہ ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور جس نے اس کی ہدایت اور پرورش کا انتظام فرمایا ہے نہ کہ تم جس کو نہ اس کے خلق میں کوئی دخل اور نہ اس کی تدبیر میں۔ اب وہی بات حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے تمام حامیوں کو مخاطب کر کے سنا دی کہ خدا کا کوئی شریک وسہیم نہیں اگر تم اپنے جی سے کسی اور کو شریک وسہیم بناتے ہو تو یہ تم اپنی من گھڑت بات خدا پر لگاتے ہو۔ خدا کی طرف سے اس کی کوئی سند تمھارے پاس نہیں ہے اور یہ درحقیقت تم خدا پر افترا کر رہے ہو جس کی پاداش میں تم مستحق ہو کہ خدا تم پر ایک عذاب بھیج کر تمھیں فنا کر دے۔ جو لوگ اللہ پر افترا کرتے ہیں وہ بالآخر نامراد ہو کر رہتے ہیں۔

فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَىٰ (۶۲)

اعیانِ فرعون کی خفیہ میٹنگ

'تنازع فی الحدیث' اور 'تنازع امر' کا محاورہ عربی میں آپس میں تبادلۂ خیالات و آراء کے لیے آتا ہے یعنی جب تمام اعیانِ حکومت اور سارے ساحر جمع ہو گئے تو ان کی آپس میں ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔ آگے کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میٹنگ میں نہایت رازدارانہ طور پر فرعون کی طرف سے ساحروں کے دل میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی گئی کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں نہایت ماہر جادوگر ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ یہ اپنے جادو کے زور سے بنی اسرائیل کو منظم کر کے ہمیں اس ملک سے بے دخل کریں اور ہماری تمام تہذیب و ترقی کو جو ہم نے پروان چڑھائی ہے، مٹا کے رکھ دیں تو یہ موقع غفلت کا نہیں ہے بلکہ متحدہ طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کرو اور یاد رکھو کہ جو آج کے معرکے میں جیتا وہی فتحمند رہے گا۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (۶۳)

یہ 'اِن' مخففہ 'اِنّ' کے معنی میں ہے اور اس کے بعد جو 'ل' ہے یہ اس کا قرینہ ہے۔ 'مُثْلٰی' 'امثل' کی مؤنث ہے۔ اس کے معنی اعلیٰ، عمدہ اور برتر کے ہیں۔

یہ وہ بات نقل ہوئی ہے جو خفیہ مجلس میں فرعون اور اس کے اعیان نے جادوگروں کو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف بھڑکانے کے لیے کی۔

پہلی بات تو انھوں نے جادوگروں کے اندر پیشہ ورانہ رقابت کا جذبہ بھڑکانے کے لیے یہ کہی کہ یہ دونوں ماہر جادوگر ہیں۔ مقصد یہ کہ یہ اسی ہتھیار کے ساتھ میدان میں آئے ہیں جو تمھارے پاس بھی ہے تو اگر تم نے ان کے مقابلہ میں کمزوری دکھائی تو سب سے زیادہ ہوا خیزی تمھاری ہی ہوگی۔

دوسری بات یہ سجھائی کہ یہ اپنے جادو کے زور سے ہم پر اپنا رعب جمانا اور بنی اسرائیل کو منظم کر کے تمھیں تمھارے ملک سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہی کہ اس وقت تمھاری نہایت اعلیٰ اور شاندار تہذیب، جو تم نے اتنی محنت سے فروغ دی ہے، سخت خطرے میں ہے۔ اگر موسیٰؑ و ہارونؑ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گئے تو اس اعلیٰ تہذیب و تمدن کا یہ یک قلم خاتمہ کر دیں گے۔

ان باتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ارباب اقتدار اہل حق کے مقابلہ میں ہمیشہ اسی طرح کے حربے استعمال کرتے رہے ہیں جس قسم کے حربے فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ 'تمھارا ملک' اور 'تمھاری تہذیب' کے الفاظ میں خطاب محض عوام فریبی کے لیے ہے ورنہ فرعونی حکومت اور فرعونی تہذیب میں ایک مخصوص ارسٹوکریسی کے سوا دوسروں کی حیثیت صرف غلاموں اور تلیوں کی تھی لیکن ارباب اقتدار جب عوام کو اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اسی طرح ان کو نشہ پلاتے اور بے وقوف بناتے ہیں۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى (۶۴)

یہ وہ مشورہ ہے جو غور و فکر کے بعد ساحروں کو دیا گیا کہ چونکہ مرحلہ بہت نازک اور مقابلہ نہایت ماہر جادوگروں سے ہے اس وجہ سے سب ساحر مل کر اپنی مجتمعہ طاقت سے ایک متحدہ محاذ بنا کر مقابلہ کریں۔ اس مشورے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی ہوگی کہ جس طرح سیاسی پارٹیوں میں باہم رقابتیں ہوتی ہیں، ہر ایک کی خواہش اور کوشش صرف اپنے مفاد کے لیے ہوتی ہے، اسی طرح پیشہ ور جماعتوں میں بھی آپس میں چشمک ہوتی ہے اور ہر ایک صرف اپنی برتری چاہتی ہے۔ فرعون اور اس کے اعیان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ساحروں میں اس

طرح کا انتشار رہا تو شکست ہو جائے گی اس وجہ سے انھوں نے ان کو مشورہ دیا کہ الگ الگ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سب مل کر متحدہ طاقت کے ساتھ مقابلہ کرو۔

'وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى'۔ یہ اس دن کی نزاکت اور اہمیت کی طرف اشارہ ہے کہ آج کا دن فیصلہ کن ہے۔ اگر بازی ہماری رہی تو مستقبل کی کامیابی ہمارے لیے ہے اور اگر ہم ہار گئے تو پھر وہ تمام خطرات لازماً پیش آ کے رہیں گے جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کی کامیابی کی صورت میں متصور ہیں۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى (۶۵)

حق اور باطل میدانِ مقابلہ میں

اس مشورت کے بعد جیسا کہ اوپر مذکور ہوئی ساحر اور حضرت موسیٰؑ اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ میدانِ مقابلہ میں اترے۔ ساحروں نے آمنے سامنے ہوتے ہی اپنے پیشہ ورانہ اخلاق کے مطابق حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یا تو پہلے تم اپنا پانسہ پھینکو یا پھر ہمیں اپنا ہنر دکھاتے ہیں۔ ان کے اس قول سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اگرچہ انھوں نے موقع پہل کرنے کا حضرت موسیٰؑ کو بظاہر دیا لیکن دبی زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ پہل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس طرح کے مقابلوں میں تقدیم و تاخیر کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر فریق کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے پہلے ہی کرتب سے حاضرین کو اس طرح مسحور کر دے کہ دوسرے فریق کا حوصلہ پست ہو جائے۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (۶۶)

ساحروں کا کرتب

حضرت موسیٰؑ کو چونکہ اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا، اللہ تعالیٰ نے خود ان کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ تم ہر میدان میں کامیاب و فتحمند رہو گے اس وجہ سے انھوں نے خود پہل کرنے کے بجائے پہلے انہی کو موقع دیا کہ تمہی اپنا ہنر دکھاؤ۔ وہ تو پہلے ہی سے تیار تھے چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے یہ کہتے ہی انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر ڈال دیں اور ان کے جادو کے سبب سے حضرت موسیٰؑ کو ایسا خیال ہوا کہ گویا وہ دوڑ رہی ہیں۔ چونکہ ساحروں کے علم میں یہ بات تھی کہ حضرت موسیٰؑ اپنی لاٹھیا کو سانپ بنا دیتے ہیں اس وجہ سے انھوں نے اسی قسم کے جادو سے ان کو زک دینے کی کوشش کی اور اس پر اتنا اضافہ کر دیا کہ ان کی رسیاں بھی سانپوں کی طرح رینگنے لگیں۔ اپنے خیال میں تو انھوں نے حضرت موسیٰؑ کو شکست دینے کا پورا اہتمام کیا تھا اس لیے کہ حضرت موسیٰؑ کی ایک ہی لٹھیا سانپ بنتی تھی اور ان کی بہت سی لاٹھیاں سانپ بن گئیں اور مزید برآں انھوں نے رسیوں کو بھی سانپ بنا کر دکھا دیا لیکن یہ سب کچھ، جیسا کہ لفظ 'يُخَيَّلُ' سے واضح ہے، محض حاضرین کی قوتِ متخیلہ پر جادو کے ایک فوری اثر کا کرشمہ تھا۔ جادو سے کسی شے کی حقیقت و ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ محض دیکھنے والوں کے ذہن و خیال پر اس کا ایک فوری اثر پڑتا ہے اور اگر حقیقت سامنے آ جائے تو فوراً ہی اس کا طلسم باطل بھی ہو جاتا ہے۔

فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى (۶۷)

یہ منظر دیکھ کر فطری طور پر حضرت موسیٰؑ کے دل میں ذرا اندیشہ پیدا ہوا اس لیے کہ اب تک ان کے سامنے ایک ہی لٹھیا

کا اصلی کمال ظاہر نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ مقابلہ بہر حال سخت ہے۔ ہر چند اللہ تعالیٰ کے وعدے کی بنا پر ان کو یہ اطمینان تھا کہ فتح انہی کی ہوگی لیکن جب صورتِ حال توقع سے زیادہ پیچیدہ سامنے آجائے تو دل میں وقتی طور پر کچھ نہ کچھ ہراس پیدا ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح کا ایک وقتی ہراس حضرت موسیٰؑ کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ لفظ 'خِيْفَةً' کی تنکیر سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ خوف محض معمولی اور وقتی تھا۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (۶۸)

حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کی اطمینان دہانی

حضرت موسیٰؑ کا یہ ہراس دور کرنے کے لیے فوراً یہ بشارت نازل ہوئی کہ تم ذرہ برابر بھی اندیشہ نہ کرو۔ انھوں نے کتنا ہی بڑا جادو دکھایا ہو لیکن غالب اور سربلند تمہی رہوگے۔

وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى (۶۹)

معجزہ اور سحر کا فرق

ساتھ ہی یہ ہدایت ہوئی کہ یہ تمھارے ہاتھ میں جو لٹھیا ہے اس کو تم بھی ڈال دو۔ یہ ان کی اس ساری شعبدہ گری کو ہڑپ کر جائے گی۔ انھوں نے جو کچھ دکھایا ہے یہ محض ایک ساحر کا کرتب ہے اور ساحر جہاں بھی جائے کامیاب نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہاں اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ ساحر کا سحر حق کے مقابل میں کبھی نہیں ٹکتا لیکن بات ایک کلیہ کے رنگ میں کہی گئی ہے کہ ساحر کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ سحر کا تعلق تمام تر فریب نظر اور دیکھنے والے کی قوت متخیلہ سے ہے، اصل حقیقت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، پھر اس پیشہ کے لوگ ہمیشہ سوسائٹی کے اراذل و انفار سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں جو چند دن اپنی شعبدہ بازیوں سے کچھ سادہ لوحوں کو بیوقوف تو بنا لیتے ہیں لیکن سوسائٹی کی تعمیر و اصلاح میں کوئی کردار ان کا نہ ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ برعکس اس کے حضرات انبیاء سے جو معجزے صادر ہوتے ہیں ان کے اندر ایک سطوت و جلالت ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا صدور ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوتا ہے جو انسانیت کے گلِ سرسبد ہوتے ہیں جن کے دشمن بھی ان کے پاکیزہ اخلاق و کردار کی گواہی دیتے ہیں، جن کے ساتھ ایک عظیم دعوت ہوتی ہے جس کی حقانیت کی شہادت اس کے مخالفوں کے دل بھی دیتے ہیں۔ یہ لوگ جب دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو تاریخ کا ورق الٹ کر رخصت ہوتے ہیں۔ ان کی دعوت سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور دنیا ایک نیا جنم لیتی ہے۔ بتائیے کون ساحر ہے جس کا انسانی زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کارنامہ بھی ہو! یہاں وہ حقیقت بھی پیش نظر رکھیے جس کی طرف ہم پیچھے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارے متکلمین نے معجزہ اور سحر میں منطق کے ذریعہ سے جو فرق کرنے کی کوشش کی ہے یہ ایک سعی لاحاصل ہے۔ ماہِ نخشب اور خورشید جہاں تاب کے درمیان فرق منطق کے ذریعے سے نہیں معلوم کیا جاتا! اس کا فیصلہ خود دیکھنے والے کر لیتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (۷۰)

ساحروں کا

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے اپنی لٹھیا زمین پر ڈال دی اور اس نے ایک اژدھے کی طرح جادوگروں کے تمام سانپوں سنپولیوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ جادوگروں نے یہ منظر جو دیکھا تو ان کی آنکھیں

کھل گئیں۔ جادوگر میں اگر کوئی رمق اعترافِ حق کی ہو تو وہ اپنے شعبدہ اور نبی کے معجزہ میں سب سے زیادہ امتیاز کرنے والا ہو سکتا ہے۔ ان ساحروں کے اندر حق شناسی کی رمق تھی۔ آگے آیت ۷۲ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جادوگر یہ احساس پہلے سے رکھتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ جو چیز پیش کر رہے ہیں جادو نہیں ہے چنانچہ وہ ان کے مقابل میں آنے سے کتراتے بھی تھے لیکن انھیں حکومت کے کارندوں نے سیاسی خطرات کا ہوا کھڑا کر کے آمادہ کیا کہ وہ ان کا مقابلہ کریں۔ وہ کہنے سننے سے مقابلہ کے لیے آتو گئے لیکن جب انھوں نے اپنے شعبدہ کے مقابل میں حضرت موسیٰؑ کا اعجاز دیکھا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ اس طرح سجدے میں گر پڑنا اس زمانے میں کسی کے کمالِ فن کے اعتراف کا ایک طریقہ تھا لیکن ان جادوگروں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بھرے مجمع میں یہ اعلان بھی کر دیا کہ ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب پر ایمان لائے۔ غور کیجیے ساری پبلک کے سامنے ساحروں کے اس اعترافِ شکست اور اس اعلانِ ایمان کے بعد فرعون اور اس کے درباریوں پر کیا گزری ہوگی! لیکن فرعون نہایت کائیاں سیاسی تھا اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے فوراً ایک نیا شغلہ چھوڑا۔

قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَهٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيۡرُكُمُ الَّذِىۡ عَلَّمَكُمُ السِّحۡرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمۡ فِىۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ وَلَتَعۡلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰى (۷۱)

فرعون کا سیاسی شغلہ

اس نے ساحروں سے کہا تم نے بدون میری اجازت کے موسیٰؑ کو سچا مان لیا۔ اب میں سمجھ گیا کہ درحقیقت وہی تمھارا گرو ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے اور تم نے باہمی سازش سے یہ فتح و شکست کا ڈرامہ دکھایا ہے تاکہ حکومت کی ہوا خیزی ہو اور تم موسیٰؑ کے اقتدار کے لیے راہ ہموار کر دو۔ یہ حکومت کے خلاف تم نے سازش کی ہے اس وجہ سے میں تمھیں وہ سزا دوں گا جو ملک کے باغیوں کو دی جاتی ہے۔ میں پہلے تمھارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کٹواؤں گا اور پھر عبرتِ عام کے لیے تمھیں کھجور کے تنوں پر سولی کے لیے لٹکاؤں گا۔ اس وقت تمھیں اندازہ ہوگا کہ میری سزا زیادہ سخت اور زیادہ پائیدار ہوتی ہے یا تمھارے گرو کی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ہزیمت نہایت رسواکن تھی لیکن فرعون نے اپنی کیادی سے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ قائم رکھنے کے لیے ایک بات بنا ہی لی۔

'قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَهٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ' اوپر ساحروں کا جو قول نقل ہوا ہے اس سے واضح ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے صرف ایک سچے آدمی ہونے ہی کا اقرار نہیں کیا بلکہ نہایت تصریح کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب پر ایمان لائے۔ اس اعلان کے اندر ظاہر ہے کہ فرعون کے رب ہونے کا انکار بھی مضمر تھا جس کی زد فرعون کی خدائی اور اس کی بادشاہی دونوں ہی چیزوں پر پڑتی تھی اس وجہ سے اس کے لیے یہ مسئلہ محض دین و عقیدہ کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ بالواسطہ اس کے اقتدار کو ایک چیلنج تھا۔ بھلا اس جسارت کو وہ اپنی حکومت میں کس طرح گوارا کر سکتا تھا!

'اِنَّہٗ لَکَبِیۡرُکُمُ الَّذِیۡ عَلَّمَکُمُ السِّحۡرَ'۔ 'کبیر' سے مراد استاد اور گرو کے ہیں۔ فرعون نے اپنی ذہانت سے عوام فریبی کے لیے یہ شگوفہ چھوڑا کہ اصل میں یہی شخص (حضرت موسیٰؑ) تمھارا گرو ہے، اسی نے تمھیں جادو کا یہ فن سکھایا ہے۔ تمھاری آپس میں ملی بھگت تھی۔ تم نے یہ طے کر رکھا تھا کہ تم اس طرح کھلے میدان میں اپنے اس گرو کے سامنے اپنی شکست مان لو گے جس سے اس کی دھاک تمام لوگوں پر بیٹھ جائے گی اور پھر تم حکومت کے خلاف جو سازش کرنا چاہتے ہو اس میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہر چند یہ بات بالکل بے تکی تھی۔ فرعون خود اپنے ہی منتخب کیے ہوئے میدان میں خود اپنی ہی لائی ہوئی فوج سے ہارا تھا لیکن اس شکست کا اثر مٹانے کے لیے اس کو کوئی نہ کوئی بات تو آخر بنانی تھی چنانچہ اس نے بنائی اور داد دینی چاہیے کہ اس نے بڑی سیاسی ذہانت کا ثبوت دیا اور کیا عجب کہ اس طرح وہ بہتوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا ہو لیکن حق کو اس قسم کی پُرفریب باتوں سے نہیں دبایا جا سکتا۔

'فَلَاُقَطِّعَنَّ ... الایۃ' جب ساحروں کو حکومت کے خلاف سازش کا مجرم قرار دیا گیا تو ان کے لیے اس سزا کا بھی اعلان کر دیا گیا جو اس زمانے میں حکومت کے خلاف سازش کرنے والوں کو دی جاتی تھی یعنی ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں اور ان کو برسرِعام سولی دی جائے تاکہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔ 'فِیۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ' سے مقصود اس کے برسرِعام ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

ساحروں کا ایک وہم

'وَلَتَعۡلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰی' یعنی تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر تم نے اپنے گرو کی مرضی کے خلاف کیا تو وہ اپنے جادو کے زور سے تم کو کسی آفت میں مبتلا کر دے گا اس وجہ سے اس کے آلۂ کار بنے ہوئے ہو۔ لیکن جب میری سزا کا مزا چکھو گے تو تمھیں پتہ چل جائے گا کہ میری سزا تمھارے گرو کی سزا کے مقابل میں کہیں زیادہ سخت اور پائیدار ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جادوگروں میں یہ وہم پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی بات گرو کی مرضی کے خلاف کی جائے اور وہ کسی شاگرد سے ناراض ہو جائے تو اس شاگرد کو وہ اپنے جادو کے زور سے کسی بہت بڑی آفت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ فرعون نے اسی وہم کو سامنے رکھ کر جادوگروں کو متنبہ کیا کہ تم اپنے گرو کی سزا سے ڈرتے ہو لیکن میری سزا اس کی سزا سے کہیں زیادہ سخت اور عبرت انگیز ہو گی۔

قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالَّذِیۡ فَطَرَنَا فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقۡضِیۡ هٰذِهِ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا (۷۲)

ایمان کا کرشمہ

فرعون نے دھمکی تو بڑی سخت سنائی اور اسے توقع رہی ہوگی کہ وہ اس دھمکی سے ساحروں کو مرعوب کر لے گا لیکن اب اس کا سابقہ پیشہ ور جادوگروں سے نہیں بلکہ راسخ الایمان مومنوں سے تھا۔ انھوں نے فرعون کی یہ دھمکی سن کر کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف سنا دیا کہ تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو اب ہم ان روشن نشانیوں پر جو ہمارے مشاہدے میں آ چکی ہیں اور اپنے اس خالق پر جس نے ہمیں وجود بخشا ہے تمھیں ترجیح دینے والے نہیں ہیں۔ تم اگر کچھ کر سکتے ہو تو اسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو اور ہمیں اس دنیا کی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے ـــــ دیکھا آپ نے

ایمان کا کرشمہ! یہ وہی جادوگر ہیں جن کا حال قرآن میں دوسری جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ جب وہ مقابلہ کے لیے بلائے گئے تو انھوں نے بڑی لجاجت کے ساتھ فرعون سے اپنی کامیابی کی صورت میں انعام کی درخواست کی یا اب ایمان کے نور نے ان کے دلوں کو اس طرح منور کر دیا کہ خدا اور آخرت کے سوا اس دنیا کی کسی چیز کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کی راہ میں اپنی زندگی بھی قربان کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۷۳)

انھوں نے مزید فرمایا کہ ہم اپنے رب پر اس امید کے ساتھ ایمان لائے ہیں کہ وہ ہماری ان تمام غلطیوں کو بھی معاف فرمائے گا جو ہم سے صادر ہوئی ہیں اور اس سحر سے بھی درگزر فرمائے گا جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

'وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ' سے صاف واضح ہے کہ یہ لوگ حضرت موسیٰ کے مقابلہ کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ جو چیز پیش کر رہے ہیں یہ جادو نہیں ہے، کچھ اور ہی شے ہے لیکن حکومت کے دباؤ سے انھیں آنا پڑا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر حقیقت اس طرح واضح کر دی کہ ان کا سینہ اس کے اعتراف و اعلان کے لیے کھل گیا۔

'وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى' یہ فرعون کی بات 'اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى' کا جواب ہے جو بالکل صحیح بھی ہے اور بھرپور بھی۔ انھوں نے فرمایا کہ تم ہمیں اپنی سزا سے ڈراتے ہو کہ وہ نہایت سخت اور پائیدار ہوگی لیکن ہم نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنے رب کو اختیار کیا ہے جو تمام دنیا و مافیہا سے بہتر بھی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (۷۴)

ایک تضمین — یہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں میرے نزدیک بطور تضمین ہیں۔ جس طرح اوپر آیات ۵۳-۵۶ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی تقریر کے ساتھ اپنی بات ملا کر اس کو مکمل اور مطابق حال کر دیا ہے اسی طرح ان لوگوں کے جواب کے ساتھ اپنی بات ملا کر اس کو مکمل اور مطابق حال کر دیا ہے۔ ان آیات کو تضمین ماننے کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ان میں جزا و سزا اور آخرت کا حال جن الفاظ میں بیان ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے شایانِ شان ہیں اور ان کا انداز اوپر کی آیات کے انداز سے بالکل مختلف ہے۔ فرمایا کہ جو اپنے رب کے حضور مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوگا تو اس کے لیے دوزخ ہے جس میں نہ وہ مرے گا اور نہ جیے گا۔ مجرم کی حیثیت سے، یعنی جس نے خدا کی نافرمانیاں کیں اور اس کو توبہ و اصلاح کی توفیق نہ ہوئی۔ 'لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى' اس عذاب کی شدت، اس کے خلود اور اس کی بے پناہی کی ایسی تعبیر ہے کہ اپنے لفظوں میں اس کو واضح کرنا ممکن نہیں، بڑی سے بڑی مصیبت بھی ہو تو اس سے نجات کے لیے موت بہرحال ایک آخری چارۂ کار رہے

لیکن جہاں موت بھی نہ ہو اور موت کے مصائب ہر طرف سے پلے پڑ رہے ہوں وہاں کوئی کدھر جائے گا۔

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى (۷۵)

یہ ان کے مقابل میں فائز المرام گروہ کا بیان ہوا کہ البتہ جو لوگ ایمان کے ساتھ خدا کے پاس حاضر ہوں گے اور اس کے ساتھ انھوں نے نیک اعمال بھی کیے ہوں گے ان کے لیے مراتب عالیہ ہیں۔

ایمان کی مقبولیت کے لیے اعمال صالحہ شرط ہیں

'مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ' کے اسلوب بیان پر غور کیجیے تو یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ایمان وہی ہے جس کے ساتھ عمل صالح بھی پایا جاتا ہے۔ جو ایمان عمل صالح سے خالی ہو اس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ایسا ایمان ایک ٹھونٹھ درخت کے مانند ہے جو برگ و بار سے بالکل خالی ہے۔ جس درخت نے دنیا میں اپنے برگ و بار پیدا نہیں کیے آخر وہ آخرت میں کس طرح ثمر بار ہو جائے گا! خدا کے ہاں اعمال کی مقبولیت کے لیے جس طرح ایمان شرط ہے اسی طرح ایمان کی مقبولیت کے لیے اعمالِ صالحہ شرط ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى (۷۶)

جنت ایک سستی چیز نہیں

یہ وضاحت ہے ان مراتب عالیہ کی یعنی ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ فرمایا کہ 'وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى' یہ صلہ ہے ان لوگوں کا جو اپنے ظاہر و باطن اور اپنے عقیدہ و عمل کو پاکیزہ بنائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جھوٹی تمناؤں سے ملنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے حق دار وہی ٹھہریں گے جو اس کے حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس کو ہر قسم کی آلائشوں سے، خواہ وہ فکری و نظری ہوں یا عملی و اخلاقی، پاک کرنے کی جدوجہد کریں گے۔ اس راہ میں آدمی کو جو ٹھوکریں لگتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے تدارک کی تدبیریں بھی اپنی اس کتاب میں بتا دی ہیں اور انسان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے جن رعایتوں کا محتاج ہے وہ بھی اس کو بخشی گئی ہیں۔ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا انکار دین میں غلو اور تشدد ہے لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جن لوگوں نے محض اپنے جی سے عمل کی اہمیت گھٹا کر اباحت کے دروازے کھول دیے ہیں، خواہ وہ ہمارے پرانے متکلمین ہوں یا نئے متکلمین، انھوں نے اپنی فیاضی سے جنت کو ایک بہت سستی چیز تو ضرور بنا دیا ہے اور اس سے ہم جیسے بے عملوں کو بڑی تسلی مل جاتی ہے لیکن قرآن میں ان کے اس نظریے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور جنت کی کنجی بہر حال اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ اس نے ان متکلمین کے ہاتھ میں نہیں پکڑا دی ہے اس وجہ سے سلامتی اسی میں ہے کہ اس قسم کی جھوٹی آرزوؤں سے اپنے آپ کو محفوظ ہی رکھیے۔ قرآن نے ان کو یہود کی امانی باطلہ میں سے شمار کیا ہے اور ان کی تفصیل سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى (۷۷)

'فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا'۔ 'ضرب طریق' کے معنی عربی محاورہ کے لحاظ سے تو، جیسا کہ صاحب کشاف

نے تصریح کی ہے، راستہ بنا لینے کے ہیں لیکن یہاں اس لفظ کے استعمال میں ایک لطیف کنایہ حضرت موسیٰؑ کے عصا کی طرف بھی ہے اس لیے کہ اس راستہ کے بنانے میں حضرت موسیٰؑ کے عصا کو بھی دخل تھا اور عصا کی مناسبت لفظ 'ضرب' کے ساتھ واضح ہے۔

حذف کی ایک مثال

'لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى' میں 'تَخْشٰى' کا مفعول تقابل کے اصول پر میرے نزدیک محذوف ہے۔ اس محذوف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی۔ 'لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى غَرَقًا' یعنی نہ تم کو فرعون کی طرف سے پا لیے جانے کا کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ سمندر میں ڈوبنے کا کوئی خطرہ ہوگا۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ میں نے ترجمہ میں اس حذف کو کھول دیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو ہجرت کا حکم

یہاں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کا ایک طویل حصہ حذف کر دیا گیا ہے، جس پر سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے یہ مطالبہ جو کیا کہ میرے ساتھ بنی اسرائیل کو عید قربانی منانے کے لیے جانے دے تو فرعون نے اس مطالبہ کو ماننے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اس ظلم و تشدد میں اس نے مزید اضافہ کر دیا جو اب تک اس کے اور اس کے کارندوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر ہو رہا تھا۔ اس دوران میں یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ نے مصر پر مختلف آفتیں نازل کیں کہ فرعون کی آنکھیں کھلیں لیکن جب کوئی مصیبت آتی تب تو وہ حضرت موسیٰؑ کی خوشامدیں کرتا کہ اگر تمہاری دعا سے یہ آفت ٹل گئی تو میں بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ جانے دوں گا لیکن حضرت موسیٰؑ کی دعا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جب آفت ٹل جاتی تو پھر اس کی سرکشی عود کر آتی اور وہ اپنے عہد سے مکر جاتا۔ اسی نزاع میں کئی سال بیت گئے۔ اس دوران میں حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کی قوم پر اپنا وہ فرض رسالت اچھی طرح ادا کر دیا جو ایک رسول کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا تھا۔ بالآخر جب فرعون اور اس کی قوم پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو گئی تب حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ وہ بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے ہجرت کر جائیں۔

اب تک تو حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ، جیسا کہ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں صرف یہ تھا کہ ان کو بنی اسرائیل کے ساتھ تین دن کی راہ بیابان میں قربانی کے لیے جانے کی اجازت دی جائے[1] لیکن اب چونکہ وہ فرعون اور اس کی قوم پر اتمام حجت کر چکے تھے اس وجہ سے سنتِ الٰہی کے مطابق ان کو اس علاقے سے ہجرت کا حکم ہو گیا۔ ارشاد ہوا کہ راتوں رات میرے بندوں کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔ 'میرے بندوں' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تھے۔ ان میں عظیم اکثریت تو بنی اسرائیل ہی کی تھی لیکن ایک مختصر جماعت ان میں ان لوگوں کی بھی شامل تھی جو مصریوں میں سے ایمان لائے تھے۔ اوپر جن جادوگروں کے ایمان لانے کا ذکر ہے قرائن شاہد ہیں کہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں بلکہ مصریوں میں سے تھے۔ لفظ 'عِبَادِیْ' ان تمام لوگوں پر مشتمل ہے جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے، عام اس سے کہ وہ مصری تھے یا اسرائیلی۔ قرآن میں ایک مومن آلِ فرعون

[1] استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو قربانی کے لیے مکہ معظمہ لے جانا چاہتے تھے۔

کا ذکر بھی خاص طور پر ہوا ہے۔

قدرتِ خداوندی کا کرشمہ

'فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ' بحر سے مراد یہاں بحرِ احمر کی شمالی خلیج ہے۔ ہدایت ہوئی کہ پوری جماعت کے ساتھ ساحلِ سمندر پر پہنچو اور وہاں اپنی لٹھیا سمندر پر مار کر اس کے اندر سے لوگوں کے لیے خشک راہ پیدا کر لو۔ یہ اسلوبِ بیان اس اختیار کو ظاہر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے معجزے کے ذریعے سے حضرت موسیٰؑ کو بخشا کہ تم اس کے اشارے سے سمندر کو حکم دو گے تو وہ تمہارے گزرنے کے لیے خشک راستہ نکال دے گا۔

'الْبَحْرِ' پر الف لام اس بات کا قرینہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو متعین طور پر اس جگہ کی نشان دہی کر دی گئی تھی جہاں ان کو پہنچنا تھا۔ اس واقعہ کے متعلق تورات میں جو تفصیل آئی ہے وہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ اس موقع پر شانِ خداوندی کس شکل میں ظاہر ہوئی۔ کتاب خروج باب ۱۴ ملاحظہ ہو۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے؟ بنی اسرائیل سے کہہ کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اس کو دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے۔ ....

..... پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔ اور مصریوں نے تعاقب کیا۔" (۱۴: ۱۵-۲۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معجزہ پوربی ہوا کے تصرف سے ظہور میں آیا۔ اس سے خلیج کا پانی اس طرح دو حصوں میں منقسم ہو گیا کہ بنی اسرائیل کے گزرنے کے لیے خشک راستہ پیدا ہو گیا۔

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ (۷۸)

فرعون اور اس کی فوجوں کی غرقابی

'فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ' عربی میں یہ اسلوبِ بیان کسی چیز کی ایسی ہولناکی یا عظمت کے اظہار کے لیے آتا ہے جس کو الفاظ تعبیر کرنے سے قاصر ہوں۔

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے معجزات سے تنگ آ کر اگرچہ فرعون نے ان کو جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن ان کی روانگی کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور اس نے فوج کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور بالآخر اپنی فوج سمیت سمندر کی بے پناہ موجوں کی لپیٹ میں آ گیا اس کی تفصیل تورات میں یوں آتی ہے۔

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ یہ ہم نے کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا۔ تب اس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا اور اس نے چھ سو چنے ہوئے رتھ بلکہ مصر کے سب رتھ لیے اور ان سبھوں میں سرداروں کو بٹھایا۔" خروج باب ۱۴: ۵-۷

اس کے بعد ان کے غرق ہونے کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے:۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور ان کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آگیا اور مصری الٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے مصریوں کو سمندر کے بیچ ہی میں تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا، غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔ پر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ دیوار کی طرح رہا۔" خروج باب ۱۴: ۲۶-۲۹

وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ (۷۹)

قائد کی اصل ذمہ داری

یہ فرعون اور اس کی تباہ کن قیادت پر اظہار افسوس ہے کہ اس نے اپنی گمراہ کن روش کے سبب سے اپنی قوم کو ہلاکت کے سمندر میں غرق کیا، ان کی صحیح رہنمائی نہ کی 'وَمَا هَدَىٰ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قائد اور حکمران کی اصل ذمہ داری اپنی قوم کی صحیح رہنمائی ہے۔ اس کی حیثیت درحقیقت ایک راعی کی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی خلق کے کسی گلہ کی چرواہی اور اس کی حفاظت پر مامور فرماتا ہے۔ بدبخت ہے وہ چرواہا جو اپنی انانیت پر پورے گلے کو بھینٹ چڑھا دے!

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ قَدْ أَنجَيْنَاكُم مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوَاعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۝ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي ۖ وَمَن يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ ۝ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ (۸۰-۸۲)

بنی اسرائیل کو تنبیہ

دریا پار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے عظیم احسانات یاد دلا کر ان کو وہ عظیم ذمہ داری یاد دلائی جو ان احسانات کے حق کے طور پر ان پر عائد ہوتی تھی اور ساتھ ہی اس انجام سے بھی آگاہ فرما دیا جو ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو ان نعمتوں کی ناقدری کریں گے اور شکر کے بجائے کفر اور طغیان کی راہ اختیار کریں گے بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں، الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ یہ مضمون سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم تفصیل کے ساتھ اس کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارات پر اکتفا کریں گے۔ تفصیل کے طالب بقرہ کی تفسیر میں آیات ۴۶-۵۷ کے تحت جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

'وَوَاعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنَ' سے مراد وہ وعدہ ہے جو تورات دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے واسطہ سے بنی اسرائیل سے فرمایا اور جس کے لیے اس نے ان کو طور کے اسی مقدس جانب میں بلایا جہاں مدین سے واپس ہوتے ہوئے حضرت موسیٰ کو نبوت عطا ہوئی — اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی

جو قدر بنی اسرائیل نے کی اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

'وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى' ۔ 'مَنّ' ، 'وسَلْوٰی' کی وضاحت بقرہ آیت ، ۵ کے تحت ہو چکی ہے۔ اس نعمت کی بھی بنی اسرائیل نے جو قدر کی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

'كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ' یہ ان نعمتوں کا حق بیان ہوا ہے۔ اس حق کی یاد دہانی ہر نعمت زبانِ حال سے بھی کرتی ہے اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی کے واسطہ سے لفظوں میں بھی بار بار اس کی ہدایت فرمائی تھی۔ تورات میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ 'وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ خدا کی نعمتوں کی فراوانی تم کو طغیان میں مبتلا نہ کرنے پائے۔ یہ طغیان فرعون کی روایت ہے اور اس کا انجام تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔

'وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى' یعنی اس قسم کا طغیان خدا کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ اور جس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے وہ گر کے رہتا ہے۔ 'گر کے رہتا ہے' یعنی عزت کے عرش سے ذلت کے فرش پر۔ یہ ماجرا بھی تم اپنی آنکھوں دیکھ چکے ہو کہ جو خدائی کا مدعی تھا اس کا انجام کیا ہوا!

'وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى' ۔ یہ ان لوگوں کے لیے راہِ نجات بتا دی جو ان ہدایات پر عمل کا عزم بالجزم رکھتے ہیں۔ فرمایا کہ اس طرح کے لوگوں سے اگر کوئی غلطی صادر ہو تو اس کی اصلاح کا طریقہ توبہ ہے۔ وہ اپنی غلطی سے رجوع کریں، ایمان اور عمل صالح کی تجدید کریں اور آئندہ کے لیے خدا سے مزید ہدایت کے طالب بنیں۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى (۸۳-۸۴)

عربیت کا ایک اسلوب

'اَعْجَلَكَ' کے بعد 'عَنْ' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے جو چھوڑ کر آنے کے مفہوم میں ہو۔ اس لیے کہ 'عن' 'اعجلک' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا اور ہم عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ کرتے آئے ہیں کہ جب فعل اور اس کے صلہ میں مناسبت ظاہری نہ ہو تو وہاں وہ فعل کسی ایسے فعل پر متضمن ہوتا ہے جو اس صلہ سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس اصول کی روشنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے موسیٰ تمھیں اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی چلے آنے پر کس چیز نے ابھارا!

تورات کے حصول کے لیے حضرت موسیٰ کی عجلت

یہ اس موقع کا ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو طور کے اسی مقام پر، جہاں ان کو نبوت عطا ہوئی تھی، تورات دینے کے لیے بلایا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیس دن کی مدت مقرر کی تھی لیکن حضرت موسیٰ فرط شوق میں، قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری حضرت ہارون کے سپرد کر کے، وقت سے کچھ پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ تورات میں اس کا ذکر ہے لیکن اس میں کسی مدت یا حضرت موسیٰ کی کسی عجلت کا ذکر نہیں ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ پہاڑ پر میرے پاس آ اور وہیں ٹھہرا رہ اور میں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت

اور احکام جو میں نے لکھے ہیں دوں گا تاکہ تو انھیں سکھائے اور موسٰیؑ اور اس کا خادم یشوع اٹھے اور موسٰیؑ خدا کے پہاڑ کے اوپر گیا اور بزرگوں سے کہہ گیا کہ جب تک ہم لوٹ کر تمھارے پاس نہ آجائیں تم ہمارے لیے یہیں ٹھہرے رہو اور دیکھو ہارونؑ اور حور تمھارے ساتھ ہیں جس کسی کا کوئی مقدمہ ہو وہ ان کے پاس جائے۔"
خروج باب ۲۴: ۱۲-۱۴

اعراف میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۴۲ - الاعراف)

اور ہم نے موسٰیؑ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی اور موسٰیؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور اصلاح کرتے رہنا اور فساد کرنے والوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔

حضرت موسٰیؑ نے اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ اے میرے رب! میری قوم کے لوگ بھی بس میرے پیچھے ہی ہیں اور میں وقت موعود سے ذرا پہلے تیری خوشنودی کے لیے چلا آیا ہوں۔

حضرت موسٰیؑ کی یہ عجلت، جیسا کہ ان کے ارشاد سے واضح ہے، محض فرطِ شوق کا نتیجہ اور خدا کی رضا طلبی کے لیے تھی۔ اس پہلو سے یہ کوئی برائی نہیں بلکہ محبتِ الٰہی کا تقاضا تھی لیکن یہی عجلت ان کے لیے ایک شدید آزمائش اور ان کی قوم کے لیے ایک سخت فتنہ بن گئی۔ ان کی قوم کے اندر جو اشرار و مفسدین تھے انھوں نے ان کی اس غیبت سے فائدہ اٹھا کر قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا اور حضرت ہارونؑ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود صورتِ حال پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ حضرت موسٰیؑ کی قوم کا مزاج اس وقت تک سخت منفعل تھا۔ سورۂ اعراف میں ان کا حال بیان ہو چکا ہے کہ دریا پار کرنے کے معاً بعد جب ان کو بت پرست قوموں سے سابقہ پیش آیا تو انھوں نے حضرت موسٰیؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لیے بھی اسی طرح کا ایک بت بنا دیں جس طرح کے بت ان قوموں کے پاس ہیں۔ یہ واقعہ حضرت موسٰیؑ کے طور پر جانے سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔ اس پر حضرت موسٰیؑ نے ان مفسدین کو ڈانٹ بھی بتائی تھی۔ حضرت موسٰیؑ اپنی قوم کے مفسدین سے بھی واقف رہے ہوں گے اور اس امر کا بھی سب سے بہتر وہی اندازہ کر سکتے تھے کہ ان بگڑے ہوئے لوگوں کو حضرت ہارونؑ کس حد تک کنٹرول میں رکھ سکیں گے۔ ایسے حالات کے اندر ان کی چند روز کی غیر حاضری بھی قوم کے لیے آزمائش بن سکتی تھی لیکن غلبۂ شوق میں وہ ان پہلوؤں کا کماحقہٗ اندازہ نہ فرما سکے اور اس کا نتیجہ نہایت خطرناک شکل میں سامنے آیا۔

یہ بات ہم جگہ جگہ ظاہر کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام سے اگر کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ اتباع ہوا

کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی وہ حق اور خدا کی رضا طلبی کی راہ میں حدِ مطلوب سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز فی نفسہٖ کوئی برائی نہیں ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ میزانِ حق ہوتے ہیں اور ان کا ہر قول و فعل دوسروں کے لیے نمونہ ہوتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کی اس عجلت پر بھی گرفت ہوئی۔ اس سورہ میں، جیسا کہ آپ تمہید میں پڑھ آئے ہیں، ہمارے حضورؐ کو صبر اور انتظار کی تعلیم دی گئی ہے اس وجہ سے اس میں حضرت موسیٰ کی زندگی سے اس واقعہ کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کی راہ میں صبر اور انتظار ہی کی روش قرینِ مصلحتِ الٰہی ہے ورنہ بعض اوقات نیک سے نیک ارادہ کے ساتھ بھی جو عجلت کی جاتی ہے وہ بہتوں کے لیے مزلّۂ قدم بن جاتی ہے۔

قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ (۸۵)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو خبر دی کہ تم تو ہماری رضا جوئی کے شوق میں قوم کو چھوڑ کر وقت سے پہلے چلے آئے اور تمہارے بعد ہم نے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے اس کو گمراہی میں مبتلا کر دیا۔

'فَتَنَّا قَوۡمَكَ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیت 'فَتَنّٰكَ فُتُوۡنًا' کے تحت ہم کر آئے ہیں۔ افراد ہوں یا اقوام، نیک ہوں یا بد، سب کی آزمائش ہر وقت ہوتی رہتی ہے اور اسی آزمائش کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کھرے اور کھوٹے کو ممیز کرتا ہے۔ یہاں مقصود یہ بتانا ہے کہ ہم نے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈالا اور وہ اس امتحان میں فیل ہو گئی۔ سامری نے اس کو گمراہ کر ڈالا۔

سامری کا فتنہ

سامری کا کوئی ذکر تورات میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کے متعلق صرف اتنی ہی بات علم میں آئی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے اور جو آگے آ رہی ہے۔ تورات کے راویوں نے تو اس سارے فتنہ کو حضرت ہارونؑ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اس نے اس فتنہ کے اصل بانی کا پتہ دیا اور حضرت ہارونؑ کو اس تہمت سے بری کیا۔

سامری کوئی اسرائیلی تھا یا ان مصریوں میں سے تھا جنھوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ ہجرت کی؟ یہ ایک غیر متعلق اور غیر مفید سوال ہے۔ ہم اس غیر ضروری بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ قرآن سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک نہایت ہی فتین اور رکیا د منافق تھا جو محض اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے حضرت موسیٰ کی جماعت میں گھسا ہوا تھا۔ آگے کی آیات سے معلوم ہو گا کہ اس کو متصوفانہ قسم کے کشوف و کرامات کے ڈھونگ رچانے کا فن بھی معلوم تھا۔ اس قسم کے چالاک لوگ بڑی آسانی سے سادہ لوح عوام کو اپنے دامِ فریب میں پھنسا لیتے ہیں۔ اس نے حضرت موسیٰ کی غیر حاضری سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ کچھ تو وقت سے پہلے چلے گئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ تربیت کے تحت ان کی مدتِ قیام میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا۔ اس طرح سامری کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے بنی اسرائیل کے ان تمام عناصر کو اپنے اردگرد اکٹھا کر لیا جو پہلے ہی سے بت پرستانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ اس نے ان کو سمجھایا کہ موسیٰ تو معلوم

نہیں خدا کی تلاش میں کہاں گئے، اگر تم لوگ اپنے زیورات چندے میں دو تو میں تمہارے لیے ایک معبود بنائے دیتا ہوں جو تمہاری رہنمائی کرے گا۔ موسیٰ تو تمھیں یہاں چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے، اب تم کب تک انتظار کرو گے۔ سامری مصر کے فنِ بت گری کا بھی ماہر تھا اس نے لوگوں کے دیے ہوئے زیورات سے ایک بچھڑا بنایا جس کی شکل ایسی تھی کہ جب اس میں سے ہوا گزرتی تو اس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی۔ اس نے اس آواز کو جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، اپنی ایک کرامت کا نتیجہ قرار دیا اور سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا۔
حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس فتنہ سے بچانے کے لیے پورا زور لگایا لیکن جو لوگ حضرت موسیٰؑ کے دبدبہ سے دبے ہوئے تھے ان کو وہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے یہاں تک کہ ان کی جان بھی خطرے میں پڑ گئی اور انھوں نے یہ بھی محسوس فرما لیا کہ اب اگر انھوں نے کوئی مزید قدم اٹھایا تو اس سے فائدہ کے بجائے الٹا نقصان ہوگا، جماعت کا شیرازہ بالکل درہم برہم ہو جائے گا اس وجہ سے انھوں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں۔

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا
حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ (۸۶)

حضرت موسیٰؑ کی واپسی اور قوم پر ان کا عتاب

جب حضرت موسیٰؑ کو اس حادثہ کی خبر ملی تو اس کا جو اثر قدرتی طور پر ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ نہایت غصہ اور غم کی حالت میں قوم کی طرف واپس آئے۔ غصہ تو ان کو مفسدین کی کامیاب شرارت پر تھا کہ انھوں نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور آگے کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح صورتِ حال سامنے نہ ہونے کے سبب سے حضرت ہارونؑ پر بھی تھا کہ ان کو مفسدین سے ہوشیار رہنے کی جو ہدایت انھوں نے فرمائی تھی اس کو ملحوظ رکھنے میں وہ ناکام رہے۔ اور غم اپنی قوم کی اس بدبختی پر کہ میں تو اس کے لیے اللہ کی کتاب لینے گیا اور یہ ایک بچھڑا بنا کر اس کی عبادت میں لگ گئی!

انھوں نے سب سے پہلے قوم کو سرزنش فرمائی کہ نادانو، یہ تم کیا کر بیٹھے! کیا خدا نے تم سے نہایت مبارک وعدہ کتاب و شریعت دینے کا نہیں فرمایا تھا؟ کیا اس وعدے کے پورے ہونے میں اتنی دیر ہو گئی کہ تم صبر نہ کر سکے؟ کیا تم نے یہ چاہا کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو کہ تم اس عہد کو توڑ بیٹھے جو میں تم سے لے کر گیا تھا۔ اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جس کا حوالہ ہم پیچھے نقل کر آئے ہیں کہ طور پر جاتے وقت قوم کے تمام سرداروں کو حضرت موسیٰؑ نے یہ ہدایت فرما دی تھی کہ میں شریعت لینے جا رہا ہوں، جب تک میں واپس نہ آؤں لوگ یہیں ٹھہرے رہیں اور تمام معاملات میں حضرت ہارونؑ کی ہدایات کی پیروی کریں۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا
فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ (۸۷)

اس آیت کے ایجاز کے سبب سے اس کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ ہم

اپنے لفظوں میں اس کا مطلب بیان کریں گے اس کے بعد اس کے الفاظ کی وضاحت کریں گے۔

قوم کے بزرگوں کی معذرت

حضرت موسیٰ نے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، سب سے پہلے قوم کے ان بزرگوں کو سرزنش کی جن پر انھوں نے اپنی غیر حاضری میں لوگوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ڈالی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی مجبوری و بے بسی بیان کی کہ یہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے ارادے اور ہماری مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ لوگوں کے زیورات کی امانت کا جو بوجھ ہمارے اوپر تھا وہ لوگوں کے مطالبے پر ہم نے اپنے سر سے اتار دیا اور اس طرح سامری نے ان کے لیے یہ بچھڑا ڈھال کر تیار کر دیا۔ یعنی یہ جرم سر تا سر سامری اور اس کے فریب میں آئے ہوئے ان عوام کا ہے جن کے زیورات ہماری امانت میں تھے۔ ہم ان کے دباؤ میں آ کر ان کے زیورات ان کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان زیورات سے سامری نے یہ فتنہ کھڑا کر دیا۔

'مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا'۔ 'ملک' کے معنی اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یعنی آپ ہم سے جو عہد لے کر گئے تھے ہم نے اپنے امکان کی حد تک اس پر قائم رہنے کی پوری کوشش کی لیکن حالات اس قدر قابو سے باہر ہو گئے تھے کہ ہمارے لیے عوام کو کنٹرول میں رکھنا ناممکن ہو گیا۔

'وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ'۔ 'زِيْنَةِ الْقَوْمِ' سے مراد لوگوں کے وہ زیورات ہیں جو ان سرداروں کی امانت میں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سفر کی آبادھاپی میں ضائع ہونے کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے قیمتی زیورات بہت سے لوگوں نے ان سرداروں کی امانت میں رکھ دیے تھے اور ان لوگوں نے ایک خدمت سمجھ کر مجبوراً یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ یہ زیورات بنی اسرائیل ہی کے لوگوں کے تھے یا قبطیوں کے؟ اس باب میں تورات کی روایات متضاد ہیں۔ کتاب خروج کے باب ۳۵ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے تھے لیکن اسی کتاب کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ملک چھوڑتے وقت سونے چاندی کے بہت سے زیورات اور ظروف مصریوں سے مستعار لیے تھے لیکن یہ دوسری روایت بالکل خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اوّل تو بنی اسرائیل کو مصر میں یہ حیثیت حاصل نہیں تھی کہ وہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیورات مستعار لے سکیں اور مصری ان کو اپنے قیمتی ظروف تک اٹھا کر ان کو عاریۃً دے دیں بالخصوص ایسے حالات میں جب کہ سالوں سے ان کے اندر ایک شدید کشمکش برپا تھی اور مصری یہ اندیشہ رکھتے تھے کہ بنی اسرائیل ملک چھوڑ کر جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ ثانیاً حضرت موسیٰ شرعی اور اخلاقی پہلو سے یہ گوارا کس طرح کر سکتے تھے کہ وہ دوسروں کے عاریت دیے ہوئے مال پر اپنی قوم کو اس طرح قابض ہونے کی اجازت دیں!! اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے زیورات تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ 'مِنْ حُلِيِّهِمْ' کے الفاظ ہیں۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے زیورات تھے۔

'فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ'۔ 'قذف' کے معنی پھینک دینے اور رقم کر دینے کے

ہیں۔ سرداروں نے کہا کہ ہم نے تو لوگوں کا لادا ہوا بوجھ ناخوش گواری کے ساتھ محض لوگوں کی خدمت کے خیال سے اٹھایا تھا۔ لیکن جب ہم مجبور کر دیے گئے تو ہم نے اس کو سر سے اتار پھینکا۔ عربی زبان کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں 'حملنا'، 'اوزار'، 'قذف'، تینوں ہی الفاظ اس احساس گرانباری کو ظاہر کر رہے ہیں جو ان سرداروں کو اس بار امانت کے سبب سے تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے جب ان کو سرزنش فرمائی تو ان کو خیال ہوا کہ چونکہ یہ بت ان زیورات سے تیار ہوا ہے جو ان کی امانت میں تھے اس وجہ سے ممکن ہے ان کے پیغمبر کو یہ گمان ہو کہ اس سازش میں کچھ ہاتھ ان کا بھی ہے۔ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کا یہ شبہ دور کرنے کے لیے اپنی پوزیشن صاف کر دی کہ اس فتنہ میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے، البتہ لوگوں کے زیورات کا جو بوجھ ہمارے سر پر لادا گیا تھا وہ ہم نے لوگوں کے مطالبہ سے مجبور ہو کر اپنے سر سے اتار پھینکا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ ان کے اس قول سے کہ ہم نے یہ جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا، یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اپنے امکان کی حد تک انھوں نے سامری کے فتنہ سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کی لیکن حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ ان پر قابو پانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ان کی یہ بے بسی چونکہ واضح تھی اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ان کا عذر قبول فرما لیا۔

'فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ' لفظ 'القاء' عربی میں وسیع معنوں میں آتا ہے۔ جس طرح زمین پر کسی چیز کے ڈال دینے یا پھینک دینے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح پانسہ پھینکنے کوئی ہنر دکھانے یا کوئی کرتب دکھانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ سورۂ حج میں انشاء اللہ ہم اس کی تحقیق بیان کریں گے۔ یہاں یہ لفظ ہنر اور کرتب دکھانے کے معنی میں ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۶۵ میں ہے 'اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى' (ساحروں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یا تو تم پہلے اپنا کرتب دکھاؤ یا پھر ہم ہی اپنا ہنر دکھاتے ہیں)

سرداروں نے اس فتنہ کی ساری ذمہ داری سامری پر ڈالی کہ ہم نے مجبور ہو کر زیورات کا بوجھ اپنے سر سے اتار دیا اور پھر اس طرح سامری نے اپنا کرتب دکھایا اور ایک بچھڑا بنا کر اس نے پیش کر دیا

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۵ فَنَسِيَ (۸۸)

اس طرح سامری نے ڈھال کر ایک بچھڑا برآمد کیا۔ 'جَسَدًا'، 'خُوَارٌ' خوار بچھڑے کے ڈکرنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ یعنی اس نے ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سامری مصر کے فن بت گری کا ماہر تھا۔ اس زمانہ میں یہ فن مصر میں عروج پر تھا۔ اعراف کی تفسیر میں ہم اس سور کے بعض نوادر کا ذکر کر چکے ہیں۔ ایک ماہر آدمی کے لیے بچھڑے کا ایک ایسا دھڑ بنا لینا کچھ مشکل کام نہیں ہے جس میں سے ہوا گزرے تو بچھڑے کی سی آواز نکلے۔ سامری نے اس آواز کو اپنی کرامت کا نتیجہ قرار دیا اور عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے ان کو یہ باور کرایا کہ اس نے اس کے اندر حضرت جبریلؑ کے گھوڑے کے سم کی خاک ڈالی ہے جس سے یہ آواز نکلتی ہے۔ اس قسم کے متصوفانہ ڈھونگ رچانے والے تو آج بھی لوگوں کو بڑی آسانی سے احمق بنا لیتے ہیں اور سامری سے کہیں بڑھے بڑھے سامری ہمارے شہر شہر میں موجود ہیں تو اس زمانہ میں بنی اسرائیل جیسی سادہ لوح

قوم کو کسی سامری کے لیے بے وقوف بنا لینا کیا مشکل کام تھا! چنانچہ جو مفسدین اس فتنہ کے بانی تھے انھوں نے یہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ دراصل تمھارا اور موسیٰؑ کا معبود تو یہی ہے لیکن موسیٰؑ اس کو نظر انداز کر کے معلوم نہیں کہاں طور پر چلے گئے اور اس کو بھول گئے۔ اس پروپگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی عظیم اکثریت اس فتنہ میں پھنس گئی۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا (۸۹)

یہ ان سادہ لوحوں کی سادہ لوحی پر اظہار تعجب ہے کہ ان احمقوں نے ذرا نہ سوچا کہ یہ بے جان دھڑ جو نہ ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا اور نہ ان کو کوئی نقصان یا نفع پہنچا سکتا آخر کس مرض کی دوا ہے کہ اس کو معبود بنا بیٹھے! معبود کوئی کھلونا نہیں بلکہ وہ زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ آخر اس سے کون سی ضرورت پوری ہونے والی ہے کہ انھوں نے اس کی عبادت شروع کر دی!

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُونُ مِن قَبْلُ يٰقَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي (۹۰)

حضرت ہارونؑ کی فتنہ سے برأت

یہ حضرت ہارونؑ کی اس فتنہ سے براءت کا اظہار ہے۔ تورات میں تو جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، اس سارے فتنہ کی ذمہ داری حضرت ہارونؑ پر ڈال دی گئی ہے لیکن قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں ان کو اس سے بالکل بری قرار دیا ہے۔ مِن قَبْلُ کے لفظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے جوں ہی اس فتنہ کے ابھرنے کے آثار دیکھے اسی وقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کر دیا کہ لوگو، یہ مفسدین تم کو فتنہ میں مبتلا کر رہے ہیں۔ تمھارا معبود خدائے رحمان ہے نہ کہ تمھارے اپنے ہی ہاتھوں کا ڈھالا ہوا کوئی بچھڑا تو میری بات مانو اور ان مفسدین کے پیچھے نہ لگو۔

قَالُوا لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِينَ حَتّٰى يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسٰى (۹۱)

حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو آگاہ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ان کی کسی نے ایک نہ سنی۔ لوگوں نے جواب دیا کہ اب تو ہم اس کی پرستش پر حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک بہر حال قائم رہیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ آ کر کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ اس فقرے سے یہ بات نکلتی ہے کہ لوگ سامری کے چکمے میں آ کر، حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے علی الرغم ایک شدید حماقت تو کر بیٹھے لیکن بعد میں بہت سے لوگوں کو، جیسا کہ سورۂ اعراف سے واضح ہوتا ہے اپنی اس حماقت کا احساس ہوا۔ مگر ایک حماقت کر گزرنے کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اس سے فوری دست برداری کا اعلان کرنے کے بجائے مجبور ہوئے کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک اسی جہالت پر جمے رہیں۔

قَالَ يٰهٰرُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۝ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي (۹۲-۹۳)

حضرت ہارونؑ سے پرسش

قوم کے سرداروں سے پوچھ گچھ کے بعد حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ کی طرف متوجہ ہوئے جن پر قوم کی دیکھ بھال کی اصل ذمہ داری تھی۔ ان سے پوچھا کہ جب تم نے لوگوں کو گمراہی کی راہ پر جاتے دیکھا تو میری ہدایت کی پیروی کیوں نہ کی، کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ اس حکم سے مراد وہ حکم ہے جو طور پر جاتے وقت وہ حضرت ہارونؑ

اور اپنے مقرر کردہ مانیٹروں کو دے گئے تھے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۲ کے تحت بھی اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ انھوں نے حضرت ہارونؑ کو ہدایت فرمائی تھی کہ میرے بعد جملہ معاملات میں میری جانشینی کرنا اور قوم کے اندر جو مفسد عناصر ہیں ان سے چوکنے رہنا، ان کو سر اٹھانے کا موقع نہ دینا۔ حضرت موسیٰؑ کے سوال کا انداز ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ گمان نہیں تھا کہ حضرت ہارونؑ نے دیدہ دانستہ ان کے حکم کی نافرمانی کی ہے بلکہ وہ ان کا عذر معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر وہ کیا مجبوری پیش آئی کہ وہ اس فتنہ کا سدباب نہ کر سکے اور اس کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔

'مَا مَنَعَكَ' کے بعد بظاہر 'اَلَّا تَتَّبِعَنِ' میں 'لا' کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ ہمارے اہلِ نحو اس کو زائد مانتے ہیں۔ لیکن یہ زائد نہیں ہے بلکہ یہ زبان کے معروف استعمال کے مطابق تاکید کے لیے آتا ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب موجود ہے۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ (۹۴)

حضرت ہارونؑ کی معذرت

حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کا سر اور ان کی ڈاڑھی پکڑ کر ان کو جھنجھوڑا کہ تم نے یہ کیا کمزوری دکھائی! حضرت موسیٰؑ کے اس طرزِ عمل سے ان کی حمیتِ حق بھی نمایاں ہو رہی ہے اور وہ محبت بھی جو فطری طور پر ان کو حضرت ہارونؑ سے تھی۔ اس محبت کا تقاضا یہی تھا کہ جب انھوں نے محسوس فرمایا کہ حضرت ہارونؑ سے دین کے معاملے میں کمزوری صادر ہوئی ہے تو وہ جذبات سے مغلوب ہو گئے اور ان کو انھوں نے سختی سے جھنجھوڑا۔ حضرات انبیاء اور صالحین کا طریقہ یہی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تو رواداری برتتے ہیں لیکن دین کے معاملات میں وہ مداہنت نہیں برتتے۔ اس معاملے میں جو ان سے جتنا ہی قریب ہوتا ہے وہ اس کے لیے اتنے ہی زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اہلِ دنیا کی روش اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ اپنی دنیا کے معاملات میں تو بڑے چوکنے اور زیرک ہوتے ہیں، اپنے باپ اور بیٹے کا بھی محاسبہ کرتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں بالکل بے حمیت اور بے حس ہوتے ہیں۔ بھائی بند جو چاہیں کرتے پھریں ان کی غیرت کو ذرا بھی حرکت نہیں ہوتی!

حضرت ہارونؑ نے اپنی معذرت پیش کی اور انداز خطاب بہت ہی پیارا ہے۔ فرمایا، اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑیے، مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے کوئی سخت قدم اٹھایا تو بنی اسرائیل کے درمیان تفریق ہو جائے گی اور پھر آپ کہیں گے کہ میں نے آپ کی نصیحت پر عمل نہیں کیا اور ملت کے اندر تفریق برپا کر دی۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس فتنہ سے روکنے کی انتہائی کوشش کی لیکن ایک عظیم اکثریت پر سامری کا جادو اس طرح چل چکا تھا کہ لوگوں کو روکنا تو در کنار اندیشہ اس بات کا پیدا ہو گیا تھا کہ مبادا اشرار حضرت ہارونؑ کو قتل کر دیں۔ اب دو ہی صورتیں باقی رہ گئیں تھیں۔ یا تو حضرت ہارونؑ اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہو جائیں یا چند دن حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں۔ پہلی صورت میں اندیشہ

تفریق ملت اور باہمی کشت و خون کا تھا۔ دوسری صورت میں توقع تھی کہ حضرت موسیٰؑ اپنے دبدبہ اور حسن تدبیر سے حالات پر قابو پالیں گے۔ اسی توقع کی بنا پر انھوں نے پہلی صورت اختیار نہ کی کہ اس سے اصلاح کی جگہ فساد کا اندیشہ تھا اور وہ حتی الامکان اس فساد سے قوم کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ (۹۵)

سامری سے بازپرس

تمام ذمہ داروں سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد جب بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ دراصل اس سارے فساد کا بانی سامری ہی ہے تو حضرت موسیٰؑ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت تیکھے انداز میں اس سے سوال کیا کہ سامری! تو بتا، یہ تو نے کیا کیا، یہ کیا ماجرا ہے، یہ کیا فتنہ کھڑا کر دیا!

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ (۹۶)

سامری کا ڈھونگ

سامری نے جب دیکھا کہ اب وہ حضرت موسیٰؑ کی گرفت میں آچکا ہے تو اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ایک بات بنائی جس میں اس نے ایک طرف تو اپنے اس فعل کے لیے ایک وجہ بھی بیان کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اس امر کا اعتراف بھی کر لیا کہ اب مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ جو کچھ بھی میں نے سمجھا تھا یہ محض فریب نفس تھا اور میں غلط فہمی کے سبب سے نفس کے فریب کو ایک حقیقت سمجھ بیٹھا۔

بات تو اس نے یہ بنائی کہ مجھے ایک کشفی مشاہدہ ہوا جو صرف مجھی کو ہوا دوسروں کو نہیں ہوا۔ وہ یہ کہ میں نے دیکھا کہ حضرت جبریلؑ آئے ہیں اور میں نے ان کے نقش قدم (یا ان کے گھوڑے کے نقش قدم) سے ایک مٹھی خاک اٹھا لی ہے اور ایک بچھڑا بنا کر اس کے اندر ڈال دی ہے جس سے وہ بولنے لگا لیکن اب آپ کی اس تنبیہ کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ کوئی کشف کا مشاہدہ نہیں تھا بلکہ یہ محض میرے نفس کا ایک دھوکا تھا جس میں مبتلا ہو کر میں یہ جرم کر بیٹھا۔ سامری نے اس طرح حضرت موسیٰؑ کے سامنے اپنے آپ کو معذور ٹھہرانے کی کوشش کی کہ اس نے یہ جو کچھ کیا ایک کشف کے زیر اثر کیا، بطور خود کسی شرارت کے ارادے سے نہیں کیا۔ لیکن اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب حضرت موسیٰؑ کی گرفت سے اس کے لیے چھوٹنا آسان نہیں ہے اور اس قسم کی ڈھونس ان کے آگے چلنے والی نہیں ہے اس وجہ سے اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ یہ جو کچھ ہوا محض مغالطہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنے نفس کے ایک فریب کو ایک کشف سمجھ بیٹھا اور مجھ سے یہ جرم صادر ہو گیا۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۖ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا (۹۷)

سامری پر لعنت

اس کے اس عذر سے حضرت موسیٰؑ پر اس کی مکاری اور شرارت اچھی طرح واضح ہو گئی۔ انھوں نے اس کے اوپر لعنت کر دی اور عمر بھر کے لیے اس کو یہ سزا دی کہ اب تو یہ کہتا پھرے گا کہ لوگو، میں ناپاک ہوں، نہ کوئی مجھے ہاتھ لگائے اور نہ میں کسی کو ہاتھ لگا سکتا ہوں اور ساتھ ہی اس کو آخرت کے عذاب کی بھی خبر دے دی

کہ ایک عذاب موعود کا دن بھی تیرے لیے آنے والا ہے جس سے تو کسی طرح بھی اپنے کو بچا نہ سکے گا۔ وہ بہر حال شدنی ہے۔

'فَاذْهَبْ' یعنی دور دفع ہو۔ یہ یہاں دھتکارنے کے معنی میں آیا ہے۔

'فِي الْحَيٰوةِ' یعنی تیرے لیے یہ لعنت کی سزا وقتی اور عارضی نہیں ہے بلکہ عمر بھر کے لیے یہ تیرے اوپر مسلط کر دی گئی۔

'لَا مِسَاسَ' کا مفہوم

'أَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ' یعنی تو خود اپنی زبان سے پکارتا پھرے گا کہ میں ناپاک ہوں، نہ مجھے کوئی چھوئے نہ میں کسی کو چھونے کا مجاز ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں جماعت سے کسی شخص کو کاٹ دینے کی سزا موجود ہے۔ احبار باب آیت ۲۱ میں بعض چیزوں کی حرمت بیان کرنے کے بعد ان کے مرتکب کے لیے یہ سزا بیان ہوئی ہے۔

"وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے۔"

جس شخص کو یہ سزا دی جاتی وہ بالکل اچھوت بن کر رہ جاتا۔ نہ اس کی شادی غمی میں کوئی شریک ہوتا، نہ اس کو عبادت خانہ میں جانے کی اجازت ہوتی اور نہ کوئی اس کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیتا۔

اس سے زیادہ سخت سزا کوڑھیوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ احبار کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اس کے کپڑے پھٹے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک۔ جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے وہ ناپاک رہے گا۔ اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہا کرے۔ اس کا مکان لشکر گاہ کے باہر ہو۔ (احبار ۱۳: ۴۵-۴۶)

یہی سزا حضرت موسیٰؑ نے سامری کو دی۔ بس یہ فرق ہے کہ کوڑھی کے لیے یہ سزا صرف اس وقت تک کے لیے تھی جب تک وہ اس مرض میں مبتلا رہے لیکن سامری کو حضرت موسیٰؑ نے یہ سزا عمر بھر کے لیے دی اس لیے کہ وہ منافقت کے کوڑھ میں مبتلا تھا جو ایک اخلاقی اور روحانی کوڑھ جسمانی کوڑھ سے زیادہ غلیظ ہے۔ مزید براں اس پر حضرت موسیٰؑ نے لعنت بھی کر دی جو دین میں سخت ترین سزا ہے۔ قرآن کے الفاظ 'أَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ' اور تورات کے الفاظ "اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک" ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر دیکھیے تب قرآن کے الفاظ کا اصل مقام و محل اور اس کا اصل زور سمجھ میں آئے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی کا خود اپنے ناپاک ہونے کا چلا چلا کر اعلان کرنا اس کی ذلت و رذالت کی آخری حد ہے!

سامری کے معبود کا حشر

'وَانْظُرْ إِلٰٓى إِلٰهِكَ الَّذِيْ' ۔ الآیۃ۔ ساتھ ہی حضرت موسیٰؑ نے اس کے ڈھالے ہوئے معبود کے متعلق بھی فرمایا کہ دیکھ تیری آنکھوں کے سامنے ہم اس کو جلائیں گے اور اس کو راکھ بنا کر سمندر میں بکھیر دیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ اقدام اس لیے فرمایا کہ شرک کے ساتھ آثارِ شرک کا مٹانا ضروری ہوتا ہے تاکہ شرک کے تمام جراثیم کا یک قلم خاتمہ ہو جائے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فتح مکہ کے موقع پر تمام بتوں کا یک قلم خاتمہ

کرا دیا تھا۔

یہاں ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت موسیٰؑ نے سامری کو قتل کی سزا کیوں نہ دی جب کہ اسی جرم کے بہت سے مرتکبین کو، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے، انھوں نے قتل کرا دیا، ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لعنت، جیسا کہ ہم اصحاب سبت کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں، قتل سے زیادہ سنگین اور عبرت انگیز سزا ہے۔ قتل کی سزا تو آناً فاناً ختم ہو جاتی ہے اور اس سے دوسروں کو جو عبرت ہوتی ہے وہ بھی وقتی ہوتی ہے لیکن یہ لعنت کی سزا دنیا اور آخرت دونوں میں آدمی کے ساتھ چپک کے رہ جاتی ہے۔ تصور کیجیے اس انسان کی شومئ قسمت کا جو زندگی بھر خود اپنی زبان سے یہ منادی کرتا پھرے کہ لوگو، میں ناپاک ہوں، کوئی مجھے ہاتھ نہ لگائے! یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ پیغمبر کی لعنت ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی کہیں بھاگ کر چھوٹ سکے۔ پیغمبر کا لعنت کیا ہوا جہاں کہیں بھی جاتا ہے لعنتی ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی!

تورات کی ایک دلچسپ روایت

اس بت سے متعلق قرآن کا ارشاد تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کو جلا کر اور کوٹ پیس کر اس کی راکھ سمندر میں بکھیر دی لیکن تورات میں یہ دلچسپ روایت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کی راکھ پانی میں گھول کر لوگوں کو پلا دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تورات کے راویوں کو روایت گھڑنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے! آخر یہ کون سا شربت روح افزا تھا جو حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو پلانے کے لیے یہ اہتمام فرماتے! اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شاید اسی کا فیض ہے کہ حامل کتاب ہونے کے باوجود شرک اس بدقسمت قوم کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ جس سے نہ کبھی اس کو نجات ملی اور نہ شاید کبھی ملے گی!

اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا (۹۸)

یعنی اس بچھڑے کو جن لوگوں نے معبود بنایا انھوں نے اپنی شامت بلائی۔ تمہارا معبود یہ بچھڑا نہیں بلکہ صرف وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا، توحید کی دلیل ہے کہ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ کوئی چیز بھی اس کے دائرۂ علم سے خارج نہیں ہے تو وہ اپنا کسی کو شریک کیوں بنائے اور دوسرے اس کا کسی کو شریک کیوں قرار دیں۔ جب وہ سب کچھ سنتا جانتا ہے تو وہ تنہا کافی ہے۔ کسی اور کی احتیاج کہاں باقی رہی۔

۴۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۹۹-۱۳۵

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت تمام ہوئی۔ اب آگے وہی مضمون جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا نئے اسلوب اور نئے دلائل کے ساتھ پھر سامنے آ گیا۔ آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ماضی کی یہ سرگزشت جو ہم نے تمھیں سنائی ہے یہ صرف ماضی کی حکایت نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمھارے اور تمھارے مخالفین کے سامنے بھی پیش آ رہا ہے اور پیش آئے گا۔ جو لوگ تمھاری اس یاد دہانی سے اعراض اور دوسروں کو برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ قیامت کے روز اپنا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی ان کو اٹھانا پڑے گا جو ان کے

سبب سے گمراہ ہوں گے۔ اور یہ قیامت کا دن بڑا ہی سخت دن ہوگا۔ اس دن کسی کی کچھ پیش نہیں جائے گی۔ سب کی پیشی خدا ہی کے سامنے ہوگی اور اس کے سامنے کوئی اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کے لیے زبان نہ کھول سکے گا۔ تو ہم نے جو یاد دہانی تم پر اتاری ہے اس کے اندر ہر خطرے سے لوگوں کو آگاہ کر دیا ہے۔ تم اس کو لوگوں کو سنا دو۔ جس کو توفیق ہوگی وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ جو اس سے اعراض کرتا ہے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔

اس کی کوئی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے اور یہ قرآن جس تدریج کے ساتھ اتر رہا ہے اسی تدریج کے ساتھ تم اس کو لوگوں کو سناؤ۔ اسی تدریج و ترتیب میں حکمت ہے۔ اس کے لیے جلدی نہ کرو۔ جلدی میں خیر و برکت نہیں ہے۔ آدمؑ نے جلدی کی تو اس کا نتیجہ اس شکل میں ان کے سامنے آیا کہ شیطان نے ان کو جنت سے نکلوا چھوڑا۔ جو لوگ تم سے نشانئ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کو خود ان کے ملک کی تاریخ کی طرف توجہ دلاؤ۔ اور ان کے طعن و طنز پر صبر کرو اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ نماز کا اہتمام کرو۔ امراء و اغنیاء کے ایمان کے لیے بھی تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ تم ان کے مال و اسباب کے محتاج ہو اور نہ تمہاری یہ دعوت ان کی سرپرستی کی محتاج ہے۔ تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا کفیل اور سرپرست اللہ ہے۔ جو لوگ تم سے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ سب سے بڑی نشانی تمہارے پاس قرآن کی صورت میں آ گئی ہے اور یہ اسی لیے آئی ہے کہ تم پر حجت تمام ہو جائے۔ اگر تم لوگ اس کو کافی نہیں سمجھتے، کسی عذاب ہی کے طالب ہو تو اس کے لیے تم بھی انتظار کرو، میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ آیات ٩٩-١٣٥
لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿٩٩﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿١٠٠﴾ۙ
خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿١٠١﴾ۙ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ
وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴿١٠٢﴾ۚ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ
لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿١٠٣﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ
طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾ وَيَسْــَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ ع ٥ ١٥ ١٤
يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ۙ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ۙ لَّا تَرٰى فِيْهَا
عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ۭ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ

خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَئِذٍ
لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ
عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ
ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ
ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ
صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ
ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ
قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَلَقَدْ
عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قُلْنَا ع ۶ ۱۱ ۱۵
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا
يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ
فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا
تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ
هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا
مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ
وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۡ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ
فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ

عَدُوٌّ ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ
وَلَا يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَّ
نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى ﴿١٢٤﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمٰى
وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ﴿١٢٥﴾ قَالَ كَذٰلِكَ أَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيتَهَا ۚ وَ
كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿١٢٦﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي مَنْ أَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ
بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقٰى ﴿١٢٧﴾ أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ
كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسٰكِنِهِمْ ۗ إِنَّ فِي ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي النُّهٰى ﴿١٢٨﴾ ع وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا ع ١٣ ١٦
وَّأَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ
طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ
لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿١٣٠﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا
مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۗ وَرِزْقُ رَبِّكَ
خَيْرٌ وَّأَبْقٰى ﴿١٣١﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۗ لَا
نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۗ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿١٣٢﴾ وَقَالُوا
لَوْلَا يَأْتِينَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۗ أَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ
الْأُولٰى ﴿١٣٣﴾ وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوا رَبَّنَا
لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّذِلَّ وَ
نَخْزٰى ﴿١٣٤﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوا ۚ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحٰبُ

الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ ع ۸ / ۱۷

ترجمۂ آیات ۹۹-۱۳۵

اسی طرح ہم تمہیں ماضی کی سرگزشتیں بھی سناتے ہیں اور خاص اپنے پاس سے تمہیں ہم نے یاد دہانی عطا کی ہے۔ جو اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ اسی کے تلے ہمیشہ رہیں گے اور قیامت کے دن یہ بہت بھاری بوجھ ہوگا! جس دن صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس دن ہم اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ خوف کے مارے ان کی آنکھیں نیلی پڑی ہوں گی۔ وہ آپس میں چپکے چپکے کہتے ہوں گے کہ بس تم دس دن رہے ہوگے! ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے جب کہ ان میں جو سب سے بڑا لال بجھکڑ ہوگا کہے گا کہ بس زیادہ سے زیادہ ایک دن تم ٹھہرے ہوگے۔ ۹۹-۱۰۴

اور وہ تم سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ میرا رب ان کو گرد و غبار کی طرح اڑا دے گا اور زمین کو بالکل صفا چٹ چھوڑ دے گا۔ نہ تم اس میں کوئی کجی دیکھو گے اور نہ کوئی بلندی۔ اس دن سب پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے۔ مجال نہیں کہ ذرا اس سے کج ہو سکیں اور ساری آوازیں خدائے رحمان کے آگے پست ہو جائیں گی، بس تم صرف کانا پھوسی ہی سنو گے۔ اس دن شفاعت نفع نہ دے گی اِلّا آنکہ خدائے رحمان جس کو اجازت دے اور جس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے۔ وہ ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے سب سے باخبر ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ سب کے چہرے خدائے حی و قیوم کے حضور جھکے ہوئے ہوں گے اور جو کسی شرک کا مرتکب ہوا وہ نامراد ہوا۔ اور جو نیک اعمال کرے گا اور وہ مومن بھی ہے تو اس کو نہ کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی زیادتی کا۔ ۱۰۵-۱۱۲

اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں اتارا اور اس میں ہم نے اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دی ہے تاکہ یہ لوگ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ان کے اندر کچھ سوجھ بوجھ پیدا کرے۔ پس اللہ بادشاہ حقیقی بہت برتر ہے۔ پس تم قرآن کے لیے، اپنی طرف اس کی وحی پوری کیے جانے

سے پہلے، جلدی نہ کرو، اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب میرے علم میں افزونی فرما۔ ۱۱۳-۱۱۴

اور ہم نے اس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی اور جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے انکار کر دیا۔ تو ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے تو تم کو کہیں جنت سے نکال نہ چھوڑے کہ تم محروم ہو کر رہ جاؤ۔ اس میں تم کو یہ مقام حاصل ہے کہ تم اس میں نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے۔ اور نہ تم کو پیاس ستائے گی اور نہ دھوپ لگے گی۔ تو شیطان نے اس کو ورغلایا، کہا کہ اے آدم، کیا میں تمھیں زندگیٔ دوام کے درخت اور ایسی بادشاہی کا سراغ دوں جس پر کبھی کہنگی نہ آئے! تو ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو ان کے ڈھانکنے کی چیزیں عریاں ہوگئیں اور وہ اپنے اوپر باغ کے پتے گانٹھنے گونتھنے لگے اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گئے۔ پھر اس کے رب نے اس کو نوازا، اس کی توبہ قبول کی اور اس کو ہدایت بخشی۔ حکم ہوا کہ تم سب یہاں سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ پس اگر تمھارے پاس میری ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، نہ وہ گمراہ ہو گا اور نہ محروم رہے گا۔ اور جو میری یاددہانی سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے منیق کی زندگی ہو گی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، میں تو بینا تھا! ارشاد ہو گا، اسی طرح دنیا میں ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو نظر انداز کیا تو اسی طرح تو آج نظر انداز کیا جائے گا اور اسی طرح ہم بدلہ دیں گے اس کو جو حدود سے تجاوز کرے گا اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہیں لائے گا اور عذابِ آخرت زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہو گا۔ ۱۱۵-۱۲۷

کیا ان کے لیے یہ چیز ہدایت دینے والی نہ بنی کہ کتنی ہی قوموں کو ان سے پہلے ہم نے ہلاک کر

دیا جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں بے شک اس کے اندر اہل عقل کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں! اور اگر تمہارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی اور ایک اجل معین مقرر نہ ہو چکی ہوتی تو عذاب مسلط ہو کے رہتا۔ تو جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی، اس کی حمد کے ساتھ، تسبیح کرو سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔ اور ان کی بعض جماعتوں کو آسائش زندگی کی جس رونق سے ہم نے ان کی آزمائش کے لیے بہرہ مند کر رکھا ہے اس کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ اور تمہارے رب کا رزق بہتر اور پائدار ہے۔ اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو۔ ہم تم سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم تم کو رزق دیں گے اور انجام کار کی فیروز مندی تقویٰ کے لیے ہے۔ ۱۲۸-۱۳۲

اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اپنے رب کے پاس سے ہمارے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے! کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں میں جو کچھ مذکور ہے اس کی دلیل نہیں پہنچی! اور اگر ہم ان کو اس سے پہلے ہی کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے کہ اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیری ہدایات کی پیروی کرتے! کہہ دو، ہر ایک منتظر ہے تو تم بھی انتظار کرو۔ تم عنقریب جان لو گے کہ سیدھی راہ والے کون ہیں اور منزل پر کون پہنچے۔ ۱۳۳-۱۳۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا (۹۹)

ماضی اور مستقبل دونوں کا آئینہ

'كَذٰلِكَ' کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کی اسی سرگزشت کی طرف ہے جو پیچھے گزری۔ اب یہ آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہم تمہیں ماضی کی یہ اہم سرگزشتیں بھی سنا رہے ہیں اور خاص اپنے پاس سے تمہیں بھی کتاب عطا فرمائی ہے۔ یعنی ماضی میں خدا نے اپنے رسولوں اور ان کے مخالفوں کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ بھی تمہیں سنا دیا ہے اور تمہارے ان مخالفوں کے ساتھ جو معاملہ کرنے والا ہے وہ بھی تمہیں بتا دیا ہے۔ اب اسی آئینے میں اپنا اور اپنے ان

حریفوں کا مستقبل دیکھ لو۔ 'ذکر' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے پچھلے انبیاء اوران کی تعلیمات کا وہ حصہ بھی محفوظ کر دیا ہے جس کو محفوظ رکھنا تھا اور آخری رسول کی حیثیت سے جو ہدایت آنحضرتؐ پر نازل ہونے والی تھی وہ بھی اس میں ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًاۙ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًاۙ (۱۰۰ - ۱۰۱)

مخالفین کو دھمکی

یہ دھمکی ہے ان لوگوں کو جو اس یاددہانی سے اعراض کریں گے۔ فرمایا کہ جو اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے روز ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ ان کے اوپر اپنی گمراہی کا بوجھ بھی ہوگا اور جو لوگ ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے ان کے بوجھ میں سے بھی ان کو اٹھانا پڑے گا۔ 'خٰلِدِيْنَ فِيْهِ' میں ضمیر لفظ 'وزر' کے لازم کے اعتبار سے آئی ہے۔ چونکہ 'وزر' سے مراد اس کا لازمی نتیجہ یعنی عذاب ہے اس وجہ سے فرمایا کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اس بوجھ کی نسبت فرمایا کہ نہایت ہی برا بوجھ ہوگا اس لیے کہ نہ تو اس سے کبھی نجات حاصل ہو سکے گی اور نہ کوئی اس کے اٹھانے میں معین و مددگار ہوگا۔ ہر ایک کو یہ بوجھ خود ہی اٹھانا پڑے گا۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا (۱۰۲)

'زرق' 'ازرق' کی جمع ہے۔ 'ازرق' نیلگوں چشم کو کہتے ہیں لیکن عربی محاورہ میں یہ خوف زدہ اور دہشت زدہ آدمی کے لیے بھی آتا ہے اس لیے کہ شدتِ خوف کی حالت میں آنکھیں نیلی پڑ جایا کرتی ہیں اور ان کے سرخ ڈورے غائب ہو جاتے ہیں۔

اوپر والی آیت میں جس قیامت کا ذکر ہے یہ اس کی تصویر ہے کہ اس دن کو یاد کرو جس دن صور پھونکا جائے گا۔ یہ مجہول کا صیغہ اس کی ہولناکی کی تعبیر کے لیے ہے کہ ایک ہولناک آواز ایک ہلچل تو برپا کر دے گی لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ فرمایا کہ اس دن ہم ان تمام مجرموں کو جو ہماری اس یاددہانی سے برگشتہ ہیں اور دوسروں کو بھی برگشتہ کر رہے ہیں اکٹھا کریں گے اور آج تو وہ بڑی ڈھٹائی سے ہماری تنبیہ کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن اس دن سب کی آنکھیں خوف سے نیلی پڑی ہوں گی۔

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا (۱۰۳)

ایک مغالطہ کا ازالہ

یعنی آج تو یہ قیامت سے بالکل بےخوف اور بےخوف ہیں۔ اول تو اس کو بہت بعید از امکان چیز سمجھتے ہیں اور اگر کسی درجے میں اس کو مانتے بھی ہیں تو یہ خیال کر کے بےفکر ہو جاتے ہیں کہ زندگی، پھر موت، پھر برزخ پھر قیامت یہ اتنی دور کی بات ہے کہ اس کی فکر میں ابھی سے اپنے عیش کو مکدر کرنا حماقت ہے۔ فرمایا کہ آج تو یہ اس کو بہت دور کی چیز سمجھتے ہیں لیکن جب وہ آن کھڑی ہوگی تو آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشی کریں گے اور کہیں گے کہ ان سارے مراحل پر زیادہ سے زیادہ بس دس دن گزرے ہوں گے! یہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ برزخی زندگی کا قیامت کے دن کوئی احساس نہیں ہوگا، ایسا معلوم ہوگا کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے

ہیں۔ رہی یہ دنیا کی زندگی تو جب تک یہ ہے اس وقت تک تو آدمی اسی مغالطہ میں رہتا ہے کہ ابھی بہت عمر باقی ہے لیکن جب وقت آخر آجاتا ہے تب محسوس ہوتا ہے کہ جس چیز کو بہت طویل سمجھے تھے وہ بہت مختصر نکلی۔ خاص طور پر غفلت میں جو زندگی گزرتی ہے وہ آنکھ کھلنے کے بعد بس ایک خواب معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے اسی غفلت پر یہاں متنبہ کیا ہے کہ اصل اعتبار آج کے احساس کا نہیں کہ یہ تو یکسر مغالطہ ہے بلکہ اس احساس کا ہے جو حقیقت کے سامنے آنے کے بعد ہوگا۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا (۱۰۴)

یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم اس دن کے احوال و احساسات کی یہ خبر جو دے رہے ہیں یہ محض ہوائی باتیں ہیں جو صرف مرعوب کرنے کے لیے سنائی جا رہی ہیں بلکہ یہ حقائق ہیں جو پیش آئیں گے۔ اس دن لوگ جو کچھ کہیں گے ان سے سب سے زیادہ واقف ہم ہیں۔ یہ دس دن والی بات تو الگ رہی اس دن ان کے اندر جو سب سے زیادہ معقول دانشمند اور اندازہ دان سمجھا جاتا ہوگا وہ یہ کہے گا کہ دس دن کہاں! بس زیادہ سے زیادہ ایک دن تم دنیا میں رہے ہوگے!

'امثل' کے معنی

'امثل' کے معنی افضل و برتر کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ بطریق تعریض استعمال ہوا ہے یعنی ان کے اندر جو سب سے زیادہ لال بجھکڑ مانا جاتا ہوگا وہ اپنی اندازہ دانی کا یہ ثبوت فراہم کرے گا!

عرب جاہلیت کی شاعری پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ ان آیتوں میں جس مغالطہ پر متنبہ کیا گیا ہے اسی مغالطہ میں مبتلا ہو کر بہت سے شاعروں نے قیامت کو 'حدیث خرافہ' یعنی ایک مہمل بات قرار دیا ہے۔ میں ان شعروں کے نقل کرنے سے قصداً احتراز کر رہا ہوں اور ان کے نقل کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے اس لیے کہ یہ مغالطہ صرف دورِ جاہلیت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس دورِ تمدن کے لوگوں کا بھی اصل مغالطہ یہی ہے ــــ قرآن نے یہاں اسی مغالطہ پر متنبہ کیا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (۱۰۵-۱۰۷)

'نسف' کے معنی

'نسف' کے معنی ہیں کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینا، غلہ کو چھاج میں رکھ کے پھٹکنا، کسی چیز کو خس و خاشاک اور خاک اور راکھ بنا کر ہوا میں اڑا دینا۔

'یذرھا' میں ضمیر کا مرجع زمین ہے۔ ظاہر اور مشہور چیزوں کے لیے عربی میں اس طرح ضمیر لاتے ہیں۔ قرآن میں آسمان اور زمین وغیرہ کے لیے اس طرح متعدد جگہ ضمیریں آئی ہیں 'مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ' (اور روئے زمین پر کسی جاندار کو باقی نہیں چھوڑے گا) میں بھی ضمیر کا مرجع زمین ہے اگرچہ الفاظ میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

'قاع صفصف' کا مفہوم

'قاع صفصف' ہموار اور چٹیل میدان کو کہتے ہیں جس میں نہ نشیب و فراز ہو، نہ سبزہ و نباتات، نہ

درخت اور جنگل۔

'امت' بلندی اور فراز کو کہتے ہیں۔

پہاڑوں کے غیر فانی ہونے کا نظریہ اور اس کا ابطال

قیامت کے باب میں اہل عرب کو جس طرح وہ مغالطہ تھا جو اوپر مذکور ہوا اسی طرح وہ اس مغالطہ میں بھی مبتلا تھے کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی دن روئے زمین سے یہ تمام پہاڑ غائب ہو جائیں۔ عوام تو درکنار ان کے بہت سے دانشوروں تک کا خیال یہ تھا کہ پہاڑ غیر فانی ہیں۔ زہیر جو عرب کے حکیم شعراء میں سے ہے کہتا ہے کہ

الا ارٰی علی الحوادث باقیا

ولا خالدا الا الجبال الرواسیا

(حوادث روزگار کے مقابل میں ان مستحکم پہاڑوں کے سوا میں اور کسی چیز کو بھی قائم و دائم رہنے والی خیال نہیں کرتا)

جب قرآن لوگوں کو قیامت کے زلزلہ سے ڈراتا تو اسی مغالطہ کی بنا پر بہت سے نادان آنحضرت صلعم سے طنز اور مذاق کے انداز میں، سوال کرتے کہ جب قیامت آئے گی تو ان عظیم الشان پہاڑوں کا کیا بنے گا؟ کیا وہ ان کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکے گی! فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ ہاں! میرا رب ان کو بھی پاش پاش کر کے گرد و غبار کی طرح اڑا دے گا اور اس زمین کو بالکل صفاچٹ چھوڑ دے گا، نہ اس میں کسی سبزہ اور درخت کا نشان ہوگا اور نہ اس میں وادیاں اور کہسار اور نشیب و فراز ہوں گے!!

عرب جاہلیت تو پہاڑوں کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک پہاڑ ہی بڑی چیز تھے لیکن اس زمانے کا انسان خود اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھتا ہے اور اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ بہت جلد ساری کائنات کو مسخر کر لے گا۔ اس زعم کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک قیامت کا سوال بالکل خارج از بحث ہے!!

يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۚ وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا (۱۰۸)

'همس' کے معنی باریک اور پست آواز کے ہیں جو کانا پھوسی کی نوعیت کی ہو۔

فرمایا کہ آج تو لوگ ہمارے داعی کی بات نہیں سن رہے ہیں، وہ صراط مستقیم کی دعوت دے رہا ہے تو یہ کج ہو کے چل رہے ہیں، اس کی مخالفت میں گلے پھاڑ رہے ہیں۔ لیکن اس دن کا داعی جب پکارے گا تو سب اس کے پیچھے چل پڑیں گے، کسی کی مجال نہ ہوگی کہ سرمو اس سے انحراف کر سکے اور خدائے رحمان کی ہیبت کے آگے سب کی آوازیں پست ہو جائیں گی، کسی کے حلق سے بھی آواز نہیں نکلے گی۔ جو بھی بات کرے گا سرگوشی اور کانا پھوسی کے انداز میں بات کرے گا۔

شفاعت کے لیے شرائط

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (۱۰۹)

'الّا' استثناء میرے نزدیک یہاں منقطع ہے۔ یہ عربوں کی مزعومہ شفاعت کی تردید ہے۔ ان کا زعم یہ تھا کہ وہ جن معبودوں کو پوجتے ہیں وہ خدا کے لاڈلے اور چہیتے ہیں، وہ خود آگے بڑھ کر اپنے پجاریوں میں سے جس کو چاہیں گے

سفارش کریں گے اور اس کو خدا سے چھڑا لیں گے۔ ان کے اس زعم کی تردید میں فرمایا کہ اس دن کسی کی شفاعت کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں ہے الا آنکہ خدائے رحمان کسی کو شفاعت کی اجازت دے اور کسی کے بارے میں وہ کسی کے کچھ کہنے کو پسند فرمائے۔ یعنی جو شفاعت کرے گا وہ بھی خدا کی اجازت سے کرے گا اور جس کے لیے شفاعت کی جائے گی وہ بھی بایں شرط مشروط ہے کہ خدا اس کے بارے میں کسی کے سفارش کرنے کو پسند فرمائے۔ مطلب یہ ہے کہ کام آنے والی شفاعت بیک وقت ان دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر کسی نے شفاعت سے متعلق ان شرائط سے قطع نظر کرکے کوئی اپنا نظریہ ایجاد کر رکھا ہے تو وہ محض اس کا واہمہ ہے جس کی حقیقت قیامت کے دن اس کے سامنے آجائے گی۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۲۸ کے تحت انشاء اللہ اس مضمون کی مزید وضاحت آئے گی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا (۱۱۰)

اس ٹکڑے کی شرح آیت الکرسی کے تحت وضاحت سے ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کا علم سب کو محیط ہے۔ ہر ایک کے ماضی و مستقبل اور حاضر و غائب سب سے وہ واقف ہے۔ دوسرے کسی کی یہ حیثیت نہیں کہ اس کا علم خدا کے علم کا احاطہ کر سکے تو یہ مقام کس کا ہے کہ وہ کسی کے باب میں خدا کے علم میں کوئی اضافہ اور اس بنیاد پر اس کے حق میں کوئی سفارش کر سکے! خدا کسی کے متعلق کسی سے یہ معلوم کرنے کا محتاج نہیں ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے، اس کے اعمال کیا رہے ہیں اور وہ کیا معاملہ کیے جانے کا مستحق ہے؟ یہ ساری چیزیں اس کے علم میں موجود ہیں۔ اس مسئلے پر سورۂ مریم کی آیت ۶۴ کے تحت جو بحث گزر چکی ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا (۱۱۱)

'عنو' کے معنی فروتنی اور عجز و تذلل کے اظہار کے ہیں اور 'ظلم' سے مراد، جیسا کہ ہم متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں، شرک ہے۔

شفاعتِ باطل کے امیدواروں کے ایک زعم کی تردید

یہ شفاعت باطل کے امیدواروں کے ایک اور زعم باطل کی تردید ہے۔ وہ اپنے جن مزعومہ شرکاء کو اپنا سفارشی سمجھے بیٹھے تھے ان کے متعلق یہ گمان بھی رکھتے تھے کہ خدا کے ہاں ان کو بڑے ناز و تدلل کا مقام حاصل ہے' وہ جو بات چاہیں خدا کے سامنے جرأت و اعتماد اور رندانہ اصرار کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں اور خدا کو ان کی ناز برداری اس قدر محبوب و مطلوب ہے کہ وہ بہر حال ان کی بات مانتا اور ان کی سفارش پوری کرتا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس قسم کے واہمہ میں مبتلا ہیں وہ اس کو اپنے ذہن سے نکال ڈالیں۔ خدا کے سامنے کسی کو بھی ناز و تدلل کا مقام حاصل نہیں ہے۔ اس کے سامنے ناز و تدلل کے بجائے سب کے چہرے خشیت و تذلل کے ساتھ جھکے ہوئے ہوں گے۔

یہاں اسمائے حسنیٰ میں سے 'حی' اور 'قیوم' کا حوالہ ہے۔ ان اسماء کے حوالہ کا ایک خاص محل ہے۔ مشرکین عرب کے متعلق ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ جہاں تک خدا کے ماننے کا تعلق ہے وہ خدا کو مانتے تھے لیکن اپنے شرکیہ عقائد کے تحت اس کی حیثیت انھوں نے بالکل وہ بنا کے رکھ دی تھی جو معاذ اللہ گھر کے ایک بڑے بوڑھے ناکارہ وجود کی ہوتی ہے جو اپنی ساری ذمہ داریاں دوسروں کے سپرد کرکے خود گوشہ نشین بن کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس

تصور نے ان کو خدا سے بالکل بے نیاز کر کے ان کا سارا اعتماد ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر جما دیا تھا۔ یہاں قرآن نے ان کے اس زعم باطل پر بھی ضرب لگائی اور فرمایا کہ خدا کوئی ناکارہ وجود نہیں بلکہ زندہ خدا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی اس دنیا کے سارے معاملات کو دوسروں کے اوپر چھوڑ کر کسی گوشہ میں ایک خاموش علۃ العلل بن کر نہیں بیٹھا ہے بلکہ قیوم، یعنی اس کائنات کے سارے نظم کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو خود اپنی نگرانی اور اہتمام میں چلا رہا ہے۔

شرک باعثِ نامرادی ہے

'وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا'۔ ظلم سے مراد شرک ہے اور یہاں اس لفظ کی تنکیر اس بات پر دلیل ہے کہ شرک کی جس نوع کا بھی کوئی مرتکب ہوگا وہ آخرت میں خاسر اور نامراد ہوگا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی شخص بت پرستی کرے بلکہ اس کی جلی اور خفی بہت سی قسمیں ہیں اور اس کی ہر قسم باعث خسران و نامرادی ہے۔ ہم اس کی مختلف قسموں کی وضاحت اپنی اس کتاب میں بھی موقع موقع سے کر رہے ہیں اور اس موضوع پر 'حقیقت شرک' کے عنوان سے ہم نے مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۱۱۲)

'ظلم' اور 'ھضم' کا مفہوم

'ظلم' اور 'ھضم' دونوں لفظ جب ایک ساتھ استعمال ہوں تو 'ظلم' کے اندر حق تلفی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور 'ھضم' کے اندر غصب اور تعدی کا۔ یعنی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کا حق جو آپ پر عاید ہوتا ہے آپ اس کو دبا بیٹھیں۔ یہ ظلم ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ تعدی کر کے دوسرے کے پاس جو کچھ ہے اس کو چھیننے اور غصب کرنے کی کوشش کریں۔ یہ 'ھضم' ہے۔

اوپر والی آیت میں فرمایا کہ جو کسی نوع کے شرک کا مرتکب ہوا وہ نامراد ہوا۔ یہ اس کے مقابل میں فرمایا کہ جو اعمال صالحہ کرے گا اور وہ مومن بھی ہو تو وہ اپنے اعمال کا بھرپور صلہ پائے گا۔ نہ اس کو کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی تعدی کا۔

'وَهُوَ مُؤْمِنٌ' کا مفہوم ظاہر ہے کہ یہاں یہ ہے کہ وہ توحید پر قائم رہتے ہوئے نیک اعمال کرے۔ اگر اس میں شرک کی کوئی آلودگی ہو تو پھر اس کے اعمال کی خدا کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر کوئی عمل خدا کی رضامندی کے لیے نہ کیا جائے بلکہ کسی اور غرض کے لیے کیا جائے تو اس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے اگرچہ وہ بظاہر نیکی ہی کا کام کیوں نہ ہو!

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا (۱۱۳)

اصل سلسلۂ کلام نئی تمہید کے ساتھ

اس کا عطف اوپر والی بات پر ہے جہاں سے یہ سلسلۂ کلام چلا ہے۔ آیات ۹۹-۱۰۰ میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے خاص اپنے پاس سے تمھیں یہ یاددہانی (قرآن) عطا فرمائی ہے تو جو اس سے منہ موڑیں گے وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ اس کے بعد انذار کے لیے قیامت کا ذکر آگیا تھا۔ قیامت کے ذکر کے بعد وہی اصل مضمون ایک نئی تمہید اور مزید تفصیل کے ساتھ از سرِ نو آگیا۔ فرمایا کہ اسی مقصد تذکیر کے لیے ہم نے

یہ قرآن عربی زبان میں اتارا ہے اور اس میں گوناگون پہلوؤں سے ان عواقب و نتائج کی وضاحت کر دی ہے جن سے اس کی تکذیب کرنے والوں کو لازماً دوچار ہونا پڑے گا تاکہ لوگ اگر تقویٰ اور خدا ترسی کی راہ اختیار کرنا چاہیں تو وہ اختیار کریں اور اگر یہ نہیں تو پھر ہماری طرف سے ان کو یاددہانی ہو جائے تاکہ اگر وہ ہماری پکڑ میں آئیں تو وہ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو یاددہانی نہیں کی گئی۔

اہل عرب پر قرآن کا اتمام حجت

'قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا' کے الفاظ یہاں اہل عرب پر بطور اظہار احسان و امتنان کے بھی ہیں اور بطور اتمام حجت و قطع عذر کے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کو عربی زبان میں اتار کر ان لوگوں پر اپنا سب سے بڑا فضل بھی فرمایا کہ اپنی تذکیر و تعلیم کے لیے انہی کی زبان کو منتخب کیا اور اس طرح ان پر حجت بھی تمام ہو گئی۔ اب یہ قیامت کے روز یہ عذر نہیں کر سکتے کہ اگر ان کے پاس کوئی رسول، ان کی اپنی زبان میں کوئی کتاب لے کر آتا تو یہ سب سے زیادہ ہدایت کے اختیار کرنے والے بنتے۔ اس قرآن نے ان تمام عذرات کا خاتمہ کر دیا!

'صَرَّفْنَا فِیْهِ مِنَ الْوَعِیْدِ' تصریف کا مفہوم ہم متعدد جگہ واضح کر چکے ہیں کہ کسی بات کو گوناگون و بوقلموں اسالیب سے پیش کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو یہ کتاب ہم نے ان کی اپنی زبان عربی میں اتاری، پھر یہ کہ اس سے اعراض کے جو نتائج ہوں گے ان کو مبہم نہیں چھوڑا بلکہ ان کو عقل کے، نقل کے، تاریخ کے، آفاق کے، انفس کے دلائل سے اچھی طرح مبرہن کر دیا ہے۔ اب اگر اس اہتمام کے بعد بھی یہ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو نتائج کی ذمہ داری خود ان پر ہے!

'لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ اَوْ یُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا' یعنی اصل مقصود تو اس تمام اہتمام سے یہ ہے کہ ان کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی پیدا ہو اور اگر یہ نہیں تو ان کو ہماری طرف سے یاددہانی ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں کس لیے برپا کیے گئے تھے اور اب کیا بنا رہے ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن نے عربوں کو ان کی وہ اصل تاریخ بھی از سر نو یاد دلائی ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے ان کے باپ حضرت اسماعیلؑ کو اس سرزمین میں ایک خاص مشن کے ساتھ بسایا تھا۔ اس کی وضاحت دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ ہو چکی ہے۔ آیت میں 'احداث' کا لفظ اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ 'احداث ذکر' کا اصل مفہوم کسی سرگزشت کی از سر نو یاددہانی ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤى اِلَیْكَ وَحْیُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۱۱۴)

نزول قرآن کے لیے آنحضرتؐ کے اندر بے قراری کی اصل وجہ

اس آیت کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرنے کے لیے سورۂ مریم کی آیات ۶۴-۶۵ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ مخالفین کی تمام مخالفتوں اور ژاژخائیوں کے مقابلہ کے لیے آنحضرت صلعم کے پاس واحد ہتھیار قرآن ہی تھا۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کے اترنے کے لیے آپؐ کے اندر ایک بے قراری اور بے چینی پائی جاتی تھی۔ اسی سے مشکلات میں آپؐ کو رہنمائی ملتی تھی، یہی چیز الجھنوں اور پریشانیوں میں تسلی کا ذریعہ بنتی تھی اور مخالفین جو نت نئے مطالبات و اعتراضات روز روز پیش کرتے ان کے فیصلہ کن جواب بھی قرآن

ہی دے سکتا تھا۔ ان وجوہ سے اس سپاہی کی طرح جو دشمنوں کی دَل بادل فوج کے مقابل میں نبرد آزما ہو، آپ کو ہر وقت اس آسمانی کمک کا انتظار رہتا۔ حضورؐ کی اسی پریشانی کو دور کرنے کے لیے ارشاد ہوا کہ تم قرآن کے اتارے جانے کے لیے جلدی نہ کرو۔ خدا کی ذات بڑی ہی برتر اور بلند ہے۔ اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہ خود ہی جانتا ہے۔ وہی اس کائنات کا بادشاہ حقیقی ہے اور تم جو یاد دہانی لوگوں کو سنا رہے ہو وہ اسی بادشاہ حقیقی کا فرمان ہے۔ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ تم لوگوں کے رد و قبول سے بالکل بے نیاز ہو کر جس تدریج اور ترتیب سے یہ اتر رہا ہے لوگوں کو سناتے رہو۔ اس کی تکمیل کے لیے خدا نے جو مدت مقرر کر رکھی ہے وہ اس کی حکمت و مصلحت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس مدت سے پہلے اس کے اتار دیے جانے کے لیے جلدی نہ کرو۔ البتہ یہ دعا برابر کرتے رہو کہ اے رب میرے علم کو زیادہ کر!

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اسی سیاق و سباق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ہمارے مفسرین نے ان آیات کو اس محدود مفہوم میں لیا ہے کہ حضرت جبریلؑ جب آنحضرتؐ کو وحی سناتے تو آپؐ اس کو سیکھنے میں عجلت کر دیتے جس پر آپؐ کو ٹوکا گیا۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ جس چیز کے لیے شوق و بے قراری ہو، جذبۂ شوق اس کے لیے جلد باز بنا دیتا ہے، ہمارے پاس اگر کوئی ایسا نامۂ محبت آئے جس کے لیے ہم نے بے چینی کی گھڑیاں گزاری ہوں تو ہم یہی چاہیں گے کہ اس کو ایک ہی سانس میں پورا پڑھ ڈالیں۔ یہ جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور قرآن کے معاملہ میں حضورؐ کے اندر یہ جذبہ ضرور رہا ہوگا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ یہاں آپؐ کو اس چیز پر ٹوکا گیا ہے۔ اس کا اصل پس منظر وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ آگے بھی اس مضمون کی آیات جگہ جگہ آئیں گی۔ ان سے انشاء اللہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا (۱۱۵)

'عَهِدْنَآ إِلَىٰ' کا مفہوم ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں۔ یہ اسلوبِ بیان کسی کو کوئی خاص ہدایت یا وصیت تاکید و اہتمام کے ساتھ کرنے کے لیے آتا ہے۔

عجلت سے احتراز کی ہدایت

اوپر کی آیت میں آنحضرتؐ کو قرآن کے معاملہ میں جلدی کرنے سے روکا ہے۔ اب اس جلدی کے نقصانات واضح کرنے کے لیے حضرت آدمؑ اور ابلیس کے ماجرے کا حوالہ دیا ہے کہ یہی عجلت آدمؑ کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہوئی۔ انسانی فطرت کے اسی ضعف سے ابلیس نے فائدہ اٹھایا اور آدمؑ کو ورغلا کر اللہ کی اس ہدایت سے غافل کر دیا جو ان کو ایک خاص درخت کے پھل سے احتراز کے لیے کی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ آدمؑ کو جنت سے نکل کر اس دنیا کے دار الابتلاء میں آنا پڑا۔ مقصود اس ماجرے کی یاد دہانی سے یہ ہے کہ یہ عجلت کسی کو بھی راس نہیں آئی ہے۔ اوپر حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت میں بھی یہ حقیقت واضح فرمائی گئی کہ ان کی عجلت بھی ان کو راس نہیں آئی بلکہ ان کے اور ان کی قوم کے لیے ایک سخت آزمائش بن گئی۔ ان واقعات کے پردے میں آنحضرتؐ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آپ بھی اپنی دعوت کے معاملے میں جلدی نہ کریں بلکہ صبر و عزم کے ساتھ درجہ بدرجہ جس

طرح آپ کو ہدایت کی جا رہی ہے اپنے کام میں لگے رہیں۔ اگر آپ نے جلدی کی تو، خواہ وہ کتنے ہی اچھے مقصد کے لیے ہو، اس سے اندیشہ اس بات کا ہے کہ آپ کی امت کی تربیت میں خامی رہ جائے اور کوئی شیطان یا سامری اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو ایک فتنہ میں مبتلا کر دے۔

'مِنْ قَبْلُ' ماضی کی سرگزشت کی یاد دہانی ہے۔ یعنی جس طرح آج تمھیں عجلت نہ کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے اسی طرح پہلے تمھارے اور تمام نسل آدم کے باپ آدم علیہ السلام کو بھی ہدایت کی گئی تھی لیکن وہ اس کو ملحوظ نہ رکھ سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شیطان کے فریب میں آ گئے۔ چونکہ ماضی کے تجربات، بالخصوص جب کہ وہ اپنے ہی ابوالآباء کی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوں، نسل حاضر و مستقبل کے لیے نہایت سبق آموز ہوتے ہیں اس وجہ سے اشارہ فرمایا کہ پہلے کے واقعات و تجربات کو پیش نظر رکھو۔

'فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا' 'نسی' یہاں نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی حضرت آدمؑ کو جو ہدایت کی گئی ایک وقتی جذبۂ عجلت سے مغلوب ہو جانے کے سبب سے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور وہ مضبوط عزم کے ساتھ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ حضرت آدمؑ کو جو ہدایت کی گئی تھی اور ان سے جو لغزش صادر ہوئی اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اس آیت میں صرف یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ جذبات و داعیات جتنے بھی ہیں سب انسانی سرشت کے اجزا ہیں لیکن ان کے لیے حدود و قیود ہیں۔ اگر وہ اپنے حدود کے اندر رہیں تب تو وہ فرد اور معاشرہ سب کے لیے خیر و برکت ہیں لیکن اگر ان میں سے کسی کی باگ ذرا ڈھیل چھوڑ دی جائے تو پھر وہ فرد اور سماج دونوں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ ان داعیات و جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے آدمی کو اپنے اندر صبر اور عزم کی صفت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ اسی صفت کو پیدا کر کے آدمی اپنے رہوار نفس کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ ورنہ معلوم نہیں کون سا جذبہ اس کو کس فتنہ میں مبتلا کر دے۔ عجلت بھی انسان کے جذبات میں سے ایک جذبہ ہے اور یہ اس کی سرشت میں داخل ہے۔ خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انبیاء - ۳۷) اور وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا (اسراء - ۱۱) وغیرہ آیات میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ انسان کے لیے نافع اسی وقت تک ہے جب تک یہ آدمی کے صبر اور عزم کے کنٹرول میں رہے۔ اگر یہ صبر اور عزم پر غالب ہو جائے تو پھر یہ انسان کے لیے بہت بڑا خطرہ بھی بن سکتا ہے۔

'وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا' عزم کا صحیح مفہوم صبر اور عزیمت و استقامت ہے، جس کا ضد بے صبری اور جلد بازی ہے۔ یہاں اصل مقصد کلام حضرت آدمؑ کی بے صبری اور جلد بازی ہی کی طرف اشارہ کرنا اور اس کے عواقب سے آنحضرتؐ کو آگاہ کرنا ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ (۱۱۶)

اجمال کے بعد تفصیل

اوپر والی آیت میں قصۂ آدم و ابلیس کا وہ خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے جو یہاں اس کے بیان سے مد نظر ہے۔ اس کے بعد اب اصل قصہ کی تفصیل آ رہی ہے۔ قصوں کی تفصیل سے پہلے ان کا خلاصہ نگاہ کے سامنے کر دینے

سے نظم کلام کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ اسلوبِ بیان قرآن نے جگہ جگہ اختیار کیا ہے۔ اصحاب کہف کے واقعہ کے بیان کرنے میں بھی قرآن نے یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے اور ہم اس کی وضاحت اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

قصۂ آدم و ابلیس کا سبق

فرمایا کہ، یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو تعظیم بجا لاؤ تو سب نے اس حکم کی تعمیل کی مگر ابلیس نے اس کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ یہ ماجرا سورۂ بقرہ اور اعراف میں بھی بیان ہو چکا ہے اور ہم وہاں اس کے ہر جزو پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ بقرہ کی آیات ۳۰-۳۹ کے تحت تدبر قرآن جلد اول کے صفحات ۱۱۲-۱۳۰ پر اور اعراف کی آیات ۱۱-۱۴ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس حکم کی حکمت، سجدہ کی نوعیت، فرشتوں کے ساتھ اس حکم میں جنات کی شرکت کی علت، ابلیس اور اس کے غرور و استکبار، ہر چیز پر اپنے علم کے حد تک ہم نے گفتگو کی ہے۔

فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ (۱۱۷)

ابلیس نے صرف سجدہ کرنے ہی سے انکار نہیں کیا بلکہ، جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیات ۱۴-۲۲ کے تحت ہم وضاحت سے بیان کر آئے ہیں اس نے جوشِ حسد میں خود اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج کیا کہ اگر تو مجھے آدمؑ اور اس کی ذریت کو ورغلانے کی مہلت دے دے تو میں یہ ثابت کر دوں گا کہ نہ یہ مجھ پر کسی فضیلت کے سزاوار ہیں اور نہ اس جنت کے حقدار ہیں بلکہ میں ان میں سے اکثر کو اپنا مرید و ہمنوا بنا لوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو اس کو مہلت دے دی کہ جا تو جس کو ورغلا سکتا ہے ورغلا لے، میں تجھ کو اور تیرے سارے مریدوں کو جہنم میں جھونک دوں گا اور دوسری طرف حضرت آدمؑ کو آگاہ فرما دیا کہ تم جنت میں رہو لیکن اس امر کو یاد رکھو کہ ابلیس تمہارا ابدی دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں کسی گمراہی میں مبتلا کر کے جنت سے نکلوا چھوڑے اور تم محروم و نامراد ہو کر رہ جاؤ۔

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ (۱۱۸-۱۱۹)

جنتِ آدم کی جامع تعریف

ان دو آیتوں میں اس جنت کی نہایت ہی جامع تعریف ہے جس میں حضرت آدمؑ رکھے گئے تھے۔ فرمایا کہ اس میں نہ تم بھوکے ہوگے نہ ننگے، نہ اس میں تمہیں پیاس ستائے گی نہ دھوپ۔ دوسرے لفظوں میں اگر اس بات کو کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں تم سردی اور گرمی دونوں کے آزار سے محفوظ رہوگے۔ سردی کے آزار میں سے بھوک اور عریانی ہے اور گرمی کی تکالیف میں سے پیاس اور دھوپ۔ جن لوگوں کی نظر اہلِ عرب کے کلام پر ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ بسا اوقات سردی اور گرمی کی تکالیف کا ذکر اسی طرح کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ اور دھوپ کا ذکر عریانی کے ساتھ زیادہ موزوں ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہ رائے عربیت کے ذوق سے محرومی کا نتیجہ ہے۔

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (۱۲۰)

آدمؑ پر ابلیس کا کامیاب حملہ

ابلیس اگرچہ استکبار اور حکمِ خداوندی کی نافرمانی کے باعث جنت سے راندہ ہو چکا تھا لیکن اس نے قیامت تک کے لیے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ پر اپنا چلتر آزمانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت حاصل کر لی تھی اس وجہ سے

وہ حضرت آدمؑ کے پاس جنت میں بھی وسوسہ اندازی کے لیے پہنچ گیا اور ان کو سمجھایا کہ ایک خاص درخت کے پھل سے جو تمھیں روک دیا گیا ہے اس کا راز یہ ہے کہ ابدی زندگی اور ابدی بادشاہی کا درخت وہی ہے۔ اگر تم ابدی زندگی اور لازوال بادشاہی چاہتے ہو تو اس درخت کا پھل چکھو ورنہ آخر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم اس جنت میں ہمیشہ رہو گے! اول تو انسان کے اندر یہ کمزوری موجود ہے کہ وہ جس چیز سے روک دیا جائے اس کا حریص بن جایا کرتا ہے۔ ثانیاً حضرت آدمؑ کو یہ کھٹکا بھی تھا کہ اس جنت سے وہ نکالے بھی جا سکتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈرایا تھا کہ ابلیس تمھارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو جنت سے نکلوا چھوڑے۔ ابلیس نے آدمؑ کے اسی اندیشہ کو تاڑ لیا اور نہایت خیر خواہانہ انداز میں ان کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ اگر وہ ابدی زندگی اور ابدی بادشاہی چاہتے ہیں تو انھیں اس درخت کا پھل کھا لینا چاہیے۔ اس خواہش کے غلبہ نے ان کو اس یاد دہانی سے بالکل غافل کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو شیطان کی دشمنی سے متعلق فرمائی تھی۔ وہ اپنے دشمن کو اپنا خیر خواہ سمجھ بیٹھے اور اس کے چکمہ میں آ گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان اگرچہ بنی آدم کا ابدی دشمن ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ کامیاب حملہ وہ ہوتا ہے جو وہ دوست اور خیر خواہ کے بھیس میں کرتا ہے۔ وہ اسی بھیس میں آ کر وسوسہ اندازی کرتا ہے اور انسان کو یہ باور کراتا ہے کہ خدا اور رسول نے اس کو جن چیزوں سے روکا ہے اس کی تمام تہذیب و ترقی کا راز اگر ہے تو بس انہی چیزوں کے اختیار کرنے میں ہے۔ آج کے حالات کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہو گا کہ تمام محرمات شریعت کی اباحت کی سب سے بڑی دلیل جو شیطان کے ایجنٹ پیش کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ اگر ان چیزوں کے باب میں مذہب کے فتوے پر عمل کیا جائے تو تمام تہذیب و ترقی کا جنازہ نکل جائے گا!

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے یہی مضمون سورۂ اعراف میں یوں آیا ہے مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (۲۰) (تمھارے رب نے تم دونوں کو صرف اس وجہ سے اس درخت سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے اور زندگیٔ دوام کے مالک نہ بن جاؤ) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت زیر بحث میں 'مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى' (ایسی بادشاہی جس پر کبھی زوال نہ آئے) کے الفاظ ہیں اور اعراف میں 'اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ' (کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ) کے الفاظ ہیں۔ ان دونوں باتوں کے اندر تضاد نہ سہی لیکن فرق تو بہرحال ہے تو آخر ان میں تطبیق کی کیا شکل ہے؟ اسی مشکل سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے 'مَلَكَيْنِ' کو 'مَلِكَيْنِ' بکسر لام پڑھا ہے یعنی کہیں تم دونوں بادشاہ نہ بن جاؤ اور اس طرح انھوں نے ان دونوں آیتوں میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اول تو اس صورت میں بھی پوری تطبیق نہیں ہوتی ثانیاً ہمارے نزدیک متواتر اور مشہور قرأت صرف مصحف ہی کی قرأت ہے اور ہم غیر متواتر قرأت پر قرآن کی کسی آیت کی تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ابلیس نے حضرت آدمؑ و حوا کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے

ان کو مختلف قسم کی ترغیبات دیں کبھی ان کو فرشتے بن جانے کی امید دلائی اور کبھی ایک لازوال بادشاہی حاصل ہو جانے کی توقع دلائی۔ اس بات کی طرف ہمارا ذہن اس وجہ سے جاتا ہے کہ اعراف میں اس بات کی تصریح ہے کہ حضرت آدمؑ کو اپنے دام میں لانے کے لیے ابلیس کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس نے بڑی قسموں اور بڑی اطمینان دہانیوں کے بعد ان کو رام کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اعراف کی آیت ۲۲ میں فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ کے الفاظ ہیں۔ ہم نے وہاں ان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم کسی کو درجہ بدرجہ اپنے ڈھب پر لانے یا شیشہ میں اتارنے کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ ابلیس کے ایک ہی فقرے میں اس کے چکمے میں نہیں آگئے بلکہ اس نے مختلف مواقع پیدا کر کے ان کو مختلف قسم کے فریب دیے یہاں تک کہ وہ اس کے دام میں پھنس گئے۔ کبھی یہ کہا کہ خدا نے تم کو اس درخت سے اس اندیشہ سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، اور کبھی یہ کہا کہ اس وجہ سے اس سے منع کیا ہے کہ تمہیں لازوال بادشاہی نہ حاصل ہو جائے۔ مقصد تو کسی نہ کسی طرح اپنے دامِ فریب میں لانا تھا اس وجہ سے جس وقت جو بات بن سکی وہ اس نے بنانے کی کوشش کی۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (۱۲۱)

اس آیت کی وضاحت بقرہ کی تفسیر میں بھی ہو چکی ہے اور اعراف کی آیت ۲۲ کے تحت بھی۔ یہاں ان ساری باتوں کے دہرانے کی گنجائش نہیں ہے۔ 'غوٰی' کے معنی 'ضَلَّ وَخَابَ' کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمؑ ابلیس کے چکمے میں آکر شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھا بیٹھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو جو حلّۂ جنت پہنایا گیا تھا اور جس کی نسبت، جیسا کہ آیت ۱۱۸ میں گزرا، اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا کہ اس سے وہ کبھی محروم نہیں ہوں گے، وہ ان سے چھن گیا اور وہ گھبراہٹ میں باغ کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانکنے لگے۔ 'وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى' یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جو ہدایت دی تھی وہ اس پر قائم نہ رہ سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صحیح راہ سے بھٹک گئے۔ 'وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ' سے حضرت آدمؑ و حوّا کی اس گھبراہٹ اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا ہے جو دفعۃً حلّۂ جنت سے محروم ہو جانے کے باعث ان پر طاری ہوئی۔ انھوں نے تو ابدی جنت کے حصول کی طمع میں یہ اقدام کیا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ جو حاصل تھی وہ بھی ہاتھ سے گئی۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى (۱۲۲)

'اجتباء' کا مفہوم

یہاں 'اجتباء' کا ذکر ان کی توبہ اور قبولیت توبہ سے پہلے ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ اس 'اجتباء' سے مراد حضرت آدمؑ کو توفیقِ توبہ اور کلماتِ توبہ سے سرفراز فرمانا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہی مضمون یوں آیا ہے۔

آدمؑ کی توبہ کا اثر

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۳۷) (پس آدمؑ نے اپنے رب کی طرف سے کچھ کلمات سیکھ لیے اور توبہ کی تو اس کے رب نے اس کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحیم ہے) سورۂ اعراف میں ان کلماتِ توبہ کی وضاحت بھی ہے۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ

تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ ۲۳ (انھوں نے دعا کی کہ اے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم نامراد ہو کے رہ جائیں گے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے جو لغزش ہوئی وہ اس پر سخت نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو بندہ اپنے گناہ پر شرمسار ہوتا ہے وہ اس کو توبہ و اصلاح کی توفیق بخشتا ہے اور توبہ و اصلاح کے بعد اس کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے سے قریب کر لیتا ہے۔ اسی چیز کو یہاں 'اجتباء' سے تعبیر فرمایا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بڑا ہی خوش بخت ہے وہ انسان جس کو احساسِ ندامت اور توفیق توبہ کے ساتھ ساتھ ربِّ کریم کی طرف سے توبہ کے کلمات تلقین ہوں۔

'تَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى'۔ 'تاب' کے بعد جب 'علی' آتا ہے تو، جیسا کہ ہم بقرہ ۳۷ کے تحت وضاحت کر چکے ہیں، یہ رحم کے مضمون پر بھی متضمن ہوتا ہے۔ یعنی اللہ نے اس کی توبہ قبول کی اور اس پر رحم فرمایا اور اس کو ہدایت دی۔ "ہدایت دی" سے مراد ظاہر ہے کہ آگے کے مراحل کے لیے ہدایت دینا ہے تاکہ آدمؑ اور ان کی ذریت شیطان کے فتنوں کا مقابلہ کر سکے۔

عیسائیوں اور نبوتِ آدمؑ کے منکروں کی تردید

اس آیت سے عیسائیوں کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو ان کے ہاں آدمؑ اور ان کی ذریت کے ابدی گنہگار ہونے کا پایا جاتا ہے اور ان لوگوں کے خیال کی بھی تردید ہوتی ہے جو حضرت آدمؑ کو صرف نسلِ انسانی کا باپ مانتے ہیں، ان کو نبی نہیں مانتے۔ اس آیت کے الفاظ بھی ان کی نبوت پر دلیل ہیں اور عقل بھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اور ان کی ذریت کی رہنمائی کے لیے ان کے حسبِ حال ان کو شریعت عطا فرمائے۔ آگے کی آیت میں اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۱۲۳)

بقرہ آیت ۳۶ اور اعراف آیت ۲۴ کے تحت اس آیت کے تمام متعلقات پر گفتگو ہو چکی ہے۔ ہم نے ان آیات کے تحت وہ حکمت بھی واضح کی ہے جو مقتضی ہوئی کہ حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت اس دنیا میں آ کر شیطان کا مقابلہ کریں اور یہ بات بھی واضح کی ہے کہ ان آیات میں خطاب حضرت آدمؑ و حواؑ سے نہیں بلکہ آدمؑ اور ابلیس سے بحیثیت دو فریقوں کے ہے۔

'بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ' یعنی شیطان تمھارا دشمن ہوگا اور تم، اگر تمھیں اپنی عاقبت عزیز ہے اور پھر جنت حاصل کرنے کے آرزومند ہو، شیطان کے دشمن ہو گے اس لیے کہ ہر عاقل اپنے دشمن کو دشمن سمجھتا اور اس سے چوکنا رہتا ہے۔ صرف احمق اور ناعاقبت اندیش ہی ہوتا ہے جو اپنے دشمن سے دوستی گانٹھتا اور اس کے مشوروں پر کاربند ہوتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

جن لوگوں نے محض اس غلط فہمی کی بنا پر کہ یہاں مثنٰی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس کا مخاطب حضرت آدمؑ اور

سوا کرنا ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ اول تو بعینہٖ یہی بات بقرہ اور اعراف وغیرہ میں جمع کے صیغہ سے ارشاد ہوئی ہے، ثانیاً یہاں اگر مثنیٰ کا صیغہ آیا ہے تو اس کے ساتھ لفظ جَمِیۡعًا بھی ہے، اگر مخاطب حضرت آدمؑ اور حوا ہی ہیں تو یہ لفظ بالکل بے ضرورت ہو کے رہ جاتا ہے۔ ثالثاً آدمؑ و حواؑ میں فطری تعلق عداوت کا نہیں بلکہ محبت کا ہے۔ میاں بیوی میں اگر عداوت ہوتی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ خدانخواستہ بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ واقع ہوئے ہیں بلکہ یہ شیطان کی دراندازی اور فساد انگیزی سے پیدا ہوتی ہے۔ البتہ شیطان اور ان کے مابین دشمنی فطری ہے اور یہ دشمنی قیامت تک کے لیے ہے۔ شیطان کی دشمنی تو واضح ہے کہ وہ بربنائے حسد ہے اور اس کا وہ کھلم کھلا اعلان کر چکا ہے۔ رہا انسان تو وہ اگر ذی ہوش ہے تو اس کو یہ حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھنی چاہیے کہ وہ اسی دشمن سے نبرد آزمائی کے لیے جنت سے نکال کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اگر وہ اس سے دوستی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنے دشمن کے آگے سپر انداز ہوتا ہے۔

شیطان کے مقابلہ کے لیے ہتھیار

فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی ۬ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ ہُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشۡقٰی۔ یہ وہ ہتھیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے مقابلہ کے لیے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو مہیا فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ چونکہ انسان اس دنیا میں بڑے ہی شاطر دشمن سے نبرد آزمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ اس کو عقل و فطرت کی ہدایت کے ساتھ ساتھ خاص اپنے پاس سے حق کی ہدایت سے سرفراز فرمائے تاکہ وہ دہری طاقت و ہمت کے ساتھ شیطان کا مقابلہ کر سکے۔ فرمایا کہ اب تم یہاں سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے تو جب تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ وہ شیطان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے اور نہ اس جنت سے محروم رہیں گے جس سے محروم رکھنے کے لیے شیطان نے قسم کھائی ہے۔

اس آیت سے دو باتیں بالکل واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں شیطان کے فتنوں سے امان میں رہنے کا واحد ذریعہ اللہ کی کتاب ہے جو اس روشنی سے محروم ہے وہ ہر وقت شیاطین جن و انس کی زد میں ہے۔

حضرت آدمؑ نبی تھے

دوسری یہ کہ حضرت آدمؑ ایک نبی تھے۔ جب وہ شیطان کے ساتھ نبرد آزمائی کے لیے اس دنیا میں اتارے گئے ہیں اور اس سے مقابلہ کے لیے اللہ کی ہدایت ضروری ہے تو لازماً ان کی اور ان کی ذریت کی رہنمائی کے لیے، ان کے حالات کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی شریعت بھی دی ہوگی۔ ہم حضرت آدمؑ کی شریعت کے بعض احکام کی طرف سورۂ مائدہ کی تفسیر میں، بضمن قصہ ہابیل و قابیل، اشارہ کر چکے ہیں۔

وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا وَّ نَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی (۱۲۴)

ایمان کے بغیر طمانیت نہیں حاصل ہوتی

'مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا' کے معنی تنگ زندگی کے ہیں جو سکون و طمانیت اور فراغِ خاطر و شرحِ صدر کی نعمت سے محروم ہو۔ فرمایا کہ جو ہماری اس یاددہانی سے اعراض کرے گا وہ دنیا سکونِ قلب و شرحِ صدر سے محروم زندگی گزارے گا اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

طمانیت قلب ذکرِ الٰہی سے ہے

سکون قلب و شرح صدر سے اس کی زندگی کے محروم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک خلا ہے جو اللہ کے ایمان کے سوا اور کسی چیز سے نہیں بھر سکتا اس وجہ سے جب تک اس کو ایمان حاصل نہ ہو کوئی دوسری چیز اس کو تسلی و طمانیت سے بہرہ مند نہیں کر سکتی۔ دوسری چیزیں خواہ وہ بظاہر کتنی ہی شاندار اور دلفریب کیوں نہ ہوں، وقتی بہلاوے کا کام تو دے سکتی ہیں لیکن قلب و روح کی بے قراری کو رفع نہیں کر سکتیں۔ جب بچہ بھوک سے روتا ہے تو اس کے منہ میں چُسنی یا نپل دے کر کچھ دیر کے لیے بہلایا جا سکتا ہے لیکن وہ آسودہ اسی وقت ہوتا ہے جب ماں اس کو چھاتی سے لگاتی اور اس کو دودھ پلاتی ہے۔ اس کے بغیر اس کی بے چینی نہیں جاتی۔ یہی حال انسان کا ہے وہ اپنے لیے جو اسباب و سامان بھی مہیا کر لے لیکن اگر وہ خدا کے ایمان سے محروم ہے تو وہ غیر مطمئن، ڈانواڈول، اندیشہ ناک، مضطرب اور اندرونی خلفشار میں مبتلا رہے گا، اگرچہ وہ اپنی نمائشوں سے اس پر کتنا ہی پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ نفس مطمئنہ کی بادشاہی صرف سچے اور پکے ایمان ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ!

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ بہت سے لوگ ایمان کے مدعی ہوتے ہیں لیکن ان کی زندگی نہایت پریشان حالی و پراگندہ بالی کی ہوتی ہے۔ برعکس اس کے کتنے ہیں جو خدا کو محض ایک وہم سمجھتے ہیں لیکن وہ بڑی بے فکری و طمانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہاں بحث ایمان کے مدعیوں سے نہیں بلکہ حقیقی اہل ایمان سے ہے۔ ثانیاً جن لوگوں کو خدا سے بے پروا ہونے کے باوجود ہم مطمئن خیال کرتے ہیں ہم صرف ان کے ظاہری کروفر کو دیکھتے ہیں۔ اگر کبھی ان کے سینوں میں جھانک کر دیکھنے کا موقع ملے تب معلوم ہو کہ ان کے اندر کتنے خطرے اور کتنے خلجان چھپے ہوئے بیٹھے ہیں لیکن یہ ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ ان کو وہ خود دیکھتے ہیں یا وہ لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے اندر ایمانی بصیرت ہو۔

ذکرِ الٰہی سے غافل قیامت کو اندھے اٹھیں گے

وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى: اللہ کے ذکر سے اعراض کرنے والے قیامت کے روز اندھے اٹھائے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ، کان اور دل کے پردے اٹھانے والی چیز اللہ کی یاددہانی ہے۔ اگر کوئی شخص اس یاددہانی سے اعراض کرتا ہے تو جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، وہ آنکھیں، کان اور دل و دماغ رکھتے ہوئے، اندھا، بہرا اور لایعقل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ان عظیم نعمتوں کی ناقدری کی پاداش میں ایسے بلید جانوروں کو اندھا بنا کر اٹھائے گا۔ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے صرف محسوسات کی غلامی کے لیے نہیں عطا فرمائی ہیں بلکہ ان حقائق کے مشاہدے کے لیے عطا فرمائی ہیں جو اس کائنات کے ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ پر نقش ہیں، اگر کوئی شخص سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اس کو وہی حقیقت نظر نہیں آتی جو سب سے زیادہ نمایاں ہے تو ہر چند وہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اس کو سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں!

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ قٓ میں فرمایا ہے فَكَشَفۡنَا عَنۡكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ

الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۲۲ (پس ہم نے تیرے حجابات ہٹا دیے تو تیری نگاہ آج بہت تیز ہے) اور یہاں ارشاد ہوا ہے کہ ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے، تو ان دونوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سورۂ قٓ میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اس قیامت کی طرف سے بالکل غافل رہے لیکن آج سارے حقائق سامنے آگئے اور سارے پردے چاک ہوگئے! اس اسلوب کلام کے اندر خاص بلیغ پہلو یہ ہے کہ اس دنیا میں تو محسوسات کے غلام اندھے بن کر زندگی گزارتے ہیں لیکن ان کو نہ صرف یہ کہ اپنے اندھے ہونے کا کوئی احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے آپ کو بڑا سقراط و بقراط اور بڑا ہی دانا و بینا سمجھتے ہیں لیکن قیامت کے دن ان کو اپنا اندھا ہونا نظر آجائے گا۔ آج تو یہ حال ہے کہ ہمارے سائنس دانوں کی آنکھیں تمام دوربینوں اور خوردبینوں سے مسلح ہونے کے باوجود اپنی آنکھیں دیکھنے سے بھی قاصر ہیں لیکن ایک دن آنے والا ہے جب سارے پردے اٹھ جائیں گے اور کسی کے لیے بھی مجالِ انکار باقی نہیں رہے گی، اسی انکشافِ حقیقت کو فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ سے تعبیر فرمایا ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ۝ قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ (۱۲۵-۱۲۶)

'نسی' کے معنی یہاں نظر انداز کرنے کے ہیں۔ لفظ کے اس مفہوم کی وضاحت دوسرے مقام میں ہو چکی ہے۔

فرمایا کہ جو لوگ اندھے اٹھائے جائیں گے وہ فریاد کریں گے کہ اے رب! ہم تو آنکھیں رکھنے والے لوگ تھے تو تو نے ہم کو اندھے بنا کر کیوں اٹھایا! ارشاد ہوگا کہ ہم نے تمہارے پاس اپنی کتاب بھیجی جس کی آیات نے ایک ایک حقیقت تم پر واضح کی لیکن تم ان کو نظر انداز کر کے بالکل اندھے بہرے بنے رہے۔ مطلب یہ کہ اگر آنکھیں تھیں تو وہ آنکھیں ہماری اس ساری تذکیر و تنبیہ کے باوجود کیوں نہ کھلیں؟ جب تم نے اس وقت اپنی آنکھیں نہیں کھولیں تو سزاوار ہو کہ تمہاری آنکھیں بند ہی رہیں۔

وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ: یعنی اب تمہارا یہ نالہ و شیون بے سود ہے۔ جس طرح تم نے ہماری آیات کو نظر انداز کیا اسی طرح تم سزاوار ہو کہ نظر انداز کیے جاؤ اور تمہاری اس فریاد پر کوئی توجہ نہ کی جائے۔

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ أَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِن بِآيَاتِ رَبِّهِ ۚ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ (۱۲۷)

'اسراف' کے معنی حدود سے تجاوز کے ہیں۔ یہاں 'مَنْ أَسْرَفَ' سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی قوتیں اور صلاحیتیں ان چیزوں پر برباد کیں جن سے ان کو بچنا تھا اور جو چیزیں اختیار کرنے کی تھیں ان سے انھوں نے آنکھیں بند رکھیں۔ فرمایا کہ یہ احوالِ آخرت جو بیان ہوئے ہیں ہم اسی طرح ان لوگوں کو بدلہ دیں گے جو اپنی صلاحیتوں کو بالکل غلط ہدف پر برباد کریں گے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر مزید تنبیہ فرمائی کہ آخرت کا عذاب کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ دنیا کی تنبیہات پر قیاس کر کے اس کو کوئی اہون چیز نہ سمجھے۔ وہ نہایت سخت بھی ہوگا اور نہایت پائیدار بھی۔

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ (۱۲۸)

'اَفَلَمْ یَھْدِ لَھُمْ' کا صحیح مفہوم ہماری زبان میں یہ ہوگا کہ کیا فلاں چیز ان کے لیے ہدایت دینے والی اور ان کی آنکھیں کھولنے والی نہ بنی!

یہ کتاب الٰہی سے اعراض کرنے والوں کے مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب ہے۔ فرمایا کہ ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ بس نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں تو کیا یہ چیز ان کو ہدایت دینے والی نہ بنی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو، اپنی تذکیر و تنبیہ سے اعراض کرنے کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور وہ قومیں کسی دوسرے خطۂ ارضی کی نہیں بلکہ اسی ملک کی رہنے بسنے والی تھیں۔ ان کے تباہ شدہ آثار اور ان کے کھنڈروں پر سے یہ لوگ اپنے تجارتی سفروں میں برابر گزرتے ہیں! یہ اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی بستیوں کی طرف ہے جن کا ذکر اہل عرب کے اشعار میں بھی ملتا ہے اور ان کا عام شاہراہوں پر ہونا بھی معلوم ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ کوئی نشانی چاہتے ہیں تو ان کے اپنے ملک کی تاریخ اور اس کے آثار میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ آخر یہ ان سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟ عاقل تو وہ ہے جو دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے، نہ کہ جب وہی انجام اپنے سامنے آ جائے تب مانے۔ اگر انسان یہ روش اختیار کر لے تو پھر اس میں اور حیوان میں فرق کیا رہا! نشانیٔ عذاب کے مطالبہ کا جواب

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى (۱۲۹)

'اَجَلٌ مُّسَمًّی' کا عطف 'کَلِمَۃٌ' پر ہے۔

یہ اس مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب ہے۔ فرمایا کہ اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ پا چکی ہوتی اور اس کے ظہور کے لیے ایک مدت معین نہ ہو چکی ہوتی تو جس عذاب کے لیے یہ جلدی مچائے ہوئے ہیں وہ آج ہی ان پر آ دھمکتا۔ یعنی اگر اس کے ظہور میں تاخیر ہو رہی ہے تو یہ خدا کی سنت اور اس کے طے کردہ قاعدے اور ضابطے کے تحت ہو رہی ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا رہے کہ یہ محض ہوائی بات ہے یا یہ کہ اللہ ابھی اس کا سامان نہیں کر پا رہا ہے اس وجہ سے عذاب نہیں آ رہا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے۔ 'وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ' (الشوریٰ: ۱۴) (اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے ایک مدت متعین تک کے لیے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان آج ہی فیصلہ کر دیا جاتا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین و مکذبین کے فیصلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک یوم الحساب مقرر کر رکھا ہے جس کی مدت اور جس کا دن بھی معین ہے اس وجہ سے وہ جلد بازوں کی جلدی کے باوجود ان کو ڈھیل دے رہا ہے۔ بدقسمت ہیں وہ جو اس ڈھیل سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کو اپنے طغیان میں اضافہ کا ذریعہ بنا لیں!!

یہاں 'کَلِمَۃٌ' سے مراد کلمۃ الفصل ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہے کہ فیصلہ اور انصاف کا ایک دن آئے گا اور 'اَجَلٌ مُّسَمًّی' سے اس دن کے معین ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی اس کو مبہم و مجہول

نہ خیال کرے بلکہ منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ خدا کی جنتری میں وہ مندرج ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی (۱۳۰)

نبی صلعم کو صبر کی تلقین اور نماز کی تاکید

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی تمام بکواس پر صبر کی تلقین اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز کے اہتمام کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ صبر اور نماز کے باہمی تعلق پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ صبر کی بنیاد درحقیقت اس عقیدے پر ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی مشیت سے ہوتا ہے اور اس کی مشیت تمام تر خیر پر مبنی ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کو دل میں راسخ اور ذہن میں متحضر رکھنے کے لیے سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ نماز ہے۔

'وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ' تسبیح کا عام مفہوم تو ذکرِ الٰہی ہے اور یہ ذکرِ الٰہی ہر وقت مطلوب ہے لیکن یہاں اس کا ذکر اوقات کی قید کے ساتھ ہے۔ اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد نماز ہے۔ 'تسبیح' کے ساتھ 'حمد' کی قید ذکرِ الٰہی کی صحیح صورت بتانے کے لیے ہے کہ یہ خدا کی 'تسبیح' اور 'تحمید' دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہو۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور 'تحمید' میں اثبات کا۔ خدا کے ذکر کی صحیح شکل یہی ہے کہ اس کو تمام خلافِ شان صفات سے بری اور تمام اعلیٰ صفات سے متصف قرار دیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک پہلو بھی صحیح طور پر ملحوظ نہ رہے تو خدا کے معاملے میں انسان کا تصور غلط ہو جاتا ہے جس سے اس کا سارا نظامِ فکر متزلزل ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعض مذاہب نے تنزیہہ کو اہمیت دی تو اس کی لَے اس قدر بڑھا دی کہ خدا کو بالکل نرنکار اور خلق سے بالکل بے تعلق بنا کر رکھ دیا جس کے نتیجہ میں ان کو وسائل و وسایط کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ قرآن نے اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے تسبیح اور حمد دونوں کی ہدایت فرمائی تاکہ بندے کا تعلق اس کے رب کے ساتھ صحیح بنیاد پر استوار ہو سکے۔ بغیر اس تعلق کی استواری کے انسان کا قدم جادۂ مستقیم پر نہیں جم سکتا۔

اوقاتِ نماز کی تعلیم

'قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا' سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے پہلے فجر اور عصر کی نمازیں ہیں۔ بخاری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی روایت ہے۔ ان دونوں نمازوں کے پہلے ذکر کرنے کی وجہ دین میں ان کی اہمیت ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی ان دونوں نمازوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

'وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ' اور اوقاتِ شب میں بھی نماز پڑھو۔ اوقاتِ شب میں دو نمازیں ہیں ایک عشاء اور دوسری تہجد۔ یہاں فعل کا اعادہ تاکید پر دلیل ہے۔ یہ تاکید اس لیے فرمائی گئی ہے کہ یہ دونوں نمازیں نفس پر بہت شاق ہیں۔

'وَاَطْرَافَ النَّهَارِ' دن کے اطراف و اجزا میں تین نمازیں ہیں یعنی چاشت، ظہر اور مغرب۔ چاشت اور مغرب کا اطرافِ نہار میں ہونا تو واضح ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ظہر بھی اطرافِ نہار میں ہے اس لیے

کہ دن دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ظہر کا وقت اس کے پہلے حصے کے آخری کنارے اور دوسرے حصے کے ابتدائی کنارے پر ہے۔

اس آیت سے ان لوگوں کے خیال کی نہایت واضح طور پر تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ نمازوں کے اوقات قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ قرآن میں صرف فرض نمازوں ہی کے نہیں بلکہ اشراق اور تہجد کے اوقات بھی مذکور ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی اوقات کو اپنے عمل سے منضبط کر کے ان کی حد بندی فرما دی۔ مختلف نمازوں کی شکلیں بھی معین فرما دیں اور یہ بھی بتا دیا کہ ان میں سے کن نمازوں کی حیثیت فرض و واجب کی ہے اور کن کی حیثیت نوافل کی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام تفصیلات کا بتانا اور ہر نماز کے حدود و اطراف کا معین کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کام تھا اس لیے کہ آپ صرف قرآن کے سنا دینے والے ہی نہیں بلکہ اس کے معلم بھی تھے۔

صبر و عزیمت کے حصول کے لیے نفلی نمازوں کا اہتمام

یہاں اس امر کو بھی ملحوظ رکھیے کہ آیت زیر بحث میں نماز کی تاکید صبر و عزیمت کے حصول کی تدبیر کی حیثیت سے فرمائی گئی ہے۔ یہ آیات حق و باطل کی کشمکش کے نہایت شکل دور میں نازل ہوئی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے امت کو وہ تدبیر بتائی گئی ہے جو مشکلات و مصائب میں ثابت قدم رکھنے والی اور خدا کی رحمت و نصرت کا حق دار بنانے والی ہے۔ اس طرح کے حالات میں صرف فرض نمازوں ہی کا اہتمام مطلوب نہیں ہے بلکہ نوافل کا اہتمام بھی مطلوب ہے۔ قرآن، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سلف صالحین کے عمل، ہر چیز سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ عام حالات میں تو تہجد و اشراق کی نمازوں کی حیثیت بہر حال نفلی نمازوں ہی کی ہے لیکن مشکلات و مصائب میں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، ان کا اہتمام ضروری ہے۔

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

اس مسئلہ پر ان شاء اللہ سورۂ مزمل کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بحث کریں گے اور کسی موزوں مقام پر ان مصالح پر روشنی ڈالیں گے جو اوقات نماز کے تعین میں ملحوظ ہیں۔

نمازوں کے اندر سب کچھ ہے

'لَعَلَّكَ تَرْضٰى' دوسرے مقام میں یہی مضمون یوں بیان ہوا ہے۔ 'وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى' (اور تمہارا رب عنقریب تمہیں عطا فرمائے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے) ان دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے موقف پر ڈٹے اور اپنے کام میں لگے رہو اور نمازوں کا اہتمام رکھو، خدا تمہیں دنیا اور آخرت دونوں میں وہ کامرانیاں بخشے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے! انہی نمازوں کے اندر تمہارے لیے سب کچھ محفوظ ہے۔ اپنے رب کے سوا تمہیں کسی اور طرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى (۱۳۱)

امراء و اغنیاء سے بے نیازی کی ہدایت

اب یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے امراء و اغنیاء کی زیادہ پروا اور دلداری کرنے سے روک دیا گیا۔ کسی قوم کے امراء و اغنیاء چونکہ قوم کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہی کے بگڑنے سے پوری

قوم بگڑتی ادران کی اصلاح سے پوری قوم کے اصلاح پذیر ہونے کی توقع ہوتی ہے اس وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنی اپنی قوموں کے سرداروں اور بڑوں کو مخاطب کیا اور جب تک انھوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے مایوس نہیں کر دیا اس وقت تک وہ ان کی اصلاح کی فکر میں لگے رہے۔ حضرات انبیاء کرام کی اس سنت کے مطابق ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سب سے پہلے قریش کے سادات وامراء کو دعوت دی کہ اگر وہ اس حق کو قبول کر لیں گے تو ان کے زور و اثر اور ان کے مال و اسباب ہر چیز سے دعوتِ حق اور غربائے مسلمین کو تقویت حاصل ہوگی۔ یہ خواہش سرتا سر ان امراء و اغنیاء کی خیر خواہی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبہ پر مبنی تھی لیکن جب ان امراء و اغنیاء نے اپنے رویہ سے ثابت کر دیا کہ یہ سمجھنے والے نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بھی ان کے لیے زیادہ فکر مند ہونے سے روک دیا اور فرمایا کہ تم ان کے مال و اسباب کو ذرا خاطر میں نہ لاؤ، تمھاری دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا کفیل اللہ ہے۔ اگر یہ لوگ اس حق کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں تو اس میں تو ان کی اپنی محرومی ہے، خدا ان کا اور ان کے مال و اسباب کا محتاج نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ - أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ سے اشارہ قریش کے ان گروہوں کی طرف ہے جو مکہ اور طائف وغیرہ میں عزت و اقتدار رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے مال و اسباب کی طرف آنحضرت صلعم کا نگاہ اٹھانا العیاذ باللہ اس لیے تو ہو نہیں سکتا کہ آپ کے اندر دولتِ دنیا کی کوئی طمع تھی ورنہ دولتِ دنیا تو مکہ و طائف کے امراء بڑی سے بڑی مقدار میں حضورؐ کے قدموں پر نثار کرنے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ آپ اپنی دعوت سے باز آجائیں۔ لیکن آپ نے ان کی اس پیشکش کے جواب میں ان کو دعوتِ ایمان کی چند آیتیں سنا دیں۔ حضرات انبیائے کرام اور صالحین نے ان لوگوں کے مال و اسباب کو کبھی وقعت نہیں دی ہے جنھوں نے اپنے دل اپنے رب کے حوالہ نہیں کیے ہیں۔ ایک عاقل و فرزانہ اگر ایک ایسے نوجوان کو دیکھتا ہے جو اپنی بھرپور جوانی اور اپنی تمام صلاحیتیں ایک بالکل غلط ہدف پر برباد کر رہا ہوتا ہے تو اس کے دل میں یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش یہ عاقبت نااندیش بے وقوف نوجوان اپنی جوانی اور صلاحیتوں کی قدر کرے، اسی طرح حضورؐ کے اندر بھی یہ ارمان تھا کہ کاش آپؐ کی قوم کے امراء و اغنیاء ان نعمتوں کی قدر پہچانیں جو اللہ نے ان کو بخشی ہیں اور ان کا مال اور ان کی صلاحیتیں شیطان کی راہ میں برباد نہ ہوں۔ اس ارمان و حسرت کا تعلق تمام تر جذبۂ خیر خواہی و ہمدردی سے ہوتا ہے۔ اس میں ہرگز طمع و حرص کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس جذبۂ خیر خواہی کی بھی ایک حد ہے۔ اس حد پر پہنچ جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اس چیز سے روک دیا۔

مَتَّعْنَا بِهِۦ: ایک امر واقعی کا اظہار ہے۔ دنیا میں اگر کسی کو مال و اسباب حاصل ہوتا ہے تو نہ وہ اس کے اب و جد کی میراث ہوتا اور نہ اس کی ذہانت و قابلیت کا ثمرہ بلکہ یہ خدا کی دین ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو دے کر یہ دیکھتا ہے کہ خدا کے دیے ہوئے مال و متاع کو پا کر یہ شخص خدا کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا ناشکرا۔ احمق ہے وہ

انسان جو اس حقیقت نفس الامری کو نہ سمجھے اور خدا کی نعمت کو خدا ہی کے خلاف بغاوت کا سبب بنا لے۔

'زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' ہمارے نزدیک 'بِهٖ' کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ مجرور سے حال پڑنا فصیح عربی میں معروف ہے ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس کی مثالیں پیش کرتے آرہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے جس مال و متاع سے ان کو بہرہ مند کیا ہے اس کی چمک دمک چند روزہ ہے۔ اس کا اگر کوئی نفع ہے تو یہ ہے کہ اس سے وہ آخرت کے لیے کچھ کمائی کریں۔ اگر وہ یہ نہیں کرتے تو یہ غازہ ایک دن اڑ جائے گا اور اس کی پیدا کردہ روسیاہی ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے گی۔

'لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ' یہ اس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جس کی وضاحت اسی سورہ کی آیت 'وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا' کے تحت ہم کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں لوگوں کو مصائب سے بھی آزماتا ہے اور نعمتوں سے بھی۔ جب مصائب سے آزماتا ہے تو مقصود بندے کے صبر کا امتحان ہوتا ہے اور جب نعمتوں سے آزماتا ہے تو مقصود اس کے شکر کا امتحان ہوتا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو یہ مال و متاع جو بخشا ہے تو اس لیے نہیں کہ یہ اس کے حقدار تھے بلکہ اس لیے بخشا کہ ان کا امتحان کریں کہ یہ ہماری نعمتیں پا کر کیا بناتے ہیں۔ اگر انھوں نے ان نعمتوں کا یہی حق پہچانا ہے کہ ان کو پا کر ہمارے ہی سرکش ہو گئے ہیں تو اس کا انجام جلد دیکھ لیں گے!

'وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى' مطلب یہ کہ تم اپنی دعوت اور اپنے ساتھیوں کے لیے ان ناقدروں اور ناشکروں کی سرپرستی کے محتاج نہیں ہو۔ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے لیے خدا کے پاس سے جو کچھ عطا ہونے والا ہے وہ ہزار درجہ بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔ ان مغروروں کے پاس جو کچھ ہے اس کی چمک دمک تو چند روزہ ہے لیکن خدا جو کچھ بخشے گا وہ ابدی ہے۔ اس کے لیے کبھی زوال نہیں ——— یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نیکی کا پودا اس آب حیات ہی سے پروان چڑھتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کی پرورش کے لیے نازل ہو۔ اگر آپ ہر جوہڑ کے پانی سے اس کو پروان چڑھانے کی کوشش کریں گے تو اول تو کسی ناپاک پانی سے اس کا نشو و نما پانا ہی اس کی فطرت کے خلاف ہے اور اگر وہ بظاہر نشو و نما پا بھی جائے گا تو وہ نیکی کے پھل نہیں بلکہ بدی ہی کے پھل دے گا۔ اس حقیقت کا تعلق حکمتِ قرآن سے ہے اور یہ تفصیل کے ساتھ اپنے محل میں زیر بحث آئے گی۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْـَٔــلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (۱۳۲)

لفظ 'اهل' یہاں صرف اہل بیت نبی کے مفہوم میں نہیں ہے۔ یہ لفظ عربی میں وسیع معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً اہل کتاب، اہل انجیل، اہل قریہ، اہل اللہ، اہل قرآن اور اہل حدیث وغیرہ۔ لسان العرب میں ہے: 'اهل الرجل اخص الناس به' (اہل الرجل سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس شخص سے خاص تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں) 'اهل کل نبی امته' (نبی کے اہل سے اس کے امتی مراد ہوتے ہیں) سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے حضرت عمرؓ کے خلیفہ بنانے کے بارے میں روایت ہے کہ جب قیامت کے دن میرا رب مجھ سے پوچھے گا کہ مسلمانوں کا والی کس کو بنا کے آئے ہو تو

لفظ 'اہل' کا مفہوم

عرض کروں گا کہ استعملتُ علیھم خیار اھلك (میں نے ان پر تیرے بہترین اہل کو خلیفہ بنایا ہے) سورۂ مریم کی آیت ۵۵ میں سیدنا اسماعیلؑ کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔ 'وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ' ظاہر ہے کہ یہاں بھی 'اھل' سے حضرت اسماعیلؑ کے بیوی بچے ہی مراد نہیں ہیں بلکہ وہ تمام لوگ مراد ہیں جو ان سے وابستہ تھے۔

اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی 'اھل' سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، عام اس سے کہ وہ حضورؐ کے خاص متعلقین ہوں یا دوسرے مسلمان اور عام اس سے کہ وہ قرشی و ہاشمی ہوں یا لونڈی اور غلام۔ ان سب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ فی الحقیقت وہ سب لوگ نبی کے کنبہ کے افراد ہوتے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور نبی کو اسی طرح ان کی خبر گیری کی فکر ہوتی ہے جس طرح کسی کو اپنے خاص کنبہ کی خبر گیری کی فکر ہوتی ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں لفظ 'اھل' نے غربائے مسلمین کی کتنی عزت و شان بڑھائی ہے! جن بیچاروں کا ابھی تک کوئی پرسان حال نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل میں شامل کر دیا!!

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔ ارشاد ہوا کہ تم اپنے لوگوں کو نماز کی ہدایت کرو اور اس پر جمے رہو۔ نماز سے مراد وہی نماز ہے جس کا اوپر والی آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ یعنی اپنے اور اپنے لوگوں کے اندر صبر و استقامت پیدا کرنے کے لیے نماز کا اہتمام کرو اور استقلال کے ساتھ اس کا پورا پورا اہتمام کرو۔ 'وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا' کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں ہل چلاتا، اس میں تخم ریزی کرتا، اس کو پانی دیتا اور برابر اس کی نگرانی کرتا ہے اسی طرح تم اپنے اس مبارک مزرعہ میں پوری محنت اور اس کی پوری حفاظت کرو۔ پھر دیکھو کہ اس سے دین و دنیا کی کیا برکتیں حاصل ہوتی ہیں! وہ برکتیں اس سے حاصل ہوں گی کہ نہال ہو جاؤ گے، تمھیں کسی اور کی طرف نگاہ اٹھانے کی احتیاج باقی نہیں رہے گی!!

'لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا' یعنی تمھارے اور تمھارے جاں نثاروں کے لیے روزی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہم نے نہ تم پر ڈالی ہے اور نہ ہم تم سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ 'نَحْنُ نَرْزُقُكَ' ہم تمھارے رزق کے ذمہ دار ہیں، تم ہمارا کام کرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ باقی جو ذمہ داری ہماری ہے وہ ہم پر چھوڑ دو۔ تم اس کے لیے فکر مند نہ ہو۔ سیدنا مسیحؑ نے اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ "جو مزدور اپنی ڈیوٹی پر ہے وہ اپنی مزدوری کا حق دار ہے۔"

اسلامی نظام میں خلیفہ اور حکمران اسلامی کنبہ کا قیم ہوتا ہے

یہاں 'نَرْزُقُكَ' میں ضمیر خطاب واحد پر بھی نظر رہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہم تم کو اور تمھارے لوگوں کو روزی دیں گے، بلکہ فرمایا کہ "ہم تم کو روزی دیں گے۔" آنحضرت صلعم سے یہ خطاب اسلامی کنبہ کے سربراہ اور قیم کی حیثیت سے ہے۔ جب کنبہ کے قیم سے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے پورے کنبہ یعنی تمام مسلمانوں کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اسلامی نظام میں خلیفہ اور حکمران کی حیثیت پورے اسلامی کنبہ کے قیم کی ہے اس وجہ سے اسے کنبہ کے ایک ایک فرد کی اسی طرح فکر رکھنی پڑتی ہے جس طرح ایک کنبہ کا سردھرا اپنے بیوی بچوں کی رکھتا ہے۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ

نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں اس حقیقت کو جس طرح ملحوظ رکھا اس کو بیان کروں تو بات دوسرے گوشوں میں نکل جائے گی۔ اس زمانے میں عوام کے غم میں اسٹیجوں پر زمزمہ خوانی کرنے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن کوئی نہیں جو حضرت عمرؓ کی طرح یہ ذمہ داری محسوس کرے کہ میری مملکت کے بعید ترین گوشوں میں بھی اگر کوئی بھوکا سوتا ہے تو اس کی مسئولیت مجھ پر ہے اور صرف محسوس ہی نہ کرے بلکہ عملاً اپنے احساس کو ثابت بھی کر دے، یہاں تک کہ یہ احساس اس کو خود اپنے بیوی بچوں تک سے غافل کر دے!!

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى۔ اوپر والے ٹکڑے میں اس دنیا کے رزق و فضل کا وعدہ تھا۔ یہ آخرت کی کامیابی کی بشارت ہے یعنی انجام کار کی کامیابی تو بہرحال اہل تقویٰ ہی کے لیے ہے، اس میں تو کسی اور کا کوئی حصہ ہی نہیں۔

نماز رزق کی ضامن ہے

یہاں ظاہر پرستوں کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی کہ نماز بھلا آدمی کے رزق کی ضامن کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حقیقت ان لوگوں کو نہیں سمجھائی جا سکتی جو نہ خود نماز کی روح سے آشنا ہیں اور نہ انھیں کسی حقیقی نماز آشنا سے آشنائی ہوئی۔ یہ چیز سمجھانے کی نہیں بلکہ جاننے اور سمجھنے کی ہے۔ صرف تجربہ ہی اس کا یقین پیدا کر سکتا ہے۔ جو نماز کے لذت آشنا ہیں وہی جانتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔ میری اس بات کو ادعا پر محمول نہ فرمائیے۔ میں خود ایک بے عمل آدمی ہوں لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے تاریخ کے صفحات میں بھی اور چلتے پھرتے انسانوں میں بھی ایسی پیشانیاں دیکھی ہیں جن کے سجدوں کے نشانات کی تابناکی آفتاب کو بھی شرماتی تھی اور جن کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ تختِ جمشید کو بھی پائے استحقار سے ٹھکرا دینے والے تھے!!

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (١٣٣)

نشانی کا مطالبہ کرنے والوں کو جواب

مخالفین جب دلائل کے میدان میں ہر طرف سے پسپا ہو جاتے تو ان کا آخری حربہ یہ ہوتا کہ وہ مطالبہ کرتے کہ اگر یہ رسول ہیں تو اپنی رسالت کے ثبوت میں یہ اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں پیش کرتے، نشانی سے مراد کوئی حسی معجزہ بھی ہوتا اور اس طرح کا کوئی عذاب بھی جس سے قرآن ان کو رسول کی تکذیب کی صورت میں آگاہ کر رہا تھا۔ اس سوال کے اٹھانے میں بھی زیادہ دخل اہل کتاب کو تھا۔ وہ مشرکین کو اس دور میں جس طرح بہت سے سوالات القا کرتے تھے، جن کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، اسی طرح یہ سبق بھی پڑھاتے تھے کہ ان مدعی رسالت سے مطالبہ کرو کہ جس طرح پچھلے رسولوں نے بہت سی نشانیاں دکھائیں یہاں تک کہ ان کی خبر کے مطابق ان کی قوموں پر عذاب بھی آئے، آخر یہ اس طرح کی کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتے۔ قرآن نے یہ اس مطالبہ کا جواب دیا اور اس جواب میں ان لوگوں کو بھی پیشِ نظر رکھا جو ان سوالات کے لیے وسوسہ اندازی کرتے تھے اور ان لوگوں کو بھی جو ان کو پیش کرتے تھے۔ اس آیت میں پہلے گروہ کو جواب دیا ہے اور اس کے بعد والی آیت میں دوسرے گروہ کو۔

پہلے گروہ یعنی اہل کتاب کو یہ جواب دیا کہ کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ پچھلے صحیفوں میں جس آخری رسول کی بعثت کی بشارتیں تھیں ان کا مظہر اور مصداق ان کے سامنے آ گیا جس نے ان تمام پیشین گوئیوں کی تصدیق و تائید ان کے سامنے کر دی؟ ہم نے سورۂ بقرہ اور آلِ عمران کی تفسیر میں ان پیشین گوئیوں کا تفصیل سے حوالہ

دیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کو سابق صحیفوں کا جو مصدق کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بعثت نے ان تمام پیشین گوئیوں کی عملی تصدیق کر دی۔ اسی تصدیق کو یہاں 'بینۃ' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى (۱۳۴)

اب یہ دوسرے گروہ یعنی مشرکین عرب کو پیش نظر رکھ کر جواب دیا کہ شامت زدہ لوگ دوسروں کے اتقاء سے متاثر ہو کر عذاب تو مانگتے ہیں لیکن اگر ہم رسول کے بھیجنے سے پہلے ان پر عذاب بھیج دیتے تو یہ قیامت کے روز یہ عذر کرتے کہ اے رب تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم اس ذلت و رسوائی سے دوچار ہونے سے پہلے تیری آیات کی پیروی کرتے۔ مطلب یہ کہ ہم نے اس عذر کو ختم کر دینے کے لیے ان کے پاس اپنا رسول بھیج دیا۔ اب ان پر حجت تمام ہو گئی۔ اگر اس کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لاتے تو ان کے سامنے وہی چیز ظاہر ہو گی جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔

'ذلت' اور 'خزی' کا مفہوم

'ذلت' اور 'خزی' کے الفاظ اپنے عام استعمال میں ایک دوسرے کے مفہوم میں بھی آتے ہیں لیکن جب یہ دونوں ایک ساتھ آئیں جس طرح یہاں آئے ہیں تو ان کے درمیان ایک نازک سا فرق ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں 'ذلت' سے مراد وہ ذلت ہوتی ہے جس کا احساس ایک ذلیل ہونے والا خود اپنے باطن میں کرتا ہے اور 'خزی' سے وہ رسوائی مراد ہوتی ہے جو دوسروں کے سامنے اس کو ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ نہ ہم اپنی نگاہوں ہی میں ذلیل ہوتے اور نہ دوسروں کے آگے ہی رسوائی اور فضیحتا کی یہ نوبت آتی۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى (۱۳۵)

یہ آخری وارننگ ہے۔ اوپر کی دونوں آیتوں میں بات غائب کے صیغوں میں منہ پھیر کر فرمائی گئی ہے! اس میں شدتِ عتاب کے اظہار کے پہلو سے خطاب کے اسلوب میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اب فیصلہ کن مرحلہ سامنے ہے۔ دونوں پارٹیاں انتظار میں ہیں کہ اس کشمکش کا آخری انجام کیا ہوتا ہے اور اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے تو چندے انتظار کرو، عنقریب تم پر واضح ہو جائے گا کہ سیدھی اور ہموار راہ پر کون تھے اور وہ منزل مقصود پر پہنچنے والے بنے اور کون گمراہی کی راہ پر تھے اور وہ ہلاکت کے گڈھے میں گرے!

اس آیت میں میرے نزدیک قرینہ کی وضاحت کی بنا پر 'مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى' کا تقابل جملہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ میں نے اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں سے درگزر فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔

لاہور

۲۵ر جنوری ۱۹۷۳ء

تدبرِ قرآن

۲۱

الانبیاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــ سورہ طٰہٰ ـــ کی مثنیٰ ہے۔ جس مضمون پر سورۂ طٰہٰ ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ سابق سورہ کی آخری آیت میں کفارِ قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ اگر تم کوئی نشانیٔ عذاب ہی دیکھنے پر اڑے ہوئے ہو تو انتظار کرو، اب اس عذاب کے آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ اس سورہ کا آغاز بغیر کسی نئی تمہید کے، بعینہٖ اسی مضمون سے فرمایا کہ ان لوگوں (کفارِ قریش) کے حساب کی گھڑی بالکل سر پر آ چکی ہے لیکن یہ اپنی سرمستیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ یہ پیغمبر کی تنبیہات کا مذاق اڑاتے اور اللہ کی آیات کا استہزا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے جس کو اس کے پیدا کرنے والے نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ ان کا سارا اعتماد ان کے خود تراشیدہ معبودوں پر ہے۔ حالانکہ یہ ساری چیزیں محض ان کے وہم کی ایجاد ہیں، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ سابق سورہ میں صرف حضرت موسیٰ کی سرگزشت کا حوالہ تھا اس میں دوسرے انبیاءِ عظام علیہم السلام کا بھی حوالہ ہے اور نہایت واضح الفاظ میں غلبۂ حق اور فتح مکہ کے قرب کی پیشین گوئی کی گئی ہے جو کفارِ قریش کے لیے ایک آخری تنبیہ اور مسلمانوں کے لیے کشمکشِ حق و باطل کے اس شدید ترین دور میں ایک عظیم بشارت ہے۔

سورہ کے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سابق سورہ کی طرح یہ سورہ بھی تین بڑے حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے قریش کو ان کی ان بوالفضولیوں پر نہایت واضح الفاظ میں تنبیہ و وعید ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت لاابالیانہ انداز میں وہ کر رہے تھے، پھر حضرات انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں سے ان تمام حقائق کو مبرہن کیا گیا ہے جن کی قرآن کے ذریعہ سے ان کو دعوت دی جا رہی تھی، آخر میں اسی مضمون کو، جو شروع میں بیان ہوا ہے بعینہٖ اسی تمہید کے ساتھ از سرِ نو لے لیا ہے اور نہایت فیصلہ کن انداز میں مخالفین کو اس انجام سے آگاہ کیا ہے جس سے وہ دوچار ہونے والے ہیں۔

اگرچہ سورہ کا عمود اور نظام واضح کر دینے کے لیے یہ تمہید بھی کافی ہے لیکن ہم مزید وضاحت کے لیے سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۵) قریش کو انذار کے رسولؐ کی بعثت کے بعد، سنتِ الٰہی کے مطابق، اب ان کی قسمت میزان میں اور ان کے محاسبہ کا دن ان کے سر پر ہے لیکن یہ اپنی بدمستیوں میں کھوئے ہوئے خطرہ سے آگاہ کرنے والے رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کوئی ان کو ساحر بناتا ہے کوئی کاہن، کوئی اس کی وحی کو خواب پریشان سے تعبیر کرتا ہے، کوئی اس کو مفتری اور شاعر قرار دیتا ہے اور اس سے اگلے انبیاء کے سے خوارق و عجائب کا مطالبہ کرتا ہے حالانکہ تاریخ اور اہلِ علم گواہ ہیں کہ انبیاء ہمیشہ اسی طرح کی وحی کے ساتھ آئے جس طرح کی وحی کے ساتھ ان کا رسول آیا۔

ان پر اتمامِ حجت کے لیے جس یاددہانی کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس آگئی۔ اب اگر یہ اس کو ٹھکراتے ہیں تو ان قوموں کے انجام کو یاد کرلیں جن کے پاس ان کے رسول آئے اور انھوں نے ان کی تکذیب کی۔ انھوں نے بھی اسی تبختر کے ساتھ اپنے رسولوں کا مذاق اڑایا، پھر جب وہ اس کے نتیجہ میں خدا کی پکڑ میں آگئیں تو کوئی ان کا پناہ دینے والا نہ بنا اور ہم نے ان کو خس و خاشاک کی طرح اڑا دیا۔

(۱۶-۲۹) اس حقیقت کی یاددہانی کہ اس دنیا کے خالق نے اس کو محض اپنا جی بہلانے کے لیے کوئی تھیٹر نہیں بنایا ہے کہ حق و باطل اور نیکی و بدی دونوں کی حیثیت اس میں یکساں ہو بلکہ اس کا خالق ایک عادل و حکیم ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک دن لائے جس میں حق کا بول بالا ہو اور باطل کا وہ کچومر نکال دے۔ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء اس کو خدا کے عدل کی گرفت سے بچالیں گے تو یہ اس کا محض ایک وہم باطل ہے۔ خدا کی خدائی میں کوئی شریک نہیں، جو بھی ہیں سب اس کے آگے سرفگندہ ہیں۔ اگر اس کائنات میں کئی ارادوں اور مشیتوں کی کارفرمائی ہوتی تو یہ درہم برہم ہو کے رہ جاتی۔ خدا کے نبیوں اور رسولوں کی تعلیم میں اس شرک کا کوئی شائبہ نہیں۔ ہر نبی نے توحید ہی کی تعلیم دی ہے۔ اگر کسی نے خدا کے لیے بیٹیاں فرض کرکے ان کو خدا کے ہاں اپنا سفارشی سمجھ رکھا ہے تو یہ محض خود فریبی ہے۔ فرشتے خدا کی بیٹیاں نہیں بلکہ اس کے باعزت بندے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے اس کے اذن کے بدوں زبان نہیں کھول سکتے، وہ صرف اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اگر کوئی بھی خدائی کا مدعی نکلا تو خدا اس کو جہنم میں جھونک دے گا۔

(۳۰-۳۳) نشانیوں کا مطالبہ کرنے والوں کے جواب میں نظامِ کائنات کی چند نہایت واضح نشانیوں کی طرف اشارہ کہ اگر ان کو نشانیوں کی طلب ہے تو آخر وہ ان نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو ہر وقت ان کے سامنے موجود اور خدا کی ربوبیت و رحمت، اس کے عدل و حکمت اور توحید و معاد کی گواہی دے رہی ہیں۔ انہی چیزوں کی دعوت ان کو پیغمبر دے رہا ہے تو جب اس کی تائید میں یہ سارے شواہد موجود ہیں تو کسی نئی نشانی کی کیا ضرورت باقی رہی۔

(۳۴-۴۳) ان لوگوں کو جواب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اس بنا پر مذاق اڑا رہے تھے کہ آپؐ نہ تو بشریت

سے کوئی مافوق ہستی تھے اور نہ کوئی مال دار آدمی۔ ان کے باب میں فرمایا کہ اگر یہ پیغمبرؐ کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑا لیں لیکن یاد رکھیں جب خدا کی پکڑ میں آجائیں گے تو ان کے یہ دیوی دیوتا ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے جن کی حمیت حمایت میں یہ خدا کے رسول کی توہین کر رہے ہیں۔

(۴۴-۴۷) متکبرین کے اصل سبب غرور کی طرف اشارہ اور یہ پیشین گوئی کہ یہ مکہ میں جس دعوت حق کو دبانے کے لیے زور آزمائی کر رہے ہیں وہ دعوت اطرافِ مکہ سے مکہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور بہت جلد یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ دعوت غالب رہتی ہے یا اس کے یہ اعداء۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کہ میں تو تمہیں وحی کے ذریعہ سے آگاہ کر رہا ہوں لیکن تمہارے بہرے کان اس کو نہیں سن رہے ہیں، اگر خدا کے تازیانۂ عذاب کی زد میں آگئے تو پھر اپنے سر پیٹو گے۔

(۴۸-۷۷) ایک صعودی ترتیب کے ساتھ جلیل القدر انبیاء میں سے حضرت موسٰی، حضرت ابراہیم (بشمول حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب) اور حضرت نوح علیہم السلام کی تعلیم و دعوت اور ان کے جھٹلانے والوں کے انجام کی طرف اشارہ تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان تمام انبیائے عظام کی دعوت وہی رہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے اور لازماً اس کی مخالفت کرنے والوں کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان انبیاء کی مخالفت کرنے والوں کا ہوا۔

(۷۸-۸۶) ایک صفاتی ترتیب کے ساتھ ان انبیاء کا ذکر جو شکر اور صبر کے نہایت کڑے امتحانوں میں ڈالے گئے اور وہ ان میں سو فی صد کامیاب رہے۔ پہلے زمرہ میں سے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا حوالہ دے کر قریش کو انہی کی طرح خدا کا شکر گزار بندہ بننے کی دعوت دی ہے۔ دوسرے زمرے کے انبیاء میں سے خاص طور پر حضرت ایوب، حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا حوالہ دیا ہے اور مقصود ان کا حوالہ دینے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مظلوم صحابہؓ کی حوصلہ افزائی ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے ان صابر بندوں کو ان کے صبر کے سلسلہ میں اپنی رحمت سے نوازا اسی طرح اگر تم بھی مصائب کے مقابل میں حق پر ثابت قدم رہے تو اللہ تم کو بھی اپنی رحمت سے نوازے گا۔

(۸۷-۹۱) ان انبیاء کی طرف ایک اجمالی اشارہ جن کے لیے نہایت تاریک اور بظاہر مایوس کن حالات کے اندر خدا کی قدرت و حکمت کی نہایت حیرت انگیز شانیں ظاہر ہوئیں۔ اس زمرہ کے انبیاء میں سے حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحیٰی اور حضرت مریم و حضرت مسیح علیہم السلام کا حوالہ دیا ہے اور مقصود اس سے اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ خدا جب اپنے بندوں کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہے گا تو کوئی چیز اس کے ارادے میں مزاحم نہ ہو سکے گی۔ حالات و اسباب سب اس کے اختیار میں ہیں۔

(۹۲-۱۱۲) خاتمۂ سورہ جس میں تمہید کے مضمون کو مزید مؤکد کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو اطمینان دلا دیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت و تعلیم یہی رہی ہے جو تم دے رہے ہو تو تم اپنے کام میں لگے رہو اور

جن لوگوں نے اس میں اختلافات پیدا کیے اور پیدا کر رہے ہیں ان کے معاملہ کو ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ یہ لوگ خدا کے عذاب کو دیکھ کر ہی ایمان لائیں گے لیکن اس وقت کا ایمان لانا بالکل بے سود ہوگا۔ آخرت کی کامرانی صرف اللہ کے نیک بندوں ہی کے لیے ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فیصلہ کن اعلان کہ اب فیصلہ کی گھڑی سر پر ہے، جس کو فائدہ اٹھانا ہو وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا لے پھر یہ فرصت نصیب ہونے والی نہیں ہے۔ آخری آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ دعا کہ اے رب! اب میرے اور ان اعدائے حق کے درمیان تو فیصلہ فرما دے!

یہ سورہ کے مطالب کا سرسری تجزیہ ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ (۲۱)

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيَاتُهَا ۱۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱ مَا يَاْتِيْهِمْ آیات ۱-۱۵
مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲ لَاهِيَةً
قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖۗ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۳ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ
الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۫ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۴ بَلْ قَالُوْٓا
اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۖۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ
كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۵ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ
اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ
فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ
جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝۸ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ
الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝۹
ع ۱ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰ ۧ وَ

كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا
آخَرِينَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ﴿۱۲﴾
لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تُسْأَلُونَ ﴿۱۳﴾ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ
تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ﴿۱۵﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۵

لوگوں کے لیے ان کے محاسبہ کا وقت قریب آلگا ہے اور یہ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کیے جا رہے ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے جو تازہ یاددہانی بھی ان کے پاس آتی ہے یہ اس کو بس مذاق کرتے ہوئے سنتے ہیں۔ ان کے دل غفلت میں مدہوش ہیں اور ان ظالموں نے آپس میں یہ سرگوشی کی کہ یہ تو بس تمہارے ہی مانند ایک بشر ہیں تو کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو میں پھنسو گے! ۱-۳

اس نے کہا میرا رب آسمان اور زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے اور وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۴

بلکہ انھوں نے کہا، یہ تو خواب پریشان ہیں، بلکہ اس کو انھوں نے گھڑ لیا ہے، بلکہ یہ ایک شاعر ہیں۔ پس یہ ہمارے پاس اس طرح کی کوئی نشانی لائیں جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ سابق رسول بھیجے گئے تھے۔ ۵

ان سے پہلے کسی بستی کے لوگ بھی، جس کو ہم نے ہلاک کیا، ایمان لانے والے نہ بنے، تو کیا یہ لوگ ایمان لانے والے بنیں گے! اور تم سے پہلے جس کو بھی ہم نے رسول بنا کر بھیجا آدمیوں ہی میں سے بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ تو اہلِ علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے اور ہم

نے ان کو ایسے جسم بھی نہیں دیے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ ابدی زندگی رکھنے والے بھی نہ تھے۔ پھر ہم نے ان سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ان کو اور جن کو ہم چاہتے ہیں نجات دی اور حدود سے تجاوز کر جانے والوں کو ہلاک کر دیا۔ ۶-۹

اور ہم نے تمھاری طرف بھی ایک کتاب اتاری ہے جس میں تمھارے حصہ کی یاددہانی ہے تو کیا تم سمجھتے نہیں! اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں جن کے لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے اور ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھا کھڑے کیے۔ پس جب انھوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی تو لگے وہاں سے بھاگنے۔ ہم نے کہا، اب بھاگو مت، اپنے عیش کے سامانوں اور اپنی عیش گاہوں کی طرف پلٹو تاکہ تم سے پرسش ہو۔ انھوں نے واویلا کیا کہ ہائے ہماری بدبختی! بے شک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! وہ یہی واویلا کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو خس و خاشاک اور راکھ کے مانند کر دیا۔ ۱۰-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ (۱)

سابق سورہ کے مضمون کی تکمیل

یہ سورہ بغیر کسی تسمیہ و تمہید کے شروع ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا، یہ ہے کہ یہ درحقیقت اسی انذار کے مضمون کی تکمیل ہے جس پر سابق سورہ تمام ہوئی ہے۔ سابق سورہ کی آخری آیات اور اس سورہ کی ابتدائی آیات نے ایک حلقۂ اتصال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ سورۂ برأت کی تفسیر میں ہم اس نوع کے اتصال کی بعض خوبیوں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

مخاطبین سے مراد مشرکین مکہ ہیں

'لِلنَّاسِ' سے مراد، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے مشرکین مکہ ہیں۔ یہ لوگ چونکہ خدا کی یاددہانی سے اعراض پر اڑے ہوئے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے اعراض کرتے ہوئے عام لفظ سے ان کا ذکر فرمایا۔ اس اسلوب بیان سے ایک قسم کی نفرت و کراہت اور حسرت کا اظہار ہو رہا ہے اور اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

ایک سنت الٰہی کی یاددہانی

'لوگوں کے لیے ان کے محاسبہ کا وقت بالکل قریب آ گیا ہے' یہ محض ایک دھمکی نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس سنت الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو اس کے لیے ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اگر وہ یہ راہ نہیں اختیار کرتی تو اتمام حجت کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ اسی سنتِ الٰہی کی روشنی میں فرمایا کہ رسول کی بعثت و دعوت کے بعد ان مشرکین کا یوم الحساب بھی بالکل قریب آ لگا ہے لیکن یہ بدستور غفلت میں پڑے ہوئے، رسول کی تذکیر و تنبیہ سے اعراض کیے جا رہے ہیں۔ یہاں بیک وقت ان کی دو حالتوں کا ذکر ہے، ایک غفلت، دوسری اعراض۔ غفلت یعنی زندگی کے اصل حقائق سے بے پروائی، بجائے خود بھی انسان کی شامت کی دلیل ہے اور ایک بہت بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم اس صورت میں بہت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب کوئی اللہ کا بندہ جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہو لیکن لوگ ایسے غفلت کے ماتے ہوں کہ اس کی کوئی نصیحت بھی سننے کے لیے تیار نہ ہوں۔

مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ (۲)

تازہ بتازہ یاد دہانی

فرمایا کہ ان کے اندر غفلت اور لاابالی پن کے ساتھ سرمستی اور شرارت بھی ہے کہ ان کو بار بار گوناگوں پہلوؤں اور اسلوبوں سے یاد دہانی کی جا رہی ہے لیکن جو تازہ تذکیر و تنبیہ بھی ان کے پاس آتی ہے اس کو سنجیدگی کے ساتھ سننے اور اس پر غور کرنے کے بجائے اس کو ہنسی مسخری میں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورہ طٰہٰ میں فرمایا ہے۔ وَكَذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا - ۱۱۳ (اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا اور اس میں اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دی کہ وہ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ان کے اندر ہماری یاد دہانی کو تازہ کر دے) مطلب یہ ہے کہ اللہ نے صرف ایک بار ان کو سنا دینے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ان کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے تازہ بتازہ یاد دہانیاں بھیجیں لیکن وہ متنبہ ہونے اور ان کی قدر کرنے کے بجائے ہر تذکیر کو اپنے مذاق کا موضوع بنا لیتے ہیں۔

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۗ وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ ۖ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ (۳)

قریش کے لیڈروں کی سخن سازیاں

'لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ' دوسرا حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل کا اصلی کام تفکر و تدبر ہے لیکن ان کا حال یہ ہے کہ ان کے دل اپنی دلچسپیوں میں ایسے کھوئے ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ بات اور بڑی سے بڑی حقیقت کو بھی یہ مذاق میں اڑا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ قریش کے لیڈروں اور ان کے دانشوروں کی وہ باتیں نقل ہو رہی ہیں جو وہ اپنی مجالس میں قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے لوگوں کے اندر پھیلاتے تھے۔ ان کو یہ اندازہ اچھی طرح ہو گیا تھا کہ قرآن کی دعوت دلوں میں گھر کر رہی ہے اور صاف ذہن رکھنے والے لوگ اس سے متاثر ہو رہے

ہیں۔ اس اثر کو مٹانے کے لیے انھوں نے لوگوں کے اندر یہ وسوسہ اندازی شروع کی کہ یہ نہ سمجھو کہ ان کے کلام میں یہ زور و اثر اس چیز کا نتیجہ ہے کہ یہ کوئی فرستادے ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ یہ بھی تمھارے ہی جیسے انسان ہیں، اگر خدا کو کوئی رسول ہی بھیجنا ہوتا تو وہ کسی فرشتے یا کسی اور مخلوق کو اپنا رسول بناتا نہ کہ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو! اور یہ جو ان کے کلام میں زور و تاثیر اور فصاحت و بلاغت محسوس کرتے ہو یہ بھی محض اس شخص کی جادو بیانی کا کرشمہ ہے، جس طرح ہمارے دوسرے شاعر اور خطیب اپنی جادو بیانی سے لوگوں پر اثر ڈالتے ہیں اسی طرح یہ شخص بھی اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو تمھاری یہ بڑی سادہ لوحی ہوگی اگر تم جانتے بوجھتے اس شخص کے جادو میں پھنس گئے!

یہ اشغلے چونکہ لیڈر لوگ خاص اپنی مجالس میں ایجاد کرتے تھے اور وہیں سے القاء ہو کر یہ لوگوں کے اندر پھیلتے تھے، اس وجہ سے ان کو 'نجویٰ' سے تعبیر فرمایا ہے اور 'الَّذِينَ ظَلَمُوا' کے الفاظ سے یہ ظاہر فرما دیا کہ یہ وسوسہ اندازیاں کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے خود اپنے اوپر بھی ظلم کیا کہ اپنے دل و دماغ معطل کر لیے اور دوسروں کے اوپر بھی ظلم کر رہے ہیں کہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

سحر سے مراد اور قرآن کو سحر کہنے کی وجہ

'أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ' میں سحر سے مراد وہ کلام ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سناتے تھے۔ اہل عرب اس کلام کو جس میں غیر معمولی تاثیر و تسخیر ہو سحر سے تعبیر کرتے تھے۔ زور و اثر رکھنے والے کلام کے لیے یہ تعبیر ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ جہاں تک قرآن مجید اور آنحضرت صلعم کے ارشادات کی فصاحت و بلاغت اور سطوت و جلالت کا تعلق ہے وہ ایسی چیز تھی کہ اس کا انکار مخالفین بھی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اس وجہ سے وہ مجبوراً اس کا اعتراف کرتے۔ البتہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ زور و تاثیر اس چیز کا نتیجہ نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی کلام ہے یا اس کا پیش کرنے والا خدا کا کوئی رسول ہے بلکہ یہ تمام تر الفاظ کی جادوگری اور زورِ خطابت کی ساحری ہے تو جانتے بوجھتے، دیکھتے سنتے اس شخص کے جادو میں نہ پھنسو۔ 'وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ' کا ٹکڑا لوگوں کے اندر احساس برتری ابھارنے کے لیے ہے کہ تم کوئی بھولے بھالے اور سادہ لوح لوگ نہیں بلکہ سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ ہو اس وجہ سے تمھیں اس فریب میں نہیں آنا چاہیے۔

قَالَ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۴)

تفویض الی اللہ

یہ اس ردعمل کا بیان ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مخالفین کی اس بکواس کا ہوا۔ آپؐ جانتے تھے کہ یہ اشغلے محض لوگوں کو ورغلانے کے لیے وہ لوگ ایجاد کر رہے ہیں جن پر قرآن کا حق ہونا اچھی طرح واضح ہے اس وجہ سے آپؐ نے ان لوگوں کو خطاب کیے بغیر معاملہ اللہ کے حوالہ کیا کہ میرا رب آسمان و زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے، وہ سمیع و علیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سرگوشیاں جو نہاں خانوں میں بھی ہو رہی ہیں اور یہ فتنے جو لوگ بھی ایجاد کر رہے ہیں، میرا رب ہر بات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ تو جب وہ جانتا ہے تو وہی اس کے تدارک کا سامان بھی فرمائے گا۔ میں اس معاملہ کو اپنے رب ہی کے حوالہ کرتا ہوں۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (۵)

احلام ... ہوم

'اضغاث'، 'ضغث' کی جمع ہے۔ 'ضغث' گھاس کی اس مٹھی کو کہتے ہیں جو رطب و یابس اور خشک و تر دونوں کا مجموعہ ہو۔ یہیں سے 'اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ' کا محاورہ پیدا ہوا جس کے معنی خواب پریشان کے ہیں یعنی وہ خواب جو معنی و مفہوم سے بالکل خالی اور اپنے الجھاؤ کے سبب سے اس قابل نہ ہوں کہ ان کی تاویل و تعبیر کی طرف کوئی توجہ کی جائے اور ان کو کوئی اہمیت دی جائے۔

فرمایا کہ بات یہیں تک نہیں رہی ہے کہ یہ لوگ پیغمبر کی وحی کو سحر کہتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کو خوابِ پریشان سے تعبیر کرتے ہیں، اس کو افترا قرار دیتے ہیں، پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک شاعر بتاتے ہیں اور مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر یہ خدا کے پیغمبر ہیں تو اس کے ثبوت کے لیے اسی طرح کی کوئی نشانی یہ بھی دکھائیں جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ سابق انبیاء آئے۔

قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے کلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کی حیثیت سے پیش فرماتے تھے جو آپ پر خدا کے مقرب فرشتہ جبریل امین کے واسطہ سے نازل ہوتی تھی۔ مخالفوں نے جب یہ محسوس کیا کہ قرآن کے متعلق اس دعوے نے بھی اس کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے اور لوگ اس کو انسانی کلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدائی الہام کی حیثیت سے قبول کر رہے ہیں تو اس کا توڑ کرنے کے لیے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کلام کے وحی الٰہی ہونے کا دعویٰ محض واہمہ کی خلاقی ہے۔ یہ خوابہائے پریشان کا مجموعہ ہے۔ جو خیالات اس شخص کے ذہن میں رچے بسے ہوتے ہیں وہی اس کو سوتے میں خواب میں نظر آتے ہیں اور یہ ان کو (العیاذ باللہ) عوام فریبی کے لیے اس دعوے کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہ خدا نے ایک فرشتہ کے ذریعہ سے وحی نازل کی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دورِ حاضر کے بعض ملاحدہ نے بھی وحی کو ایک مشکوک چیز ٹھہرانے کے لیے بعینہٖ یہی بات کہی ہے جو عرب کے ان اشرار نے کہی تھی۔ بس اتنا فرق ہے کہ عرب کے جہلا نے یہ بات ناتراشیدہ انداز میں کہی اور اس زمانے کے مدعیانِ عقل نے اس کو ایک فلسفہ کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشاء اللہ آخری گروپ کی سورتوں میں ہم اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

آنحضرت صلعم پر ایک شاعر ہونے کی تہمت

'بَلِ افْتَرٰىهُ' یعنی اس قرآن کو افترا بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کو افترا قرار دینے سے ان کا مدعا یہ تھا کہ ہے تو ان کے (آنحضرت کے) اپنے ذہن کی ایجاد لیکن (العیاذ باللہ) یہ جھوٹ موٹ محض ہم پر اپنی دھونس جمانے کے لیے اس کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

'بَلْ هُوَ شَاعِرٌ' یعنی یہ ایک شاعر ہیں اور ان کے اس کلام کی ساری سحر آفرینی اس نوعیت کی ہے جس نوعیت کی سحر آفرینی ہمارے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ ان کو اور ان کے کلام کو اہمیت دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہل عرب کا تصور یہ تھا کہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اس کو شعر القا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شاعر

کہہ کر وہ لوگوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے تھے کہ نعوذ باللہ آپ کے ساتھ بھی کوئی جن ہے جو یہ کلام آپ پر القا کرتا ہے۔

مخالفین پر قرآن کا رعب

قرآن کے مخالفین کی ان باتوں سے ایک امر تو بالکل واضح ہے کہ وہ اس کی ہیبت و جلالت سے سخت مرعوب تھے اور یہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ لوگوں کے دلوں پر سے اس کے رعب کو ہٹایا نہیں جا سکتا۔ البتہ ان کی یہ کوشش تھی کہ لوگوں پر اس کے خدائی کلام ہونے کی جو ہیبت بیٹھتی جا رہی ہے اس کو کسی طرح کم کریں کہ لوگ اس کو وحی و الہام کا درجہ نہ دیں بلکہ بشری و انسانی کلام ہی کے درجے میں رکھیں۔

معجزات کی نشانی کا مطالبہ

'کَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ' کے بعد 'بِالْاٰیٰتِ' قرینہ کی دلالت کی بنا پر حذف ہے۔ یعنی جب وہ یہ محسوس کرتے کہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کی یہ اوٹ پٹانگ باتیں لوگوں کے دلوں میں اترنے والی نہیں ہیں تو یہ مطالبہ کرتے کہ اگر یہ رسول ہیں تو یہ بھی اسی طرح کی کوئی نشانی دکھائیں جس طرح کی نشانیاں پہلے آنے والے رسولوں نے دکھائیں۔ نشانی سے ان کی مراد اس طرح کے حسی معجزات یا عذاب کی نشانیاں ہیں جن کا ذکر دوسرے انبیاء کی سرگزشتوں کے سلسلہ میں آیا ہے۔ ان کا یہ حربہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں، ان کے زعم کے مطابق، سب سے زیادہ کارگر حربہ تھا اس لیے کہ قرآن کی دعوت تمام تر آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے دلائل پر مبنی تھی۔ وہ معجزات و خوارق اور نشانیٔ عذاب کے بجائے لوگوں کو آنکھیں کھولنے اور عقل و بصیرت سے کام لینے پر ابھارتا تھا کہ ایمان کا فطری راستہ عقل و دل کا راستہ ہے۔ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے وہ خوارق دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے اور عذاب کی نشانی دیکھ کر جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان لانا بے سود ہوتا ہے۔ قرآن کی یہ بات بالکل برحق تھی لیکن مخالفین اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گریز پر محمول کر کے لوگوں کو ورغلاتے کہ دیکھو، اگر یہ سچ مچ کوئی رسول ہوتے تو ان کے لیے ہمارا یہ مطالبہ پورا کر دینا کیا مشکل تھا! لیکن جب یہ اس سے گریز کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنے دعوے میں (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ (۶)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ ان کی ان خرافات کی پروا نہ کرو۔ یہ ضد اور ہٹ دھرمی کی اسی روش پر چل پڑے ہیں جس پر ان سے پہلے ہلاک ہونے والی قومیں چلیں۔ جس طرح انھوں نے اپنے نبیوں کو جھٹلایا اور اس کی پاداش میں ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اسی طرح ان کے لیے بھی ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔ انھوں نے ہر قسم کی نشانیاں دیکھیں لیکن ایمان کی راہ اختیار نہ کی تو ان سے کس طرح توقع رکھتے ہو کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو کوئی نشانی دکھا دی گئی تو یہ ایمان لانے والے بن جائیں گے! یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی اسی طرح اندھے بنے رہیں گے جس طرح آج اندھے اور بہرے بنے ہوئے ہیں!

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۷)

رسولوں

اوپر آیت ۳ میں مخالفین کا یہ اعتراض نقل ہوا ہے، 'هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ' (یہ تو تمھارے

ہی مانند ایک بشر ہیں) یہ اسی اعتراض کا جواب ہے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ نہیں ہے کہ خدا نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا بلکہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے ہیں سب بشر ہی تھے کبھی خدا نے غیر بشر کو رسول بنا کر نہیں بھیجا۔ رسولوں کو جو امتیاز حاصل تھا وہ یہ نہیں کہ وہ مافوق بشر تھے بلکہ صرف یہ کہ ہم ان کے پاس اپنی وحی بھیجتے تھے، اسی طرح کی وحی جس طرح کی وحی ہم تمھارے پاس بھیجتے ہیں، جس کی مخالفت میں یہ لوگ یہ بکواس کر رہے ہیں۔

دشمن کی گواہی

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ - اوپر والے ٹکڑے میں خطاب کا رخ آنحضرت صلعم کی طرف تھا۔ یہ براہ راست مخالفین و معترضین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تم اس بات سے بے خبر ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لو جن کو پہلے خدا کی کتاب ملی اور وہ نبیوں اور رسولوں کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ اشارہ اہل کتاب بالخصوص یہود کی طرف ہے۔ ان کو گواہ بنانا دشمن کو گواہ بنانے کے ہم معنی ہے اس لیے کہ اس دور میں جیسا کہ پچھلی سورتوں سے واضح ہو چکا ہے، اہل کتاب من حیث الجماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور قریش کی حمایت کے لیے میدان میں اتر چکے تھے۔ قرآن نے ان کو گواہ بنا کر قریش پر حجت تمام کر دی کہ اس حقیقت سے انکار تو تمھارے حامیوں اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن اہل کتاب کو بھی نہیں ہو سکتا تو انہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے! یہاں اہل کتاب کو اہل کتاب کے بجائے اَهْلَ الذِّكْرِ سے تعبیر کرنے میں یہ بلاغت ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت میں اندھے ہو جانے کی بات تو اور ہے لیکن ان میں سے جن کو اپنے نبیوں اور رسولوں کی یاد ہو گی وہ اس بدیہی حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔

قریش پر ایک تعریض

اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کے الفاظ کے اندر قریش پر ایک تعریض بھی ہے کہ ہر چند یہ بات معلوم تو تمھیں بھی ہونی چاہیے کہ تم ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے خلف اور وارث ہونے کے مدعی ہو جو بہر حال بشر ہی تھے مافوق بشر نہیں تھے، لیکن تمھیں اگر یہ بات امی ہونے کے سبب سے بھول گئی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ کر اپنی یادداشت تازہ کر لو جن کو کم از کم یہ بات تو نہیں بھول ہو گی کہ جتنے رسول بھی آئے سب بشر ہی تھے، کوئی بھی فرشتہ نہیں تھا۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (۸)

کوئی نبی مافوق بشر نہیں ہوا

یعنی وہ تمام انبیاء بھی اسی طرح کی بشری خصوصیات کے ساتھ آئے تھے جس طرح کی بشری خصوصیات تمھارے اندر ہیں۔ نہ تو ان کو ایسے جسم ملے تھے جو کھانے پینے کی ضرورت سے مستغنی ہوں اور نہ وہ زندۂ جاوید ہو کر آئے تھے۔ وہ بھی انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے تھے اور انھیں بھی اسی طرح موت سے دوچار ہونا پڑا جس طرح ہر بشر کو اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہ اعتراض دوسری جگہ اس طرح نقل ہوا ہے۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا — یہ تو بس تمھارے ہی مانند ایک بشر ہیں۔ جو تم کھاتے ہو

تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (المومنون ۔ ۳۳-۳۴)

وہی یہ کھاتے ہیں اور جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتے ہیں تو اگر تم اپنے ہی جیسے ایک انسان کو رسول مان لوگے تو بڑے گھاٹے میں رہو گے۔

کسی نبی کو حیاتِ جاوداں نہیں ملی

'وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ' میں ان کے اس زعم کی تردید ہے کہ رسول کو زندہ جاوید ہونا چاہیے۔ اسی سورہ میں آگے اس خیال کی تردید یوں فرمائی گئی ہے۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۳۴-۳۵) یعنی ہم نے تم سے پہلے کسی انسان کو بھی، خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی، حیاتِ جاوداں نہیں بخشی، اگر تمھیں موت آنی ہے تو یہ بھی ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں، ہر نفس کو بہر صورت موت کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ مطلب یہ ہے کہ موت تو اس زندگی کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے جس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ نبی کو بھی اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ چیز نہ اس کی نبوت کے لیے قادح ہے، اور نہ اس کو نبی ماننے میں دوسروں کے لیے کوئی کسرِ شان کی بات ہے۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (۹)

ہر رسول کی تکذیب کرنے والے ہلاک ہوتے

'وعد' سے مراد وہی وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے فرمایا کہ اگر لوگ تمھاری تکذیب کر دیں گے تو ہم تمھاری تکذیب کرنے والوں کو ہلاک کر دیں گے اور تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو نجات دیں گے۔ ہم یونس ۲۰ کے تحت واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک اس عذاب سے جو اس دنیا میں رسول کی تکذیب کر دینے والی قوم پر لازماً آتا ہے۔ دوسرے اس عذاب سے جو آخرت میں ہوگا۔ یہاں پہلا عذاب مراد ہے۔ فرمایا کہ تھے تو وہ بہرحال بشر ہی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ہم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچا کر دکھایا یعنی ان کو اور جن کو ہم نے چاہیں نجات دی اور ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو حدود سے تجاوز کر جانے والے تھے۔ یہاں 'مَنْ نَّشَآءُ' کے اسلوبِ بیان نے کلام کو مطابقِ حال کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ صرف ماضی کی حکایت نہیں ہے بلکہ اس وقت تمھارے سامنے بھی یہی فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ اگر تم نے اپنی ضد سے ہمارے عذاب کو دعوت دی تو ہم اس سے نجات انہی لوگوں کو دیں گے جن کو چاہیں گے۔ ہماری اس مشیت میں کوئی دوسرا دخیل نہ بن سکے گا اور نہ کوئی ہماری پکڑ سے بچ سکے گا۔ 'مُسْرِفِيْنَ' سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کی حدود کو ڈھٹائی کے ساتھ توڑتے ہیں اور رسول کے انذار کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے باغی قرار پاتے ہیں اور باغیوں کی سرکوبی لازماً ہو کے رہتی ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰)

یاد دہانی کے لازمی نتائج

یعنی جس طرح ہم نے پچھلی قوموں پر ان کے ہلاک کرنے سے پہلے ان کی تذکیر کے لیے رسول بھیجے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اسی طرح تمھارے اوپر بھی ایک کتاب اتار دی ہے جس میں تمھیں اچھی طرح یاد دہانی کر دی ہے۔ اب تم ہمارے سامنے یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تمھیں یاد دہانی نہیں کی گئی۔ یہ یاد دہانی اپنے لازمی نتائج اپنے ساتھ

دکھتی ہے جو سنت الٰہی کے مطابق بہر حال ظاہر ہو کے رہیں گے۔ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے کہ اگر تم نے رد کر دی تو یہ رد ہو جائے گی بلکہ اس کو رد کر دینے کا وہی نتیجہ تمہارے سامنے آ کے رہے گا جو تم سے پہلے دوسری قوموں کے سامنے آ چکا۔ خدا کی جو سنت آج تک جاری رہی ہے وہ تمہارے معاملے میں بدل نہیں جائے گی۔ 'اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ' یہاں سخت تہدید و وعید کے سیاق میں ہے کہ نادانو، تمہاری عقل کہاں کھوئی گئی ہے! کیوں اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہو! اس آیت کے صحیح زور کو سمجھنے کے لیے سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۳۲ - ۱۳۵ کے تحت جو وضاحت کی گئی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَكَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ كَانَتۡ ظَالِمَةً وَّاَنۡشَاۡنَا بَعۡدَهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ (۱۱)

تاریخ کا حوالہ

یہ پچھلی قوموں کی تاریخ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح تم اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہو کہ خدا کی یاددہانی کا مذاق اڑا رہے ہو اسی طرح تم سے پہلے بھی بہت سی قومیں یہی حرکت کر چکی ہیں جس کی پاداش میں ہم نے ان کے پرخچے اڑا دیے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اسی جرم کے تم مرتکب ہو رہے ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا وہی معاملہ تمہارے ساتھ نہ کرے جو اس نے ان کے ساتھ کیا۔

'كَانَتۡ ظَالِمَةً' یہاں 'ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ' کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ نے ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والی بنیں۔ خدا نے اپنے رسول بھیج کر ان کو خطرے سے آگاہ کر دیا۔ لیکن انھوں نے اپنی رعونت کے سبب سے خود اس خطرے کے بند کو توڑا۔

قوموں کے ایک مغالطہ کی تردید

'وَّاَنۡشَاۡنَا بَعۡدَهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ' یعنی خدا کے لیے ایک قوم کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری قوم کو برپا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کوئی بھی اپنے وجود کو اس دنیا کے لیے ناگزیر نہ سمجھے کہ اس کے اجڑنے سے خدا کی دنیا اجڑ جائے گی۔ جب کوئی قوم بغاوت کی روش اختیار کرے گی خدا اس کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو لائے گا اور دیکھے گا کہ وہ کیا روش اختیار کرتی ہے۔ اگر وہ بھی وہی روش اختیار کرے گی تو بالآخر اس کا بھی وہی حشر ہوگا ـــــ افراد ہوں یا اقوام جب ان پر خدا سے بے پروائی غالب ہوتی ہے، تو وہ اپنے وجود کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگ جاتے ہیں۔ یہاں اسی مغالطہ کو دور فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو بہت بڑی چیز نہ سمجھو، خدا جب چاہے گا، یہاں جھاڑو پھر وا دے گا اور تمہاری جگہ دوسروں کو لا بسائے گا۔

فَلَمَّاۤ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ اِذَا هُمۡ مِّنۡهَا يَرۡكُضُوۡنَ (۱۲)

خدا کی پکڑ سے کوئی پناہ نہیں

یعنی جس طرح آج تم بڑے طنطنہ کے ساتھ خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے ہو اسی طرح انھوں نے بھی بڑی رعونت کے ساتھ خدا کے عذاب کو دعوت دی بالآخر جب ہمارے عذاب نے ان کے دروازوں پر دستک دے دی تو اس کے مقابلہ کے لیے وہ کوئی تدبیر نہ کر سکے بلکہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن خدا کے عذاب سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ وہ جب دبوچ لیتا ہے تو اس کے چنگل سے کوئی نہیں نکل سکتا!

لَا تَرۡكُضُوۡا وَارۡجِعُوۡۤا اِلٰى مَاۤ اُتۡرِفۡتُمۡ فِيۡهِ وَمَسٰكِنِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُسۡـَٔلُوۡنَ (۱۳)

ایک طنزیہ اسلوب

یہ صورتِ حال کی تعبیر ہے یعنی خدا کی گرفت نے اپنی زبانِ حال سے ان سے کہا کہ اب کہاں بھاگتے ہو! اب بھاگو مت، بھاگنے کا وقت گزر گیا! خدا کی بخشی ہوئی جن رفاہیتوں میں اب تک عیش کرتے اور اپنے جن محلوں اور ایوانوں میں بیٹھ کر خدا کی آیات اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے رہے ہو، ان میں جاؤ تاکہ تمہاری اچھی طرح مزاج پرسی ہو! لَعَلَّکُمۡ تُسۡـَٔلُوۡنَ یہاں طنز و تضحیک کے مفہوم میں ہے۔ طنز و تضحیک کا یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی ہے۔ سخت اظہارِ غضب کے مواقع میں ہم بھی باندازِ طنز یوں کہتے ہیں کہ ٹھہرو، ابھی میں تمہاری مزاج پرسی کرتا ہوں، ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں، ابھی پوچھتا ہوں۔ قرآن کے دوسرے مواقع میں بھی یہ اسلوب استعمال ہوا ہے۔ مثلاً آیت ۸۔ تکاثر اور آیت ۹۲۔ نحل میں۔

'اِلٰی مَاۤ اُتۡرِفۡتُمۡ فِیۡہِ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ رفاہیت و نعمت کی فراوانی تمہیں بخشی تو گئی خدا کی طرف سے تاکہ تمہاری شکرگزاری کا امتحان ہو لیکن تم اس کو اپنے اب وجد کی میراث اور اپنے استحقاقِ ذاتی اور اپنی قابلیت کا کرشمہ سمجھے اور اس کے بل پر اسی خدا سے تم نے بغاوت کی جس کے فضل سے تمہیں یہ نعمتیں حاصل ہوئیں تو اب اس کا مزہ چکھو۔ یہاں خطاب چونکہ امراء و اغنیاء سے ہے اور 'مساکن' کا ذکر ان کے اسبابِ عیش و رفاہیت کے ذکر کے بعد ہے اس وجہ سے 'مساکن' سے مراد انہی امراء کے ایوان و محل ہیں۔

قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَاۤ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتۡ تِّلۡکَ دَعۡوٰىہُمۡ حَتّٰی جَعَلۡنٰہُمۡ حَصِیۡدًا خٰمِدِیۡنَ (۱۴-۱۵)

بعد از وقت اعتراف

یعنی جب عذاب نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تب ان کو ہوش آیا اور انھوں نے واویلا شروع کیا اور بول اٹھے کہ بے شک ہم خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے اور ہم نے یہ شامت خود بلائی۔ لفظ 'ظلم' کے اس مفہوم کی طرف اوپر آیت ۱۱ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ اعتراف انھیں اس وجہ سے کرنا پڑا کہ اس عذاب سے پہلے خدا کے رسول نے انھیں اچھی طرح خبردار کر دیا تھا لیکن وہ نہ صرف اندھے بہرے بنے رہے بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتے رہے۔ بالآخر جب وہ سر پر آدھمکا تو انھیں ماننا پڑا کہ سارا قصور ان کا اپنا ہے۔

فَمَا زَالَتۡ تِّلۡکَ دَعۡوٰىہُمۡ الاٰیۃ۔ 'دَعۡوٰی' کے معنی چیخ و پکار اور استغاثہ و فریاد کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ان کی وہی چیخ و پکار ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ یعنی وہ اسی طرح چیخ پکار کرتے ہی رہ گئے، ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی اس لیے کہ عذاب آجانے کے بعد چیخ پکار بے سود ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کو کاٹی ہوئی گھاس اور بجھی ہوئی آگ کی مانند کر دیا۔ 'کاٹی ہوئی گھاس اور بجھی ہوئی آگ'، کے استعارے میں یہ مضمون مضمر ہے کہ جس طرح گھاس کاٹ کر اس کے خشک انبار میں آگ لگا دی جائے اور وہ راکھ کا ڈھیر ہو کے رہ جائے اسی طرح ہم نے ان کو خاک اور راکھ بنا دیا۔ لفظ 'خٰمِدِیۡنَ' یہاں استعارہ کی رعایت سے آیا ہے اور یہ عربی کا معروف اسلوب ہے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۶-۲۹

آگے اسی بات کی دلیل بیان ہوئی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس دنیا میں قوموں کا جو محاسبہ ہوتا ہے اور آگے قیامت میں جو ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خدا نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے اس طرح کا کوئی تھیٹر نہیں بنایا ہے جس طرح کے تھیٹر دنیا کے بادشاہ اپنے جی بہلانے کے لیے بناتے ہیں بلکہ یہ اس نے اپنے فضل و رحمت اور حق و عدل کے ظہور کے لیے بنائی ہے۔ اس فضل و رحمت اور حق و عدل کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس میں اس کے بندے شتر بے مہار کی زندگی نہ گزاریں بلکہ خدا کے نظام حق و عدل کے پابند ہو کر زندگی گزاریں اور یہ یوں ہی چلتی نہ رہے بلکہ اس کے بعد ایک ایسا یوم الحساب بھی آئے جس میں وہ لوگ اپنی کارکردگی کا صلہ پائیں جو اس دنیا کے خالق کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں اور وہ لوگ کیفر کردار کو پہنچیں جو اس میں دھاندلی مچائیں۔ اگر کسی ایسے یوم الحساب کے بغیر اسی طرح یہ دنیا چلتی رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا خالق کوئی کھلنڈرا ہے جس نے محض اپنی تفریح کے لیے یہ کھیل رچائی ہے اس کو اس کے خیر و شر اور عدل و ظلم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ خیال بالبداہت باطل اور خدا کی صفات عدل و رحم کے بالکل منافی ہے اس وجہ سے قیامت ناگزیر ہے۔ اسی سلسلہ میں شرک کی تردید بھی فرمائی اس لیے کہ اگر شرک کی کوئی گنجائش باقی رہے تو اس صورت میں بھی یہ دنیا بازیچۂ اطفال اور ایک کھیل تماشہ بن کے رہ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایسے شرکاء و شفعاء کا وجود تسلیم کر لیا جائے جو خدا کے معاملات میں اتنے دخیل ہوں کہ وہ اپنے پجاریوں کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں تو قیامت کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر یہ روز عدالت آیا بھی تو اس کے لیے کسی فکر و اہتمام کی ضرورت نہیں ہے، سفارشیوں کے ذریعہ سے اس عدالت سے چھوٹا جا سکتا ہے اور سفارش کے لیے ان کے یہ مزعومہ شرکاء و شفعاء ان کے نزدیک کافی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶-۲۰ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ
نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ
نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ
الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ
عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ يُسَبِّحُوْنَ
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ

يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ
رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾
اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا
ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ
فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ
اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿٢٥﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ
وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ
بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ
اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَمَنْ يَّقُلْ
مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ
نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾ ع ۱۹/۲

ترجمۂ آیات ۱۲-۲۹

اور ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشہ کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو خاص اپنے پاس ہی بنالیتے۔ اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے! بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ اس کا بھیجا نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کے رہے گا اور تمھارے لیے اس چیز کے سبب سے، جو تم بیان کرتے ہو، بڑی خرابی ہے! ۱۶-۱۸

اور اسی کے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس ہیں۔ وہ اس کی بندگی سے نہ سرتابی کرتے اور نہ تھکتے۔ وہ شب و روز اس کی تسبیح کرتے ہیں اور دم نہیں لیتے۔ ۱۹-۲۰

کیا انھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لیے ہیں، وہ زمین کو شاداب کرتے ہیں؛ اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کے رہ جاتے۔ تو اللہ، عرش کا مالک، ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں! وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے باب میں کسی کے آگے مسئول نہیں اور یہ سارے مسئول ہیں۔ کیا انھوں نے خدا کے ماسوا دوسرے معبود ٹھہرا رکھے ہیں؟ ان سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ تعلیم ہے ان لوگوں کی جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے۔ بلکہ ان میں سے اکثر حق سے بے خبر ہیں اس وجہ سے اعراض کیے جا رہے ہیں۔ اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھی بھیجے ان کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔ ۲۱-۲۵

اور یہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمان کے اولاد ہے، وہ ان باتوں سے ارفع ہے، بلکہ وہ خدا کے مقرب بندے ہیں۔ وہ اس کے آگے بات میں پہل نہیں کرتے، وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے سب سے باخبر ہے۔ اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اللہ پسند فرمائے۔ اور وہ اس کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں اور ان میں سے جو بھی مدعی بنے گا کہ اس کے سوا میں الٰہ ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیں گے۔ ۲۶-۲۹۔

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۱۶)

جزاء و سزا کے لازم ہونے کی دلیل — اوپر جو بات جزاء و سزا کے لازمی ہونے سے متعلق فرمائی گئی ہے یہ اس کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اگر اس دنیا کے پیچھے کوئی روزِ جزاء و سزا نہیں ہے، یہ یوں ہی چلتی آئی ہے اور یوں ہی ہمیشہ چلتی رہے گی، کوئی نیکی کرے یا بدی، ظلم کرے یا انصاف، اس کے خالق کو اس کے خیر و شر سے کوئی بحث نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ

اس نے یہ محض اپنا جی بہلانے کے لیے ایک کھیل تماشا بنایا ہے، جب تک وہ چاہے گا اس سے جی بہلائے گا اور جب اُکتا جائے گا اس کی بساط لپیٹ کر رکھ دے گا اور اپنی دلچسپی اور اوقات گزاری کے لیے کوئی نیا کھیل ایجاد کرے گا۔ فرمایا کہ ہم نے اس آسمان و زمین اور ان کے مابین کی چیزوں کو اس طرح کے کسی کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ یہ کارخانۂ کائنات اپنے وجود سے شاہد ہے کہ یہ ایک عادل و حکیم اور رحمان و رحیم کا بنایا ہوا کارخانہ ہے۔ نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، نہ یہ دیوتاؤں کی رزمگاہ ہے اور نہ یہ کسی بھگوان کی لیلا ہے بلکہ اس پُر حکمت کارخانہ کی ایک ایک چیز شاہد ہے کہ اس کے خالق نے اس کو ایک عظیم مقصد و غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے عدل و حکمت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے، جس میں اس کا مقصد ظہور میں آئے۔

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۱۷)

کھیل اور کارِ عبث خدا کی صفات کے منافی ہے۔

فرمایا کہ اول تو اس قسم کا کھیل اور کارِ عبث ہماری شان اور ہماری اعلیٰ صفات کے منافی ہے لیکن بالفرض ہم ایسا کرنے والے ہی ہوتے تو اپنے پاس ہی سے اس کا سر و سامان مہیا کر لیتے، اس میں اپنے بندوں اور بندیوں اور اپنی دوسری مخلوقات کو کیوں گھسیٹتے! ہم اس کتاب میں روم کے قدیم سلاطین کے متعلق کہیں ذکر کر آئے ہیں کہ وہ اپنے تھیٹروں میں بھوکے شیروں اور اپنے مظلوم غلاموں کی چیر پھاڑ کا تماشا دیکھتے تھے۔ العیاذ باللہ یہی رائے اس کائنات کے خالق کے متعلق قائم کرنی پڑے گی اگر وہ اپنی تمام مخلوقات کو اس ابتلا میں ڈال کر ان کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی، سرکش و باغی بھی ہیں اور وفادار و تابعدار بھی، ناشکرے اور نابکار بھی ہیں اور حق شناس و شکر گزار بھی، ایسی حالت میں اگر اس دنیا کے لیے کوئی روزِ عدل نہیں ہے تو پھر یہ روم کے سلاطین کے ایک تھیٹر کے مانند ہے۔ اس آیت میں اسی بیہودہ خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اپنی مخلوقات کے ساتھ خدا کا جو تعلق ہے وہ اس بات کو واجب کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں حق و باطل کا فیصلہ ہو، حق سربلند ہو اور باطل نابود۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور یہ چیز خدا کی صفات کے منافی ہے۔

'لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ' کے چند لفظوں کے اندر جس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم کوئی کھیل تماشا بنانا ہی چاہتے تو ہم اس کا سر و سامان اپنے پاس ہی سے کر لیتے اس کے لیے آدم و ابلیس، حق و باطل، ہدایت و ضلالت، عدل و ظلم، خیر و شر، اور ظلم و مظلومی کی یہ رزمگاہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں تھی! یہ بات خدا کے عدل و رحم کے بالکل منافی ہے کہ وہ ایک رزمگاہ میں اپنے بندوں اور بندیوں کو اتار دے اور خود ایک تماشائی بن کر صرف اس کا تماشا دیکھے، نہ ان لوگوں کو انعام دے جو اس جہاد میں کامیاب و سرخرو ہوں اور نہ ان لوگوں کو سزا دے جو اپنی ساری زندگی باطل کی پرستش اور اس کی حمایت میں گزاریں۔

'اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ' میں خدا کی نسبت اسی باطل تصور کی تردید ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اسی باطل تصور کی بنا پر دنیا کی مشرک قوموں نے اس کائنات کو اپنے دیوتاؤں کی ایک تماشہ گاہ قرار دیا اور ہندو فلسفیوں نے اس کو بھگوان کی لیلا سے تعبیر کیا۔ ان کے ہاں چونکہ قیامت کا کوئی واضح تصور نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے خیال کیا کہ جس

طرح دنیا کے بادشاہ اپنی تفریح کے لیے تھیٹر بناتے ہیں اسی طرح ان کے غیبی دیوتاؤں نے یہ دنیا بنائی ہے اور وہ اس میں کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم، کسی کو قاتل اور کسی کو مقتول بنا کر اس کا تماشہ دیکھتے اور اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمارے اس زمانے کے منکرین و ملاحدہ اگرچہ زبان سے تو یہ بات نہیں کہتے کہ یہ کہنے میں نہایت بھونڈی ہے لیکن جب وہ قیامت اور ایک روزِ عدل و انصاف کو نہیں مانتے تو ان کے دل کے اندر بھی اصلاً یہی تصورِ باطل گھسا ہوا ہے اس لیے کہ انکارِ قیامت کے معنی دوسرے لفظوں میں یہی ہیں کہ یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال ہے۔ قیامت کو مانے بغیر اس کائنات کی کوئی ایسی توجیہ ممکن ہی نہیں ہے جو اس کو حق و عدل پر مبنی قرار دے سکے۔ ان دونوں میں اسی طرح کی نسبت ہے جس طرح کی نسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ اگر جوڑے کے ایک فرد کو اس کے دوسرے جزو سے الگ فرض کر کے اس کی توجیہ کرنا اور اس کے داعیات و مقتضیات کی حکمت معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔

بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَـكُمُ الۡوَيۡلُ مِمَّا تَصِفُوۡنَ (۱۸)

'دمغ' کے معنی کسی کو اس طرح مارنے اور زخمی کرنے کے ہیں کہ وہ اس کا بھیجا نکال دے۔

اصل حقیقت کا بیان

فرمایا کہ تم جو اس دنیا کو ایک کھیل تماشہ سمجھے بیٹھے ہو، یہ خیال بالکل باطل ہے۔ اس میں ہم نے حق کے ساتھ باطل کو جو مہلت دے رکھی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ ہمارے نزدیک حق و باطل دونوں یکساں ہیں بلکہ یہ محض تمہارے امتحان کے لیے ہے کہ دیکھیں کون حق کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون باطل کا پرستار بنتا ہے۔ بالآخر ایک دن آئے گا جب تم دیکھو گے کہ ہم حق کا ہتھوڑا باطل کے سر پر اس طرح ماریں گے کہ وہ باطل کا بھیجا نکال کر رکھ دے گا اور جس طرح تم دیکھتے ہو کہ دماغ پر ضرب کاری آدمی کو آناً فاناً ختم کر دیتی ہے اسی طرح یہ ضرب کاری باطل کو چشم زدن میں نابود کر دے گی۔

'وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ' یعنی اس وقت تمہاری اس بکواس کے سبب سے جو تم آج کر رہے ہو تمہارے لیے صرف تباہی اور ہلاکی ہی ہو گی۔ 'مِمَّا تَصِفُوْنَ' سے ہمارے نزدیک مراد ان کا دنیا سے متعلق یہ تصور بھی ہے کہ یہ محض ایک کھیل تماشا ہے، اور ان کے شرک و شفاعت کا وہ عقیدہ بھی ہے جس کے سبب سے وہ آخرت سے بالکل نچنت ہو کر یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ بالفرض آخرت سے سابقہ پیش ہی آیا تو ان کے شرکاء و شفعاء ان کو ہر خطرے سے بچا لیں گے۔ فرمایا کہ تمہاری یہ تمام باتیں موجب وبال اور سبب ہلاکت بنیں گی۔

وَلَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسۡتَحۡسِرُوۡنَ ۚ يُسَبِّحُوۡنَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفۡتُرُوۡنَ (۱۹-۲۰)

شرک کے واہمہ کی تردید

اوپر کی آیات میں جزا و سزا کے واجب ہونے پر صفاتِ الٰہی سے استدلال تھا۔ اب یہ توحید کا بیان

آ رہا ہے تاکہ یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ اپنے شرکاء و شفعاء کی سفارش سے خدا کی پکڑ اور جزا و سزا سے بچ جائے گا تو یہ محض اس کا وہم ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدا ہی کی مخلوق اور اسی کے مملوک ہیں کسی کو خدا کے ہاں کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے۔

فرشتوں کا حال

'وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ'۔ 'مَنْ عِنْدَهٗ' سے مراد خدا کے مقرب ملائکہ ہیں۔ فرمایا کہ وہ بھی اسی زمرے میں داخل ہیں۔ باہمہ قرب و شرف ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ اس کی عبادت سے کبھی سرتابی کرتے، نہ کبھی اس سے تھکتے۔ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں فرض کر کے ان کی عبادت کرتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ ان کو خدا کے ہاں بڑا مرتبہ و مقام حاصل ہے جو بات چاہیں اپنے باپ سے منوا لیتی ہیں اور خدا ان کی نازبرداری میں ان کی ہر خواہش کی لازماً تعمیل کرتا ہے۔ وہ اپنی دنیا کی نعمتوں کو بھی انہی کا عطیہ سمجھتے اور آخرت کے باب میں بھی ان کا خیال تھا کہ اگر بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی ہوا تو ان کی بدولت وہاں بھی ان کو بڑا درجہ حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ تم تو ان کے بل پر خدا سے اکڑتے ہو لیکن خود ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ کبھی خدا کی بندگی سے سرتابی کرتے اور نہ کبھی اس کام میں وہ کوئی تکان محسوس کرتے، وہ شب و روز خدا کی تسبیح و تہلیل میں سرگرم رہتے ہیں، ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں توقف نہیں کرتے۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۲۱ - ۲۲)

'انشر اللہ الارض' کے معنی یہ ہوں گے، خدا نے زمین کو اس کے خشک و بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ و شاداب کر دیا۔ مثلاً فرمایا ہے۔ 'وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا' (زخرف - ۱۱) (اور جس نے اتارا آسمان سے پانی ایک خاص اندازہ کے ساتھ پس ہم نے اس سے شاداب کر دیا خشک زمین کو)

زمین و آسمان کا رب ایک ہے

یہ مشرکین کے ایک دوسرے مشرکانہ واہمہ کی تردید ہے۔ بہت سے مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ زمین اور آسمان کے الٰہ الگ الگ ہیں۔ وہ ایک رب العرش کو مانتے تھے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ رب العرش اپنے عرش آسمان پر براجمان ہے، زمین میں دوسرے خداؤں کی خدائی چل رہی ہے۔ اسی وہم کے تحت وہ آسمان کے خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے زمینی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ اہل عرب کے علم الاصنام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تصور یہ تھا کہ زمین چونکہ رب العرش کی مملکت کا ایک بہت بعید علاقہ ہے اس وجہ سے اس کا انتظام و انصرام، دوسروں کے حوالہ کر کے وہ اس سے الگ تھلگ ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ کیا انھوں نے زمین کے الگ الٰہ ٹھہرا لیے ہیں جو اس زمین کو زندگی بخشتے اور اس کو سرسبز و شاداب کرتے ہیں؟ ان کا یہ خیال بالکل ہی باطل ہے۔ اگر آسمان و زمین میں خدا کے ماسوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو

کے رہ جاتے۔ آخر آسمان والوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین کے خشک و بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد اس کو از سرِ نو پر بہار کر دینے کے لیے پانی برساتے یا ان کی دوسری ضروریات کی فراہمی میں کوئی حصہ لیتے! توحید کی اس دلیل کی وضاحت دوسرے مقام میں 'دلیل توافق' کے عنوان سے ہم کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات کے بقا کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے مختلف اجزاء و عناصر اور اس کے تمام اضداد میں نہایت گہرا توافق ہے۔ اگر یہ توافق ایک لمحہ کے لیے بھی ختم ہو جائے تو اس کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتے۔ یہ توافق صریح طور پر اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس پوری کائنات پر ایک ہی ذات کا ارادہ (۴۷، ۴۵) کارفرما ہے۔ اگر اس میں بہت سے ارادے کارفرما ہوتے تو آسمان و زمین کا باقی رہنا ناممکن تھا۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ توحید کی یہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا کہ خدائے رب العرش کے باب میں اس قسم کا تصور ایک احمقانہ تصور ہے۔ وہ اس قسم کی باتوں سے ارفع اور پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ جب وہ اس کائنات کے تختِ حکومت کا مالک ہے تو اسی کا حکم آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب پر چل رہا ہے، پھر دوسروں کی کسی مداخلت کے فرض کرنے کی گنجائش کہاں باقی رہی!

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (۲۳)

سب خدا کے آگے مسئول ہیں

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان واضح فرمائی کہ وہ کسی کے آگے مسئول اور جواب دہ نہیں، باقی سب، خواہ فرشتے ہوں یا جن و انس، اس کے آگے جواب دہ ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے اور اگر کسی نے اس کی جرأت کی تو اس کو اللہ کے حضور میں جواب دہی کرنی پڑے گی اور وہ اس جسارت کی سزا بھگتے گا۔ یہ مشرکین کے اس واہمہ کی تردید ہے کہ وہ اس کائنات کے نظم و نسق میں اپنے معبودوں کو دخیل سمجھ کر ان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ خدا کے جس ارادے کو چاہیں بدلوا سکتے اور جو چاہیں اپنی مرضی سے کر سکتے ہیں، وہ خدا کی باز پرس سے بالاتر ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۴-۲۵)

توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں تاریخ کی شہادت

یہ توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں تاریخ کی شہادت کا حوالہ ہے۔ اوپر کی مذکورہ دلیل توافق سے یہ ایک الگ اور مستقل دلیل ہے اس وجہ سے سوال اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً کو پھر دوہرایا گیا ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو بھی مانتے ہیں تو ان سے کہو کہ یہ ان کے حق میں کوئی دلیل لائیں۔ شرک کے حامیوں سے دلیل کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ تو مابہ النزاع اور اختلافی چیز

نہیں ہے، اس کو تو یہ بھی مانتے ہیں اس وجہ سے وہ ایک مسلم حقیقت ہے۔ رہا یہ دعویٰ کہ اس کے سوا کچھ اور بھی معبود ہیں تو یہ محتاج دلیل ہے اور اس کو ثابت کرنے کی ذمہ داری اس دعوے کے مدعیوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے حق میں اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو پیش کریں۔

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ: 'ھذا' یعنی یہ قرآن اپنے اندر وہ تعلیم بھی رکھتا ہے جو مجھ کو اور میرے ساتھ والوں (یعنی میری امت) کو دی گئی ہے اور اس میں وہ تعلیم بھی ہے جو مجھ سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئی۔ سب نے اسی توحید کی تعلیم دی ہے کسی نے بھی شرک کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اگر تمھارے پاس اس کے خلاف کوئی شہادت موجود ہے تو اس کو لاؤ۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ: یعنی یہ بات نہیں ہے کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے جس کی بنا پر یہ توحید کی مخالفت اور شرک کی حمایت میں آستین چڑھائے ہوئے ہیں بلکہ صرف حق سے بے خبری اور جہالت ہے جو اس سارے اعراض وانکار کا سبب ہے۔ یہ آنحضرت صلعم اور آپؐ کے ساتھیوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اس ہنگامۂ مخالفت سے تم آزردہ خاطر نہ ہو، جب مخالفت کی بنیاد دلیل و حجت پر نہیں بلکہ تمام تر بے خبری اور جہالت پر ہے تو اس مرض کا کیا علاج!

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔

یہ اوپر والے ٹکڑے 'ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ' کی وضاحت ہے اور 'نُوْحِيْٓ' سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ یعنی ہم نے تم سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب کو یہی وحی کرتے رہے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو میری ہی عبادت کیجیو۔ یہ امر واضح رہے کہ سابق انبیاء کے جو صحیفے موجود ہیں ان میں اگرچہ بے شمار تحریفیں ہو چکی ہیں لیکن توحید کی تعلیم آج بھی ان میں محفوظ ہے۔ ان کے حاملوں نے اگر شرک اختیار کیا ہے تو اپنے فاسد علمِ کلام کے سہارے پر اختیار کیا ہے نہ کہ ان صحیفوں کی تعلیم کی بنا پر۔ جس طرح قرآن کی نہایت واضح تعلیم توحید کے باوجود اس امت میں شرک کی بہت سی قسمیں گھس آئی ہیں۔ اسی طرح ان امتوں نے اپنے صحیفوں کی تعلیم کے بالکل برخلاف شرک کی لعنت اختیار کی اور پھر اس کے حق میں خارج سے دلیلیں فراہم کرنے کی کوشش کی۔ تورات، انجیل، زبور وغیرہ کی تعلیمات کا حوالہ پچھلی سورتوں میں ہم دے چکے ہیں۔ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم بھی موجود ہے وہ بھی سرتاسر توحید ہے۔ الغرض حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و دعوت کا جو ریکارڈ موجود ہے، وہ قرآن کے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے کہ اللہ کے ہر رسول نے توحید ہی کی تعلیم دی ہے، شرک کی تعلیم کسی نے بھی نہیں دی ہے۔ اس کے خلاف جو دعویٰ کرتا ہے وہ انبیاء کی تاریخ اور ان کی دعوت سے بالکل بے خبر ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (۲۶-۲۷)

خدا کے دربار میں فرشتوں کی حیثیت

یہ مشرکین کے باطل عقیدۂ شفاعت کی تردید ہے کہ وہ خدا کے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنائے بیٹھے ہیں۔ اور اس خبط میں مبتلا ہیں کہ اس دنیا میں جو رزق و فضل ان کو ملتا ہے انہی کی عنایت سے ملتا ہے اور اگر آخرت ہوئی تو انہی کی سفارش سے وہاں بھی یہ نہایت اعلیٰ مراتب حاصل کر لیں گے۔ اس عقیدۂ باطل کی تردید یہاں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس پہلو سے فرمائی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قسم کی سفارش کی کوئی گنجائش مان لی جائے تو آخرت کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوا اس لیے کہ جب خدا کی عدالت میں رشوت یا سفارش سے حق کو باطل اور باطل کو حق بنایا جا سکتا ہے تو یہ دنیا ایک اندھیر نگری بن کے رہ جاتی ہے۔ پھر یہ کارخانہ مبنی بر حق و عدل کہاں رہا! اور اس کے خالق کو عادل اور حکیم کون مانے گا!

فرمایا کہ ان لوگوں کا یہ خیال بالکل باطل ہے۔ اللہ جل شانہٗ بیٹوں، بیٹیوں اور بیوی بچوں کی نسبت سے پاک و ارفع ہے۔ اس قسم کی نسبتیں اس کی شانِ الوہیت کے بالکل منافی ہیں۔ فرشتے خدا کی بیٹیاں نہیں ہیں، جیسا کہ یہ بے وقوف لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ وہ اس کے باعزت بندے ہیں۔ ان کو خدا کے قرب کا مقام حاصل ہے لیکن یہ قرب ان کو اس لیے حاصل ہے کہ وہ شر سے بالکل پاک اور خدا کی بندگی اور وفاداری میں کامل العیار ہیں نہ اس لیے کہ وہ خدا سے جو چاہیں منوا لیتے ہیں۔

'لَا یَسۡبِقُوۡنَہٗ بِالۡقَوۡلِ وَ ہُمۡ بِاَمۡرِہٖ یَعۡمَلُوۡنَ'۔ یعنی زور و اثر یا ناز و تدلل سے کوئی بات منوا لینا تو درکنار وہ خدا کے آگے بات کرنے میں پہل بھی نہیں کرتے۔ جب ان کو اذن ہوتا ہے تب وہ زبان کھولتے ہیں اور جو بات ان سے پوچھی جاتی ہے حدِ ادب کے اندر اس کا جواب دیتے ہیں، اور ان کی یہ حیثیت بھی نہیں کہ بطور خود کسی کام کے لیے اقدام کر سکیں۔ وہ بس اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں جو خدا کی طرف سے ان کو دیا جاتا ہے۔ تو جن کی حیثیت خدا کے آگے یہ ہے ان سے یہ آس لگا بیٹھنا کہ وہ اپنے زور و اثر سے جس کو چاہیں گے خدا کی پکڑ سے چھڑا لیں گے یا جس درجے اور مرتبے پر اس کو چاہیں گے سرفراز کریں گے محض ایک احمقانہ آرزو ہے۔

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ وَ لَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی وَ ہُمۡ مِّنۡ خَشۡیَتِہٖ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۸﴾

'یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ'، یعنی ان کے آگے پیچھے اور حاضر و مستقبل میں جو کچھ ہے خدا ان ساری باتوں سے خود اچھی طرح واقف ہے اس وجہ سے نہ تو وہ کسی کے باب میں خدا کے علم میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ کسی بات کو کچھ گھٹا یا بڑھا سکتے ہیں۔

'وَ لَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی'۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ کسی کے بارے میں سفارش کے لیے خود سبقت نہیں کریں گے بلکہ جن کے لیے خدا پسند فرمائے گا صرف انہی کے لیے سفارش کریں گے۔

'وَ ہُمۡ مِّنۡ خَشۡیَتِہٖ مُشۡفِقُوۡنَ'۔ مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ وہ خدا کے خوف سے ہر وقت

لرزاں و ترساں رہنے والے ہیں اس وجہ سے اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی خلافِ حق بات زبان سے نکالیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کی سفارش پر جو لوگ تکیہ کیے بیٹھے ہیں وہ ان ساری باتوں کو سوچ لیں، محض ایک وہم کے سہارے پر اپنی عاقبت خراب نہ کریں۔

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (۲۹)

یعنی تم نے ان کو یہ درجہ دے رکھا ہے کہ گویا خدا ان کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے، وہ اس کو جس طرح چاہیں کھیل سکتے ہیں لیکن اصل حقیقت یہ ہے، اس کو اچھی طرح کان کھول کر سن لو، کہ اگر ان میں سے بھی کوئی کہیں یہ کہہ بیٹھے کہ خدا کے سوا وہ بھی ایک الٰہ ہے تو ہم اس کو جہنم میں جھونک دیں گے۔ یہی جہنم کی سزا ہے جو ہم نے تمام مشرکوں کے لیے ٹھہرا رکھی ہے وہی ہم ان کو بھی دے کے رہیں گے۔ یاد ہوگا کہ بعینہٖ یہی بات اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو خطاب کر کے حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ مائدہ کے باب میں بھی فرمائی ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۳۰-۳۳

اوپر کی آیات میں معاد و توحید کی وہ دلیلیں بیان ہوئی ہیں جو عقل و فطرت اور صفاتِ الٰہی کے بدیہیات و مقتضیات پر مبنی ہیں۔ اب یہ نشانیوں کا مطالبہ کرنے والوں کو جن کا ذکر آیت ۵ میں ہے، آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ وہ کسی نئی نشانی کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں، خدا کی یہ کائنات، اس کی قدرت، رحمت، ربوبیت اور توحید و معاد کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے، ان نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے؟ جب وہ ان ساری نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اگر کوئی نئی نشانی دکھا دی گئی تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی! دل میں ہدایت کے اترنے کی اصل راہ عقل ہے، جب انھوں نے عقل پر پٹی باندھ رکھی ہے تو ان کو ہدایت کس طرح نصیب ہو سکتی ہے! اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۳۰-۳۳
اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا
فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۰)
وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا
فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳۱) وَجَعَلْنَا السَّمَاۗءَ سَقْفًا

مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمۂ آیات ۳۰-۳۳

کیا ان کفر کرنے والوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بند ہوتے ہیں، پھر ہم ان کو کھول دیتے ہیں اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا، تو کیا وہ پھر بھی ایمان نہیں لا رہے ہیں! اور ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ ان کو لے کر لڑھک نہ جائے اور ان پہاڑوں کے اندر ہم نے راستہ کے لیے درے بنائے تاکہ وہ راہ پائیں۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور وہ اس کی نشانیوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند بنائے۔ ان میں سے ہر ایک ایک خاص مدار کے اندر گردش کر رہا ہے۔ ۳۰-۳۳

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (۳۰)

آفاق کی شہادت توحید، معاد اور جزا پر

'کَانَ' یہاں اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں کَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا میں ہے۔ 'رتق' کے معنی بند اور فتق کے معنی کھولنے کے ہیں۔ آسمان اور زمین کے بند ہونے اور ان کے کھولنے سے مقصود یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ دیکھتے ہو کہ آسمان بند ہوتا ہے، اس سے بارش نہیں ہوتی، اسی طرح زمین بند ہوتی ہے اس سے سبزہ نہیں اگتا، پھر دیکھتے ہو کہ آسمان کھلتا ہے اور اس سے دھڑا دھڑ پانی برسنے لگتا ہے اور اس کے بعد خدا زمین کو بھی کھول دیتا ہے اور وہ اپنی نباتات کے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ کل تک زمین بالکل خشک اور مردہ پڑی ہوئی تھی لیکن بارش کے ہوتے ہی اس کے گوشے گوشے میں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے۔

فرمایا کہ جو لوگ توحید و معاد کا انکار کر رہے ہیں اور قائل ہونے کے لیے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آخر وہ آفاق کی ان نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو ہر روز ان کے مشاہدے میں آ رہی ہیں۔ اللہ نے اپنی اس کائنات

میں یہ نشانیاں اسی لیے تو نمایاں فرمائی تھیں کہ لوگوں کو ان سے صحیح راہ کی طرف رہنمائی حاصل ہو!

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسی ایک مشاہدہ کے اندر ان تمام باتوں کی دلیلیں موجود ہیں جن کی قرآن ان کو دعوت دے رہا تھا۔

اس میں نہایت واضح دلیل توحید کی موجود ہے۔ اگر آسمان میں الگ الٰہ اور زمین میں الگ معبود ہوتے تو آسمان کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین کو زندہ و شاداب رکھنے کے لیے اپنے ذخیرے کا پانی صرف کرتا۔ زمین و آسمان میں یہ زمین کی سی سازگاری اس بات کی صاف شہادت ہے کہ دونوں کا خالق و مالک ایک ہے اور دونوں پر اسی کا ارادہ کارفرما ہے۔

دوسری شہادت اس کے اندر معاد کی ہے۔ جب زمین خشک و بے آب و گیاہ، یا بالفاظ دیگر مردہ ہو کر از سر نو زندہ و شاداب ہو جاتی ہے تو موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو کیوں مستبعد خیال کیا جائے!

تیسری شہادت اس کے اندر انسان کے مسئول ہونے کی ہے۔ جب خدا نے انسان کی پرورش کے لیے یہ کچھ اہتمام فرمایا ہے کہ اپنے آسمان و زمین، سورج چاند، اور ابر و ہوا ہر چیز کو اس کی خاطر سرگرم کار رکھتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کو بالکل شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دے، محاسبہ کا کوئی دن اس کے لیے مقرر نہ کرے۔

یہی مضمون سورۂ قٓ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا	اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا پس ہم
فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ﴿٩﴾	نے اس سے اگائے باغ اور فصل کے غلے اور
وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴿١٠﴾	دراز قامت کھجور جن پر تہ بہ تہ خوشے نکلتے ہیں۔
رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً	بندوں کی روزی کے لیے۔ اور اسی پانی سے ہم نے
مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿١١﴾	مردہ زمین کو بھی زندہ کر دیا۔ اسی طرح قبروں سے
(قٓ: ۹ - ۱۱)	نکلنا ہوگا۔

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿٣١﴾

پہاڑوں جیسی عظیم نشانیاں

'رواسی' عربی میں پہاڑوں کی صفت کے لیے آتا ہے اور یہ صفت ایسی مشہور ہو گئی ہے کہ موصوف کے قائم مقام کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے۔ 'اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ' میں 'ان' سے پہلے 'کراھیۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ 'فجاج'، 'فج'، کی جمع ہے۔ 'فج' دو پہاڑوں کے درمیان کے شگاف کو کہتے ہیں۔

فرمایا کہ ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے جو اس کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں کہ مبادا وہ ان کے سمیت کسی سمت کو لڑھک کر کسی اور کرّہ سے جا ٹکرائے اور یہ اہتمام بھی کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان درّے بنا دیے ہیں کہ وہ لوگوں کے راستہ کا کام دیں کہ وہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو

آ جا سکیں۔ اگر خدا نے ایسا نہ کیا ہوتا تو لوگ اپنے اپنے علاقوں ہی کے اندر بند ہو کے رہ جاتے اور کسی کے امکان میں بھی نہ ہوتا کہ وہ ان دیواروں کو توڑ کر سفر اور تجارت کی راہیں کھول سکے۔

لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ کے اندر یہ مفہوم بھی ہے کہ لوگ ان راستوں سے رہنمائی حاصل کریں اور یہ مفہوم بھی ہے کہ خدا نے اپنی یہ عظیم نشانیاں اس لیے نمایاں فرمائیں کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلیں، ان پر پہاڑوں کے خالق کی قدرت، عظمت اور حکمت کی شانیں واضح ہوں اور وہ خدا تک پہنچنے کی راہ پائیں۔ لیکن یہ انسان کا عجب المعاملہ ہے کہ وہ پہاڑ جیسے عظیم نشان سے تو کوئی رہنمائی حاصل نہیں کرتا البتہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اگر اس کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ اس کو دکھا دیا جائے تو وہ ہدایت کی راہ اختیار کر لے گا۔ آخر جو پہاڑ کو دیکھنے سے قاصر ہے اس کو تل کس طرح نظر آجائے گا! سورۂ قٓ میں ہے۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا	اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ لنگر انداز
رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ	کر دیے اور اس میں نوع بنوع کی خوش منظر چیزیں
بَهِيجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ	اگائیں۔ ہر متوجہ ہونے والے بندے کے اندر بصیرت
مُنِيبٍ (قٓ: ۷-۸)	اور یاد دہانی پیدا کرنے کے لیے۔

اس آیت کے آخری الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ ان عظیم نشانیوں کے دکھانے سے قدرت کا اصل منشا یہ ہے کہ لوگوں کے اندر بصیرت پیدا ہو، ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ لیکن یہ نشانیاں نافع ان کے لیے ہیں جو ان کی طرف متوجہ ہوں۔ جن کے اندر متوجہ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی اندھے کے اندھے ہی رہ جاتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ (۳۲)

آسمان اور اس کی نشانیوں کی طرف اشارہ

زمین کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آسمان کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ آخر یہ نشانیاں طلب کرنے والے آسمان کی اس ناپیدا کنار سقف نیلگوں کو کیوں نہیں دیکھتے جس کی وسعت و پہنائی کی کوئی حد نہیں لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کسی معمولی سے معمولی خلل کی بھی کوئی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ چھت کب بنی لیکن اس امتداد زمانہ کے باوجود نہ اس پر کوئی کہنگی طاری ہوئی، نہ اس میں کوئی نقص و خلل پیدا ہوا۔ ہر قسم کے دراڑ اور شگاف سے بالکل محفوظ یہ قائم و دائم ہے۔

یہی مضمون سورۂ قٓ میں یوں بیان ہوا ہے۔

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ	کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف توجہ نہیں کی؟
كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ	ہم نے اس کو کیسا بنایا اور کس طرح اس کو زینت دی
فُرُوجٍ ۝ (قٓ: ۶)	اور کہیں اس میں دراڑ اور کوئی شگاف نہیں!

سورۂ ملک میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ (ملک: ۳-۴)

وہ ذات جس نے پیدا کیے سات آسمان تہ بہ تہ۔ تم خدائے رحمان کی اس صنعت گری میں کوئی نقص نہیں پا سکتے۔ پس نگاہ دوڑاؤ، کیا تم کوئی خلل دیکھتے ہو؟ پھر دوبارہ نگاہ دوڑاؤ، تمہاری نگاہ ناکام اور تھک ہار کر واپس آ جائے گی لیکن وہ کوئی خلل نہ پا سکے گی!

اس مضمون کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو ۹۹ بنی اسرائیل اور ۲۷ ، ۳۲ نازعات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ بعض لوگوں نے محفوظ سے یہ مراد لیا ہے کہ آسمان شیطان کی دراندازی سے محفوظ ہے۔ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن اس کا ایک خاص محل ہے۔ یہاں یہ چیز زیر بحث نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو سورۂ ملک کی تفسیر میں ہم بحث کریں گے۔

'وَهُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں تک نشانیوں کا تعلق ہے ان کی تو کوئی کمی نہیں ہے، اس کائنات کی ہر چیز نشانی ہے لیکن یہ نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں تو ایسے اندھوں کا کیا علاج!

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۳)

آسمان کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آسمان کی نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ وہی خدا ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند پیدا کیے۔ ہر چند ان میں باہمدگر نسبت اضداد کی ہے لیکن یہ پورے توافق اور کامل ہم آہنگی کے ساتھ اس کائنات کی خدمت میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ ایک ہی قوت قاہرہ کے ہاتھ میں ان کی باگ ہے جو دنیا کے مجموعی مفاد کے لیے ان کو مسخر کیے ہوئے ہے۔

'كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ' ۔ 'کل' سے مراد سورج اور چاند ہیں۔ ہم دوسرے محل میں ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ 'کل' جب اس طرح آتا ہے تو یہ معرفہ کے حکم میں ہوتا ہے اور اس سے مراد سابق الذکر چیزیں ہی ہوتی ہیں عام اس سے کہ وہ دو ہوں یا اس سے زائد۔ فرمایا کہ یہ سورج اور چاند اپنے اپنے معین مدار میں حرکت کرتے ہیں، مجال نہیں کہ سر مو ان سے منحرف ہو سکیں، اگر ذرا بھی ادھر ادھر ہو جائیں تو سارے نظام کائنات میں خلل واقع ہو جائے۔ منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ ان کا اپنی ڈیوٹی میں لگے رہنا اور بلا کسی ادنیٰ تخلف و توقف کے ہمیشہ لگے رہنا صاف اس بات کی شہادت ہے کہ حاکم کائنات کے محکوم اور اسی کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ اب یہ کیسی خرد باختگی ہے کہ ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے، جن کا دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں میں یہ مشاہدہ کر رہے ہیں، کسی اور نشانی کا یہ مطالبہ کرتے ہیں اور اس سے بھی بڑی سفاہت اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے سورج اور چاند کو بھی معبود بنا رکھا ہے درآنحالیکہ وہ رات دن اپنے محکوم و مسخر ہونے کی منادی کر رہے ہیں!

۶- آگے کا مضمون ــــ آیات ۳۴-۴۷

پیچھے آیت ۳ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ مخالفین اس بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑا رہے تھے کہ آپ رسول کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ آپ بھی اسی طرح کے ایک بشر ہیں جس طرح کے عام بشر ہوتے ہیں اور مال و جاہ کے اعتبار سے بھی آپ کو کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ پھر وہ یہ کہتے کہ اگر ہم سے اپنی رسالت تسلیم کرانی ہے تو آپ کوئی ایسی نشانی دکھائیں جو یہ ثابت کر دے کہ فی الواقع آپ کی بات سچی ہے۔ اوپر کی آیات میں نشانیوں کے مطالبہ کا جواب دیا۔ اب آگے کی آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ تم ان لوگوں کے استہزا کی پروا نہ کرو۔ اب وقت آ رہا ہے کہ یہ تمھاری ہر بات کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ان کی یہ ساری اکڑفوں ختم ہو جائے گی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۚ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾
۳۴-۴۷ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۚ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۚ وَ
إِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَإِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا إِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ إِلَّا
هُزُوًا ۚ أَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ
كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۚ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا
تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾
لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ
وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَأْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ
فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ
بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ
ع ۳ ۱۲ ۲ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۚ
بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ أَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ

مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ۝۴۳
بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا
يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۴۴
قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ڮ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاۗءَ اِذَا مَا
يُنْذَرُوْنَ ۝۴۵ وَلَىِٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ
يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۴۶ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ
الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـــًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ
خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝۴۷

ترجمۂ آیات ۳۴-۴۷

اور ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کو ہمیشہ کی زندگی نہیں بخشی تو کیا اگر تم مرجانے والے ہو تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں! ہر جان کو موت کا مزا لازماً چکھنا ہے۔ اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں پرکھنے کے لیے اور ہماری ہی طرف تمھاری واپسی ہونی ہے۔ ۳۴-۳۵

اور یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا جب تم کو دیکھتے ہیں تو بس تم کو مذاق بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں، اچھا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے! اور حال یہ ہے کہ یہ خدائے رحمان کے ذکر کے منکر ہیں۔ ۳۶

انسان عجلت کے خمیر سے پیدا ہوا ہے۔ تو میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، تو تم مجھ سے جلدی نہ مچاؤ! اور یہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا، اگر تم سچے ہو! کاش یہ کفر کرنے والے جان پاتے اس وقت کو جب کہ یہ عذاب نار کو نہ اپنے چہروں سے دفع کر سکیں گے، نہ اپنی پیٹھوں سے اور نہ ان کی کسی طرف سے کوئی مدد ہوگی۔ بلکہ وہ اچانک ان پر آ دھمکے گی اور

ان کو مبہوت کر دے گی۔ نہ وہ اس کو دفع ہی کر سکیں گے اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔ ۳۷-۴۰

اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔ ان سے پوچھو کہ رات اور دن خدائے رحمان کی پکڑ سے کون تمہاری حفاظت کر رہا ہے؟ بلکہ یہ لوگ اپنے رب کی تنبیہ سے روگردانی کر رہے ہیں! کیا ان کے لیے ہمارے سوا کچھ اور معبود ہیں جو ان کو بچا لیں گے! نہ وہ خود اپنی مدد کر سکیں گے اور نہ ہمارے مقابل میں ان کی کوئی حمایت کی جا سکے گی! ۴۱-۴۳

بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل مدت گزر گئی۔ تاہم کیا وہ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم سرزمین (مکہ) کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں! تو کیا یہ لوگ غالب رہنے والے ہیں! ۴۴

کہہ دو، میں تو تمہیں بس وحی کے ذریعہ سے آگاہ کر رہا ہوں لیکن بہرے، جب وہ خطرے سے آگاہ کیے جاتے ہیں، پکار کو نہیں سنتے۔ اور اگر تمہارے رب کے عذاب کا کوئی جھونکا ان کو پہنچ گیا تو پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! بے شک ہم اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! ۴۵-۴۶

اور قیامت کے دن ہم میزانِ عدل قائم کریں گے تو کسی جان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر کسی کا رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو موجود کر دیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔ ۴۷

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ

الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۳۴-۳۵)

رسول کی بشریت پر اعتراض کرنے والوں کو جواب

آیت ۳ میں کفار کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض گزر چکا ہے کہ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (یہ تو بس تمہارے ہی جیسے ایک بشر ہیں) یعنی جس طرح تم کھاتے پیتے ہو اسی طرح یہ بھی کھاتے پیتے ہیں اور جس طرح تم ایک دن مر جاؤ گے اسی طرح یہ بھی ایک دن مر جائیں گے تو اپنے ہی جیسے ایک انسان کو نبی و رسول ماننے کے کیا معنی؟ وہاں اس اعتراض کا جواب ایک دوسرے پہلو سے دیا ہے۔ یہاں اسی اعتراض سے پھر تعرض فرمایا اور اعتراض کرنے والوں کے مافی الذہن پر ایک اور پہلو سے ضرب لگائی۔ فرمایا کہ نبی اور رسول ہونے کے لیے زندۂ جاوید ہونا ضروری نہیں۔ اگر تم کو موت آنی ہے تو تم سے پہلے ہر بشر کو خواہ نبی ہو یا غیر نبی، یہ آنی ہے اور ہر ایک کو آئے گی۔ تم سے پہلے کوئی بھی ایسا نہیں گزرا ہے جو اس چیز سے محفوظ رہا ہو۔ اگر تم ایک دن وفات پاؤ گے تو یہ بھی ہمیشہ زندہ رہنے والے نہیں ہیں۔ یہ بھی لازماً ایک دن اس موت سے دوچار ہوں گے۔ یہ موت تو لازمۂ بشریت ہے۔ اس کا مزا تو ہر ایک کو چکھنا ہے۔ مطلب یہ کہ ان کے اس اعتراض میں اگر کوئی وزن ہو سکتا تھا تو اس صورت میں جب یہ زندگیٔ جاوداں لے کے آئے ہوتے۔ اس وقت تو یہ کہہ سکتے تھے کہ بھلا ہم حیاتِ ابدی کے مالک ایک فانی انسان کو کس طرح رسول مان لیں لیکن جب یہ بھی فانی ہیں تو آخر رسول ان کو کیوں غیر فانی مطلوب ہے!

رسول کے لیے نہ مافوق بشر ہونا ضروری ہے نہ مالدار

'وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ' یہ اسی اعتراض کے ایک دوسرے پہلو کا جواب ہے۔ کفار جس طرح آپ کے بشر ہونے پر معترض تھے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے کہ اگر خدا کو کسی بشر ہی کو رسول بنانا ہوتا تو وہ مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو رسول بناتا، ان کو کیوں رسول بناتا جو مال و جاہ سے محروم ایک غریب آدمی ہیں۔ اس طعن کا جواب قرآن نے مختلف پہلوؤں سے جگہ جگہ دیا ہے۔ یہاں بھی اسی کا جواب ایک نئے انداز سے دیا ہے۔ فرمایا کہ رسول کے لیے جس طرح مافوق بشر ہونا ضروری نہیں اسی طرح اس کا صاحبِ مال و جائداد ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اس دنیا میں امارت نہ کسی کے مقربِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے، نہ غربت اس کے حقیر ہونے کی دلیل ہے۔ اس دنیا میں غربت و امارت، دکھ اور سکھ، رنج اور راحت صرف امتحان کے لیے ہے۔ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا اور ان کے کھرے کھوٹے میں امتیاز فرماتا ہے۔ جب وہ کسی کو مال و جاہ دیتا ہے تو اس کے شکر کا امتحان کرتا ہے اور جب فقر و غربت دیتا ہے تو اس کے صبر کا امتحان کرتا ہے۔ پھر سب کی واپسی خدا ہی کی طرف ہوگی اور وہ فیصلہ فرمائے گا کہ کس نے کمایا اور کس نے کھویا؛ مال و دولت پا کر جو لوگ اپنے آپ کو خدا کا منظورِ نظر سمجھ بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ نبوت و رسالت کو بھی اپنا اجارہ خیال کرنے لگتے ہیں، وہ بالکل برخود غلط ہیں۔

آیت میں لفظ 'فِتْنَةً' کو زمخشری نے تاکید فعل کے مفہوم میں لیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ مفعول لہٗ ہے۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ
وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۳۶)

مٹی کی مورتوں کے لیے غیرت مند اور خدائے رحمان کے لیے بے غیرت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جس انداز اور جس لب ولہجہ میں وہ مذاق اڑاتے، یہاں اس کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ توحید اور قیامت کے یہ منکرین جہاں کہیں تمھیں دیکھ پاتے ہیں تمھارا مذاق اڑاتے ہیں اور بڑی تحقیر کے انداز میں کہتے ہیں کہ اچھا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے۔ ’ذکر کرتا ہے‘ یعنی برائی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ ’یَذۡکُرُ اٰلِہَتَکُمۡ‘ کے بعد ’بِالسُّوۡٓءِ‘ کا لفظ بربنائے غیرت وحمیت وہ حذف کر دیتے۔ گویا اپنے بتوں کے لیے برائی کا لفظ اپنی زبان پر لانا انھیں بطور ’نقلِ کفر‘ بھی گوارا نہیں۔ ’یَذۡکُرُ اٰلِہَتَکُمۡ‘ میں ضمیر خطاب اپنے عوام کو بھڑکانے کے لیے ہے۔ یوں نہیں کہتے تھے کہ ہمارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے بلکہ یوں کہتے کہ تمھارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے۔ دونوں اسلوبوں کا فرق واضح ہے۔

’وَہُمۡ بِذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ‘: فرمایا کہ مٹی اور پتھر کی بنی ہوئی مورتوں کے لیے تو ان کے اندر یہ غیرت وحمیت ہے کہ جہاں کہیں ہمارے رسول کو دیکھ پاتے ہیں جھاڑ کے کانٹوں کی طرح اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں لیکن معبود حقیقی ــ خدائے رحمان ــــ کے معاملے میں ان کی حس اس طرح مردہ ہو چکی ہے کہ اس کے لیے غیرت و حمیت تو درکنار اس کے ذکر کے بھی روادار نہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جو لوگ کسی شرک میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے دل ایسے اوندھے ہو جاتے ہیں کہ اپنے شرکاء کے لیے تو ان کی حس اتنی تیز ہوتی ہے کہ ان کی حمیت وحمایت میں وہ ہر ایک سے لڑنے کے لیے آستین چڑھائے رہتے ہیں لیکن خدا کے معاملے میں وہ بالکل بے غیرت ہوتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی نعوذ باللہ خدا کو گالی بھی دے تو بھی ان کے اندر کوئی حرکت نہیں پیدا ہوتی! اس کی ایک خاص نفسیاتی وجہ ہے جس کی طرف قرآن مجید نے بعض جگہ اشارہ کیا ہے۔ کسی موزوں مقام پر اس کی وضاحت آئے گی۔

خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ۝ وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (۳۷-۳۸)

عذاب کے لیے جلد بازی کا جواب

’انسان‘ سے مراد یہاں یہی مذاق اڑانے والے ہی لوگ ہیں۔ ایسے ناشائستہ لوگوں کا ذکر عام لفظ سے کر دیا ہے۔ فرمایا کہ پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کا تمسخر کرنے کے لیے یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو آخر وہ کہاں اٹکا ہوا ہے! اگر سچے ہو تو اس کو لا کر دکھا کیوں نہیں دیتے کہ اس نزاع کا فیصلہ ہو جائے۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ یہ تاخیر تو خدا کی عنایت سے ہو رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو لوگ اس فرصت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں وہ فائدہ اٹھا کر توبہ و اصلاح کر لیں لیکن انسان بڑا ہی جلد باز پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ اس فرصت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ان کو خطاب کر کے تہدید کے انداز میں فرمایا کہ اگر عذاب کے طلبگار ہو تو جلدی نہ مچاؤ، میں بہت جلد اپنے عذاب کی نشانیاں تم کو دکھاؤں گا جس سے تم پر واضح ہو جائے گا کہ پیغمبر جس چیز سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے وہ دنیا میں بھی تمھارے سامنے آ کے رہے گی اور آخرت میں بھی تم اس سے دوچار ہو گے۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۳۹)

یہ باندازِ حسرت فرمایا کہ آج تو یہ اس ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں، کاش یہ اس وقت کا بھی کچھ اندازہ کر پاتے جب خدا کے عذاب کی آگ ان کو آگے پیچھے ہر طرف سے گھیر لے گی اور ان کی بے کسی کا یہ حال ہوگا کہ نہ یہ اپنے آگے سے اس کو دفع کر سکیں گے، نہ پیچھے سے اور نہ ان کے ان حمایتوں کی طرف سے ان کی کوئی مدد ہو سکے گی جن کی جمعیت پر ان کو ناز ہے اور نہ ان معبودوں ہی سے ان کو کچھ سہارا مل سکے گا جن کے بل پر وہ خدا سے اکڑ رہے ہیں!

بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ (۴۰)

فرمایا کہ وہ جب آئے گی تو وقت بتا کر نہیں آئے گی۔ اس کا صحیح وقت نہ کسی کو معلوم ہے نہ معلوم ہو سکتا ہے اس وجہ سے یہ نہ پوچھو کہ وہ کب آئے گی! وہ، جب اس کا وقت آجائے گا، اچانک آدھمکے گی۔ اس وقت نہ اس کا امکان ہوگا کہ وہ اس کو دفع کر سکیں اور نہ ان کو اس کے بعد کوئی مہلت ہی دی جائے گی کہ وہ ذرا دم لے لیں یا توبہ و اصلاح کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴۱)

آنحضرت صلعم کی تسلی کے لیے تاریخ کا حوالہ

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے تاریخ کا حوالہ ہے کہ تم سے پہلے اللہ کے جو رسول گزرے ہیں ان کے انذار کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا جس طرح تمھارے انذار کا مذاق اڑایا جا رہا ہے بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس عذاب کا مذاق اڑایا گیا اس نے ان لوگوں کو آگھیرا جنھوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ مطلب یہ ہے کہ وہی روزِ بد تمھارے ان مذاق اڑانے والوں کے سامنے بھی آنے والا ہے۔

'سَخِرُوا مِنْهُمْ' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان قوموں پر جو فیصلہ کن عذاب آتا ہے اس میں صرف وہی لوگ ہلاک ہوتے ہیں جو اپنی تکذیب پر اڑے رہ جاتے ہیں۔ اس سنتِ الٰہی کی طرف ہم دوسرے مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں۔

قُلْ مَنْ يَكْلَؤُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمَٰنِ ۗ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُعْرِضُونَ (۴۲)

عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں سے ایک سوال

فرمایا کہ عذاب کے لیے جو لوگ اتنی جلدی مچائے ہوئے ہیں ان سے پوچھو کہ اس سے بچنے کے لیے انھوں نے کیا بندوبست کر رکھا ہے! آخر رات اور دن خدائے رحمان کی پکڑ سے بچانے کے لیے ان کی کون حفاظت کر رہا ہے؟ خدا کا عذاب رات میں آجائے یا دن میں، کوئی اس کو روکنے والا نہیں بن سکتا تو اس طنطنہ کے ساتھ جو یہ اس کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کے مقابلہ کے لیے ان کے پاس کون سا لشکر ہے!

"بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ": یہ ان کی اس بدبختی پر اظہار افسوس ہے کہ ان کے اس سارے طنطنہ کی عمارت ریت پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لیے انھوں نے کوئی انتظام کر رکھا ہے، جس کے بل پر اکڑ رہے ہوں بلکہ انجام سے بے پروا ہو کر خدا کی یاد دہانی سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ (۴۳)

یعنی کیا ان کی سرپرستی اور حفاظت کرنے کے لیے ہمارے سوا ان کے کچھ معبود ہیں جو ہماری پکڑ سے ان کو بچا لیں گے؟ اگر یہ اس طمع خام میں مبتلا ہیں تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ان کی مدد تو بھلا کیا کریں گے خدا کے مقابل میں وہ خود اپنی بھی مدد نہ کر سکیں گے اور نہ کسی دوسرے ہی کی مدد و رفاقت ان کو حاصل ہو سکے گی۔ یہ امر یہاں ملحوظ ہے کہ مشرکین کے خود تراشیدہ اصنام کی اول تو کوئی حقیقت تھی ہی نہیں، اگر بالفرض کسی کا کوئی وجود تھا تو اس کی بابت فرمایا کہ وہ خدا سے خود اپنے کو نہ بچا پائیں گے تو دوسروں کو بھلا کیا بچا سکیں گے!

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۴۴)

اصل سبب استکبار و اعراض

یہ ان کے اصل سبب استکبار و اعراض سے پردہ اٹھایا ہے کہ ایک طویل مدت تک خدا کی نعمتوں سے بہرہ مند رہنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے دل سخت و سیاہ ہو چکے ہیں۔ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ عزت و اقتدار جو ان کو حاصل ہے ان کے آبا و اجداد کا ورثہ ہے، یہ اس کے موروثی حق دار ہیں، اسی میں وہ پیدا ہوئے ہیں، اسی میں عیش کریں گے اور اسی کے وارث ان کے اخلاف ہوں گے۔ اس زعم باطل نے پیغمبر کے انذار سے ان کو بالکل بے پروا کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کی ساری تنبیہات محض ہوائی ہیں۔ ان کے اقتدار کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

ایک طویل مدت تک خدا کی نعمت سے بہرہ مند رہنے کا نتیجہ ناشکروں پر قساوت قلب ہی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ سورۂ حدید میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	اور ان لوگوں کی طرح بن کر نہ رہ جائیں جن کو اس سے
مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ	پہلے کتاب دی گئی تو ان پر ایک طویل مدت گزر گئی
فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (۱۶)	اور ان کے دل سخت ہو گئے۔

غلبۂ اسلام کے آثار کی طرف اشارہ

اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ 'الارض' سے مراد یہاں سرزمین مکہ ہے۔ سورۂ حج میں جہاں مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ سرزمین حرم کو کفار کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کریں وہاں فرمایا ہے کہ 'اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ' (۴۱) (ہم ان لوگوں کی مدد کریں گے جن کا حال یہ ہے کہ اگر ہم نے ان کو سرزمین حرم میں متمکن کیا تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے، منکر سے روکیں گے اور عاقبت کار کا...

اللہ ہی کے اختیار میں ہے) قرینہ دلیل ہے کہ یہاں 'الارض' سرزمین حرم ہی کے لیے آیا ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ رعد آیت ۴۱ میں بھی بیان ہوا ہے۔ وہاں ہم وضاحت سے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال چکے ہیں۔

آیت زیر بحث میں ان آثار کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو اس دور میں غلبۂ اسلام کے لیے نمایاں ہو چکے تھے۔ مکہ میں حق و باطل کی جو کشمکش برپا تھی اس میں مکہ کے حد تک تو حق ابھی مظلوم تھا لیکن اطراف کے قبائل اور خاص طور پر مدینہ میں اسلام کی دعوت جڑ پکڑ رہی تھی جس سے بالتدریج یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ کفر کا حیطۂ اقتدار کم ہو رہا ہے اور اسلام مکہ کے اطراف سے مکہ کو زیر نگیں کرنے کے لیے اس کو آہستہ آہستہ اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔ اسلام کے اسی تدریجی غلبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا یہ لوگ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم اطراف مکہ سے ان لوگوں کے تسلط کو بالتدریج کم کرتے ہوئے مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں! 'اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ' یعنی یہ قرائن اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس کشمکش کے نتیجہ میں یہ غالب رہیں گے یا اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام اور اس کے علمبردار غالب رہیں گے! اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو یہ لوگ ان آثار کو کیوں نہیں دیکھتے جو ان کے اپنے اطراف میں نمایاں ہو رہے ہیں!

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ۝ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۴۵-۴۶)

فرمایا کہ جو لوگ تم سے کسی نشانئ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ میں تو تم کو کسی اس طرح کی نشانی کے بجائے صرف وحی کے ذریعہ سے متنبہ کر رہا ہوں تاکہ تم کسی آفت میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر خدا کے غضب سے بچنے کی فکر کرو۔ یہ چیز تمھارے لیے نافع اور شکر کی سزاوار تھی لیکن تم اس کی قدر کرنے کے بجائے اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہو!

'وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ اس نعمت کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی محرومی ہے۔ یہ عقل و دل کے بہرے ہیں اور جو بہرے ہوتے ہیں وہ جب کسی خطرے سے آگاہ کیے جاتے ہیں تو داعی کی پکار کو نہیں سنا کرتے یہاں تک کہ وہ اس کھڈ میں گر کے رہتے ہیں جس سے انھیں آگاہ کیا جاتا ہے۔

'وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ' الایۃ یعنی آج تو یہ اس ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں گویا وہ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے جملہ اسلحہ سے لیس کھڑے ہیں لیکن ان کی یہ ساری شیخت صرف اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک وہ نمودار نہیں ہوتا۔ اگر قہر الٰہی کا کوئی ادنیٰ جھونکا بھی کسی طرف سے آ گیا تو یہ ساری شیخت ہرن ہو جائے گی، پھر یہ سر پیٹیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! ہم خود اپنی جانوں پر آفت ڈھانے والے بنے کہ ہم نے رسول کی وحی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس سے عذاب کا مطالبہ کیا۔ 'نَفْحَةٌ' کی تنکیر یہاں اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ خدا کا عذاب تو بڑی چیز ہے اگر اس کا کوئی معمولی جھونکا بھی ان کو چھو گیا تو ان کے سارے

کس بل نکال دے گا!

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (۴۷)

قیامت ظہورِ عدل کے لیے ہے

اَلْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ' میں 'لِ' کو مفسرین نے 'فِی' کے معنی میں لیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ غایت و مقصد کے مفہوم میں ہے۔ یعنی مقصدِ قیامت کے ظہور کے لیے ہم عدل کی میزان نصب کریں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیامت بجائے خود مقصود نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے عدل و انصاف کے ظہور کے لیے لازمی ہے۔

'وَاِنْ كَانَ' میں 'كَانَ' کا اسم بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے اور 'اَتَيْنَا بِهَا' میں ضمیر مؤنث 'حَبَّة' کی مناسبت سے ہے۔

فرمایا کہ مقصدِ قیامت یعنی جزا و سزا کو بروئے کار لانے کے لیے ہم عدل کی میزانیں نصب کریں گے تو اس دن کسی جان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ ہر جان ٹھیک کانٹے کی تول اپنے اعمال کا بدلہ پائے گی۔ رائی کے دانہ کے برابر بھی اگر کسی کا کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو بھی اس کے سامنے حاضر کردیں گے۔

'وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ' ہم حساب کے لیے کافی ہیں۔ یعنی اس کام میں ہمیں کسی کی مدد و معاونت کی ضرورت نہیں ہوگی، ہم تنہا اس کو سرانجام دیں گے۔ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ساری خدائی کا یہ حساب کتاب ہم کس طرح کرسکیں گے تو یہ اس کا مغالطہ ہے اور اگر کوئی اس وہم میں مبتلا ہے کہ خدا کسی کے باب میں اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء سے کچھ معلومات حاصل کرنے کا محتاج ہوگا تو یہ بھی محض ایک واہمہ ہے۔

سورۂ لقمان میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۱۶)

اے میرے بیٹے کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں خدا اس کو موجود کردے گا۔ بے شک خدا بڑا ہی باریک بین اور بڑی ہی خبر رکھنے والا ہے۔

۸- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۸-۷۷

اوپر آیت ۲۴ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے فرمایا کہ 'هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ' یعنی یہی تعلیم جو میں تمہیں دے رہا ہوں تمام انبیائے سابقین نے دی۔ اب ایک صوری ترتیب کے ساتھ ان انبیائے عظام کا حوالہ دیا جو امتوں کے بانی ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر صاحبِ شریعت نبی و رسول حضرت موسٰیؑ ہوئے ہیں۔[1]

---

[1] یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام جہاں تک شریعت کا تعلق ہے حضرت موسٰی ہی کی شریعت کے پیرو تھے۔

چنانچہ پہلے ان کا ذکر فرمایا اور انہی کے ضمن میں حضرت ہارونؑ کا بھی ذکر فرمایا جو ان کے وزیر تھے ۔ پھر ان سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو امتوں کے بانی اور نبوت کے دونوں سلسلوں ـــــ بنی اسرائیل و بنی اسمٰعیل ـــــ کے امام تھے اور انہی کے ضمن میں حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت لوطؑ کا حوالہ دیا۔ پھر ان کے اوپر حضرت نوحؑ کا حوالہ دیا جن کو آدمِ ثانی ہونے کی حیثیت حاصل ہے ۔ ان انبیائے عظام کا حوالہ گویا پورے سلسلہ رشد و ہدایت کا حوالہ ہے اور مقصود ان کے حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جو دعوت ان انبیاء نے دی وہی دعوت اب تم کو دی جا رہی ہے جن خصوصیات کے حامل یہ انبیاء تھے وہی خصوصیات تمہارے پیغمبر کے اندر بھی ہیں اور ساتھ ہی یہ یاددہانی بھی فرما دی گئی کہ جو انجام ان نبیوں کے جھٹلانے والوں کا ہوا وہی انجام لازماً تمہارا بھی ہوگا اگر تم ان کی تکذیب پر اڑے رہ گئے ۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے ۔

آیات ۴۸-۷۷

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾
الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ
هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ
اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ
قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ
اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ
رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ڮ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ
مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا
مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾
قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا
فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ

النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا
يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا
يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾
ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ
اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ اُفٍّ
لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوْا
حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْنَا يٰنَارُ
كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ
الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا
لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۗ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۗ وَكُلًّا جَعَلْنَا
صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ
فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا
عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ
الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿٧٤﴾
وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾ وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى ع ۲۵ ۵
مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٦﴾
وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ
فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٧٧﴾

ترجمۂ آیات ۴۸-۷۷

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی اور روشنی اور یاد دہانی عطا فرمائی، خدا ترسوں کے لیے۔ ان کے لیے جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اور وہ قیامت سے لرزاں و ترساں رہنے والے ہیں۔ ۴۸-۴۹

اور یہ بھی ایک بابرکت یاد دہانی ہے جو ہم نے نازل فرمائی ہے تو کیا تم اس کے منکر ہی بنے رہو گے! ۵۰

اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہدایت عطا فرمائی اور ہم اس سے خوب باخبر تھے۔ جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم دھرنا دیے بیٹھے ہو! انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو انہی کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔ اس نے کہا تم بھی اور تمھارے باپ دادا بھی ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا رہے ہو۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ جو کچھ تم ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو سنجیدہ بات پیش کر رہے ہو یا ہنسی مسخری کر رہے ہو! اس نے کہا بلکہ تمھارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور میں اس پر تمھارے سامنے گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔ اور خدا کی قسم! جب تم یہاں سے رخصت ہو کر لوٹ گے تو میں تمھارے ان بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا۔ پس اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا بجز ان کے ایک بڑے کے تاکہ وہ اسی کی طرف رجوع کریں۔ ۵۱-۵۸

وہ بولے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی! بے شک وہ بڑا ہی ظالم ہے! لوگوں نے بتایا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا، جس کو ابراہیم کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کو لوگوں کے سامنے حاضر کرو تاکہ وہ بھی گواہ رہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ ابراہیم! کیا یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کی ہے! اس نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ

حرکت کی ہے تو انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں۔ تو ان کو ذرا تنبہ ہوا اور آپس میں بولے کہ بلاشبہ تم ہی ناحق پر ہو۔ پھر اوندھے ہو گئے، بولے کہ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ اس نے کہا کیا خدا کے ماسوا تم ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو تم کو نہ تو کوئی نفع پہنچا سکیں نہ کوئی ضرر! تُف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو! کیا تم لوگ سمجھتے نہیں! ۵۹-۶۷

انھوں نے کہا کہ اس کو آگ میں جلا دو اور اپنے معبودوں کی حمایت میں اٹھو، اگر کچھ کرنے کا ارادہ ہے! ہم نے حکم دیا کہ اے آگ تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن جا اور انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی تو ہم نے انھیں ناکام بنایا۔ ۶۸-۷۰

اور ہم نے اس کو اور لُوطؑ کو اس سرزمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی تھیں۔ اور ہم نے اس کو اسحاق اور مزید برآں یعقوب عطا کیے اور ہم نے ہر ایک کو نیک بخت بنایا۔ اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا جو ہماری ہدایت کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، اور ہم نے ان کو بھلائی کے کام، نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کے ادا کرنے کی ہدایت کی۔ اور وہ ہماری ہی بندگی کرنے والے تھے۔ ۷۱-۷۳

اور لوطؑ کو بھی ہم نے قوتِ فیصلہ اور علم کی نعمت عطا فرمائی۔ اور اس کو اس بستی سے نجات دی جس کے باشندے بدکاریوں کے مرتکب تھے۔ وہ لوگ بڑے ہی نابکار و ناہنجار تھے۔ اور ہم نے اس کو خاص اپنی رحمت میں داخل کیا، بے شک وہ نیکوکاروں میں سے تھا۔ ۷۴-۷۵

اور نوحؑ کو بھی ہم نے اپنی ہدایت بخشی۔ یاد کرو جب کہ اس نے دعا کی اس سے پہلے تو ہم نے اس کی دعا قبول کی پس اس کو اور اس کے لوگوں کو عظیم کلفت سے نجات دی اور اس کی مدد میں ان لوگوں سے ہم نے انتقام لیا۔ جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ بے شک وہ نہایت

ہی بڑے لوگ تھے تو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔" ۷۶-۷۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ (۴۸-۴۹)

'فرقان' 'ضیاء' اور 'ذکر' کا مفہوم

'فرقان' حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی کسوٹی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد تورات ہے۔ قرآن سے پہلے کتاب الٰہی کی حیثیت اسی کو حاصل رہی ہے اور کتاب الٰہی ہی وہ چیز ہے جو حق و باطل میں امتیاز کے لیے معیار کا کام دیتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے قرآن کو بھی فرقان کہا گیا ہے۔ 'ضیاء' کے معنی روشنی کے ہیں۔ کتاب الٰہی کے لیے 'ضیاء'، اور 'نور' وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اس لیے کہ یہ تمام ذہنی و اخلاقی اور فکری و عملی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت و معرفت کی شاہراہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ 'ذکر' کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ یہ لفظ بھی جس طرح قرآن کے لیے جا بجا استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں تورات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ ان صحیفوں میں چونکہ آفاق، انفس اور تاریخ کے حقائق کی یاد دہانی کی گئی ہے اس وجہ سے ان کو 'ذکر' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

فرمایا کہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اور روشنی و یاد دہانی عطا فرمائی لیکن وہ کتاب نافع صرف ان خدا ترسوں کے لیے ہوئی جو ہر چیز کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننے کے بجائے غیب میں رہتے خدا اور آخرت سے ڈرنے والے تھے۔ مطلب یہ کہ اسی طرح یہ کتاب بھی کارگر صرف انہی پر ہوگی جن کی عقل و فطرت کا نور بجھا نہیں ہے بلکہ وہ خدا اور آخرت کا اپنے دلوں کے اندر خوف رکھتے ہیں۔ یہ مضمون سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات کے تحت تفصیل سے زیر بحث آ چکا ہے اس وجہ سے یہاں ہم اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۵۰)

یعنی جس طرح موسیٰ کو تورات عطا فرمائی تھی اسی طرح یہ مبارک کتاب بھی ہم نے اتاری ہے۔ اگرچہ یہ باران رحمت کی طرح یکسر خیر و برکت ہے لیکن اس سے فیض صرف انہی کو پہنچے گا جن کے اندر صلاحیت ہے۔ 'اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ' یہ قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا تم اس نعمت کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہو! مطلب یہ کہ اگر اس نعمت کا انکار کر رہے ہو تو سوچ لو کہ کس چیز کا انکار کر رہے ہو!

حضرت موسیٰ کا ذکر پچھلی سورہ میں تفصیل سے گزر چکا ہے اس وجہ سے یہاں صرف سرسری اشارہ کر کے آگے حضرت ابراہیم کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ فرمایا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ (۵۱)

رشد و ہدایت میں حضرت ابراہیم کا مرتبۂ خاص

'رُشْدَ' سے مراد ہدایت و معرفت ہے اور اس کی اضافت نے اس کے اندر ایک خاص امتیاز کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ یعنی ابراہیم کو ہم نے وہ ہدایت و معرفت عطا فرمائی جو اس کے درجے اور مرتبے کے شایان شان تھی۔ ہدایت و معرفت کے مختلف مدارج ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو بھی اس میں سے کوئی حصہ عطا فرماتا ہے۔ وہ اس کی صلاحیتوں کو جانچ کر اس کے درجہ و مرتبہ کے اعتبار سے عطا فرماتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس میں سے جو حصہ وافر ملا اس کی وضاحت ہم آیت 'وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ الآیہ' کے تحت کر چکے ہیں۔ ان کے اسی وصفِ خاص کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔

'وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ' یعنی یہ مرتبۂ بلند جو ہم نے اس کو بخشا تو یوں ہی نہیں بخش دیا بلکہ نہایت کڑے امتحانوں میں ڈال کر اچھی طرح پرکھ لیا کہ وہ اس مرتبہ کا سزاوار ہے۔ اس فقرے میں ان لوگوں پر تعریض بھی ہے جو اپنے اندر ہمت تو حضرت ابراہیمؑ کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ سنت پر عمل کرنے کی بھی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ نسبت کے دعویدار اور اس نسبت کے بل پر اپنے آپ کو دنیا اور آخرت دونوں میں بڑے سے بڑے مرتبہ کا حق دار سمجھے بیٹھے تھے۔ فرمایا کہ خدا کے ہاں اس غلط بخشی کی گنجائش نہیں ہے وہ جس کو اپنی معرفت و حکمت بخشتا ہے اس کے ظرف اور اس کے حوصلہ کو دیکھ کر بخشتا ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (۵۲)

قوم سے اصنام کے بارے میں بحث

اب یہ ان کی بالکل ابتدائی سرگزشتِ حیات کا ایک واقعہ بیان ہو رہا ہے جس سے ان کی جرأت و فتوت بھی واضح ہو رہی ہے اور وہ ہدایت و معرفت بھی جو اللہ تعالیٰ نے عین عنفوانِ شباب میں ان کو بخشی۔ ان کی ولادت اگرچہ ایک بت پرست قوم، ایک مبتلائے شرک خاندان اور ایک مشرک اور بت گر باپ کے گھر میں ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو توحید کا وہ نور عطا فرمایا جس کی روشنی سے دنیا آج تک منور ہے اور قیامت تک منور رہے گی۔ انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں کو دعوت دی کہ یہ مورتیں کیا ہیں جن پر تم لوگ دھرنا دیے بیٹھے ہو! اس فقرے میں ان بتوں کے لیے جو استخفاف و تحقیر ہے اور لفظ 'عٰكِفُوْنَ' میں باپ اور قوم کی بلادت اور ان کے جمود پر جو طنز ہے وہ عربی زبان کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ اس عمر میں اور ایسے ماحول کے اندر یہ نعرۂ حق وہی بلند کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ توفیقِ خاص سے نوازے اور جس کے ایمان کی سطوت و جلالت ہر خوف اور ہر طمع سے بالکل بے پروا و بے نیاز ہو۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۵۳-۵۴)

باپ دادا کا طریقہ بجائے خود دلیل نہیں ہے

اس قسم کی حماقتوں کے حق میں سب سے بڑی دلیل ہمیشہ ان کے حامیوں کی طرف سے یہی پیش کی گئی ہے کہ ان کا چلن باپ دادا سے چلا آ رہا ہے۔ یہی دلیل حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے لوگوں نے پیش کی کہ ان بتوں کی عبادت تو ہمارے باپ دادا نے کی ہے تو ہم ان کو کس طرح چھوڑ بیٹھیں۔ اگرچہ یہ بات بالکل احمقانہ ہے

لیکن عام لوگوں کے لیے یہ بہت ہی مرعوب کن ہوتی ہے۔ باپ دادا کے طریقہ کے لیے دلوں میں ایک حمیت و عصبیت جڑ پکڑ جاتی ہے جس کے سبب سے اس کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا یا اس کی دعوت دینا بڑے جان جوکھم کا کام بن جاتا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے جو نور معرفت عطا فرمایا تھا اس کو ان پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے جواب میں پوری عزیمت و بے خوفی کے ساتھ فرمایا کہ تم اور تمھارے باپ دادا سب کھلی ہوئی گمراہی میں رہے اور ہو۔ کوئی ضلالت مجرد اس دلیل سے ہدایت نہیں بن جائے گی کہ وہ باپ دادا کے زمانہ سے چلی آرہی ہے۔ بلکہ اس کو عقل و فطرت کی کسوٹی پر جانچنا پرکھنا بھی ضروری ہے!

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ (۵۵-۵۶)

دعوتِ حق کی راہ میں ایک اور قدم

'حق' سے یہاں سنجیدہ اور سوچی سمجھی ہوئی بات مراد ہے۔ حضرت ابراہیم کی یہ بات ان کی قوم کے لوگوں کے لیے اتنی انوکھی اور عجیب تھی کہ وہ یہ باور نہ کر سکے کہ کوئی شخص سوچ سمجھ کر ایسی بات زبان سے نکال سکتا ہے۔ انھوں نے گمان کیا کہ یہ الھڑ نوجوان، جوانی کی ترنگ میں، بے سوچے سمجھے، بس یونہی ایک بات کہہ گزرا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سوال کیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہو واقعی اپنا عقیدہ بیان کر رہے ہو یا محض مذاق کر رہے ہو! انھوں نے حضرت ابراہیم کے اس نعرۂ حق کو ایک غیر سنجیدہ اور لاابالیانہ نعرہ قرار دے کر لوگوں کو اس کے اثر سے بچانا چاہا۔ لیکن حضرت ابراہیم نے ان کے جواب میں دعوتِ حق کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ فرمایا کہ یہ پتھر اور مٹی کے بت تمھارے رب نہیں ہیں بلکہ تمھارا رب آسمانوں اور زمین کا وہ خداوند ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں تمھیں اسی کی دعوت دیتا اور تمھارے اندر اسی کی منادی کرتا ہوں۔ شہادت یہاں دعوت اور اعلان کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (۵۷)

حضرت ابراہیم کا خاص طرز استدلال

حضرت ابراہیم نے لگے ہاتھوں، لقید قسم، لوگوں کو اپنے اس ارادہ سے بھی آگاہ کر دیا کہ جب آپ لوگ یہاں سے ہٹو گے تو میں ان بتوں کے ساتھ ایک خفیہ کارروائی کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ لفظ 'کید' پر ہم مختلف مقامات میں بحث کر چکے ہیں کہ یہ کسی ایسے اقدام کے لیے بھی آتا ہے جو کسی مخالف کے خلاف اس طرح کیا جائے کہ وہ اس سے باخبر نہ ہو سکے۔

'تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے یہ دعوت بت خانہ کے اندر کسی اجتماع کے موقع پر دی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ جب آپ لوگ یہاں سے گھروں کو سدھاریں گے تو میں آپ کے ان خداؤں کی مرمت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اصل اسکیم کو حضرت ابراہیم نے مخفی رکھا۔ یہ جس صورت میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ لیکن اس تفصیل کو پڑھنے سے پہلے حضرت ابراہیم کے مخصوص طریقۂ بحث و استدلال کے ان پہلوؤں پر ایک نظر ڈال لیجیے جن کی وضاحت سورۂ انعام کی آیات ۷۶-۷۹ کے تحت بعنوان 'حضرت ابراہیم

کے طرزِ استدلال کی بعض خصوصیات، ہم کرآئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بحث و استدلال میں لطیف و پاکیزہ طنز سے جس طرح کام لیتے ہیں اسی طرح استدراج بھی حجتِ ابراہیمی کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت ہے۔ استدراج کا مطلب یہ ہے کہ وہ بحث میں اپنے حریف کو وہاں سے داؤں پر لاتے ہیں جہاں سے ان کو سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ بالآخر وہ چاروں شانے چت گرتا ہے اور اسے خود اپنی زبان سے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہی طریقۂ استدراج حضرت ابراہیمؑ نے اپنے حریفوں کو قائل کرنے کے لیے اس موقع پر استعمال فرمایا۔ انھوں نے شب میں کوئی موقع نکال کر تمام چھوٹے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا اور ذہن میں یہ رکھا کہ اگر نوبت مجھ سے باز پرس کی آئی تو میں کہہ دوں گا کہ یہ حرکت تو ان بڑے صاحب کی معلوم ہوتی ہے اور مجھ سے پوچھنے کے بجائے خود ان مظلوموں ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے، اگر وہ بولتے ہیں تو اپنی داستانِ غم خود ہی سنا دیں گے کہ یہ مصیبت ان پر کس کی لائی ہوئی ہے! ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ لازماً یہی کہیں گے کہ یہ تو بولتے نہیں تو ان سے کس طرح پوچھا جائے تو میں ان سے کہوں گا کہ نادانو! جو خود اپنے اوپر آئی ہوئی مصیبت کو نہ دفع کر سکتے ہیں نہ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ مصیبت کس کے ہاتھوں ان پر آئی آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کو معبود بنا کر ان کو ڈنڈوت کرتے ہو! یہی وہ ذہنی اسکیم ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ نے کَیۡد سے تعبیر فرمایا۔ اس میں طنز، تضحیک اور استدراج کے جو پہلو ہیں وہ واضح ہیں اور حریفوں کو جس طرح بے بس ہو کر اس حجتِ ابراہیمی کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پڑے اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ (۵۸)

بت شکنی کی سکیم پر عمل

'جُذَاذ' پاش پاش اور ٹکڑے ٹکڑے ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ اس مخفی تدبیر کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ارادے کو بروئے کار لانے کے لیے اختیار فرمائی۔ انھوں نے موقع نکال کر بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سب بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ بڑے بت کو اس خیال سے چھوڑ دیا کہ جب اس معاملہ کی تفتیش ہو تو وہ ان احمق لوگوں سے یہ کہہ سکیں کہ یہ تو اس بڑے کی کارستانی معلوم ہوتی ہے تو اس کی طرف رجوع کریں کہ یہ کیا ماجرا ہے، اور اگر یہ کہیں کہ یہ تو بولتے نہیں تو پھر ان پر اتمامِ حجت کا موقع ہاتھ آئے کہ جب یہ بڑے چھوٹے سب ہی گونگے ہیں تو آخر ان گونگوں بہروں کو معبود بنانے کے کیا معنی؟

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۹)

یہ دو الگ الگ مستقل جملے ہیں۔ پہلے جملہ سے ان کی حیرت و پریشانی کا اظہار ہو رہا ہے، دوسرے سے ان کے غصہ و غضب کا۔ یعنی جب انھوں نے اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھا تو پہلے تو ان کے اندر یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر وہ کون ہو سکتا ہے جس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ جسارت کی؟ پھر اپنے غصہ و غضب کا اظہار کیا کہ جس نے بھی یہ حرکت کی وہ بڑا ہی ظالم ہے!

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ (۶۰)

بالآخر جو لوگ حضرت ابراہیمؑ کے رجحانات اور ان کی مذکورہ بالا دعوت اور ان کے چیلنج سے آگاہ تھے انھوں نے بتایا کہ یہ اسی نوجوان کی حرکت ہو سکتی ہے جس کو ابراہیم کہتے ہیں، ہم نے اس کو ان بتوں کا ذکر تحقیر کے ساتھ کرتے سنا ہے۔ 'تحقیر' کے الفاظ انھوں نے بھی اسی طرح حذف کر دیے جس طرح آیت ۳۶ میں یہ حذف ہیں۔ اس حذف کی بلاغت ہم وہاں واضح کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے معبودوں کی شان میں گویا نقلِ کفر کو بھی گوارا نہیں کیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کے ساتھ جو معاملہ کرنے کی دھمکی دی تھی وہ بلقید قسم ڈنکے کی چوٹ دی تھی۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ان کی دعوتِ توحید بھی بالکل برملا اور آشکارا تھی۔ بہت سے لوگ ان کی ان باتوں سے واقف تھے لیکن اس وقت تک حضرت ابراہیمؑ کی ان باتوں کو جو لوگ سنتے تھے وہ ان کو، جیسا کہ اوپر گزرا ہے، ان کی نوجوانی کی ترنگ اور جسارت پر محمول کر کے ٹال جاتے تھے۔ ان کو یہ گمان نہیں تھا کہ فی الواقع حضرت ابراہیمؑ کوئی اس طرح کا اقدام کر گزریں گے جیسا کہ اب ان کے سامنے آیا، اس وجہ سے انھوں نے ان کے اوپر نہ کوئی قدغن عاید کرنے کی ضرورت سمجھی اور نہ بتوں کی حفاظت کے لیے کوئی اہتمام کیا۔ ان کا خیال یہ رہا ہو گا کہ کوئی ہمارے ان معبودوں سے کتنا ہی برگشتہ ہو لیکن ان کے خلاف کوئی خطرناک اقدام کرنے کی جسارت بھلا کیا کر سکے گا! لیکن جب یہ حادثہ پیش آیا تو جو لوگ حضرت ابراہیمؑ سے واقف تھے انھوں نے بتایا کہ ہو نہ ہو یہ کارروائی اسی نوجوان کی ہے جس کو ابراہیم کہتے ہیں۔ اس کو ہم نے ان معبودوں کی ہجو کرتے سنا ہے۔

'یُقَالُ لَہٗ اِبْرٰہِیْمُ' سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت بہت سے کانوں میں پڑ چکی تھی لیکن ابھی وہ قوم میں اتنے روشناس نہیں ہوئے تھے کہ لوگ شخصاً ان سے واقف ہوں تاہم ان کا نام مختلف حلقوں میں پہنچ چکا تھا اور وہ دینِ آبائی کے ایک باغی نوجوان کی حیثیت سے معروف ہو رہے تھے۔ اسی بنا پر ان گواہی دینے والوں نے ایک حقارت آمیز انداز میں یوں کہا کہ وہی سر پھرا نوجوان جس کو ابراہیمؑ، ابراہیمؑ پکارتے ہیں، ہمارے ان معبودوں کی ہجو کرتا رہا ہے، ہو نہ ہو، یہ اسی کی کارستانی ہے!

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ (۶۱)

حضرت ابراہیمؑ پر مقدمہ

حضرت ابراہیمؑ پر الزام قائم ہو جانے کے بعد قوم کے سربراہوں نے حکم دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو عام لوگوں کے سامنے لا کر پبلک کی موجودگی میں ان سے پوچھ گچھ کی جائے کہ سارا معاملہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگ اس کے گواہ رہیں۔ یہ اہتمام اس لیے ضروری خیال کیا گیا ہو گا کہ یہ جرم ان کے نزدیک ایک سنگین جرم تھا جس کی سزا بھی ان کی شریعت میں بہت سخت تھی اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ اس کی تحقیقات پبلک کے سامنے ہو تاکہ لوگوں کو جرم کی شناعت کا اندازہ بھی ہو اور مجرم کو جو سزا دی جائے وہ عام عبرت کی موجب بھی ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس زمانے میں اس طرح کے مذہبی معاملات میں حکم لگانے اور فتویٰ دینے کے مجاز مذہبی پیشوا ہوتے تھے۔ حکومتِ وقت (اگر کوئی ہوتی تھی) انہی کے فتوے کی تنفیذ کر دیتی تھی۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (۶۲-۶۳)

حضرت ابراہیمؑ کا جواب

بالآخر مذکورہ بالا حکم کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام عام لوگوں کے سامنے، پیشوایانِ دین کی عدالت میں، پیش کیے گئے اور ان سے سوال ہوا کہ ابراہیمؑ! کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ جرم تم نے کیا ہے؟ حضرت ابراہیم نے نہایت تیکھے طنز اور استہزا کے انداز میں جواب دیا کہ یہ کارستانی تو ان کے اس بڑے کی معلوم ہوتی ہے اور اس بارے میں مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، آخر آپ لوگ انہی سے کیوں نہیں پوچھتے، اگر یہ بولتے ہیں تو خود ہی اپنی کہانی آپ کو سنا دیں گے!

یہ جواب دے کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے ان بزرگوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں اعترافِ شکست کے سوا کوئی اور راہ ان کے لیے باقی ہی نہیں رہ گئی۔ ان کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (یہ تو تمھیں اچھی طرح علم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں) ان کے اس اعتراف کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی اگر یہ اس لائق بھی نہیں کہ خود اپنی بپتا تم کو سنا سکیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ ان کی عبادت کرتے ہو! تم پر اور تمھارے ان معبودوں پر لعنت ہے۔ آخر تم لوگ عقل سے کیوں کام نہیں لیتے!

حضرت ابراہیمؑ پر خوف یا جھوٹ کی تہمت عربی سے بے خبری پر مبنی ہے

جن لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کے جواب، بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا کو کذب یا خوف پر محمول کیا ہے وہ عربی سے بے خبری کے باعث اس ارشاد کی بلاغت کو نہ سمجھ سکے۔ خوف کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ جب وہ اس طرح بے دھڑک قوم کے بت خانے کے اندر توحید کی اذان دیتے ہیں، بتوں کے خلاف ایک مخفی اقدام کا اعلان کرتے ہیں اور پھر عین عدالت کے منہ پر ساری قوم کے سامنے اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ کے الفاظ سے بتوں پر بھی اور ان کے پوجنے والوں پر بھی لعنت کرتے ہیں تو ایسے مردِ حق کے بارے میں یہ گمان بالکل ہی خلافِ عقل ہے کہ وہ کسی خطرے سے مرعوب ہو کر سخن سازی کرے گا۔

رہا اس کے جھوٹ ہونے کا معاملہ تو قطع نظر اس سے کہ حضرت ابراہیمؑ جھوٹ بول سکتے ہیں یا نہیں کہی ہوئی بات میں کوئی پہلو ایسا نہیں ہے کہ اس کو جھوٹ پر محمول کیا جا سکے۔ اس کو کہہ سکتے ہیں تو ایک لطیف طنز، ایک پرمعنی استہزاء اور ایک حکیمانہ استدراج کہہ سکتے ہیں، جھوٹ کا تو اس میں کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے حضرت ابراہیمؑ کے مخالفوں نے بھی ان پر جھوٹ کا الزام نہیں لگایا حالانکہ اگر وہ ان کے جواب کو جھوٹ سمجھتے تو وہ بڑی آسانی سے ان کو جھوٹا قرار دے سکتے تھے۔ پھر جب ان کے دشمنوں نے ان کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت نہیں کی تو نعوذ باللہ ہم ان کو جھوٹا کیوں قرار دیں!

بعض لوگوں کو ایک حدیث کی بنا پر مغالطہ ہوا تھا جس میں یہ آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین جھوٹ بولے جن میں سے ایک ان کا یہ قول بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا بھی ہے۔ ہمارے نزدیک اس حدیث کے سمجھنے

ہیں لوگوں سے غلطی ہوتی ہے۔ عربی میں لفظ 'کذب' کئی معنوں میں آتا ہے۔ اگر کہیں 'کَذَبَ فُلَانٌ' تو اس کے معنی جس طرح یہ ہوسکتے ہیں کہ اس نے جھوٹ بولا اسی طرح یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اس نے غلطی کی اور یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اس نے توریہ کیا۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین اس کے سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔ توریہ کا مفہوم اپنے مخالف کے سامنے اپنی بات کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ مخاطب اس سے مغالطہ میں پڑ جائے۔ اوپر ہم نے 'استدراج' کا جو ذکر کیا ہے وہ بھی اسی میں شامل ہے۔ اس توریہ کی نہایت لطیف و پاکیزہ مثالیں قرآن میں بھی موجود ہیں اور سلف صالحین کے اقوال میں بھی۔ سورۂ یوسف کی تفسیر میں بعض عمدہ مثالیں گزر چکی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا ایک لطیف پاکیزہ توریہ اِنِّیْ سَقِیْمٌ بھی ہے۔ اس کی بلاغت انشاء اللہ سورۂ صافات کی تفسیر میں ہم واضح کریں گے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں یہ دشمن کے مقابل میں راستبازوں کا ایک کارگر حربہ ہے۔ حدیث میں حضرت ابراہیمؑ کے لیے کذب کے اس مفہوم کے ثبوت میں کلامِ عرب کے شواہد میں پیش کرسکتا ہوں لیکن بحث بالکل دوسرے گوشے میں نکل جائے گی اس وجہ سے اس کو کسی مناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

ابطالِ شرک کی ایک واضح دلیل

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ سیدنا حضرت ابراہیمؑ کا قول بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا بجائے خود ابطالِ شرک کی ایک نہایت واضح دلیل ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اگر اس کائنات میں مختلف چھوٹے بڑے خداؤں کی خدائی مان لی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدائے اعظم اپنی خدائی میں دوسروں کی شرکت تسلیم کرنے پر راضی ہو اور اگر بالفرض کسی وقتی مصلحت سے وہ راضی بھی ہو جائے تو یہ امر بعید نہیں ہے کہ کسی دن وہ برہم ہو کر سب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ اسی حقیقت کو سیدنا ابراہیمؑ نے اپنے اس فعل سے ممثل کر کے دکھا دیا اور ان کے حریف اس حقیقت کو، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہوگا، پا بھی گئے اگرچہ وہ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ بہرحال ہمارے نزدیک یہ ایک نہایت اعلیٰ حکیمانہ استدراج و استدلال اور شرک و اہلِ شرک کی تفضیح و تضحیک ہے۔ اس کو جھوٹ پر محمول کرنے کی کوئی ادنیٰ وجہ بھی نہیں ہے۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۶۴)

ایک قدم صحیح دوسرا الٹا

یعنی حضرت ابراہیمؑ کی اس ٹھوکر نے ذرا ان کو متنبہ کیا اور وہ اپنے باطن کی آواز اور اپنے عقل و دل کی رہنمائی کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ تم لوگ تو اس نوجوان کو ظالم کہتے ہو لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ ظالم وہ نہیں بلکہ ظالم تم خود ہو کہ ایسی چیزوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو جو یہ صلاحیت بھی نہیں رکھتی ہیں کہ خود اپنے سر پر آئی ہوئی مصیبت کو دفع کرسکیں یا اس کو کسی دوسرے سے بیان ہی کرسکیں۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (۶۵)

'نکس' کے معنی کسی چیز کو اس طرح الٹ دینے کے ہیں کہ اس کے پاؤں اوپر ہو جائیں اور اس کا سر نیچے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس تنبیہ سے ذرا دیر کے لیے انھوں نے آنکھیں کھولیں تو سہی لیکن پھر اوندھے ہو

گئے اور بولے کہ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں تو ہم ان سے کس طرح پوچھیں! — جو لوگ اس قسم کی جہالتوں میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے دلوں پر بھی کبھی کسی واقعہ یا تنبیہ سے ایسی روشنی پڑتی ہے کہ انھیں سیدھی راہ صاف دکھائی دینے لگتی ہے لیکن عصبیتِ جاہلیت آسانی سے جان چھوڑنے والی چیز نہیں ہے اس وجہ سے وہ پھر اندھے بہرے بن جاتے ہیں اور ایک قدم صحیح اٹھا کر پھر وہی الٹی چال اختیار کر لیتے ہیں جو چل رہے ہوتے ہیں۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ (۶۶)

حضرت ابراہیم کا بھرپور وار

حضرت ابراہیم اپنے حریفوں کو جس مقام پر لانا چاہتے تھے ان کو انھوں نے وہاں لا کھڑا کیا۔ وہ پکار اٹھے کہ یہ تو بولتے نہیں تو ان سے کس طرح ان کا حال پوچھا جائے! ان کے اس اعتراف کے بعد حضرت ابراہیم نے ان پر بھرپور وار کیا۔ فرمایا کہ پھر تم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہو جو نہ تم کو کوئی نفع پہنچا سکیں نہ کوئی نقصان! یہ تقریر ظاہر ہے کہ بتوں کی بے بسی کو اس طرح آشکارا کر دینے کے بعد جتنی مؤثر ہو سکتی تھی اس کے بغیر اتنی مؤثر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بغیر اگر یہی بات ان کے سامنے لائی جاتی تو وہ اس کے جواب میں سو باتیں بنا سکتے تھے لیکن اب جب کہ وہ پاش پاش ہو کر سامنے پڑے ہوئے اپنی زبانِ حال سے اپنی بے حقیقتی اور بے بسی کی کہانی خود ہی سنا رہے تھے تو ان کے پجاری ان کی حمایت میں کیا چیز پیش کر سکتے تھے۔

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۶۷)

'اُفٍّ لَّكُمْ' نہایت شدید نفرت و کراہت کا کلمہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اس طرح ان پر حجت تمام کر دی، پھر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلیں تو انھوں نے نہایت کراہت و بیزاری کے ساتھ فرمایا کہ تم پر اور تمھارے ان معبودوں پر، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، تف ہے! 'اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ' یعنی کیا تم بالکل لایعقل بیل ہی ہو! بھلا ان پتھروں کی مورتوں کو پوجنے سے کیا حاصل! جن کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ وہ خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں تو آخر وہ تمھاری حفاظت کس طرح کریں گی!

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (۶۸)

مذہبی عدالت سے حضرت ابراہیم کے لیے حکم سزا

جب پجاریوں اور مندر کے پروہتوں نے دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کا سارا کاروبار پیشوائی خطرے میں ڈال دیا ہے، نہ ان کا کوئی بھرم رہ گیا ہے نہ ان کے معبودوں کا تو اپنے عوام کو اکسایا کہ یہ وقت اپنے معبودوں کی حمایت میں اٹھنے کا ہے۔ اگر اس وقت اس نوجوان کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہ کی گئی تو آبا و اجداد کا دین تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے اس اپیل کا عوام پر اثر ہوا اور حضرت ابراہیم کے خلاف اقدام سے متعلق کچھ تجویزیں بھی سامنے آئیں لیکن ان تجویزوں سے پروہتوں کو اطمینان نہیں ہوا۔ انھوں نے ابھارا کہ اگر اس شخص کے خلاف سچ مچ کوئی مؤثر کارروائی کرنی ہے تو یہ کرو کہ اس کو جلا دو۔ پروہتوں نے چاہا

کہ یہ سزا دے کر اپنے زعم کے مطابق اس فتنہ کا کلی سدباب کر دیں۔

قُلْنَا یٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ (۶۹)

آگ حضرت ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی

اس فیصلہ کے بموجب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو آگ میں جلانے کی کوشش کی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو حضرت ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا۔ اس کی کیا شکل ہوئی؟ قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے لیکن اس بات میں کوئی استبعاد نہیں ہے۔ اشیاء کے خواص و اثرات تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ جس زہر کو جس کے لیے چاہے تریاق بنا دے اور جس تریاق کو جس کے لیے چاہے زہر بنا دے۔ اس قسم کے عجائبِ تصرفاتِ قدرت ہم آج بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر خدا نے اپنے ایک پیغمبر کی حفاظت کے لیے آگ کو گلزار بنا دیا تو یہ کیا عجیب بات ہوئی!

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ (۷۰)

پروہتوں کی سازش کی ناکامی اور حضرت ابراہیم کی ہجرت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کے لیے پروہتوں نے ایک سازش کی جس کی طرف سورۂ صافات کی آیت ۹۸ میں اشارہ ہے۔ انشاء اللہ ہم وہاں اس کی وضاحت کریں گے۔ پروہتوں کی یہ سازش ناکام ہوئی اور اس کے بعد حضرت ابراہیم نے اس علاقہ سے ہجرت فرمائی۔

وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ (۷۱)

'اَلْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ' سے زرخیز و شاداب علاقہ مراد ہے۔ یہ اشارہ ارضِ کنعان کی طرف ہے۔ یعنی جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت ابراہیم کے لیے اپنے وطن میں ٹکنا ناممکن ہو گیا تو فرمایا کہ ہم نے اس کو اور لوطؑ کو ان کی قوموں کے شر سے نجات دی اور کنعان کے علاقے میں ان کو ٹھکانا دیا۔ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ اگرچہ ان دونوں حضرات کا دائرۂ دعوت الگ الگ تھا لیکن اس ہجرت میں حضرت لوطؑ بھی ان کے ساتھ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہجرت تک دونوں نے اپنی قوم ہی کو دعوت دی لیکن ہجرت کے بعد مختلف علاقوں کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہجرت کے بعد حضرت ابراہیم کی قوم سے کیا معاملہ ہوا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَیَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ (۷۲-۷۳)

حضرت ابراہیم پر اللہ کا انعام

یہ اللہ تعالیٰ نے وہ انعام بیان فرمایا ہے جو ہجرت کے بعد اس نے حضرت ابراہیم پر یکے بعد دیگرے کیا۔ حضرت ابراہیم نے اللہ کی خاطر اپنی قوم اور عزیزوں کو چھوڑا تھا تو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے بیٹے پوتے عطا فرمائے۔ انھوں نے جن کو چھوڑا تھا وہ نابکار و ناہنجار تھے اور اللہ نے ان کی جگہ ان کو جو دیے وہ سب ایک سے ایک بڑھ کر صالحین و اخیار میں سے تھے۔ 'نَافِلَةً' سے اس حقیقت کا اظہار

مقصود ہے کہ حضرت ابراہیم کو حضرت اسماعیل تو ان کی دعا کے صلہ میں ملے مزید برآں اللہ تعالیٰ نے ان کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بھی عطا فرمائے اور اس کے بعد نبوت کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا[1]۔ 'وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امتوں کے بانی اور قوموں کے امام ہوئے۔ اگرچہ ہر نبی اپنے منصب کے لحاظ سے امام ہوتا ہے لیکن بعض انبیاء ایسے بھی گزرے ہیں جن کے سایہ کے سوا ان کا کسی نے ساتھ نہیں دیا مگر حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کو بالفعل اللہ تعالیٰ نے منصب امامت پر سرفراز فرمایا اور انھوں نے ایک عظیم امت کی قیادت فرمائی۔ 'وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ'۔ 'اِقَامَ الصَّلٰوة' دراصل 'اِقَامَةَ الصَّلٰوة' ہے 'اِقَامَة' کی 'ة' آہنگ و صوت کے تقاضے سے گر گئی ہے۔ اس قسم کی تخفیف بتقاضائے حسن صوت عربی میں معروف ہے۔ ان انبیاء کی دعوت کے ان اجزا کے گنانے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کی دعوت وہی رہی ہے جو قرآن دے رہا ہے اور یہ تمام انبیاء صرف خدا ہی کے عبادت گزار تھے، خدائے واحد کے سوا انھوں نے کسی اور کے آگے سر نہیں جھکایا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان نبیوں کے نام لیوا اور ان کے ساتھ نسبت کے مدعی ہیں وہ اس آئینہ میں اپنے منہ دیکھیں اور اپنے قول و عمل کا جائزہ لیں۔ وہ کیا تھے اور یہ کیا بن کے رہ گئے۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰۗىِٕثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۷۴-۷۵)

حضرت لوطؑ پر حکم اور علم کا انعام

اوپر حضرت لوطؑ کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کے تعلق سے آیا تھا۔ اب یہ ان کا مستقل ذکر فرمایا کہ ان کو بھی ہم نے حکم اور علم عطا کیا۔ 'حکم' سے مراد فیصلہ کی قوت و صلاحیت ہے اور علم سے مراد علم نبوت ہے پہلی چیز عقل و فطرت کی پاکیزگی کا ثمرہ ہے، دوسری چیز وحی الٰہی کی برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو منصب نبوت کے لیے انتخاب فرمایا وہ نخلِ فطرت کے بہترین ثمر تھے۔ انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ ان کا باطن نور حکمت سے منور ہو کر نور وحی کے اخذ و اکتساب کے قابل ہو گیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو نور وحی سے فیضیاب فرمایا تو وہ 'نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ' ہو گئے۔

حضرت لوطؑ کی ہجرت

'وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰۗىِٕثَ'۔ ان کی نجات کی جو شکل ہوئی اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ انھوں نے بھی سرزمین شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ ان کی بستی کے لوگوں پر چونکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اس وجہ سے ان کے وہاں سے نکلنے کو نجات سے تعبیر فرمایا۔ 'كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰۗىِٕثَ'

---

[1] سورۂ صافات کی آیات ۱۰۰-۱۱۲ کے تحت ان شاء اللہ یہ بحث آئے گی کہ حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ دعا کے صلہ میں ملے ہیں اور حضرت اسحاقؑ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے صلہ میں۔ اس تاریخی حقیقت کو یہود نے جس طرح مسخ کیا ہے اس کی تفصیل استاذ امامؒ کے رسالہ ذبیح میں دیکھیے۔

سے اصلاً تو ان کی اس بدمستی کی خباثت کی طرف اشارہ ہے جس کو بعض جگہ 'فاحشۃ' سے تعبیر فرمایا ہے لیکن لفظ جمع اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس نوع کی کوئی برائی کبھی تنہا نہیں ہوتی بلکہ یہ عیب جب کسی قوم میں پیدا ہوتی ہے تو اس کے سایہ میں فواحش و خبائث کا ایک پورا کنبہ آباد ہو جاتا ہے۔ یہاں ان برائیوں کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی اس لیے کہ اس قسم کی گھناؤنی برائیاں قابلِ ذکر نہیں ہوا کرتیں۔

قومِ لوط کا انجام

'إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَاسِقِينَ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو ان لوگوں کے اندر سے نکالا اور ان پر اپنا عذاب نازل کیا۔ فرمایا کہ یہ نابکار اور نافرمان لوگ تھے اور لوطؑ صالح اور خوب کار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندے کو ان ناہنجاروں کے اندر سے نکال لیا اور ان نابکاروں کو دفن کر دیا۔ 'وَأَدْخَلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا' میں 'رحمت' سے مراد وہ نجات و فلاح بھی ہے جو اس دنیا میں ان کو حاصل ہوئی اور وہ کامیابی و کامرانی بھی جو آخرت میں ان کو حاصل ہوگی۔

وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِن قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ (۷۶)

حضرتِ نوحؑ کا حوالہ

'نُوحًا' کا نصب اس مفہوم سے پیدا ہوا ہے جو یہاں سلسلۂ کلام سے مستفاد ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے اپنے مذکورہ بالا بندوں پر اپنی رحمت نازل کی، ان کو نجات دی اور ان کی مدد فرمائی اسی طرح اس سے پہلے اپنے بندے نوحؑ کو بھی ہم نے نجات دی اور اس کی مدد فرمائی۔

حضرت نوحؑ کی آخری دعا

'إِذْ نَادَىٰ مِن قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ' یہ حضرت نوحؑ کی اس آخری دعا کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ نوح میں تفصیل سے مذکور ہے اور جس کو پڑھ کر دل کانپ اٹھتا ہے۔ اس دعا کی قبولیت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل تو سورۂ نوح میں آئے گی۔ یہاں صرف اس سلسلہ کی آخری آیات کو یاد کر لیجیے۔

مِّمَّا خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا	پس قوم نوحؑ کے لوگ اپنے جرموں کی پاداش میں
نَارًا ، فَلَمْ يَجِدُوا لَهُم مِّن	غرق کر دیے گئے، اور آگ میں داخل کیے گئے
دُونِ اللَّهِ أَنصَارًا ۝ وَقَالَ	اور وہ خدا کے مقابل میں اپنے لیے کوئی مددگار
نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى	نہ پا سکے۔ اور نوحؑ نے دعا کی کہ اے میرے رب!
الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝	تو زمین پر ان کافروں میں سے ایک کو بھی چلتا پھرتا
إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا	نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو یہ تیرے
عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا	بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف ناہنجاروں اور
فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ رَّبِّ اغْفِرْ لِي	ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔ اے میرے رب!
وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ	میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما اور ان کی
مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَ	جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہو جائیں۔
الْمُؤْمِنَاتِ ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ	اور تمام مومنین و مومنات کی اور ظالموں کے لیے

اِلَّا مَتَاعًا ۵ (نوح ۷۱: ۲۸)   صرف تباہی میں اضافہ کر۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ۔ لفظ 'اَھل' کی تحقیق سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۳۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس سے کسی شخص کے اہلِ خانہ اور اتباع و اصحاب سب مراد ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے باایمان ساتھیوں کو ایک عظیم کلفت اور بہت بڑی مصیبت سے نجات بخشی۔ 'کرب عظیم' سے مراد وہ غم و الم بھی ہے جو اعدائے حق کی ستم رانیوں اور اذیتوں سے ایک مدت دراز تک ان کو اور ان کے مظلوم ساتھیوں کو لاحق رہا اور وہ عذاب عظیم بھی ہے جس میں بالآخر ان کی پوری قوم مبتلا ہوئی۔

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ (۷۷)

قوم نوح کا انجام

'نَصَرْنَا' کے بعد 'مِن' کا صلہ اس امر کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'اِنْتَقَمْنَا' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ عربی زبان کے اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ 'ہم نے اس کی مدد کی اور ان لوگوں سے ہم نے انتقام لیا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔' ہم نے ترجمہ میں اس تضمین کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ 'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ' میں بالاجمال ان کے جرم کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نہایت ہی برے لوگ تھے۔ ان کے جرائم کی تفصیل پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے اور آگے سورۂ نوح میں بھی آئے گی۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ جتنی طویل مدت تک حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو جھنجھوڑا ہے اس کی کوئی دوسری مثال شاید مشکل ہی سے مل سکے گی اور حضرت نوحؑ کی دلسوزی اور دردمندی کا جو حال رہا ہے اس کی تفصیل خود حضرت نوحؑ کی زبان سے ان شاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں آئے گی لیکن یہ ایسے پتھر لوگ تھے کہ کوئی چیز بھی ان پر کارگر نہ ہو سکی۔ 'فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ' ان لوگوں کی اس سنگ دلی اور نابکاری کی سزا ان کو بالآخر یہ ملی کہ پوری قوم کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ بلکہ یہ پوری قوم خدا کی زمین پر غلاظت کا ایک ڈھیر تھی جس کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے زمین کے سمندروں اور آسمان کے بادلوں کو حکم دیا کہ وہ اس ناپاکی کے ڈھیر سے خدا کی زمین کو دھو کر پاک کر دیں۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ طوفانِ نوح نے اس زمین کو دھو کر بالکل پاک کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے پاکیزہ صفات ساتھیوں سے اس کو از سرِ نو آباد کیا۔ اس مضمون کو اچھی طرح کھولنے کے لیے تورات میں قوم نوح سے متعلق جو کچھ آیا ہے اس کا حوالہ بہت مفید رہتا لیکن اس کے لیے موزوں جگہ ان شاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں آئے گی۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷۸-۹۴

اوپر کی آیات میں، ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ، ان انبیائے عظام کا ذکر ہوا جو ملتوں اور امتوں کے بانی ہوئے، اب آگے ایک صفاتی ترتیب کے ساتھ ان انبیاء کا ذکر آ رہا ہے جو اپنی صفات اور اپنے کردار کے اعتبار سے پوری انسانیت کے لیے نمونہ ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت داؤد

اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا ذکر فرمایا جو بادشاہی اور درویشی کے امتزاج کی بہترین مثال تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے شوکتِ دنیا عطا فرمائی لیکن وہ اس کے فتنوں میں مبتلا ہونے کے بجائے برابر خدا کے شکر گزار رہے اور اپنی تمام صلاحیتیں اور اپنے تمام وسائل و ذرائع انھوں نے اپنے رب ہی کی رضا جوئی میں صرف کیے۔ اس کے بعد حضرت ایوب، حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر فرمایا جو اپنے صبر کے اعتبار سے تمام انسانیت کے گل سرسبد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے امتحانوں میں ان کو ڈالا اور ہر امتحان میں یہ ثابت قدم رہے۔ اس کے بعد حضرت یونس، حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہم السلام کا ذکر فرمایا جنھوں نے نہایت تاریک اور مایوس کن حالات کے اندر اپنے رب کو پکارا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کے لیے اپنی رحمتِ خاص سے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ ان انبیائے کرام کی زندگیوں میں ان متکبرین کے لیے بھی درس ہے جو خدا کی نعمتیں پا کر خدا ہی سے اکڑ رہے تھے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مظلوم صحابہؓ کے لیے بھی درس ہے جو آزمائش کے ایک نہایت ہی نازک دور سے گزر رہے تھے اور جن کو سامنے کی راہ بالکل رندھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ
وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا
وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا
فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ
فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ
بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾
وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ
وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ
وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ
ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰي
لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۶﴾ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ
مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ
اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖۗ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ
نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۸﴾ وَزَكَرِیَّاۤ اِذْ نَادٰی
رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ﴿۸۹﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ؗ
وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ
فِی الْخَیْرٰتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ ﴿۹۰﴾ وَالَّتِیْۤ
اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰیَةً
لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۱﴾ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ٘ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾
ع ۶ وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

ترجمۂ آیات ۷۸-۹۴

اور داؤد اور سلیمان پر بھی ہم نے اپنا فضل کیا۔ یاد کرو جب کہ وہ ایک کھیتی کے مقدمے کا فیصلہ کر رہے تھے جب کہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں شب میں جا پڑی تھیں اور ہم ان کے اس قضیہ پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس کو سمجھا دیا سلیمان کو اور ہم نے ان میں سے ہر ایک کو حکمت اور علم سے نوازا تھا۔ اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کا ہم نوا کر دیا تھا، وہ اس کے ساتھ خدا کی تسبیح کرتے تھے اور یہ باتیں ہم ہی کرنے والے تھے! اور ہم نے اس کو تمہارے لیے ایک خاص جنگی لباس کی صنعت سکھائی تا کہ وہ تم کو جنگ میں محفوظ رکھے تو کیا تم بھی اسی طرح شکر کرنے والے بنتے ہو! ۷۸-۸۰

اور ہم نے سلیمان کے لیے بادِ تند کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور ہم ہر چیز سے باخبر ہیں۔ اور شیاطین میں سے بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کیے تھے جو اس کے لیے سمندروں میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے۔ اور ہم ان کو سنبھالنے والے تھے۔ ۸۱-۸۲

اور ایوبؑ پر بھی ہم نے رحمت کی۔ جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مبتلائے آزار ہوں اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے! تو ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی اور ہم نے اس کی تکلیف دور کر دی اور اس کو اس کے اہل و عیال بھی دیے اور ان کے مانند ان کے ساتھ اور بھی خاص اپنے فضل سے اور عبادت گزاروں کی یاد دہانی کے لیے۔ ۸۳-۸۴

اور اسمٰعیلؑ، ادریسؑ اور ذو الکفلؑ پر بھی ہم نے فضل کیا۔ یہ سب ثابت قدموں میں سے تھے۔ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا، بے شک وہ نیکو کاروں میں سے تھے۔ ۸۵-۸۶

اور ذو النون پر بھی ہم نے رحم کیا جب کہ وہ قوم سے برہم ہو کر چل کھڑا ہوا اور اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔ پس اس نے تاریکیوں کے اندر پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی قصور وار ہوں! تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم اہل ایمان کو نجات دیتے ہیں۔ ۸۷-۸۸

اور زکریاؑ پر بھی فضل کیا کہ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ اے رب تو مجھے تنہا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تو ہے تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور ہم نے اس کو یحییٰ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے سازگار کر دیا۔ بے شک یہ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والے اور امید و بیم ہر حال میں ہماری ہی عبادت کرنے والے اور ہمارے آگے سرفگندہ رہنے والے تھے۔ ۸۹-۹۰

اور اس (پاک دامن بی بی) پر بھی اپنا فضل کیا جس نے اپنے اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت کی تو ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی اور اس کو اور اس کے بیٹے کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔ ۹۱

یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمھارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو۔ اور انھوں نے اپنا دین ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ ہر ایک کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے! تو جو نیک عمل کرے گا اور وہ ایمان پر بھی ہو گا اس کی سعی رائگاں جانے والی نہیں، ہم اس کے لیے اس کو لکھ رکھنے والے ہیں۔ ۹۲-۹۴

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ (۷۸-۷۹)

داؤد و سلیمان یہاں اسی طرح منصوب ہیں جس طرح اوپر 'نُوْحًا' منصوب ہے یعنی سیاقِ کلام کی روشنی میں کوئی فعل محذوف مانیں گے۔ ہم نے ترجمہ میں اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

'نفش' کے معنی بکریوں یا مویشیوں کا شب میں چرنا اور 'فَفَهَّمْنٰهَا' میں ضمیر مؤنث اس مرجع کے لیے آئی ہے جو سیاق کلام سے مستنبط و متبادر ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

حضرت داؤدؑ کے ایک مقدمہ کی طرف اشارہ اور اس اشارہ سے مقصود

یہاں ایک مقدمہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو حضرت داؤدؑ کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس مقدمہ کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی ہے۔ بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی بکریوں کا ریوڑ کسی کے کھیت میں جا پڑا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے اس کا فیصلہ فرمایا لیکن اس فیصلہ میں وہ معاملہ کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ نے، جو ابھی کمسن ہی تھے، اپنی رائے پیش کی جو زیادہ صائب اور قرینِ عدل تھی۔ بالآخر حضرت داؤدؑ نے انہی کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ یہ سوال کہ باپ نے کیا فیصلہ کیا اور بیٹے نے کیا رائے دی، خارج از بحث ہے اس لیے کہ قرآن

داؤدؑ و سلیمانؑ کی عدل گستری

کا مقصد یہاں مقدمہ کی روداد پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ایک تو یہ دکھانا ہے کہ حضرت داؤدؑ ایک حکمران اور پیغمبر ہونے کے باوجود اپنے فیصلوں میں اتنے محتاط تھے کہ اپنے ایک اجتہاد کا ضعف، اپنے ایک کم عمر فرزند کے توجہ دلانے

سے بھی جب ان پر واضح ہو گیا تو انھوں نے فوراً اپنا فیصلہ بدل دیا اور اپنے سے ایک فروتر کی رائے قبول کر لی۔ دوسری یہ بات دکھانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو ایک ایسا فرزند عطا فرمایا جو اپنے عنفوان شباب ہی سے ایسی اعلیٰ قوت فیصلہ رکھتا تھا کہ بسا اوقات اپنے عظیم باپ کو بھی مشورے دیتا تھا اور باپ اس کے فیصلوں کی قدر کرتا تھا۔ یہ کسی باپ کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ایسا لائق بیٹا عطا ہو جو امور حکومت میں نہ صرف اس کا دست و بازو بنے بلکہ بسا اوقات اس کی رہنمائی بھی کرے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں اس مقدمہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہمارے مفسرین نے اس مقدمے کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ قرآن سے ایک بالکل خارج چیز ہے۔ اس کی مختلف شکلیں فرض کی جا سکتی ہیں لیکن ان کی نوعیت بالکل مفروضات کی ہے اور ہم مفروضات کے درپے ہونا پسند نہیں کرتے۔

حکمران کا اصل جوہر

'وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ' یعنی ہم اس خاندان کے لوگوں کو اپنی زمین میں حکومت دے کر بالکل الگ تھلگ نہیں جا بیٹھے تھے بلکہ دیکھتے رہے تھے کہ وہ کیا بناتے ہیں، رعایا کے اندر امن و عدل قائم کرنے کا ان کو کتنا احساس ہے، اور اپنی ذمہ داریوں کے معاملے میں وہ کتنے زیرک، کتنے محتاط اور کتنے بےنفس اور غیر جانبدار ہیں۔ چنانچہ ان باپ بیٹے نے یہ ثابت کر دیا کہ دونوں اس منصب کے پوری طرح اہل ہیں۔ بیٹے نے جونہی محسوس کیا کہ باپ سے درباب عدل لغزش ہوئی اس نے اپنا حق نصیحت ادا کیا اور باپ نے جونہی محسوس کیا کہ بیٹے کی رائے زیادہ قرین عدل ہے بے چون و چرا اس نے حق کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیا۔ یہی کردار حکمرانی کا اصل جوہر ہے اور اللہ تعالیٰ جن کو اپنی زمین میں خلافت دیتا ہے اسی جوہر کو پرکھنے کے لیے دیتا ہے۔

'وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا' یعنی ان کا یہی جوہر ہے جس کی بنا پر ہم نے ان میں سے ہر ایک کو حکمت اور نبوت سے نوازا۔

حکمرانی کے ساتھ درویشی

'وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ' یہ حضرت داؤدؑ کی درویشی کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو ہم نے ان کو تخت حکومت پر بٹھایا تھا، وہ پوری بیدار مغزی اور بےنفسی کے ساتھ رعایا کے اندر امن و عدل قائم کرتے تھے۔ دوسری طرف ان کے تعلق باللہ کا یہ حال تھا کہ وہ شب میں پہاڑوں میں نکل جاتے اور ان کے حمد و تسبیح کے نغموں اور گیتوں کی صدائے بازگشت پہاڑوں میں گونجتی اور پرندے بھی ان کی ہمنوائی کرتے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ تورات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت داؤدؑ نہایت خوش الحان تھے اور اس خوش الحانی کے ساتھ ساتھ ان کے اندر سوز و درد بھی تھا۔ مزید برآں یہ کہ ان کی تمام مناجاتیں گیتوں اور نغموں کی شکل میں ہیں اور یہ گیت الہامی ہیں۔ ان گیتوں کا حال یہ ہے کہ زبور پڑھیے تو اگرچہ ترجمہ میں ان کی شعری روح نکل چکی ہے لیکن آج بھی ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل سینہ سے نکل پڑے گا۔ حضرت داؤدؑ جیسا خوش الحان اور صاحب سوز و درد جب ان الہامی گیتوں کو پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر، سحر کے سہانے وقت میں، پڑھتا رہا ہوگا تو یقیناً پہاڑوں سے بھی ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی ہوگی

اور پرندے بھی ان کی ہمنوائی کرتے رہے ہوں گے۔ یہ نہ خیال فرمائیے کہ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اپنے رب کی تسبیح کرتی ہے لیکن ہم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ ان کا یہ شوقِ تسبیح اس وقت اور بھڑک اٹھتا ہے۔ جب کوئی صاحب درد کوئی ایسا نغمہ چھیڑ دیتا ہے جو ان کے دل کی ترجمانی کرتا ہے، اس وقت وہ بھی جھوم اٹھتے ہیں اور اس کی لَے میں اپنی لَے ملاتے ہیں۔ اگر پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح ہم نہیں سنتے سمجھتے تو یہ خیال نہ کیجیے کہ اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں سنتا سمجھتا۔ وہ لوگ اس کو سنتے اور سمجھتے ہیں جن کے سینوں میں دل گداختہ ہوتا ہے۔ مولانا رومؒ نے خوب بات فرمائی ہے۔

فلسفی کو منکر حنانہ است

از حواس انبیاء بے گانہ است

اسی حقیقت کی طرف مرزا غالب نے یوں اشارہ کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس ٹکڑے کا اسلوبِ بیان بھی قابلِ غور ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ سَخَّرْنَا لَهٗ بلکہ اسلوب بدل کر سَخَّرْنَا مَعَهٗ فرمایا۔ معہ سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی تسبیح میں اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو بھی ان کا شریکِ بزم بنا دیا تھا۔ جب وہ اپنا نغمۂ حمد چھیڑتے تو یہ بھی ان کی ہمنوائی کرتے۔

زبان کا ایک نکتہ — یہاں معطوف اور معطوف علیہ یعنی جِبَالَ اور طَيْرَ کے درمیان فعل يُسَبِّحْنَ حائل ہے۔ حالانکہ بظاہر اس کو طیر کے بعد آنا چاہیے۔ فعل کی اس تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ پرندوں کی تسبیح خوانی تو ایک معروف بات ہے البتہ پہاڑوں کی نواسنجی ایک نادر بات تھی۔ اس وجہ سے فعل کو ان سے متصل کر دیا۔

خدا ساز بات — وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ۔ یعنی یہ کام کسی اور کے کرنے کے نہیں بلکہ ہمارے ہی کرنے کے تھے اور ہم ہی ان کے کرنے والے بنے۔ ہم جس کے لیے چاہیں شجر و حجر، دریا، پہاڑ اور چرند و پرند ہر چیز کو اس کے پیچھے لگا دیں۔ خدا کی یہ نعمتیں کسی کو اس کے اپنے زور و اقتدار سے نہیں ملتیں بلکہ خدا ہی کے دینے سے ملتی ہیں۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ (۸۰)

رات کا راہب اور دن کا شہسوار — یعنی یہ زاہد شب زندہ دار یہ نہ سمجھو کہ صرف تنہائی کے گوشوں میں بیٹھ کر اللّٰھو کرنے والا ہی تھا بلکہ یہ جس طرح رات کا راہب تھا اسی طرح دن کا شہسوار بھی تھا۔ ہم نے جنگ کے حملوں سے حفاظت کے لیے اس کو ایک خاص لباس بنانے کی تعلیم دی۔ اس خاص لباس سے اشارہ زرہ کی طرف ہے۔ اس کے موجد حضرت داؤدؑ ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ زرہ کی جو اعلیٰ قسمیں حضرت داؤدؑ نے ایجاد کیں ویسی زرہیں ان سے پہلے وجود میں نہیں آئی تھیں۔ عربوں کی رزمیہ شاعری میں داؤدی ساخت کی زرہوں کا ذکر بہت آتا ہے۔ اس عہد کے

وفاعی اسلحہ میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل رہی ہے۔ اب زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ ان آلات و اسلحہ کی اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن جس زمانے کی یہ بات ہے اس زمانے میں حضرت داؤدؑ اپنی انہی ایجادات کی بدولت دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت کے مالک تھے۔ مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ باللیل رہبان و بالنہار فرسان کی صحیح تصویر تھے۔ ایک طرف ان کی پرسوز دعاؤں اور مناجاتوں سے پہاڑوں کا دل موم ہوتا، دوسری طرف ان کی جنگی ایجادات اور ان کی فوجی یلغاروں سے دشمنوں پر لرزہ طاری رہتا۔

شکر میں حضرت داؤدؑ کی پیروی کی دعوت

'فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ' حضرت داؤدؑ کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے بعد مخاطبوں کو خطاب کر کے سوال کیا کہ کیا اس طرح کے شکرگزار بندے بننے کا حوصلہ تم بھی رکھتے ہو! حکمت، نبوت، حکومت اور قوت سب کچھ پا کر حضرت داؤدؑ کے فقر و درویشی کا یہ حال تھا! دین و دنیا کی یہی ہم آمیزی خدا کو مطلوب ہے اور خدا کے شکرگزار بندے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نہ کہ وہ ہیز لوگ جو داؤدؑ و سلیمانؑ کی سطوت و عظمت کے گیت تو بہت گاتے ہیں لیکن دنیا کے کتے بنے ہوئے ہیں۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ (۸۱)

حضرت سلیمانؑ کا عظیم بحری بیڑا

یہاں 'لِ' اس بات کا قرینہ ہے کہ فعل 'سَخَّرْنَا' محذوف ہے۔ 'سَخَّرْنَا لَهٗ' کا مفہوم ہم اس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'لِ' کے صلہ کے ساتھ یہ لفظ کسی شے کو کسی کی خدمت میں لگا دینے کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی ہم نے تند ہواؤں کو بھی مسخر کر کے سلیمانؑ کی خدمت میں لگا دیا تھا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی بری قوت تو بہت تھی لیکن ان کی حکومت کی بحری قوت میں بے مثال ترقی حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوئی۔ انھوں نے ایسے بادبانی جہاز ایجاد کیے جو ہندوستان اور مغربی جزائر تک سفر کرتے تھے۔ ان کا بحری بیڑا وقت کا سب سے زیادہ طاقتور بیڑا تھا۔ بحر احمر میں اس کا مرکز ترسیس تھا جو خلیج عقبہ میں واقع تھا اور بحر متوسط میں صور، طائر اور یافہ کی بندرگاہیں۔ اس زمانے تک سمندری ہواؤں کو کنٹرول کرنے کا ذریعہ بادبان ہی تھے۔ یہی بادبان جہازوں کے لیے انجن کا کام دیتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ نے ایسے بادبان ایجاد کیے جو تند ہواؤں میں بھی جہاز کی آمد و رفت میں خلل واقع نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ اپنی معینہ سمتوں میں، موافق و ناموافق ہر قسم کی ہواؤں، اپنے لمبے لمبے سفر بے خوف و خطر جاری رکھتے۔ یہ چیز چونکہ خدا کی سکھائی ہوئی سائنس کا ثمرہ تھی اس وجہ سے فرمایا کہ ہم نے سلیمانؑ کے لیے تند ہوائیں مسخر کر دی تھیں جو اس کے حکم سے چلتی تھیں۔

'الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا' سے اشارہ فلسطین اور شام وغیرہ کے علاقے ہیں جو زرخیز ہونے کے سبب سے تجارتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھنے والے تھے۔

'وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ' بعینہٖ یہی فقرہ معمولی تغیر کے ساتھ آیت ۵۱ میں حضرت ابراہیمؑ کی شان

میں وارد ہوا ہے۔ وہاں ہم اس کا مفہوم واضح کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی صلاحیتوں اور ان کے ظرف اور حوصلہ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس وجہ سے ہم نے ان کو اپنی ہواؤں پر یہ تصرف بخشا اور ہم یہ کچھ دے کر اپنی آنکھیں موند کر بیٹھ نہیں گئے تھے بلکہ ہر چیز کو جانتے اور دیکھتے رہے تھے کہ سلیمانؑ ہماری بخشی ہوئی طاقت کو کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ درحقیقت یہی نکتہ ہے جو ہمارے اس عہد کے سائنسدانوں کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

تسخیر کائنات خدا کا فضل ہے

انھیں تسخیر کائنات کی مہمات میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کو وہ خدا کا فضل سمجھنے کے بجائے اپنی ذہانت کا کرشمہ تصور کرتے ہیں حالانکہ انسان کو جو کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے خدا کی بخشی ہوئی عقل اور خدا ہی کی رہنمائی سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اوپر وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ سے اشارہ فرمایا ہے۔ پھر جب انسان اس مغالطہ میں پڑ جاتا ہے کہ اس کی یہ تمام ایجادات اس کا اپنا کارنامہ ہیں تو اس مغالطہ کے بطن سے ایک اور مغالطہ جنم لیتا ہے جو اس سے بھی زیادہ مہلک ہے، وہ یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ ان حاصل کردہ قوتوں سے جس طرح چاہے کام لے کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے۔ قرآن نے وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ سے اس مغالطہ پر بھی ضرب لگائی ہے کہ قدرت نادان نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے خزانوں کی کنجیاں پکڑا کر خود کنارہ کش ہو کر بیٹھ رہے، لوگ جو چاہیں بناتے اور کرتے پھریں، بلکہ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور جب وہ آگاہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی بخشی ہوئی قوت کو اگر کسی نے غلط استعمال کیا تو وہ لازماً اس کے لیے ایک دن مسئول ہوگا۔ حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام اس رمز سے خوب آگاہ تھے اس وجہ سے بر و بحر دونوں میں عظیم کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس مغالطہ میں مبتلا نہیں ہوئے کہ یہ ان کے اپنے کارنامے ہیں بلکہ انھوں نے ان ساری چیزوں کو خدا کا فضل سمجھا اور جو قدم بھی اٹھاتے یہ سوچ کر اٹھاتے کہ ایک دن ان کو خدا کے سامنے پیش ہونا اور اپنے ہر عمل کی جواب دہی کرنی ہے۔ یہی احساس ہے جو انسان کو خدا کا حقیقی شکر گزار و تابعدار بندہ بناتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی زندگی کا یہ پہلو انشاءاللہ سورۂ نمل کی تفسیر میں تفصیل سے زیر بحث آئے گا۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (۸۲)

حضرت سلیمانؑ نے مفسد عناصر کو تعمیر و تمدن کی خدمت میں استعمال کیا

شیاطین سے مراد وہ شیاطین جن ہیں جن کو حضرت سلیمانؑ نے مسخر کر رکھا تھا۔ قرآن اور تورات دونوں سے ثابت ہے کہ ان کے پاس انسانوں، جنوں اور پرندوں کی باقاعدہ فوج تھی جس کی پریڈ ہوتی رہتی تھی۔ مثلاً فرمایا ہے۔ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (نمل - ۱۸) (اور سلیمان کے قبضہ میں جنوں، انسانوں اور پرندوں کی فوجیں تھیں جن کا جائزہ ہوتا رہتا تھا) سورۂ نمل میں حضرت سلیمان کی فوج کے ایک عفریت جن کا بھی ذکر ہے جس نے ان سے کہا کہ اگر حضور کا حکم ہو تو میں ملکۂ سبا کا تخت آپ کے دربار سے اٹھنے سے پہلے پہلے حاضر کر دوں۔ یہ جن سمندروں میں غوطہ لگا کر سمندری دولت، مونگے موتی وغیرہ بھی فراہم کرتے تھے اور دوسرے کام بھی کرتے تھے۔ اس طرح کے مفسد عناصر کو مسخر کر کے انسانیت کی مفید

خدمت میں استعمال کرنا حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور ایک لائق حکمران کا اصلی کام یہی ہے کہ وہ نہ صرف مفید عناصر کو بلکہ مضر عناصر کو بھی اپنے علم و حکمت سے تعمیر و تمدن اور اصلاح و ترقی کی راہ پر لگا دے۔ ان شیاطین کو مسخر کرنے کے لیے حضرت سلیمانؑ کو جو علم عطا ہوا تھا اس پر مفصل بحث بقرہ کی آیت ۱۰۲ کے تحت ہاروت و ماروت کے ضمن میں، ہم کر چکے ہیں۔ بعض لوگوں نے شیاطین سے ان کافر قوموں کو مراد لیا ہے جو حضرت سلیمانؑ کے زیر نگیں تھیں لیکن ہمارے نزدیک یہ اس لفظ سے ایک قسم کا تجاوز ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ قرآن میں یہ لفظ اشرار جن اور اشرار انس دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن مطلق کافر قوموں کے لیے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے کافر قوموں کے اشرار مراد ہیں تو لفظ کے اندر اس کی بھی گنجائش ہے لیکن اصلاً نہیں تبعاً۔ اصلاً اس سے مراد جنوں ہی کے اشرار ہوں گے۔

ہمارے عہد کے سائنس دانوں کا ایک مغالطہ

'وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ' یعنی ان شیطانی قوتوں کو حضرت سلیمانؑ کے لیے ہم نے جو مسخر کر دیا تھا تو یہ نہیں تھا کہ وہ مجرد ان کے اپنے بل بوتے پر ان کے قابو میں تھیں بلکہ ان کے اصلی نگران ہم تھے۔ ہمیں نے اپنے فضل سے ان کو سلیمانؑ کے قابو میں کر دیا تھا اور ہم ہی ان کی نگرانی کرنے والے تھے کہ نہ ان میں سے کوئی بھاگ سکے نہ کوئی حضرت سلیمانؑ کے منشا کے خلاف کوئی تعدی کر سکے۔ اگر ہم ان کے نگران نہ ہوتے تو یہ بے قابو ہو کر خطرے اور آفت کا سبب بھی بن سکتی تھیں۔ اس ٹکڑے میں ایک بہت بڑی تنبیہ ہے ان لوگوں کے لیے جو قدرت کی بعض قوتوں کو تسخیر کر کے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اب یہ ان کے مالک ہیں، نہ ان کو ان سے کوئی چھین سکتا اور نہ یہ ان کے خلاف کوئی بغاوت کر سکتیں۔ یہ خیال محض انسان کی تنگ ظرفی اور جہالت کا نتیجہ ہے۔ آج انسان نے بھاپ، گیس بجلی اور ایٹم وغیرہ کی جو قوتیں اپنے قابو میں کر رکھی ہیں ان پر خدا ہی نے انسان کو قابو دیا ہے اور یہ اسی وقت تک انسان کے قابو میں ہیں جب تک خدا چاہے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی قوت کی باگ بھی ذرا ڈھیلی چھوڑ دے تو یہی قوتیں، جن کی مدد سے انسان آسمان و زمین کے قلابے ملا رہا ہے، چشم زدن میں اس کے سارے خرمن کو سوخت کر کے رکھ دیں۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ (۸۳-۸۴)

حضرت ایوبؑ اور ان کا مثالی صبر

شکر کی دو اعلیٰ مثالیں پیش کرنے کے بعد اب یہاں انبیائے کرامؑ کا ذکر آ رہا ہے جنھوں نے صبر کی نہایت اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت ایوبؑ کا ذکر فرمایا ہے۔ سفر ایوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک عوض میں حضرت ایوبؑ ایک نہایت کامل اور راستباز انسان تھے۔ خدا نے انھیں بڑا خاندان اور بڑی دولت دے رکھی تھی۔ ان کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بیل اور پانچ سو بار برداری کے گدھے ان کے پاس تھے۔ ان کے نوکر چاکر بھی بے شمار تھے۔ اہل مشرق میں اس درجہ کا مالدار کوئی اور نہ تھا لیکن یہ تمام خدم و حشم رکھنے کے باوجود وہ خدا کے نہایت شکر گزار اور فرمانبردار بندے

تھے کبھی کسی برائی سے وہ آلودہ نہ ہوئے۔

ان کی اس نیکی پر شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو حسد ہوا۔ انھوں نے طعنہ دیا کہ ایوب کی یہ خدا پرستی و راستبازی اس لیے ہوئی کہ خدا نے اسے ہر طرح کی خوشحالیاں دے رکھی ہیں۔ اگر یہ ان سے محروم ہو جائے تو پھر کبھی خدا کا شکر گزار نہ ہوگا۔[1]

اس کے بعد خدا کی طرف سے ان کے لیے آزمائشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے مویشی لوٹ لیے گئے، نوکر چاکر قتل ہو گئے، اولاد مر گئی اور دولت و حشمت سب غائب ہو گئی لیکن حضرت ایوبؑ خدا سے مایوس ہونے کے بجائے اسی کے دروازے پر گر پڑے۔ سفر ایوب میں ہے کہ

"وہ سجدے میں گر پڑا اور کہا میں اپنی ماں کے پیٹ سے برہنہ پیدا ہوا تھا اور برہنہ ہی دنیا سے جاؤں گا۔ خداوند نے مجھے دیا تھا اور خداوند نے لے لیا اس کے نام کے لیے ساری پاکیاں اور مبارکیاں ہوں"۔

سفر ایوب ۱: ۲۲

مالی آفات و مصائب کے بعد جسمانی تکالیف و آلام کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ،

"ایوب کے تلوے سے لے کر سر کی چاندی تک سارے جسم میں جلتے ہوئے پھوڑے نکل آئے۔ وہ ایک ٹھیکرا لے کر اپنا جسم کھجاتا اور راکھ پر بیٹھا رہتا" سفر ایوب ۲: ۸

حضرت ایوب نے ان تکالیف کا بھی اسی صبر و رضا کے ساتھ مقابلہ کیا جس صبر و رضا کے ساتھ انھوں نے مالی آفات و مصائب کا مقابلہ کیا بالآخر اس امتحان سے بھی وہ بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے زیادہ دیا جو انھوں نے کھویا تھا۔

"اور خداوند نے ایوب کی حالت بدل دی۔ اسے پہلے کی نسبت دو چند دولت عنایت کی۔ اس کے تمام عزیزوں کو اس کے گرد جمع کر دیا۔ اسے آخری عمر میں پہلے کی طرح اولاد ملی۔ وہ ایک سو چالیس برس تک جیا اور اپنی نسل کی چار پشتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ سفر ایوب ۴۲: ۱۰

مقام رضا اور اس کا اجر

'أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ'۔ اس دعا کی اس بلاغت کو ملحوظ رکھیے کہ حضرت ایوبؑ نے اپنے دکھ اور درد کا حوالہ تو دیا لیکن حرفِ مدعا کو زبان پر نہیں لائے۔ اس کو خدا کی رحمت پر چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ میں دکھی ہوں اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا دکھ تیرے آگے پیش کرتا ہوں اور معاملہ تیری رحمت کے حوالہ کرتا ہوں، تو جو کچھ کرے گا اپنی شانِ رحیمی کے مطابق کرے گا اور اسی میں میرے لیے برکت و رحمت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو مقامِ رضا کہتے ہیں۔ جو اس مقام کو حاصل کر لیتا ہے اسی کو آخرت میں 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس دنیا میں انسان کو جن حالات اور

---

[1] سفر ایوب - ۱: ۹-۱۱

آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے ان میں یہ متعین کرنا کہ اس کی دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے خیر کس میں ہے، انسان کے لیے نہایت مشکل ہے۔ وہ بسا اوقات جس چیز کو چاہتا ہے اس کی عاقبت کے پہلو سے اس کے لیے فلاح و سعادت اس کے ضد پہلو میں ہوتی ہے اس وجہ سے ان تمام امور میں، جن میں خیر کا پہلو خدا کی طرف سے متعین نہ ہو، معاملہ کو اللہ کے حوالہ کرنے ہی میں سعادت ہے۔ وہی جانتا ہے کہ بندے کے لیے بیماری بہتر ہے یا تندرستی، موت بہتر ہے یا زندگی!

فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کی دعا قبول فرمائی۔ ان کی وہ تمام تکالیف بھی دور فرما دیں جن میں وہ مبتلا تھے اور ان کے اہل و عیال اور ان کے خدم و حشم بھی ان کو از سر نو عطا فرمائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت ایوبؑ نے اپنی دعا میں صرف اپنی تکالیف کی طرف اشارہ فرمایا، آل و اولاد اور مال و اسباب کے لیے کسی تمنا کا اظہار نہیں کیا۔ وہ جن حالات میں مبتلا تھے ان میں ان کے لیے یہی بڑی چیز تھی کہ ان کے دکھ کا ازالہ ہو جائے، اس سے زیادہ کے لیے ارمان کرنے کی کہاں گنجائش تھی! لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو وہ بھی دیا جو انھوں نے مانگا اور وہ بھی دیا جس کا وہ اپنی تواضع کے سبب سے اب اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھ رہے تھے۔

وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس دور آزمائش میں ان کے جو اہل و عیال اور اعزا و اقربا منتشر ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اکٹھا کر دیا، جو وفات پا گئے تھے ان کے نعم البدل بھی دیے اور ان کے متعلقین کے دائرے کو مزید وسیع بھی کر دیا۔

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ۔ یعنی یہ جو کچھ ہوا خاص ہمارے فضل سے ہوا۔ حالات بظاہر بالکل مایوس کن تھے، نہ ایوبؑ اس کی توقع کر سکتے تھے نہ کوئی دوسرا لیکن ہم نے اپنی رحمت سے اپنے بندے ایوبؑ کے لیے سب کچھ کر دیا۔ وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ۔ یعنی یہ ہم نے اس لیے بھی کیا کہ یہ واقعہ ہمارے عبادت گزار بندوں کے لیے ایک یادگار واقعہ ہو کہ ہمارے جو بندے ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں ہمارے ہی ساتھ وابستہ رہتے ہیں ہم اسی طرح ان پر اپنا فضل کرتے ہیں اور کریں گے۔

اسمٰعیلؑ، ادریسؑ، اور ذوالکفل علیہم السلام

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۸۵-۸۶)

حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہما السلام پر سورۂ مریم کی آیات ۵۴-۵۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ ان دونوں نبیوں میں جو وصفی مماثلت ہے اس کی طرف بھی ہم نے وہاں اشارہ کیا ہے۔ یہاں ان کے ساتھ حضرت ذوالکفل کو بھی شامل کر دیا اور ان تینوں ہی حضرات کے باب میں فرمایا کہ 'كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفت صبر ان تینوں ہی حضرات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان میں سے حضرت اسمٰعیلؑ کا صبر تو واضح طور پر معلوم ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ان کے صبر کا ذکر ہے لیکن حضرت ادریسؑ اور حضرت ذوالکفل کی سرگزشت حیات

بالکل پردۂ خفا میں ہے۔ قدیم صحیفوں میں ان ناموں سے ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔ اب یا تو یہ ہوا ہے کہ عربی لب ولہجہ میں یہ نام بالکل بدل گئے ہیں یا قدیم صحیفوں سے ان کے نام غائب ہو گئے صرف قرآن نے ان کو از سر نو زندہ کیا۔ جو شکل بھی ہوئی ہو بہرحال ان دونوں نبیوں کے بارے میں میری ناچیز معلومات میں کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ذوالکفل کو حضرت حزقیل پر منطبق کیا ہے۔ لیکن یہ اسی شکل میں قابل اعتماد ہے جب یہ ثابت ہو سکے کہ حضرت حزقیل اس لقب سے ملقب تھے۔ ان دونوں نبیوں کے نام قرآن ہی کے ذریعہ سے متعارف ہوئے ہیں اور صبر ان کی نمایاں خصوصیت بتائی گئی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ تورات یا قرآن کسی میں بھی جملہ انبیائے کرام کے نام اور حالات مذکور نہیں ہیں۔ تمام انبیائے کرام کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ‌ۖ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝ (۸۷)

ذوالنون علیہ السلام کی لغزش کی نوعیت

'ذوالنون' سے مراد حضرت یونسؑ ہیں۔ قدیم صحیفوں میں ان کا نام یوناہ آیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر ذوالنون (مچھلی والا) کے لقب سے کیا ہے۔ 'نون' مچھلی کو کہتے ہیں۔ چونکہ ان کو مچھلی نے نگل لیا تھا اس وجہ سے ان کو یہ لقب عطا ہوا جس میں مچھلی کے واقعہ کی تلمیح بھی ہے اور ایک قسم کا پیار بھی۔

حضرت یونسؑ اہل نینوا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ نینوا کی آبادی، صحیفۂ یونس کی روایت کے مطابق، ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ قرآن کی سورۂ صافات میں بھی مِائَةِ اَلۡفٍ اَوۡ يَزِيۡدُوۡنَ کے الفاظ آئے ہیں جس سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت یونسؑ نے ایک مدت تک اہل نینوا کو دعوت دی لیکن کسی نے ان کی بات نہیں سنی۔ بالآخر ان پر حق کی حمیت غالب آئی اور قوم کی اس ناقدری و سنگ دلی سے مایوس و آزردہ ہو کر وہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ جب ان پتھروں میں جونک لگنا ممکن نہیں ہے تو کیوں ایسے ناقدروں کے پیچھے اپنا وقت برباد اور ان کی خاطر اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا رکھا جائے! حق کی ناقدری کس مپرسی پر ایک صاحب حق کے اندر یہ جذبہ پیدا ہونا ایک امر فطری ہے لیکن اس جذبہ کے غلبہ میں معاملہ کا ایک دوسرا نہایت اہم پہلو حضرت یونسؑ کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ وہ یہ کہ خدا کے رسول کو اپنی قوم کو کب چھوڑنا چاہیے؟ یہ اس کے اپنے فیصلہ کرنے کی چیز نہیں بلکہ خدا ہی کے فیصلہ کرنے کی ہے۔ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ کب کسی قوم کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے اور کب کسی رسول کے لیے یہ روا ہے کہ وہ اپنی قوم سے اعلانِ براءت کر کے ہجرت کرے اور قوم کو اللہ کے عذاب کے حوالہ کرے۔ حضرات انبیاء کے لیے ہمیشہ یہ سنت الٰہی رہی ہے کہ وہ خدا کے اذن کے بغیر اپنی قوم کو نہ چھوڑیں اگرچہ ان کے سر پر آرے ہی کیوں نہ چلتے رہیں اور اگرچہ ایک شخص بھی ان کی دعوت پر کان دھرنے والا نہ نکلے۔ حضرت یونسؑ حمیت حق کے جوش میں اس سنت الٰہی کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ ایک طویل مدت تک لوگوں کو جگانے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کے بعد بھی جب کوئی ان کی بات کو سننے والا نہیں نکلا تو اب عنداللہ وہ بری الذمہ ہیں، انھیں ایسی ناہنجار قوم کو خدا کے

عذاب کے حوالہ کر کے اس سے الگ ہو جانا چاہیے۔ اپنے کو بری الذمہ سمجھنے کے معنی یہ بھی تھے کہ وہ اپنے اس اقدام پر خدا کی طرف سے کسی گرفت کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا گمان یہ تھا کہ اس طرح وہ اس ابتلاء سے چھوٹ جائیں گے جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں۔

حضرت یونسؑ کا یہ خیال بجائے خود ایک پاکیزہ جذبہ پر مبنی تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو آزمائشیں مقرر کر رکھی ہیں وہ لازماً پوری ہو کے رہتی ہیں۔ وہ قوم سے بیزار ہو کر ایک کشتی میں، جو سفر پر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی، سوار ہو گئے۔ کشتی کچھ منزل طے کرنے کے بعد طوفان میں گھر گئی۔ جب طوفان کسی طرح ٹلتا نظر نہیں آیا تو ملاحوں نے اس زمانے کے عام وہم کے مطابق یہ خیال کیا کہ ہو نہ ہو اس کشتی میں اپنے آقا سے بھاگا ہوا کوئی غلام سوار ہو گیا ہے، جب تک اسے پکڑ کر سمندر کے حوالے نہ کیا جائے گا اس طوفان سے نجات نہیں مل سکتی۔ بالآخر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کشتی میں مفرور غلام کون ہے قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ ڈالنے کی خدمت، جیسا کہ سورۂ صافات میں اشارہ ہے، حضرت یونسؑ ہی کے سپرد ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ تمام اہل کشتی میں لوگوں کو سب سے زیادہ ثقہ آدمی وہی نظر آئے ہوں گے۔ بہرحال قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ حضرت یونسؑ کے نام کا نکلا جس کے نتیجے میں وہ کشتی سے سمندر میں لڑھکا دیے گئے۔ سمندر میں ان کو کسی بڑی مچھلی غالباً وہیل نے نگل لیا لیکن خدا کے رسول کو ہضم کرنا آسان نہیں ہے۔ حضرت یونسؑ نے جب دیکھا کہ مشکلات کی تاریکی سے نکلنے کی جو راہ انھوں نے اختیار کی اس نے ان کو اس سے بھی زیادہ گہری تاریکیوں میں ڈال دیا تو ان کے دل سے وہ زندۂ جاوید دعا نکلی جس کے لیے یہ ضمانت ہے کہ وہ اگر صدق دل سے کی جائے تو کبھی قبولیت سے محروم نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور مچھلی نے ان کو ساحل کی ریت پر اگل دیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے نڈھال جسم کو گرمی اور دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے کدو یا اسی قسم کی کوئی بیل اگا رکھی تھی۔ جس کے نیچے ان کو پناہ ملی۔ جب اس حادثہ سے اوسان بجا ہوئے اور جسم میں کچھ جان آئی تو ان کو پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت ہوئی۔ صحیفۂ یونس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوبارہ انذار کے لیے قدرت نے ایک مؤثر تقریب بھی پیدا کر دی۔ وہ یوں کہ وہ بیل جس کے سایہ نے حضرت یونسؑ کو امان دی تھی، کسی سبب سے دفعتہً سوکھ گئی۔ احسان شناس لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے احسان کی بھی قدر کرتے ہیں۔ حضرت یونسؑ کو اس یادگار بیل کے یوں خشک ہو جانے کا احساس ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کو توجہ دلائی کہ ایک حقیر بیل جس کے لگانے اور پروان چڑھانے پر تم نے کوئی محنت نہیں کی، سوکھ جانے پر تم یوں ملول ہوئے تو غور کرو کہ میں اس عظیم نینوا کو کس طرح اپنے عذاب کے حوالے کر سکتا ہوں جس کو میں نے پیدا کیا، جس کی پرورش کی اور جس کو پروان چڑھایا ہے! جاؤ ان کو پھر دعوت دو، شاید وہ نیکی کی راہ اختیار کریں اور میری رحمت کے مستحق ٹھہریں۔ اس ہدایت کے مطابق حضرت یونسؑ پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے گئے اور ان کی اس دوبارہ دعوت و تذکیر کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ سے لے کر نینوا کے عام باشندے تک سب کانپ اٹھے، سب خدا پر ایمان لائے، بادشاہ

نے شاہی لباس اتار کر ٹاٹ کا پیرہن پہن لیا اور باشندوں کے نام فرمان جاری کیا کہ ہر کوئی اپنی بری راہ سے باز آجائے، روزہ رکھے، خدا کے حضور زاری کرے اور توبہ و انابت کا سر جھکائے!!

حضرت یونسؑ کے واقعہ کی روایت میں چونکہ مفسرین نے بڑا گھپلا کر دیا ہے اس وجہ سے ہم نے اس کی صحیح نوعیت واضح کرنے کے لیے اس کی تفصیل پیش کر دی۔ یہ تفصیل صحیفۂ یونسؑ اور قرآن کی تصریحات و اشارات پر مبنی ہے۔ آگے سورۂ صافات کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت آئے گی۔ اس تفصیل کو پیش نظر رکھ کر اب آیت کے اجزاء پر غور کیجیے۔

قوم کی ناقدری پر غصہ

'اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا'۔ 'مُغَاضِبًا' کا مفعول یہاں بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی اپنی قوم سے ناراض و آزردہ ہو کر وہ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ آزردگی و ناراضگی ظاہر ہے کہ اسی بات پر ہو سکتی ہے کہ انھوں نے متنبہ کرنے کے لیے سارے جتن کر ڈالے لیکن اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی بلکہ حق کی توہین کرتی اور ان کی باتوں کا مذاق اڑاتی رہی۔

حضرت یونسؑ کے اقدام کا ایک مخفی پہلو

'فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ' یعنی وہ سمجھے کہ اس طرح وہ اس مصیبت سے چھوٹ جائیں گے جس میں اس وقت قوم کے ہاتھوں وہ مبتلا ہیں۔ اسی جوشِ غیرت میں ان کو اس بات کی طرف توجہ نہیں ہوئی کہ جس محاذ پر ان کو خدا نے مامور کیا ہے اگر وہ خدا کے حکم کے بغیر اس کو چھوڑیں گے تو خدا ان کو اس سے بھی کسی بڑی آزمائش میں ڈال سکتا ہے۔ اس فقرے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اقدام کے ایک ایسے پہلو پر عکس ڈالا ہے جس پر اگرچہ حضرت یونسؑ کی نظر نہیں پڑی تھی لیکن وہ اس کے اندر مضمر تھا۔ حضرت یونسؑ یہ گمان تو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تو خدا کی گرفت سے باہر ہو جائیں گے۔ البتہ یہ گمان ان کو ہوا ہو گا کہ ان ناہنجاروں سے الگ ہو کر میں اس جنجال سے نکل جاؤں گا جس میں اس وقت ان کی خاطر مبتلا ہوں اور بقیہ زندگی یکسو ہو کر گزاروں گا۔ یہ گمان بجائے خود کوئی معصیت نہیں ہے لیکن رسول، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اللہ تعالیٰ

رسول محاذ پر مامور ایک مجاہد ہے

کی طرف سے محاذ پر مامور ایک مجاہد کی حیثیت رکھتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے سے میدان چھوڑے اگرچہ اس چھوڑنے کا محرک حمیتِ حق کا جذبہ ہی ہو۔ اگر وہ ایسا کرے تو درپردہ اس کے اندر یہ بات مخفی ہے کہ وہ خدا کے ابتلائے سے خود اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ یہ مخفی پہلو حضرت یونسؑ پر واضح نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو کھول دیا تاکہ اس کی سنگینی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ بسا اوقات آدمی ایک اقدام کرتا ہے جو بالکل معصومانہ ہوتا ہے لیکن وہ ایک ایسے گمان کی بھی غمازی کرتا ہے جو غلط ہوتا ہے اور اس کی طرف اس وقت تک توجہ نہیں ہوتی جب تک کوئی دانا اس کی طرف توجہ نہ دلائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت یونسؑ کے اسی گمان کو بے نقاب کیا ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو۔ باطنی اصلاح و تربیت کے معاملہ میں یہی طریقہ حکیمانہ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ تمام انسانیت کے لیے نمونہ ہوتے ہیں اس وجہ سے ان سے کوئی ادنیٰ لغزش بھی صادر ہوتی ہے تو

رب حکیم و علیم اپنے خاص ایکسرے کے ذریعے سے ان کو دکھا دیتا ہے کہ ان کی یہ بات کہاں تک متعدی ہو سکتی ہے اگر اس کا تدارک نہ ہو۔

اس ٹکڑے کی اگر یہ تاویل لی جائے تو یہ عقل و فطرت کے بالکل مطابق بھی ہے، اس سے حضرت یونسؑ پر کوئی الزام بھی عاید نہیں ہوتا اور اس تکلف کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی جو لوگوں نے 'لَنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ' کی تاویل میں لغت سے تجاوز کر کے کیا ہے۔ حالانکہ اس تکلف کے بعد بھی وہ اس مشکل کو حل نہ کر سکے جو اس میں ہے۔

حضرت یونسؑ کی دعا

فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔

یہاں اس واقعہ کی تفصیل حذف کر دی گئی ہے جو حضرت یونسؑ کو کشتی میں پیش آیا۔ صرف اس دعا کا ذکر فرمایا ہے جو مچھلی کے پیٹ اور قعر سمندر کی تاریکیوں کے اندر انھوں نے کی اور جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ اس حذف کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ مقصود یہاں قصہ کی تفصیل نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ رب کریم تاریک سے تاریک حالات کے اندر بھی اپنے بندے کی دعائیں قبول فرماتا اور اس کو بڑی سے بڑی آفت سے نجات دیتا ہے بشرطیکہ بندہ اپنے رب ہی کو ملجا و ماویٰ سمجھے اور اسی سے دعا و فریاد کرے۔

صحیفۂ یونس میں اس دعا کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے۔

"اس نے مچھلی کے پیٹ میں خداوند اپنے خدا سے دعا مانگی اور اس نے اس کی پکار سن لی تھی۔ وہ پاتال کے بطن میں سے چلایا اور اس کی پکار سنی گئی۔" ۲: ۱

'ظُلُمٰت' کا مفہوم

لفظ 'ظُلُمٰت' اس تاریکی کی شدت اور اس کے اطراف کی وسعت اور اس کے ناپیدا کنار ہونے کو ظاہر کر رہا ہے۔ عربی زبان میں جمع کبھی کبھی کسی شے کے اطراف کی وسعت کے اعتبار سے بھی آتی ہے۔ ہم اس کی مثال میں 'مشارق' و 'مغارب' کا حوالہ دے چکے ہیں۔ یہاں اس سے مراد مچھلی کے پیٹ اور پاتال کی گہرائیوں کی تاریکیاں ہیں۔ مقصود اس لفظ سے یہ واضح کرنا ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ خدا کو اپنی بات سنانے کے لیے کسی پبلک پلیٹ فارم یا ریڈیو اور ٹیلی وژن کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے بندوں کی فریاد پاتال کی تاریکیوں اور سمندر کی گہرائیوں سے بھی سنتا اور ان کی فریاد رسی کرتا ہے۔

حضرت یونسؑ کا اعتراف تقصیر

'لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ' یہ حضرت یونسؑ کی دعا ہے۔ اس دعا میں ان کی طرف سے طلب و تمنا کسی چیز کی بھی نہیں ہے۔ صرف اپنی تقصیر کا اعتراف و اظہار ہے۔ اعتراف تقصیر کے بعد انھوں نے اپنے معاملے کو اپنے رب پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو فیصلہ فرمائے وہی حق ہے اور اسی میں حکمت و رحمت ہے اس لیے کہ وہ ہر عیب سے پاک ہے۔ سب سے پہلے خدا ہی کے معبود اور ملجا و ماویٰ ہونے کا اظہار کیا ہے، اس کے بعد اس کو ہر نقص و عیب سے پاک اور منزہ قرار دیا ہے، پھر اپنی تقصیر کا اعتراف فرمایا ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا سرتاسر میری اپنی ہی غلطی کا نتیجہ ہے۔ میں نے خود ہی اپنی جان پر ظلم ڈھایا، میرے رب

نے مجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ (۸۸)

باوجودیکہ حضرت یونسؑ حرفِ مدعا زبان پر نہیں لائے تھے، صرف اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیا تھا لیکن خدائے علام الغیوب جو پا تال کی فریادوں کو سنتا اور دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے، اس نے ان کے تمام غم والم کو دور فرما دیا۔ یہاں غم و الم سے صرف وہی غم والم مراد نہیں ہے جو کشتی والے حادثے کے سبب سے پیش آیا بلکہ وہ غم والم بھی ہے جس کے سبب سے انھوں نے اپنی قوم کو چھوڑا تھا۔ قرآن میں دوسری جگہ اس بات کی تصریح ہے کہ اس حادثہ کے بعد جب انھوں نے از سر نو اپنی قوم کو دعوت دی تو ان کی پوری قوم ایمان لائی اور جو عذاب ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا اس سے خدا نے اس کو نجات دی۔

ایک ٹکڑا سرگزشت کو مطابق حال بنانے کے لیے

وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ۔ یہ ٹکڑا اس سرگزشت کو مطابق حال بنانے کے لیے ہے۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات کے سنانے سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو یہ اطمینان دلانا ہے کہ حالات کتنے ہی تاریک اور مایوس کن ہوں لیکن دل برداشتہ نہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ تمھاری دعاؤں اور فریادوں کو جانتا اور سنتا ہے۔ وہ اپنے باایمان بندوں کو اسی طرح ہر غم والم سے نجات دیتا ہے جس طرح اس نے یونسؑ کو نجات دی۔ ایک دن آئے گا کہ یہ ساری تاریکیاں، جن میں تم گھرے ہوئے ہو، کافور ہو جائیں گی، حق کا بول بالا ہوگا اور تمھاری قوم ایمان کے نور سے منور ہو جائے گی۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ (۸۹)

حضرت زکریاؑ کی دعا کی قبولیت

حضرت زکریاؑ کی سرگزشت تفصیل کے ساتھ سورۂ مریم میں گزر چکی ہے۔ انھوں نے بھی بظاہر نہایت مایوس کن حالات میں اپنے رب سے دعا کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ظاہری حالات کے بالکل خلاف ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ سورۂ مریمؑ کی تفسیر میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ان کی بیوی بانجھ تھیں اور وہ خود بڑھاپے کی آخری منزل کو پہنچ چکے تھے۔ اعزا و اقربا سب نااہل اور دین سے بے پروا تھے۔ حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ آلِ یعقوبؑ کے جس دینی ورثہ کے وہ وارث ہیں خاندان میں اس کا کوئی اہل نہیں پیدا ہوا اور خود ان کا [illegible] آخر اب سر پر آ پہنچا۔ اس پریشانی میں انھوں نے دعا فرمائی کہ اے رب تو مجھے تنہا نہ چھوڑ بلکہ کوئی ایسا وارث عطا فرما جو میری اور آلِ یعقوبؑ کی دینی روایات کا حامل بن سکے۔

وَاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ۔ یعنی وارث کے لیے یہ دعا جو میں کر رہا ہوں اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ میرا کوئی وارث نہ ہوا تو تیرے دین کا کوئی حامل نہیں رہے گا۔ تیرا کوئی کام میرے یا میرے خاندان کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے تو اپنے دین کا بہترین وارث خود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ دعا جو کر رہا ہوں صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ تیرے دین کی خدمت کی جو سعادت اس خاندان کو، تیرے فضل سے حاصل رہی ہے اس سے یہ خاندان محروم نہ رہ جائے۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ تو جس کو چاہے گا اس خدمت کے لیے اٹھا کھڑا کرے گا، تو کسی کا محتاج

نہیں ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ (۹۰)

حضرت زکریاؑ کی دعا ایک اعلیٰ دینی مقصد کے لیے تھی

حضرت زکریاؑ کی دعا ایک نہایت اعلیٰ دینی مقصد کے لیے تھی۔ انھیں اولاد کی نہیں بلکہ دین کے ایک خدمت گزار کی تمنا تھی۔ وہ جس میراث کے حامل تھے وہ مال و جائداد کی میراث نہیں بلکہ آل یعقوبؑ کے دین کی میراث تھی اور وہ چاہتے تھے کہ یہ مقدس امانت محفوظ رہے اس وجہ سے ان کی دعا درخورِ قبول ٹھہری۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بانجھ بیوی کو اولاد کے قابل بنا دیا اور ان کو حضرت یحییٰؑ جیسا نامور فرزند عطا فرمایا۔

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ۔ فرمایا کہ بالکل ناموافق و نامساعد حالات کے اندر ان کی یہ دعا اس لیے درخورِ قبول ٹھہری کہ یہ لوگ دنیا کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والے نہیں بلکہ بھلائیوں اور نیکیوں کی راہ میں سبقت کرنے والے تھے۔ 'إِنَّهُمْ' میں ضمیر جمع حضرت زکریاؑ کے خاص اہل بیت کے لیے ہے۔ ان کے بنی اعمام تو، جیسا کہ سورۂ مریم سے واضح ہو چکا ہے، دین سے غافل لوگ تھے لیکن خاص حضرت زکریاؑ سے وابستہ لوگ دین دار تھے۔ ان لوگوں کے اندر تنافس فی الدنیا کا روگ نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ مسابقت الی الخیر کی وہ روح باقی تھی جو آل یعقوبؑ کی امتیازی خصوصیت تھی۔ حضرت یحییٰؑ کی ولادت سے اس روح کو ایک تازہ دم قالب حاصل ہو گیا۔

ان کی دوسری صفت یہ بتائی ہے کہ 'يَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا'۔ وہ امید و بیم ہر حال میں اپنے رب ہی کو پکارتے تھے۔ قرآن میں دنیا داروں اور مشرکوں کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ جب ان کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تب تو وہ بڑی لمبی لمبی دعائیں ہم سے کرتے اور عہد باندھتے ہیں کہ اگر ان کی یہ ضرورت پوری ہو گئی تو ہمیشہ خدا کے وفادار بندے بن کر رہیں گے لیکن جب خدا ان کی ضرورت پوری کر دیتا ہے تو گن اپنی تدبیر اور دوسروں کی کارسازی کے گاتے ہیں اور خدا کو اس طرح بھول جاتے ہیں گویا اس کو کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ فرمایا کہ ان لوگوں کا کردار منافقانہ اور مشرکانہ نہیں تھا بلکہ وہ طمع اور خوف، امید اور بیم ہر حال میں خدا ہی کو پکارنے والے تھے۔ 'وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ' یعنی یہ نہیں تھا کہ نعمت ملے تو اکڑنے لگیں اور چھن جائے تو مایوس اور ناشکرے بن کر رہ جائیں بلکہ ہر حال میں وہ خدا ہی کے آگے سرفگندہ رہنے والے تھے۔

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ (۹۱)

یہ حضرت مریمؑ کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ سورۂ مریم میں گزر چکا ہے۔ یہاں ان کا نام نہیں لیا ہے اس لیے کہ ان کی جو صفت مذکور ہوئی ہے وہ ایک ایسی صفت ہے جس کا موصوف و مصداق ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ اس صفت کے ساتھ ان کے اختصاص کی دلیل ہے۔

أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کا مفہوم

'أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا' کو اس کے عام لغوی مفہوم میں نہ لیجیے۔ 'اَحْصَنَ فَرْجَہٗ' عربی زبان میں اسی طرح کا ایک محاورہ ہے جس طرح 'سد الثلمة'، 'دَقّ الفتق'، 'جبر الکسر' وغیرہ بہت سے محاورات ہیں۔ ان محاورات میں الفاظ کے لغوی مفہوم کا اعتبار نہیں بلکہ اس مفہوم کا اعتبار ہوتا ہے جس کے لیے یہ استعمال ہوتے ہیں۔ 'اَحْصَنَ فَرْجَہٗ' کا مفہوم تحصن من السوء اس نے اپنے آپ کو ہر برائی سے پاک رکھا یا خطرہ سے محفوظ رکھا۔ یہ محاورہ عورتوں کے لیے جس طرح استعمال ہوا ہے اسی طرح مردوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ 'فرج' کے معنی لغت عرب میں اصلاً ہیں بھی 'موضع مخافة' یعنی اندیشہ کی جگہ کے۔ میں اس کے شواہد پیش کر سکتا ہوں لیکن ان سے مستفید صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کی کلام عرب پر نظر ہو۔ کتاب کے عام قارئین ان سے استفادہ نہیں کر سکیں گے۔

حضرت مسیحؑ کے روح ہونے کا مفہوم

'فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا' یعنی خاص اپنے کلمۂ 'کُن' کے ذریعہ سے ان کے اندر ایک مولود کی روح ڈال دی۔ حضرت مسیحؑ کا استقرار بطن مادر میں چونکہ عالم اسباب کے عام ضابطہ سے الگ صرف کلمۂ 'کُن' کے ذریعہ سے ہوا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی ڈالی ہوئی روح سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی اعتبار سے ان کو اور ان کی والدہ کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی بھی قرار دیا گیا ہے۔ ہم سورۂ مریم کی تفسیر میں ان کے نشانی ہونے کے پہلو واضح کر چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے، جیسا کہ انجیلوں سے واضح ہے، خود بھی اپنی نسبت یہی فرمایا ہے جو قرآن بیان کر رہا ہے، یہ محض پال کے پیرو عیسائیوں نے اپنی تحریفات کے ذریعہ سے بات کا بتنگڑ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان تحریفات پر آل عمران کی تفسیر میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (۹۲)

انبیاء کی سرگزشت خلاصۂ بحث

تمام انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد اب بطور خلاصۂ بحث کے فرمایا کہ ان تمام کی دعوت اور ان کا دین ابتداء سے انتہاء تک ایک ہی ہے اور یہ سب انبیاء ایک ہی ملت و امت ہیں اور میں ہی تمہارا رب ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انبیاء کے درمیان کسی نے تفریق کی ہے، ان کے لائے ہوئے دین میں کسی نے بدعتیں ایجاد کی ہیں اور خدا کی توحید میں کسی نے شرک کی ملاوٹ کی ہے تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔ ان نبیوں کا دامن ان چیزوں سے پاک ہے۔

وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ (۹۳)

خدا کے دین میں تفریق پیدا کرنے والوں کو دھمکی

یہ ان لوگوں کو دھمکی ہے جنھوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے اس دین میں بدعتیں پیدا کر کے اس کو پارہ پارہ کیا اور اب ہر گروہ اپنی اپنی ڈگر کی حمایت میں انبیاء کے لائے ہوئے اس مشترک دین کی مخالفت کر رہا ہے جو قرآن اور خدا کے آخری رسول کے ذریعہ سے ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ تم ان مخالفت کرنے والوں کی کوئی پروا نہ کرو، ان سب کی واپسی بہرحال ہماری ہی طرف ہونی ہے کوئی اور مرجع بننے والا نہیں ہے ہم سب کے آگے اس کا کچا چٹھا رکھ دیں گے۔ کسی کی کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔

فَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ (۹۴)

یعنی سب کی واپسی ہماری ہی طرف ہوگی تو جو عمل صالح کریں گے، بشرطیکہ وہ ایمان اور توحید پر قائم ہوں، وہ اطمینان رکھیں کہ ان کی سعی رائگاں نہیں جائے گی۔ ہم ان کو بھرپور صلہ دیں گے۔ ان کی ایک ایک نیکی کو ہم نوٹ کر رکھیں گے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ ان کا کوئی عمل ہماری یادداشت سے رہ جائے۔ بس یہ شرط ہے کہ وہ ایمان کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔ ہم اس حقیقت کی وضاحت بار بار کر چکے ہیں کہ خدا کے ہاں عمل صرف وہی مقبول ہے جو ایمان کے ساتھ صرف خدائے وحدہ لاشریک لہ کے لیے کیا جائے۔ جو عمل خدا کے لیے نہ کیا جائے اس کی خدا کے ہاں کوڑی کے برابر بھی قیمت نہیں ہے اگرچہ وہ ہجرت و جہاد ہی کیوں نہ ہو۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۹۵-۱۱۲

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ انذار کے اسی مضمون کی، جس سے سورہ کا آغاز فرمایا تھا، ایک نئے اسلوب سے آخر میں پھر یاددہانی فرما دی ہے اور اس خاتمہ کی تمہید بھی بعینہٖ اسی لفظ سے شروع کی ہے جس لفظ سے سورہ کا آغاز ہوا ہے۔ شروع میں فرمایا تھا۔ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ۔ یہاں جب اسی مضمون کو ازسرِنو لیا تو فرمایا وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ۔ اس طرح قرآن اپنے نظم کی طرف خود رہنمائی کر دیتا ہے۔ اکثر سورتوں میں یہ اسلوب موجود ہے۔ استاذ امامؒ اس اسلوب کو عود علی البدء سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سورہ کے مطالب کے پھیلاؤ میں اگر اصل مدعا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو وہ ازسرِنو مخاطب کے ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۵-۱۱۲ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٩٥﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ
يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ
الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ
كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٩٧﴾ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿٩٨﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً
مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٩٩﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا
يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا
مُبْعَدُوْنَ ﴿١٠١﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ

خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا
يَوْمُكُمُ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ السِّجِلِّ
لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا
فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ
يَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾
وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ
اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ
اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾
اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِیْ
لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ
وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۷ النصف

ترجمۂ آیات ۹۵-۱۱۲

اور جس بستی والوں کے لیے ہم نے ہلاکت مقدر کر رکھی ہے ان کے لیے حرام ہے کہ وہ رجوع کریں۔ وہ رجوع کرنے والے نہیں بنیں گے یہاں تک کہ وہ وقت آ جائے جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں۔ ۹۵-۹۶

اور قیامت کا شدنی وعدہ قریب آ گیا ہے تو ناگہاں ان لوگوں کی نگاہیں ٹنگی رہ جائیں گی جنھوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ وہ پکاریں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم اس سے غفلت میں پڑے رہے۔ بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! ۹۷

اب تم اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے رہے ہو جہنم کے ایندھن بنو گے، تم لازماً اس میں

داخل ہو کر رہو گے ۔ اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں نہ پڑتے اور اب سب اسی میں ہمیشہ رہیں گے ۔ اس میں ان پوجنے والوں کے لیے چلّانا ہو گا اور ان کے معبودوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ کچھ نہیں سنیں گے ۔ ۹۸-۱۰۰

البتہ جن کے لیے اچھے انجام کا ہماری جانب سے وعدہ ہو چکا ہے وہ اس سے دور رکھے جائیں گے ۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے ۔ اور وہ اپنے من بھاتے عیش میں ہمیشہ رہیں گے ۔ ان کو اس دن کی بڑی گھبراہٹ کا غم لاحق نہ ہو گا اور فرشتے ان کا خیر مقدم کریں گے ، کہیں گے ، یہ ہے آپ لوگوں کا وہ دن جس کا آپ لوگوں سے وعدہ کیا جا رہا تھا ۔ ۱۰۱-۱۰۳

اس دن کا خیال کرو جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح طُومار میں اوراق کو لپیٹتے ہیں ۔ جس طرح ہم نے پہلی خلقت کا آغاز کیا اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے ۔ یہ ہم پر ایک حتمی وعدہ ہے ۔ بے شک ہم یہ کر کے رہیں گے ۔ ۱۰۴

اور ہم نے زبور میں موعظت کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے ۔ بے شک اس کے اندر ہمارے عبادت گزار بندوں کے لیے بڑی آگاہی ہے ۔ اور ہم نے تم کو تو بس اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے ۔ کہہ دو کہ میری طرف تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا تم اپنے کو اسی کے حوالہ کرتے ہو ۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ میں نے تم سب کو یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے ، اب میں یہ نہیں جانتا کہ وہ وقت قریب ہے یا دور ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے ۔ بے شک وہی جانتا ہے کھلی بات کو بھی اور اس بات کو بھی جس کو تم چھپاتے ہو اور مجھے نہیں معلوم ، شاید یہ فرصت تمھارے لیے ایک آزمائش اور فائدہ اٹھا لینے کی ایک مہلت ہو ۔ ۱۰۵-۱۱۱

اس نے دعا کی ، اے میرے پروردگار ! حق کے ساتھ فیصلہ کر دے ! اور ہمارا رب رحمان ہی

ہے جس سے مدد کی درخواست ہے ان باتوں کے مقابل میں جو تم بیان کرتے ہو! ۱۱۲

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (۹۵)

حذف کا ایک اسلوب اور فعل فیصلۂ فعل کے مفہوم میں

اس آیت میں عربی کے معروف اسلوب کے مطابق ایک جزو حذف ہے جس کی وضاحت اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ کے جملہ نے کر دی ہے۔ پوری بات کو کھول دیجیے تو یوں ہوگی وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنْ یَّرْجِعُوْا اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اور اس میں فعل 'اَھْلَکْنَا' فیصلۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔ بسا اوقات جب کسی امر کی قطعیت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ واقع ہو چکا۔ رجوع کے معنی یہاں باطل سے حق کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔

اشرارِ قریش سے اعراض کی ہدایت

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اشرارِ قریش کے زیادہ درپے ہونے سے روکا گیا ہے کہ اب یہ لوگ سنتِ الٰہی کی زد میں آ چکے ہیں۔ جس طرح پچھلی قومیں جو ہلاک ہوئیں، لاکھ جتن کرنے کے باوجود ایمان نہیں لائیں، اسی طرح اب ان لوگوں کے لیے ایمان میں داخل ہونا حرام ہو چکا ہے اور ان کی ہٹ دھرمی کی پاداش میں ان کے لیے عذابِ الٰہی مقدر ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان لوگوں کا زیادہ غم نہ کھاؤ، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۶ میں یوں بیان ہوا ہے۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَھُمْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا اَفَھُمْ یُؤْمِنُوْنَ۔	ان سے پہلے کوئی قوم بھی جو ہلاکت کی زد میں آئی ایمان لانے والی نہ بنی تو کیا ان سے توقع رکھتے ہو کہ یہ ایمان لانے والے بنیں گے!

حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ (۹۶)

یاجوج و ماجوج کا غلبہ آثارِ قیامت میں سے ہے

یاجوج ماجوج پر مفصل بحث سورۂ کہف کی آیات ۹۸-۹۹ کے تحت گزر چکی ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ قیامت کے وقت یاجوج ماجوج ہر طرف سے پل پڑیں گے اور ساری دنیا فساد سے بھر جائے گی۔ اس کی صورت کیا ہوگی؟ یہ چیز متشابہات میں سے ہے اور متشابہات کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔ یہاں مقصود اس کے ذکر سے صرف یہ دکھانا ہے کہ آج جو لوگ قرآن پر ایمان لانے کے لیے مختلف قسم کی نشانیوں اور عذاب کے مشاہدہ کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کے پیچھے اب پیغمبر کو اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ یہ لوگ عقل و فطرت کے ان دلائل سے رام ہونے والے نہیں ہیں جو قرآن ان کے سامنے پیش کر رہا ہے بلکہ یہ اسی وقت ایمان لائیں گے جب قیامت ان کے سر پر آن کھڑی ہوگی اور جس وقت ایمان لانا یا نہ لانا دونوں یکساں ہوگا۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۹۷)

قیامت سر پر کھڑی ہے

یعنی یہ جس وعدۂ قیامت کو بہت دور کی بات سمجھ رہے ہیں وہ بہت دور نہیں بلکہ اس کے ظہور کا وقت بہت قریب آچکا ہے۔ سورۂ معارج میں فرمایا ہے 'اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا' (وہ اس کو بہت دور خیال کر رہے ہیں لیکن ہم اس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں) انسان ہر چیز کو اپنے چھوٹے پیمانوں سے ناپتا ہے اس وجہ سے اسے قیامت بہت دور معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ خدائی دنوں کے اعتبار سے وہ بالکل سر پر کھڑی ہے۔ یہی مضمون اس سورہ کی پہلی آیت میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس کے بعض دوسرے پہلو بھی واضح کیے ہیں۔ ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

'فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' یعنی وہ اچانک آدھمکے گی اور اس کا منظر ایسا ہولناک ہوگا کہ آج جو لوگ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں ان کی آنکھیں ٹنگی رہ جائیں گی۔ یہ خوف اور دہشت زدگی کی تصویر ہے۔ انسان جب کوئی ہولناک چیز اچانک دیکھتا ہے تو ہکا بکا ہو کر اس کو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

قیامت کے معاملہ میں اصل حجاب

'يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ' یہ اس وقت کی ان کی زبانِ حال کی تعبیر ہے اس وجہ سے یہاں 'قَالُوْا' حذف کر دیا۔ فرمایا کہ وہ اس وقت خود بول اٹھیں گے کہ بیشک ہم خود ایک شدنی حقیقت سے غفلت میں پڑے رہے۔ 'بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ' یعنی یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہم کو کوئی اس غفلت سے بیدار کرنے والا نہ آیا ہو۔ اللہ نے بیدار کرنے والے بھی بھیجے جنھوں نے ہمیں جگانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا لیکن ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے کہ ان کی تنبیہات کا مذاق اڑاتے رہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیامت کے معاملہ میں اصل حجاب یہ نہیں ہے کہ اس کی کوئی مسکت دلیل نہیں ہے بلکہ اصلی حجاب انسان کی غفلت ہے۔ وہ ایک حقیقت کو، اس کے دلائل کی وضاحت کے باوجود، ماننا نہیں چاہتا اس لیے کہ اس کو ماننا اس کی خواہشوں کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں واحد چیز جو اس کو سہارا دیتی ہے وہ اس کی غفلت ہے۔ وہ غفلت میں پڑا ہوا اس کے لیے کسی اہتمام کو برابر ٹالتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ اس کے سر پر آدھمکے گی۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (۹۸)

اصنام اور ان کے پجاری دونوں جہنم میں

یعنی اس وقت ان کا یہ اعتراف ان کے لیے کچھ کارآمد نہ ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ تم اور تمھارے یہ تمام اصنام و احجار، جن کو تم معبود بنا کے پوجتے رہے ہو سب جہنم کا ایندھن بنو گے۔ 'اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ' یعنی اب روؤ یا فریاد کرو، تمھیں بہر حال ہلاکت کے اس گھاٹ پر اترنا ہے۔ اب اس سے مفر نہیں ہے۔

'وَمَا تَعْبُدُوْنَ' میں 'مَا' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ اصنام و احجار ہیں جن کی مشرکین عرب پرستش کرتے تھے۔ 'مَا' کا استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے معروف ہے۔ ان کو جہنم کا ایندھن بنانے سے مقصود ظاہر ہے کہ ان پتھروں کو سزا دینا نہیں بلکہ ان کے پجاریوں کو یہ دکھانا ہے کہ جن کو معبود سمجھ کر ان کے آگے وہ ڈنڈوت کرتے رہے ہیں ان کی یہاں کیا گت بن رہی ہے۔ مشرکین عرب جن فرشتوں یا جنوں کی پوجا کرتے تھے مثلاً لات، عزیٰ، منات اور ہبل وغیرہ اول تو یہ ان کے اپنے رکھے ہوئے فرضی نام تھے جن کا کوئی مسمّی سرے سے موجود ہی نہیں تھا پھر ان کی پوجا بھی وہ پتھروں کی مورتوں ہی کی شکل میں کرتے تھے۔ بعض مشرک قومیں جو انبیاء اور صالحین کی پرستش کرتی ہیں ان کا انجام یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ ان کے معاملات کی تفصیل قرآن کے دوسرے مقامات میں آئی ہے۔ مثلاً عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے خلاف سیدنا مسیح قیامت کے دن جو گواہی دیں گے اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح دوسرے انبیاء و صالحین بھی قیامت کے دن اپنے پجاریوں سے اعلانِ برارت کر دیں گے کہ ہمیں کیا خبر کہ تم ہماری پوجا کرتے رہے ہو! اگر تم نے یہ حماقت کی ہے تو اب اس کی سزا بھگتو! ہم نے تم سے کب کہا تھا کہ تم ہماری عبادت کرو۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۹۹)

اصنام کو جہنم میں ڈالنے کا مقصد

یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے یہ اصنام و احجار جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ ان کو جہنم میں ڈالنے سے اصل مقصود ان کے پوجنے والوں کو یہ دکھانا ہے کہ اگر یہ معبود ہوتے تو ان کی یہ درگت نہ بنتی! یہ ان کی تذلیل کی آخری حد ہوگی کہ جو ان کی تمام امیدوں کا آخری مرجع تھے ان کو وہ اپنی ہی طرح بے بس و مجبور اور گرفتارِ عذاب پائیں گے۔ 'وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ' یعنی یہ عابد و معبود سب ہمیشہ ہمیش کے لیے اسی جہنم میں اکٹھے رہیں گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ اس بات کا پہلا ٹکڑا تو ان کو مخاطب کر کے کہا جائے گا اور دوسرا ٹکڑا ان کے اس انجام ابدی کا اعلان ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ (۱۰۰)

اگر التباس نہ ہو تو انتشارِ ضمیر عیب نہیں بلکہ ایجاز ہے

'زَفِيْرٌ' کے معنی آہ و فریاد اور چیخنے چلانے کے ہیں۔ اور ضمیر 'هُمْ' پہلے جملے میں میرے نزدیک پجاریوں کے لیے ہے اور دوسرے جملے میں ان کے اصنام و احجار کے لیے۔ اگرچہ اس صورت میں بظاہر انتشارِ ضمیر ہے لیکن انتشار ضمیر، جیسا کہ ہم جگہ جگہ مثالوں کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں، عیب صرف اس صورت میں ہے جب مرجع میں التباس کا اندیشہ ہو۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہو، مرجع کے تعین کے لیے واضح قرینہ موجود ہو، تو یہ عیب نہیں بلکہ ایجاز کے پہلو سے یہ کلام کا حسن ہے۔ یہاں التباس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ پجاری تو جہنم میں چیختے چلاتے اور آہ و فریاد کرتے ہوں گے اور ان بے حس پتھروں کو، جن کو انھوں نے معبود بنا کر پوجا، خبر بھی نہ ہوگی کہ کوئی آہ و فریاد کر رہا ہے اور ان سے مدد کا طالب ہے۔ یہ مضمون قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے کہ جہنمی مدد کے لیے فریاد کریں گے لیکن کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسرے

ٹکڑے میں ضمیر اور فعل دونوں وہ استعمال ہوئے ہیں جو ذی عقل ہستیوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو ان کا استعمال اصنام و احجار کے لیے کس طرح موزوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضمیر اور فعل پجاریوں کے تصور کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ ان پتھروں کو وہ چونکہ اپنا فریادرس اور معبود خیال کرتے تھے اس وجہ سے یہ اسلوب بیان اختیار فرمایا گیا۔ اس کی مثالیں کلام عرب اور قرآن مجید میں بہت ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ (۱۰۱)

اچھے انجام والوں کے لیے بشارت

'حُسْنٰی' کا موصوف یہاں محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے لیے اچھے انجام کا وعدہ ہماری طرف سے پہلے سے ہو چکا ہے وہ لوگ البتہ اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ اس اچھے انجام کا وعدہ آیت ۹۴ میں گزر چکا ہے۔ وہاں فرمایا ہے کہ 'جو لوگ ایمان پر قائم رہتے ہوئے عمل صالح کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کی ناقدری نہیں کرے گا بلکہ ان کے ایک ایک عمل کو وہ نوٹ کیے ہوئے ہے اور ان کے ہر عمل کا ان کو بھرپور صلہ ملنے والا ہے۔

لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ۖ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ (۱۰۲)

ایک غلط خیال کی تردید

یعنی وہ اس جہنم سے اتنے دور رکھے جائیں گے کہ ان کو اس کی آہٹ بھی سنائی نہیں دے گی۔ اس آیت سے ان لوگوں کے خیال کی نہایت واضح الفاظ میں تردید ہو رہی ہے جو سورۂ مریم کی آیت 'وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا' کے خطاب کو صحیح طور پر معین نہ کرنے کے سبب سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ العیاذ باللہ ایک مرتبہ تمام اہل ایمان کو بھی جہنم سے گزرنا پڑے گا۔ ہم نے سورۂ مریم کی آیت مذکورہ کے خطاب کو متعین کر دیا ہے اور آیت زیر بحث کی روشنی میں مفسرین کے اس عام خیال کی تردید کر کے دونوں آیتوں کی باہمی موافقت واضح کر دی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

جنت کے اندر تنوع کی آزادی

'وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ'۔ عیش، جنت ہی کا عیش سہی، اگر انسان کو اس کے اندر اپنے حسب منشا تغیر و تبدل کی آزادی حاصل نہ ہو تو اس کی یکسانی اس کو افسردہ کر دے گی اور وہ اس سے اکتا کر جی بہلانے کے لیے کسی دوسرے ماحول کا طالب ہو گا۔ انسان ایک ذی ارادہ و امتیاز ہستی ہے اس وجہ سے بڑے سے بڑے عیش کو بھی وہ اپنی ہی شرائط پر پسند کرتا ہے۔ اس کی فطرت کے اس تقاضے کی رعایت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کے لیے جنت بھی ایسی بنائی ہے جس میں وہ اپنی پسند کے مطابق جس طرح کا تنوع چاہیں گے پیدا کر لیں گے۔ ان کی کسی خواہش میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی حائل نہیں ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ عیش دوام اور اس کے اندر حسب منشا تنوع اور رنگا رنگی پیدا کرنے کی یہ آزادی اس دنیا میں ہفت اقلیم کے کسی شاہنشاہ کو بھی نہ حاصل ہوئی، نہ حاصل ہو سکتی۔ اسی حقیقت کو دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے کہ 'لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا' (اہل جنت اپنی جنت سے ٹلنے کا نام بھی نہیں لیں گے)

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ (۱۰۳)

ابدی بادشاہی کی بشارت

'فَزَعِ اکبر' سے مراد وہ عظیم ہلچل اور گھبراہٹ ہے جو نفخ صور کے بعد تمام کائنات میں برپا ہو گی اور جس کی ہولناک تصویر قرآن نے جگہ جگہ کھینچی ہے۔ خصوصاً آخری گروپ کی سورتوں میں تو قرآن کے اعجاز بیان نے اس طرح اس کو مصور کر دیا ہے کہ انسان دیدۂ بینا رکھتا ہو تو اس کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ اوپر آیت ۹۷ اسی کی طرف فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے الفاظ سے اشارہ کر رہی ہے۔ فرمایا کہ یہ عظیم ہلچل کا دن ہمارے باایمان بندوں کے لیے ذرا بھی اضطراب کا باعث نہیں بنے گا بلکہ اس دن ہمارے فرشتے اہلاً و سہلاً اور مرحبا کے نعروں سے ان کا استقبال کریں گے اور ان کو بشارت دیں گے کہ ابدی کامرانیوں کے جس مبارک دن کا، نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے، آپ لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا وہ آگیا۔ اب آپ لوگوں کو ابدی بادشاہی مبارک ہو!!

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۱۰۴)

'سجل' اور 'کتب' کا مفہوم

'سجل' اس دفتر یا طومار یا فائل کو کہتے ہیں جس میں لکھے ہوئے اوراق محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ 'کتب' یہاں اوراق نوشتہ کے معنی میں ہے۔ 'اَوَّلَ خَلْقٍ' ظرف کے محل میں ہے۔ اسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے قرآن میں بعض جگہ 'اَوَّلَ مَرَّةٍ' کا لفظ بھی آیا ہے۔

نئے آسمان اور نئی زمین

مطلب یہ کہ یہ سب کچھ اس دن ہو گا جس دن ہم اس پھیلے ہوئے آسمان کی بساط اس طرح لپیٹ کر رکھ دیں گے جس طرح طوماروں میں کاغذات لپیٹ کر رکھ دیے جاتے ہیں اور جس طرح ہم نے پہلی بار آسمان و زمین پیدا کیے اسی طرح ان کی جگہ نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ، نئے آسمان و زمین پیدا کریں گے۔ 'وَعْدًا عَلَيْنَا' میں مصدر تاکید کے لیے ہے۔ یعنی یہ ہمارے ذمہ ایک حتمی وعدہ ہے۔ ہم نے اپنے نیک بندوں سے، جیسا کہ اوپر والی آیت کے الفاظ 'كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ' میں اشارہ ہے، اس کا قطعی وعدہ کر رکھا ہے جس کا ایفا ہماری ذمہ داری ہے۔ 'اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ' یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں جو ہم کر نہیں سکیں گے یا نہیں کریں گے۔ یہ ہم ضرور کریں گے، اس کا ہم نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا ہے اور یہ ہمارے لیے ایک نہایت آسان بات ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (۱۰۵)

زمین کے وارث صالحین ہوں گے

اس آیت میں زبور کا حوالہ ہے۔ زبور میں یہ بات یوں تو جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ زمین کے وارث خدا کے نیک بندے ہی ہوں گے لیکن باب ۳۷ تو پورے کا پورا گویا صرف اسی ایک حقیقت کی وضاحت کے لیے مخصوص ہے اس وجہ سے ہم یہ پورا باب یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ قرآن کے حوالہ کی صحت و صداقت بھی واضح ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ زمین کی وراثت سے یہاں کس زمین کی وراثت مراد ہے، نیز 'مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ' کا صحیح مفہوم بھی متعین ہو سکے کہ 'ذکر' سے یہاں کس چیز کی طرف اشارہ ہے۔ پہلے ہم زبور سے حضرت داؤد کا

مزمور نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی ان باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جو آیت زیر بحث کی وضاحت کے لیے خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

زبور کا باب ۳۷

"تو بدکرداروں کے سبب سے بیزار نہ ہو
اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر
کیونکہ وہ گھاس کی طرح جلد کاٹ ڈالے جائیں گے
اور سبزہ کی طرح مرجھا جائیں گے۔
خداوند پر توکل کر اور نیکی کر۔
ملک میں آباد رہ اور اس کی وفاداری سے پرورش پا۔
خداوند میں مسرور رہ
اور وہ تیرے دل کی مرادیں پوری کرے گا۔
اپنی راہ خداوند پر چھوڑ دے
اور اس پر توکل کر۔ وہی سب کچھ کرے گا۔
وہ تیری راست بازی کو نور کی طرح
اور تیرے حق کو دوپہر کی طرح روشن کرے گا۔
خداوند میں مطمئن رہ اور صبر سے اس کی آس رکھ۔
اس آدمی کے سبب سے جو اپنی راہ میں کامیاب ہوتا
اور برے منصوبوں کو انجام دیتا ہے بیزار نہ ہو۔
قہر سے باز آ اور غضب کو چھوڑ دے۔
بیزار نہ ہو۔ اس سے برائی ہی نکلتی ہے۔
کیوں کہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے
لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہوں گے۔
کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا۔
تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہوگا۔
لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے۔
اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے۔
شریر راست باز کے خلاف بندشیں باندھتا ہے
اور اس پر دانت پیستا ہے۔

خداوند اس پر ہنسے گا
کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کا دن آتا ہے۔
شریروں نے تلوار نکالی اور کمان کھینچی ہے
تاکہ غریب اور محتاج کو گرا دیں۔
اور راست رو کو قتل کریں۔
ان کی تلوار ان ہی کے دل کو چھیدے گی
اور ان کی کمانیں توڑی جائیں گی۔
صادق کا تھوڑا سا مال
بہت سے شریروں کی دولت سے بہتر ہے
کیونکہ شریروں کے بازو توڑے جائیں گے۔
لیکن خداوند صادقوں کو سنبھالتا ہے۔
کامل لوگوں کے ایام کو خدا جانتا ہے۔
ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی۔
وہ آفت کے وقت شرمندہ نہ ہوں گے
اور کال کے دنوں میں آسودہ رہیں گے۔
لیکن شریر ہلاک ہوں گے۔
خداوند کے دشمن چراگاہوں کی سرسبزی کی مانند ہوں گے۔
وہ فنا ہو جائیں گے۔ وہ دھوئیں کی طرح جاتے رہیں گے۔
شریر قرض لیتا ہے اور ادا نہیں کرتا:
لیکن صادق رحم کرتا ہے اور دیتا ہے
کیونکہ جن کو وہ برکت دیتا ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے۔
اور جن پر وہ لعنت کرتا ہے وہ کاٹ ڈالے جائیں گے۔
انسان کی روشیں خداوند کریم کی طرف سے قائم ہیں
اور وہ اس کی راہ سے خوش ہے۔
اگر وہ گر بھی جائے تو پڑا نہ رہے گا
کیونکہ خداوند اسے اپنے ہاتھ سے سنبھالتا ہے۔
میں جوان تھا اور اب بوڑھا ہوں

تو بھی میں نے صادق کو بے کس
اور اس کی اولاد کو ٹکڑے مانگتے نہیں دیکھا۔
وہ دن بھر رحم کرتا ہے اور قرض دیتا ہے
اور اس کی اولاد کو برکت ملتی ہے۔
بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر
اور ہمیشہ تک آباد رہ۔
کیونکہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے
اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا۔
وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔
پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔
صادق زمین کے وارث ہوں گے
اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔
صادق کے منہ سے دانائی نکلتی ہے
اور اس کی زبان سے انصاف کی باتیں۔
اس کے خدا کی شریعت اس کے دل میں ہے۔
وہ اپنی روش میں پھسلے گا نہیں۔
شریر صادق کی تاک میں رہتا ہے
اور اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔
خداوند اسے اس کے ہاتھ میں نہیں چھوڑے گا
اور جب اس کی عدالت ہو تو اسے مجرم نہ ٹھہرائے گا۔
خداوند کی آس رکھ اور اسی کی راہ پر چلتا رہ
اور وہ تجھے سرفراز کر کے زمین کا وارث بنائے گا۔

اس مزمور کے بعض نمایاں پہلو

ہمارے نزدیک زبور کے اسی مزمور کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ اس مزمور پر غور کیجیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اس کی نوعیت ایک ترکیب بند کی ہے جس میں پہلے موعظت و نصیحت کی باتیں آتی ہیں پھر بار بار ایک ترجیع یا ٹیپ کے بند کی طرح یہ بات آتی ہے کہ زمین اور ملک کے وارث خدا کے نیک اور متقی بندے ہوں گے۔ یہ اسلوب کلام قرآن کی سورۂ رحمٰن کے اسلوب سے مشابہ ہے جس میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کی ترجیع ہے۔ خط کشیدہ فقروں پر نگاہ ڈالیے تو یہ بات بھی معلوم ہو گی کہ یہاں صالحین و متقین کے لیے زمین کی

جس وراثت کا ذکر ہے اس کے ساتھ یہ بشارت بھی ہے کہ یہ وراثت ابدی ہوگی۔ مثلاً فرمایا ہے "ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی" دوسری جگہ ہے "اور ہمیشہ تک آباد رہ" تیسری جگہ ہے "وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں" چوتھی جگہ نہایت واضح الفاظ میں ہے "اور صادق زمین کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے"[1]

ظاہر ہے کہ یہ ابدی وراثت کی بشارت اس زمین سے متعلق نہیں ہے جس پر ہم اور آپ آباد ہیں۔ اس کی نہ تو کوئی چیز ابدی ہے اور نہ اس کی وراثت صالحین و متقین کے لیے مخصوص ہے بلکہ یہ زمین اور اس کی ہر چیز فانی ہے اور اس میں نیکوں اور بدوں دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک مدت تک کے لیے یکساں مہلت بخشی ہے۔ جس کے بعد یہ آسمان و زمین دونوں فنا ہو جائیں گے اور نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ ایک جہانِ نو پیدا ہوگا جس کی ابدی وراثت صالحین و متقین کو حاصل ہوگی اور اہلِ باطل جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

جہانِ نو کی وراثت صرف صالحین کو حاصل ہوگی

بعینہٖ یہی بات قرآن سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ اوپر کی آیت ۱۰۴ میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن اس آسمان کی بساط لپیٹ کر رکھ دے گا۔ سورۂ ابراہیم آیت ۴۸ میں آسمان و زمین دونوں سے متعلق یہ تصریح ہے کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (اس دن کو نگاہ میں رکھو جس دن زمین دوسری زمین سے اور آسمان دوسرے آسمان سے بدل دیے جائیں گے) اس بدلے ہوئے آسمان و زمین کے اندر بلاشبہ یہ قانون ہوگا کہ ان کی ابدی وراثت و بادشاہی صرف صالحین کو حاصل ہوگی نافرمانوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ یہ بات صرف زبور اور قرآن ہی سے نہیں بلکہ تمام آسمانی صحیفوں اور تمام نبیوں اور رسولوں کی تعلیم سے ثابت ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن نے آیت زیرِ بحث میں زبور کے حوالہ سے واضح فرمایا ہے۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اترے ہوئے نغماتِ الٰہی کا مجموعہ ہے۔ حضرت داؤدؑ، جیسا کہ اسی سورہ میں بیان ہوا ہے، نبی بھی تھے اور اس زمین کے ایک جلیل القدر بادشاہ بھی۔ ایک بادشاہ کی زبان ہی سے یہ اعلان سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا کہ زمین کے حقیقی اور آخری وارث صرف اللہ کے نیک بندے ہی ہوں گے۔ جب ایک صاحبِ جبروت بادشاہ اس حقیقت کی منادی کر گیا ہے تو کسی دوسرے کے لیے اس میں مجالِ سخن کہاں باقی رہی!!

آیت کے اجزاء پر ایک نظر

اس وضاحت کے بعد اب آیت زیرِ بحث کے اجزا پر غور کیجیے۔

'وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ' اوپر زبور کے بابؐ کے حوالہ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قرآن نے یہاں زبور کی جس تعلیم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس کے ایک مستقل باب میں نہایت تفصیل کے ساتھ، نہایت مؤثر انداز میں بیان ہوئی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ اسلوبِ بیان یہ اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل بات ترجیع و تکرار کے ساتھ اس طرح کہی گئی ہے کہ ہر بار اصل بات سے پہلے حکمت و عظمت

---

[1] ملاحظہ ہوں مزمور کے اندر خط کشیدہ فقرے۔

کی نہایت اعلیٰ باتوں کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اسی چیز کی طرف قرآن نے 'مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس اشارے کی اہمیت یہ ہے کہ درحقیقت یہی نصیحتیں ہیں جن پر عمل زمین کی ابدی بادشاہی کا ضامن ہے۔

'أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ' یہ وہ اصل بات ہے جس کے لیے قرآن نے زبور کا حوالہ دیا ہے۔ زبور کے حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ یہاں زمین سے مراد اس جہانِ نو کی زمین ہے جو قیامت کے بعد وجود میں آئے گی اور جس کے مالک و وارث بلا شرکت غیرے صرف اللہ کے نیکوکار بندے ہوں گے۔

إِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ (۱۰۶)

لفظ 'بلاغ' یہاں منادی عام اور بشارت عام دونوں کے مضمون کا حامل ہے اور لفظ کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا یہ فیصلہ کہ زمین کے وارث صرف خدا کے نیکوکار بندے ہی ہوں گے اس کے عبادت گزار بندوں کے لیے ایک عظیم اعلانِ بشارت ہے تو جس کو بازی کھیلنی ہو اس کے لیے بازی کھیلے، اس حیاتِ چند روزہ کے پیچھے اپنی ابدی بادشاہی کو کیوں ضائع کرے!

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۰۷)

یعنی اسی انذار و بشارت کے لیے ہم نے تمھیں لوگوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے کہ ان کو اس حقیقت سے آگاہ کردو۔ تمھارے اوپر ذمہ داری صرف بلاغ اور منادی کی ہے، تم یہ فرض ادا کردو۔ اگر مغرور و سرکش لوگ تمھارے انذار کا مذاق اڑاتے اور اس وقت موعود کے دکھا دینے کا مطالبہ کرتے ہیں تو تم ان سے کہہ دو کہ مجھے خدا نے رحمت بنا کر بھیجا ہے، عذاب بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ عذاب کب آئے گا۔ اس کے وقت کا علم صرف میرے رب ہی کو ہے۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۸)

تم ان کو خبردار کردو کہ مجھ پر جو وحی آئی ہے وہ یہ ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے تو کسی اور کے اعتماد پر اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ کوئی دوسرا تمھیں خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے گا۔

'فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ' میں نہایت زوردار تنبیہ ہے کہ بتاؤ تم اپنے آپ کو اسی ایک قادر و قیوم کے حوالہ کرنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ میرا جو فرض تھا وہ میں نے ادا کر دیا، اب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اگر تم اپنی اسی ضد پر اڑے رہے اور اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر میری بات کا مذاق اڑاتے رہے تو میں بری الذمہ ہوا۔ اب نتائج کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے!!

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (۱۰۹)

فیصلہ کن تنبیہ

یعنی اگر یہ تمھاری اس فیصلہ کن تنبیہ کے بعد بھی اپنی اسی اعراض کی روش پر جمے رہیں تو ان سے کہہ دو

کہ میں نے تمہارے بڑے اور چھوٹے، لیڈر اور پیرو، امیر اور غریب سب کو بلا فرق و تمیز آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اب تم میں سے کوئی یہ عذر نہیں کر سکتا کہ اس کو خبردار نہیں کیا گیا۔ رہی یہ بات کہ جس خطرے سے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں اس کے ظہور کا وقت قریب ہے یا بعید تو اس کا علم مجھے بھی نہیں ہے۔ اس کا صحیح علم صرف اس خدا ہی کو ہے جس کے حکم سے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔

إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ (۱۱۰)

تفویض الی اللہ

یہ نہایت جامع اور بلیغ کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تمہاری کھلی باتوں کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ تم اپنے پیٹوں میں چھپائے ہوئے ہو اس کو بھی جانتا ہے تو معاملہ اسی کے حوالہ ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہو گا وہ وہی کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ تم مجھ سے کیا مطالبہ کر رہے ہو اور تمہارے اس مطالبے کی تہ میں کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے وہ اس وجہ سے نہیں کر رہے تھے کہ فی الواقع وہ عذاب قیامت کو ناممکن یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا سمجھتے تھے بلکہ وہ محض آپ کو زچ کرنے اور اپنے عوام کو دھوکا دینے کے لیے ایسا کرتے تھے۔ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ خدا تمہارے دلوں کے بھید سے بے خبر ہے، اس پر سب کچھ واضح ہے اس وجہ سے مجھے تمہارے اس مطالبے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس کے علم اور اس کی حکمت پر پورا اعتماد ہے۔

وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۱۱۱)

'لَعَلَّهُ' میں ضمیر کا مرجع وہ تاخیر وعدہ ہے جس کا اشارہ اوپر والی آیت میں ہے۔ یعنی یہ عذاب کا وعدہ جو مؤخر ہو رہا ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تاخیر میں کیا بھید ہے۔ اس بھید کو خدا ہی جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ایک آزمائش ہو کہ خدا کی حجت تم پر اچھی طرح تمام اور تمہارا پیمانہ خوب بھر جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ابھی کچھ اور کھانے پینے کی مہلت دینا چاہتا ہو۔ بہر حال جو سبب بھی ہو اس مہلت پر مغرور ہونے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔ اگر پہلی صورت ہے تو توبہ کے لیے جلدی کرو اور اگر دوسری صورت ہے تو شکر کی روش اختیار کرو۔

قٰلَ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ ۗ وَرَبُّنَا الرَّحْمَٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ (۱۱۲)

دعا اور وداع

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی ہے اور مخالفین کو وداع بھی۔

اللہ تعالیٰ سے آپ نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب اب اس کشمکش کا تو حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور مخالفین کو آپ نے اس طرح وداع کیا کہ تم جو کچھ کہتے اور کرتے ہو میں اس کے مقابل میں اپنے رب رحمان ہی سے مدد کا طالب ہوں اس لیے کہ مستعان حقیقی وہی ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد ــــــ ۱۸ مارچ ۱۹۷۳ء

تدبرِ قرآن

۲۲

الحج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور زمانۂ نزول

یہ سورہ مکی دور کی اُن آخری سورتوں میں سے ہے جب مسلمانوں نے قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آکر، دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت شروع کر دی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ہجرت کا وقت بالکل قریب آچکا تھا۔ اس دور میں قریش کے لیے آخری انذار و تنبیہ کے ساتھ یہ سورہ نازل ہوئی۔ اس میں ان کو خدا کے غضب سے ڈرایا گیا، توحید اور قیامت کی قطعیت نہایت مؤثر دلائل کے ساتھ واضح کی گئی اور حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور بیت اللہ کے مقصد تعمیر کی روشنی میں ان پر یہ حقیقت واضح کی گئی کہ اس گھر کی تولیت کے اصل حقدار مشرکین نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جن کو انھوں نے اس سے محروم کر رکھا ہے اور ان کو یہاں سے نکالنے کے لیے ان پر ہر قسم کے ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ فتح مکہ کی طرف اشارہ تو پچھلی سورہ کی آیت ۴۴ میں بھی گزر چکا ہے، اس سورہ میں اس اشارے نے بالکل قطعی فیصلہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس میں قریش کو غدار اور غاصب قرار دے کر ان کو اس گھر سے بے دخل کیے جانے کی دھمکی اور مسلمانوں کو بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور قریش کو اس سے بے دخل کر کے ان کو اس کا امین و متولی بنائے گا۔

یہ سورہ مکی ہے

یہ سورہ اپنے مزاج و مطالب کے اعتبار سے مکی ہے۔ اس کی صرف چار آیات (۳۸-۴۱) ہجرت کے بعد کی ہیں جس میں مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ اگر وہ حج کے لیے جائیں اور کفار قریش ان کو بزور روکنے کی کوشش کریں تو ان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں تلوار اٹھائیں۔ اللہ ان کی مدد فرمائے گا۔ یہ بات چونکہ اوپر والی بات ہی کی وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے مصحف کی ترتیب میں ان آیات کو یہاں جگہ ملی تاکہ اس اجازت کی حکمت واضح ہو جائے کہ مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کا یہ حق اس لیے حاصل ہے کہ قریش کا خانہ کعبہ پر تسلط بالکل غاصبانہ ہے۔ اس کی تولیت کے اصلی حق دار مسلمان ہیں نہ کہ قریش۔

انہی چند آیات کی بنا پر ہمارے مفسرین نے، اس سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کے باب میں، اختلاف کیا ہے۔ لیکن کسی مکی سورہ میں چند مدنی آیتیں داخل ہو جانے سے، جب کہ ان آیات کی نوعیت بھی محض توضیحی آیات کی ہو، پوری سورہ کو مدنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بعض مدنی آیات سورۂ مزمل میں بھی ہیں حالانکہ وہ بالاتفاق مکی ہے۔ ہم آگے ان آیات کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ ان کی حیثیت اجمال کے بعد تصریح کی ہے۔ ایک بات جو مکی زندگی

کے آخری دور میں فرمائی گئی تھی جب مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں اس کی تفصیل نازل ہوئی تو اجمال اور تفصیل دونوں کو ایک ساتھ رکھ دیا گیا۔ صاحب کشاف نے بھی اس سورہ کو، باستثنائے چند آیات، مکی ہی قرار دیا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) مخالفین قرآن کو انذار کہ خدا کی پکڑ اور قیامت کا عذاب بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔ بغیر کسی دلیل کے خدا کے شریک و شفیع گمان کر کے، قیامت سے بے پروا ہو بیٹھنا اور شیطان کی پیروی کرنا اپنی شامت کو دعوت دینا ہے۔ شیطان کا اصلی کام، جس کے لیے خدا نے اس کو مہلت دی ہے، ہدایت دینا نہیں ہے کہ اس کی پیروی کی جائے بلکہ یہ ہے کہ جو شامت زدہ لوگ اس کی پیروی کریں ان کو وہ سیدھے جہنم میں لے جا اتارے۔

(۵-۸) انسان کی خلقت اور زمین کے خشک و بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو سرسبز و شاداب ہو جانے سے امکانِ معاد پر استدلال، یہ واضح کرنے کے لیے کہ جو لوگ قیامت کے باب میں شک میں پڑے ہوئے اور اس سے بے پروا ہیں، نہ خود اپنی خلقت کی نوعیت اور اس کی حکمتوں پر غور کر رہے ہیں اور نہ اس کائنات کے روزمرہ مشاہدات پر، وہ آنکھیں کھولیں اور مشاہدۂ عذاب کے مطالبہ کے بجائے آفاق و انفس کی نشانیوں سے سبق حاصل کریں۔ قیامت کا آنا خدا کی صفات کا ایک بدیہی اور لازمی تقاضا ہے۔ وہ لاریب آ کے رہے گی۔

(۹-۱۶) ان لوگوں کی تردید جو اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر آخرت سے نچنت اور شرک کی حمایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث و مباحثہ کے لیے ہر وقت آستینیں چڑھائے رہتے۔ اس امر کی وضاحت کہ شرک کے ساتھ خدا کی بندگی کا دعویٰ ایک بالکل لاطائل دعویٰ ہے۔ جو لوگ محض اپنی ظاہری منفعتوں ہی کے حد تک خدا کی بندگی اور اطاعت کرنا چاہتے ہیں، اس راہ میں کوئی امتحان پیش آ جائے تو وہیں سے وہ کترا جاتے ہیں اور دوسرے آستانوں پر جبہ سائی شروع کر دیتے ہیں، خدا کے ہاں ایسے دو دلوں اور منافقوں کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ایسے لوگ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہیں۔ یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنی منفعتوں کی خاطر جن کی طرف بھاگتے ہیں ان کا ضرر ان کی منفعت سے قریب تر ہے۔ نافع و ضار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اگر کوئی خدا سے مایوس ہوتا ہے تو وہ آسمان میں کھونٹی لگا کر اپنی سی کر کے دیکھ لے کہ اس کی کوئی بڑی سے بڑی تدبیر بھی اس مشکل کو حل کرنے والی بنتی ہے!

(۱۷-۲۴) مسلمانوں کو تسلی اور تمام مخالفِ اسلام فرقوں اور گروہوں کو آگاہی کہ ہر ایک کا رویہ خدا کی نظر میں ہے۔ کسی کا کوئی قول و فعل بھی اس سے مخفی نہیں۔ بالآخر ایک دن سب کا معاملہ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ ایک طرف وہ لوگ ہوں گے جو آج خدا کی وحدانیت اور اس کے کلمۂ حق کی دعوت دے رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنی بدعتوں سے خدا کے دین کو بگاڑا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جو شرک و کفر کے مرتکب ہوئے ہوں گے ان سب کو جہنم میں داخل کرے گا اور جو توحید و ایمان پر قائم رہیں گے وہ جنت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔

(۲۵-۳۷) اصل ملت ابراہیمؑ اور بیت اللہ کے مقصد تعمیر کی وضاحت تاکہ مشرکین مکہ اور ان کے حامی اہل کتاب پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ آج وہ اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمؑ اور بیت اللہ کا جو وارث و متولی سمجھے بیٹھے ہیں اور اس زعم میں خدا کے رسول اور اس کے ساتھیوں پر انھوں نے اس گھر کے دروازے بند کر رکھے ہیں، یہ محض ان کی برخود غلطی اور دھاندلی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو اس شرک و بت پرستی کے لیے نہیں بنایا تھا جس کا ایک گڑھ بنا کے اس کو رکھ دیا گیا ہے بلکہ انھوں نے اس کو صرف خدائے واحد کی عبادت اور اسی کے حج و طواف کا مرکز بنایا تھا۔ اسی ضمن میں قربانی اور دوسرے شعائر و مناسک کی اصل روح کی طرف توجہ دلائی گئی تاکہ وراثتِ ابراہیمی کے یہ مدعی اپنا جائزہ لیں کہ حضرت ابراہیمؑ کیا تعلیم دے گئے تھے اور انھوں نے ان کی تعلیم کو کس طرح مسخ کیا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ آج اللہ کے جو بندے ملتِ ابراہیمؑ کا احیاء کر رہے ہیں ان کو یہ اس گھر سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۳۸-۴۱) یہ چار آیتیں مدنی ہیں مسلمان، مدینہ سے ہجرت کر جانے کے بعد، جب ایک منظم جماعت بن گئے تب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر وہ حج کے لیے جائیں اور کفار روکیں تو ان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ یہ سوال اس وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اشہرِ حُرم اور خاص طور پر حدودِ حرم میں جنگ زمانۂ جاہلیت میں بھی حرام سمجھی جاتی تھی۔ قریش اشہرِ حُرم اور حرم کی اس حرمت کو اپنے لیے ایک سپر بنائے ہوئے تھے اور مسلمان بھی اس حرمت کے منافی کوئی اقدام کرنے کی جرأت اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اجازت نہ ملے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اجازت دے دی کہ اگر اس طرح کی کسی جنگ کی نوبت آئے تو تم بھی جنگ کرو۔ یہ جنگ اشہرِ حُرم یا حرم کی حرمت کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ بیت اللہ کی تطہیر کے لیے ایک مقدس جہاد ہے اور اگر تمھیں قوت حاصل ہو تو بیت اللہ کو اس کے غاصب قابضوں سے آزاد کرانا تمھارا فریضہ ہے۔ ساتھ ہی جہاد کی یہ حکمت بھی واضح فرما دی کہ اگر اس طرح کی جنگ بھی تقویٰ کے منافی سمجھی جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ تمام مساجد، جو اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوئیں، کفار و شیاطین کے حوالے کر دی جائیں کہ وہ ان کو ڈھا کر رکھ دیں یا ان کو بت خانہ بنا ڈالیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو اس جنگ سے نہ ہچکچانا چاہیے نہ مخالفوں کے طعنوں کی پروا کرنی چاہیے۔ اگر اس راہ میں جنگ پیش آئی تو، ان کی قلت تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود، خدائے قوی و عزیز ان کی مدد فرمائے گا تاکہ جب ان کو سرزمینِ حرم میں اقتدار حاصل ہو تو وہ اس کو شرک و کفر کی تمام نجاستوں سے پاک کر کے اس کے ان مقاصد کا احیاء کریں جن کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان کو آباد کیا تھا۔

تطہیر بیت اللہ کے لیے جہاد کی یہ اجازت چونکہ اسی بات کا ایک لازمی نتیجہ تھی جو اوپر والے پیرے میں بیان ہوئی کہ قریش کا اس گھر پر قبضہ غاصبانہ ہے، انھوں نے اس کے مقاصد برباد کر کے رکھ دیے ہیں، اس وجہ سے جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو گو یہ نازل مدینہ میں ہوئیں لیکن ترتیب میں ان کو جگہ یہاں دی گئی تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ صورتِ حال کے تقاضے سے یہ اجازت دی گئی۔

(۴۲-۵۲) تاریخ کی شہادت کہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کی قوموں کو جو تہدید فرمائی وہ بالآخر پوری ہو کے رہی۔ کوئی قوم بھی اپنے رسول کی تکذیب کے بعد صفحۂ ارض پر قائم نہ رہ سکی۔ صرف ان کی عظیم عمارتوں کے کھنڈر

باقی رہ گئے جو عبرت کے لیے کافی ہیں بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں ہوں لیکن جن کے دل اندھے ہو چکے ہوں ان کا علاج کسی طبیب کے پاس بھی نہیں ہے جو لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے ان کو جواب کہ خدا کی تقویم تمھاری تقویم سے مختلف ہے۔ اس کے ہاں کا ایک دن تمھارے ہزار سالوں کی طرح ہے تو جلدی نہ مچاؤ خدا کی بات پوری ہو کے رہے گی۔ خدا نے جس طرح پچھلی قوموں کو مہلت دی اسی طرح تمھیں بھی مہلت دی ہے لیکن جس طرح ان پر عذاب آ کر رہا اسی طرح تم پر بھی، اگر تم اپنی ہٹ سے باز نہ آئے، عذاب آ کے رہے گا۔ رسول کا کام انذار و تبشیر ہے۔ عذاب کا فیصلہ خدا کے اختیار میں ہے۔

(۵۲-۵۷) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تمھارے یہ مخالفین تمھاری دعوت کی مخالفت میں جو جھاڑ کے کانٹے کی طرح تمھارے پیچھے پڑ گئے ہیں، رسولوں کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر رسول کو اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہے۔ جب کبھی کسی رسول یا نبی نے اصلاحِ احوال کی راہ میں کوئی حوصلہ کیا ہے شیاطین نے اسی طرح اس کے حوصلہ کی راہ مارنے کی کوشش کی ہے اور اس میں اڑنگے ڈالے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہمیشہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں کو مٹاتا اور اپنی باتوں کو غالب و فتحمند کرتا رہا ہے۔ شیاطین کو اللہ نے وسوسہ اندازی و خاک بازی کی یہ مہلت اس لیے دی ہے کہ یہ چیز حق کے سچے حامیوں اور بوالہوسوں میں وجہ امتیاز ہو۔ جو لوگ حق کے طالب ہوتے ہیں شیاطین کے پروپیگنڈے سے ان کا ایمان نکھرتا اور ان کا علم پختہ ہوتا ہے اور جو بوالہوس اور منافق ہوتے ہیں ان کی ضلالت پختہ سے پختہ تر ہو جاتی ہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ ان کے اور اہلِ حق کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جو اہلِ حق ہوں گے اس امتحان سے گزرنے کے بعد آخرت کی بادشاہی کے وارث ہوں گے اور اہلِ باطل جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

(۵۸-۶۴) جو لوگ اس دور میں ہجرت کر چکے تھے یا اس کے لیے پا برکاب تھے ان کو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی بشارت اور خدا کی صفات اور آفاق کی شہادت سے اس بشارت کی تائید کے دلائل۔

(۶۵-۷۰) کفار کی طرف سے مطالبۂ عذاب کے باوجود ان کو جو مہلت ملی ہوئی تھی اس کی حکمت کی طرف اشارہ کہ خدا رحمت کرنے میں جلدی کرتا ہے، قہر کرنے میں وہ بڑا دھیما ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ اب تم ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ خدا قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور یہ چیز خدا کے لیے نہایت آسان ہے۔

(۷۱-۷۶) شرک اور شفاعتِ باطل کے نظریہ پر آخری ضرب تاکہ مشرکین پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جن شرکاء و شفعاء کے اعتماد پر وہ آخرت سے بے پروا ہیں، وہ خدا کی عدالت میں ذرا بھی ان کے کام آنے والے نہیں ہیں۔

(۷۷-۷۸) خاتمۂ سورہ جس میں مسلمانوں کو بحیثیت جماعت خطاب کر کے خدا کی عبادت اور اس کی راہ میں جہاد کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ اب ملتِ ابراہیمؑ کے وارث تم ہو، خدا نے تم کو مسلم کے لقب سے ممتاز فرمایا اور اب یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ خدا کے رسول نے جس طرح تم پر حق کی گواہی دی اسی طرح تم خلق پر حق کی گواہی دینے والے بنو، نماز و زکوٰۃ کا اہتمام کرو، خدا پر جمے رہو۔ وہی تمھارا مولیٰ ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

مطالب کا یہ تجزیہ پوری سورہ کا نظام واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبیدہ اللہ التوفیق۔

سُوْرَةُ الْحَجِّ (۲۲)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۷۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۴

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ
عَظِيْمٌ ① يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ
وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ
بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ② وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ
فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ③ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ
مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ④

ترجمۂ آیات ۱-۴

اے لوگو! اپنے خداوند سے ڈرو۔ بے شک قیامت کی ہلچل بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھو گے اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہے ہی بڑی ہولناک چیز! ۱-۲

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی علم کے خدا کی توحید کے باب میں کٹ حجتی کرتے اور ہر سرکش شیطان خبیث کی پیروی کرتے ہیں۔ جس کی بابت یہ ڈیوٹی ہی مقرر ہے کہ جو اس کو دوست

بنائے گا وہ اس کو گمراہ کر کے رہے گا اور اس کی رہنمائی وہ عذاب دوزخ کی طرف کرے گا۔ ۳-۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ (۱)

'یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ' کا خطاب اگرچہ عام ہے لیکن مراد اس سے وہی متمردین قریش ہیں جو قیامت کی تکذیب کر رہے تھے اور عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ اپنے رب سے ڈرو، اس نے اپنی عنایت سے جو مہلت دے رکھی ہے اس کو غنیمت جانو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ وہ اپنی رحمت و رافت کے سبب سے دیر گیر ضرور ہے لیکن بڑا ہی سخت گیر بھی ہے۔ قیامت کو سہل چیز نہ سمجھو کہ اس ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کر رہے ہو۔ اس کی ہلچل بڑی ہی ہولناک ہوگی۔ وہ پناہ مانگنے کی چیز ہے، مطالبہ کرنے کی چیز نہیں ہے!

یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰی وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰی وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ (۲)

قیامت کی ہولناکی کی تصویر

یہ اس دن کی ہولناکی کی تصویر ہے کہ وہ دن ایسی نفسی نفسی کا ہوگا کہ کسی کے اعوان و انصار اور اس کے اخوان و اقربا اس کے ذرا کام نہ آئیں گے۔ اس دن مرضعہ، جس کو اپنا بچہ جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے، اپنے بچے کو بھول جائے گی اور حاملہ دہشت کے سبب سے اپنا حمل ڈال دے گی۔ لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ بالکل مدہوش اور متوالے ہو رہے ہوں گے۔ لیکن یہ مدہوشی شراب کے نشہ کی نہیں ہوگی بلکہ عذابِ الٰہی کی ہولناکی سب کو پاگل بنا کے رکھ دے گی!

آیت میں ایک ہی ساتھ مخاطب کے لیے جمع اور واحد دونوں کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جمع کے لیے جب واحد کا صیغہ استعمال ہوتا ہے تو مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مراد ہوتا ہے اور اس میں جمع کے بالمقابل زیادہ زور ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّیَتَّبِعُ كُلَّ شَیْطٰنٍ مَّرِیْدٍ (۳)

ایک خاص اسلوبِ بیان

'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ' کے اسلوبِ بیان میں جب کوئی بات کہی جاتی ہے تو اس سے مقصود عام میں سے خاص کا ذکر ہوتا ہے۔ اگر موقع و محل تحسین کا ہو تو یہ اسلوب تحسین کے لیے بھی آتا ہے اور اگر موقع و محل تقبیح کا ہو، جیسا کہ یہاں ہے، تو اس سے تقبیح کی شدت نمایاں ہوگی۔ اگر اس اسلوب کو اپنی زبان میں ادا کرنا چاہیں گے تو کہیں گے کہ لوگوں میں ایسے جاہل، احمق اور بدھو بھی ہیں جو یوں کہتے یا یوں کرتے ہیں۔ یہ خاص طور پر اس گروہ کا ذکر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، خاص طور پر توحید کی مخالفت میں، ہر وقت مناظرہ و مجادلہ کے لیے آستینیں چڑھائے رہتا تھا۔ اس طرح کے لوگ کسی معاشرہ میں بھی تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہوتے بلکہ ان کا ایک خاص طائفہ ہی ہوتا ہے

ان کا علم بھی بس سنی سنائی اور رٹی رٹائی باتوں پر مبنی ہوتا ہے لیکن زبان درازی میں طاق اور لاف زنی میں مشّاق ہوتے ہیں اس وجہ سے شاطر لوگوں کے ایجنٹ بن کر بے چارے سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنے کی خدمت خوب انجام دیتے ہیں۔

مجادلۃ بغیر علم کے

'یُجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ'۔ 'فی اللہ' سے مراد فی توحید اللہ ہے اس لیے کہ کفار عرب خدا کے منکر نہیں تھے۔ وہ صرف خدا کی توحید کے منکر تھے اور توحید کے انکار کے لیے ان کے پاس دین آبا کی اندھی تقلید کے سوا کوئی دلیل نہیں تھی۔ آگے آیت ۸ میں وضاحت آئے گی کہ ان کے پاس اللہ کے دین کا کوئی علم تھا، نہ عقل و فطرت کی کوئی ہدایت، نہ کوئی قرآن و کتاب، بس یونہی، بغیر کسی دلیل اور علم کے، خدا کی توحید کے بارے میں مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ پیشہ ور مناظروں کے پاس زبان درازی کے سوا اور کوئی علم نہیں ہوتا۔ یہ صرف اپنے ضالّ و مُضلّ لیڈروں سے الہام حاصل کرتے ہیں اور گلی گلی میں ان کا ڈھول پیٹتے پھرتے ہیں۔

شیطان سے مراد شیاطین جن وانس دونوں ہیں

'وَیَتَّبِعُ کُلَّ شَیۡطٰنٍ مَّرِیۡدٍ'۔ 'شیطان' سے مراد شیاطین جن وانس دونوں ہیں۔ لفظ 'کل' اس مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں میں بڑا گہرا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ شیاطین جن، شیاطین انس ہی کو اپنی فتنہ انگیزیوں کا ذریعہ بناتے ہیں۔ شیاطین جن القا کرتے ہیں اور شیاطین انس ان کے القا کو مختلف ناموں سے ایک فلسفہ بناتے اور پھر اولادِ آدمؑ کو گمراہ کرنے کے لیے اس کو تمام ذرائع سے پھیلاتے ہیں۔ قرآن نے اس طرح کے تمام ائمۂ ضلالت کے لیے شیطان ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

'مرید' کے معنی

'مَرِیۡدٌ' کے معنی شریر، خبیث اور متعری عن الخیر یعنی لاخیرے کے ہیں۔

'شَیٰطِیۡن' خواہ شیاطین جن ہوں یا شیاطین انس، ظاہر تو ہوتے ہیں ہمیشہ خیر خواہ، ناصح، ہمدرد اور بہی خواہ قوم و وطن کے بھیس میں لیکن درحقیقت وہ نہایت ہی خبیث و شریر اور بالکل لاخیرے ہوتے ہیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی راہ سے ہٹا کر اپنی ڈگر پر ڈال دیتے ہیں اور جو لوگ ان کے نقیب و پاڈش بن کر ان کے فتنوں کے پھیلانے میں ان کے آلۂ کار بن جاتے ہیں ان کو اپنے سمیت جہنم کا فرزند بنا دیتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی توحید کے بارے میں ہمارے پیغمبر سے مباحثے اور مناظرے کر رہے ہیں وہ ایسے ہی خبیث اور لاخیرے شیطانوں کے پیرو ہیں۔

قیامت کے ذکر کے ساتھ توحید کے ذکر کی حکمت

قیامت کے ذکر کے ساتھ بعد توحید کا ذکر اس لیے ہے کہ درحقیقت قیامت کی ساری اہمیت توحید کے ساتھ ہی ہے۔ اگر خدا کے ساتھ اس کے شرکا و شفعا کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو قیامت کی ساری اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی روزِ عدالت ہے تو اس سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے اگر ایسے شرکا و شفعا موجود ہیں جو اپنے زور و اثر یا سعی و سفارش سے اپنے نام لیواؤں کو خدا کی پکڑ سے بچا سکتے ہیں! اسی وجہ سے قرآن میں قیامت اور ردِّ شرک دونوں مضمون ہمیشہ ساتھ ساتھ بیان ہوتے ہیں تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی جائے کہ خدا کی پکڑ سے کوئی بھی کسی کو بچانے والا نہیں بن سکے گا۔ سب کا معاملہ اسی کے حضور میں پیش ہوگا اور وہی تنہا ہر ایک کا فیصلہ فرمائے گا۔

كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ (۴)

شیطان کی ڈیوٹی

قرآن میں جگہ جگہ یہ بات تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ شیطان نے قیامت تک کے لیے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت لی ہے اور اللہ نے اس کو یہ مہلت دی ہے کہ جا، جو تجھے اپنا دوست، مددگار اور رہنما بنائیں ان کو گمراہ کرے، میں ان کو اور تجھ کو سب کو جہنم میں جھونک دوں گا۔ اسی حقیقت کو یہاں 'كُتِبَ عَلَيْهِ' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ شیطان کی خدا کی طرف سے ایک مقررہ ڈیوٹی ہے کہ جو اس کو دوست بنائیں ان کو وہ گمراہ اور جہنم کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ 'فَأَنَّهُ' کا عطف 'أَنَّهُ' پر ہے اور 'مَنْ تَوَلَّاهُ' بطور بیان شرط کے ہے یعنی شیطان کا یہ فریضہ کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے اور ان کو جہنم کی راہ دکھائے بایں شرط مشروط ہے کہ جو لوگ اس کو اپنا ولی و کارساز بنائیں گے صرف وہی اس کے دام میں شکار ہوں گے۔ خدا کے ان بندوں پر اس کا کوئی زور نہیں چلے گا جو اس کو اپنا دشمن سمجھیں گے اور ہمیشہ اس کے فتنوں سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ زہر کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہلاک کرے، احمق ہیں وہ جو اس کو تریاق سمجھیں اور نگل لیں۔ شیطان کو خدا نے جو مہلت دی ہے وہ لوگوں کے امتحان کے لیے دی ہے اس کو لیڈر بنانے اور اس سے الہام حاصل کرنے یا اس کی پیروی کے لیے نہیں دی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵-۲۴

آگے قیامت اور توحید کے اسی مضمون کو، جو تمہید کی آیات میں بیان ہوا، ایک نئے رنگ سے لیا اور انسان کی خلقت کی نوعیت، اس کائنات کے مشاہدات، اور ان مشاہدات سے اس کائنات کے خالق کی جو صفات ہر عاقل کے سامنے آتی ہیں، ان سے قیامت اور توحید پر دلیل قائم کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اگر انسان غور کرے تو قیامت اور توحید کے دلائل خود اس کے اپنے وجود اور اس کے اپنے ہی گرد و پیش میں موجود ہیں۔ اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ احمق ہیں وہ جو ایسے بدیہی حقائق کا انکار اور ان کے بارے میں حجتیں کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں ان لوگوں کو بھی لیا، جو خدا کی بندگی اپنے شرائط پر کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تک ان کے زعم میں خدا کے احکام ان کی خواہشوں کے مطابق ہوں وہاں تک تو وہ خدا کی بندگی پر راضی تھے، لیکن دین کی جن باتوں کو وہ اپنی خواہشوں اور اپنے مصالح کے خلاف سمجھتے ان سے وہ گریز کرتے۔ اسی طرح کے دو دلوں اور منافقوں کا ایک گروہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اس دور میں پیدا ہو گیا تھا جو خدا اور شیطان، کفر اور اسلام دونوں کو جمع کرنے کا خواہشمند تھا۔ اگرچہ اس گروہ کا رویہ کھلے ہوئے معاندین کے مقابل میں بظاہر روادارانہ تھا لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ رویہ بھی شرک بلکہ نہایت گھناؤنا شرک ہے اس وجہ سے قرآن نے یہاں اس پر بھی ضرب لگائی کہ اس دورخی پالیسی کی خدا کے دین

میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو لوگ نفع و ضرر دونوں خدا کے ہاتھ میں نہیں مانتے اور نرم گرم ہر طرح کے حالات میں خدا ہی کی بندگی نہیں کرنا چاہتے وہ اپنی پسندیدہ روش اختیار کریں لیکن یاد رکھیں کہ ان کی کوئی بڑی سے بڑی تدبیر بھی، خدا کی مرضی کے بدوں، ان کے کام آنے والی نہیں بن سکتی۔ آخر میں اس کشمکش حق و باطل کے دونوں فریق ـــــ اہلِ ایمان اور حامیانِ کفر و شرک ـــــ کے انجام کا ذکر فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے جس میں فریقین کا معاملہ خدا کی عدالت میں پیش ہو گا اور دونوں اپنے اپنے عقیدہ اور عمل کے مطابق سزا یا انعام پائیں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵-۲۴ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِن كُنتُمْ فِى رَيْبٍ مِّنَ ٱلْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَٰكُم
مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ
وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِى ٱلْأَرْحَامِ مَا نَشَآءُ إِلَىٰٓ
أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا۟ أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم
مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰٓ أَرْذَلِ ٱلْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنۢ
بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۚ وَتَرَى ٱلْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا ٱلْمَآءَ
ٱهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ﴿۵﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ ٱللَّهَ
هُوَ ٱلْحَقُّ وَأَنَّهُۥ يُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُۥ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿۶﴾ وَ
أَنَّ ٱلسَّاعَةَ ءَاتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ ٱللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِى ٱلْقُبُورِ ﴿۷﴾
وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُجَٰدِلُ فِى ٱللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَٰبٍ
مُّنِيرٍ ﴿۸﴾ ثَانِىَ عِطْفِهِۦ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ لَهُۥ فِى ٱلدُّنْيَا خِزْىٌ
وَنُذِيقُهُۥ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ عَذَابَ ٱلْحَرِيقِ ﴿۹﴾ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ
يَدَاكَ وَأَنَّ ٱللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّٰمٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿۱۰﴾ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن ۱ ع ۸
يَعْبُدُ ٱللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ ۖ فَإِنْ أَصَابَهُۥ خَيْرٌ ٱطْمَأَنَّ بِهِۦ ۖ وَإِنْ

اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ
ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ
وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ
اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ
يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ
لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ
ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ
اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ
اَشْرَكُوْۤا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى
السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ
الْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ
عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۱۸﴾ ۩ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ السجدة
فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ
رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَ

لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ
أُعِيدُوا فِيهَا وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٢٢﴾ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ ع ۱۲ / ۹
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا
حَرِيرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ
الْحَمِيدِ ﴿٢٤﴾

ترجمۂ آیات ۵-۲۴

اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اٹھنے کے باب میں شبہ میں ہو تو دیکھو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر منی کے ایک قطرے سے، پھر ایک جنین سے، پھر ایک لوتھڑے سے، کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص۔ ایسا ہم نے اس لیے کیا تاکہ تم پر اپنی قدرت و حکمت اچھی طرح واضح کر دیں اور ہم رحموں میں ٹھہرا دیتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مدت معیّن کے لیے۔ پھر ہم تم کو ایک بچّہ کی شکل میں برآمد کرتے ہیں، پھر ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچتے ہیں تاآنکہ وہ کچھ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جانتے۔

اور تم زمین کو بالکل خشک دیکھتے ہو تو جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہریں لینے لگتی اور ابھرتی ہے اور طرح طرح کی خوش نما چیزیں اگاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اللہ ہی پروردگار حقیقی ہے۔ اور وہی مردوں کو زندہ

کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور قیامت آ کے رہے گی، اس کے آنے
میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ ان سب کو ایک دن زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں
میں ہیں۔ ۵۔۷

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے،
تکبر سے اینٹھتے ہوئے، حجتیں کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے برگشتہ کریں۔ ان کے لیے دنیا میں
رسوائی ہے اور ہم قیامت کے دن ان کو آگ کا عذاب چکھائیں گے کہ یہ ہے تیرے اپنے ہی ہاتھوں
کی کرتوت اور اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ ۸۔۱۰

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں۔ اگر
ان کو کوئی فائدہ پہنچا تب تو ان کا دل خدا پر جمتا ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آگئی تو اوندھے
ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی۔ کھلا ہوا خسارہ درحقیقت یہی ہے۔ یہ
خدا کے سوا ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جو نہ ان کو کوئی نقصان پہنچا سکیں اور نہ کوئی نفع پہنچا پائیں۔
یہی بڑی دور کی گمراہی ہے۔ وہ ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جن کا ضرر ان کے نفع سے قریب تر ہے۔ کیا ہی بُرے ہیں اُن
کے یہ مرجع اور کیا ہی بُرے ہیں ان کے یہ ساتھی!! بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور
جنھوں نے عمل صالح کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔
بے شک اللہ جو چاہے گا کر ڈالے گا۔ ۱۱۔۱۴

جو یہ گمان رکھتا ہو کہ خدا دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا تو وہ آسمان تک ایک
رسی تانے اور پھر اپنے معاملہ کا فیصلہ کر ڈالے اور دیکھے کہ کیا اس کی یہ تدبیر اس کے غم کو دور
کرنے والی بنتی ہے؟ اور ہم نے اسی طرح اس قرآن کو نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں اتارا ہے

کہ لوگ ہدایت حاصل کریں اور بے شک اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ ۱۵-۱۶

جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے یہودیت اختیار کی اور صابئین، نصاریٰ، مجوس اور جنھوں نے شرک کیا، اللہ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۱۷

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے آگے جھکتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج چاند، تارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور لوگوں میں سے بہتیرے۔ اور بہتیرے ایسے ہیں جن پر خدا کا عذاب لازم ہو چکا ہے۔ اور جن کو خدا ذلیل کر دے تو ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک اللہ ہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۱۸

یہ دو فریق ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں اختلاف کیا تو جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے جامے تراشے جائیں گے۔ ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی بہایا جائے گا اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے سب پگھل جائے گا اور ان کی کھالیں بھی۔ اور ان کی سرکوبی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ جب جب وہ اس کے کسی عذاب سے نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیلے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کا عذاب!! ۱۹-۲۱

ہاں، اللہ ان لوگوں کو، جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے، ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے اور اس میں ان کا پہناوا یکسر ریشم ہوگا اور ان کی رہنمائی پاکیزہ کلمۂ حمد کی طرف اور ان کی رہنمائی خدائے حمید کی راہ کی طرف ہوگی!! ۲۲-۲۴

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۔ (۵)

قیامت کا شاہد اپنے اندر اور باہر

'فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ' قیامت کے باب میں مشرکین عرب کی روش صریح انکار کی نہیں بلکہ شک اور تردد ہی کی تھی۔ وہ اس کو ایک بہت ہی بعید چیز خیال کرتے تھے اور اس استبعاد کی بڑی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا ان کے خیال میں بہت بعید از قیاس بات تھی۔ اپنے اس واہمہ کے سبب سے اول تو قیامت کو وہ کوئی اہمیت دیتے ہی نہیں تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی تھے تو ان کو اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر یہ اعتماد تھا کہ وہ اپنی سفارش سے ان کو خدا کی بازپرس سے بچا لیں گے۔ قرآن نے قیامت کا جب اس شد و مد سے ذکر کیا کہ وہی اس زندگی اور اس کائنات کی اصل غایت قرار پا گئی اور ساتھ ہی ان کے تمام شرکاء و شفعاء کو بھی بے حقیقت ثابت کر دیا تو یہ چیز ان پر بہت شاق گزری۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کی ساری عمارت بالکل ریت پر ہے۔ اس کو بچانے کے لیے ان کے پاس واحد حربہ صرف یہ رہ گیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر قیامت ایسی ہی یقینی چیز ہے تو وہ اس کو دکھا دیں یا اس کی کوئی ایسی محسوس نشانی 'بشکل عذاب' دکھائیں جس کے بعد وقوعِ قیامت میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ قرآن نے ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ان کو خود ان کے اپنے وجود اور اس دنیا میں روزمرہ کے شاہدات کی طرف توجہ دلائی کہ قیامت اور توحید کی دلیل ڈھونڈھنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خدا نے انسان اور اس کائنات کو بنایا ہی اس طرح ہے کہ جو شخص آنکھیں رکھتا ہے وہ اپنے اندر اور باہر ہر وقت خدا اور قیامت کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ۔

'عَلَقَة' کے معنی

'عَلَقَةٌ' خون کی پھٹکی کو بھی کہتے ہیں اور چھوٹے جاندار کیڑے کو بھی۔ یہ نطفہ کے قرار پا جانے کے بعد کا درجہ ہے جب وہ خون اور ایک جنین کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس کے اندر زندگی کی نمود پیدا ہو جاتی ہے۔

'مُضْغَة' کے معنی

'مُضْغَةٌ' گوشت کے لوتھڑے کو کہتے ہیں۔ یہ 'عَلَقَةٌ' کے بعد کا مرحلہ ہے جب جنین گوشت کے ایک لوتھڑے کی شکل میں ایک جسم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس 'مُضْغَةٌ' کی بابت فرمایا کہ ان میں سے بعض

کا ڈیزائن بالکل مکمل ہوتا ہے اور بعض کو قدرت نامکمل ہی چھوڑ دیتی ہے اور کسی کے بس میں بھی یہ نہیں ہے کہ اس کو مکمل کر دے۔

انسان کی اپنی خلقت ایک درس گاہ ہے

'لِنُبَيِّنَ لَكُمْ' یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے انسان کی خلقت کے ان مراحل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا انسان کو وجود میں لانے کے لیے ان تمام مراحل اور اس سارے اہتمام کا محتاج نہیں تھا کہ پانی کی ایک بوند کسی مادہ کے رحم میں قرار پکڑے، پھر وہ خون اور جنین کی صورت اختیار کرے اور قدرت اپنے ڈیزائن کے مطابق اس کی نقاشی و مصوری کر کے اس کو حسین پیکر بنائے۔ اس تمام اہتمام و انتظام کے بغیر اگر خدا چاہتا تو بنے بنائے آدمی کسی دریا یا پہاڑ سے جھنڈ کے جھنڈ اور ریوڑ کے ریوڑ برآمد ہو جایا کرتے لیکن خدا نے یہ چاہا کہ انسان کی خود اپنی خلقت اس کے لیے خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی ایک درس گاہ بن جائے جس میں وہ اپنے اور اس کائنات کے احسن الخالقین کی معرفت حاصل کرے۔ اس کا خود اپنا وجود اس پر شہادت دے کہ جس نے اس اہتمام و عنایت کے ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اس نے اس کو محض ایک کھلونا نہیں بنایا ہے بلکہ اس کی خلقت کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے، جو لازماً ظہور میں آ کے رہے گی۔ اس کے اپنے ہر بُن مُو سے اس کو یہ گواہی ملے کہ خالق نے اس کو مٹی کے خلاصہ اور پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا اور اس کو اس میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی تو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا بھی اس کے لیے نہایت آسان ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ مومنون میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝

(المؤمنون - ۲۳ : ۱۲ - ۱۶)

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا، پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک قرار کی جگہ میں رکھا، پھر ہم نے پانی کی بوند کو جنین کی شکل دی، پھر جنین کو ایک لوتھڑا بنایا، پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا، پھر اس کو ایک بالکل ہی مختلف نمونہ کی شکل میں شکل کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا! پھر اس کے بعد تم لازماً مرو گے، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

سورہ مومنون کی اس آیت میں وہ خلاصہ بھی سامنے رکھ دیا ہے جس پر انسان کی خلقت کے یہ تمام مراحل شہادت دے رہے ہیں لیکن ہمارے دور حاضر کے فلسفیوں اور سائنس دانوں کا یہ عجیب اندھا پن ہے کہ انھیں انسان کی خلقت کے یہ تمام مراحل و مدارج تو نظر آتے ہیں لیکن اس اصل حقیقت تک ان کی نظر نہیں پہنچتی جس کو واضح کرنے ہی کے لیے خدا نے یہ سارا اہتمام فرمایا۔

'وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا'۔ ابھی اصل سلسلۂ کلام پورا نہیں ہوا تھا کہ بیچ میں 'لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ' کا ٹکڑا اچانک مخاطبوں کو جھنجھوڑنے کے لیے آگیا تھا کہ بلادت کے سبب سے وہ سو نہ رہے ہوں۔ ان کو جھنجھوڑنے کے بعد پھر اصل سلسلۂ کلام کو لے لیا۔ فرمایا کہ اس کے بعد ایک مدت معین تک اس کو رحم میں ہم ٹھہراتے ہیں کہ وہ ایک پورے بچے کی شکل اختیار کرے۔ 'مَا نَشَآءُ' یعنی یہ کلیۃً ہماری مشیت پر منحصر ہے کہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، خوب صورت ہو یا بدصورت، ناقص ہو یا کامل، کسی دوسرے کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ لڑکی کو لڑکا بنا دے یا بدصورت کو خوب صورت۔ 'اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى' یعنی اسی طرح وضع حمل کے لیے ہم نے ایک مدت ٹھہرا دی ہے اور یہ چیز بھی کلیۃً ہمارے ہی اختیار میں ہے، کسی کے بس میں نہیں ہے کہ ہماری مقرر کی ہوئی مدت میں کوئی تغیر و تبدل کر دے۔

'ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ' یہاں 'ل' اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے پہلے فعل محذوف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور سورۂ مومن آیت ۶۷ میں بھی اس کی نہایت واضح مثال آئے گی۔ یعنی بچہ کی شکل میں تمھیں وجود بخشنے کے بعد ہم تمھیں ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی اور پختگی کو پہنچو اور یہ قانون بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ وہ بچپن اور مراہقہ کے مراحل کو لانگ کر جوانی کے حدود میں قدم رکھ دے۔

'وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ' یہاں تقابل کے اصول پر، بربنائے وضاحتِ قرینہ، پہلے ٹکڑے میں فی صباہ او فی شبابہ یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں اور دوسرے ٹکڑے میں 'اَرْذَلِ الْعُمُرِ' کے الفاظ اس حذف کو واضح کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کتنے تو اپنے بچپن یا جوانی ہی میں مر جاتے ہیں اور کتنے ایسے ہوتے ہیں جو بڑھاپے کی آخری منزل تک پہنچتے ہیں اور یہ امر بھی کلیۃً خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ کوئی شخص اپنی مدتِ حیات میں نہ کمی کر سکتا ہے نہ بیشی۔

'لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا' 'ل' غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا ترجمہ 'یہاں تک' یا 'تا آنکہ' ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ 'علم' کی تنکیر تحقیر کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور تفخیم کے لیے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ ایسی ارذل عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ تھوڑا بہت علم جو اس کو حاصل ہوا ہوتا ہے وہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ دوسری صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ وہ بہت کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ بھی نہیں جانتا، ہر چیز اس کے حافظہ سے محو ہو جاتی ہے۔ ہم پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے کہ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا ہے 'اِنْ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا' (تمھیں تو بس تھوڑا ہی علم عطا ہوا ہے) اصل حقیقت یہی ہے کہ انسان چاہے سقراط و بقراط ہی کیوں نہ بن جائے لیکن علم کے بحر بیکراں کا ایک قطرہ ہی ہے جس کا وہ حامل بنتا ہے۔ اس سے زیادہ کے لیے وہ اپنے اندر ظرف ہی نہیں رکھتا اور اس علم کا بھی حال یہ ہے کہ عمر کے ایک خاص حصہ میں وہ سب سلب ہو جاتا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اپنے علم پر بھی کسی کو غرہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی خدا ہی کی دین ہے،

وہی بخشتا ہے اور وہ جب چاہے اس کو چھین سکتا ہے۔

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ

ایک نظر عالم خارج پر

انسان کی خلقت کے اندر قیامت کے جو دلائل ہیں ان کی طرف توجہ دلانے کے بعد اس کو باہر کی دنیا کی طرف توجہ دلائی کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین بالکل خشک اور بے آب وگیاہ ہوتی ہے۔ پھر جب اس پر بارش ہوتی ہے تو وہ نرم وگداز ہو جاتی اور نوع بنوع خوشنما نباتات سے لہلہا اٹھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس زمین کو بار بار مرتے اور جیتے دیکھتے ہو تو آخر اسی زمین سے اپنے ہی دوبارہ جی اٹھنے کو کیوں بعید از امکان سمجھتے ہو؟ ہر فصل و موسم میں یہ ریہرسل تو تمہارے سامنے اسی غرض سے ہو رہا ہے کہ قیامت کا مشاہدہ اس کے ہونے سے پہلے ہی تمہیں ہوتا رہے۔ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ کے الفاظ یہاں مقدر ہیں۔ چونکہ یہ نشانی بالکل واضح تھی اس وجہ سے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں تھی۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ (۶-۷)

خلاصۂ بحث

شروع سورہ سے لے کر یہاں تک جو کچھ بیان ہوا ان آیات میں اس کا خلاصہ سامنے رکھ دیا۔ یعنی خدا اور قیامت سے تمہیں ڈرتے رہنے کی یہ ہدایت جو کی جا رہی ہے اس لیے کی جا رہی ہے کہ معبود حقیقی صرف خدا ہی ہے، اس کے ماسوا جو تم نے اس کے شریک و سہیم بنا رکھے ہیں، اور جن کے بل پر تم خدا اور آخرت سے نچنت ہوئے بیٹھے ہو، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ محض تمہارے وہم کی ایجاد ہیں۔ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ یعنی اوپر جو دلائل مذکور ہوئے ان سے یہ بات ثابت ہے کہ خدا مُردوں کو زندہ کرتا ہے اس لیے جب وہ چاہے گا تمہیں اٹھا کھڑا کرے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو پانی کے ایک قطرے کو عاقل و بالغ انسان بنا دیتا اور زمین کو اس کے خشک اور چٹیل ہو جانے کے بعد باغ و بہار کر دیتا ہے، اس کے لیے دنیا کو از سرِ نو زندہ کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا!

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ (۸)

بے دلیل مجادلہ کرنے والے

آیت ۳ میں جن مجادلین کی طرف اشارہ فرمایا تھا یہ ان کے رویہ کی تفصیل ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ خدا کے بارے میں مشرکین کی اصلی مخاصمت عقیدۂ توحید سے تھی۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو وہ بلا بحث و نزاع مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اس کے بہت سے دوسرے شریک بھی ٹھہرا لیے تھے جن کو ثابت کرنے کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہوتی تھی لیکن ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں تھی۔ بس زیادہ سے زیادہ جو چیز وہ پیش کرتے وہ یہ کہ ہمارے باپ دادا ان معبودوں کو پوجتے آئے ہیں اس لیے ہم ان کو پوجتے رہیں گے اور ان کی توہین کسی حال میں برداشت نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جب بحث کا تعلق دلیل کے بجائے مجرد آباء و اجداد کی اندھی تقلید سے رہ جائے تو یہ کبر و غرور ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد آدمی کے

سامنے ساری منطق بے کار ہو کے رہ جاتی ہے، اسی وجہ سے قرآن نے اس بے دلیل مجادلہ کو کبر قرار دیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ	بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں
بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِیْ	بغیر کسی دلیل کے، جو ان کے پاس آئی ہو، کٹ حجتی
صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ	کرتے ہیں، ان کے دلوں میں صرف غرور ہے جس میں
بِبَالِغِیْهِ ۚ (مومن - ۵۶)	ان کو کامیابی حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

دوسرے مقام میں یہ حقیقت بھی واضح فرمادی ہے کہ اس سارے مجادلے کی محرک طریقۂ آبار کی اندھی عصبیت ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی	اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں
اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا	بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی رہنما
كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ۝ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ	کتاب کے جھگڑتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا
اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا	ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو کہتے
بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ	ہیں ہم اسی طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے
اٰبَآءَنَا ؕ (لقمان - ۲۰-۲۱)	اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

ثَانِیَ عِطْفِهٖ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّنُذِیْقُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۔(۹)

'ثَانِیَ عِطْفِهٖ' ان کے کبر و غرور کی تصویر ہے۔ جب کوئی شخص غرور کے ساتھ کسی سے اپنا رُخ موڑتا ہے تو شانے جھٹک کر موڑتا ہے۔ آدمی کے پاس دلیل نہ ہو اور وہ اپنے غلط موقف سے دستبردار ہونے کے لیے بھی تیار نہ ہو تو اس کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی ہے اور اس کا انتقام وہ اپنے غرور کا مظاہرہ کر کے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ 'لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ' یعنی یہ سارا طنطنہ اور یہ ساری حمیت کسی حق کی حمایت کے لیے نہیں بلکہ صرف اس لیے ہے کہ جس طرح وہ خود خدا کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے دوسروں کو بھی اسی طرح بھٹکا دے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آدمی کا خدا کی راہ سے بھٹکا ہوا ہونا، اگر اس کو اپنی کمزوریوں کا احساس ہو، اس سے مایوس کر دینے والی چیز نہیں ہے، حق کی طرف اس کی بازگشت کا امکان ہے، لیکن جو شخص اپنے باطل کے حق میں اپنے پاس کوئی دلیل نہ رکھتے ہوتے بھی اس کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے، پوری رعونت کے ساتھ، اٹھ کھڑا ہو تو اس سے پھر کسی امید خیر کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

استکبار کی سزا دنیا اور آخرت کی رسوائی — لَهٗ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّنُذِیْقُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِیْقِ۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب نار ہے۔ رسوائی اس لیے کہ انھوں نے حق کے مقابل میں استکبار کا مظاہرہ کیا اس وجہ سے وہ مستحق ہیں کہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث رسول کے مخالفین ہیں

رسولوں کے مخالفین کے باب میں سنتِ الٰہی، جیسا کہ ہم متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں، یہی ہے کہ اگر وہ حق کی مخالفت پر جمے رہ جاتے ہیں تو، اتمامِ حجت کے بعد، لازماً وہ اس دنیا میں بھی شکست اور ذلت سے دوچار ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی جہنم کے سزاوار ٹھہریں گے۔

عَذَابَ الْحَرِيقِ۔ میں بھی عمل اور جزا کی مشابہت کا پہلو موجود ہے۔ یعنی چونکہ وہ اس دنیا میں حق کے خلاف غصہ، نفرت اور حسد سے جلتے اور کھولتے رہے اس وجہ سے وہ مستحق ہیں کہ آخرت میں جلنے کے عذاب کا مزا چکھیں۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۱۰)

زبانِ حال کی شہادت

ہم قرآن کے اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ کرتے آئے ہیں کہ جہاں مقصود صورتِ حال کی تعبیر ہو وہاں بالعموم 'قیل' اور 'یقال' وغیرہ حذف کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ یعنی زبانِ حال خود ان پر گواہی دے گی کہ یہ تمہاری اپنی ہی بوئی ہوئی بس بھری فصل کا حاصل ہے جو تمہارے سامنے آیا ہے، خدا نے تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔

جو بوئے گا وہی کاٹے گا

'وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ' اس اسلوب کی وضاحت بھی متعدد جگہ ہو چکی ہے کہ جب مبالغہ پر نفی آئے تو اس سے مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے 'لَيْسَ بِظَلَّامٍ' کے معنی ہوں گے اللہ تعالیٰ بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

آیت کا مقصود یہ ہے کہ آدمی اس دنیا میں جو بوئے گا اسی کی فصل آخرت میں کاٹے گا۔ اگر اس نے استکبار کی کاشت کی ہے تو استکبار کا حاصل رسوائی ہے، وہ رسوائی کی فصل کاٹے گا۔ اور اگر حق کے خلاف غصہ اور نفرت کی پرورش اس نے کی ہے تو اس کا حاصل جلنے کا عذاب ہے وہ اس سے دوچار ہوگا۔ غرض جو کچھ اس نے کیا ہوگا وہی اللہ تعالیٰ اس کے سامنے رکھ دے گا۔ بہرحال اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی!

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۱۱)

مذبذبین کا کردار

ان کٹر مشرکین کا ذکر کرنے کے بعد، جو شرک کی حمایت میں لڑائی ٹھانے ہوئے تھے، اب یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بیک وقت یزدان اور اہرمن، اللہ اور غیر اللہ، حق اور باطل دونوں سے تعلق باقی رکھنا چاہتے تھے۔ یکسو ہو کر نہ وہ اہلِ ایمان کے اندر شامل ہونا چاہتے تھے نہ مشرکین کے اندر۔ وہ ان دونوں صفوں سے الگ کھڑے ہو کر اپنی مصلحت اور مفاد کو دیکھتے تھے۔ جس حد تک ان کو مسلمانوں کی ہمنوائی میں فائدہ نظر آتا ان کی ہمنوائی کرتے اور جب دیکھتے کہ شرک اور اہلِ شرک کی تائید میں فائدہ ہے، ان کے ساتھی بن جاتے۔ اس قسم کے دورنگے اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر، اس دور میں، مشرکین اور اہلِ کتاب کے اندر بھی پیدا ہو

گئے تھے جو کفر و اسلام دونوں میں سمجھوتے کے خواہشمند تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ خدا کی بھی بندگی ہونی چاہیے اور ان اصنام و آلہہ کی بھی جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ آخر یہ بھی کام آنے والی ہستیاں ہیں تو ان کو کیوں نظرانداز کیا جائے؟ یہی گروہ ہے جس کی طرف سے قرآن میں ترمیم کی تجویز بھی پیش ہوئی تھی جس کا ذکر سورۂ یونس میں گزر چکا ہے۔ اس طرح کے عناصر اگر مسلمانوں میں داخل ہوئے تو وہ توحید میں یکسو نہیں ہوئے۔ جہاں تک ان کو راہ ہموار نظر آتی وہاں تک تو وہ قافلۂ اسلام کا ساتھ دیتے لیکن جب کوئی آزمائش پیش آجاتی تو وہیں لڑکھڑا جاتے اور خدا سے مایوس و بدگمان ہو کر دوسروں کو مولیٰ و مرجع بنا بیٹھتے۔ یہ چیز اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ اوپر مجادلین کا جو شرک بیان ہوا ہے۔ اس میں اور اس میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ حقیقت کا نہیں بلکہ صرف مزاج کا فرق ہے۔ مجادلین کے شرک کا مزاج معاندانہ ہے، اس کا مزاج منافقانہ۔ اس فرق کے سوا ان دونوں میں کوئی اور فرق نہیں ہے۔ توحید کا تقاضا صرف اس شکل میں پورا ہوتا ہے جب بندہ کلیۃً اپنے آپ کو اپنے رب کی تحویل میں دے دے۔ وہ پھولوں کی سیج پر لٹائے جب بھی راضی رہے اور اگر سر پر آرے چلوا دے جب بھی راضی و مطمئن رہے۔ صرف منفعت ہی کے حد تک جو خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے وہ موحد نہیں بلکہ مشرک ہے اور خدا کے ہاں ایسے ابن الوقتوں اور مفاد پرستوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ سرمد نے نہایت دو ٹوک بات کہہ دی۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد — یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن برضائے یار می باید داد — یا قطع نظر زیار می باید کرد

'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ'۔ یہ اسلوب بیان یہاں اظہار تعجب اور اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے اور لفظ 'عبادت' پرستش اور اطاعت دونوں ہی معنوں پر مشتمل ہے۔ 'عَلٰى حَرْفٍ' یعنی ایک کنارے پر کھڑے ہو کر، دُور دُور سے۔ خدا کی بندگی اور اطاعت میں پوری طرح داخل ہو کر نہیں، جو 'اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً' کا تقاضا ہے بلکہ 'مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ' کے مصداق بن کر۔ نہ پوری طرح خدا کی طرف جو ایک حنیف مسلم کی شان ہے اور نہ کفار کی طرح کفر کی حمایت میں برہنہ ہو کر بلکہ ع منہ پھیر کر ادھر کو اُدھر کو بڑھا کے ہاتھ۔

'فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۣاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۣانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ'۔ 'فِتْنَةٌ' کے معنی یہاں مصیبت اور آزمائش کے ہیں۔ یہ 'عَلٰى حَرْفٍ' کی وضاحت ہے کہ یہ احمق لوگ خدا کی بندگی صرف اپنے مفاد کے حد تک کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہر بات ان کے منشا کے مطابق ہوتی رہے اس وقت تک تو یہ خدا سے راضی و مطمئن رہتے ہیں، لیکن کوئی امتحان پیش آجائے تو پھر یہ اوندھے ہو جاتے ہیں اور خدا کو چھوڑ کر دوسروں کے آستانوں پر جبہ سائی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ پھولوں کے طالب ہیں لیکن کانٹوں کی خلش برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں حالانکہ خدا کی راہ میں راحتوں کے ساتھ آزمائشیں بھی ہیں اور

جب تک کوئی ان آزمائشوں میں پورا نہ اترے خدا کے ہاں اس کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ کا مفہوم

'خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ' فرمایا کہ ایسے احمق لوگ دنیا اور آخرت دونوں ہی برباد کرتے ہیں۔ اگر دنیا میں بندے کو کوئی آزمائش پیش آتی ہے، وہ جان یا مال کے کسی خسارہ میں مبتلا کیا جاتا ہے تو اس کے لیے اس خسارہ کے اندر ایک عظیم اخروی منفعت بھی پوشیدہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے رب کے فیصلہ پر راضی و مطمئن رہے اور اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دے۔ اس طرح کا ہر امتحان بندے کے ایمان کو پختہ اور اس کی اخروی منفعتوں کو اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کرتا ہے لیکن کوئی احمق اگر اس طرح کی کسی آزمائش سے گھبرا کر خدا سے مایوس و بدگمان ہو بیٹھے تو اس نے دنیا کا بھی نقصان اٹھایا اور اپنی آخرت بھی برباد کی۔ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ظاہر ہے کہ اصلی اور کھلا ہوا خسارہ یہی ہے۔ اگر اس دنیا کا کوئی نقصان ہوا تو وہ نقصان نہیں ہے اگر بندے نے اپنا اخروی اجر اس کے عوض میں محفوظ کرا لیا۔ البتہ جس نے اپنی دنیا بھی کھوئی اور اپنی آخرت بھی اس کا خسران 'خُسْرَانٌ مُّبِيْنٌ' ہے۔

ابنائے زمانہ کا کردار

'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ' میں جس گروہ کا کردار بیان ہوا ہے، غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی کردار ابنائے زمانہ کا ہے۔ آج ہم بھی، جو اس شرک کو مٹانے ہی کے لیے مامور کیے گئے تھے، اسی طرح دُور دُور سے خدا کی بندگی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن کو خدا کی کتاب بھی مانتے ہیں لیکن قانون، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست ہر شعبۂ زندگی میں پیروی دوسروں کی کرتے ہیں۔ قرآن کا مصرف اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ جب کوئی مرے تو، کچھ حافظ اس کے لیے قرآن خوانی کر کے اس کو بخشوا دیا کریں۔ اگرچہ اس نے خود کبھی اتفاق سے بھی قرآن کو ہاتھ نہ لگایا ہو!! ان کے نزدیک قرآن زندوں کے لیے نہیں بلکہ مردوں کے لیے اترا ہے اور وہ ہدایت کے لیے نہیں بلکہ صرف کبھی کبھی چوم لینے کے لیے ہے۔ خوب بات کہی جس نے کہی ہے کہ

یاراں عجب اندازِ دورنگی دارند مصحف بہ بغل دین فرنگی دارند

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (۱۲)

غیر اللہ سے دعا شرک اور ضلال بعید ہے

'يَدْعُوْا' یہاں دعا، استغاثہ، فریاد، استرحام اور استمداد سب معنوں پر مشتمل ہے۔ اگر خدا کے سوا کسی کو نافع و ضار مان کر، پکارا جائے تو یہ شرک ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ خدا سے مایوس ہو کر جن سے طالبِ مدد ہوتے ہیں وہ نہ ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ نفع و ضرر صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر کسی کو کسی سے کوئی نفع یا ضرر پہنچتا ہے تو اللہ ہی کے اذن سے پہنچتا ہے اس وجہ سے ہر حال میں بندے کا اعتماد اللہ ہی پر ہونا چاہیے نہ کہ اس سے مایوس ہو کر دوسروں پر۔ دوسروں کے نافع یا ضار ہونے کی حقیقت اسی سورہ کے آخر میں ایک تمثیل کے ذریعہ سے یوں واضح فرما دی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اے لوگو! ایک تمثیل سنائی جا رہی ہے تو اس کو

لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَـيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (حج : ۷۳)

(دھیان سے سن لو۔ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سارے کے سارے مل کر اس کے لیے اپنا زور لگا ڈالیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس سے اس کو بچا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں!)

'ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ' فرمایا کہ دور کی گمراہی درحقیقت یہی ہے۔ مطلب یہ ہے اگر یہ خدا سے روٹھ کر کسی ایسے کی پناہ لیتے جو کوئی نفع یا نقصان ان کو پہنچا سکتا تب تو یہ ایک گمراہی ہوتی لیکن بہت دور کی نہ ہوتی لیکن خدا کی آزمائش سے بھاگ کر ایسوں کی پناہ ڈھونڈھنا جو خود اپنے چہرے سے بھی مکھی ہنکا نہیں سکتے صرف گمراہی نہیں بلکہ بہت دور کی گمراہی ہے۔ یہ خدا کے امتحان کی بھٹی سے بھاگے اور سیدھے جہنم میں جا کودے!

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ (۱۳)

ضرر و نفع اور / نفع پر ضرر

اس 'يَدْعُوْا' کے بارے میں مجھے ان نحویوں کا مذہب قوی معلوم ہوتا ہے جو اس کو سابق الذکر 'يَدْعُوْا' کا اعادہ اور بعد کے جملے سے اس کو بالکل غیر متعلق مانتے ہیں۔ اعادۂ فعل یہاں اظہار حسرت و افسوس کے لیے ہے 'لَمَنْ ضَرُّهٗ'، 'يَدْعُوْا' کا مفعول نہیں بلکہ اوپر والے مفعول 'مَالَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ' پر ایک قسم کا استدراک ہے اور مقصود اس سے اس کے 'ضَلٰلٌ بَعِيْدٌ' ہونے کی وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی ضرر یا نفع نہیں پہنچا سکتے بلکہ ستم بالائے ستم ہے کہ ان کا ضرر ان کے نفع سے قریب تر ہے۔ اگر کسی ایسے کی پناہ ڈھونڈھی جائے جو نہ نفع پہنچا سکے نہ ضرر تو یہ حماقت ہے لیکن حماقت در حماقت یہ ہے کہ ایسے کی پناہ ڈھونڈھی جائے جس کا ضرر تو نقد اور ثابت و معلوم ہو لیکن نفع بالکل موہوم۔ جنھوں نے خدا سے تعلق توڑ کر دوسروں کو اپنا ولی و کارساز مانا انھوں نے اپنا حقیقی سہارا تو ختم کر دیا۔ رہے دوسرے مزعومہ سہارے تو وہ کام آتے ہیں یا نہیں؟ یہ بعد کی چیز ہے اور یہ بھی ان کے سامنے آجائے گی۔

امام اور / مقتدی دونوں / نابنجار

'لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ' یہ فقرہ یہاں بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح آیت ۷۳ میں، جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے، 'ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ' ہے۔ جس طرح وہاں فرمایا ہے کہ "طالب و مطلوب دونوں ہی بے بس و ناتواں" اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ مولیٰ اور عشیر دونوں ہی ایک سے ایک بڑھ کر نابنجار! 'مولیٰ' سے مراد وہ شرکا و شفعاء ہیں جن کو خدا کے سوا مرجع اور کارساز بنایا گیا اور 'عشیر' سے مراد وہ مشرکین ہیں جنھوں نے ان کو مرجع و کارساز بنایا۔ پیر اور مرید، امام اور مقتدی، لیڈر اور پیرو دونوں اگر ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے اور برے ہونے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوں تو ان کا انجام معلوم ہے!

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۱۴)

مخلصوں کا / انجام

خدا سے مایوس ہو کر دوسروں کی پناہ ڈھونڈھنے والوں کا انجام بیان کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کے انجام

کی طرف اشارہ فرمایا جو سختی و نرمی اور رنج و راحت ہر طرح کے حالات میں ایمان و عمل صالح کی روش پر قائم و دائم رہیں گے۔ فرمایا کہ بے شک اللہ ان لوگوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ سیاقِ کلام دلیل ہے کہ یہاں فعل اپنے کامل معنوں میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ یہ مقابل ہے 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ' کے۔ اس وجہ سے اس سے لازماً وہ لوگ مراد ہوں گے جو دودلی اور نفاق میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ پوری دل جمعی و یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی پر جمے ہوئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۔ یعنی یہ مشرکین تو جن پر تکیہ کیے ہوئے ہیں وہ نہ کوئی نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ کوئی ضرر، یہاں تک کہ اگر کوئی مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس کو بھی اس سے بچا سکنے پر قادر نہیں۔ البتہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ جو چاہے کر ڈالتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لیے طمانیت و بشارت ہے کہ تم ظاہری حالات کی ناساعدت کو نہ دیکھو۔ حالات خواہ کتنے ہی ناموافق و ناساعد ہوں اپنے رب پر جمے رہو۔ اور اطمینان رکھو کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ (۱۵)

ضمیر مفعول کا مرجع

'مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ'۔ 'يَنْصُرَهٗ' میں ضمیر کا مرجع 'مَن' ہے۔ جن لوگوں نے اس کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا ہے ان کی رائے سیاق و سباق کلام سے بالکل بے جوڑ ہے۔ آیت میں اشارہ انہی دودلوں اور منافقوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے اور جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ اگر انھیں کوئی آزمائش پیش آ جاتی ہے تو خدا سے مایوس و بدگمان ہو کر دوسروں کو مولیٰ و مرجع بنا بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پیش آمدہ مشکل سے خدا ان کو نہیں نکالے گا یا نہیں نکال سکتا۔

'تدسبب' کا مفہوم

'فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ'۔ آسمان میں رسی تاننا آخری اور انتہائی تدبیر کر دیکھنے کے لیے اسی طرح کا ایک استعارہ ہے جس طرح ہماری زبان میں تھگلی لگانے کا استعارہ ہے۔ سورۂ انعام میں بھی آسمان میں تھگلی لگانے کا استعارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ	اور اگر ان لوگوں کا اعراض تم پر ایسا ہی شاق گزر رہا ہے
اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ	تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگا
اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ	کر ان کے لیے کوئی نشانی لا سکو تو لا دو! اگر اللہ چاہتا
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا	تو ان سب کو ہدایت پر مجتمع کر دیتا تو تم جذبات سے مغلوب
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (انعام: ۳۵)	ہو جانے والوں میں سے نہ بنو!

زہیر اور اعشیٰ نے بھی انتہائی اور آخری جدوجہد کے مفہوم کے لیے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔ زہیر کا

مصرع ہے ع ولونال اسباب السماء بسلم

اسی طرح اعشٰی کہتا ہے۔ ع ورقیت اسباب السماء بسلم۔

قطع کا مفہوم

'ثُمَّ لْيَقْطَعْ'، 'قطع' کے معنی ابومسلم نے قطع مسافت کے لیے ہیں یعنی وہ آسمان میں رسی تانے اور آسمان میں چڑھ جائے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی قطع وحی کے لیے ہیں یعنی جس کو یہ گمان ہو کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا وہ آسمان میں چڑھ کر سلسلۂ وحی کو قطع کردے۔ اکثر لوگوں نے اس کے معنی پھانسی لگانے یا گلا گھونٹ لینے کے لیے ہیں یعنی وہ چھت میں رسی لٹکا کر اپنے آپ کو پھانسی لگا لے۔ ان تاویلوں میں جو قباحت ہے اس سے قطع نظر، لفظ 'قطع' کا جو مفہوم ان حضرات نے لیا ہے وہی محل نظر ہے۔ وحی کو منقطع کردینے یا پھانسی لگا لینے کے معنی کے لیے تو اس لفظ کا استعمال بالکل ہی ناموزوں ہے۔ عربیت کا ذوق اس سے ابا کرتا ہے کہ کسی مفہوم کے لیے معروف و متداول الفاظ کے ہوتے ہوئے کسی ناموزوں لفظ کا استعمال قرآن کی فصاحت و بلاغت کے بالکل منافی ہے۔ قطع مسافت کے مفہوم کے لیے اگرچہ اس لفظ کو ناموزوں نہیں قرار دیا جاسکتا اس لیے کہ 'قطع وادی' وغیرہ کے محاورات عربی میں معروف ہیں لیکن یہاں اس لفظ کا استعمال اس مفہوم کے لیے بالکل ناموزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آسمان کی طرف رسی تاننے کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ 'فَلْيَتَصَعَّدْ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ موزوں ہوسکتا ہے۔ 'یقطع' اس کے ساتھ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تمام اقوال ضعیف ہیں۔ البتہ عزم و جزم کے ساتھ کسی معاملہ کا فیصلہ کرنے کے مفہوم کے لیے یہ لفظ اعلیٰ عربی میں معروف ہے۔ اس کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے۔ مثلاً سورۂ نمل میں ہے۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ	ملکۂ سبا نے کہا کہ اے دربار والو! میرے اس معاملے میں مجھے
اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا	لوگ اپنی رائے دیں۔ میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی
حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ (نمل: ۳۲)	جب تک آپ لوگ موجود ہو کر مشورہ نہ دیں۔

خدا سے مایوسی و بدگمانی کا انجام

اجزائے آیت کی تشریح کے بعد اب آیت کے مفہوم پر غور کیجیے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو بدبخت و نامراد خدا سے مایوس و بدگمان ہوتا ہے کہ وہ اس کی مدد نہیں کرے گا اور اس بدگمانی میں مبتلا ہو کر دوسروں کو اپنا مولیٰ و مرجع بناتا ہے وہ جو چاہے کر دیکھے، وہ آسمان میں کمند لگائے اور اپنا پورا زور لگا کر اپنے معاملہ کا فیصلہ اور غم اور پریشانی کو اگر دور کرسکتا ہے تو دور کرلے۔ مطلب یہ کہ خدا کو ایسے لاخیروں سے کوئی بحث نہیں۔ وہ جہاں چاہیں آوارہ گردی کریں اور جس جوہڑ سے چاہیں اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کریں۔ لیکن یاد رکھیں کہ انسانی فطرت کے اندر جو پیاس ہے وہ ہر جوہڑ کے پانی سے نہیں بجھ سکتی، وہ صرف ایمان کے حوض کوثر ہی سے بجھتی ہے۔ اور اس کے اندر جو خلا ہے وہ ہر اینٹ پتھر سے نہیں بھرا جاسکتا، اس کو اگر بھرا جاسکتا ہے تو صرف اللہ واحد کی یاد ہی سے بھرا جاسکتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴ 'وَمَنْ اَعْرَضَ

عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس آیت سے متعلق بعض مزید سوالات جو پیدا ہوں گے وہ اس سے صاف ہو جائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا سے مایوسی و بدگمانی شرک کے بہت بڑے عوامل میں سے ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم اپنی کتاب حقیقتِ شرک میں کر چکے ہیں۔ انسان جب خدا سے کٹتا ہے تو وہ بہر حال اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی سہارا ڈھونڈھنے کی سعی کرتا ہے لیکن حقیقی سہارا چونکہ خدا اور صرف خدا ہی ہے اس وجہ سے وہ چاہے آسمان ہی پر چڑھ جائے اس کی ساری سعی لاحاصل ہی رہتی ہے۔

اس آیت میں 'فِي الْاٰخِرَةِ' کا لفظ بھی قابلِ غور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں خدا ہی یاور و ناصر ہے اسی طرح آخرت میں بھی خدا ہی یاور و ناصر ہے۔ اگر کوئی خدا کے رحم یا انصاف سے بدگمان ہو کر کسی اور کو اپنا یاور و ناصر بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے مقابل میں اس کے کام آئیں گے تو وہ یہ بھی کر دیکھے۔ اس کے اس وہم کی حقیقت بھی قیامت کے دن اس پر آشکارا ہو جائے گی۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ (۱۶)

یہ آیت بطور تنبیہ کے ہے اور 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ توحید اور ردِ شرک کے ان روشن دلائل کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔ فرمایا کہ اسی طرح نہایت روشن دلائل کے ساتھ ہم نے قرآن کو اتارا ہے۔ اس کے بعد برنبائے قرینہ یہ مضمون محذوف ہے کہ جو صاحبِ توفیق ہوں گے وہ آیات پر ایمان لائیں گے اور جو توفیق سے محروم ہوں گے وہ، جیسا کہ اوپر آیت ۸ میں اشارہ ہوا، اللہ اور اس کی آیات میں کٹ حجتی ہی کرتے رہیں گے۔ 'وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو ہدایت و ضلالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہے اور جس کی وضاحت ہم بار بار کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت انہی کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ جو اندھے بہرے بن جاتے ہیں ان کے دلوں پر مہر کر دی جاتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۱۷)

مشرکین اور ان کے اتحادیوں کو تنبیہ

اس آیت میں جن گروہوں کا ذکر ہے ان میں سے مجوس اور مشرکین کے سوا ہر گروہ کا ذکر سورۂ بقرہ آیت ۶۲ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے یہود، نصاریٰ اور صابئین، سب پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۱۸۲-۱۸۷ جلد اول۔ مجوس اصلاً تو دین زردشت کے پیرو تھے اور دینِ زردشت کی بنیاد، جیسا کہ ہم سورۂ کہف میں بیان کر چکے ہیں، خالص توحید پر تھی لیکن جس طرح امتدادِ زمانہ سے ہر دین کا حلیہ بگڑا اسی طرح اس دین کے پیرو بھی اپنے اصل دین کو مسخ کر کے آتش پرستی اور دوسری مشرکانہ بدعتوں میں مبتلا ہو گئے۔

اوپر کی آیات میں مومنین اور مشرکین کے درمیان جس مناظرہ و مجادلہ کا ذکر ہوا ہے یہ آیت بھی اسی سے متعلق ہے۔ اس مناظرہ کے اصلی فریق تو مسلمان اور مشرکین قریش ہی تھے لیکن اس دور میں، جیسا کہ پیچھے کی سورتوں میں تفصیل گزر چکی ہے، دوسرے مذاہب کے پیرو بھی، جو عرب میں موجود تھے، اس میں فریق بن گئے، اور چونکہ اسلام کی دعوت کی زد ان سب پر پڑتی تھی اس وجہ سے ان کی ہمدردیاں مشرکین کے ساتھ تھیں۔ خاص طور پر یہود و نصاریٰ تو کھلم کھلا ہر محاذ پر ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ قرآن نے ان سب کو نام لے کر آگاہ کیا کہ آج خدا اور اس کی آیات کے باب میں جو محاذ گرم ہے وہ یہیں نہیں ختم ہو جائے گا بلکہ یہ قضیہ قیامت کے دن خدا کی عدالت میں بھی پیش ہونے والا ہے جس میں ایک طرف اہلِ ایمان ہوں گے، دوسری طرف یہ مشرکین اور ان کے ہمنوا — یہود، صابئین، نصاریٰ اور مجوس — اس دن خدا فیصلہ فرمائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'فیصلہ' سے مقصود اس کے نتیجہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اس دن ہر ایک کے سامنے اس کی اس سعی و سرگرمی کے نتائج آ جائیں گے جس میں وہ آج مصروف ہے۔ اہلِ ایمان اپنی جانبازیوں کا صلہ پائیں گے اور کفار و مشرکین اور ان کے اتحادی اپنی سرگرمیوں کے نتائج بھگتیں گے۔

'اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ' اہلِ ایمان کے لیے پیامِ تسلی اور اہلِ شرک اور ان کے حامیوں کے لیے تہدید و وعید ہے کہ خدا ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اپنے باایمان بندوں کی جانبازیوں اور سرفروشیوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور مخالفین کی سازشوں اور شرارتوں کو بھی۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک کے ساتھ ٹھیک وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ٹھہرے گا۔

جو اہلِ ایمان کے ساتھ نہیں وہ اہلِ کفر ہیں

اس آیت میں آپ نے غور کیا ہوگا کہ سب سے پہلے اہلِ ایمان کا ذکر ہوا ہے اور آخر میں مشرکین کا اور بیچ میں دوسرے مختلف فرقوں کا۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ہے کہ اصل فریق کی حیثیت اس مباحثہ و مناظرہ میں انہی دو کو حاصل تھی، باقی گروہوں کی حیثیت ضمنی تھی۔ چنانچہ آگے آیت ۱۹ میں تصریح بھی ہے کہ اصل فریق دو ہیں۔ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر و شرک۔ جو اہلِ ایمان کے ساتھ نہیں ہے وہ اہلِ کفر میں سے ہے، خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی دین کی پیروی کا مدعی ہو۔

اسم و فعل کے مواقع استعمال میں ایک نازک فرق

آیت میں مختلف گروہوں کے ذکر کے لیے جو اسلوبِ بیان اختیار فرمایا گیا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ مسلمانوں اور یہود و مشرکین کا ذکر تو فعل کی شکل میں ہوا ہے اور صابئین، نصاریٰ اور مجوس کا اسم کی شکل میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملاً اس میدان میں ایک طرف مسلمان تھے، دوسری طرف مشرکین اور یہود۔ یہود، مشرکین کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں اپنے حسد و عناد کے باعث بہت سرگرم تھے۔ باقی فرقوں کی ہمدردیاں اگرچہ تھیں تو مشرکین ہی کے ساتھ لیکن وہ کچھ زیادہ سرگرم نہ تھے۔ اس وجہ سے معرکہ کے اصلی حریفوں کو تو فعل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور دوسروں کا

ذکر اسم کے ساتھ۔ زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ فعل کے اندر ایک قسم کی سرگرمی کا مفہوم پایا جاتا ہے جب کہ اسم بالعموم صرف علامت امتیاز کا فائدہ دیتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ (۱۸)

کائنات کی ہر چیز سجدے میں ہے

یہ توحید کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جس کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز اپنے وجود سے دے رہی ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز اپنی تکوینی حیثیت میں ابراہیمی مزاج رکھتی ہے۔ سورج، چاند، تارے، پہاڑ اور چوپائے سب خدا کے امر و حکم کے تحت مسخر ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی سرِمُو خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین سے انحراف نہیں اختیار کرتی۔ سورج، جس کو نادانوں نے معبود بنا کر سب سے زیادہ پوجا ہے، خود اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ وہ شب و روز اپنے رب کے آگے قیام، رکوع اور سجدے میں ہے۔ طلوع کے وقت وہ سجدے سے سر اٹھاتا ہے، دوپہر تک وہ قیام میں رہتا ہے، زوال کے بعد وہ رکوع میں جھک جاتا ہے اور غروب کے وقت وہ سجدے میں گر جاتا ہے اور رات بھر اسی سجدے کی حالت میں رہتا ہے۔ اسی حقیقت کا مظاہرہ چاند اپنے عروج و محاق سے اور ستارے اپنے طلوع و غروب سے کرتے ہیں۔ پہاڑوں، درختوں اور چوپایوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں سے ہر چیز کا سایہ ہر وقت قیام، رکوع اور سجود میں رہتا ہے۔ اور غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی نظر آئے گی کہ اس سایہ کی فطرت ایسی ابراہیمی ہے کہ یہ ہمیشہ آفتاب کی مخالف سمت میں رہتا ہے۔ اگر سورج مشرق کی سمت میں ہے تو سایہ مغرب کی جانب پھیلے گا اور اگر مغرب کی جانب ہے تو ہر چیز کا سایہ مشرق کی طرف پھیلے گا۔ گویا ہر چیز کا سایہ اپنے وجود سے ہمیں اس بات کی تعلیم دے رہا ہے کہ سجدہ کا اصل سزاوار آفتاب نہیں بلکہ خالقِ آفتاب ہے۔

توحید کی یہ دلیل اشارات کی نوعیت کی ہے اس وجہ سے یہ منطق کی گرفت میں نہیں آتی لیکن نظامِ کائنات میں تدبر کرنے والوں کی نظر میں ان اشارات کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ع

آں کس است اہلِ بشارت کہ اشارت داند

یہی دلیل سورۂ رعد میں یوں بیان ہوئی ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (رعد - ۱۵)	اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خواہ طوعاً یا کرہاً اور ان کے سائے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں صبح و شام۔

اس آیت کی وضاحت سورۂ رعد میں ہم کر چکے ہیں۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس میں ظِلٰلُهُمْ

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ' کے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اگر کوئی شامت کا مارا اپنے دائرۂ اختیار میں خدا کو سجدہ کرنے سے بغاوت کرتا ہے تو اس کا اپنا سایہ اپنی شہادتِ حال سے اس پر اظہارِ نفرت کرتا ہے اور وہ بدستور اپنی ابراہیمی فطرت پر جما رہتا ہے، کسی حال میں بھی کسی غیر اللہ کے آگے جھکنے کا ننگ گوارا نہیں کرتا۔

سورۂ نحل میں یہی دلیل اس طرح بیان ہوئی ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۔ (نحل: ۴۸-۴۹)	کیا ان لوگوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ ان کے سائے داہنے اور بائیں سے لوٹتے ہیں اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہوئے اور وہ اس کے آگے سرنگندہ ہوتے ہیں اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں آسمانوں اور زمین میں جو جاندار بھی ہیں اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

سب سے بڑا شرف سب سے بڑی ذلت!

وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ' یعنی یہی حال ان بہت سے اللہ کے بندوں کا بھی ہے جن کی فطرت سلیم ہے۔ جس طرح کائنات کی تمام بے ارادہ اشیاء اللہ ہی کے امر کے تابع اور اسی کے آگے سربسجود ہیں اسی طرح اللہ کے بہت سے بندے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اختیار و ارادے کو اللہ ہی کے امر و حکم کے تابع کر دیا ہے اور وہ اپنے رب کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں کرتے لیکن بہتوں نے اپنے اس اختیار و ارادہ کو غلط استعمال کیا ہے اور اس سب سے بڑے شرف کو، جو اللہ نے ان کو بخشا، اپنی شامتِ اعمال سے انھوں نے اپنے لیے سب سے بڑی گمراہی اور سب سے بڑی ذلت کا سبب بنا لیا۔ کائنات کی چیزوں کا حال تو یہ ہے کہ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کی خدمت کے لیے بنایا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ انسان کو سجدہ کرے لیکن انسان کی رذالت و سفاہت کا حال یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہوتے ہوئے اپنے سے فروتر مخلوقات کو معبود مان کر ان کے آگے ڈنڈوت کرتا ہے! فرمایا ہے کہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کا عذاب واجب ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے کو بھی ذلیل کیا اور اپنے رب کی بھی نہایت تحقیر کی۔

انسان کا شرف کردار کے ساتھ مشروط ہے

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ' یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے انسان کو جو شرف بخشا ہے وہ صفات و کردار کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ اس شرف کا حق ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے شرف کو قائم رکھتا ہے اور اس کے درجات و مراتب میں اضافہ فرماتا ہے اور اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتا تو وہ اس کو اپنی سنت کے مطابق اسی گڑھے میں گرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے جس میں وہ گرنا چاہتا ہے۔ 'نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى' اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی

سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ اس سنتِ الٰہی کی زد میں آجاتے ہیں ان کو کوئی دوسرا سنبھالنے والا نہیں بن سکتا۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے کہ اب یہ لوگ جس ذلت کے گڑھے میں گر چکے ہیں اس سے ان کو نکالنے کے لیے تم لاکھ جتن کر و لیکن یہ اس سے نکلنے والے نہیں ہیں۔ خدا کی مشیت کا فیصلہ اس اتمامِ حجت کے بعد یہی ہے کہ اب یہ اس ذلت کی مار کھائیں۔

من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ انسان کا اصلی شرف توحید ہے، اگر وہ اس شرف سے اپنے کو محروم کرے تو اس کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز سے بھی وہ فروتر اور حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ دوسری حقیقت اس سے یہ واضح ہوئی کہ اس کائنات کے ساتھ انسان کی ہم آہنگی اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اس کی پیشانی کسی غیر اللہ کے سجدے سے آلودہ نہیں ہوتی۔ اگر وہ اس ذلت پر راضی ہو جائے تو وہ اس پوری کائنات سے بالکل بے جوڑ اور گول خلنے میں ایک چوکھٹی چیز بن کر رہ جاتا ہے یہاں تک کہ خود اس کا اپنا سایہ بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر اس میں اور اس کے سایہ میں ایسی بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس پر "من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید" کی مثل صادق آتی ہے۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۚ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۚ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۚ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۱۹-۲۲)

دونوں گروہوں کے انجام کی تفصیل

اب یہ ان دونوں فریقوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۱۷ میں گزرا۔ وہاں صرف اس قدر اشارہ فرمایا تھا کہ ایک دن آئے گا جب اللہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا، ان کے انجام کی تفصیل اس آیت میں بیان نہیں ہوئی تھی۔ ان آیات میں ان کے انجام کی تفصیل آرہی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

آیت ۱۷ میں کئی گروہوں کا ذکر ہے اور یہاں هٰذٰنِ خَصْمٰنِ کے الفاظ ہیں۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس آیت میں انہی گروہوں کی طرف اشارہ ہے تو ان کے لیے مثنیٰ کا صیغہ کیوں استعمال ہوا، جمع کا صیغہ کیوں نہیں استعمال ہوا؟ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان، کلامِ عرب کی روشنی میں اس بات کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ اگر فریق دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے مثنیٰ اور جمع دونوں کے صیغے استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہاں اِخْتَصَمُوْا کے صیغۂ جمع سے بھی ان کے خیال کی تائید نکلتی ہے۔ لیکن میرا رجحان، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا، اس بات کی طرف ہے کہ یہاں اوپر کے گروہوں کا ذکر، ان کے ظاہری تعدد کو نظر انداز کر کے، ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہوا ہے۔ فی الظاہر تو یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس اور مشرکین الگ الگ گروہ تھے لیکن جہاں تک توحید اور اسلام کی مخالفت کا تعلق ہے اس میں یہ سب مشترک تھے بلکہ مخالفت کا مزاج، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، الگ الگ ضرور تھا لیکن اسلام کی مخالفت میں،

اپنے اپنے رجحان کے مطابق، سب شریک تھے اس وجہ سے قرآن نے اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کے اصول کے مطابق ان سب کو ایک ہی پارٹی قرار دیا اور ان کے مقابل میں مسلمانوں کو ایک مستقل پارٹی کی حیثیت دی اور اسی حیثیت سے دونوں کے انجام کو بیان فرمایا۔

'اِخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّہِمْ' میں اسی بحث و جدال کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں اور ان کی مخالف پارٹیوں کے درمیان در باب شرک و توحید برپا تھا اور جس کا ذکر اوپر آیت ۳ اور آیت ۸ میں گزر چکا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ توحید اور شرک کے اس معرکے میں اہل کتاب نے، اہل کتاب ہونے کا دعوےٰ رکھتے ہوئے، کھلم کھلا مشرکین عرب کا ساتھ دیا۔

شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے کفر ہے

'فَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا' سے مراد وہ تمام پارٹیاں ہیں جنھوں نے توحید و شرک کی اس جنگ میں شرک کا ساتھ دیا۔ شرک کو کفر سے تعبیر کرنے کی وجہ کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ شرک اپنی اصل حقیقت و غایت کے اعتبار سے کفر ہی ہے اسی وجہ سے قرآن میں شرک کو کفر سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ شرک کو کفر کے مقابل میں اہون خیال کرتے ہیں ان کا خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

جزاء اور عمل کی مطابقت

'قُطِّعَتْ لَہُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ' یعنی اس دنیا میں وہ حق کی مخالفت کے جوش میں نفرت، غصہ، حسد اور انتقام کی جس آگ میں جلتے رہے ہیں اس کی پاداش میں آخرت میں ان کے لیے آگ ہی کا جامہ تراشا جائے گا اور ان کے سروں پر کھولتا پانی انڈیلا جائے گا جو ان کے تمام اندرونی اعضاء اور ان کی بیرونی کھالوں کو پگھلا کے رکھ دے گا۔

'وَلَہُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ ۝ کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْہَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْہَا':

'مَقَامِعُ' کے معنی ہتھوڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سرکوبی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے موجود ہوں گے۔ اگر وہ دوزخ کی کسی آفت سے بھاگنے کی کوشش کریں گے تو انہی ہتھوڑوں سے ان کی سرکوبی کر کے اسی آفت میں پڑے رہنے کے لیے ان کو واپس کیا جائے گا۔ 'مِنْ غَمٍّ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہاں دوزخ سے بھاگ نکلنے کا تو کوئی تصور بھی نہ کر سکے گا۔ بس زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کوشش کر سکے گا تو اس بات کی کر سکے گا کہ ایک آفت کی شدت سے گھبرا کر کسی دوسری آفت کی پناہ ڈھونڈھے لیکن اس کا امکان بھی وہاں نہیں ہوگا۔ دوزخ کے داروغے لوہے کے ہتھوڑوں سے ان کی سرکوبی کریں گے۔

زبانِ حال کی تعبیر

'وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ' یہ زبانِ حال کی تعبیر ہے۔ یعنی صورتِ حال خود ان کو پکار کر سنا دے گی کہ اب یہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے، اب اسی میں رہو اور جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو! اسی طرح کے مواقع میں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آئے ہیں، 'قِیْلَ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زبانِ حال زبانِ قال سے زیادہ ناطق اور فصیح البیان ہوتی ہے۔ یہاں عربی کے معروف اسلوب کے مطابق معطوف علیہ محذوف ہے۔ یعنی اِخْسَئُوْا فِیْہَا، وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ۔ اس کی مثالیں پیچھے

گزر چکی ہیں۔

یہاں عمل اور جزا کی مشابہت کے پہلو پر بھی نگاہ رہے۔ جن لوگوں کو قعرِ ہلاکت سے نکالنے کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے اپنا سارا زور صرف کر ڈالا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اس سے نکلنے پر راضی نہ ہوتے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے اس بنا پر دشمن بن گئے کہ انھوں نے ان کو اس سے نکالنے کی کوشش کی تو آخرت میں جب اس کی حقیقت سامنے آئے گی تو اس سے بھاگنے کے کیا معنی؟ دنیا میں جس چیز سے ان کو اتنا عشق رہا اب اس کا مزہ چکھیں۔

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ۝ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوا إِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيدِ (۲۳-۲۴)

اہلِ حق کے انجام کی تفصیل

مخالفینِ حق کا انجام بیان کرنے کے بعد اب یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو مخالفین کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم موقفِ حق پر ڈٹے رہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ 'يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا' میں 'لُؤْلُؤًا'، 'اساور' کے محل پر عطف ہے۔ یعنی وہ اس جنت میں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔ 'وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس جنت میں ان کا لباس ریشم ہی ریشم ہوگا۔ اسی کا لباس، اسی کا اوڑھنا، اسی کا بچھونا، اسی کے دوسرے لوازم۔

قولِ طیب سے مراد

'وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ' سے اہلِ جنت کے اس کلمۂ حمد و شکر کی طرف اشارہ ہے جو ان کی زبانوں سے بے تحاشا اس وقت ادا ہوگا جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے رب نے جتنے وعدے کیے وہ سب پورے ہوئے۔ سورۂ زمر آیت ۷۴ میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے۔ 'وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ' (اور وہ سب پکار اٹھیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہم سے اپنے کیے ہوئے وعدے پورے کیے) اسی ترانۂ حمد کا ذکر سورۂ فاطر آیت ۳۴-۳۵ میں بھی ہے۔ 'وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۖ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ۝ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ' (اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہم سے غم کو دور کیا، بے شک ہمارا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا اور پذیرائی فرمانے والا ہے۔ جس نے اپنے فضل سے ہمیں قرار کی منزل میں اتارا)

صراطِ حمید کا مفہوم

'وَهُدُوا إِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيدِ'۔ 'صِرَاطِ الْحَمِيدِ' سے مراد میرے نزدیک اسی 'دَارُ الْمُقَامَةِ' کی شاہراہ ہے جس کی طرف سورۂ فاطر کی محولہ بالا آیت میں اشارہ ہوا۔ یہاں لفظ ہدایت، منزلِ مقصود کی طرف ہدایت کے مفہوم میں ہے اور صیغۂ مجہول تشریف و تکریم پر دلیل ہے کہ ملائکہ کی ایک جماعت کے ذریعہ سے ان لوگوں کی رہنمائی اس شاہراہ کی طرف کی جائے گی جو اس دار المقامۃ تک ان کو پہنچائے گا جو خدائے

حمید نے ان کے قیام کے لیے پسند فرمایا ہے۔

شاہدِ حق کے احوال کی تعبیر بادہ و ساغر کے الفاظ سے

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جنت و دوزخ وغیرہ کے احوال کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہے۔ ان کو مخاطب کے ذہن سے قریب لانے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کی تعبیر کے لیے وہ اسلوب اختیار کیا جائے جس سے مخاطب مانوس ہوں۔ اہلِ عرب مصریوں اور ایرانیوں کے تمدن سے متاثر تھے اس وجہ سے تنعم و رفاہیت کی تعبیر کے لیے وہی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جس میں یا تو خود ان کے اپنے تصورات تنعم کی جھلک ہوتی ہے یا پھر ان تصورات کی جھلک ہوتی ہے جن سے فی الجملہ وہ آشنا تھے۔ ان تصورات میں زمانہ کے اختلاف سے بھی بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے الفاظ کے بجائے ہمیشہ حقیقت پر نظر رکھنی چاہیے۔ بس یہ ماننا چاہیے کہ اہلِ جنت کو یہ نعمتیں حاصل ہوں گی جو قرآن میں مذکور ہوئیں، رہی یہ بات کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے تو ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ جس طرح بعض اوقات شاہدِ حق کے

• احوال و معاملات کے لیے بادہ و ساغر کی تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں اسی طرح احوالِ آخرت کی تعبیر ان الفاظ و تمثیلات سے کی جاتی ہے جو مخاطب کے لیے قریب الفہم ہوں۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۵ - ۳۷

توحید و شرک کی بحث جو اوپر سے چلی آ رہی ہے یہاں وہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ قریش اور ان کے ہمنواؤں نے اس دور میں جو اتنی شدید خصومت کی روش اختیار کر لی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ دعوتِ توحید اور ابطالِ شرک کی اس جدوجہد کی نوعیت صرف ایک کلامی و عقائدی نزاع کی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرب ان کی اس کہنتی اور سیادت و قیادت پر بھی پڑنے والی ہے جو ان کو حرم کی تولیت کی بدولت حاصل ہے۔ قریش نے حرم پر اپنا قبضہ جما رکھا تھا اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس وراثت کے اصلی حقدار اور متولی و امین وہی ہیں۔ خاندانِ بنی ہاشم کو خانہ کعبہ کی کلید برداری کا منصب حاصل تھا اور ان کا سرغنہ اس زمانے میں ابولہب تھا جو رفادہ کے تمام خزانے پر غاصبانہ قابض اور اس میں من مانے تصرفات کے لیے پوری طرح آزاد تھا۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قریش کو صرف مکہ ہی میں سیادت و امارت حاصل نہیں تھی بلکہ حرم کے پاسبان سمجھے جانے کے سبب سے پورے عرب پر ان کی مذہبی پیشوائی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے حالات میں وہ ایک ایسی دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں کس طرح برداشت کر سکتے تھے جو ان کو ان تمام مفادات سے یک قلم محروم کر دے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو حرم کی حاضری سے بھی محروم کر دیا اور ظلم و تشدد کے زور سے ان کو سرزمین مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ان حالات میں یہ آیات اتریں جن میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کو کس مقصد کے لیے بنایا تھا، ان کی دعوت کیا تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کن شعائر و مناسک

کی تعلیم دی تھی۔ یہ گویا ایک آئینہ ہے جو قریش کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس میں اپنا منہ دیکھ کر خود فیصلہ کر لیں کہ وہ اس وراثتِ ابراہیمی کے حق دار ہیں یا غاصب و غدار! ضمناً مسلمانوں کی اس میں حوصلہ افزائی بھی فرمائی گئی ہے اور ان کو ان ذمہ داریوں سے بھی آگاہ فرمایا گیا ہے جو آگے اس گھر کے مناسک و شعائر سے متعلق ان پر عاید ہونے والی ہیں ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۵-۳۷ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَنْ
۳ ع ۴ ۱۰ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٥﴾ وَإِذْ
بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ
لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿٢٦﴾ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ
بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ
عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ
مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَ
أَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا
نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾ ذَٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُعَظِّمْ
حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۗ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ
إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ۖ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ
الزُّورِ ﴿٣٠﴾ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ
فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ
فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ﴿٣١﴾ ذَٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ

تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ
اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا
اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۭ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۭ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ
اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي
الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ
مِّنْ شَعَاۗىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ڰ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَاۗفَّ ۚ
فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۭ
كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ
لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰي مِنْكُمْ ۭ كَذٰلِكَ
سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ ۭ وَبَشِّرِ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

ترجمۂ آیات ۲۵-۳۷

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ لوگوں کو اللہ کی راہ اور اس مسجد حرام سے روکتے ہیں جس کو ہم نے لوگوں کے لیے یکساں بنایا، خواہ وہ اس کے شہری ہوں یا آفاقی (تو انھوں نے بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا) اور جو اس میں کسی بے دینی، کسی شرک کے ارتکاب کا ارادہ کریں گے تو ہم ان کو ایک عذاب دردناک کا مزا چکھائیں گے۔ ۲۵

اور یاد کرو جب کہ ہم نے ابراہیم کے لیے ٹھکانا بنایا بیت اللہ کی جگہ کو اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں

اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو! اور لوگوں میں حج کی منادی کر دو، وہ تمہارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی جو پہنچیں گی دور دراز گہرے پہاڑی رستوں سے۔ تاکہ لوگ اپنی منفعت کی جگہوں پر بھی پہنچیں اور چند خاص دنوں میں، ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت قدیم کا طواف کریں۔ ۲۶-۲۹

ان امور کا اہتمام رکھو! اور جو حرمات الٰہی کی تعظیم کرے گا تو اس کے رب کے نزدیک یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور تمہارے لیے چوپائے حلال ٹھہرائے گئے ہیں بجز ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنا دیے گئے ہیں تو بتوں کی گندگی سے اجتناب رکھو اور جھوٹ بات سے بچو۔ اللہ ہی کی طرف یکسو رہو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔ ان امور کا اہتمام رکھو! اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے۔ اور تمہارے لیے ان ہدی کے جانوروں میں ایک خاص وقت تک مختلف قسم کی منفعتیں ہیں پھر ان کو قربانی کے لیے قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔ ۳۰-۳۳

اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مشروع کی تاکہ اللہ نے ان کو جو چوپائے بخشے ہیں ان پر وہ اس کا نام لیں۔ پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرو۔ اور خوش خبری دو ان کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے

کہ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے ان کے دل دہل جاتے، ان کو جو مصیبت پہنچتی ہے اس پر صبر کرنے والے، نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ ۳۴-۳۵

اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے شعائر الٰہی میں سے ٹھہرایا ہے۔ تمہارے لیے ان میں بڑے خیر ہیں تو ان پر اللہ کا نام لو ان کو صف بستہ کر کے۔ پس جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور کھلاؤ قانع محتاجوں اور سائلوں کو۔ اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم خدا کے شکر گزار رہو۔ اور اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون بلکہ اس کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم اللہ کی ہدایت بخشی پر اس کی تعظیم بجا لاؤ۔ اور خوب کاروں کو خوش خبری سنا دو۔ ۳۶-۳۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۵)

تالیف کلام کی دو شکلیں — اس آیت میں تالیف کلام کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے لے کر اَلْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ تک پورے ٹکڑے کو بطور توطیہ و تمہید مانیے اور اصل مبتدا وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ کو قرار دیجیے۔ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں خبر کو یعنی فَقَدْ ظَلَمُوْا ظُلْمًا كَبِيْرًا یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف مانیے۔ عربیت کے قاعدے سے یہ دونوں شکلیں صحیح ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان پہلی صورت کی طرف ہے اور میرا رجحان دوسری شکل کی طرف۔ میں نے ترجمے میں اسی کا لحاظ رکھا ہے لیکن آیت کی تاویل میں دونوں ہی صورتوں میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوگا۔

اشارہ قریش کی طرف — اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یہ اشارہ قریش کی طرف ہے۔ جنھوں نے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر دیا تھا اور مسلمانوں کو جبر و زور کے ذریعہ سے اللہ کے دین سے بھی روک رہے تھے اور اس دور میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، انھوں نے مسلمانوں کو حرم کی حاضری سے بھی محروم کر دیا تھا۔

بنی ہاشم کی مہنتی پر ضرب

'الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ'۔ یہ مسجد حرام کی تعریف ہے کہ اللہ نے اس میں حدود حرم کے مقیمین اور باہر سے آنے والوں دونوں کے حقوق یکساں رکھے ہیں۔ یہ قریش کی اجارہ داری اور خاص طور پر بنی ہاشم کی مہنتی پر ضرب ہے کہ انھوں نے اللہ کے اس گھر پر اپنا جو تسلط مالکانہ و حاکمانہ جما رکھا ہے، جس کو چاہیں اس میں آنے دیں، جس کو چاہیں اس کی حاضری سے محروم کر دیں یہ بالکل ناجائز ہے۔ اس گھر پر کسی خاص خاندان کا اجارہ نہیں ہے۔ ہر شخص جو اللہ کی عبادت اور حج و طواف کے لیے اس گھر کا قصد کرے، خواہ قرشی و ہاشمی ہو یا غیر قرشی و غیر ہاشمی، مکی ہو یا غیر مکی، عربی ہو یا عجمی اس کے اور کسی کو کوئی قدغن عاید کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے مقیمین کا اگر کوئی حق و فرض ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ اس کو ان گندگیوں سے پاک و صاف رکھیں جن سے اس کو پاک و صاف رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا تھا اور جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ لیکن قریش کی یہ ستم ظریفی ہے کہ انھوں نے اللہ کے اس گھر کو ان تمام نجاستوں سے تو بھر دیا ہے جن سے پاک رکھنے کی اللہ نے ہدایت فرمائی تھی لیکن اس کی تولیت کے مدعی بنے بیٹھے ہیں اور اللہ کے ان بندوں کو اس سے روک رہے ہیں جو اس کو اس کے اصل ابراہیمی حسن و جمال سے از سر نو منور کرنا چاہتے ہیں۔

'الْعَاكِفُ وَالْبَادِ' کا عام مفہوم تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہاں مقیم و آفاقی کا ہے لیکن حرم کے باشندوں کے لیے 'عاکف' کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے ان کی اصل حیثیت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کی حیثیت حرم الٰہی کے ٹھیکیداروں، اجارہ داروں اور حکمرانوں کی نہیں ہے بلکہ اس کے معتکفین اور خدمت گزاروں کی ہے۔ وہ اس کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح تمام دنیا کے لیے حج و عبادت کا مرکز بنائیں اور تمام خلق کو دعوت دیں کہ لوگ اس کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے اس آستانۂ الٰہی پر آئیں۔

مسجد حرام پر کسی خاندان یا حکومت کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی

ان الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جہاں تک مسجد حرام کا تعلق ہے اس پر کسی خاندان یا کسی مخصوص حکومت کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی۔ اس میں عرب و عجم اور مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں کے حقوق بالکل یکساں ہیں۔ اہل مکہ یا ان کی حکومت کی حیثیت اس کے مالکوں کی نہیں بلکہ اس کے پاسبانوں اور خدمت گزاروں کی ہے۔ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو شرک و بدعت کے ہر شائبہ سے پاک و صاف رکھیں اور اللہ کے جو بندے حج و قربانی کے لیے وہاں پہنچیں ان کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کریں لیکن کسی حال میں بھی دنیا کے کسی خطہ کے کسی مسلمان کو وہ اس کی حاضری سے محروم نہیں کر سکتے الا آنکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ اللہ کے اس گھر کو ان مقاصد کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے جن

کے لیے حضرت ابراہیم نے اس کی تعمیر فرمائی ہے۔

حقوق کے ساتھ ساتھ اس گھر کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داریوں میں بھی تمام دنیا کے مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ جو لوگ اس کے پاسبان ہیں وہ اس کو ان چیزوں سے آلودہ کر رہے ہیں جن سے اللہ نے اس کو پاک صاف رکھنے کا حکم دیا ہے تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی یہ مشترک ذمہ داری ہے کہ وہ پاسبانوں کے ہاتھ پکڑیں۔ اس کے پاسبان یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ان کے گھر کا داخلی معاملہ ہے، دوسروں کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔

مسجد حرام کی حفاظت تمام مسلمانوں کی مشترک ذمہ داری ہے

اسی طرح اگر خدانخواستہ کوئی بیرونی طاقت اس پر حملہ کر دے تو اس کی حفاظت و مدافعت کے لیے تمام دنیا کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جائے گا۔ اس معاملے میں کسی قومی یا بین الاقوامی معاہدے اور مصلحت کا بھی کوئی لحاظ جائز نہیں ہوگا۔ اگر کسی ملک کی حکومت اس جہاد میں شرکت سے روکے تو ہر چند وہ نام نہاد مسلمانوں ہی کی حکومت ہو، اس کے خلاف بھی اہل ایمان پر فرض ہوگا کہ وہ جہاد کریں، اس لیے کہ حرم کی حفاظت و مدافعت کی ذمہ داری صرف اہل مکہ یا ان کی حکومت پر نہیں ہے بلکہ ہر کلمہ گو پر ہے۔ اس کو کسی صورت میں بھی پرایا جھگڑا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حرم کے حقوق اور ذمہ داریوں میں ہر مسلمان برابر کا شریک ہے۔ حرم امتِ مسلمہ کا دل ہے۔ اس کی صلاح تمام امت کی صلاح اور اس کا فساد پوری ملت کا فساد ہے۔

'سَوَآءَ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ' کے الفاظ سے یہ نتائج تو بدیہی طور پر نکلتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے لیکن ہمارے فقہاء کی ایک جماعت نے اس سے یہ مسئلہ بھی استنباط کیا ہے کہ حدودِ حرم میں نہ کوئی گھر کسی کی ذاتی ملکیت ہو سکتا اور نہ وہ کسی دوسرے سے کسی گھر کا کرایہ وصول کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ استنباط ضعیف ہے۔ آیت کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ 'جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ا لْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ' کے الفاظ مسجد حرام کی صفت کی حیثیت سے وارد ہوتے ہیں، پورے مکہ یا تمام حدودِ حرم کی صفت کے طور پر نہیں آئے ہیں۔ اس وجہ سے میں اس مسئلہ میں شوافع کے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں جو اس پابندی کے حق میں نہیں ہیں۔

'وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ'۔ 'يُّرِدْ' کے بعد 'ب' کا صلہ اس کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'هَمّ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے۔ 'الحاد' کے معنی انحراف، کجی اور بے دینی کے ہیں۔ 'بظلم'، 'بالحاد' سے بدل واقع ہے۔ اور لفظ شرک کے مفہوم کے لیے قرآن مجید میں معروف ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہے کہ یہ گھر وہ گھر ہے کہ اس میں اگر کوئی کسی بے دینی کا اور وہ بھی شرک جیسی بے دینی کرے گا تو ہم اس کو ایک عذاب دردناک کا مزا چکھائیں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ارادہ، اور هَمّ میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ارادہ تو سوچ سمجھ کر ظہور میں آتا ہے لیکن 'هَمّ' جیسا کہ 'وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا'

(توبہ: ۷۴)، وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا (یوسف: ۲۴) وغیرہ آیات میں وارد ہے کسی وقتی میلانِ نفس سے بھی ظہور میں آ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس گھر کے شرائط و آداب بہت سخت ہیں۔ یہاں ان غلط چیزوں پر بھی گرفت ہے جو وقتی میلاناتِ نفس سے ظہور میں آ جاتی ہیں۔ ع

ہشدار کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

'الحاد' کے بعد 'ظلم' کا اضافہ کر کے یہ حقیقت واضح فرما دی کہ جب یہاں معمولی کجروی بھی قابلِ گرفت ہے تو اس شرکِ عظیم کے لیے یہاں کس طرح گنجائش نکل سکتی ہے جس کا ایک وسیع کاروبار یہاں قریش نے پھیلا رکھا ہے!

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (۲۶)

حضرت ابراہیمؑ اور بیت اللہ کی صحیح تاریخ

اب یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بیت اللہ کی تاریخ بیان ہو رہی ہے تاکہ قریش پر یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جن مقاصد کے لیے اللہ نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام سے یہ گھر تعمیر کرایا تھا وہ سارے ہی مقاصد انھوں نے برباد کر کے رکھ دیے ہیں اس وجہ سے یہ سزاوار ہیں کہ اب یہاں سے بے دخل ہوں اور وہ لوگ اس کے ذمہ دار بنائے جائیں جو اس عظیم امانتِ الٰہی کا حق ادا کرنے والے ہوں۔

'وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ' 'تبویہ' کے معنی ٹکانے، ٹھہرانے، آباد کرنے اور بسانے کے ہیں۔ یعنی تاریخ کی اس سرگزشت کو یاد کرو جب کہ ہم نے خاص اپنے حکم سے، ابراہیمؑ کی ہجرت کے بعد، ان کو اور اسماعیلؑ کو اس جگہ بسایا جس جگہ بیت اللہ ہے۔ 'بَوَّاْنَا' کے بعد 'لِ' اس امر کا قرینہ ہے کہ یہ مقام صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کا مسکن نہیں ٹھہرایا گیا تھا بلکہ ان کی ذریت (حضرت اسماعیلؑ) کا مسکن بھی یہی قرار پایا تھا۔ اہلِ عرب اپنی اس تاریخ سے بالاجمال واقف اور اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اولاد اور ان کی ملت کے وارث ہیں لیکن یہود نے یہ سازش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے بہت پہلے ہی تورات سے وہ ساری چیزیں نکال دیں یا ان کی تحریف کر دی جو حضرت ابراہیمؑ کے بیت اللہ کے ساتھ تعلق کی شہادت دینے والی تھیں تاکہ آخری رسول کی بعثت بنی اسمٰعیل کے اندر نہ ثابت ہو سکے۔ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی ایک من گھڑت تاریخ بنائی اور یہ دکھانے کی کوشش کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کے بعد اپنا مستقر شام میں بنایا نہ کہ مکہ میں اور اپنے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسحاقؑ ہیں نہ کہ حضرت اسماعیلؑ۔ اور پھر مروہ، مکہ اور بیت اللہ اور ان سے تعلق رکھنے والی ساری ہی چیزوں پر تحریف کی سیاہی پھیرنے کی کوشش کی لیکن آخر وہ آفتاب سے زیادہ روشن حقیقت کو کہاں تک چھپانے میں کامیاب

ہوتے۔ اب بھی تورات ہیں، یہود کے علی الرغم، ایسی شہادتیں موجود ہیں جو ان کی سازش کا پردہ چاک کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف 'الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح' میں یہود کی ان ساری سازشوں کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا ہے اور ہم بھی اس کتاب میں تمام ضروری مباحث سے تعرض کر رہے ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۲۲ - ۱۴۱ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

قریش کے سامنے تاریخ کا آئینہ

'اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْئًا وَّطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ' بعینہٖ یہی مضمون کم و بیش انہی الفاظ میں، سورۂ بقرہ میں یوں بیان ہوا ہے۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ — اور ابراہیم اور اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر

طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ — کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (بقرہ : ۱۲۵) — سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ آیت ایک آئینہ ہے تاکہ قریش اس میں یہ دیکھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس مقصد اور کس حکم و ہدایت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کو اس گھر کی تعمیر پر مامور فرمایا تھا اور یہ اب اس کو قریش نے کیا بنا کے رکھ دیا ہے، پھر بھی اس کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اور ان لوگوں کو اس سے روک رہے ہیں جو اس گھر کے اصلی مقاصد کی از سر نو تجدید کرنا چاہتے ہیں۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (۲۷)

'رِجَال'، 'رَاجِل' کی جمع ہے جس کے معنی پیادہ چلنے والوں کے ہیں۔ 'ضَامِرٌ' اس اونٹ یا اونٹنی یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو طولِ سفر سے لاغر ہو گیا ہو۔ یہ لفظ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ 'کل' اس کے ساتھ صفت کی تاکید کے طور پر ہے۔ مثلاً کہیں گے 'ھو العالم کل العالم' (وہ نہایت جید عالم ہے)۔ 'فج' پہاڑوں کے درمیان کے راستہ کو کہتے ہیں اور 'عمیق' اسی کی صفت ہے۔ پہاڑی راستے چونکہ تنگ ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ کثرتِ آمد و رفت سے گہرے ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کو منادیٔ عام

یعنی حضرت ابراہیمؑ کو اس گھر سے متعلق ایک ہدایت تو وہ ہوئی تھی جو اوپر کی آیت میں مذکور ہوئی، دوسری ہدایت یہ ہوئی کہ وہ اس گھر کے حج کے لیے لوگوں میں منادیٔ عام کریں کہ لوگ دور و قریب سے اس سرچشمہ خیر و برکت سے مستفید ہونے کے لیے آئیں۔ اس میں بھی قریش کے رویہ پر تعریض ہے کہ ان کو کرنا تو یہ تھا کہ تمام خلق کو اس گھر کے حج و زیارت کی دعوت دیتے لیکن انھوں نے اس کے بالکل برعکس کیا یہ ہے کہ اس پر مارِ گنج بن کر بیٹھ گئے ہیں اور ملت ابراہیمؑ کے اصلی پیرو جب اس گھر کا قصد کرتے ہیں تو یہ ان پر پھنکارتے اور ان کو ڈستے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت

'یَاْتُوْكَ رِجَالًا الاٰیۃ' یہ جواب امر ہے اس وجہ سے یہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت ہے کہ جب

تم حج کی منادی کروگے تو لوگ پیادہ اور سوار والہانہ اس گھر کے حج کے لیے آئیں گے۔ لوگوں کے اونٹ طولِ سفر سے لاغر اور مکہ کے راستے کثرتِ آمد و شد سے گہرے ہو جائیں گے۔ حج پر پابندیاں ناروا ہیں

ان استعارات سے آنے والوں کی جس کثرت، جس شوق و عشق، جس وارفتگی و ازخود رفتگی کا اظہار ہو رہا ہے اس کی شہادت آج ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی مکہ اور مدینہ کی سڑکیں اور منیٰ و عرفات کے میدان حج کے موقعے پر دے رہے ہیں اور ہر دیکھنے والا اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بشارت دی گئی تھی وہ کس طرح ظہور میں آئی اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں کس طرح برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے اس راہِ عشق میں صرف اونٹنیاں لاغر ہوتی تھیں۔ اب زمانہ کی ترقی نے اس دوڑ میں بسوں، لاریوں، موٹروں اور ہوائی جہازوں کو بھی شریک کر دیا ہے۔ ان آیات کا سیاق اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پسند اور اس کی رضا یہی ہے کہ اس کے گھر کی زیارت کے لیے اس کے بندوں کے اندر یہ ذوق و شوق روز افزوں رہے اس وجہ سے بہت سی حکومتوں نے، اور وہ بھی مسلمان کہلانے والی حکومتوں نے حج پر ویزے، کوٹے، قرعے اور زرِ مبادلہ کے مختلف ناموں سے جو پابندیاں عاید کر رکھی ہیں یہ نہ صرف بالکل ناروا ہیں بلکہ ہمارے نزدیک صدٌ عن المسجد الحرام کے حکم میں داخل ہیں۔ کوئی غیر مسلم حکومت بھی اگر اپنے علاقے کے مسلمانوں پر اس قسم کی کوئی پابندی عاید کرے تو وہ اس کی مجاز نہیں ہے بلکہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا کہ یہ چیز اس فتنہ (PERSECUTION) کے حکم میں داخل ہے جس کو مٹانے کے لیے اس غیر مسلم حکومت کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کرنا چاہیے اگر وہ اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (۲۸)

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ بقرہ کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ حج کے مہینے اہلِ عرب کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے بھی موسمِ بہار کا حکم رکھتے تھے۔ اسی زمانے میں باہر سے اہلِ مکہ کی ضرورت کی تمام چیزیں مکہ کے بازاروں میں پہنچتی تھیں اور مکہ کا مال باہر کی منڈیوں کے لیے نکلتا تھا۔ اگر حج کے اصل مقصود کے ساتھ ساتھ اس قسم کے جائز دنیوی منافع حاصل کیے جائیں تو یہ چیز اس دینِ قیم کے مزاج کے منافی نہیں ہے جس کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی ہے بلکہ یہ اس امر کی شہادت ہے کہ یہ دین فطرت رہبانیت کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی اس عبادت میں بھی دین و دنیا کی باہم آمیزی کا اعتدال قائم رکھا ہے جس میں بظاہر سب سے زیادہ ترکِ دنیا کی نمود ہے۔ بس اصل چیز صحیح توازن کو قائم رکھنا ہے کہ حج صرف تجارتی یا سیاسی سفر بن کے نہ رہ جائے۔ حج کی دنیوی برکات

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ کی تحقیق مائدہ آیت ۱ کے تحت گزر چکی ہے۔

'ایام معلومت' سے مراد

'اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ' سے مراد قربانی کے معین ایام ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طرح اس دنیا کے کاموں میں اوقات، فصلوں اور موسموں کا اعتبار ہے، اگر اس کو قائم نہ رکھا جائے تو ساری جدوجہد اکارت ہو کے رہ جاتی ہے اسی طرح عبادات میں بھی مقام، اوقات ایام اور مہینوں کا اعتبار ہے۔ اگر ان کا حتی الامکان اہتمام نہ رکھا جائے تو عبادت اپنی اصلی برکت سے محروم رہ جاتی ہے۔ قربانی کے جو دن ہیں یہ اللہ و رسول کے مقرر کیے ہوئے ہیں اور یہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار ہیں۔ ان میں امت کی سہولت کو پیش نظر رکھ کر اللہ و رسول نے ایک حد خاص تک وسعت بھی رکھی ہے۔ اس وسعت سے فائدہ اٹھانا تقویٰ کے منافی نہیں ہے لیکن ان ایام کا اعتبار دین میں ضروری ہے اور یہ چیز اس کائنات کی فطرت کے بالکل مطابق ہے۔

چوپایوں کی جانوں پر اللہ کے نام کا قفل

'وَیَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰہِ' اس آیت میں بھی اور آگے کی آیات میں بھی ذبح اور نحر کو ذکر اسم اللہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس اہتمام خاص کی وجہ یہ ہے کہ جاہلیت میں مشرکین کی تمام قربانیاں ان کے اصنام کے لیے ہوتی تھیں۔ اس فتنہ کے کلی سدباب کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام چوپایوں کی جانوں پر اپنے نام کا قفل لگا دیا جو صرف اسی کے نام کی کنجی سے کھولا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر کسی چوپایہ کی جان لینا دین میں حرام ٹھہرا۔ 'عَلٰی مَا رَزَقَہُمۡ مِّنۡۢ بَہِیۡمَۃِ الۡاَنۡعَامِ' اس بات کی دلیل ہے کہ کیوں چوپایوں کو خدا ہی کے نام پر ذبح کرنا ضروری ہے؟ یہ اس لیے ضروری ہے کہ یہ خدا ہی کے عطا کردہ ہیں اس وجہ سے کسی غیر اللہ کے نام پر ان کو ذبح کرنا خدا کی بھی ناشکری ہے اور جانوروں کی بھی تحقیر ہے۔ اس اسلوب میں اللہ تعالیٰ کے شکر کی ترغیب و تشویق بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کو چوپائے اپنے فضل و رحمت سے عطا فرمائے ہیں ان کا حق یہ ہے کہ بندے اس نعمت کے شکر کے طور پر ان کا نذرانہ اپنے رب کے حضور میں پیش کریں۔

مشرکین کے بعض تصورات کا خاتمہ

'فَکُلُوۡا مِنۡہَا وَ اَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِیۡرَ' فرمایا کہ یہ قربانی جو تمہیں پیش کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے وہ اس لیے نہیں کہ خدا کو ان قربانیوں سے کوئی نفع پہنچتا ہے۔ خدا کو ان قربانیوں کا گوشت یا خون کچھ بھی نہیں پہنچتا۔ تمہاری پیش کی ہوئی یہ چیز تمہی کو لوٹا دی جاتی ہے، تم خود اس کو کھاؤ اور بھوکوں اور محتاجوں کو کھلاؤ۔ قربانی کی مثال بالکل یوں ہے کہ کوئی اپنے سر کے تاج کو اصل بادشاہ کے قدموں پر رکھے اور بادشاہ اس تاج کو اپنے قدموں سے عزت دے کر پھر اس کے سر پر پہنا دے — یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرک قومیں بلا استثناء یہ تصور رکھتی ہیں کہ ان کے معبود ان کی پیش کردہ قربانیوں سے بہرہ اندوز و لذت یاب ہوتے ہیں۔ مشرکین تو درکنار یہود تک کے یہاں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ خداوند بعض قربانیوں کی خوشبو سے بہت محظوظ ہوتا ہے۔ قرآن نے اس آیت میں بھی اور آگے کی آیات میں بھی ان تصورات کا خاتمہ کر دیا ہے۔

ثُمَّ لۡیَقۡضُوۡا تَفَثَہُمۡ وَ لۡیُوۡفُوۡا نُذُوۡرَہُمۡ وَ لۡیَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَیۡتِ الۡعَتِیۡقِ (۲۹)

حج کے آخری مراسم

'تفث' کے معنی میل کچیل کے ہیں۔ 'قضی تفثہ' ای ازالہ' اس نے اپنا میل کچیل دور کیا۔ یہ قربانی سے فارغ ہونے کے بعد حج کے آخری مراسم کی ادائیگی کی طرف اشارہ ہے۔ احرام کی پابندیوں اور مناسک کی سرگرمیوں کی وجہ سے بال وغیرہ بھی بڑھ جاتے ہیں اور جسم کا میل کچیل بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی بات پسند ہے کہ ان ایام میں بندے پر یہی خستہ حالی و پراگندہ بالی کی حالت طاری رہے، لیکن حج کے بعد حجامت بنوائے، نہائے دھوئے، کپڑے بدلے اور اگر کوئی قربانی وغیرہ نذر مانی ہے تو وہ پوری کرے اور بیت اللہ کا آخری طواف کر کے حج سے فارغ ہو جائے۔

بیتِ عتیق

'بیت اللہ' کو یہاں 'بیتِ عتیق' سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'عتیق' کے معنی اصل اور قدیم کے ہیں۔ 'بیت اللہ' کو 'عتیق' کہنے کی وجہ، جیسا کہ ہم بقرہ ۱۲۵ کے تحت واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ خدا کا اصل اور قدیم گھر یہی ہے نہ کہ بیت المقدس، جیسا کہ یہود دعویٰ کرتے ہیں۔ بیت المقدس اول تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد، حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں تعمیر ہوا ہے، پھر اس کی تعمیر بھی اس طرح ہوئی کہ اس کی اصل قربان گاہ کا رُخ بیت اللہ ہی کی طرف تھا، اس لیے کہ تمام ذریتِ ابراہیم کا اصل قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔ اگرچہ یہود نے ان تمام چیزوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن اصل حقیقت کے شواہد تورات میں آج بھی موجود ہیں اور بقرہ کی تفسیر میں ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا
يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۳۰)

'ذٰلِکَ' پورے جملہ کا قائم مقام

'ذٰلِكَ' جب اس طرح آتا ہے تو یہ پورے جملہ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ یعنی یہ باتیں ہیں جو بیت اللہ اور اس کے حج و مناسک سے متعلق ابراہیم کو بتائی گئی تھیں، ان کو اچھی طرح سن اور سمجھ لو۔ یہ گویا تنبیہ کا کلمہ ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ اس جملہ پر پوری ہوئیں۔ اب آگے ان لوگوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں جو بیت اللہ کی وراثت کے مدعی تو تھے لیکن اس امانت کی ذمہ داریوں سے بالکل بے خبر تھے۔

تمام حرماتِ الٰہی کے احترام کی ہدایت

'وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ'۔ 'حُرُمٰتِ اللّٰهِ' سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کے احترام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ مثلاً حرم، مسجد حرام، اشہر حرم، ہدی اور قلائد وغیرہ۔ ان تمام چیزوں کے احترام کی روایت حضرت ابراہیم کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ یہاں ان محترم چیزوں کی تعظیم و تکریم کی تاکید کی خاص وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے حضرت ابراہیم کی تمام مقدس روایات اپنے دنیوی مفادات کی خاطر بالکل بدل ڈالی تھیں۔ مثلاً چار محترم مہینوں ہی کو لیجیے۔ ان کو نسی کا قاعدہ ایجاد کر کے، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے، قمری کے بجائے شمسی مہینوں کے مطابق کر لیا گیا تھا تاکہ تجارتی پہلو سے ان کو سازگار بنایا جا سکے۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ حرماتِ الٰہی کے احترام کی پابندیوں کے سبب سے ہو سکتا ہے کہ بظاہر بعض دنیوی مفادات کو کچھ نقصان پہنچے۔ لیکن دیکھنے کی چیز

یہ اشارہ ہے ان تفصیلات کی طرف جو سورۂ انعام میں گزر چکی ہیں۔ ملاحظہ ہوں سورۂ انعام کی آیات ۱۳۶-۱۵۲۔ یہ ساری تحریم و تحلیل چونکہ مشرکانہ عقائد و توہمات پر مبنی تھی اس وجہ سے فرمایا کہ اپنے بتوں کے تعلق سے جو گندگی تم نے اپنے اوپر لاد رکھی ہے اس سے بچو۔ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ اور خدا کے اوپر جھوٹ افترا سے بچو۔ یعنی حرام و حلال تو تم اپنے جی سے کرتے ہو لیکن اس کو مذہبی تقدس کا درجہ دینے کے لیے منسوب خدا کی طرف کرتے ہو کہ اس نے تمھیں ان باتوں کا حکم دیا ہے۔ یہ نہایت سنگین جھوٹ اور اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ پر افترا ہے، اس سے احتراز کرو۔ اسی چیز کو سورۂ انعام میں اِفْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ سے تعبیر فرمایا ہے۔ وَحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ۔ ۱۴۰

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۳۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کے تمام شعائر کی تعظیم اور تمام مناسک کی ادائیگی اس طرح مطلوب ہے کہ ہر کام اُس کی طرف یکسو ہو کر اور شرک کے ہر شائبہ سے بالکل پاک رہتے ہوئے کیا جائے۔ اگر کسی کام میں شرک کی کوئی آمیزش ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بالکل باطل ہے۔

شرک کی تمثیل

'وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ الاٰیۃ' یہ شرک کی تمثیل بیان ہوئی ہے کہ آدمی شرک کا ارتکاب کر کے اپنے اصل مرکز سے کٹ جاتا ہے اور جب وہ اصل مرکز سے کٹ گیا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس شیطان کے ہتھے چڑھ جائے۔ وہ ایک بے لنگر کا جہاز ہے جو ہر چٹان سے ٹکرا سکتا اور ایک کٹا ہوا پتنگ ہے جس کو ہوا جہاں چاہے اڑا لے جا سکتی ہے۔ توحید سے انسان کو جس درجے کی سرفرازی حاصل ہوتی ہے اس سے محروم ہوتے ہی وہ اسی درجے کی پستی میں گر جاتا ہے۔ فرمایا کہ جو اللہ کا شریک بناتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرا اور عقابوں نے اس کو اُچک لیا یا ہوا نے اس کو کسی گہرے کھڈ میں لے جا کر پھینک دیا!

یہ وقتی مفادات نہیں ہیں بلکہ ان کی اخروی برکتیں ہیں۔ جو لوگ ان اخروی برکتوں کی خاطر ہر حال میں ان کا احترام قائم رکھیں گے وہ یاد رکھیں کہ اللہ کے نزدیک یہ چیز ان کے لیے بہت بڑے خیر کا باعث ہو گی۔

مشرکین کے من گھڑت تصورات کی تردید

وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ اوپر والا ٹکڑا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بطور تنبیہ کے ہے۔ اب 'عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ' کے تعلق سے یہ واضح فرمایا جا رہا ہے کہ مشرکین نے محض اپنے مشرکانہ توہمات کی بنا پر مختلف چوپایوں کے بارے میں یہ فتوے جو جاری کر رکھے ہیں کہ فلاں چوپایہ حلال ہے، فلاں حرام ہے، فلاں مردوں کے لیے جائز ہے اور فلاں عورتوں کے لیے ناجائز ہے، فلاں قسم کے چوپایہ پر سواری کرنا جائز ہے اور فلاں قسم کے چوپایہ پر جائز نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ ساری باتیں محض من گھڑت ہیں۔ ملت ابراہیم میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ملتِ ابراہیم میں حرام صرف وہی چوپائے ہیں جو قرآن میں پڑھ کر سنائے جا رہے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ شرک کا ارتکاب کر کے آدمی خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ خود اپنے ہی کو اس سرفرازی اور اس امن و حفاظت سے محروم کر لیتا ہے جو توحید کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشی ہے۔ پھر وہ شیطان کے ہر فتنہ کا ہدف اور اس کے بچھائے ہوئے ہر جال کا شکار رہے۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (۳۲)

شعائر کی تعظیم کے لیے اصل شرط

یہ 'ذٰلِكَ' بھی اسی طرح کا ہے جیسا کہ اوپر آیت ۳۰ میں گزرا۔ یعنی اوپر جو باتیں بتائی گئیں ان کو اچھی طرح سن لو اور ان کو گرہ کر لو اور مزید برآں یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ اللہ نے جو شعائر مقرر فرمائے ہیں ان کی تعظیم کا حق محض ظاہرداری سے ادا نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے دل کا تقویٰ مطلوب ہے۔ 'شعائر'، جیسا کہ ہم بقرہ۔ ۱۵۸۔ 'اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ' کے تحت واضح کر چکے ہیں کسی عظیم حقیقت کے نشان اور مظہر کے طور پر مقرر ہوئے ہیں۔ ان سے اصل مقصود انہی حقائق کی تذکیر و تذکر ہے جو ان کے اندر مضمر ہیں۔ اگر ان حقائق کا اہتمام باقی نہ رہ جائے تو محض ظاہری رسم داری سے شعائر کی تعظیم کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ان کی صحیح تعظیم کا حق اسی وقت ادا ہوتا ہے جب وہ اثر ان سے اخذ کیا جائے جس کو پیدا کرنے کے لیے وہ مقرر ہوتے ہیں۔ آگے قربانی سے متعلق، جو ایک عظیم شعیرہ ہے، اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا — اللہ کو تمہاری ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچے گا اور
وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔ ۳۷ — نہ ان کا خون بلکہ صرف تمہارا تقویٰ پہنچے گا۔

قربانی کے متعلق معلوم ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ انھوں نے اپنے محبوب فرزند ـــ حضرت اسماعیلؑ ـــ کی قربانی کر کے اسلام کی اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ مسلم کو ہر وقت اپنی عزیز سے عزیز شے اپنے رب کی خاطر قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر قربانی کی یہ حقیقت مستحضر نہ رہے اور آدمی ایک جانور کی گردن پر چھری چلا دے تو گو فی الظاہر اس نے قربانی کر دی لیکن فی الحقیقت وہ اس عظیم شعیرہ کی روح سے بے خبر رہا درآنحالیکہ خدا تک رسائی حاصل کرنے والی چیز وہ روح ہی ہے نہ کہ اس کی قربانی کا گوشت یا خون۔

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۳۳)

لفظ 'محل' پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ص ۴۲۹ پر بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے بعد حرف 'الیٰ' اس بات کا قرینہ ہے کہ کوئی لفظ ایسا محذوف مانا جائے جس سے یہ مفہوم پیدا ہو کر پھر ان کو بیت عتیق کے پاس لے جا کر قربان کرنا ہے۔

مشرکین کی بعض بدعات کی اصلاح

مشرکین جب کسی چوپایہ کو ہدی و نیاز کے لیے نامزد کر دیتے تو پھر اس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز سمجھتے۔ قرآن نے ان کی اصلاح فرما دی کہ ان شعائر کی تعظیم کے لیے یہ چیز ضروری نہیں ہے۔ اپنے قربانی کے جانوروں کو پالو اور ان سے اس وقت تک فائدہ اٹھاؤ جب تک ان کی قربانی کا وقت نہ آجائے۔ اس

انتفاع سے ان کی حرمت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا البتہ یہ ضروری ہے کہ جب ان کی قربانی کا وقت آ جائے تو ان کو اللہ کے قدیم گھر کے پاس لے جا کر اللہ ہی کے لیے ان کو قربان کرو۔ اگر کسی اور تھان یا استھان پر لے جا کر ان کو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا تو اس سے ان کی حرمت برباد ہو جاتی ہے۔ 'بَیْتِ عَتِیْق' کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے۔ 'ثُمَّ' یہاں میرے نزدیک ترتیب کو ظاہر کرتا ہے اس وجہ سے میں اس انتفاع کو اس وقت تک جائز سمجھتا ہوں جب تک قربانی ٹھکانے نہ لگ جائے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ (۳۴)

قربانی ایک قدیم ترین طریقۂ عبادت

لفظ 'منسک' کی تحقیق بقرہ آیت ۲۰۰ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے مختلف معانی میں سے قربانی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شرائع الٰہی میں قربانی ایک قدیم ترین عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی امت کے لیے اس طریقۂ عبادت کو مشروع فرمایا کہ اللہ کے بندے اس طرح اللہ کے بخشے ہوئے چوپایوں پر اس کی شکرگزاری کا حق ادا کریں۔ یہاں قربانی کے قدیم ترین طریقۂ عبادت ہونے کا جو ذکر ہے اس کی شہادت کے لیے یہ کافی ہے کہ تورات اور قرآن دونوں میں حضرت آدمؑ کے بیٹے ہابیل کی قربانی کا ذکر موجود ہے۔

'لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ' خدا کی مشروع کی ہوئی اس عبادت کی یہ خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ اللہ نے یہ عبادت خاص اپنی شکرگزاری کے لیے مشروع فرمائی ہے کہ اس کے عطا کیے ہوئے چوپائے اس کی خوشنودی اور رضاطلبی کے لیے لوگ اس کے حضور میں نذر گزرانیں اور اس طرح اس کی بخشی ہوئی نعمت پر اس کا شکر ادا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام ادیان الٰہی میں قربانی کی مشروعیت اور اس کی اصل روح یہ رہی ہے۔ اس میں اگر کسی غیر اللہ کو شریک بنایا گیا ہے تو یہ مبتدعین کی پیدا کردہ ضلالت ہے۔ اللہ کے دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

'فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا' مطلب یہ ہے کہ معبود تم سب کا ایک ہی ہے تو اس کی قربانی اور عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ بناؤ بلکہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرو۔ یہی حوالگی قربانی کی اصل روح ہے۔

'اخبات' کی حقیقت

'وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ'۔ 'خبت' پست اور نشیبی زمین کو کہتے ہیں۔ اسی سے 'اخبات' ہے جس کے معنی فروتنی اور تذلل و تواضع کے اظہار کے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے اسی حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے جس کی ہدایت 'أَسْلِمُوا' کے لفظ سے ہوئی ہے۔ اسلام کی اصل روح 'اخبات' ہی ہے یعنی انسان کا صرف ظاہر ہی نہیں بلکہ اس کا دل بھی اپنے پروردگار کے آگے جھک جائے۔ جن لوگوں کے اندر یہ اخبات ہو حقیقی مومن و مسلم وہی ہیں اور انہی کے لیے خدا کے رضوان اور اس کی جنت کی بشارت ہے۔

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِى الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳۵)

یہ مُخبتین کی صفت ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور اس کی آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ متکبرین کی طرح، جن کا ذکر اسی سورہ میں آگے آیت ۷۲ میں آئے گا، ناک بھوں نہیں چڑھاتے بلکہ ان کے دل خشیتِ الٰہی سے دہل جاتے ہیں۔ 'وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ' اور جن کا حال یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں ہر مصیبت کو پوری ہمت کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں، ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جن کا حال آیت 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ' کے تحت بیان ہوا کہ وہ ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے ہیں لیکن اس راہ میں کوئی چوٹ کھانے اور کوئی جوکھم برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ 'وَالْمُقِيْمِى الصَّلٰوةِ' یہ مضاف مضاف الیہ کی ترکیب ہے۔ صبر اور نماز کے باہمی تعلق پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اس کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ برابر نماز کا نہایت اہتمام رکھنے والے ہیں۔ 'وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ' اور خدا نے جو کچھ ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس اسلوب میں انفاق کی تسہیل اور اس کی ترغیب کا جو پہلو ہے اس پر بھی نگاہ رکھیے اور نماز اور انفاق میں جو رشتہ ہے اس کو بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیجیے۔ دین کی حکمت سمجھنے کے لیے ان اجزاء کے باہمی تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۳۶)

'بُدْن' کا مفہوم

'بُدْن'، 'بَدَنَة' کی جمع ہے۔ یہ لفظ اونٹوں کے لیے آتا ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر ان اونٹوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو قربانی کے لیے نامزد کر دیے گئے ہوں اور جن کی حیثیت ہدی اور قلائد کی ہو چکی ہو۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ 'جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ' (ان کو ہم نے تمہارے لیے شعائر میں سے ٹھہرایا ہے) ظاہر ہے کہ شعیرہ ہونے کا درجہ ہر اونٹ اور اونٹنی کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف نیاز کے اونٹوں کو حاصل ہوتا ہے۔

اونٹوں کے ذکر کی ایک خاص وجہ

اوپر آیت ۲۸ میں ان تمام چوپایوں کا ذکر ہو چکا ہے جن کی قربانی مشروع ہے۔ اس کے بعد اونٹوں کے ذکر کی چنداں ضرورت تو نہیں تھی اس لیے کہ 'بھیمۃ الانعام' میں یہ بھی شامل ہیں لیکن ایک خاص سبب سے ان کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا۔ وہ یہ کہ اونٹ اہل عرب کے محبوب چوپایوں میں سے ہے، لیکن یہود نے اپنی ایک کمزور روایت کی بنا پر، جس کا ذکر آل عمران ۹۳ کے تحت ہو چکا ہے، اس کو حرام قرار دے رکھا تھا۔ اپنی اسی روایت کی آڑ لے کر انھوں نے اونٹ کی قربانی کے مسئلہ کو بھی اسلام کے خلاف فتنہ انگیزی اور وسوسہ اندازی کا ذریعہ بنا لیا۔ انھوں نے یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ نیا دین حضرت ابراہیم کا دین کس طرح ہو سکتا

ہے جس نے تمام انبیاء کے حرام کیے ہوئے جانور کی قربانی کو خدا کے تقرب کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ قرآن نے آلِ عمران کی آیت ۹۳ میں یہود کے اس واہمہ کی تردید فرمائی ہے اور یہود سے مطالبہ کیا ہے کہ اگر اس بات کا ان کے پاس کوئی ثبوت موجود ہو کہ اونٹ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حرام قرار دیا ہے تو وہ اس کو پیش کریں۔

'لَکُمْ فِیْھَا خَیْرٌ' یہ اونٹ کی قربانی کو شعائرِ الٰہی میں سے قرار دیے جانے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ اس کے اندر تمھارے لیے بڑی برکتیں اور بڑے فوائد ہیں۔ آیت 'لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ' کے تحت ہم عرض کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو قربانی اسی جانور کی پسند ہے جو عزیز و محبوب ہو۔ اونٹ عرب کے محبوب ترین جانوروں میں سے ہے۔ یہ ان کے صحرا کا سفینہ، ان کے تمام سفر و حضر کا رفیق اور ان کی تمام تجارتی سرگرمیوں کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ اس کے دودھ، گوشت اور کھال ہر چیز سے بیش از بیش فائدے اٹھاتے تھے۔ قرآن نے اس کی انہی منفعتوں اور برکتوں کے سبب سے اہلِ عرب کو اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی اس نعمت کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز باعتبارِ دنیا اہلِ عرب کے لیے اتنی نفع بخش اور بابرکت ہو اگر وہ اس کو اپنے رب کی خوشنودی کے لیے قربان کریں تو یہ ان کے لیے خدا کے تقرب کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

بدنوں کی قربانی کا طریقہ

'فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ' یہ ان کی قربانی کرنے کا طریقہ بتایا کہ ان کو قبلہ رو صف بستہ کھڑے کر کے ان کو نحر کرو۔ نحر یا ذبح کو ذکر اللہ سے تعبیر کرنے کی وجہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یہ صف بستہ کھڑا کرنا گویا خدا کے حضور نماز کے لیے ان کا قیام ہے اور نحر کے بعد جب وہ اپنے پہلو پر گر پڑیں تو یہ گویا رب کے حضور ان کا سجدہ ہے۔ فرمایا کہ اس کے بعد تم خود بھی اس کے گوشت سے فائدہ اٹھاؤ اور خوددار محتاجوں اور سائلوں کو بھی کھلاؤ۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اپنی قربانیوں سے کوئی فائدہ اٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس بدعت کی بھی اصلاح کر دی۔

قانع اور معتر کی وضاحت

یہاں مستحقین کے لیے 'قانع' اور 'معتر' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اصل مستحق تو جیسا کہ اوپر آیت ۲۸ میں گزرا، نادار و غریب لوگ ہیں لیکن غریبوں میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کی خودداری سوال کرنے کا ننگ گوارا نہیں کرتی اور بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو سوال کرتے ہیں۔ پہلی قسم کے ناداروں کے لیے 'قانع' کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور دوسری قسم کے ناداروں کے لیے 'معتر' کا۔ 'معتر'، متعرض للسوال کو کہتے ہیں۔ آیت میں 'قانع' کی تقدیم سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا حق مقدم ہے اور چونکہ وہ سائل بن [illegible] کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرتے اس وجہ سے دینے والوں کا فرض ہے کہ خود ان کے پاس پہنچیں، ان سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ دینے والوں کے پاس پہنچیں گے۔ آیت 'لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا' کے تحت اس مسئلہ پر وضاحت سے ہم لکھ چکے ہیں اور یہ اشارہ بھی کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

کے نزدیک غرباء کے لیے پسندیدہ رویہ خودداری ہی کا رویہ ہے۔ اگرچہ مجبوری کی حالت میں سوال کرنے کی بھی اجازت ہے۔

'کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰهَا لَکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ' مطلب یہ ہے کہ یہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اونٹ جیسے عظیم جانور کی نکیل اس طرح تمہارے ہاتھ میں پکڑا دی ہے کہ تم اپنے سفر و حضر میں جس طرح چاہو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور جب چاہو اس کو نحر کر دو۔ وہ تمہاری اطاعت سے سرِ انحراف نہیں کر سکتا۔ اگر خدا نہ چاہتا تو اونٹ تو درکنار کسی چھوٹے سے چھوٹے جانور کو بھی تم اس طرح اپنا تابع فرمان نہیں بنا سکتے تھے۔ خدا کے اس احسان کا قدرتی اور فطری حق یہی ہے کہ تم اس کے شکر گزار رہو، اس کے حقوق برابر ادا کرو اور ان حقوق میں دوسروں کو ساجھی نہ ٹھہراؤ۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰکِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ ۭ کَذٰلِکَ سَخَّرَهَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىکُمْ ۭ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ (۳۷)

اصل حقیقت کی یاد دہانی

یہ اسی حقیقت کی دوسرے پہلو سے یاد دہانی ہے جس کی طرف اوپر آیت ۳۲ میں اشارہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا قربانیوں کے گوشت یا خون سے محظوظ نہیں ہوتا، جیسا کہ مشرکین نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ اس تقویٰ اور اس اسلام و اخبات سے خوشنود ہوتا ہے جو ان قربانیوں سے ان کے پیش کرنے والوں کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ قربانیاں پیش کرتے ہوئے اپنے اندر تقویٰ کی یہ روح پیدا کرو۔ اگر یہ چیز نہ پیدا ہوئی تو یہ محض ایک جانور کا خون بہا دینا ہوا، اس کا حاصل کچھ نہیں۔

'کَذٰلِکَ سَخَّرَهَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىکُمْ' یہ اسی مضمون کا دوسرے لفظوں میں اعادہ ہے جو اوپر 'کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰهَا الآیہ' میں گزرا۔ البتہ اس میں اس شکر کا طریقہ بتا دیا کہ یہ خدا کی تکبیر و تہلیل کی صورت میں ہو یعنی اس نذرانہ کو خدا کی بارگاہ میں پیش کرتے ہوئے صرف خدا ہی کی عظمت و کبریائی کا اعتراف و اعلان کیا جائے، کسی غیر خدا کو اس میں ساجھی نہ بنایا جائے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں ان چوپایوں کو قبلہ رُو کر کے ان پر تکبیر پڑھی جاتی اور 'منک و لک' کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ مزید براں اس آیت میں اس شکر کے اصل محرک کا بھی پتہ دے دیا ہے کہ یہ شکر اس بات کا ہے کہ خدا نے تمہیں ہدایت بخشی یعنی اس اسلام و اخبات کی ہدایت بخشی جس کا اظہار حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کر کے کیا۔

'وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ' 'محسن' کا مفہوم ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ خوب کار لوگ ہوتے ہیں جو خدا کے ہر حکم کی تعمیل اس کو حاضر و ناظر جان کر اس طرح انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح اس کو انجام دینا چاہیے۔ یہاں بربنائے قرینہ یہ مضمون محذوف ہے کہ جو لوگ ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی قربانی پیش کریں گے وہی لوگ دراصل خوب کار ہیں۔ ایسے خوب کاروں

کو خدا کی خوشنودی اور اس کی جنت کی خوش خبری پہنچا دو!

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۸-۴۱

یہ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں اور چونکہ یہ، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، انہی باتوں پر متفرع اور انہی کی توضیح کی حیثیت رکھتی ہیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے ان کو مصحف کی ترتیب میں یہاں جگہ ملی۔

اوپر آیت ۲۵ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں، قریش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ اور مسجد حرام سے مسلمانوں کو روک رہے ہیں، درآنحالیکہ مسجد حرام پر کسی کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی، وہ بڑے ہی ظالم ہیں اور اللہ ایسے ظالموں کو ایک دردناک عذاب چکھائے گا۔ اس کے بعد بیت اللہ کی تاریخ اور اس کے مناسک و شعائر کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ قریش نے اس گھر کی ساری حرمت برباد کر کے رکھ دی ہے ان کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس گھر پر مسلط رہیں۔
ان آیات کے اندر ظاہر ہے کہ یہ اشارہ مضمر تھا کہ اس گھر کی تولیت کے اصل حقدار مسلمان ہیں نہ کہ قریش لیکن مکہ میں مسلمان بالکل بے بس اور مجبور تھے اس وجہ سے وہ اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لیے کوئی عملی اقدام نہیں کر سکتے تھے۔ مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد جب انھوں نے ایک تنظیم کی شکل اختیار کر لی تو ان کے اندر قدرتی طور پر یہ احساس شدت سے پیدا ہوا کہ انھیں اس گھر کی برکتوں سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ لیکن اس کی شکل کیا ہو؟ ظاہر ہے کہ جب قریش نے اس بے دردی کے ساتھ ان کو اس گھر سے نکال چھوڑا تھا تو وہ آسانی سے یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کو حج و عمرہ کی اجازت دیں۔ اگر مسلمان اس کی کوشش کرتے تو لازماً جنگ کی نوبت آجاتی اور جنگ بھی حدودِ حرم اور اشہر حرم میں، جس کو جاہلیت اور اسلام دونوں میں ممنوع سمجھا گیا ہے۔ قریش اور ان کے حلیف ـــ اہل کتاب ـــ اس چیز کو بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کا ذریعہ بناتے کہ دیکھو اس نئے دین والوں نے حرم اور اشہر حرم کی حرمت پر بھی حملہ کر دیا جس کی جسارت ان سے پہلے کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ یہ سارے مسائل اس وقت مسلمانوں کے سامنے تھے۔
ان آیات میں انہی سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں۔

آیات ۳۸-۴۱ إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ
ع ۱۲ كَفُورٍ ﴿۳۸﴾ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ
نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿۳۹﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا

أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ
لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ
اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (۴۰)
الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ
وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ
الْأُمُورِ (۴۱)

بے شک اللہ مدافعت کرے گا ان لوگوں کی جو ایمان لائے۔ اللہ ہرگز بدعہدوں اور ناشکروں کو پسند نہیں کرتا۔ جن سے جنگ کی جائے ان کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی بوجہ اس کے کہ ان پر ظلم ہوا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے۔ جو مظلوم اپنے گھروں سے بے قصور محض اس جرم پر نکالے گئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو، ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں، جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، ڈھائے جا چکے ہوتے۔ اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ ۳۸-۴۱

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ (۳۸)

اس بحث کی تمہید ہی اللہ تعالیٰ نے مظلوم مسلمانوں کے لیے بشارت سے اٹھائی ہے۔ فرمایا کہ قریش نے ہمارے با ایمان بندوں پر جو ظلم ڈھایا ہے اس میں اپنے مظلوم بندوں کی مدافعت ہم کریں گے۔ یعنی اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت و مدافعت کے لیے اٹھیں، خدا اس جہاد میں ان کے ساتھ ہوگا اور ہر قدم پر ان کی نصرت فرمائے گا۔

مظلوم مسلمانوں کے لیے بشارت

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ۔ 'کُلَّ' یہاں میرے نزدیک تاکیدِ صفت کے لیے ہے اور 'خَوَّانٍ کَفُوْرٍ' سے اشارہ کفارِ قریش کی طرف ہے۔ 'خَوَّانٍ' کے معنی، خائن، غدار اور عہد شکن کے ہیں۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انھوں نے وہ تمام عہود و شرائط پامال کر دیے ہیں جن کے تحت ان کو حرم کی پاسبانی سپرد ہوئی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جن مقاصد کے لیے اس گھر کو تعمیر کیا تھا اور اپنی ذریت پر اس گھر سے متعلق جو ذمہ داری ڈالی تھی ان میں سے ایک ایک چیز کی انھوں نے آبرو مٹا دی۔ اس وجہ سے یہ اس گھر کی تولیت کے حقدار نہیں ہیں اور ایسے غداروں اور خائنوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا۔

قریش سے اعلانِ برأت

'خوان' کے ساتھ 'کفور' کی صفت ان کی ناسپاسی و ناشکری کے بیان کے لیے ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ قریش کو پورے عرب میں مذہبی پیشوائی اور سیاسی اقتدار کا جو مقام بلند حاصل ہوا وہ تمام تر بیت اللہ کی بدولت حاصل ہوا لیکن وہ بجائے اس کے کہ اس نعمت کی قدر کرتے اور اپنے رب کے شکر گزار رہتے اس گھر پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے اس کے نام پر حقوق تو سارے حاصل کرتے رہے لیکن خود اس کے حقوق و فرائض نہ صرف یہ کہ بالکل بھول بیٹھے بلکہ ان کے بالکل برعکس اقدامات سے اس گھر کی ساری عزت انھوں نے خاک میں ملا دی۔ فرمایا کہ ایسے غداروں اور ناشکروں سے خدا کو کیا تعلق! اللہ ایسے خائنوں اور ناسپاسوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ 'لَا یُحِبُّ' سے مقصود یہ ہے کہ خدا ایسے بدعہدوں کو مبغوض رکھتا ہے۔ ان کو جتنی مہلت ملنی تھی وہ مل چکی۔ اب وقت آگیا ہے کہ خدا اپنے حرم کو ان ناپاکوں سے پاک کرے اور اپنے ان بندوں کو اس کی تولیت سپرد کرے جو اس ابراہیمی امانت کا حق ادا کریں۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ (۳۹)

'اُذِنَ' کا متعلق یہاں بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی اب ان مسلمانوں کو جن سے جنگ کی جائے جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس وقت تک چونکہ مسلمانوں کی کوئی باقاعدہ تنظیمی ہیئت نہیں تھی اس وجہ سے ہر قسم کے مظالم کے ہدف رہنے کے باوجود ان کو جنگ کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ صبر کی ہدایت فرمائی گئی۔ اس لیے کہ منتشر افراد کی جنگ فساد کو مٹا کر حق و عدل قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور اسلام میں جنگ صرف حق و عدل کے قیام ہی کے لیے جائز ہے لیکن مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد حالات تبدیل ہو گئے اس وجہ سے ان کو اپنی مدافعت میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت دے دی گئی۔ علاوہ ازیں

مسلمانوں کو اپنی مدافعت میں جہاد کی اجازت

یہ اجازت اس پہلو سے بھی ضروری تھی کہ معاملہ حرم اور حدودِ حرم کا تھا۔ مسلمان حرم کے معاملے میں کوئی اقدام اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک اللہ و رسول کی طرف سے ان کو اس کے لیے اجازت نہ ملے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں صرف مدافعانہ جنگ کی اجازت مذکور ہے اس لیے کہ اس مرحلے تک مسلمان ابھی اس سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔ رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے لیے جارحانہ جنگ بھی جائز ہے یا نہیں تو اس سوال کے جواب کے لیے ہماری تفسیر سورۂ براءت کا تدبر سے مطالعہ فرمائیے۔

'بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا' یہ اس اجازت کے حق میں ایک مزید وجہ کا حوالہ ہے۔ یعنی اوّل تو اپنا دفاع ہر شخص اور ہر جماعت کا حق ہے ہی، پھر مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ ان مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے۔ اس ظلم کی تفصیل آگے والی آیت میں آرہی ہے۔

'وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ' یہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا وعدۂ مدافعت کی توثیق بھی ہے اور کفارِ قریش کے لیے ایک قسم کی تہدید بھی۔ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے اور کوئی ان کی مدد کر کے ان کو کیا تقویت پہنچا سکتا ہے۔ اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے اور جب وہ ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے تو دنیا کی کوئی قوت بھی ان کو شکست نہیں دے سکتی۔

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۴۰)

مسلمانوں کی مظلومیت کی وضاحت

'اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ' یہ مسلمانوں کی اس مظلومیت کی وضاحت ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو بغیر کسی جرم کے ان کے گھروں سے نکالا گیا ہے۔ اس اسلوبِ بیان میں وہ تمام مظالم و شدائد آپ سے آپ آگئے جن میں مسلمان مبتلا کیے گئے۔ اس لیے کہ کوئی اپنے وطن اور اپنے گھر در کو اس وقت تک چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک اس پر اس کے وطن کی سرزمین تنگ نہ کر دی جائے۔

'اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ' یہ نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مظلوموں کا اگر کوئی جرم بنتا ہے تو یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب بس اللہ ہے! یعنی ان کی سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑے حق کی دعوت ان کا سب سے بڑا گناہ بن گئی ہے اور اس جرم میں ان کو اتنا تنگ کیا گیا ہے کہ ان غریبوں کو اپنے گھر در کو خیرباد کہنا پڑا۔

بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ قرآن یہاں کلمۂ توحید کو ایک مرنجاں مرنج قسم کے کلمہ کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ یہ کسی کے لیے کوئی چڑنے کی چیز تو ہے نہیں، کفارِ قریش خواہ مخواہ کو اس سے چڑ کر مسلمانوں کے درپے آزار ہو گئے۔ آخر اس سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے کہ کوئی صرف ایک ہی خدا کو مانے!

جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے یہ محض ان کی خوش فہمی ہے۔ قریش ان لوگوں کی طرح اتنے بلید نہیں تھے کہ وہ اس کلمہ کے مضمرات کو نہ سمجھیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی زد کہاں تک ہے اس وجہ سے وہ اس کے دشمن تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح وہ سب سے بڑے حق کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ قرآن نے ان کی اسی حماقت کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے اور نہایت لطیف انداز میں توجہ دلائی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔

'صوامع' سے مراد

'صوامع' 'صومعۃ' کی جمع ہے۔ اصلاً یہ لفظ ان بلند پہاڑوں اور مکانوں کے لیے آیا ہے جہاں عیسائی راہب عبادت کے لیے خلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے تھے۔ اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ 'خانقاہیں' کیا جائے تو موزوں رہے گا۔

'بیع' سے مراد

'بیع' 'بیعۃ' کی جمع ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ دونوں کے عبادت خانوں کے لیے آتا ہے۔ لیکن آگے یہود کے عبادت خانوں کے لیے الگ لفظ آیا ہے۔ اس وجہ سے اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ کے گرجے ہوں۔ ان کے ہاں رہبانیت کے نظام کی وجہ سے خانقاہوں اور گرجوں دونوں کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔

'صلوات' سے مراد

'صلوات' 'صلاۃ' کی جمع ہے۔ یہ لفظ یہود کے کنیسوں کے لیے آتا ہے۔ عبرانی میں اس کی اصل 'صلوتا' ہے۔

'مساجد'

'مساجد' مسلمانوں کی مساجد کے لیے معروف ہے۔

جہاد کی اجازت کی حکمت

اب یہ حکمت بیان ہو رہی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دے دی ہے یہاں تک کہ حرم اور حدود حرم میں بھی اگر ان پر حملہ ہو تو وہاں بھی ان کو حق ہے کہ وہ اپنی مدافعت کریں اور اپنے رب سے یہ امید رکھیں کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا۔ فرمایا کہ یہ اجازت اس وجہ سے دی گئی ہے کہ اگر اللہ اشرار و شیاطین کو اپنے صالح بندوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، تمام گرجے، تمام کنیسے اور تمام مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب کب کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ چنانچہ ہمیشہ اللہ نے اپنے نبیوں اور رسولوں اور اپنے صالح بندوں کو جہاد کی ہدایت فرمائی اور انھوں نے جہاد کر کے تمام دینی اقدار اور شعائر کی حفاظت کی۔ اسی طرح آج مسلمانوں کو بھی یہ اجازت دی جا رہی ہے کہ وہ اللہ کے حرم اور اس کے شعائر کی حفاظت کے لیے اٹھیں اور اگر اس کے موجودہ غاصب و غدار مدعیان تولیت ان کی راہ میں مزاحم ہوں تو وہ ان کا جواب ترکی بہ ترکی دیں۔

مخالفین جہاد کو جواب

یہ امر ملحوظ رہے کہ مسلمانوں کے اس حوصلہ کو بھانپ کر قریش نے پہلے ہی سے ان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا کہ اب یہ نئے دین والے حرم اور حدود حرم کی حرمت بھی باقی نہیں رہنے دینا چاہتے اور یہود و

نصاریٰ بھی انھیں کی لَے میں لَے ملا کر مسلمانوں کے اس جذبۂ جہاد کو دینداری کے خلاف قرار دے رہے تھے۔ قرآن نے دوسرے مقامات میں بھی دینداری کے ان مدعیوں کو جواب دیا ہے اور یہاں بھی ان سب کو جواب دیا ہے کہ اگر اللہ کی راہ میں جہاد دینداری کے خلاف ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کی ساری بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے اور مفسدین کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ دل کھول کے اپنے حوصلے پورے کریں۔

جہاد کے سب سے بڑے مخالف نصاریٰ تھے

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ آیت میں سب سے پہلے، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، نصاریٰ کی خانقاہوں اور ان کے گرجوں کا ذکر ہے۔ سب سے پہلے ان کی طرف اشارہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد پر سب سے زیادہ معترض، جیسا کہ سورۂ حدید کی تفسیر سے معلوم ہوگا، نصاریٰ ہی تھے۔ اگرچہ ان کی اس مخالفت کے محرکات بعض اور بھی تھے جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی لیکن ان کے رہبانی تصور کو اس میں بڑا دخل تھا۔ قرآن نے ان کے اسی تصور پر یہاں ضرب لگائی ہے کہ اسلام کی مخالفت کے جوش میں جو لوگ جہاد کو دینداری کے خلاف قرار دے رہے ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ اگر دینداری کا یہی تصور پہلے بھی ہوتا تو آج زمین پر خدا کی عبادت کا ایک گوشہ بھی محفوظ نہ ہوتا۔

یہاں نصاریٰ اور یہود کے جن معابد کا حوالہ ہے ان کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ اصلاً ان کی حیثیت وہی تھی جو ہمارے ہاں مساجد کی ہے۔ ان میں خرابی اس وقت سے پیدا ہوئی ہے جب اہل کتاب شرک و بدعت میں مبتلا ہوئے۔

مسلمانوں سے وعدۂ نصرت سے متعلق بعض حقائق

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ۔ یہ اسی وعدۂ نصرت کو مزید مؤکد فرمایا ہے اور اس کے ساتھ بعض نئی حقیقتوں کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے جو نہایت اہم ہیں۔

ایک یہ کہ جو لوگ خدا کے دین اور اس کے شعائر کی حفاظت کے لیے اٹھتے ہیں وہ درحقیقت اپنے رب کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں، اس وجہ سے خدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کی مدد فرمائے جو اس کی مدد کے لیے اٹھے ہیں۔

دوسری یہ کہ خدا کی مدد ہمیشہ ان لوگوں کے لیے ظہور میں آتی ہے جو حق کی راہ میں خود اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کی مدد نہیں کرتا جو بنی اسرائیل کی طرح یہ چاہتے ہیں کہ خدا ان کے لیے میدان جیت کر تخت حکومت بچھا دے تب وہ جا کر اس پر براجمان ہو جائیں گے۔

خدا کے قوی و عزیز ہونے کے بعض خاص پہلو

إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ میں بھی کئی پہلو ہیں۔

—— خدا قوی و عزیز ہے اس وجہ سے وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے جو لوگ اس کی مدد کرتے ہیں وہ درحقیقت خود اپنے لیے خدا کی مدد کی راہ کھولتے ہیں۔

—— مسلمان اپنی قلت تعداد اور دشمن کی بھاری جمعیت سے ہراساں نہ ہوں، جو خداوند ذوالجلال

ان کی پشت پناہی کا وعدہ کر رہا ہے وہ قوی و عزیز ہے۔

کفار مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ یہ چند چنے بھلا کیا بھاڑ پھوڑیں گے! یہی قطرے اب طوفان بنیں گے! اس لیے کہ ان کو خدا کی نصرت و حمایت حاصل ہے اور خدا قوی و عزیز ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۴۱)

'الارض' سے مراد سرزمین حرم

'الارض' سے مراد، جس طرح رعد۔ ۴۱ اور انبیاء۔ ۴۴ میں ارض مکہ ہے اسی طرح قرینہ دلیل ہے کہ یہاں بھی اس سے مراد ارض مکہ ہے اس لیے کہ یہاں جس جہاد کی اجازت دی گئی ہے اصلاً اس کا تعلق ارضِ حرم ہی کی آزادی و تطہیر سے ہے۔ فرمایا کہ اس کے موجودہ غاصب اجارہ داروں نے تو اس حرم کے وہ تمام مقاصد برباد کر دیے ہیں جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنی ذریت کو بسایا تھا البتہ اگر ہم اپنے ان بندوں کو اس سرزمین میں، اپنی تائید و نصرت سے، اقتدار بخشیں گے تو یہ اس کے تمام مقاصد کو از سرِ نو بروئے کار لائیں گے۔ یہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ بقرہ کی آیات ۱۲۴-۱۲۸ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ بعینہٖ یہی مقاصد ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو حضرات ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا مرکز بنایا تھا اور آیت کا اسلوب بیان خود اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ قریش نے یہ تمام مقاصد برباد کر دیے ہیں۔

مسلمانوں کے اقتدار کے ثمرات

دنیا میں مسلمانوں کے اقتدار و تمکن کی پہلی بشارت یہی ہے جس کا آغاز حرم کی سرزمین سے ہوتا ہے، جس کی نسبت ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اس کی حیثیت ملت کے قلب کی ہے۔ اسی کے صلاح و فساد پر تمام ملت کے صلاح و فساد کا انحصار ہے۔ بعینہٖ یہی فریضہ مسلمانوں پر ہر اس سرزمین کے لیے عاید ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ ان کو اقتدار بخشے۔ اگر وہ یہ فریضہ ادا نہ کریں تو خدا کے نزدیک جس طرح دوسروں کا تسلط ناجائز ہے اسی طرح ان نام نہاد مسلمانوں کا تسلط بھی ناجائز ہے۔

نماز اور زکوٰۃ تمام دین کے لیے بمنزلۂ شیرازہ ہیں

نماز اور زکوٰۃ، جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کر چکے ہیں تمام شریعت کے لیے بمنزلۂ شیرازہ ہیں۔ اگر ان کا ذکر ہو گیا تو گویا پوری شریعت کا ذکر ہو گیا۔

معروف پر عمل کی آزادی کا مفہوم

معروف و منکر پر بھی تفسیر سورۂ بقرہ میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ بعض سادہ لوح یہ سوال کرتے ہیں کہ جب قرآن نے معروف پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر گروہ اور ہر قوم کے لوگ اپنے اپنے معروف پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی کے جن شعبوں میں خود خدا اور رسول نے معروف و منکر کو معین کر دیا ہے ان میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے معروف کو منکر یا اس کے منکر کو معروف بنائے۔ البتہ شریعت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے

ہر قوم و ملک کے لوگ اپنے معروف پر عمل کے لیے آزاد ہیں۔

'وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ' یہ مسلمانوں کو بشارت ہے کہ ابھی آغاز کار ہے اس وجہ سے حالات مشتبہ اور انجام پردے میں ہے۔ ممکن ہے تم کو بھی اور دوسروں کو بھی یہ تمکن کی بشارت مستبعد معلوم ہو رہی ہو لیکن انجام کار اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر کے رہے گا۔ مسلمانوں کو بشارت

۸- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۴۲-۵۷

آیت اہم پر توضیحی آیات، جو بیچ میں بطور جملہ معترضہ آ گئی تھیں، ختم ہوئیں۔ اب آگے کلام اپنے اصل سلسلہ سے پھر مربوط ہو گیا اور حضرات انبیائے کرام اور ان کے مکذبین کی تاریخ کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ اطمینان رکھو، اللہ کا ہر وعدہ پورا ہو کے رہے گا اور اس کی ہر وعید شدنی ہے۔ اگر اس کے ظہور میں کچھ تاخیر ہو رہی ہے تو یہ سنتِ الٰہی کے تحت ہو رہی ہے۔ اس طرح اللہ اپنے نیک بندوں کا امتحان اور ان کے مخالفین کو ڈھیل دے کر ان پر اپنی حجت تمام کرتا ہے۔ لوگوں کے پاس آنکھیں ہوں تو اس سنتِ الٰہی کے آثار اس ملک میں قدم قدم پر موجود ہیں لیکن جن کے دلوں کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں ان پر یہ آثار کیا کارگر ہو سکتے ہیں!

اسی ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ تم مخالفین کے رویہ سے بے نیاز ہو کر ایک نذیر مبین کی طرح، لوگوں کو سامنے کے خطرے سے آگاہ کر دو۔ اگر یہ تمہاری دعوت کی راہ میں اڑنگے ڈالتے ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ہر نبی اور رسول کو اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہے لیکن اللہ کی بات پوری ہو کے رہی اور مخالفین و شیاطین کی تمام فتنہ انگیزیاں اللہ نے نابود کر دیں۔ شیاطین کو ان فتنہ انگیزیوں کا اللہ نے جو موقع دیا ہے تو اس لیے دیا ہے کہ اس طرح حق پوری طرح نکھر کر سامنے آ جاتا ہے اور اہل علم و ایمان پوری بصیرت کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں، پھر ان کے قدم متزلزل نہیں ہوتے ــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ آیات ۴۲-۵۷
وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ
مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ
مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا
وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ

لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى
الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿٤٦﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ
بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ
سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿٤٧﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ع ٦ ١٢
ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿٤٨﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا
لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٤٩﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ
وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٥٠﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَحِيْمِ ﴿٥١﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ
اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي
الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٥٢﴾ لِّيَجْعَلَ
مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ
قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿٥٣﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ
قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٤﴾
وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ
بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿٥٥﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۭ
يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ
النَّعِيْمِ ﴿٥٦﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ

عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۵۷﴾

ع ۹ ۱۴ اور اگر یہ لوگ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے
ترجمۂ آیات قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط اور مدین کے لوگ بھی تکذیب کر چکے ہیں۔ اور
۴۲-۵۷ موسیٰ کی بھی تکذیب کی گئی تو میں نے ان کافروں کو کچھ ڈھیل دی، پھر ان کو دھر لیا تو دیکھو کیسی ہوئی
میری پھٹکار! اور کتنی ہی بستیاں ہیں، جن کو ان کے ظلم کی حالت میں ہم نے ہلاک کر دیا تو
وہ اپنی چھتوں پر ڈھئی پڑی ہیں اور کتنے ناکارہ کنوئیں اور کتنے پختہ محل ہیں جو ویران پڑے
ہوئے ہیں! کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے
سمجھتے یا ان کے کان ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سنتے کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ
دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔ ۴۲-۴۶

اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی
ہرگز خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے۔ اور تمھارے رب کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار
کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں، جن کو ان کے ظلم
کے باوجود میں نے ڈھیل دی، پھر ان کو پکڑ لیا اور میری ہی طرف سب کی واپسی ہے۔ ۴۷-۴۸

کہہ دو، اے لوگو! میں تو تمھارے لیے بس ایک کھلا ہوا آگاہ پہنچانے والا ہوں تو
جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے
اور جن کی تگ و دو ہماری آیات کی مخالفت کی راہ میں ہے وہی دوزخ والے ہیں۔ ۴۹-۵۱

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی بھی بھیجا تو جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا تو
شیطان نے اس کی راہ میں اڑنگے ڈالے۔ پس اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کے ڈالے ہوئے

وسوسوں کو، پھر اللہ اپنی باتوں کو قرار بخشتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو ان لوگوں کے لیے فتنہ بنائے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو سخت دل ہیں اور بے شک یہ ظالم اپنی مخاصمت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ اور ایسا اس لیے بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کو علم عطا ہوا ہے اچھی طرح جان لیں کہ یہی تیرے رب کی جانب سے حق ہے پس ان کے ایمان اس پر پختہ ہوں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں اور اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ضرور صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائے گا۔ ۵۲-۵۴

اور یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے برابر اس کی طرف سے شک ہی میں رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آدھمکے یا ایک منحوس دن کا عذاب آجائے۔ اس دن سارا اختیار اللہ ہی کو حاصل ہوگا۔ وہی ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ہوں گے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی وہی ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۵۵-۵۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ۙ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۙ وَّ اَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (۴۲-۴۴)

'وَكُذِّبَ مُوْسٰى' حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کا ذکر مجہول کے صیغہ سے کیا ہے درآنحالیکہ اوپر دوسرے انبیاءؑ کی تکذیب کا ذکر ان کی قوموں کی طرف نسبت کے ساتھ فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی تکذیب ان کی قوم نے نہیں بلکہ فرعونیوں نے کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے صاحبِ

شریعت بنی حضرت موسیٰ ہی تھے جن کے حالات کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے کسی تصریح کے بغیر، خاتمۂ کلام کے طور پر، بات یوں فرما دی گئی کہ تکذیب تو ابھی تم سے پہلے موسیٰ کی بھی ہو چکی ہے! (ونکیر کا مفہوم)

'نکیر' اصل میں نکیری ہے۔ 'ی' گر گئی ہے اور کسرہ اس کی یادگار ہے۔ عربی میں قافیہ وغیرہ کی رعایت سے 'ی' اس طرح گر جایا کرتی ہے۔ 'نکیر' کے معنی عام طور پر اہل لغت نے انکار کے لیے ہیں لیکن مجھے اس سے انکار ہے۔ کلام عرب کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی مجرد انکار کے نہیں بلکہ اس انکار کے ہیں جس کے ساتھ غیرت، نفرت اور بیزاری کی شدت پائی جاتی ہو۔ اس وجہ سے ہم نے اس کا ترجمہ پھٹکار کیا ہے۔

(رسولوں کے معاملہ میں قوموں کی مشترک روایت)

ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہاری قوم تمہارے ساتھ جو معاملہ کر رہی ہے یہ ذرا بھی اس سے مختلف نہیں ہے جو دوسری قوموں نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا۔ رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ بعینہٖ یہی ہے جو ٹھیک ٹھیک تمہارے ساتھ بھی دہرائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورتِ حال میں نہ تمہاری کسی کوتاہی کو دخل ہے اور نہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھیں جن چیزوں سے مسلح ہو کر میدان میں اترنا تھا، ان میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ تمہاری جانب سے سب کچھ ٹھیک ہے لیکن قوموں کی جو روایت ہے وہ بدلنے والی نہیں ہے۔ پس اپنا کام کیے جاؤ! لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

'فَاَمْلَیْتُ لِلْکٰفِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْتُھُمْ ۚ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ' یعنی جن قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی ان کو اللہ نے فوراً نہیں پکڑا بلکہ ان کو کافی مدت تک ڈھیل دی لیکن اس ڈھیل نے اصلاحِ حال کے بجائے جب ان کی سرکشی ہی میں اضافہ کیا تو اللہ نے ان کو پکڑا اور پھر اس طرح پکڑا کہ ان کی ہستی ہی مٹا دی۔ یہی معاملہ تمہاری قوم کے ساتھ بھی ہوگا اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی۔

فَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا وَھِیَ ظَالِمَۃٌ فَھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَۃٍ وَّقَصْرٍ مَّشِیْدٍ (۴۵)

('قصر مشید' کا مفہوم)

'قَصْرٍ مَّشِیْدٍ' پختہ اور بلند ایوان و محل کو کہتے ہیں۔ اور عربیت کے قاعدے کے مطابق جس طرح بئر کے ساتھ 'مُعَطَّلَۃٍ' کی صفت ہے اسی طرح اس کے ساتھ بھی متروک و مہجور یا اس کے ہم معنی کوئی صفت ماننی پڑے گی جو، وضاحت قرینہ کی بنا پر، حذف کر دی گئی ہے۔

(قوموں کے اخلاقی زوال کے نتائج)

اوپر والی آیت میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے یہ اسی کی شہادت ملک عرب کے ان آثار سے پیش کی گئی ہے جن پر سے اہل عرب کے تجارتی قافلے برابر گزرتے تھے اور جن کی روایات، جیسا کہ ان کے شعراء اور خطباء کے کلام سے واضح ہے، ان کے ہاں مشہور تھیں۔ فرمایا کہ کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ کتنے ہی شہر اور بستیاں ہیں، جن کو ان کے کفرانِ نعمت کی پاداش میں، ہم نے ہلاک کر دیا اور اب ان کا حال یہ ہے کہ ان کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔

قوموں پر تباہی ان کی اخلاقی زوال کے نتیجہ میں آتی ہے

'وَهِيَ ظَالِمَةٌ' یہاں حال کے محل میں ہے اور 'ظلم' کا مفہوم ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ اس سے مراد وہ ظلم ہے جو قومیں اپنے کفرانِ نعمت اور اپنے شرک کے سبب سے خود اپنی جانوں پر ڈھاتی ہیں۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ قوموں پر اس طرح کی جو تباہیاں آتی ہیں وہ محض اتفاقی حادثہ یا گردشِ روزگار کے طور پر نہیں آتی ہیں، جیسا کہ احمقوں نے سمجھا ہے، بلکہ ان کا ظہور ان کے اخلاق و کردار کے اندر سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کی ناشکری میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان کا یہ ظلم ان کے تمام انفرادی و اجتماعی اخلاق و کردار کی چولیں ہلا دیتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ پہلے ان کی عظمت کی چھتیں زمیں بوس ہوتی ہیں پھر ان کے وجود کی بنیادیں بھی اکھڑ جاتی ہیں۔

بربادی کی تصویر

'فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا' صورتِ حال کی تصویر ہے۔ بڑی عمارتوں کے انہدام کا آغاز بالعموم ان کی چھتوں سے ہوتا ہے۔ متروک و مہجور ہو جانے کے بعد پہلے ان کی چھتیں بوسیدہ ہو کر گرتی ہیں پھر دیواریں بھی غیر محفوظ ہو جانے کے باعث باد و باراں سے ڈھے جاتی ہیں۔

'وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ' کا عطف 'قَرْيَةٍ' پر ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ عرب کے ملک میں پانی کی قلت کے سبب سے کنوؤں اور چشموں کی بڑی اہمیت تھی۔ بستیاں وہیں بستی تھیں جہاں پانی دستیاب ہو اور کنوئیں بنائے جا سکتے ہوں۔ پھر لازماً سب سے زیادہ رونق بھی کنوؤں اور چشموں ہی پر ہوتی تھی اس وجہ سے کنوؤں کی ویرانی تعبیر ہے ساری ہماہمی اور تمام چہل پہل کے ختم ہو جانے کی۔

'وَقَصْرٍ مَّشِيْدٍ' کے ساتھ بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، کوئی صفت 'معطّلۃ' کی ہم معنی محذوف ماننی پڑے گی۔ اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کتنے پرشکوہ اور بلند و بالا ایوان و محل ہیں جو بالکل متروک و مہجور پڑے ہیں اور جن کی ڈیوڑھیوں کے آگے کبھی بڑے بڑے سردار اور حکمران سجدے کرتے تھے۔ اب ان کے کنگروں اور ان کی برجیوں میں زاغ و زغن کے آشیانے ہیں!

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۴۶)

دل کے اندھے

یعنی یہ عبرت بخش آثار تو ہم نے زمین میں چھوڑے ہی اس لیے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں اور ان سے عبرت حاصل کریں تاکہ ان کے دلوں کے اندر سوچنے کی اور ان کے کانوں کے اندر سننے کی صلاحیت بیدار ہو اس لیے کہ اس دنیا کی اصلی آفت یہ نہیں ہے کہ سروں پر جو آنکھیں لگی ہوئی ہیں وہ اندھی ہو جاتی ہیں بلکہ یہ ہے کہ سینوں میں جو دل ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں! مطلب یہ ہے کہ اگر سروں کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہے اور سینے میں لینے والا دل بیدار رہو تو آدمی نابینا ہو کر بھی تمام حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن دل کی آنکھیں چوپٹ ہو چکی ہوں تو وہ دیکھتا تو سب کچھ ہے لیکن اسے سوجھتا کچھ بھی نہیں!

یہاں 'قُلُوْبُ' کے ساتھ 'فِي الصُّدُوْرِ' کی قید اس امر کا قرینہ ہے کہ 'الابصار' کے ساتھ 'فی الرؤس'

یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف مانا جائے۔ تقابل کا اصول، جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، اس کا تقاضا کر رہا ہے۔ چونکہ یہاں حال بے بصیرت لوگوں کا بیان ہو رہا ہے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ دل کا پتہ، اس کے مقام و محل کے تعین کے ساتھ دیا جائے کہ اصلی اندھاپن دل کا اندھاپن ہے اور یہ مکذبین رسول اسی اندھے پن میں مبتلا ہیں۔ کوئی ان کے سر کی آنکھیں کھلی دیکھ کر ان کو بینا نہ سمجھے۔ اس لیے کہ آنکھوں کے اندر بصیرت کی روشنی دل کی راہ سے آتی ہے اور ان کے دل کی آنکھیں بالکل اندھی ہیں۔

آثار سے عبرت پذیری سے گریز

یہ امر خاص طور پر یہاں ملحوظ رہے کہ عرب کے شعراء منزل جاناں کے آثار پر تو خون کے آنسو بہاتے تھے یہاں تک کہ اس کے چولہے اور چکی کے آثار تک کو یاد کر کے روتے اور رلاتے لیکن ان کے اس سارے توہم کی رسائی بس منزل جاناں کے آثار ہی تک تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے تاریخ کے ان آثار اور اپنے ملک کے ان کھنڈروں سے کوئی سبق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جو دل کی آنکھیں کھولنے والی ہزاروں داستانیں زبان حال سے سنا رہے تھے۔ یہی حال ہمارے موجودہ زمانے کے ماہرین آثریات یا متوسمین کا ہے انھوں نے بڑی گہری کھدائیاں کر کے بے شمار آثار سے عجائب خانے تو بھر دیے لیکن ان کی ساری تحقیق و تفتیش صرف اس نقطہ پر مرتکز ہے کہ یہ آثار پانچ ہزار برس پہلے کی تہذیب کے ہیں، یا سات ہزار برس پہلے کی تہذیب کے! وہ اصل حقیقت جس کی طرف یہ آثار اشارہ کر رہے ہیں نہ کسی کی سمجھ میں آئی ہے، نہ شاید آئے گی حالانکہ قدرت نے یہ آثار اسی حقیقت کی تذکیر کے لیے محفوظ کیے ہیں اس لیے کہ دلوں کے اندر بصیرت اسی حقیقت کے تذکر سے پیدا ہوتی ہے!

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (۴۷)

انسان کا ایک مغالطہ

یعنی تم کو جھٹلانے والے جلدی مچائے ہوئے ہیں کہ جس عذاب کی تم ان کو وعید سنا رہے ہو یہ آ کیوں نہیں جاتا؟ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ آئے گا تو ضرور، خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، لیکن انسان ہر چیز کو اپنے محدود پیمانوں سے ناپتا ہے اس وجہ سے اس کو چند سالوں کی مدت یا مہلت بہت طویل معلوم ہوتی ہے۔ وہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے یہ سب ہوائی باتیں ہیں حالانکہ یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں بلکہ حقائق ہیں لیکن خدا کے ہاں کے دن اس دنیا کے دنوں سے بالکل مختلف ہیں۔ خدا کے ہاں کا ایک دن اس دنیا کے دنوں کے حساب سے ایک ہزار سال کے مانند ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے سکنڈ اور منٹ بھی اس دنیا کے برسوں کی مدت سے متجاوز ہوتے ہیں۔ انسان ہر چیز کا شمار اپنے چوبیس گھنٹوں کے دن کے حساب سے کرتا ہے اور خدا کے پروگرام اس کی اپنی تقویم کے اعتبار سے بنتے ہیں۔

خدائی دنوں کے پیمانے

مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کی ملکوت کے معاملات کو اپنے اوزان اور پیمانوں سے ناپنے اور تولنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے ہاں جب صدیاں گزر جاتی ہیں تو خدا کے ہاں وہ منٹوں اور گھنٹوں کی بات ہوتی ہے۔ خدائی دنوں کا یہ حساب جو یہاں مذکور ہوا ہے یہ بھی صرف تقریب فہم کے لیے ایک تمثیل ہے اور

'کَاَلۡفِ سَنَۃٍ' کے الفاظ خود اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اصل حقیقت ان دنوں کی کیا ہے؛ اس کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ یہ تمثیل جس طرح قرآن میں وارد ہوئی ہے اسی طرح زبور اور انجیل میں بھی ہے۔ ۲۔ پطرس: ۳: ۸ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"یہ خاص بات تم پر پوشیدہ نہ رہے کہ خداوند کے نزدیک ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور ہزار برس ایک دن کے برابر۔"

آسمان و زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر جس طرح قرآن میں ہے اسی طرح تورات میں بھی ہے اور ان چھ دنوں میں تقسیم کار کی جو صورت اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی ہے اس کی تفصیل حٰمٓ السجدہ میں بیان ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے ہمارے اور آپ کے دن مراد نہیں ہیں بلکہ یہ خدائی ایام ہیں جن کے طول و عرض کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ہمارے لیے یہ اجمالی علم کافی ہے کہ خدا نے الگ الگ عالم بنائے ہیں اور ہر عالم کا مدار و نظام الگ الگ ہے۔ ایک کے معاملات کو دوسرے پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے۔ ہمیں اپنے گز سے آسمان و زمین کے طول و عرض کو ناپنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

قرآن سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ملکوتِ الٰہی کے نظام میں بعض امور کے لیے اس سے بھی بڑے دن مقرر ہیں۔ مثلاً جبریلِ امین اور ملائکہ کی دربارِ الٰہی میں خاص حضوری کے لیے جو دن ہے وہ پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ سورہ معارج میں ہے۔

تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ (معارج: ۴)	فرشتے اور جبریل اس کی طرف ایک ایسے دن میں صعود کرتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

جن لوگوں نے آیت زیر بحث میں 'یَوۡمٌ' سے یوم قیامت مراد لیا ہے اور اس کے اس طول کو اس کی شدتِ عذاب سے استعارہ قرار دیا ہے ہمارے نزدیک ان کی تاویل سیاقِ کلام کے بھی خلاف ہے اور نظائرِ قرآن کے بھی۔ خاص طور پر اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ جیسے اکابرِ تفسیر کی طرف تو بالکل ہی خلافِ حقیقت ہے۔ لیکن اس وضاحت کے بعد، جو ہم نے اوپر کی ہے، اب اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَمۡلَيۡتُ لَهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذۡتُهَا‌ ۚ وَاِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ (۴۸)

یہ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب ہے کہ خدا کی ڈھیل سے مغرور نہ ہو۔ کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جن کو ان کے کفرانِ نعمت اور شرک کے باوجود ہم نے ڈھیل دی لیکن جب انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر ان کو دبوچ لیا اور پھر کوئی ان کو ہم سے چھڑانے والا نہ بن سکا۔ مطلب یہ ہے یہی حشر تمھارا بھی ہونے والا ہے، اگر تمھاری اس اکڑ میں خم نہ پیدا ہوا۔ 'وَاِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ' اور یہ بھی یاد

دکھو کہ بالآخر سب کی واپسی ہماری ہی طرف ہونی ہے۔ آخرت میں سب کو سابقہ صرف ہم سے پیش آئے گا۔ نہ کسی کے اعوان و انصار وہاں کسی کے کچھ کام آئیں گے نہ مزعومہ شرکا و شفعاء۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۴۹-۵۱)

رسول کی اصل ذمہ داری

'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ عربوں میں یہ طریقہ تھا کہ قبیلہ یا قافلہ جہاں ڈیرا ڈالتا وہاں کسی اونچی جگہ پر ایک نگران پہرہ دیتا اور اگر وہ کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرتا تو اپنے کپڑے اتار کر ننگا ہو جاتا اور خطرے کا اعلان کرتا جس کے بعد قبیلہ یا قافلہ کے سارے مرد تلواریں سونت کر مدافعت کے لیے تیار ہو جاتے۔ اس کو 'نذیر عریاں' کہتے تھے۔ یہ تعبیر چونکہ ناشائستہ تھی، نبی کے لیے اس کا استعمال موزوں نہ تھا، اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' کی شکل میں شائستہ بنا لیا ہے لیکن اس میں تلمیح 'نذیر عریاں' ہی کی طرف ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح ایک 'نذیر عریاں' قوم کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے تم ایک 'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' بن کر لوگوں کو آنے والے وقت سے آگاہ کر دو۔ لیکن بس آگاہ کر دو۔ نہ اس خطرے کو دکھا دینا تمھاری ذمہ داری ہے نہ اس سے لوگوں کو بچانا تمھاری ذمہ داری ہے۔ اگر لوگ تمھارے اس واضح انذار کے بعد بھی متنبہ نہ ہوں گے تو نتائج کی ذمہ داری خود ان پر ہے۔ یہ مضمون 'اِنَّمَا' کے اندر جو حصر کا مفہوم ہے اس سے نکلتا ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۔

یہ وہ اصل انذار ہے جس سے آشکارا طور پر لوگوں کو آگاہ کر دینے کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی۔ اس کا آغاز اگرچہ اہل ایمان کے لیے بشارت سے ہوا ہے لیکن یہاں یہ بشارت بھی انذار ہی کا مقدمہ ہے اس لیے کہ کلام کا رخ قریش کے متکبرین کی طرف ہے اور یہ بشارت ان کے غرور پر ایک کاری ضرب ہے۔ فرمایا کہ لوگوں کو سنا دو کہ وہ وقت آ رہا ہے جب ایمان و عمل صالح والوں کو تو مغفرت اور رزق کریم کی سرفرازی حاصل ہوگی، رہے وہ لوگ جن کی ساری بھاگ دوڑ ہماری آیات کی تکذیب اور ہمارے رسول کو شکست دینے کی راہ میں ہے وہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

'رِزْقٌ كَرِيْمٌ' مغفرت کا ثمرہ اور جنت کی تمام نعمتوں کی ایک جامع تعبیر ہے۔ یہاں 'کَرِیْم' کی صفت اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتی ہے جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔

'مُعَاجَزَة' کے معنی اس مسابقت کے ہیں جو کسی کو شکست دینے کے لیے کی جائے۔ یہاں اس سے اشارہ کفار کی اس بھاگ دوڑ کی طرف ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست دینے کے لیے وہ کر رہے تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۵۲)

'تمنی' کا اصل لغوی مفہوم، صاحب اقرب الموارد کی تصریح کے مطابق یہ ہے۔ یطلق عند اھل العربیۃ علی طلب حصول الشئ علی سبیل المحبۃ وعلی الکلام الدال علی ھذا الطلب (عربی زبان کے ماہرین کے نزدیک یہ لفظ کسی شے کے بطریق محبت حصول کی طلب کے لیے بولا جاتا ہے اور اسی طرح اس کلام پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو اس طلب پر دال ہو) میں نے اس قول کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ میرے نزدیک کلامِ عرب کی روشنی میں، اس لفظ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ قرآن میں اس کے مختلف صیغے سات آٹھ مقامات میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اسی مادے سے 'امنیۃ' کا لفظ بھی، جمع اور واحد کی مختلف صورتوں میں، سات آٹھ جگہ آیا ہے۔ ہر جگہ، ہر شکل میں، لفظ کی اصل روح موجود ہے۔ اردو میں اس کا مفہوم ہوگا، کسی چیز کی خواہش کرنا، ارمان کرنا، تمنا کرنا، حوصلہ کرنا، یا کسی مقصد کے لیے اپیل یا استمالت کرنا۔ اسی طرح 'امنیۃ' کے معنی خواہش، ارمان، تمنا، حوصلہ اور اپیل کے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس لفظ کے اندر بعض لوگوں نے قراءت کرنے کے معنی کہاں سے گھسا دیے ہیں۔ مجھے اس معنی میں یہ لفظ، کلامِ عرب میں کہیں نہیں ملا حالانکہ یہ عربی زبان کے کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہے۔ بعض مفسرین نے اس مفہوم کی تائید میں ایک شعر نقل کیا ہے لیکن اول تو ایک کثیر الاستعمال لفظ کو، اس کے معروف مفہوم سے ہٹانے کے لیے، ایک غیر معروف شعر کی سند کی وقعت کیا ہے۔ پھر وہ شعر بھی ہمارے نزدیک منحول ہے اور ہم اس کا منحول ہونا ثابت کر سکتے ہیں لیکن ایک غیر مفید بحث کو طول دینے سے کیا حاصل! اس بات کی بھی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے کہ صاحبِ لسان نے لفظ کے اس مفہوم کا بھی حوالہ دیا ہے۔ صاحبِ لسان کی ساری خوبیوں کے اعتراف کے باوجود، ان کی اس خامی کی طرف مقدمۂ تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ بسا اوقات وہ کسی لفظ کے تحت اہلِ تاویل کے لیے سند اقوال بھی نقل کر دیتے ہیں اور چونکہ اس لغت کا بڑا پایہ ہے اس وجہ سے جو لوگ لغت کے نقادوں میں سے نہیں ہیں وہ اس طرح کے اقوال کو لے اڑتے ہیں حالانکہ ان اقوال کی، جب تک زبان کے استعمالات سے تائید نہ ہو، کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بہرحال ہمارے نزدیک اس لفظ کے اندر قراءت یا تلاوت کے معنی کے لیے کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے۔

اب آیت کے مفہوم اور اس کے اجزا پر غور کیجیے۔

اوپر والی آیت میں معاندین کی جس سعی فی المعاجزۃ کا ذکر ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تمہی کو پیش آئی ہو۔ تم سے پہلے جتنے رسول اور نبی بھی آئے سب کو اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا۔ جب بھی کسی نبی نے لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے کوئی قدم اٹھایا، کوئی حوصلہ کیا، کوئی دعوت دی اور خلق کو سکھانے، سدھارنے، بلانے اور پرچلانے کی کوشش کی تو اشرار و مفسدین نے اسی طرح اس کے حوصلے کی راہ میں اڑنگے ڈالے اور اس کی آواز کو دبانے اور اس کی تعلیم و دعوت کو شکست دینے کی کوشش کی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی دعوت و اصلاح کے ارادے سے اٹھتے تو ابولہب و ابوجہل وغیرہ آپؐ کی تردید کے لیے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ پھرتے۔

یہاں ہدایت و اصلاح کی راہ میں نبی کے اقدام کو تمنّی اور اس کی سعی و جہد کو 'امنیۃ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'امنیۃ' کے معنی آرزو، حوصلہ اور ارمان کے ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کی تمنا اور آرزو تو شب و روز یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کی ہدایت اور اس کی باتیں (آیات) اتارنے کی کوئی راہ کھلے اور وہ یہ راہ کھولنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتا رہتا ہے لیکن شیاطین ہر وقت یہ راہ مارنے کے لیے گھات میں رہتے ہیں اور جہاں ان کو نبی کی کوئی بات بنتی نظر آئی فوراً اس کے خلاف طرح طرح کے پروپیگنڈے شروع کر دیتے ہیں۔ یہ امر یاد رکھیے کہ شیاطین اس وقت تک تو میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں جب تک وہ دیکھتے ہیں کہ کسی طرف سے کلمۂ حق کی صدا نہیں آ رہی ہے لیکن جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی دعوتِ حق بلند ہوئی تو ان کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگتا ہے اور پھر وہ اس کی مخالفت کے لیے اپنے تمام حربوں سے مسلح ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

نبی اور رسول کے فرق پر ہم آل عمران ۳۹ کے تحت وضاحت سے گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ان دونوں لفظوں کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس آزمائش سے کوئی نبی یا رسول بھی نہیں بچا ہے۔ یہ آزمائش انبیا و رسل کے لیے اللہ کی ایک سنت ہے جو سب کو پیش آ چکی ہے۔

لفظ 'شیطان' یہاں بطور اسم جنس ہے اور اس سے مراد شیاطین جن و انس دونوں ہیں۔ یعنی دونوں گٹھ جوڑ کر کے نبی کو شکست دینے کے لیے ایک متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں۔

شیاطین کی فتنہ انگیزیاں

'اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ' سے مراد یہ ہے کہ وہ نبی کے کام و اقدام اور اس کے ارادوں اور منصوبوں میں طرح طرح سے رخنہ اندازیاں کرتے اور قسم قسم کے اعتراضوں، طعنوں، شگوفہ بازیوں سے اس کے کلام و پیغام کے اثر کو مٹانے کے درپے ہوتے ہیں۔

'فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ'۔ نسخ کے معنی، جیسا کہ آیت نسخ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، مٹانے کے ہیں اور 'احکام' کے معنی پابرجا اور مستحکم کرنے کے۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء و رسل کو یہ آزمائش اللہ تعالیٰ کی سنت کے تحت پیش آتی ہے اور اس کا فائدہ، جیسا کہ آگے وضاحت آ رہی ہے، دعوتِ حق کو پہنچتا ہے۔ حق و باطل کے اس تصادم کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ اللہ شیاطین کے اٹھائے ہوئے فتنوں کو تو جھاگ کی طرح بٹھا دیتا ہے اور اپنی اور اپنے رسول کی باتوں کو دلوں میں رسوخ و استحکام بخشتا ہے۔

'وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ'۔ یہ تسلی کے مضمون کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے حوالہ سے مزید مؤکد و مدلّل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل میں یہ کشمکش کراتا ہے اور اپنے نبیوں کی دعوت کے مقابلہ میں شیاطین کو بھی زور آزمائی و فتنہ انگیزی کا موقع جو دیتا ہے تو یہ سب کچھ اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے اس وجہ سے نبی کو اللہ کے علم اور اس کی حکمت پر بھروسہ رکھنا چاہیے کہ جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر مبنی ہوگا اور اس کا نتیجہ اس کی دعوت کے حق میں بہتر ہی نکلے گا۔

بعینہ یہی مضمون بتغیر الفاظ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔ بعض نظائر ملاحظہ ہوں۔

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝
(الانعام : ۱۱۳-۱۱۴)

اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے شیاطین کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی باتیں خلق کو فریب دینے کے لیے القا کرتے ہیں اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے تو ان کو اور ان کی اس ساری فریب کاری کو نظر انداز کرو، اللہ نے اس کا موقع اس لیے دے رکھا ہے کہ اس سے اہل ایمان کا ایمان محکم ہو اور تاکہ اس فتنہ کی طرف ان لوگوں کے دل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی یہ کرنی چاہتے ہیں کر لیں۔

ان آیات سے سورۂ حج کی زیر بحث آیت کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر 'يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا' کے الفاظ نگاہ میں رہیں۔ یہ بعینہ وہی بات ہے جو آیت زیر بحث میں 'اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ' کے الفاظ سے تعبیر فرمائی گئی ہے۔

اسی طرح سورۂ فرقان میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝
(فرقان : ۳۱-۳۳)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے دشمن بنائے اور اطمینان رکھو، تمہارا رب رہنمائی اور مدد کے لیے کافی ہے۔ اور یہ کافر اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اس شخص پر یہ قرآن آخر یکبار دفعہ کیوں نہیں نازل کر دیا گیا! ہم نے ایسا اس لیے کیا کہ اس بار گراں کے لیے تمہارے دل کو اس کے ذریعہ سے اچھی طرح مضبوط کر دیں اور ہم نے اس کو اہتمام کے ساتھ بالتدریج اتارا۔ اور یہ جو شگوفہ بھی چھوڑیں گے تو ہم اس کے جواب میں حق کو واضح اور اس کی بہترین توجیہ کر دیں گے۔

اس آیت میں اس القائے شیطانی کی ایک مثال بھی پیش کر دی گئی ہے کہ اللہ کا رسول جب لوگوں کے سامنے اللہ کا کلام پیش کرتا ہے تو یہ معاندین، رسول کو مطعون کرنے کے لیے یہ شگوفہ چھوڑتے ہیں کہ اگر یہ

اللہ کے رسول ہیں تو یہ پورا قرآن بیک دفعہ کیوں نہیں پیش کر دیتے! آخر اللہ کے لیے یہ کیا مشکل ہے! مطلب یہ ہے کہ جب یہ ایسا نہیں کر رہے ہیں تو اس کے معنی (نعوذ باللہ) یہ ہیں کہ یہ خود اس کلام کو گھڑتے ہیں اور جتنا گھڑ پاتے ہیں اتنا سنا دیتے اور دھونس جمانے کے لیے جھوٹ موٹ اس کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

القائے شیطان کی بے بنیاد روایت

اس آیت کی توضیح میں ہم نے اس قدر تفصیل سے صرف اس لیے کام لیا ہے کہ کسی کے ذہن میں کوئی خلجان باقی نہ رہ جائے۔ اس توضیح کے بعد اس فضول سی روایت کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی جو ہمارے مفسرین نے، اللہ ان کو معاف کرے، اپنی کتابوں میں اس آیت کے شانِ نزول کی حیثیت سے درج کر دی ہے۔ اول تو یہ آیت، جیسا کہ آپ نے دیکھا، کسی شانِ نزول کی محتاج نہیں ہے بلکہ اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح اور اپنے سابق و لاحق سے بالکل مربوط ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ جو روایت یہ حضرات نقل کرتے ہیں نہ اس کا روایت کے اعتبار سے کوئی وزن ہے نہ درایت کے پہلو سے بلکہ وہ محض زنادقہ کا ایک القائے شیطانی ہے جو انھوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو مجروح کرنے کے لیے گھڑا اور حضرات مفسرین اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس کو اپنی کتابوں میں نقل کرتے آ رہے ہیں۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۙ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵۳-۵۴)

حق کے مقابل میں باطل کو مہلت دیے جانے کی پہلی حکمت

اب یہ حکمت واضح فرمائی جا رہی ہے اس بات کی کہ اس دنیا میں یہ صورتِ حال کیوں ہے کہ جب کوئی دعوتِ حق و خیر اٹھتی ہے تو اس کے مقابل میں اشرار و شیاطین بھی اپنی تمام فتنہ انگیزیوں کے ساتھ میدان میں اترتے ہیں؟ فرمایا کہ یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے حق کے ساتھ باطل کو بھی اس دنیا میں مہلت دے رکھی ہے تاکہ جو حق کو اختیار کرے وہ بھی اختیار و تمیز کے ساتھ کرے اور جو باطل کی طرف جانا چاہے وہ بھی وضوحِ حق اور اتمامِ حجت کے بعد جائے۔ اسی کشمکش سے اہلِ ایمان کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور اسی سے منافقین اور سخت دلوں پر اللہ کی حجت تمام ہوتی ہے۔

اشرار کے فتنوں کے مخفی فوائد

'فتنۃ' سے مراد آزمائش اور امتحان ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حق کے مقابل میں باطل اور اہلِ باطل کو بھی زور آزمائی کا موقع نہ دیا گیا ہوتا تو حق پرستوں اور باطل پرستوں میں امتیاز نہ ہوتا۔ یہ موقع مل جانے سے اہلِ باطل، اپنا من بھاتا کھاجا پا کر، باطل کے علمبرداروں کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور جو سچے حق پرست ہوتے ہیں، اہلِ باطل کی تمام باطل آرائیوں کے علی الرغم، حق پر جمے رہتے ہیں۔

لِلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ۔ مرض سے مراد نفاق ہے اور 'قاسیۃ القلوب' سے اشارہ قریش اور یہود کے ان کٹر معاندین کی طرف ہے جن کے باہمی گٹھ جوڑ سے، دعوتِ حق کے خلاف یہ مہم چل رہی تھی۔ فرمایا کہ باطل کو یہ مہلت اللہ نے اس لیے دی ہے کہ یہ منافقین اور اشرار کے لیے ایک

فتنہ بنے۔ وہ حق کے خلاف جو کھیل کھیلنے چاہتے ہیں وہ کھیل لیں اور اپنے دل کے ارمان پورے کر لیں۔

حق کے مقابل میں باطل کو مہلت دیے جانے کی دوسری حکمت

وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ۔ یہ انہی بدبختوں اور شامت زدوں کی حالت پر اظہارِ افسوس ہے کہ اب یہ حق کی مخالفت میں اتنی دور نکل گئے ہیں کہ ان کی بازگشت کا کوئی امکان نہیں۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ سنتِ الٰہی کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں!

وَّلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَیُؤْمِنُوْا بِہٖ فَتُخْبِتَ لَہٗ قُلُوْبُھُمْ۔ 'وَلِیَعْلَمَ' اور 'فَیُؤْمِنُوْا بِہٖ' دونوں مقامات میں فعل اپنے کامل معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور 'اُوْتُوا الْعِلْمَ' میں 'علم' سے مراد قرآن و کتاب کا علم ہے۔ یہ حق کے مقابل میں باطل کو مہلت دیے جانے کی دوسری حکمت بیان ہوئی کہ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح وہ لوگ، جو علمِ کتاب سے کچھ بہرہ ور ہو چکے ہیں، اپنے علم میں پوری طرح راسخ ہو جاتے ہیں اور ان پر یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ جو علمِ کتاب تم سے ان کو ملا ہے وہ بالکل حق اور منجانب اللہ ہے۔ پھر ان کے علم کی یہ پختگی ان کے ایمان کو بھی پورا رسوخ و استحکام بخشتی ہے اور ان کے دل پوری یکسوئی اور کامل رضا کے ساتھ اپنے رب کی طرف جھک پڑتے ہیں۔

اشیا کی اصل حقیقت ان کے اضداد سے واضح ہوتی ہے

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ اشیا کی اصل حقیقت ان کے اضداد ہی سے واضح ہوتی ہے۔ ایک بات کو آپ جانتے اور مانتے ہیں لیکن اس کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اگر آپ کے سامنے نہیں آیا تو اس بات کا بڑا امکان ہے کہ وہ جب سامنے آئے تو آپ کا علم و ایمان متزلزل ہو جائے۔ لیکن وہ سب کچھ اگر آپ کے سامنے آچکا ہے اور اس کے کھرے کھوٹے میں امتیاز کر کے آپ نے اس حق کو قبول کیا ہے تو اس کو علیٰ وجہ البصیرت آپ نے اختیار کیا ہے۔ پھر اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ کوئی بادِ مخالف آپ کے موقف سے آپ کو ہٹا سکے۔ دین میں یہی بصیرت پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں یہ انتظام فرمایا کہ حق کے مخالفین کو بھی یہ موقع دیا ہے کہ وہ حق کے خلاف جو زہر اُگلنا چاہتے ہیں وہ اگل لیں تاکہ جو لوگ حق کو قبول کریں محض تقلیدی طور پر نہ اختیار کریں بلکہ پوری معرفت کے ساتھ اختیار کریں۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا علم راسخ، اور مبنی بر حکمت و بصیرت ہوگا ان کا ایمان بھی تقلیدی نہیں ہوگا جو ہر جھونکے سے متزلزل ہو جائے بلکہ صحیح اور راسخ علم سے صحیح اور راسخ ایمان پیدا ہوتا ہے اور اسی راسخ ایمان سے وہ اسلام و اخبات وجود میں آتا ہے جو ایمان کی اصل روح ہے اور جس کے بغیر ایمان خدا کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

اہل ایمان کو ثباتِ قدم کی بشارت

وَاِنَّ اللّٰہَ لَھَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ جس طرح اوپر منافقین اور اشرار سے متعلق فرمایا ہے کہ وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ (اب یہ لوگ اتنی دور نکل جا چکے ہیں کہ ان کی حق کی طرف بازگشت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا) اسی طرح اس ٹکڑے میں اہل ایمان سے متعلق بشارت دی ہے کہ اگر یہ

شیاطین ان کی راہ مارنے کی تو بہت کوشش کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو ضائع نہیں ہونے دے گا بلکہ اپنی توفیق بخشی سے ان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف فرمائے گا۔ 'صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ' سے مراد وہ سیدھی راہ ہے جو بندے کو اس کے رب کی طرف لے جاتی ہے۔ نکرہ یہاں میرے نزدیک اس کی اہمیت و شان کے اظہار کے لیے ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۵۵-۵۷)

مخالفین کو وعید

اوپر اہل علم و ایمان کی تعریف میں فرمایا کہ مخالفین کی مخالفتیں ان کے اندر اس بات کو راسخ کرتی ہیں کہ پیغمبر جو وعد و وعید سنا رہے ہیں وہ بالکل حق ہے۔ اب فرمایا کہ رہے یہ مکذبین تو وہ اس وعد و وعید کی طرف سے اسی طرح شک میں مبتلا رہیں گے جس طرح آج ہیں۔ یہ تو اسی وقت مانیں گے جب ان پر یا تو قیامت اچانک آدھمکے یا کسی ہولناک منحوس دن کا عذاب ان پر آجائے۔ 'عَقِيْم' بانجھ کو کہتے ہیں۔ 'فَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ' (ذاریات: ۲۹) (وہ بولی کہ میں تو ایک بانجھ ہوں) یہیں سے اس کے اندر بے فیض اور منحوس کا مفہوم پیدا ہوا اور اس کا اطلاق اس طوفانی ہوا پر بھی ہوا جو تباہی تو قیامت کی مچادے لیکن اس کے اندر نفع کا کوئی پہلو نہ ہو۔ چنانچہ قوم عاد پر جو عذاب آیا اس کے لیے قرآن نے 'الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ 'وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ' (ذاریات: ۴۱) (اور ان کے لیے قوم عاد کے اندر بھی درس عبرت ہے جب کہ ہم نے ان پر منحوس ہوا بھیجی) سورۂ قمر آیت ۱۹ میں 'يَوْمِ نَحْسٍ' کی ترکیب بھی استعمال ہوئی ہے۔ ان کی تفصیلات ان کے محل میں دیکھیے۔

'اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ' فرمایا کہ اگر یہ لوگ ظہور قیامت ہی کے منتظر ہیں تو اس بات کو یاد رکھیں کہ اس دن سارا اختیار و اقتدار صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ہوگا۔ اس دن نہ ان کی جمعیتیں اور پارٹیاں ان کے کچھ کام آئیں گی اور نہ ان کے مفروضہ شرکاء و شفعاء، اور وہ دن جزا و سزا کے فیصلہ اور عدل کے ظہور کا ہوگا نہ کہ سعی و عمل کا۔ اس دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرما دے گا کہ کون جیتا اور کون ہارا اور ہر ایک اپنے عمل کے نتائج سے دوچار ہوگا۔

'فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ' یہ اس فیصلہ کا اعلان ہے جس کا اوپر والے ٹکڑے میں ذکر ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس دن جو ایمان و عمل صالح والے لوگ ہیں وہ نعمت کے باغوں میں داخل ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری باتوں کی تکذیب کی ہے ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔ ذلیل کرنے والا عذاب اس لیے کہ انھوں نے اپنے آپ کو خدا و رسول کے پیش کردہ حق سے بھی بالاتر سمجھا جو بدترین استکبار ہے۔ اس استکبار کی بنا پر وہ مستحق ہیں کہ آخرت میں ان کو صرف عذاب ہی نہ دیا جائے بلکہ وہ عذاب دیا جائے جو ذلیل کرنے والا بھی ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس سزا کی سنگینی

دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے جو تعذیب کے ساتھ ساتھ اپنے اندر توہین و تذلیل کی پھٹکار بھی رکھتی ہو۔

۱۰- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۵۸-۷۶

آگے ان مسلمانوں کی بطور خاص دلداری فرمائی ہے جو اس دور میں، اعدائے حق کی ستم رانیوں سے تنگ آکر اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے مختلف علاقوں کو ہجرت کر رہے تھے۔ ان کو اپنی صفات کا حوالہ دے کر اطمینان دلایا ہے کہ سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔ جس طرح مایوسی کے بعد رحمت کی گھٹائیں اٹھتی ہیں اور زمین کو جل تھل کر دیتی ہیں اسی طرح تمہارے لیے بھی رحمت کی گھٹائیں برسیں گی اور تم نہال ہو جاؤ گے۔ تمہارے اعداء کو خدا جو مہلت دے رہا ہے تو اس لیے دے رہا ہے کہ خدا اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، وہ عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا لیکن اس مہلت کی ایک حد ہے۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو اس کا انجام دیکھیں گے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ تمہارے یہ مخالفین جس ڈگر پر چلتے آئے ہیں اسی پر چلتے رہیں گے تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو اور ان کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ جلد وہ دن آنے والا ہے جب خدا ان کے معاملہ کا فیصلہ کرے گا۔ اس دن ان کے یہ معبود کچھ کام آنے والے نہیں ہیں جن کے خلاف کچھ سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ ان کے تن بدن میں آگ لگتی ہے تو لگے، تم ان کو صاف صاف سنا دو کہ تمہارے یہ معبود سب مل کر بھی ایک مکھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس سے اس چیز کو واپس لینے پر قادر نہیں ہیں۔ ان احمقوں کو یہ بھی سمجھا دو کہ فرشتوں کی حیثیت خدا کی بیٹیوں یا اس کے شریکوں کی نہیں بلکہ اس کے بندوں کی ہے۔ وہ ان کے اندر سے بھی اسی طرح اپنے پیغامبر منتخب کرتا ہے جس طرح انسانوں میں سے کرتا ہے۔ وہ ہر وقت خدا کے احاطہ میں ہیں۔ معاملات کا مرجع اور ان کا فیصلہ کرنے والا صرف اللہ ہی ہے ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۵۸-۷۶

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ
اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۵۸ لَيُدْخِلَنَّهُمْ
مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۵۹ ذٰلِكَ ۚ وَ
مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ

وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكَ
بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ
وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ
خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ ع ۸ ۱۵
الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۶۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ
وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ
عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۵﴾
وَهُوَ الَّذِيْۤ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَكَفُوْرٌ ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ
فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ
جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ
مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
يَسِيْرٌ ﴿۷۰﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا
وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾ وَاِذَا تُتْلٰى
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ
يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ

مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَبِئْسَ
الْمَصِيْرُ ۝۷۲ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ ع ۹/۱۶
اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا
وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَـيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ
مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝۷۳ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۷۴ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّ
مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۷۵ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۷۶

ترجمۂ آیات ۵۸-۷۶

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کر دیے گئے یا مر گئے تو اللہ ان کو اپنے رزقِ حسن سے نوازے گا۔ اور بے شک اللہ ہی ہے جو بہترین رزق دینے والا ہے۔ وہ ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جس سے وہ راضی و مطمئن ہوں گے اور بے شک اللہ علیم و حلیم ہے۔ ۵۸-۵۹

یہ بات سن لی اور مزید یہ کہ جس نے ویسا ہی بدلہ دیا جیسا کہ اس کے ساتھ کیا گیا، پھر اس پر تعدی کی گئی تو اللہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ ۶۰

یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اللہ ہی ہے جو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ہوگا کہ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے اور جن چیزوں کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں سب باطل ہیں۔ اور بے شک اللہ ہی ہے جو برتر اور عظیم ہے۔ ۶۱-۶۲

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں سے پانی برساتا ہے تو زمین اس سے سرسبز و شاداب

ہو جاتی ہے۔ بے شک اللہ بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ اسی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی ہے جو بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔ ۶۲-۶۴

دیکھتے نہیں کہ اللہ نے تمہاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے زمین کی چیزوں کو اور کشتی کو بھی، وہ چلتی ہے سمندر میں اس کے حکم سے اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ مبادا وہ زمین پر گر پڑے، مگر یہ کہ اس کے حکم سے۔ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ بڑا ہی مہربان اور بڑا ہی رحیم ہے۔ اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا۔ بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۵-۶۶

اور ہم نے ہر امت کے واسطے ایک طریقہ ٹھہرا دیا ہے تو وہ اسی پر چلیں گے۔ تو وہ اس معاملے میں تم سے نزاع کی راہ نہ پائیں اور اپنے رب کی طرف بلاتے رہو بے شک تم ہی سیدھی راہ پر ہو۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اس چیز کا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ اس کو جانتا ہے، یہ سب چیزیں ایک رجسٹر میں درج ہیں۔ بے شک یہ اللہ کے لیے نہایت ہی آسان ہے۔ ۶۷-۷۰

اور یہ اللہ کے ماسوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ ان کے بارے میں ان کو کوئی علم ہی ہے۔ اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہ بننے والا نہیں ہے۔ اور جب ہماری واضح آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم ان کافروں کے چہروں پر ناگواری پاتے ہو۔ گویا یہ ان لوگوں پر حملہ کر بیٹھیں گے جو ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں اس سے بڑھ کر ناگوار چیز کی خبر نہ سناؤں؟ وہ ہے دوزخ!

اس کا اللہ نے ان لوگوں کے لیے وعدہ کر رکھا ہے جنھوں نے کفر کیا ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے! ۷۱-۷۲

اے لوگو! ایک تمثیل بیان کی جاتی ہے تو اس کو توجہ سے سنو! جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ اس کے لیے سب مل کر کوشش کریں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے، طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتوان! انھوں نے اللہ کی، جیسا کہ اس کا حق ہے، قدر نہیں پہچانی! بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ ۷۳-۷۴۔

اللہ فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر چنتا ہے جس طرح انسانوں میں سے چنتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ وہ جو کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے۔ اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات لوٹتے ہیں۔ ۷۵-۷۶

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَیَرْزُقَنَّھُمُ اللّٰہُ رِزْقًا حَسَنًا ط وَاِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (۵۸)

راہِ ہجرت میں اول قدم بھی منزل کے حکم میں ہے۔

اب یہ اسی اوپر والی بشارت پر، جو اہلِ ایمان کو دی گئی ہے، عطف کر کے خاص طور پر ان مظلوم مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے جو کفارِ قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر، اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں گے وہ اطمینان رکھیں کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے دار الہجرت میں پہنچنے سے پہلے ہی قتل کر دیے گئے یا ان کو موت آ گئی تو ان کو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا اور اللہ ان کو اپنے رزقِ حسن سے نوازے گا۔ آل عمران آیت ۱۶۹ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ خدا کی راہ میں مارے جانے والے مرتے نہیں بلکہ زندہ رہتے ہیں اور وہ اپنی برزخی زندگی میں بھی خاص اپنے رب کے خوانِ نعمت سے رزق پاتے ہیں۔ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ

راہ ہجرت میں طبعی موت بھی شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔

یہی بشارت یہاں ان لوگوں کو بھی دی گئی جو ہجرت کے ارادے سے نکلیں اور ان کو موت آجائے اگرچہ ان کو قتل نہ کیا گیا ہو۔ گویا اس راہ میں قتل ہونا ہی شہادت نہیں ہے بلکہ طبعی موت بھی شہادت ہی کے حکم میں ہے۔ 'رزق' یہاں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں، خدا کے بے پایاں انعامات کی ایک جامع تعبیر ہے۔ اس کو محدود مفہوم میں نہیں لینا چاہیے۔ 'وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِينَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا جب 'خَيْرُ الرّٰزِقِينَ' ہے تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو کیا رزق دے گا جو اس کی خاطر اپنا گھر در سب کچھ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں گے!

لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (۵۹)

مہاجرین کے لیے عظیم بشارت

فرمایا کہ ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جہاں پہنچ کر وہ نہال ہو جائیں گے۔ 'يَرْضَوْنَهٗ' کا لفظ ہے تو نہایت مختصر سا لیکن اس کے اندر معانی کا ایک جہاں پوشیدہ ہے۔ یعنی خدا کی خاطر جو بندہ اپنے گھر اور وطن سے نکلتا ہے، اگر اسی راہ میں اس کو موت آجاتی ہے تو وہ اطمینان رکھے کہ خدا اس کو ایسی جگہ داخل کرے گا جہاں اس کی ساری توقعات ہی پوری نہیں ہو جائیں گی بلکہ وہ کچھ اس کو ملے گا جس کا اس جہان میں وہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں

'وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ' یعنی ہمارے بندے پورا اطمینان رکھیں کہ اس دنیا میں ہماری خاطر اعدائے حق کے ہاتھوں وہ جو کچھ جھیل رہے ہیں ہم اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم ہر چیز سے واقف ہیں۔ لیکن 'علیم' کے ساتھ ساتھ ہماری صفت 'حلیم' بھی ہے، اس وجہ سے ہم اپنے دشمنوں کو جلدی نہیں پکڑتے بلکہ ان کو اصلاحِ حال کا پورا موقع دیتے ہیں۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ ہمارے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۶۰)

ایک اہم اعلان

یہ 'ذٰلِكَ' جس طرح آیت ۳۰ میں گزر چکا ہے پورے جملہ کا قائم مقام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات جو کہی گئی ہے کوئی سرسری بات نہیں ہے بلکہ نہایت اہم حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اس کو دوست اور دشمن اچھی طرح سن لیں۔ مزید برآں اب یہ اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ مظلوم مسلمان اگر اپنے جان و مال کی مدافعت میں برابر سرابر کا کوئی اقدام کریں تو ان کو اس کا حق ہے۔ ان کو اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ اور اگر اس کے بعد ان پر کوئی مزید تعدی کی گئی تو ان کے اعداء یاد رکھیں کہ خدا اپنے بندوں کی پشت پر ہے اور وہ ان کی ضرور مدد فرمائے گا۔

'وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ' میں 'عُوْقِبَ بِهٖ' مماثلت کے اسی اسلوب پر ہے جو 'دِنَّاهُم كَمَا دَانُوا' یا 'جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا' وغیرہ میں ملحوظ ہے۔ 'ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ' میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اگر مسلمانوں کے کسی مدافعانہ اقدام سے چڑ کر کفار نے ان پر مزید تعدی کی کہ ان کا حوصلہ پست کر دیں کہ وہ آئندہ اپنے عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے کوئی جرأت نہ کر سکیں تو کفار یاد رکھیں اور مسلمان

مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ ہرگز ایسا نہیں ہونے دے گا بلکہ وہ اپنے بندوں کی ضرور مدد فرمائے گا۔ 'ضرور مدد فرمائے گا' کے اجمال کے اندر جو تفصیل پوشیدہ ہے، اس کی شہادت بعد کے واقعات نے دی اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بشارت مسلمانوں کو ہجرت کے وقت دی گئی تھی۔ بعد میں جب مسلمان مدینہ پہنچ کر ایک طاقت بن گئے تو یہی بات نہایت واضح الفاظ میں کہہ دی گئی جو آیات ۲۹-۴۰ میں گزر چکی ہے۔ ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'عفوٌ غفور' کی صفات کے حوالہ کا ایک خاص محل

إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ' کا یہاں ایک خاص محل ہے۔ یہ بات، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بالکل ہجرت کے وقت فرمائی گئی تھی۔ اس وجہ سے امکان تھا کہ کفار کے ہاتھوں ستائے ہوئے مسلمان جوابی کارروائی کے طور پر کوئی عاجلانہ قدم اٹھا دیں درآنحالیکہ ابھی اس کے لیے موزوں وقت نہیں آیا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات 'عفو' و 'غفور' کی یاد دہانی فرما دی کہ ہرچند تمھیں اپنی جان، اپنے مال اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کا حق ہے اور خدا تمھاری پشت پر ہے لیکن ہم جس طرح لوگوں کی تعدیوں کے باوجود عفو و مغفرت سے کام لیتے ہیں اسی طرح چندے تم بھی عفو و درگزر سے کام لو۔ ان سرکشوں سے نمٹنے کا وقت بس آہی رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا رب اپنی صفات کا عکس تمھارے اندر بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌۢ بَصِيرٌ (۶۱)

وعدۂ نصرت کی پہلی دلیل

یہ اوپر کے وعدۂ نصرت کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ خدا اس کائنات میں کوئی ناکارہ وجود نہیں ہے، جیسا کہ ان احمقوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ متصرفِ حقیقی وہی ہے۔ وہی ہر روز دن کے بعد رات کو لاتا ہے اور رات کے بعد دن کو نمایاں کرتا ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے یعنی (نعوذ باللہ) وہ کوئی اندھا بہرا نہیں ہے کہ اشرار و مفسدین اس کی دنیا میں جو دھاندلی مچاتے پھریں وہ بے خبر بیٹھا رہے۔ وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔ تو جب متصرفِ حقیقی بھی وہی ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا بھی ہے تو آخر وہ اس کائنات کی سیاست سے بے تعلق کیسے رہے گا؟ لازم ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقابل میں، جو اس کی دنیا میں فساد برپا کر رہے ہیں، ان لوگوں کی مدد فرمائے جو اس کی اصلاح کے طالب ہیں اور جب وہ رات کے بعد دن کے لانے پر قادر ہے اور اس کی اس قدرت کا مشاہدہ ہر شخص ہر روز کر رہا ہے تو کفر کی تاریکی کو مٹا کر دنیا کو ایمان کی روشنی سے جگمگا دینا اس کے لیے کیا مشکل ہے!

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (۶۲)

وعدۂ نصرت کی دوسری دلیل

یہ اسی بات کی دوسری دلیل ارشاد ہوئی کہ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ آخر ان مخالفین کی پشت پر بھی تو کچھ طاقتیں ہیں۔ فرمایا کہ اس کائنات میں کارفرمائے حقیقی صرف اللہ ہے اور یہ لوگ اللہ کے سوا جن چیزوں کو پوجتے اور پکارتے ہیں سب بے حقیقت، محض وہم کی ایجاد، اور یکسر فریب اور دھوکا ہیں۔ اللہ بڑی ہی بلند و برتر اور عظیم ہستی ہے۔ ان پتھر اور مٹی کی مورتوں کا خدا کے ساتھ کیا جوڑ؟ جو احمق ان چیزوں کو معبود بنا کر پوج رہے

ہیں وہ خدا کی عظمت و شان سے بالکل بے خبر ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۡ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۶۳)

وعدۂ نصرت کی تائید میں آفاق کی شہادت

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب پر ہم مختلف مقامات میں بحث کر چکے ہیں کہ یہ مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو توجہ دلانے کے لیے آتا ہے۔ اوپر کی آیات میں وعدۂ نصرت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے حوالہ سے مؤید کیا ہے۔ اس آیت میں اپنی صفات کے ساتھ آفاق کی شہادت بھی شامل کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی موجودہ ظاہری حالات کی ناسازگاری کو دیکھ کر خدا کی نصرت کے ظہور کو بعید از امکان نہ سمجھے۔ یہ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا کہ خدا کی شان کس طرح ظاہر ہوگی اور اس کے ہاتھ کدھر سے نمودار ہوں گے۔ زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل خشک اور چٹیل پڑی ہوتی ہے، نہ اس پر سبزہ اور روئیدگی کا کوئی اثر ہوتا اور نہ افق پر کسی جانب ابر کا کوئی نشان لیکن جب خدا چاہتا ہے تو اس کی بھیجی ہوئی ہوائیں بادلوں کے قافلے کے قافلے ہانک کر لاتی اور فضا میں پھیلا دیتی ہیں۔ پھر چشم زدن میں ساری زمین جل تھل ہو جاتی ہے اور دیکھتے دیکھتے ہر طرف سبزہ کی بانات بچھ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اپنی رحمت و نصرت کی گھٹائیں اپنے ان بندوں کے لیے بھی بھیج دے گا اگرچہ ظاہری حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں۔

لطیف خبیر کا حوالہ نہایت لطیف طریقہ سے

'لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ' کی صفات کا حوالہ یہاں نہایت لطیف طریقہ سے آیا ہے۔ 'لطیف' کے معنی باریک بین اور دقیقہ رس کے ہیں۔ یعنی وہ اپنی تدبیروں کو اس طرح بروئے کار لاتا ہے کہ کسی کو ان کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہ بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ لوگ صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں لیکن وہ ماضی کے پردوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے اس سے بھی باخبر ہے اور مستقبل کے اوٹ میں جو کچھ ہے اس سے بھی باخبر ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۶۴)

خدا بے ہمہ بھی ہے اور باہمہ بھی

یہ اوپر کے مضمون ہی کی مزید تاکید ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا اور اسی کے تصرف میں ہے تو اس کے ارادے میں کون مزاحم ہو سکتا ہے؟ وہ سب سے بے نیاز اور اپنی ذات میں مستغنی ہے۔ 'حمید' کی صفت یہاں بطور بدرقہ ہے یعنی وہ غنی ہونے کے ساتھ 'حمید' بھی ہے۔ 'حمید' کے معنی ہیں ستودہ صفات اور تمام سزاوارِ حمد کاموں کا منبع۔ اس بدرقہ کی ضرورت اس لیے تھی کہ خدا کے بے نیاز ہونے کے سبب سے بندوں کے اندر مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ وہ امید رکھیں کہ اس کے بے نیاز ہونے کے باوجود خلق کے لیے اس کا فیض ہر وقت جاری ہے۔ وہ بے ہمہ ہوتے کے ساتھ ساتھ باہمہ بھی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۭ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَي الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۶۵)

قریش کے تمردین کے لیے دھمکی

یعنی اس دنیا میں انسان کو جو مہلت ملی ہوئی ہے یہ خدا کے فضل و کرم اور اس کی عنایت و مہربانی سے ملی ہوئی ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو انسان کی خدمت گزاری میں لگی ہوئی ہے اور جس کے بغیر اس دنیا میں انسان

کا بقا ایک لمحہ کے لیے بھی ممکن نہیں ہے، یہ خدا ہی کے حکم سے لگی ہوئی ہے۔ اگر خدا کا حکم نہ ہو تو اس کائنات کی ہر چیز انسان کی باغی اور اس کی دشمن بن جائے۔ کشتی ہی کو دیکھو یہ خدا ہی کا حکم اور اسی کے قانون کی تسخیر ہے کہ وہ تمہارے لیے سمندر کے سینہ کو چیرتی ہوئی چلتی ہے ورنہ چشم زدن میں سارا بیڑا غرق ہو جائے۔ یہ خدا ہی ہے جو آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ مبادا وہ تمہارے سروں پر گر پڑے۔ 'اَنْ' سے پہلے مضاف کے محذوف ہونے کے قاعدے کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: یعنی یہ ساری چیزیں اس بات کی شاہد ہیں کہ اس دنیا میں انسان کو جو کچھ حاصل ہے یہ اس کے اپنے بل بوتے اور اس کے اپنے علم و سائنس پر مبنی نہیں ہے بلکہ خدا کی رافت و عنایت پر مبنی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس نظام کائنات کی ایک اینٹ بھی ذرا سا اس کی جگہ سے کھسکا دے تو ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہے۔

ان فقروں کے تیور نگاہ میں رہیں۔ ان میں قریش کے متمردین کے لیے جو دھمکی ہے وہ لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اگر عذاب میں تاخیر ہو رہی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ ہمارے لیے کوئی مشکل کام ہے بلکہ یہ صرف ہماری رافت و رحمت کے سبب سے ہے کہ تم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنے رویہ کی اصلاح کر لو۔

سرکشی کی اصل علت

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۡ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ (۶۶)

یہ آخرت کی یاد دہانی فرما دی کہ اگر اس دنیا میں عذاب نہ آئے تو یہ کون سی اطمینان کی بات ہے! آگے آخرت جو موجود ہے! بالآخر لوٹنا تو سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔ خدا ہی نے زندگی بخشی ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پھر وہی زندہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ جب اس کو پہلی مرتبہ پیدا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو آخر دوبارہ اٹھا کھڑا کرنے میں اس کو کیوں دشواری پیش آئے گی! 'اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ' یہ اس ساری سرکشی کی اصل علت بیان ہوئی ہے کہ جہاں تک قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا تعلق ہے وہ تو بالکل واضح ہیں، ان میں کسی بحث و نزاع کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ لوگ نہایت ناشکرے اور ناقدرے ہیں۔ لفظ 'انسان' سے اشارہ تو یہاں انہی مخالفین کی طرف ہے لیکن اظہار نفرت کے طور پر بات ان کو خطاب کر کے کہنے کے بجائے عام لفظ سے فرما دی گئی ہے۔ اس اسلوب میں اظہار حسرت کا مضمون بھی پایا جاتا ہے جس کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (۶۷)

لفظ 'منسک' پر آیت ۳۴ میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں یہ لفظ طریقہ عبادت، شریعت کے ظاہری ڈھانچہ اور اس کے قواعد و ضوابط کے لیے آیا ہے۔

مناظرہ بازوں سے گریز کرنے کی ہدایت

پیچھے اسی سورہ میں یہ تفصیل بھی گزر چکی ہے کہ اس دور میں یہود اور نصاریٰ بھی کھلم کھلا قریش کا ساتھ دے رہے تھے بلکہ اس مناظرہ بازی کو سب سے زیادہ غذا وہی بہم پہنچا رہے تھے۔ اس وجہ سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ہر امت کے لیے ایک ضابطہ ٹھہرایا تھا اور مقصود اس سے یہ تھا کہ یہ اس ضابطہ کے مطابق خدا کی عبادت کریں اور جب خدا اس میں کوئی تبدیلی کر دے تو اس کو بھی دل و جان سے قبول کر لیں تاکہ یہ ان کے مخلصین و جامدین میں امتیاز کی کسوٹی ہو۔ چنانچہ ہر رسول کے زمانے میں شریعت کے ظاہری ڈھانچہ میں تبدیلیاں بھی ہوئیں اور مبتدعین کی پیدا کردہ بدعتوں کی اصلاح بھی ہوئی، جن کے اندر حق کی طلب تھی انھوں نے یہ اصلاح صدق دل سے قبول کر لی لیکن جو لکیر کے فقیر اور رسوم و عوائد کے پجاری تھے وہ پتھر کی طرح اپنی ضد ہی پر جمے اور اپنی مالوفات کی عصبیت میں حق کے خلاف مناظرہ بازیاں کرتے رہ گئے۔ فرمایا کہ یہی حال تمھارے ان مخالفین کا بھی ہے۔ یہ بھی اپنے جمود اور جاہل عصبیت کے سبب سے اس ڈگر کو چھوڑنے والے نہیں ہیں جس پر چلتے آ رہے ہیں تو اب ان کے پیچھے زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں ہے ﴿فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ﴾ یعنی اب ان کو کوئی ایسا موقع نہ دو کہ ان کو تم سے مناظرے کی کوئی راہ ملے۔ بس اپنے رب کی جس سیدھی راہ پر تم گامزن ہو اس کی طرف ان کو بھی دعوت دے دو۔ اگر وہ آتے ہیں تو فبہا، اگر نہیں آتے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ بے شک تم ایک سیدھی راہ پر ہو، تو جو سیدھی راہ پر ہے اس کو اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے کہ دوسرے غلط راہ پر جا رہے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون، معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ، قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی پیچھے گزر چکا ہے۔ ہم بعض آیات کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں، سورۂ بقرہ میں قبلہ کی بحث کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (البقرۃ ۱۴۸)

ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رخ کرے گا تو تم بھلائیوں کی سمت میں سبقت کرو۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (المائدۃ ۵: ۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ضابطہ اور ایک طریقہ ٹھہرایا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے چاہا کہ اس چیز میں تمھاری آزمائش کرے جو اس نے تم کو بخشی تو بھلائیوں کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرو۔

یہ اظہار رواداری نہیں بلکہ اعلان ہے

مذکورہ بالا آیات کی تفسیر پر، ایک نظر ڈال لیجیے۔ ہم نے ان آیات کے تحت یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ رواداری کی ہدایت نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ ان کے رویہ سے بیزاری کا اظہار و اعلان ہے۔

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۶۸ - ۶۹)

یعنی جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم اپنی طرف سے ان کو کسی بحث و مناظرہ کا موقع نہ دو۔ لیکن تمہارے اس رویہ کے باوجود اگر وہ مناظرہ کے لیے آہی دھمکیں تو بس ان کو یہ کہہ کر دفع کرنے کی کوشش کرو کہ اللہ ہمارے اور تمہارے اس اختلاف کا فیصلہ قیامت کے دن فرمائے گا۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کو زیادہ منہ نہ لگاؤ بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں، جان بوجھ کر محض شرارت کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ یہ دلیلوں سے قائل ہونے والے اسامی نہیں ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۷۰)

اس آیت میں اگرچہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس کے لفظ لفظ میں جو عتاب ہے اس کا رخ تمام تر مخالفین کی طرف ہے۔ فرمایا کہ کیا نہیں جانتے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے خدا سب سے باخبر ہے تو اب ان اشرار کے معاملہ کو اللہ ہی کے حوالہ کرو، وہی ان سے نمٹے گا۔ 'اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ' سابق جملے کی دھمکی اس میں اور زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں بلکہ ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا نے ہر شخص کا سارا ریکارڈ، پورے اہتمام کے ساتھ، ایک دفتر میں محفوظ کر رکھا ہے۔

(حاشیہ: خطاب پیغمبرؐ سے عتاب مخالفین پر)

'اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ' اور کوئی اس مغالطہ میں بھی نہ رہے کہ بھلا ایک ایک فرد اور ایک ایک جزئیہ کی تفصیل کون محفوظ رکھ سکتا ہے۔ دوسروں کے لیے تو یہ کام بے شک ناممکن ہے لیکن اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ (۷۱)

(حاشیہ: ایک اور غلط فہمی کا ازالہ)

یہ ایک اور غلط فہمی بھی رفع فرما دی کہ جس دن خدا انصاف کے لیے بیٹھے گا تو اس دن کوئی ان ظالموں کا مددگار نہ بن سکے گا۔ جن چیزوں کو انھوں نے خدا کا شریک و شفیع بنا رکھا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، نہ خدا نے ان کے حق میں کوئی پروانہ جاری کیا ہے کہ وہ اس کی خدائی میں شریک ہیں اور نہ ان کے اپنے ہی پاس ان کے باب میں کوئی علم ہے۔ خدا کے اذن کے بدون کسی کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ خدا نے اس کو اپنا شریک بنایا ہے اللہ پر افترا ہے جو ایک جرم عظیم ہے اور جس چیز کے بارے میں کوئی عقلی و فطری دلیل نہیں ہے اس کو معبود بنانا محض ظن کی پیروی ہے اور ظن علم اور حق کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۷۲)

'سطا یسطو' کے معنی حملہ کر دینے اور پل پڑنے کے ہیں۔

اصنام کی بے حقیقتی کی تمثیل اور ان کے حامیوں کو جواب

مطلب یہ ہے کہ ان معبودوں کے حق میں کوئی دلیل ان کے پاس اگرچہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کے لیے ان کی حمیت کا حال یہ ہے کہ جب توحید کے حق میں ان کو نہایت واضح اور مدلل آیات سنائی جاتی ہیں تو ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، ان کے چہرے بگڑ جاتے اور بھویں تن جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی آیتیں سنانے والوں پر پل پڑیں گے۔ فرمایا کہ اگر اللہ کی آیات اور ان کے سنانے والوں سے یہ ایسے ہی چراغ پا ہوتے ہیں تو ان سے کہو کہ کیا میں تمھیں ایک ایسی چیز کی خبر دوں جو ان چیزوں سے کہیں زیادہ تمھارے چہروں کو بگاڑنے والی ہوگی اور اس سے لازماً تمھیں سابقہ پیش آنا ہے! وہ ہے دوزخ کی آگ!! اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (۷۳)

یعنی جب تم اپنے معبودوں کی بے حقیقتی کا بیان سن کر ایسے ہی چڑتے ہو تو آؤ ان کی بے بسی کی ایک حقیقت افروز تمثیل سن لو۔ یہ تمھارے سارے دیوی دیوتا، جن کو تم پکارتے ہو، اگر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں پیدا کر سکتے اگرچہ اس کے لیے سب مل کر اپنا پورا زور صرف کر ڈالیں۔ اور یہی نہیں کہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ ان کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ جو حلوا تم ان کے آگے پیش کرتے ہو اگر اس میں سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو یہ اس کو بھی نہیں بچا سکتے! طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں!!

'ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ' میں نہایت لطیف و بلیغ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ انسان کسی کو معبود مانتا ہے تو اس وجہ سے مانتا ہے کہ اس سے اس کے ضعف و ناتوانی کا مداوا ہوتا ہے لیکن ان نادانوں نے اپنا معبود ان کو بنایا ہے جو ان سے بھی بڑھ کر عاجز و بے بس ہیں۔ یہ اپنی خستگی کی دوا ان سے چاہتے ہیں جو بے چارے اپنے چہرے سے مکھی بھی ہانک سکنے پر قادر نہیں ہیں۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۷۴)

انھوں نے خدا کی شان اور اس کی عظمت و قدرت بالکل نہیں پہچانی۔ خدا ان کے معبودوں کی طرح کوئی عاجز و بے بس ہستی نہیں ہے بلکہ وہ نہایت ہی طاقتور اور غالب ہستی ہے۔ وہ جو ارادہ فرماتا ہے اس کو پورا کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے اور مجال نہیں ہے کہ کوئی اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ (۷۵)

فرشتوں کی حیثیت

یعنی ان نادانوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر جو ان کی پوجا شروع کر رکھی ہے، یہ محض ان کی سفاہت اور خدا کی شان سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ فرشتے خدا کی بیٹیاں اور اس کے شریک و سہیم نہیں ہیں

بلکہ اس کے بندے ہیں۔ اگران کو کوئی مرتبہ حاصل ہے تو یہ ہے کہ جس طرح وہ انسانوں میں سے خاص خاص بندوں کو اپنا پیغمبر بناتا ہے اسی طرح فرشتوں میں سے اپنے خاص خاص بندوں کو اپنے پیغبروں کے پاس اپنا قاصد بنا کر بھیجتا ہے۔

'اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ' سے بیک وقت دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک اس طرف کہ جو خدا خود سمیع و بصیر ہے، سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک بنائے۔ دوسرا اس طرف کہ جب خدا سمیع و بصیر ہے تو وہ ان فرشتوں کے فرائض کی بھی ہر قدم پر نگرانی کر رہا ہے مجال نہیں کہ وہ سرِ مو اس کے مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہو سکیں۔

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۷۶﴾

ان فرشتوں کے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے سب خدا کے علم کے احاطہ میں ہے اس وجہ سے نہ وہ خدا کے علم میں کوئی اضافہ کر سکتے، نہ ان کا کوئی قول و فعل خدا کی نگرانی سے بالاتر ہو سکتا اور نہ وہ کسی کے باب میں خدا سے یہ کہنے کے پوزیشن میں ہیں کہ ان کو اس کے بارے میں علم ہے، خدا کو نہیں ہے۔ سارے امور خدا ہی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔ نہ ان فرشتوں کے آگے پیش ہوتے ہیں، نہ پیش ہوں گے۔ خود ان فرشتوں کو جو امور تفویض ہوتے ہیں ان کی رپورٹ بھی خدا ہی کے حضور ان کو پیش کرنی ہوتی ہے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۷۷-۷۸

خاتمۂ سورہ — یہ خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اوپر آپ نے دیکھ لیا کہ کفارِ قریش کو غدّار اور خائن ثابت کر کے وراثتِ ابراہیمی اور تولیتِ بیت اللہ کے لیے ان کو بالکل نااہل قرار دے دیا اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ اس کی تولیت کے اصلی حقدار یہ مسلمان ہیں جو وہاں سے نکالے گئے ہیں اور ان کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ بیت اللہ کی آزادی اور تطہیر کے لیے جہاد کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اب آگے کی آیات میں مسلمانوں کو وہ ہدایات دی جا رہی ہیں جو اس عظیم ذمہ داری کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں ــــــ آیات ملاحظہ فرمائیے۔

آیات ۷۷-۷۸

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱرۡكَعُوا۟ وَٱسۡجُدُوا۟ وَٱعۡبُدُوا۟ رَبَّكُمۡ وَٱفۡعَلُوا۟ ٱلۡخَيۡرَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ۩ ﴿۷۷﴾ وَجَٰهِدُوا۟ فِى ٱللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِۦ ۚ هُوَ ٱجۡتَبَىٰكُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى ٱلدِّينِ مِنۡ حَرَجٍ ۚ مِّلَّةَ أَبِيكُمۡ إِبۡرَٰهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّىٰكُمُ ٱلۡمُسۡلِمِينَ مِن قَبۡلُ

وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ
عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ ع ۱۰ ۱۷
هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (۷۸)

ترجمۂ آیات ۷۷-۷۸

اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ فلاح پاؤ۔ اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیساکہ اس کا حق ہے۔ اسی نے تم کو برگزیدہ کیا اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمھارے باپ — ابراہیم — کی ملت کو تمھارے لیے پسند فرمایا۔ اسی نے تمھارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے۔ اور اس قرآن میں بھی تمھارا نام مسلم ہے۔ تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو۔ اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہی تمھارا مرجع ہے اور کیا ہی خوب مرجع اور کیا ہی خوب مددگار ہے!! ۷۷-۷۸

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۷۷)

مسلمانوں کے منصب امامت کے تقاضے

اوپر ہم نے اشارہ کیا کہ یہ اس منصب امامت کے تقاضے بیان ہو رہے ہیں جس کی اس سورہ میں بشارت دی گئی ہے۔ یہ منصب ایک عظیم سرفرازی بھی ہے اور ایک عظیم ذمہ داری بھی۔ اس وجہ سے سب سے پہلے رکوع و سجود کا حکم ہوا۔ رکوع و سجود نماز کی تعبیر ہے۔ لیکن ہم توبہ ۱۱۲ کے تحت اشارہ کر چکے ہیں کہ ان لفظوں سے جب نماز کی تعبیر کی جاتی ہے تو اس سے صرف موقت نمازیں ہی مراد نہیں ہوتیں بلکہ یہ نمازوں کے اندر شغف و انہماک کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور خاص طور پر ان سے تہجد کی نمازیں مراد ہوتی ہیں جن کا اہتمام عظیم ذمہ داریوں کا اہل بننے کے لیے ضروری ہے۔ یہ موقع، جیساکہ ہم نے اشارہ کیا، سرفرازی اور ذمہ داری دونوں کا ہے اس وجہ سے شکرگزاری کے پہلو سے بھی نماز کی ہدایت ہوئی اور آنے والی ذمہ داری کا اہل بننے کے پہلو سے بھی۔ یہاں اسی سورہ کی آیت ۴۱ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جس میں مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ حرم کی

تولیت کے لوازم کیا ہیں اور ان سے ان کا رب ان کو اس منصب پر سرفراز کرنے کے بعد کیا توقع رکھتا ہے۔

'وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ' یہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے اور 'عبادت'، جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، اطاعت کے مفہوم پر بھی متضمن ہے۔ یعنی زندگی کے سارے گوشوں میں خدا ہی کی بندگی اور اسی کی اطاعت کرو۔

'وَافْعَلُوا الْخَيْرَ' یہ اس سے بھی زیادہ عام ہے۔ یعنی مزید نیکیاں اور بھلائیاں بھی کرو۔ یہ ان نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف اشارہ ہے جن کا درجہ اگرچہ فرائض و اوامر کا نہیں ہے لیکن وہ فضائل و مکارم میں داخل ہیں اور زندگی کے سنوارنے میں ان کو بڑا دخل ہے۔

'لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ' یعنی ان کاموں کا اہتمام کرو تو اس سے اس تمکن فی الارض کی صلاحیت بھی تمہارے اندر ابھرے گی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے اور آخرت کی بازی جیتنے کی اہلیت بھی تم میں پیدا ہو گی۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (۷۸)

روحانی تیاری کے ساتھ عملی جدوجہد کی ہدایت

'وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ' اوپر کی اخلاقی و روحانی تیاری کے ساتھ ساتھ یہ پورے تن من دھن کے ساتھ عملی جدوجہد کی ہدایت ہوئی۔ جہاد سے مراد یہاں قتال نہیں ہے۔ وہ مشروط بشرائط و حالات ہے۔ اس کا ذکر آیات ۳۸-۴۱ میں گزر چکا ہے۔ یہاں اس سے مراد ہر وہ جدوجہد ہے جو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے بندے کے امکان میں ہو۔

'فِي اللّٰهِ' میں مضاف محذوف ہے یعنی 'فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' اور 'حَقَّ جِهَادِهٖ' سے مقصود یہ تنبیہ ہے کہ یہ جدوجہد نیم دلی اور کمزوری کے ساتھ مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کے لیے جی جان کی بازی لگا دی جائے۔

'هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ' یعنی جو خدا تم سے اس جہاد کا مطالبہ کر رہا ہے وہی ہے جس نے اپنے دین کامل کی عظیم امانت کا حامل بنانے کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ 'انتخاب کیا ہے' یعنی دوسروں کو، خواہ قریش ہوں یا یہود، معزول کر کے انتخاب کیا ہے تو اس انتخاب کی لاج رکھو اور دوسروں کی امامت کے اس منصب کی ذمہ داریوں کو پورے عزم و جزم کے ساتھ سنبھالو۔ 'وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ' یعنی اس دین میں تمہارے اوپر اس طرح کی قیدیں اور پابندیاں نہیں ہیں، جیسی کہ یہود کے دین میں تھیں۔ اللہ نے اپنے فضل سے اس دین فطرت کو اس قسم کی پابندیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چند یہ بار ہے تو عظیم لیکن ایسا نہیں ہے کہ تم اس کو اٹھا نہ سکو۔

'مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ' یعنی یہ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت ہے تو باپ کی ملت سے زیادہ اولاد کے لیے اور کون سی ملت مطلوب و محبوب ہو سکتی ہے! یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں اصل خطاب بنی اسمٰعیلؑ سے

ہے جو نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے بلکہ ان کو ان کی اولاد ہونے پر بڑا فخر و ناز بھی تھا۔ 'مِلَّةَ' سے پہلے 'فَاتَّبِعُوْا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل بھی محذوف مان سکتے ہیں اور 'اِجْتَبٰىكُمْ' کو کسی ایسے فعل پر متضمن بھی مان سکتے ہیں جو موقع سے مناسبت رکھنے والا ہو۔ میں نے مائدہ کی آیت ۳ 'وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا' کو پیش نظر رکھ کر تضمین مانی ہے اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ رکھا ہے۔

حضرت ابراہیم کی دعا کی طرف اشارہ

'هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا'۔ یہ اس دین کے ملت ابراہیم ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں جنھوں نے تمھارا نام اس سے پہلے مسلم رکھا اور پھر وہی نام تمھارے لیے اس دین میں بھی اختیار کیا گیا۔ بعض لوگوں نے 'هُوَ' کا مرجع اللہ تعالیٰ کو مانا ہے لیکن میرے نزدیک یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو بقرہ میں یوں وارد ہے 'رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ' - ۱۲۹ (اے ہمارے رب) تو ہم دونوں کو مسلم بنا اور ہماری ذریت میں سے ایک امت مسلمہ برپا کر) مقصد اس نام اور اس دعا کی طرف اشارہ کرنے سے مسلمانوں کی ہمت افزائی ہے کہ تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مظہر ہو، اپنی اس تاریخ کو برابر یاد رکھو! اس سے یہ غلط فہمی کسی کو نہ ہو کہ اسلام یا مسلم کا لفظ سب سے اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے استعمال فرمایا! اسلام تو تمام کائنات کی فطرت ہے۔ 'وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' (آل عمران - ۸۲) اور تمام انبیاء کا دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ البتہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیلؑ کی ذریت سے ایک امت کے پیدا ہونے کی دعا فرمائی تھی اور اس کا نام انھوں نے پہلے ہی سے امت مسلمہ رکھا تھا چنانچہ جب اس امت کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسی نام سے اس امت کو موسوم فرمایا۔

امت مسلمہ کے وجود کا مقصد

'لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ'۔ بعینہٖ یہی مضمون بقرہ آیت ۱۴۲ میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔ 'وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا' (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک ایسی امت بنایا جو وسط شاہراہ پر قائم ہے تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے) یہ اس انتخاب کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ نے تمھارا انتخاب سب کو معزول کر کے اس لیے فرمایا ہے کہ جس طرح اللہ کا رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے اسی طرح اب تم قیامت تک خلق پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو۔ یہی تمھارے وجود کا مقصد اور تمھارے اصطفاء و اجتباء کی غایت ہے۔ اس شہادت کے مقتضیات پر ہم بقرہ ۱۴۳ کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔

نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت شہادت علی الناس کی ذمہ داری کے پہلو سے

'فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ'۔ اوپر والی آیت میں نماز ہی سے بات کا آغاز ہوا تھا اور اس کا پہلو ہم واضح کر چکے ہیں۔ اب یہ نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کی ہدایت ہی پر سورہ ختم ہو رہی ہے۔ یہاں نماز و زکوٰۃ کے اس اہتمام کی ہدایت شہادت علی الناس

کی اس ذمہ داری کے پہلو سے ہے جو اس امت پر ڈالی گئی ہے۔ انہی دو ستونوں پر، جیسا کہ تفسیر سورۂ بقرہ فصل ۳۹ میں ہم واضح کر چکے ہیں، پورے دین کی عمارت قائم ہے اس وجہ سے جب تک ان کا اہتمام باقی رہے گا دین باقی رہے گا۔ اگر ان کا اہتمام ختم ہو جائے گا تو دین بھی منہدم ہو جائے گا۔

شہادتِ حق کی راہ کا بدرقہ

'وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ' اور 'وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ' کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ان مشکلات کا مداوا بتایا گیا ہے جو شہادتِ حق کی راہ میں پیش آئیں گی۔ فرمایا کہ پورے عزم و جزم کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہو، اپنے رب کو یاد رکھو، اس کی کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور اس کی مدد و نصرت پر پورا بھروسہ رکھو، وہ بہترین مرجع اور بہترین مددگار ہے!!

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

رحمان آباد

۶ر جولائی ۱۹۷۳ء

تدبّرِ قرآن

۲۳

المؤمنون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ـــ سورۂ حج ـــ کی توام اور مثنیٰ ہے۔ سورۂ حج جس مضمون پر تمام ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ سورۂ حج کے آخر میں مسلمانوں کا فریضۂ منصبی یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول نے دینِ حق کی گواہی جس طرح تم پر دی ہے اسی طرح اب تمہارا فرض ہے کہ یہ گواہی تم خلق پر دو۔ ساتھ ہی اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جن باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے مثلاً اہتمامِ نماز، ادائیگی زکوٰۃ اور توکل علی اللہ، ان کی ہدایت فرمائی ہے۔ اب اس سورہ کو پڑھیے تو بعینہٖ اسی مضمون سے اس طرح شروع ہو گئی ہے گویا اسی کا تکملہ و تتمہ ہے۔ سورۂ حج کی آخری اور سورہ مومنون کی ابتدائی آیات نے ایک حلقۂ اتصال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مضمون کے اعتبار سے بھی دونوں سورتوں میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ صرف اسلوبِ بیان اور نہجِ استدلال کا فرق ہے۔ سورۂ حج میں اہلِ ایمان کو فوز و فلاح کی اور کفار کو ذلت و نامرادی کی جو خبر دی گئی ہے وہ اس سورہ میں پوری طرح آشکارا ہو گئی ہے۔ خاص طور پر اہلِ ایمان کے لیے بشارت کا مضمون اس میں بالکل کھل کر سامنے آگیا ہے اور وہ اوصاف بھی وضاحت سے بیان ہو گئے ہیں جن کے ساتھ یہ بشارت مشروط ہے۔ اسی طرح کفار پر بھی یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ تمہیں جس ذلت کی خبر دی جا رہی ہے وہ لازماً پیش آکے رہے گی، آفاق و انفس اور تاریخ کی شہادت یہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان کا گھر بنایا ہے اس وجہ سے اس میں اہلِ ایمان کی آزمائش بھی ہوتی ہے اور اہلِ کفر کو ڈھیل بھی دی جاتی ہے۔ لیکن یہ عارضی وقفے ہیں۔ بالآخر حق ہی کا بول بالا ہوگا اور اہلِ باطل نامراد ہوں گے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۱) اہلِ ایمان کے لیے فوز و فلاح اور جنت کی وراثت کی بشارت اور یہ بشارت جن شرائط کے ساتھ مشروط ہے ان کا بیان۔

(۱۲-۲۲) انسان کی خلقت میں خدا کی قدرت و حکمت کی جو نشانیاں ہیں ان سے موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر استدلال اور اس کائنات میں خدا کی پروردگاری کے جو آثار و شواہد ہیں ان سے جزا و سزا کے لازم ہونے پر دلیل۔

(۲۳-۵۰) حضرات انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ۔ ابتدائی انبیاء میں سے حضرت نوحؑ کا اور آخری انبیاء میں سے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت مسیح علیہم السلام کا نام لے کر اور بیچ کے تمام انبیاء کا نام لیے بغیر حوالہ جس سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آج جس انداز سے خدا کے رسول کی تکذیب ہو رہی ہے اسی انداز سے ہمیشہ تمام

اور مفسدوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہے لیکن اللہ نے رسولوں کی دعوت کو فروغ دیا اور شریروں کی جڑ کاٹ دی۔ یہی اب بھی ہوگا لیکن یہ دنیا دارالامتحان ہے اس میں اہلِ حق کی آزمائش لازمی ہے۔ اس آزمائش کے تقاضے سے اہلِ باطل کو بھی ایک حدِ خاص تک مہلت دی جاتی ہے کہ وہ بھی جتنا زور لگانا ہے لگالیں۔ ان کے پاس کوئی عذر نہ باقی رہ جائے۔

(۵۱-۶۷) تمام انبیاء کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ہی دین ملا اور وہ ایک ہی دعوت کے داعی بن کر آئے لیکن ان کی امتوں نے ان کے لائے ہوئے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا اور اب سب اپنے اپنے طریقہ پر مگن ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر کہ ان کو ان کی سرمستی میں کچھ دن مگن رہ لینے دو۔ یہ اس مغالطہ میں ہیں کہ مال و اولاد کی جو نعمت انھیں ملی ہوئی ہے یہ ان کے خیر میں اضافہ ہے۔ یہ خیر میں اضافہ نہیں بلکہ ان کی تباہی میں اضافہ ہے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ خیر میں اضافہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کے اندر ایمان، خشیت، اخلاص اور انفاق کی صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ بے شک اپنی نیکیوں کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ رہے یہ دنیا دار اور دنیا پرست تو یہ اسی طرح اپنی دلچسپیوں میں ڈوبے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کو پکڑیں گے تو یہ اپنے سر پیٹیں گے لیکن اس وقت ان کا سارا چیخنا چلانا بے سود ہوگا۔

(۶۸-۷۷) مکذبین کے بعض شبہات و اعتراضات کا حوالہ اور ان کے بے بنیاد ہونے کی طرف اشارہ۔ نیز ان کے مطالبۂ عذاب کا جواب کہ اگر ان کو عذاب کا کوئی نمونہ دکھا بھی دیا گیا تو یہ ان کے لیے سودمند نہ ہوگا۔ جس طرح یہ دوسروں پر گزرے ہوئے حوادث سے کوئی سبق نہیں لیتے اسی طرح اگر خود ان پر بھی کوئی آفت آئے تو اس سے چھوٹتے ہی پھر گرد جھاڑ کے اپنی بدمستیوں میں کھو جائیں گے۔

(۷۸-۹۲) معجزے اور نشانیاں مانگنے والوں کو کان، آنکھ اور دل و دماغ سے کام لینے کی دعوت کہ اگر تم خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لو تو تمھیں مرنے کے بعد اٹھنا اور جزا و سزا کا معاملہ ایک بدیہی حقیقت معلوم ہوگا۔ پھر ان کے تضادِ فکر کے بعض پہلوؤں کی نشاندہی کہ یہ لوگ خود اپنے مسلمات کے نہایت بدیہی لوازم سے محض اپنی خواہشوں کی پیروی میں گریز اختیار کر رہے ہیں۔

(۹۳-۱۱۸) خاتمۂ سورہ، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاندین کے رویہ سے چندے درگزر کرنے اور آنے والے عذاب سے پناہ مانگتے رہنے کی تلقین اور کفار کو وعید کہ وہ وقت قریب ہے جب تم سر پیٹو گے اور آرزوئیں کرو گے کہ کاش تمھیں دنیا میں جا کر کچھ نیکی کرنے کا موقع ملے لیکن اس وقت اس کا موقع گزر چکا ہوگا۔ اس وقت صرف وہ لوگ فلاح پائیں گے جن کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ اس وقت فائز المرام ہمارے وہی بندے ہوں گے جو آج تمھیں خدا کی راہ کی دعوت دے رہے ہیں لیکن تم ان کا مذاق اڑا رہے ہو۔ آج تمھیں یہ دنیا کی زندگی بڑی طویل معلوم ہو رہی ہے لیکن اس دن اندازہ ہوگا کہ یہ زندگی چند لمحوں میں گزر گئی۔ تم نے گمان کیا کہ ہم نے تمھیں شترِ بے مہار بنا کر اس دنیا میں چھوڑا ہے اور تمھیں ہمارے پاس لوٹنا نہیں ہے لیکن تمھیں ایک ہی خدائے برتر و عظیم کی طرف لوٹنا ہوگا اور تمھارے شرکاء و شفعاء تمھارے کچھ کام نہیں آئیں گے۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۳)

مَكِّيَّةٌ ____ اٰيَاتُهَا ۱۱۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۱ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ
فٰعِلُوْنَ ۝۴ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰى
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
منزل ۴ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱

ترجمۂ آیات ۱-۱۱ فائز المرام ہوئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں فروتنی اختیار کرنے والے اور جو لغویات سے احتراز کرنے والے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے حد تک سو اس بارے میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو ان کے سوا کے خواہش مند ہوئے تو وہی ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی

حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے۔ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے! ۱-۱۱

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (۱)

اہلِ ایمان کو فلاحِ دنیا و آخرت کی بشارت

لفظ 'مُؤْمِنُوْنَ' ہر چند عام ہے لیکن یہاں اس کے مصداق اول وہی اہلِ ایمان ہیں جو اس دور میں حق کی خاطر ہجرت اور جہاد کی بازیاں کھیل رہے تھے۔ فرمایا کہ وہ فائز المرام ہوئے۔ یہ بشارت ہے تو مستقبل سے متعلق لیکن اس کو تعبیر ماضی کے صیغے سے فرمایا ہے جس سے مقصود اس کی قطعیت کا اظہار ہے اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک بات کا فیصلہ ہو چکا تو گویا وہ بات واقع ہو چکی۔ یہاں جس فلاح کی بشارت ہے اس کا حقیقی ثمرہ تو فلاحِ آخرت ہے۔ وہی اصل چیز ہے اور اہلِ ایمان کا نصب العین ہمیشہ وہی ہوتی ہے لیکن اس کے اندر تمکن فی الارض کی وہ بشارت بھی مضمر ہے جو پچھلی سورہ میں دی گئی ہے۔ لیکن اس کا ذکر چونکہ پچھلی سورہ میں وضاحت سے ہو چکا ہے اس وجہ سے اس سورہ میں اصل انعام — فردوس — کا ذکر ہوا۔ دوسری چیزیں اس کے تحت خود بخود آگئیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۲)

روحِ نماز کی طرف اشارہ

'خشوع' کے معنی عاجزی، تذلل، نیازمندی اور فروتنی کے ہیں۔ یہ لفظ مختلف شکلوں میں قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ 'خشعت الاصوات' اور 'تخشع قُلُوْبُهُمْ' وغیرہ کے استعمالات سے لفظ کی اصل روح پر روشنی پڑتی ہے اس وجہ سے جن لوگوں نے اس کے معنی مجرد 'سکون' کے لیے ہیں ہمارے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ یہ اس نماز کی اصل روح کی طرف اشارہ ہے جس پر مذکورہ فلاح کا انحصار ہے۔ مطلب یہ کہ رب کے آگے آدمی کی کمر اور اس کا سر ہی نہ جھکے بلکہ اس کا دل بھی سرنگندہ ہو جائے۔ ان اہلِ ایمان کی کیفیت یہی ہے کہ نمازوں میں ان کے قیام، ان کی ہیئت، ان کی آواز اور ان کے رکوع و سجود ایک ایک چیز سے ان کے دل کے خشوع کی شہادت ملتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ پچھلی سورہ کی آخری آیت میں 'اقامتِ صلوٰۃ' کی ہدایت ہوئی تھی جو نماز کے ظاہری اہتمام و التزام کی تعبیر ہے۔ اس سورہ میں نماز کی اصل روح کا ذکر ہوا اور وہ بھی اس حیثیت سے کہ یہ ان اہلِ ایمان کی صفت ہے جن کو فلاح کی یہ بشارت دی جا رہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۳)

زندگی پر نماز کا اثر

یہ زندگی پر نماز کا اثر بیان ہوا ہے۔ 'لغو' سے مراد ہر وہ قول و فعل ہے جو زندگی کے اصل مقصود —

رضائے الٰہی ـــــ سے غافل کرنے والا ہو۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مباح ہے یا غیر مباح۔ جس نماز کے اندر خشوع ہو اس کا اثر زندگی پر لازماً یہ پڑتا ہے کہ فضول، غیر ضروری، لایعنی، بے مقصد چیزوں سے آدمی احتراز کرنے لگتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اگر میں نے کوئی فضول قسم کی حرکت کی تو اپنے عالم الغیب مالک کو ایک روز منہ دکھانا ہے اور اس چیز کی شب و روز میں کم از کم پانچ بار اس کو یاد دہانی ہوتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا ضمیر اتنا بیدار اور حساس ہو کہ ہر غیر ضروری حرکت سے اس کی طبیعت انقباض محسوس کرے وہ کسی بڑی بے حیائی اور برائی کا مرتکب کبھی مشکل ہی سے ہوگا۔ نماز کا زندگی پر یہی اثر سورۂ عنکبوت میں یوں بیان ہوا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ ۴۵ (نماز بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے) روکنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ ایک نہایت ہی موثر واعظ و ناصح ہے جو شب و روز میں پانچ مرتبہ انسان کو تذکیر کرتی رہتی ہے کہ دربارِ الٰہی کے شایانِ شان اعمال و کردار کیا ہیں اور انسان کو کہاں جانا ہے اور اس کے لیے اس کو کیا تیاریاں کرنی چاہئیں اور اپنے آپ کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہیے۔

آیت کا اصل مفہوم تو یہی ہے لیکن موقع کلام ایک اور ضمنی مفہوم کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں مخالفین کی ان خرافات پر ایک تعریض بھی ہے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر وقت بکتے رہتے تھے۔ یہ مفہوم سورۂ قصص کی اس آیت سے نکل رہا ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (قصص : ۵۵)	اور جب وہ کوئی فضول بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے ساتھ تمہارے اعمال۔

یہی مضمون دوسرے مقام میں وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (فرقان : ۷۲) کے الفاظ سے ادا ہوا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں زیرِ بحث آیت سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ اللہ کے یہ بندے مخالفین کی ژاژ خائیوں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے اپنے رب کے ذکر اور اس کی آیات کے فکر میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۴)

نماز کے بعد دین کا دوسرا ستون زکوٰۃ ہے۔

نماز کے بعد دین کا دوسرا ستون، جیسا کہ ہم اس کتاب میں وضاحت سے بیان کر چکے ہیں، زکوٰۃ ہے۔ سورۂ مریم اور سورۂ انبیاء میں آپ تفصیل سے پڑھ آئے ہیں کہ ہر نبی کے باب میں یہ بات وارد ہوئی ہے کہ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تعلیم دیتا تھا) اس زکوٰۃ کی قانونی شکل ہر دین میں کچھ مختلف رہی ہے لیکن انفاق فی سبیل اللہ کی تعبیر کے لیے یہ ایک جامع اور معروف لفظ ہے اور اس کی حیثیت دین میں نماز کے مثنیٰ اور اس کے مظہر اول کی ہے۔ نماز بندے کو خالق سے جوڑتی ہے اور زکوٰۃ بندے کو بندوں کے ساتھ مربوط کرتی ہے اور جو بندہ خلق اور خالق دونوں سے صحیح بنیاد پر مربوط

ہوجائے درحقیقت وہی بندہ دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا سزاوار ہے۔ اگرچہ یہ سورہ مکی ہے اور اسلام میں باقاعدہ اصطلاحی زکوٰۃ کا نظام بعد میں قائم ہوا لیکن یہ لفظ مصطلحہ شرعی زکوٰۃ کے مفہوم میں نہیں بلکہ انفاق کے مفہوم میں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو مصدری معنی یعنی تزکیہ کے مفہوم میں لیا ہے، ان کی رائے ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ یہ لفظ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مکی سورتوں میں بھی نماز کے ساتھ بار بار آیا ہے اور کہیں بھی اس سے مراد تزکیہ نہیں بلکہ انفاق فی سبیل اللہ ہی ہے جس کے برکات و ثمرات میں سے تزکیہ بھی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے

فلسفۂ دین کے پہلو سے نماز اور زکوٰۃ ایمان کے دو بازو ہیں اور ان دونوں کے درمیان قدر مشترک خدا کی شکرگزاری ہے۔ یہی شکرگزاری کا جذبہ بندے کو نماز پر ابھارتا ہے جو تمام تر شکر ہے اور یہی شکرگزاری کا جذبہ اللہ کی راہ میں انفاق اور قربانی پر ابھارتا ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ درحقیقت نماز ہی کا ایک مظہر اور پہلو ہے اور دونوں میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔

پھر نماز کی روح، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا خشوع اور خشیت بھی ہے' اس پہلو سے یہ ہر برائی اور بے حیائی سے، جیسا کہ سورۂ عنکبوت کے حوالہ سے اوپر واضح ہوا، روکنے والی چیز ہے۔ چنانچہ اوپر بیان ہوا کہ جن کی نمازوں میں خشوع ہوتا ہے وہ منکرات اور لغویات سے احتراز کرتے ہیں۔ اب اسی نماز کے مزید اثرات آگے بیان ہو رہے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ (۵-۷)

شہوانی خواہشات پر قابو

یعنی یہ لوگ اپنی شہوانی خواہشات کو کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ ان کو صرف وہیں آزادی دیتے ہیں جہاں اس کا حق ان کو حاصل ہے۔ یعنی بیویوں اور لونڈیوں پر[1]۔ یہ نہیں ہوتا کہ شہوات سے اندھے ہو کر بالکل سانڈ بن جائیں اور ہر حرمت پر دست اندازی اپنا حق سمجھ لیں۔ فرمایا کہ اپنے حدود کے اندر یہ چیز مباح ہے۔ اس پر کسی کو ملامت نہیں۔ یعنی کوئی اس کو تقوٰی، دینداری اور خداترسی کے منافی نہ سمجھے جیسا کہ راہبانہ تصورات کے تحت عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو اس حد سے آگے بڑھیں گے وہ خدا کے حدود کو توڑنے والے ہیں۔ یہاں صرف ان کے جرم کا ذکر فرمایا، اس کی سزا کا ذکر نہیں فرمایا۔ سزا کا ذکر نہ کرنے میں غصہ اور نفرت کی جو شدت ہے وہ خود واضح ہے۔ ع

خموشی معنیٰ دارد کہ در گفتن نمی آید

یہاں اس امر کو یاد رکھیے کہ موجودہ مغربی اور مغرب زدہ سوسائٹی میں جنسی آزادی پر اگر کوئی قدغن ہے تو صرف اس صورت میں ہے جب جبر و اکراہ کی نوبت آئے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو پھر ہر ایک کو ہر قسم کی

---

[1] غلاموں اور لونڈیوں کے مسئلہ پر ہم اس کتاب میں پیچھے بھی بحث کر چکے ہیں اور آگے سورۂ نور کی تفسیر میں بھی اس پر مفصل بحث آ رہی ہے۔

آزادی حاصل ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۸)

امانت اور عہود کی حفاظت

'امانات' سے مراد وہ تمام امانتیں بھی ہیں جو ہمارے رب نے قوتوں اور صلاحیتوں، فرائض اور ذمہ داریوں کی شکل میں یا انعامات و افضال اور اموال و اولاد کی صورت میں ہمارے حوالہ کی ہیں ۔ اور وہ امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جو کسی نے ہمارے پاس محفوظ کی ہوں یا ازروئے حقوق ان کی ادائیگی کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہو۔ اسی طرح عہد میں وہ تمام عہد و میثاق بھی داخل ہیں جو ہمارے رب نے ہماری فطرت سے عالمِ غیب میں لیے ہیں یا اپنے نبیوں کے واسطہ سے، اپنی شریعت کی شکل میں، اس دنیا میں لیے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس وہ تمام عہد و میثاق بھی اس میں داخل ہیں جو ہم نے اپنی فطرت یا انبیاء کے واسطے سے اپنے رب سے کیے ہیں یا کسی جماعت یا فرد سے اس دنیا میں کیے ہیں، خواہ وہ قولاً و تحریراً عمل میں آئے ہوں یا ہر شائستہ سوسائٹی میں بغیر کسی تحریر و اقرار کے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ فرمایا کہ ہمارے یہ بندے ان تمام امانات اور ان تمام عہود و مواثیق کا پاس و لحاظ رکھنے والے ہیں۔ نہ اپنے رب کے معاملہ میں خائن اور غدار ہیں نہ اس کے بندوں کے ساتھ بے وفائی اور عہد شکنی کرنے والے ہیں۔

ان دو لفظوں کے اندر وہ تمام شرعی و اخلاقی، قانونی اور عرفی ذمہ داریاں آگئیں جن کا احترام ہر شریعت میں مطلوب رہا ہے۔ یہاں یہ اوپر کی باتوں کے بعد ایک جامع بات کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہے اور درحقیقت اسی اجمال کی تفصیل ہے جو پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔

حکمتِ دین کا ایک نکتہ

یہاں حکمتِ دین کا یہ نکتہ نگاہ میں رہے کہ نماز ہی ان تمام امانات و عہود کی اصل محافظ ہے۔ نماز خود بھی جیسا کہ تفسیر سورۂ بقرہ میں ہم واضح کر چکے ہیں، بندے کا اپنے رب کے ساتھ عہد و میثاق ہے جس کی تجدید ہر بندۂ مومن دن رات میں کم از کم پانچ مرتبہ کرتا رہتا ہے اور یہ ان تمام عہود و مواثیق اور امانات و فرائض کی یاد دہانی بھی ہے جن کی ذمہ داری بندے پر عاید ہوتی ہے۔ ان مسائل پر ہم اس کتاب میں بھی موزوں مقامات میں بحث کر رہے ہیں اور خاص نماز کے اسرار و حقائق پر 'حقیقت نماز' کے عنوان سے ہم نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۹)

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نماز ہی سے اہلِ ایمان کی صفات کا ذکر شروع ہوا تھا اور اسی پر آکر ختم ہوا۔ شروع میں نماز کا ذکر اس کی روح یعنی 'خشوع' کے پہلو سے ہوا اور آخر میں اس کی محافظت، اس کے رکھ رکھاؤ اور اس کی دیکھ بھال کے پہلو سے ہوا، اس لیے کہ وہ برکات جو نماز کی بیان ہوئی ہیں اسی صورتِ حال میں حاصل ہوتی ہیں جب اس کے اندر خشوع کی روح ہو اور اس کی برابر رکھوالی بھی ہوتی رہے۔ یہ باغِ جنت کا پودا ہے جو پوری نگہداشت کے بغیر پروان نہیں چڑھتا۔ ذرا غفلت اور ناقدری ہو جائے تو یہ بے ثمر ہو کے رہ جاتا ہے

بلکہ اس کے بالکل ہی سوکھ جانے کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی حقیقی برکات سے بہرہ مند ہونے کی آرزو ہے تو شیاطین کی تاخت سے اس کو بچائیے اور وقت کی پوری پابندی کے ساتھ آنسوؤں سے اس کو سینچتے رہیے۔ تب کچھ اندازہ ہوگا کہ رب نے اس کے اندر آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی ہے!!

یہ بات کہ نماز ہی تمام دین کی محافظ ہے قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔ ہم نے دوسرے مقام میں ان تمام مثالوں کا حوالہ دیا ہے۔ یہ دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ نماز ہی سے تمام نیکیاں نشوونما بھی پاتی ہیں اور وہی اپنے حصار میں ان کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اگر نماز وجود میں نہ آئے تو دوسری نیکیاں بھی وجود میں نہیں آسکتیں اور اگر نماز ہدم کر دی جائے تو دین و اخلاق کا سارا چمن تاراج ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ جس نے نماز ضائع کر دی تو وہ باقی دین کو بدرجہ اولیٰ ضائع کر دے گا۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ ۝ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۰-۱۱)

فردوس کی وراثت کے اصل حقدار

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جو اپنے باپ کی کھوئی ہوئی جنت کے وارث ہوں گے اور پھر ان کو اس سے نکالے جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا، جیسا کہ آدم کو پیش آیا بلکہ وہ اس میں اپنے باپ کے ساتھ ہمیشہ ہمیش رہیں گے اس لیے کہ وہ اس میں اپنے دشمن شیطان کو ہمیشہ کے لیے شکست دے کر داخل ہوں گے۔ فردوس جنت کے اعلیٰ ترین مقامات میں سے ہے اور یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جو اس دنیا میں حق کی سربلندی کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں گے۔

۲- مجموعۂ آیات ۱ - ۱۱ کے مطالب کا خلاصہ

اگرچہ آیات کی وضاحت کرتے ہوئے ہم تمام ضروری باتوں کی طرف اشارہ کرتے آئے ہیں لیکن چونکہ انہی باتوں پر تمام صلاح و فلاح کا انحصار ہے اس وجہ سے مناسب ہوگا کہ ان کو ازسرنو ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ یہ باتیں اپنی حکیمانہ ترتیب کے ساتھ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- خدا کے ہاں تمام صلاح و فلاح کا انحصار اس ایمان پر ہے جو آدمی کے اندر ایک ملکۂ راسخہ کی حیثیت حاصل کر لے۔ محض اوپری اور ظاہر دارانہ ایمان کی اس کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔

۲- اس ایمان کا اولین مظہر نماز ہے۔ جس ایمان سے نماز نہ پیدا ہو وہ ایک ٹھونٹھ درخت ہے جو صرف جلانے کے کام آسکتا ہے۔

۳- نماز کی اصل روح خشوع یعنی دل کی فروتنی ہے۔ اگر نماز اس خشوع سے خالی ہو تو اس کا زندگی پر کوئی مفید اثر نہیں پڑتا۔

۴- جس نماز میں خشوع کی روح موجود ہو وہ آدمی کو فواحش و منکرات اور لاطائل باتوں سے روک دیتی ہے۔ نماز میں بندے کو خدا کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اس معیت کا شعور بندے کو ان تمام سفاسف سے دور رکھتا ہے جو اس کے شایانِ شان نہ ہوں۔

۵- ایمان کا دوسرا مظہر اور نماز کا دوسرا بازو زکوٰۃ یعنی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ احکام شریعت میں یہی دو حکم سب سے بڑے ہیں۔ انہی پر تمام شریعت کا مدار ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا ہادم دونوں کا ہادم ہے۔ مانعین زکوٰۃ کے بارے میں سیدنا ابوبکرؓ نے جو اقدام کیا وہ اسی حکمت دین پر مبنی تھا۔

۶- اپنے دل اور اپنے مال دونوں پر خدا کی حکمرانی تسلیم کرنے والے کبھی اپنی خواہشوں اور شہوات کی پیروی میں ایسے اندھے نہیں ہوتے کہ خدا کے حدود کو توڑ کر اس کے بندوں کے حقوق اور ناموس پر دست درازی کریں۔

۷- یہ لوگ تمام امانات اور عہود کا پاس کرتے ہیں خواہ ان کا تعلق خدا سے ہو یا بندوں سے۔

۸- یہ لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی نماز ایک شہر پناہ کی طرح ان کے پورے دین کی حفاظت کرتی ہے۔

۹- جو لوگ ان صفات کے حامل ہوں گے وہی خدا کی جنت کے وارث ہوں گے اور یہی اصل کامیابی ہے۔

ان تمام باتوں کی تفصیل اگلی سورہ ـــــ سورۂ نور ـــــ میں آئے گی جو اس سورہ کا تکملہ و تتمہ ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جب انسان کا باطن ایمان کے نور سے منور ہوتا ہے تو اس سے زندگی کے ہر گوشہ میں، خواہ وہ انفرادی ہو یا خاندانی و اجتماعی، کیا نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اس سے محروم ہو تو اندر اور باہر ہر گوشے میں کس طرح کی تاریکی پھیلتی ہے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۲-۲۲

اوپر اہل ایمان کو جو بشارت دی گئی ہے اگرچہ وہ ایک حقیقت ہے اور اس کے اندر ایمان سے محروم منکرین قرآن کے لیے جو انذار مضمر ہے وہ بھی ایک حقیقت ہے لیکن جو لوگ سرے سے آخرت ہی کے قائل نہ ہوں، مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو نہایت مستبعد سمجھ رہے ہوں ان پر اس انذار و بشارت کا کیا اثر ہو سکتا تھا! وہ ان ساری باتوں کو محض واہمہ کی خلاقی سمجھتے اور ان کا مذاق اڑاتے۔ ان کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر آگے انفس و آفاق کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے وجود کی تشکیل جن مراحل سے گزرتی ہے اگر کوئی اسی پر غور کرے تو اس کو اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رہ جائے گا کہ جو خدا یہ سب کچھ کر سکتا ہے اس کے لیے کسی چیز کے مر کھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے وجود سے باہر اس کائنات پر غور کرے تو اس کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اس کا خالق اس کو پیدا کر کے کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ وہ نہایت بیداری اور اہتمام، نہایت ہی انعام و اکرام اور نہایت ہی قدرت و شان کے ساتھ اس کی نگہداشت و پرورش فرما رہا ہے۔ تو جب وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ لوگوں کو یوں ہی شتر بے مہار بنا کر چھوڑے رکھے، نیکوں کو ان کی

نیکیوں کا انعام اور بدوں کو ان کی بدیوں کی سزا دینے کے لیے ایک روزِ جزا و سزا لانے۔ یہ دلیل سورۂ حج کی آیت ۵ میں بھی بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور اس کے وہ پہلو بھی نمایاں ہوئے ہیں جو وہاں مخفی رہ گئے تھے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۲۲

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً
فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا
الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ
لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾
ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾
وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ
غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي
الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ
بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا
تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ
وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ
مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾
وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمۂ آیات ۱۲-۲۲

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا، پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ مستقر میں رکھا، پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک جنین کی شکل دی۔ پھر جنین کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا۔ پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہڈیوں کو گوشت کا

جامہ پہنایا۔ پھر اس کو ایک بالکل ہی مختلف مخلوق کی شکل میں کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا! پھر تم ان سب کے بعد لازماً مرنے والے ہو، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔ ۱۲-۱۶

اور ہم نے تمہارے اوپر سات تہہ بہ تہہ آسمان بنائے۔ اور ہم مخلوق سے بے پروا نہیں ہوئے۔ اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا ایک اندازہ کے ساتھ۔ پس اس کو زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم اس کو واپس لے لینے پر قادر ہیں۔ پس ہم نے اس سے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اُگائے۔ تمہارے لیے ان میں بہت سے میوے ہیں جن سے تم لذت اندوز بھی ہوتے ہو اور اپنی غذا کا سامان بھی کرتے ہو۔ اور وہ درخت بھی اُگایا جو طور سینا میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ روغن اور کھانے والوں کے لیے سالن کے ساتھ اگتا ہے۔ اور تمہارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا درس آموزی کا سامان ہے۔ ہم ان چیزوں کے اندر سے، جو ان کے پیٹوں میں ہیں، تمھیں (خوش ذائقہ دودھ) پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں دوسرے بھی بہت سے فوائد ہیں۔ اور ان سے تم اپنی غذا کا سامان بھی حاصل کرتے ہو۔ اور ان پر اور کشتیوں پر سواری بھی کرتے ہو۔ ۱۷-۲۲

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۚ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (۱۲-۱۴)

انسان کا اپنا وجود خدا اور آخرت کا شاہد ہے

انسان کی خلقت کے ان تدریجی مراحل کا بیان، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سورہ حج میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں اس کی تمہید اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ، سے اٹھائی ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

مقصود اس کے بیان سے زندگی بعد الموت کا اثبات ہے۔ نیز وہاں اثنائے کلام میں 'لِنُبَیِّنَ لَكُمْ' کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں جو اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ انسان کی خلقت کے لیے اللہ تعالیٰ نے تدریج و ترقی کا یہ اہتمام اس لیے فرمایا کہ ہر انسان کا اپنا وجود خدا کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کی پروردگاری کا ایسا نشان ہو کہ آخرت کے باب میں اس کو کسی خارجی دلیل کی ضرورت باقی نہ رہے۔ سورۂ حج میں اس آیت کے الفاظ کی بھی تحقیق گزر چکی ہے اور اس کا مدعا بھی تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک انسان کی خلقت کا تعلق ہے یہ تمام مراحل بالکل معلوم و معروف ہیں۔ جدید سائنس نے اس کے بعض ایسے گوشے بھی بے نقاب کر دیے ہیں جن کی طرف قرآن نے صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا تھا کہ انسان کے علم میں جتنا ہی اضافہ ہوتا جائے گا اتنے ہی اس کے اسرار کھلتے جائیں گے۔ اس نوع کی بعض باتوں کی طرف ہم پیچھے اس کتاب میں اشارہ کر آئے ہیں۔ غرض یہ راز تو سب کو معلوم ہے کہ مٹی کے جوہر سے وجود میں آنے والی پانی کی ایک بوند ہے جس کو قدرت پرورش کر کے درجہ بدرجہ اس طرح پروان چڑھاتی ہے کہ بالآخر وہ سقراط و بقراط اور ارسطو و جالینوس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے؟ کیا یہ ساری تدریج و تکمیل اور ساری تربیت و نگہداشت محض اندھے بہرے مادے کی کارفرمائی ہے؟ کیا یہ تمام قدرت و حکمت اور تمام ربوبیت و رافت بالکل بے مقصد و غایت ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی نتیجہ و انجام نہیں ہے؟ کیا جو پانی کی ایک بوند کو، آدمی بنا سکتا ہے، وہ اس آدمی کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ یہی سوالات ہیں جن کے جواب میں نادانوں نے، اگرچہ وہ فلسفی اور سائنس دان کے معزز ناموں ہی سے موسوم ہوں، خلاف کیا ہے۔ قرآن نے انہی سوالوں کے جواب کے لیے انسان کو خود اس کے وجود کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کے جواب کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود اپنے وجود کے مراحل پر غور کرو، ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔

'ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ' میں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کہاں پانی کی ایک بوند اور کہاں ایک بھلا چنگا، عاقل و بالغ انسان، دونوں میں کیا نسبت ہے! لیکن ہر انسان کے وجود میں قدرت کا یہ کرشمہ موجود ہے تو جس قدرت کا یہ کرشمہ ہر وجود میں مشاہدہ کرتے ہو اس سے یہ کیوں بعید سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گی۔ کیا وہ کام اس سے زیادہ مشکل ہے!

'فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ' یہ وہ تاثر اور نتیجہ بیان ہوا ہے جو انسان کی خلقت کے ان تمام مراحل پر غور کرنے والے کے سامنے آنا چاہیے کہ اللہ، جس نے ایک ایک وجود کے اندر اپنی یہ شانیں اور حکمتیں اور یہ عنایتیں اور برکتیں ظاہر فرمائی ہیں، بڑی ہی بابرکت اور بافیض ہستی ہے کہ اس نے ذلیل پانی کی ایک بوند کو رحمِ مادر کے صدف میں پرورش کر کے ایک گوہرِ آبدار بنا کر نکالا اور اس کے اندر ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت فرمائیں کہ وہ فرشتوں کا مسجود اور زمین میں خدا کی خلافت کا اہل ٹھہرا۔ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں پر غور کرنے سے آدمی کے اندر صرف خدا کا اقرار ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے بے پایاں فیض وجود والی ہستی اور اس کے نہایت حکیم و قدیر

اور نہایت اعلیٰ و برتر خالق ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ یہاں عربی زبان کے اس اسلوب کو بھی یاد رکھیے کہ 'اَفْعَلُ' کا صیغہ بالخصوص جب کہ وہ جمع کی طرف مضاف ہو بسا اوقات تفضیل و ترجیح کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض اعلیٰ مرتبہ صفت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے 'اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ' کے معنی ہوں گے کہ وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ بہترین خالق ہے۔ اس نے انسان کو جیسا تیسا پیدا ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ بہترین ساخت اور بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس اسلوب سے ناواقفیت کے باعث لفظ 'خالق' کا مفہوم بدل دیا ہے حالانکہ اس قسم کے کسی تصرف کی ضرورت نہیں ہے۔ مقصود یہاں یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان کی خلقت خود اس بات کی شاہد ہے کہ وہ کسی اندھے بہرے مادے، یا کسی محرک اول یا علۃ العلل کی ایجاد نہیں ہے اور نہ اس کا ارتقاء آپ سے آپ ہوا یا ہو رہا ہے بلکہ وہ سراپا خیر و برکت ہستی خدائے جواد و کریم کا پیدا کیا ہوا ہے جو بہترین خالق ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (۱۵-۱۶)

یہ وہ اصل نتیجہ ہے جس کو سامنے لانے ہی کے لیے اوپر کے تمام مراحل خلقت بیان ہوئے ہیں کہ ان مراحل سے گزرنے کے بعد لازماً ایک دن آتا ہے کہ تم مرتے ہو اور کسی کے لیے بھی اس موت سے مفر نہیں ہے۔ پھر قیامت کا دن آئے گا اور اس دن تم لازماً اٹھائے جاؤ گے۔ اس اٹھائے جانے کو مستبعد سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جس خدا کی یہ شانیں تم خود اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کرتے ہو اس کے لیے تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے!

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (۱۷)

'طَرَائِق' کا مفہوم

'طَرَائِقُ'، 'طَرِيْقَةٌ' کی جمع ہے۔ 'طرائق'، 'اسرّۃ' یعنی دھاریوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں صفت بول کر موصوف کو مراد لیا ہے جو عربی زبان میں معروف ہے۔ یعنی دھاریوں والے سات آسمان۔ یہاں اس لفظ سے آسمان کی رنگا رنگی و بوقلمونی کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے اور اس بارش کی طرف بھی جس کا ذکر آگے نہایت اہتمام سے آ رہا ہے۔

'وَمَا كُنَّا' یہاں بیانِ شان کے لیے ہے جس طرح 'كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا' میں ہے۔ یعنی ہم اپنی مخلوق کو پیدا کر کے اس سے غافل نہیں ہو بیٹھے بلکہ برابر نہایت اہتمام کے ساتھ اس کی پرورش اور دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

اہتمام ربوبیت کیوں ہے!

اوپر کی آیات میں انسان کی خلقت کا بیان ہوا اور مقصود امکان معاد کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اب یہ ربوبیت کے اہتمام و انتظام کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا اس دنیا کو پیدا کر کے اس کے خیر و شر سے بے تعلق ہو کر نہیں بیٹھا ہے بلکہ وہ برابر اس کی پرورش و پرداخت فرما رہا ہے۔ اس نے رنگا رنگ سات آسمان بنائے اور وہ آسمان سے پانی برساتا اور اپنی مخلوق کی پرورش کا برابر سامان کر رہا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ (۱۸)

پانی ہی سے تمام زمین کی زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ آسمان سے نازل فرماتا ہے اور یہ اس کی رحمت و ربوبیت ہی ہے کہ وہ اس کو ایک خاص اندازہ اور مقدار کے ساتھ اتارتا ہے ورنہ اگر وہ اس کے دہانے ایک مرتبہ کھول دے

تو کوئی اس کو بند کرنے پر قادر نہیں اور یہی پانی رحمت و برکت ہونے کے بجائے طوفانِ نوح کی طرح عذاب و نقمت بن جائے۔ پھر یہ اس کی رحمت و ربوبیت ہی ہے کہ وہ اس پانی کو زمین میں ٹکا دیتا ہے، جو ایک ذخیرے اور محفوظ خزانے کی طرح تمام مخلوقات کے کام آتا ہے۔ اگر خدا چاہتا تو وہ اس سارے پانی کو غائب کر دیتا۔ اس کی ایک بوند بھی اس زمین میں نہ ٹک سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی ارادہ ہے جو آسمانوں اور زمین دونوں میں کارفرما ہے۔ اگر ان میں الگ الگ ارادے کارفرما ہوتے تو آسمان کے کارفرماؤں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق ناپ تول کر پانی برسانے اور اس کی بھی فکر رکھتے کہ پانی کا ذخیرہ زمین میں ضرورت کے اوقات کے لیے محفوظ بھی رہے۔ پھر یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس ذاتِ واحد کے ارادے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے وہ نہایت مہربان و کریم ہستی ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ اس دنیا کی پرورش کر رہی ہے۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۱۹)

'تَاْكُلُوْنَ' کا قرینہ دلیل ہے کہ 'فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ' کے بعد 'تَتَفَكَّهُوْنَ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف مانا جائے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

یعنی اسی پانی سے اللہ نے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے جن میں تمہارے لیے اور بھی بہت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جن سے تم لذت اندوز ہوتے اور انہی باغوں سے تم اپنے لیے غذائی اجناس بھی حاصل کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے صرف زندہ رہنے کا سامان ہی نہیں پیدا کیا بلکہ تمہارے کام و دہن کی ضیافت کا سامان بھی مہیا فرمایا۔ جینے کو تو انسان صرف روٹی سے بھی جی سکتا ہے لیکن ربِ کریم نے تمہارے آگے قسم قسم کے میوے اور پھل بھی چن دیے۔ اہلِ عرب کے ہاں ایک اچھے باغ کا تصور، جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۳۲ میں مذکور ہے، یہ ہے کہ انگوروں کا باغ ہو، اس کے کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہو اور بیچ بیچ میں مختلف اجناس اور دوسرے موسمی پھلوں کے قطعات ہوں۔ ان کے ہاں اصل پھل کی حیثیت تو کھجور اور انگور ہی کو حاصل تھی لیکن دوسرے پھل اور بعض غذائی اجناس بھی پیدا ہوتیں۔ انہی کی طرف 'فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ' اور 'مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (۲۰)

'شَجَرَةً' سے مراد زیتون کے درخت ہیں۔ اگرچہ اس کا نام نہیں لیا ہے لیکن جو صفات اس کی بیان فرمائی ہیں وہ خود پتہ دے رہی ہیں کہ اس سے مراد زیتون ہی ہے۔ طورِ سینا اس کی پیداوار کا خاص علاقہ تھا۔ اس کا روغن اہلِ عرب میں بہت مقبول تھا اور اہلِ کتاب کے ہاں تو اس کو صرف غذائی روغن ہی کا نہیں بلکہ ایک قسم کے مذہبی تقدس کا بھی درجہ حاصل تھا۔ 'صِبْغٌ' کے معنی سالن کے ہیں۔ یہ مکھن کی طرح ایک لذیذ اور مقوی سالن بھی تھا۔ یہاں اس کی تنکیر اس کی خوبی پر دلیل ہے۔ یعنی 'صِبْغٌ طَيِّبٌ لِّلْاٰكِلِيْنَ' کھانے والوں کے لیے

ایک اچھا سالن۔ یہ اس کے دوسرے فوائد کے ساتھ اس کی ایک مزید خوبی کا بیان ہے۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۲۱)

'عِبْرَةٌ' کے معنی، جیسا کہ آل عمران ۱۳ کے تحت واضح ہو چکا ہے، ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا اور اس سے سبق حاصل کرنا ہے۔ اس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اوپر جو چیزیں مذکور ہوئیں ان میں جو درس عبرت و موعظت ہے وہ تو ہے ہی، اگر تم غور کرو تو تمہارے لیے تمہارے چوپایوں کے اندر بھی بڑا سبق موجود ہے۔

'نُسْقِيْكُمْ' کا دوسرا مفعول یہاں ظاہر نہیں فرمایا ہے۔ دوسری جگہ اس کو 'لَبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ' (نحل: ۶۶) کے الفاظ سے ظاہر فرما دیا ہے۔ اسی طرح 'مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا' یہاں مجمل ہے دوسری جگہ اس کی وضاحت 'مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ' (نحل: ۶۶) کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اگر ان محذوفات کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان چوپایوں کے پیٹ کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو بالکل بے آمیز اور خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔

'وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ'۔ ان کے خاص فائدے کے ساتھ ساتھ یہ ان کے دوسرے فوائد و منافع کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ ان کا دودھ ہی نہیں بلکہ ان کی ایک ایک چیز تمہارے لیے نفع رساں ہے۔ یہ تمہاری سواری اور بار برداری کے کام آتے ہیں، تمہاری کاشت کاری میں یہ معین ہیں، ان کا گوشت، چمڑا اور ان کی اون ہر چیز تمہارے لیے کارآمد ہے۔ یہاں تک کہ ان کا گوبر بھی تمہارے کھیتوں کے لیے کھاد کا کام دیتا ہے اور یہ تمہارے لیے غذائی ذخیرہ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ تم ان کا تر و تازہ گوشت بھی کھاتے ہو اور ان کا گوشت خشک کر کے اپنی سفری ضروریات کے لیے بھی محفوظ کر لیتے ہو اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جن کی اصلی اہمیت ان کے غذائی پہلو ہی سے ہے۔

وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ (۲۲)

'تُحْمَلُوْنَ' کے اندر سواری اور بار برداری دونوں چیزیں شامل ہیں اور اہل عرب کی زندگی چونکہ عام طور پر خانہ بدوشی کی تھی، موسموں کے ساتھ بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ دونوں ہی مسئلے بڑی اہمیت رکھنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ضرورت کے لیے اونٹ پیدا کیا جو ان کے صحرا کا سفینہ ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر اور کشتی کا ذکر ساتھ ساتھ فرمایا کہ ہم نے تمہارے صحرا کے لیے بھی کشتی کا انتظام کیا اور سمندر کے لیے بھی۔

اصل حقیقت کی طرف اشارہ

یہاں اصل حقیقت پر نگاہ رہے کہ مقصود ان چیزوں کے ذکر سے درسِ عبرت ہے کہ کیا جس رب نے ہماری ایک ایک ضرورت کا اس جزرسی کے ساتھ اہتمام فرمایا ہے اس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہم کو پیدا کر کے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہے؟ کیا اس کی یہ ربوبیت ہمارے اوپر کوئی حق اور ذمہ داری

عاید نہیں کرتی؟ اور کیا اس کا لازمی تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان ذمہ داریوں سے متعلق ہم سے پرسش ہو، جنھوں نے ان کا حق ادا کیا ہو وہ انعام پائیں، جنھوں نے اس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر ساری زندگی بطالت میں گزاری ہو وہ اس کی سزا بھگتیں! ظاہر ہے کہ عقل و فطرت کی شہادت اسی دوسرے پہلو کے حق میں ہے۔ جو لوگ کریم کے دروازے سے سب کچھ پا کر اس کا حق نہیں پہچانتے یا اس کے ماسوا دوسروں کے گن گاتے ہیں وہ لئیم اور ناشکرے ہیں اور لازم ہے کہ وہ اپنی اس ناشکری کا انجام دیکھیں۔

۵- آگے کا مضمون ____ آیات ۲۳-۵۰

آگے حضراتِ انبیاء علیہم السلام اور ان کے مکذبین کی تاریخ کا اجمالی حوالہ ہے اور مقصود اس سے تاریخ کی روشنی میں اس حقیقت کو واضح کرنا ہے جو یہاں زیرِ بحث ہے۔ یعنی اہلِ ایمان کی فلاح اور حق کی تکذیب کرنے والو [illegible] اسی ضمن میں اس سنتِ الٰہی کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا انجام ہے تو بہرحال ابدی خسران لیکن اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اہلِ حق کی بھی آزمائش کرتا ہے۔ اسی آزمائش کے تقاضے سے اہلِ باطل کو بھی کچھ عرصہ ڈھیل دی جاتی ہے۔ وہ اس ڈھیل کو اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ چیز ان کی کامیابی نہیں بلکہ ان کے لیے موت کا پھندا بنتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور ان کے مکذبین کا حوالہ پچھلی سورہ کی آیات ۴۲-۵۴ میں بھی گزر چکا ہے لیکن بہت اجمال کے ساتھ۔ اس میں فی الجملہ تفصیل ہے لیکن نام کے ساتھ ذکر انبیائے اولین میں سے صرف حضرت نوحؑ کا اور آخری انبیاء میں سے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت مسیح علیہم السلام کا ہے۔ بقیہ انبیاء کا نام لیے بغیر صرف ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳-۵۰

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ
مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ
كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ
عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي
آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوا بِهِ
حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٢٥﴾ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٢٦﴾ فَأَوْحَيْنَا
إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا

وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا
مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ
اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ
فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ
رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ
قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ ع ۲
مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ
مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ
اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ
تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا
تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا
نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ِۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾
قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ
بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا

مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَ اُمَّةً
رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ
فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ڏ
بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ
كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا
لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ
اُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾ ع ۳ ۸ ۳

ترجمۂ آیات ۲۳-۵۰

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تو کیا تم اس کے غضب سے ڈرتے نہیں! تو اس کی قوم کے اعیان نے، جنھوں نے کفر کیا، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہے، تم پر اپنی برتری جمانا چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ رسول ہی بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتا۔ اس طرح کی بات ہم نے اپنے اگلے بزرگوں میں تو سنی نہیں! یہ تو بس ایک ایسا شخص ہے جس کو ایک قسم کا جنون ہے۔ تو کچھ دن اس کے باب میں انتظار کرو! ۲۳-۲۵

تو اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! تو اس چیز سے میری مدد کر جس میں انھوں نے مجھ کو جھٹلایا۔ تو ہم نے اس کو وحی کی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق کشتی بنا

تو جب ہمارا عذاب آجائے اور طوفان اُمڈ پڑے تو اس میں ہر چیز کے جوڑے رکھ لو اور اپنے لوگوں کو بھی سوار کرالو بجز ان کے جن کے بارے میں قول فیصل ہو چکا ہے اور مجھ سے ان لوگوں کے باب میں کچھ نہ کہیو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے! وہ لازماً غرق ہو کے رہیں گے! ۲۶-۲۷

پس جب تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں سوار ہو لیں تو شکر ادا کیجیو کہ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی اور دعا کیجیو کہ اے رب تو مجھے اتار مبارک اتارنا اور تو بہترین اتارنے والا ہے۔ بے شک اس سرگزشت میں بڑی نشانیاں ہیں! اور بے شک ہم امتحان کرنے والے ہیں! ۲۸-۳۰

پھر ہم نے ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھائے اور ان میں بھی ایک رسول انہی میں سے اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں تو کیا تم اس سے ڈرتے نہیں! اور اس کی قوم کے اعیان نے، جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا اور ان کو ہم نے دنیا کی زندگی میں رفاہیت دے رکھی تھی، کہا کہ یہ تو بس تمھارے ہی مانند ایک بشر ہے۔ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی بات مان لی تو تم بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے! کیا وہ تمھیں اس بات کا ڈراوا دیتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور خاک اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم پھر نکالے جاؤ گے! بہت ہی بعید اور نہایت ہی مستبعد ہے یہ ڈراوا جو تمھیں سنایا جا رہا ہے!! زندگی تو بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہم مرتے اور جیتے ہیں، اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ تو ایک ایسا شخص ہے جس نے خدا پر ایک جھوٹ گھڑا ہے اور ہم اس کو ہرگز ماننے والے نہیں۔ ۳۱-۳۸

اس نے دعا کی اے میرے رب! تو میری مدد فرما اس چیز سے جس میں انھوں نے مجھے جھٹلایا۔ ارشاد ہوا، بہت جلد وہ پشیمان ہو کر رہیں گے۔ تو ان کو ایک سخت ڈانٹ نے شدنی کے ساتھ آ دبوچا۔ تو ہم نے ان کو خس و خاشاک کر دیا۔ تو خدا کی پھٹکار ہو ایسے بدبختوں پر! ۳۹-۴۱

پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قومیں اٹھائیں۔ نہ کوئی قوم اپنی اجلِ معین سے پہلے ہی کرتی اور نہ وہ اس سے پیچھے ہی ہٹتی ہے۔ پھر ہم نے اپنے رسول بھیجے مسلسل۔ جب جب آیا کسی قوم کے پاس اس کا رسول تو انھوں نے اس کو جھٹلایا تو ہم نے بھی ایک کے پیچھے دوسری کو لگا دیا اور ان کو افسانہ بنا دیا۔ تو خدا کی پھٹکار ہو ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے! ۴۲-۴۴

پھر ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور ایک واضح حجت کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ نہایت مغرور لوگ تھے۔ انھوں نے کہا کیا ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں کی بات مان لیں درآنحالیکہ ان کی قوم ہماری غلامی کر رہی ہے! تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا اور وہ بالآخر ہلاک ہو کے رہے۔ اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عنایت کی تاکہ وہ راہ یاب ہوں۔ ۴۵-۴۹

اور ہم نے ابنِ مریم اور اس کی ماں کو ایک عظیم نشانی بنایا اور ان کو ایک سکون اور چشمے والے ٹیلہ پر پناہ دی! ۵۰

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۳)

ایک حسین گریز — یہاں ایک نہایت ہی حسین و بلیغ تخلص ہے جس کو ہماری شاعری کی اصطلاح میں گریز کہتے ہیں۔ اوپر ربوبیت کے شواہد سے جزا و سزا پر جو استدلال کیا ہے وہ 'وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ' (اور تم ان چوپایوں اور کشتیوں پر سوار کیے جاتے ہو) پر ختم ہوا ہے۔ اب آگے جب تاریخی شواہد کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے

پہلے حضرت نوحؑ کے واقعہ کو لیا جو تاریخی تقدم کے اعتبار سے بھی رسولوں کی سرگزشت کا سرنامہ ہے اور خاص طور پر کشتی ہی کو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی نجات کا اللہ تعالیٰ نے ذریعہ بنایا۔ کشتی کے ذکر کے بعد اس کشتی والے واقعہ کا ذکر اس طرح آگیا ہے گویا بات میں سے بات پیدا ہوگئی ہے۔

حضرت نوحؑ کی سرگزشت ایک خاص پہلو سے

تورات اور قرآن دونوں میں رسولوں کی تاریخ کا آغاز حضرت نوحؑ ہی سے ہوتا ہے۔ آپ کی سرگزشت کے مختلف پہلو پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں جس مقصد سے یہ سرگزشت بیان ہو رہی ہے وہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا اس دنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق ہو بیٹھا ہے وہ خدا کو بالکل غلط سمجھے ہیں۔ خدا نے ہمیشہ اس کی مادی پرورش کا بھی انتظام فرمایا ہے اور اس کی روحانی و اخلاقی اصلاح کے لیے اپنے رسول بھی بھیجے۔ جن لوگوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی خدا نے اتمامِ حجت کے بعد، ان کو ہلاک کر دیا اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کو نجات و فلاح بخشی۔ اس دنیا کے ساتھ خدا کا یہ معاملہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بالآخر وہ ایک ایسا دن بھی لائے گا جس میں وہ نیکوکاروں اور بدکاروں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

'اَفَلَا تَتَّقُوْنَ' کے بعد اس کا مفعول محذوف ہے۔ یعنی کیا تم لوگ خدا کے قہر و غضب سے ڈرتے نہیں کہ اس کی خدائی میں دوسروں کو شریک کر کے ان کی بندگی کرتے ہو۔ یہ تو کھلی ہوئی بغاوت ہے جس پر ہر لحظہ تم اس کے عذاب کے سزاوار ہو۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ
شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۴)

قوم کے لیڈروں کی طرف سے حضرت نوحؑ کی مخالفت

'مَلَأُ' سے مراد، جیسا کہ ہم بقرہ ۲۴۶ کے تحت وضاحت کر چکے ہیں، قوم کے اعیان، سردار اور لیڈر ہیں۔ دعوتِ حق کی مخالفت میں پیش پیش ہمیشہ یہی ہوئے ہیں اس لیے کہ اپنے وقت کے نظامِ باطل کے سربراہ ہونے کے سبب سے رسول کی کامیابی میں وہ اپنی موت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ رسول کی دعوت سلیم الفطرت لوگوں پر اثر انداز ہو رہی ہے تو وہ اس کے اثر کو مٹانے کے لیے طرح طرح کی سخن سازیاں کرتے اور اپنے عوام کو اپنی مٹھی میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ اس کی نیت و صداقت پر حملہ کرتے ہیں کہ اس شخص کا یہ دعویٰ کہ یہ خدا کا فرستادہ ہے محض جھوٹ اور افترا ہے! یہ جھوٹ محض اس لیے اس نے گھڑا ہے کہ تمہارے اوپر اپنے خدائی فرستادہ ہونے کی دھونس جما کر تمہارا لیڈر بن جائے۔ 'يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ' کی بلاغت پر نگاہ رہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہماری لیڈری چھیننا چاہتا ہے بلکہ یہ کہا کہ تم پر اپنی سیادت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس زہر آلود فقرے میں سادہ لوح عوام کو بھڑکانے کے لیے جو مواد موجود ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے۔

مخالفت کے لیے بہانہ

'وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً' یہ رسول کی تکذیب کے لیے ان لال بجھکڑوں کی عقلی دلیل مذکور ہوئی ہے کہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے انھوں نے یہ بھی کہا کہ اول تو ہماری رہنمائی کے لیے کسی نبی اور

رسول کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم خود اپنی رہنمائی کے لیے کافی ہیں، اور اگر بالفرض خدا کسی کو نبی اور رسول بنا کر بھیجنے والا ہی ہوتا تو فرشتوں کو اس کارِ خاص کے لیے منتخب کرتا۔ آخر ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو نبی و رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی!

'مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ'۔ یعنی مزید ستم یہ ہے کہ یہ شخص جو کچھ پیش کرتا ہے تمام تر بدعت و ضلالت اور باپ دادا کے طریقہ کے بالکل خلاف ہے۔ ہم نے اس قسم کی باتیں اپنے اسلاف کی روایات میں کبھی نہیں سنیں۔ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۶۸ میں یوں بیان ہوا ہے۔ 'اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ' (کیا انھوں نے کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس ایسی چیز آئی جو ان کے اگلے آبا و اجداد کے پاس نہیں آئی) سورۂ قصص میں ہے۔ 'مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ۔ ۳۶' (یہ محض ایک جادو ہے جس کو جھوٹ موٹ خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ اور اس طرح کی باتیں ہم نے اگلوں میں تو کبھی سنی نہیں) یہی مضمون دوسرے مقام میں اس طرح ہے۔ 'مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ (ص: ۷)'

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰی حِیْنٍ (۲۵)

رسول پر خللِ دماغ کا الزام

یعنی ان لیڈروں نے اپنے عوام کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ شخص جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس خدا کی طرف سے کوئی فرشتہ وحی لے کر آتا ہے تو اس سے اس کے رعب میں نہ آؤ۔ یہ محض ایک قسم کا خللِ دماغ ہے جس کے سبب سے اس کو ایک قسم کا وسوسہ لاحق ہوتا ہے جس کو یہ آسمانی وحی سمجھ بیٹھتا ہے۔ 'فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰی حِیْنٍ' یعنی اس شخص کی ان باتوں کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ مستقبل کے جس عذاب سے تم کو ڈرا رہا ہے اس سے کسی اندیشہ میں مبتلا نہ ہو۔ یہ سب اس کے وساوس ہیں۔ بہت جلد یہ ہوا میں اڑ جائیں گے۔ بالکل اسی قسم کی بات قریش کے لیڈروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہی جس کا حوالہ سورۂ طور میں دیا گیا ہے۔ 'اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ۔ ۳۰' (کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم گردشِ روزگار کے منتظر ہیں) قریش کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ان کے ساحرانہ کلام سے مسحور ہو کر اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ ان کی باتوں کی کوئی بنیاد ہے اور اب مستقبل کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی اور چند روزہ کی گرماگرمی ہے۔ بہت جلد یہ ختم ہو جائے گی۔ جس طرح ہمارے بہت سے شاعر اپنی بولیاں بول کر اڑ گئے اسی طرح ایک دن یہ بھی اڑ جائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ وقت کے لیڈر جب کسی شخص کے بارے میں یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ عوام اسے مستقبل کے ہادی یا نجات دہندہ کی حیثیت سے قبول کر رہے ہیں تو اس سے وہ بہت اندیشہ ناک ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ اپنے پیروؤں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا یہ سارا طلسم چند روزہ ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ (۲۶)

وعدۂ عذاب کے ظہور کے لیے حضرت نوحؑ کی دُعا

یعنی جب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا، حضرت نوحؑ نے یہ دعا کی کہ اے رب! اب تو میرے اور میری قوم کے درمیان فیصلہ فرما دے اور اس وعدۂ عذاب کو پورا کر کے میری مدد فرما جس سے میں نے ان کو شب و روز ڈرایا لیکن انھوں نے میری سُنی ان سُنی کر دی اور اس عذاب کے بارے میں مجھے جھٹلا دیا۔ حضرت نوحؑ کی اس دعا کا ذکر، تفصیل کے ساتھ سورۂ نوح میں آئے گا۔ یہاں اس دعا کے معاً بعد، آگے والی آیت میں، حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے اور عذاب سے بچنے کے لیے تیاریوں کی ہدایت ہوئی جو اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی یہ دعا اسی وعدۂ عذاب کے ظہور کے لیے تھی۔ آگے اسی سلسلہ میں دوسرے انبیاءؑ کی زبانی بھی یہی دعا منقول ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۲۹۔ اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ (ارشاد ہوا کہ بہت جلد یہ اپنی کرتوت پر پچھتائیں گے تو خدا کی ڈانٹ نے ان کو آدبوچا) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین کی کشمکش میں آخری مرحلہ ہمیشہ یہی پیش آیا ہے کہ جس عذاب سے انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا قوم کے سرکشوں نے اسی عذاب کا مطالبہ کیا اور جب اللہ تعالیٰ کی سنتِ امہال کے تحت اس میں تاخیر ہوئی تو مکذبین نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ چونکہ تم وہ عذاب نہیں لا سکے جس کی دھمکی رات دن سنا رہے ہو اس وجہ سے تم بھی جھوٹے ہو اور یہ عذاب کی دھمکی بھی جھوٹی ہے۔ یہی مرحلہ ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام نے دعا فرمائی ہے کہ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ (اعراف: ۸۹) (اے ہمارے رب! اب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے) اسی مرحلہ میں حضرت نوحؑ نے بھی یہ دعا فرمائی ہے اور اس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر واضح کیا۔ صاحبِ کشاف نے آیت کا یہ مطلب لیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں 'انصرنی بانجاز ما وعدتهم من العذاب وهو ما كذبوه فيه' یعنی اے رب تو اس وعدۂ عذاب کو پورا کر کے میری مدد فرما جس سے تو نے ان کو ڈرایا ہے۔ یہی چیز ہے جس کے بارے میں ان کی قوم کے لوگوں نے ان کو جھٹلایا۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۲۷)

بعض اجمالات کی وضاحت

یہ آیت، بلکہ حضرت نوحؑ کی پوری سرگزشت سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارات پر کفایت کریں گے۔ کسی چیز کی تفصیل مطلوب ہو تو وہاں دیکھ لیجیے۔ 'بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا' یعنی یہ کشتی ہمارے اہتمام اور ہماری ہدایات کے مطابق بناؤ۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا نقشہ، اس کی جزئیات کی تفصیل کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعہ سے حضرت نوحؑ کو بتایا تاکہ یہ اس عظیم مہم کے لیے بالکل موزوں ہو جو پیش نظر تھی۔ 'امر' سے مراد حکم عذاب ہے۔ 'فَارَ التَّنُّوْرُ' اسی طرح کا ایک محاورہ ہے جس طرح 'حمی الوطیس' وغیرہ محاورات ہیں۔ ان محاورات کا مفہوم متعین کرنے میں الفاظ کا لحاظ نہیں

بلکہ صرف اس مفہوم کا لحاظ ہوتا ہے جس کے لیے یہ استعمال ہوتے ہیں۔ 'فَارَ التَّنُّوْرُ' طوفان کے امڈ پڑنے اور جوش مارنے کی ایک تعبیر ہے۔ 'مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ' میں لفظ 'کل' جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں، معہود ذہنی کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی ان جانوروں میں سے جو براہِ راست انسان کی معاشی ضرورت سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ 'اثنین' 'زوجین' کی وضاحت کے طور پر ہے یعنی ہر چیز میں سے نر و مادہ بس دو دو رکھ لیے جائیں اس سے زیادہ رکھنے کی فکر نہ کی جائے۔ لفظ اھل کی تشریح سورۂ انبیاء میں ہم کر چکے ہیں کہ اس میں آدمی کے اہل و عیال کے ساتھ اس کے اتباع و اصحاب بھی شامل ہوتے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت نوحؑ پر ان کی قوم کے کچھ لوگ ایمان لائے، اگرچہ ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔ 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے اتمام حجت کے بعد اب سنت الٰہی کے بموجب ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔ ان میں سب سے نمایاں، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، خود حضرت نوحؑ کا بیٹا تھا۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس کشتی میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گے۔ 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' میں 'ظلموا' سے مراد 'ظَلَمُوْآ اَنْفُسَهُمْ' ہے۔ یعنی جنھوں نے تمہاری تکذیب پر اصرار کر کے خود اپنی شامت کو دعوت دی۔ فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ جب قہرِ الٰہی کی موجیں ان ظالموں کو اپنے گھیرے میں لے لیں تو تمہارے اندر ان کے لیے رافت کا جذبہ ابھرے اور تم ہم سے ان کی نجات کی دعا کرنی شروع کر دو۔ عذاب آ جانے کے بعد یہ مرحلہ گزر جائے گا۔ پھر ان کے باب میں تمہاری بھی کوئی شنوائی نہیں ہونی ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک لازماً غرق ہو کے رہے گا۔ 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ الاية' کا یہ پہلو خاص طور پر نگاہ میں رہے کہ جب عذاب الٰہی آ دھمکتا ہے تو اس کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کے اندر بھی معذبین کے لیے جذبۂ رافت ابھرنے کا امکان ہوتا ہے جن کی حمایت و نصرت ہی کے لیے وہ ظہور میں آتا ہے لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی دعا اور سفارش بھی کچھ کام نہیں آتی۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ (۲۸-۲۹)

حضرت نوحؑ کی ہجرت اور ہجرت کے مناسب دعا

حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کا کشتی پر یہ سوار ہونا اپنی قوم سے اسی طرح کی ہجرت تھی جس طرح کی ہجرت دوسرے رسولوں کو کرنی پڑی اس وجہ سے ان کو ہجرت کے مناسبِ حال دعا تلقین کی گئی کہ سوار ہو چکنے کے بعد یہ دعا کرنا کہ اس اللہ کے لیے شکر ہے جس نے ظالموں سے ہمیں نجات دی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کرنا کہ اے رب تو ہمیں جہاں اتارے خیر و برکت اور اپنے فضل و رحمت کے ساتھ اتار۔ تو بہترین اتارنے والا ہے۔ ہجرت کے وقت اسی مضمون کی دعائیں دوسرے انبیاءؑ سے بھی منقول ہیں۔ ہمارے حضورؐ نے بھی ہجرت کے وقت اسی طرح کی دعا فرمائی تھی۔ رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا۔ یہ دعا چونکہ اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی ہے اس وجہ سے دعا کے پیرایہ میں یہ تقبل

کی فوز و فلاح کی بشارت بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہارے رب نے تمھیں ناپاکوں اور ناہنجاروں کے ماحول سے نجات دی، اب وہ تمھیں بہترین میزبان کی طرح اتارے گا اور جہاں اتارے گا اس سرزمین کو تمہارے لیے مبارک بنائے گا، تم پھولو پھلو گے اور انہی چند افراد اور تھوڑے سے وسائل معاش سے یہ دنیا پھر آباد و معمور ہوگی۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ (۳۰)

سرگزشت کے اصل مدعا کی طرف اشارہ

یہ اس اصل مدعا کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سرگزشت کے اندر غور کرنے والوں کے لیے بہت سے حقائق ہیں۔ سب سے واضح حقیقت تو اس سے یہ سامنے آتی ہے کہ خدا اس دنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اس نے خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ رسول کی مخالفت اور اس کی تکذیب کے درپے ہوتے ہیں ایک حدِ خاص تک اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا ہے لیکن بالآخر خدا ان کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر کوئی ان کو چھڑا نہیں سکتا۔ تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں فوز و فلاح رسول اور اس کے ساتھیوں کو حاصل ہوتی ہے۔ البتہ اس فوز و فلاح سے پہلے انھیں آزمائش کے ایک دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ 'وَاِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ' سے اسی سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چوتھی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جس طرح رسولوں کی دعوت ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اسی طرح ان کے مخالفین کی مخالفت کا انداز بھی ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے اس وجہ سے ہر رسول کی زندگی دوسرے رسولوں کے لیے اور ہر امت کی سرگزشت دوسری امت کے لیے ایک مستقل درس ہے۔

ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِیۡنَ (۳۱)

عاد اور ثمود کی طرف اشارہ

'قرن' جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، صدی کے مفہوم میں بھی آتا ہے اور اس سے ایک دور کے لوگ اور قوم و امت بھی مراد ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قوم نوح کو تباہ کر دینے کے بعد نوحؑ اور ان کی کشتی کے ساتھیوں کی نسل سے ہم نے دوسری قومیں اٹھائیں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود کی طرف ہے۔ سورۂ اعراف میں قوم نوحؑ کے جانشین کی حیثیت سے قوم عاد کا اور عاد کے خلفاء کی حیثیت سے ثمود کا ذکر ہوا ہے۔

فَاَرۡسَلۡنَا فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ (۳۲)

حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کی طرف اشارہ

یہ ان رسولوں کی طرف اشارہ ہے جو عاد و ثمود کی طرف بھیجے گئے۔ یعنی حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کی طرف جن کی سرگزشتیں سورۂ ہود اور سورۂ اعراف میں گزر چکی ہیں۔ 'اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ' میں 'اَنۡ' سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ یعنی اس پیغام کے ساتھ ان کو بھیجا کہ لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ یہ دعوت بعینہٖ وہی دعوت ہے جو حضرت نوحؑ نے دی اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

'رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ' یعنی یہ رسول بھی انہی قوموں کے اندر کے فرد تھے۔ کوئی فرشتے یا جن نہیں تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا

بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ہر قوم کی طرف رسول انہی میں سے بھیجا۔ اس احسان کے مختلف پہلوؤں کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ (۳۳)

متکبرین کے استکبار کی علت

'ملأ' کی وضاحت آیت ۲۴ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں ان متکبرین کی بعض ایسی صفات بیان ہوئی ہیں جن سے ان کے طغیان اور رعونت کے اصل سبب پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت اور آخرت میں خدا کے آگے پیشی کے منکر و مکذب تھے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ان کو دنیا میں جو رفاہیت و خوش حالی حاصل ہوئی ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ انھوں نے سمجھا کہ ان کی یہ دنیاوی کامیابیاں ان کے عمل اور عقیدہ کی صحت کی دلیل ہیں، آخرت اول تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو جو کچھ ان کو یہاں حاصل ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ آخرت میں اس سے محروم ہو جائیں۔ اس دولت و رفاہیت کے سبب سے وہ اپنے اوپر کسی کی برتری تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے، اور وہ بھی ایک ایسے شخص کی برتری جس کو ان کی طرح مال و جاہ حاصل نہیں تھا! اپنے اس غرور پر انھوں نے یوں پردہ ڈالنے کی کوشش کی کہ اگر خدا کسی کو ہماری رہنمائی کے لیے بھیجنے والا ہی ہوتا تو کسی مافوق بشر ہستی کو بھیجتا۔ ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو رسول بنانے کے کیا معنی!

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۳۴)

عوام کو بھڑکانے کے لیے جذباتی حربہ

یہ اپنے عوام کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے انھوں نے ایک جذباتی حربہ استعمال کیا کہ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کو، خدا کا رسول مان کر، اس کا قلادۂ اطاعت اپنی گردن میں ڈال لیا تو دین اور دنیا دونوں اعتبار سے اپنی لٹیا ڈبو دو گے۔ معلوم نہیں یہ شخص تمھیں کس کھڈ میں گرائے اور کہاں لے جا کے مارے کہ وہاں تم پانی بھی نہ پاؤ! مطلب یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی مہلک قدم اٹھانے سے پہلے خوب سوچ لو۔ ہم تمھیں نیک و بد اچھی طرح سمجھائے دیتے ہیں!

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (۳۵-۳۶)

'ھیہات' کا موقع استعمال اور مفہوم

'وَعَدَ يَعِدُ' یہاں ڈرانے کے معنی میں ہے جس طرح 'اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ' میں ہے یعنی شیطان تمھیں غریبی سے ڈراتا ہے۔ 'ھیہات' اسم فعل ہے۔ یہ عربی میں مختلف شکلوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس موقع پر بولا جاتا ہے جب کسی چیز کو نہایت مستبعد اور بعید از امکان ظاہر کرنا ہو۔ تکرار کی صورت میں اس کے اندر تاکید اور شدت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ استفہام یہاں استنکار کے مفہوم میں ہے۔

یعنی وہ بہت تعجب اور حیرت سے کہتے ہیں کہ کیا یہ شخص تمھیں اس بات سے ڈراتا ہے کہ جب تم مر کر اور سڑ گل کر مٹی اور ہڈی بن جاؤ گے تو از سر نو زندہ کر کے قبروں سے نکالے جاؤ گے! یہ ڈراوا جو تمھیں سنایا جا رہا ہے یہ نہایت ہی مستبعد اور نہایت ہی بعید از امکان ہے! مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی اس طرح کی خیالی باتوں سے

مرعوب ہو کر کہیں اس کے جال میں نہ پھنس جانا۔

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ (۳۷)

منکرینِ قیامت کی خرد باختگی

یعنی زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہم مرتے ہیں اور یہیں جیتے ہیں۔ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ پرانے مکذبینِ قیامت ہوں یا نئے، دونوں ہی نے قیامت کا انکار کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں بلکہ مجرد اس کے استبعاد کی بنا پر کیا ہے۔ درآنحالیکہ اس سے ہزاروں لاکھوں درجہ مستبعد چیزیں ہر وقت اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور ان کو مانتے ہیں۔ قرآن نے لوگوں کی اسی خرد باختگی پر جگہ جگہ اظہارِ تعجب کیا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ (۳۸)

اوپر کی باتیں تو ان دانشوروں نے اپنے عوام کو برگشتہ و مشتعل کرنے کے لیے کہیں اور پھر اپنی دانش و بینش کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ اگر کوئی اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس شخص کو رسول باور کرتا ہے تو کرے، ہمارے نزدیک تو اس نے خدا پر یہ جھوٹ گھڑا ہے کہ خدا نے اس کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس وجہ سے ہم تو اس کے اس دعوے کو ہرگز باور کرنے والے نہیں ہیں۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ (۳۹)

یہ آیت اوپر گزر چکی ہے اور وہاں اس کی پوری تشریح ہو چکی ہے۔

قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ (۴۰)

پیغمبر کی مذکورہ دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلایا کہ اب وعدۂ الٰہی کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے اپنی اس رعونت پر یہ لوگ بہت جلد پچھتائیں گے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ فَبُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (۴۱)

'صَیْحَۃٌ' کا مفہوم

'صَیْحَۃٌ' کے معنی ڈانٹ کے ہیں اور قرآن میں یہ عذابِ الٰہی کی تعبیر کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے، خواہ وہ عذاب کسی شکل میں ظاہر ہوا ہو۔ اس کو سخت آواز کے عذاب کے ساتھ مخصوص کر دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

'حق' کا مفہوم

'حق' سے مراد یہاں وہ وعدۂ حق ہے جو تکذیب کی صورت میں بشکلِ عذاب لازماً ظاہر ہونے والا تھا اور جس کی پیغمبر نے ان کو خبر دے دی تھی۔

'غثاء' کا مفہوم

لفظ 'غثاء' قرآن مجید اور کلامِ عرب دونوں میں دو مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ انشاء اللہ سورۂ اعلیٰ کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل بحث کریں گے۔ یہاں یہ پامال شدہ خس و خاشاک کے مفہوم میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی اس دعا کے بعد ان پر خدا کا عذاب اس امرِ واقعی کے ساتھ آ دھمکا جس کو لوگ محض خالی خولی دھمکی سمجھ رہے تھے اور ہم نے ان کو بالکل خس و خاشاک بنا کر رکھ دیا۔

'فَبُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ' لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے۔ یعنی ایسے ناہنجاروں پر خدا کی پھٹکار ہو! یہ اس

عذاب کی معنوی تعبیر ہے۔ عذابِ الٰہی درحقیقت خدا کی لعنت ہوتا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ (۴۲)

بعد کے انبیاء کی طرف اشارہ

اوپر والی آیت ۳۱ میں لفظ 'قرن' آیا ہے، اور یہاں 'قرون' جمع ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے بعد بالتدریج حضرت نوحؑ کی نسل سے متعدد قومیں اٹھیں اور ان میں سے ہر ایک کی ہدایت و اصلاح کے لیے خدا نے اپنے رسول بھیجے۔ اگرچہ ان تمام رسولوں کے نام نہ تورات میں مذکور ہیں، نہ قرآن میں لیکن قرآن اور تورات دونوں میں یہ اشارہ موجود ہے کہ خدا نے تمام قوموں میں اپنے رسول بھیجے۔ قرآن میں تو یہ بات نہایت واضح الفاظ میں فرمائی گئی ہے لیکن یہود چونکہ اپنے مخصوص خاندان کے انبیاء کے سوا دوسرے انبیاء کی تاریخ گم کرنے کے درپے ہمیشہ رہے ہیں اس وجہ سے تورات میں اس بات کا ذکر واضح الفاظ میں نہیں ہے۔ تاہم اشارات اس میں بھی موجود ہیں۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۴۳)

قوموں کی اجلِ معین کا اندازہ اور قریش کو تنبیہ

میرے نزدیک یہاں، عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق، مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے اور اوپر کی آیت اور اس آیت کے درمیان، وضاحتِ قرینہ کی بنا پر، خلا بھی ہے۔ اگر محذوف کو کھول دیجیے اور خلا کو بھر دیجیے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ان قوموں کی طرف ہم نے اپنے رسول بھیجے لیکن انھوں نے ان کی تکذیب کی جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ ہر قوم اپنی مہلت پوری کر چکنے کے بعد اپنے کیفرِ کردار کو پہنچی۔ نہ کسی قوم پر اس کی اجلِ معین پوری ہونے سے پہلے عذاب آیا اور نہ کسی قوم کو، اجلِ معین پوری ہو جانے کے بعد ایک منٹ کی مہلت ملی۔ قوموں کی ہلاکت کی 'اجل' سے متعلق ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اجل قوموں کے اخلاقی زوال کے پیمانہ سے ناپ کر مقرر کی ہے اور یہ خدا ہی جانتا ہے کہ کب کوئی قوم اپنے اخلاقی زوال کی اس حد کو پہنچی کہ اب اس کے وجود سے خدا کی زمین کو پاک ہو جانا چاہیے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اپنے رسول سے عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ جب تمہارا پیمانہ بھر جائے گا تو تم بھی فنا کر دیے جاؤ گے۔ نہ تمہارے جلدی مچانے سے خدا وقت سے پہلے تم پر عذاب بھیجے گا اور نہ وقت پورا ہو جانے کے بعد ایک سیکنڈ کی مہلت دے گا۔ قوموں کے باب میں سنتِ الٰہی یہی رہی ہے، اسی سنت کے مطابق تمہارے ساتھ بھی معاملہ ہوگا۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۴۴)

'تترٰی' کا مفہوم

'تترٰی' کی اصل 'وترٰی' ہے۔ عربی کے معروف قاعدے کے مطابق 'و' 'ت' سے بدل گئی ہے۔ 'جاء القوم تترٰی' کے معنی ہوں گے لوگ تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے آئے۔

قوموں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ان کی اصلاح کے اہتمام میں اضافہ

بالتدریج قوموں کی تعداد میں جتنا ہی اضافہ ہوتا گیا اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت و اصلاح کے اہتمام و انتظام میں بھی اسی رفتار سے اضافہ فرمایا۔ یہاں تک کہ ایک ہی دور میں الگ الگ قوموں میں الگ الگ رسول بھی آئے۔ اگرچہ

تاریخوں میں تفصیل نہیں ملتی لیکن حضرت ابراہیمؑ و حضرت لوطؑ کا ایک زمانے میں ہونا تو قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور حضرت شعیبؑ ایک ہی دور کے رسول ہیں۔ یہ اہتمام اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ خدا اپنی خلق کی اصلاح سے کبھی بے پروا نہیں رہا ہے۔ لیکن جس قوم کے پاس بھی اس کا رسول آیا اس نے اس کی تکذیب کی جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ یکے بعد دیگرے ہر قوم کو خدا نے ہلاکت کے اسی گڑھے میں جھونک دیا جس میں اس کی پیشرو قوم کو پھینکا۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ یعنی پھر یہ ہوا کہ جن کو اپنے کر و فر، اپنی قوت و شوکت اور اپنے عروج و اقبال پر بڑا ناز و فخر تھا وہ ماضی کی ایک داستانِ پارینہ بن کے رہ گئے۔ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ۔ یہ جیسا کہ آیت ۴۱ میں گزر چکا ہے، لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے اور اس جملہ کے موقع و محل سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ باوجودیکہ ان قوموں کی تاریخ بہت پرانی ہو چکی ہے لیکن ان کے عدم ایمان پر خدا کا جو غضب ہے وہ بدستور باقی ہے اور آج بھی ان کے ذکر کے ساتھ خدا ان پر لعنت کرتا ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۴۵)

'آیات' اور 'سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ' سے مراد

حضرت نوحؑ کے بعد کے تمام رسولوں کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد یہ ان رسولوں کا ذکر ہے جن کی مفصل سرگزشت تورات و انجیل کے صحیفوں میں موجود ہے۔ فرمایا کہ ہم نے اپنی نشانیوں اور ایک حجت قاطعہ کے ساتھ موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول بنا کر بھیجا۔ 'آیات' سے مراد میرے نزدیک وہ عام معجزات ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں فرعونیوں کے انذار کے لیے ظاہر ہوئے۔ ان کی تفصیل تورات میں بھی موجود ہے اور ہم نے اپنی اس کتاب میں بھی ان کے حوالے دیے ہیں۔ 'سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ' سے میرے نزدیک عصا کا معجزہ مراد ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ اس معجزے کو درحقیقت ایک برہان اور حجتِ قاطع کی حیثیت حاصل تھی اس وجہ سے اس کو 'سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ' سے تعبیر فرمایا۔ اسی معجزے کے ذریعہ سے فرعون اور اس کے درباریوں نے اپنی قوم اور اپنے تمام ماہر جادوگروں کے سامنے نہایت رسوا کن شکست کھائی۔ قرآن میں بعض جگہ اس کو 'بینۃ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی نہایت واضح حجت۔ لفظ 'سلطان' سورۂ رحمان کی آیت 'لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ' میں توقیع الٰہی اور سندِ خداوندی کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس اعتبار سے بھی معجزۂ عصا کے لیے یہ لفظ نہایت موزوں ہے اس لیے کہ اس کی حیثیت حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں فی الواقع ایک خدائی سند ہی کی تھی۔

اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ ۚ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۚ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِیْنَ (۴۶-۴۸)

فرعونیوں کے قومی مزاج کی خصوصیت

یعنی انھوں نے بھی وہی استکبار کی روش اختیار کی جو ہمیشہ سے انبیاء کے مکذبین کی رہی ہے۔ 'وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ'۔ ان کے قومی مزاج کی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ استکبار ان کے کسی وقتی ہیجان و اشتعال کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ تھے ہی نہایت سرکش اور مغرور لوگ۔ فرعونیوں کے اسی مزاج کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو فرمایا کہ 'اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى' (طٰہٰ : ۲۴) فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے) اور یہ بات بھی ہم اس کے محل میں ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت موسیٰؑ کو عصا کا معجزہ جو عطا فرمایا تو اسی لیے عطا فرمایا کہ ان کا مقابلہ سخت سرکشوں سے تھا۔ ان سرکشوں کی سرکوبی کے لیے حضرت موسیٰؑ کا مسلح ہونا ضروری تھا۔ 'فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ' یہ ان کے استکبار کی وضاحت ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو حق سے بالاتر سمجھا اور کہا کہ ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں کی بات باور کر کے اپنے اوپر ان کی بالاتری کس طرح تسلیم کر لیں بالخصوص جب کہ ان کی قوم ہماری غلامی و تابعداری کر رہی ہے! 'فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ' نتیجہ یہ نکلا کہ اس غرّے میں مبتلا ہو کر انھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلا دیا اور اسی کھڈ میں جا گرے جس میں ان سے پہلے ان کے بہت سے ہم مشرب گر کے تباہ ہو چکے تھے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۴۹)

حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم پر انعام

فرعون اور فرعونیوں کی سرکوبی کے بعد یہ وہ انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم پر فرمایا کہ فرعون اور اس کے درباری تو اس غرّے میں مبتلا رہے کہ بھلا وہ ایک ایسے شخص کی بات کس طرح مانیں جو ایک ایسی قوم کا فرد ہے جو ان کی غلامی کر رہی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی شخص اور اس کی قوم کو اپنی کتاب سے سرفراز فرمایا کہ وہ زندگی کے مراحل میں اس سے رہنمائی حاصل کریں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'الکتاب' سے یہاں تورات کے سوا کسی اور چیز کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور تورات کے متعلق معلوم ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کو مصر سے ہجرت کے بعد عطا ہوئی ہے۔ 'يَهْتَدُوْنَ' جمع کا صیغہ قوم کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے جس کا ذکر فرعونیوں کے قول 'وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ' میں گزر چکا ہے۔

'ذات قرار'

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (۵۰)

'معین' کا مفہوم

'ربوۃ' مرتفع اور ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ 'ذات قرار' کے معنی پرسکون اور 'معین' کے معنی چشمہ کے ہیں۔

حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کی سرگزشت کی طرف اجمالی اشارہ

یہ سیدنا مسیحؑ کے وقت ولادت کی طرف اشارہ ہے۔ جب حضرت مریمؑ کو ایک الگ تھلگ جگہ ایک درخت کے نیچے جا بیٹھنے کی غیبی ہدایت ہوئی۔ یہ جگہ مرتفع اور پرسکون تھی۔ یہاں کھجور کا ایک مثمر درخت بھی تھا اور اس کے نیچے ایک صاف و شفاف شیریں چشمہ بھی۔ اپنی زندگی کے اس نازک مرحلہ میں حضرت مریمؑ ایک پرسکون گوشۂ تنہائی کی سخت محتاج تھیں تاکہ زبانِ خلق کے طعنوں اور کچوکوں سے محفوظ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے فضل و رحمت سے ان کے لیے ایک پُرامن گوشۂ راحت مہیا فرما دیا۔ یہ ساری تفصیل سورۂ مریم میں گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے اس 'ربوۃ' کے محل و مقام کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس واقعہ کے ایک عظیم نشانی ہونے کی بھی وضاحت کی ہے۔ چونکہ یہ تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی تھیں اس وجہ سے قرآن نے یہاں صرف اشارہ کر دیا ہے۔

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

۷- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۱-۶۷

آگے یہ واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام رسولوں کو ایک ہی دین دیا لیکن ان کی امتوں نے اس دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور اب جس کے پاس جو کچھ ہے اسی میں مگن ہے، اس کے خلاف کچھ سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ ان کو کچھ دن اور موقع دو۔ یہ اپنی دنیوی کامیابیوں پر خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ بڑے تیر مار رہے ہیں حالانکہ یہ صرف اپنی تباہی کے سامان کر رہے ہیں لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہے۔ اصلی فتوحات دراصل وہ لوگ حاصل کر رہے ہیں جو آج خدا سے ڈرتے اور اس کی آیات پر ایمان لا رہے ہیں۔ بے شک یہ بازی جیتنے والے لوگ ہیں۔ رہے یہ برخود غلط لوگ تو جلد وہ دن آنے والا ہے جب یہ اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے لیکن کسی طرف سے ان کی کچھ شنوائی نہ ہوگی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ آیات ۵۱-۶۷
عَلِيْمٌ ۝۵۱ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝۵۲
فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۳
فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۵۴ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ
مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝۵۵ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۵۶
اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝۵۷ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ
رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝۵۹ وَالَّذِيْنَ
يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝۶۰
اُولٰۗىِٕكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝۶۱ وَلَا نُكَلِّفُ
نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۶۲
بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ
هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ۝۶۳ حَتّٰٓي اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا

هُمۡ يَجۡـَٔرُوۡنَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجۡـَٔرُوا الۡيَوۡمَ اِنَّكُمۡ مِّنَّا لَا تُنۡصَرُوۡنَ ﴿٦٥﴾ قَدۡ
كَانَتۡ اٰيٰتِىۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فَكُنۡتُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ تَنۡكِصُوۡنَ ﴿٦٦﴾
مُسۡتَكۡبِرِيۡنَ ۖۚ بِهٖ سٰمِرًا تَهۡجُرُوۡنَ ﴿٦٧﴾

ترجمۂ آیات ۵۱ - ۶۷

اے رسولو، پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ جو کچھ تم کرو گے میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اور یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو۔ ۵۱ - ۵۲

پس امتوں نے اپنے دین کو اپنے درمیان ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اب ہر گروہ اسی میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے تو ان کو ان کی سرمستی میں کچھ دن چھوڑ دو۔ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو ان کے مال و اولاد میں اضافہ کر رہے ہیں تو ان کے لیے بھلائی میں اضافہ کر رہے ہیں؛ بلکہ ان کو اصل حقیقت کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ ۵۳ - ۵۶

بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے ہر وقت ترساں ہیں۔ اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہوتے ہوتے ہیں کہ انھیں خدا کی طرف پلٹنا ہے ــــ یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ ان کو پا کر رہیں گے ــــ اور ہم کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور ہمارے پاس ایک رجسٹر ہے جو بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دے گا اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہو گی۔ ۵۷ - ۶۲

بلکہ ان لوگوں کے دل اس چیز سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کے کچھ اور مشاغل

ان کے ماسوا ہیں، یہ انہی میں پڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کے مترفین کو عذاب میں پکڑیں گے تو وہ آہ و فریاد کریں گے۔ اب آہ و فریاد نہ کرو، اب ہماری طرف سے تمھاری کوئی مدد نہیں ہوگی! جب ہماری آیتیں تم کو سنائی جاتی تھیں تو تم پیٹھ پیچھے بھاگتے تھے، گھمنڈ کرتے ہوئے گویا کسی افسانہ گو کو چھوڑ رہے ہو! ۶۳-۶۷

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ (۵۱)

تمام رسولوں کو مشترک ہدایت

یہ اس ہدایت کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو دی کہ اللہ کی بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو کچھ تم کروگے میں اس سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ مطلب اس بات کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ اللہ نے تو اپنے رسولوں کو یہ ہدایت دی، اسی پر انھوں نے عمل کیا اور اسی کی اپنی اپنی امتوں کو دعوت دی لیکن ان کی امتوں نے خود اپنے جی سے، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت طیبات کو حرام اور خبائث کو حلال ٹھہرایا اور اپنے رسولوں کی بتائی ہوئی شاہراہ چھوڑ کر بدعملی اور کفر و فسق کی راہ اختیار کی۔

'اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ' میں تہدید و تسلی دونوں ہے۔ یعنی اگر تم نیک عمل کروگے تو وہ بھی میرے علم میں رہے گا اور میں اس کا پورا پورا صلہ دوں گا اور اگر برائی کا ارتکاب کروگے تو وہ بھی میرے علم میں رہے گی اور میں اس کی سزا بھی دے کر رہوں گا۔

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (۵۲-۵۳)

تمام انبیاء کی مشترک دعوت کے برخلاف ان کی امتوں کا رویہ

ان تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی رہی ہے اور یہ سب ایک ہی امت ہیں۔ یہ ایک ہی دین لے کے آئے اور لوگوں کو ایک ہی امت بنانے کی کوشش کی اور میں ہی سب کا رب ہوں۔ یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے لیکن امتوں نے اپنی باہمی ضد م ضدا سے اپنے واحد دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اب حال یہ ہے کہ جو کچھ جس کے پاس ہے وہ اسی میں مگن ہے بعینہٖ یہی بات تمام انبیاء کی دعوت کا حوالہ دینے کے بعد سورۂ انبیاء میں یوں فرمائی گئی ہے۔ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝ وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ ۔۔۔ ۹۲-۹۳ (یہ سب تمھاری ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمھارا رب ہوں تو میری ہی بندگی کرو اور انھوں نے اپنے درمیان اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا)

یہی مضمون اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (۲۱۳)

لوگ ایک ہی امت بنائے گئے (تو لوگوں نے اس میں اختلاف کیا) تو اللہ نے نبیوں کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ قولِ فیصل کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے جس میں انھوں نے اختلاف کیا اور اس میں اختلاف انھی لوگوں نے کیا جن کو وہ چیز دی گئی تھی، کھلی ہوئی تنبیہات کے آجانے کے باوجود محض آپس کی ضدم ضدا کے باعث۔

انبیاء اور ان کی امتوں کے باب میں قرآن کا موقف

یہاں نبیوں اور امتوں کے باب میں قرآن کے موقف کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ اگرچہ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ اور سورۂ انبیاء کی تفسیر میں ہو چکی ہے لیکن اس کو اچھی طرح نہ سمجھنے کے باعث لوگ شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہوئے ہیں اس وجہ سے ہم اصل حقیقت پھر واضح کیے دیتے ہیں۔

قرآن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دنیا میں خدا کے جو نبی اور رسول آئے وہ الگ الگ دینوں کی دعوت لے کر آئے اور انھوں نے الگ الگ امتوں کی بنا ڈالی بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی نے ایک ہی امت ـــــ امت مسلمہ ـــــ کے قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ جب قوموں نے اس دین میں بگاڑ پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بگاڑ کی اصلاح کے لیے دوسرے نبی اور رسول بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں نے اصل دین سے الگ کوئی چیز نہیں پیش کی بلکہ صرف اصل دین کو قائم کرنے پر اپنا سارا زور صرف کیا اور اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت متقضی ہوئی تو انھوں نے اسی دین کے مزید متقضیات نمایاں کیے۔ قرآن اسی مبارک سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اس نے اصل دین کو، جس کی دعوت آدمؑ و نوحؑ سے لے کر حضرت مسیحؑ تک ہر نبی نے دی، بالکل نکھار کر، اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا ہے اور اس کے جو پہلو ابھی تشنۂ تکمیل تھے اور جن کی تکمیل کا کام، سابق انبیاء کی پیشینگوئیوں کے مطابق آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا، ان کی اس نے تکمیل کر دی۔ اپنی اس حقیقت کے اعتبار سے تمام ملتوں اور قوموں کا اصل دین یہی ہے۔ لیکن قوموں نے اپنی تنگ نظری اور تعصب کے سبب سے اس کی مخالفت کی اور اب جس کے پاس جو کچھ ہے، خواہ وہ کتنا ہی محرّف اور ناتمام ہو، وہ اسی پر اڑا ہوا اور اسی میں مگن ہے ـــــ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے طور پر فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ ایسے شامت زدہ ہیں کہ وہ اپنے ہی کھوئے ہوئے خزانے سے بہرہ مند نہیں ہونا چاہتے ان کا غم تم کہاں تک کھاؤ گے!

فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ (۵۴)

غَمْرَةٌ سے مراد یہاں غفلت کی سرمستی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ جب تم نے

ان کو اتنا جھنجھوڑا لیکن یہ کروٹ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اب ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ خود بہت جلد اپنی اس سرمستی کا انجام دیکھ لیں گے۔ 'حَتّٰى حِيْنٍ' سے مراد مہلت کی وہ مدت ہے جو ان کے لیے مقرر تھی اور جس کے ختم ہونے کا وقت اب قریب آ لگا تھا۔

أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ (۵۵-۵۶)

سرگشتگان دنیا کو تنبیہ

'مَالٍ وَّبَنِيْنَ' دنیاوی رفاہیت کی ایک جامع تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سرمستوں کی سرمستی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کو دنیا کی جو خوشحالیاں دے رکھی ہیں ان کی تھپکیاں ان کو جاگنے نہیں دے رہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ عیش جو ان کو حاصل ہے، ان کی زندگی کے کامیاب ہونے کی دلیل ہے اور ان کامیابیوں اور فتوحات میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہے گا اس وجہ سے کسی ڈرانے والے کے ڈراووں سے ڈر کر انہیں اپنا عیش مکدر نہیں کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ اگر وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں تو بہت غلط سمجھے ہیں۔ یہ جن چیزوں کو کامیابیاں تصور کیے ہوتے ہیں یہ کامیابیاں نہیں ہیں بلکہ یہ قدرت کے استدراج کا پھندا ہے جس میں پھنس جانے کے بعد وہ کبھی اس سے چھوٹ نہیں سکیں گے لیکن وہ اپنی بلادت کے سبب سے اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ۝ (۵۷-۶۱)

بازی جیتنے والوں کی صفات

یہاں سورہ کی ابتدائی دس آیات پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں جن اہل ایمان کو فوز و فلاح کی بشارت دی ہے۔ انہی کا ذکر ذرا مختلف الفاظ میں پھر فرمایا کہ البتہ یہ لوگ، جن کی صفات یہ ہیں، حقیقی کامیابیوں کی راہ میں مسابقت کر رہے ہیں اور بے شک یہ لوگ اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ کے رہیں گے۔ ان لوگوں کی مندرجہ ذیل صفات یہاں گنائی ہیں اور یہ صفات ان مسلمانوں کی ہیں جو اس دور میں دنیا کی تمام مرغوبات سے منہ موڑ کر رضائے الٰہی کی طلب کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی خشیت سے ہر وقت لرزاں و ترساں ہیں۔ اس کی شہادت ان کی نمازوں سے ملتی ہے۔ چنانچہ اوپر فرمایا ہے۔ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۔

دوسری صفت یہ ہے کہ 'هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ' یہ متکبرین کی طرح خدا کی آیات کا مذاق نہیں اڑاتے بلکہ جب اللہ کا رسول ان کو یہ آیات سناتا ہے تو وہ ان پر آمنّا و صدّقنا کہتے ہیں۔

تیسری صفت یہ ہے کہ 'هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ' ان کا سارا اعتماد اپنے رب پر ہے وہ کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتے۔

چوتھی صفت یہ ہے کہ 'يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ' وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں نمائش اور فخر کے لیے نہیں خرچ کرتے بلکہ خدا کی رضاجوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں

کہ ایک دن اس کو منہ دیکھنا ہے۔ "اَنَّھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ رٰجِعُوْنَ" میرے نزدیک "وَجِلَۃٌ" کی وضاحت کے طور پر ہے۔ اس سے اس خوف کی وضاحت ہو گئی جو ان کے دلوں میں سمایا ہوا ہے۔

"اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَھُمْ لَھَا سٰبِقُوْنَ" فرمایا کہ بے شک یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں اور کامیابیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور یہ ان نیکیوں کے ثمرات پا کے رہیں گے نہ کہ وہ لوگ جو ہمارے استدراج کو اپنی فتوحات سمجھ رہے ہیں اور برابر اپنی ہلاکت کے غار کی طرف آنکھیں بند کیے ہوئے ٹگ ٹٹ بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ یہ آیت اوپر کی آیت ۵۶ کی مقابل آیت اور شروع کے مضمون "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" الآیہ کی وضاحت مزید کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں دونوں آیتوں کے اسلوب بیان کے اس فرق پر بھی نگاہ رہے کہ اوپر تو فرمایا کہ "نُسَارِعُ لَھُمْ فِی الْخَیْرٰتِ" (یہ عیش دنیا کے متوالے اس مغالطہ میں ہیں کہ ان کے مال و اولاد میں ہم جو اضافہ پر اضافہ کر رہے ہیں یہ ان کے لیے خیر میں اضافہ کر رہے ہیں) اور ان اہل ایمان کے باب میں فرمایا کہ "اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ" بے شک یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور یہ اپنی بازی جیتیں گے۔ اسلوب بیان کا یہ فرق واضح کرتا ہے کہ اس دنیا میں انسان جو کچھ پاتا ہے وہ بہرحال خدا ہی کے دیے پاتا ہے اور اس کی حیثیت انعام کی نہیں بلکہ امتحان کی ہوتی ہے۔ البتہ آخرت میں انسان جو کچھ پائے گا وہ اس کی اپنی سعی و عمل کا ثمرہ اور اس کی اپنی محنت کا اجر ہو گا تو جس کو مسابقت کرنی ہو وہ اس میدان میں کرے۔ نہ کہ اس میدان میں جس کی ہر چیز محض وقتی اور آزمائشی ہے۔

وَلَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا وَلَدَیْنَا کِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۶۲)

اہل ایمان کو ایک بشارت

یہ بطور جملہ معترضہ اہل ایمان کے لیے اسی طرح کی بشارت اور تسلی ہے جس طرح کی بشارت بقرہ کی آخری آیت میں گزر چکی ہے۔ یعنی ہر چند ہے تو یہ امتحان سخت لیکن اہل ایمان اطمینان رکھیں کہ ہم اپنی راہ میں مسابقت کرنے والوں کو کسی ایسے امتحان میں نہیں ڈالتے جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور یہ اطمینان بھی رکھیں کہ وہ ہماری راہ میں جو مشقت بھی جھیلیں گے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، وہ ہمارے پاس ایک رجسٹر میں درج ہوتی ہے، وہ رجسٹر، جزائے اعمال کے دن، ہر ایک کے تمام اعمال کا پورا پورا ریکارڈ، بالکل ٹھیک ٹھیک پیش کر دے گا اور ہر شخص اس کے مطابق اپنے ہر عمل کا صلہ پائے گا، کسی کی ذرہ برابر بھی کوئی حق تلفی نہ ہو گی۔

بَلْ قُلُوْبُھُمْ فِیْ غَمْرَۃٍ مِّنْ ھٰذَا وَلَھُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِکَ ھُمْ لَھَا عٰمِلُوْنَ ۝ حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْھِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا ھُمْ یَجْـَٔرُوْنَ (۶۳-۶۴)

مترفین اور ان کے پیرووں کا انجام

اس اضراب کا تعلق متکبرین کے اسی مغالطہ سے ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ وہ اپنی رفاہیت و خوش حالی کو اپنی نیک اعمالی و نیک مآلی کی دلیل بنائے بیٹھے ہیں۔ وہاں صرف ان کے مغالطہ کی طرف اشارہ کر کے کلام اہل ایمان کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب پھر وہی سلسلۂ کلام عود کر آیا۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے دل، اس انذار سے جو خدا کا رسول ان کو سنا رہا ہے، غفلت کے پردوں میں ہیں اور یہ اسی طرح اپنی سرمستیوں میں کھوئے رہیں گے۔ اہل ایمان

کے جو اعمال، آیات ۷۵-۷۰ میں مذکور ہوئے ان کے اندر ان کے لیے کوئی کشش نہیں۔ ان کی دلچسپی کے اعمال کچھ اور ہیں اور وہ انہی میں منہمک رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب خدا کا عذاب ان کو دبوچ لے گا تب وہ فریاد کریں گے لیکن اس وقت ان کا فریاد کرنا بالکل بے سود ہوگا۔

'جَأَرَ يَجْأَرُ' کے معنی تضرع و زاری کرنے کے ہیں اور 'مُتْرَفِين' مالداروں اور خوش حالوں کو کہتے ہیں۔ وہ عذاب الٰہی جو رسول کے انذار کے نتیجہ میں آتا ہے وہ اصلاً مترفین ہی کے لیے آتا ہے اس لیے کہ رسول کے انذار سے اصلی کد انھیں کو ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا 'اَخَذْنَا مُتْرَفِیْہِمْ بِالْعَذَابِ' لیکن ضمناً اس کی لپیٹ میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو مترفین کے طبقہ سے تو نہیں ہوتے لیکن اپنی شامتِ اعمال سے آلۂ کار انھیں کے بن جاتے ہیں اس وجہ سے جس طرح گندم کے ساتھ گھن پس جاتا ہے اسی طرح اپنے سرپرستوں کے ساتھ وہ بھی پس جاتے ہیں۔

لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ، قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ (۶۵-۶۶)

یعنی اس وقت ان کی فریاد کا جواب ہماری طرف سے یہ ہوگا کہ اب ہمارے آگے رونے گڑگڑانے کا وقت گزر چکا۔ اس کا موقع پہلے تھا لیکن اس وقت تو تمھاری رعونت کا حال یہ رہا کہ جب ہماری آیاتِ انذار تم کو سنائی جاتیں تو تم پیٹھ پیچھے بھاگتے اور ہمارے رسول کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوتے تو اب اپنی ضد کا انجام بھگتو! اب ہماری طرف سے اپنے لیے کسی خیر کی امید نہ رکھو اور کوئی دوسرا بھی آج ہمارے مقابل میں تمھاری کوئی مدد نہ کر سکے گا۔ فرعون کی سرگزشت میں بھی بعینہٖ یہی بات مذکور ہوئی ہے۔ وہ جب طوفان کی لپیٹ میں آگیا تو چلایا کہ میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لایا۔ لیکن اس کا یہ اقرارِ ایمان درخورِ اعتنا نہیں ٹھہرا۔ بلکہ اس کو جواب ملا کہ اب ایمان لائے! ایمان لانے کا وقت پہلے تھا جب تم نے نافرمانی کی۔ پیچھے ہم اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ بات قولاً بھی ہو سکتی ہے اور صورتِ حال کی تعبیر بھی۔

مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ (۶۷)

آیت ۶۷ کی تالیف اور اس کی تاویل

اس آیت کی تالیف کلام اور اس کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ ان کے اقوال نقل کرنے اور ان پر تنقید کرنے میں بڑی طوالت ہوگی اس وجہ سے ہم صرف اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔

'اِسْتِكْبَار' کے بعد 'بِ' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ لفظ یہاں استہزاء کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'بِهٖ' کی ضمیر مجرور کا مرجع مفسرین کے ایک گروہ نے لفظ 'آیات' کو قرار دیا ہے، جو اوپر والی آیت میں مذکور ہے، اور اس کو علیٰ سبیل التاویل 'ذکر' اور 'کتاب' کے مفہوم میں لیا ہے۔ اگرچہ یہ بات عربیت کے خلاف نہیں ہے۔ 'آیت'، 'کتاب'، 'ذکر' اور 'رسول' متبادل الفاظ کی حیثیت سے قرآن میں استعمال ہوئے

ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ بسا اوقات ضمیر کا مرجع یا اسم اشارہ کا مشارٌ الیہ الفاظ میں مذکور نہیں ہوتا بلکہ فحوائے کلام سے متبادر ہوتا ہے اور اس کا تعین قرینہ کرتا ہے۔ قرآن اور کلامِ عرب دونوں میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں اور آخری گروپ کی سورتوں میں اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس ضمیر کا مرجع رسول ہے جس کی تکذیب اور جس کے ساتھ استہزا کے عواقب اس سورہ میں زیرِ بحث ہیں اور جس کی تلاوتِ آیات قَدْ کَانَتْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ میں مذکور رہی ہے۔

'سَامِرٌ' کے معنی افسانہ خواں اور قصہ گو کے ہیں۔ یہ 'تَھْجُرُوْنَ' کا مفعول بھی ہو سکتا ہے اور اگر اس کو ضمیر مجرور سے حال مانیں جب بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ مجرور سے حال پڑنے کی متعدد مثالیں اس کتاب میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

'تَھْجُرُوْنَ' اپنے بالکل معروف معنی (تم چھوڑتے تھے) میں استعمال ہوا ہے۔ اس کو اس کے معروف معنی سے ہٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر اس تالیفِ کلام پر آپ کو اطمینان ہے تو 'لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ' سے لے کر یہاں تک جو بات فرمائی گئی ہے وہ سادہ الفاظ میں یوں ہے کہ اب روؤ یا چلاؤ، اس سے کچھ حاصل نہیں، اب نہ ہمارے ہاں تمھاری کچھ شنوائی ہے اور نہ کوئی دوسرا ہی تم کو ہم سے چھڑا سکتا ہے۔ ہماری خوشنودی حاصل کرنے کا وقت وہ تھا جب ہمارے رسول کی زبانی تم کو ہماری آیات سنائی جا رہی تھیں لیکن اس وقت تمھاری بد دماغی کا یہ حال تھا کہ تم نہایت تکبر کے ساتھ، اس کا مذاق اڑاتے ہوتے، اس طرح اس سے کتراتے تھے گویا وہ کوئی افسانہ گو اور قصہ خواں ہے جس کی بات تمھارے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے متمردین کو پچھلی قوموں کی جو سرگزشتیں سناتے ان سے وہ سبق لینے کے بجائے آپ کا مذاق اڑاتے اور اپنے عوام کو ورغلاتے کہ اس شخص کے پاس ہے کیا! پچھلی قوموں کی کچھ حکایات ہیں جن کو یہ سناتا پھر رہا ہے! اِنْ ھٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ۔

۹۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۸-۹۲

آگے چند آیات میں کفار کے لاابالی پن پر زجر و توبیخ ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی ضد اور مکابرت سے مایوس نہ ہو، تم صراطِ مستقیم پر ہو اور یہ لوگ صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں، یہ اپنا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اگر ہم ان لوگوں کو بطور تنبیہ کسی مصیبت میں بھی مبتلا کریں جب بھی یہ سنبھلنے والے نہیں ہیں بلکہ ان سے چھوٹتے ہی پھر اپنی سرمستیوں میں کھو جائیں گے جن میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد آفاق و انفس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ لوگ لاابالی پن چھوڑ کر کچھ سوچنے

سمجھنے کی طرف مائل ہوں لیکن اس کے جواب میں بھی انھوں نے یہی کہا کہ وہ سب پچھلوں کے فسانے ہیں۔ اس کے بعد چند آیات میں لوگوں کے تضادِ فکر کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان سے سوال کیا ہے کہ ایک طرف تو تم صحیح باتوں کا اقرار و اعلان کرتے ہو لیکن پھر تمھاری عقل کہاں گم ہو جاتی ہے کہ ان کے بالکل برعکس باتیں مان کر ضلالت کی وادی میں بھٹک جاتے ہو! ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿٦٨﴾ آیات
أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ﴿٦٩﴾ أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ ۶۸-۹۲
بَلْ جَاءَهُم بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ
أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ بَلْ أَتَيْنَاهُم
بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَن ذِكْرِهِم مُّعْرِضُونَ ﴿٧١﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا
فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿٧٢﴾ وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ
إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٧٣﴾ وَإِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ عَنِ الربع
الصِّرَاطِ لَنَاكِبُونَ ﴿٧٤﴾ وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِم مِّن ضُرٍّ
لَّلَجُّوا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿٧٥﴾ وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ
فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ﴿٧٦﴾ حَتَّىٰ إِذَا فَتَحْنَا
عَلَيْهِم بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيدٍ إِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿٧٧﴾ وَهُوَ ع ۴
الَّذِي أَنشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿٧٨﴾
وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٧٩﴾ وَهُوَ الَّذِي
يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٨٠﴾
بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ﴿٨١﴾ قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا
تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿٨٢﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا

هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٨٣﴾ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ
وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٤﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٨٦﴾
سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٨٧﴾ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ
شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٨﴾
سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿٨٩﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٩٠﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ
اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٩١﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى
عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٩٢﴾ ع ۵ ۵

ترجمۂ آیات ۶۸-۹۲

کیا ان لوگوں نے کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ چیز آئی جو ان کے اگلے آباؤ اجداد کے پاس نہیں آئی! یا انھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس وجہ سے اس کے منکر بنے ہوئے ہیں! یا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر کچھ جنون کا اثر ہے! یہ جنون نہیں ہے بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے لیکن ان میں سے اکثر حق سے بیزار ہیں اور اگر حق ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا تو آسمان و زمین اور جو ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے۔ بلکہ ہم تو ان کے پاس ان کے حصہ کی یاددہانی لائے ہیں تو وہ اپنی یاددہانی سے اعراض کر رہے ہیں۔ ۶۸-۷۱

کیا تم ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہو! تمھارے رب کا صلہ تمھارے لیے بہتر ہے اور وہ بہترین روزی بخشنے والا ہے! اور بے شک تم ان کو ایک سیدھی راہ کی دعوت دے

رہے ہو اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں وہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں (اور اگر ہم ان کو کسی آزمائش میں ڈالنے کے بعد) پھر ان پر رحم کرتے اور ان کی تکلیف دور کر دیتے تو وہ بدستور اپنی سرکشی ہی پر اڑے اسی طرح بھٹکتے رہتے۔ اور ہم نے ان جیسوں کو عذاب میں پکڑا لیکن نہ وہ اپنے رب کے آگے جھکے اور نہ وہ تضرع ہی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہم ان پر ایک سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو وہ اس میں بالکل مایوس ہو کے رہ جائیں گے۔ ۷۱-۷۷

اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے کان، آنکھ اور دل بنائے، پر تم بہت کم شکر گزار ہوتے ہو! اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا ہے پھر تم اسی کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔ اور وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے رات اور دن کی آمد و شد تو کیا تم سمجھتے نہیں! ۷۸-۸۰

بلکہ انھوں نے بھی وہی بات کہی جو اگلوں نے کہی۔ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور ہڈیاں بن جائیں گے تو از سر نو اٹھائے جائیں گے! اس کی دھمکی تو ہم کو اور اس سے پہلے ہمارے آباء و اجداد کو بھی سنائی گئی۔ یہ محض اگلوں کے فسانے ہیں! ۸۱-۸۳

ان سے پوچھو، یہ زمین اور جو اس میں ہیں کس کے ہیں، اگر تم جانتے ہو! کہیں گے اللہ کے۔ کہو تو کیا تم اس سے یاددہانی نہیں حاصل کرتے! پوچھو، ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا خداوند کون ہے؟ کہیں گے یہ سب اللہ کے ہیں۔ کہو تو کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں! پوچھو، وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے، لیکن اس کے
۲۱ میں پناہ نہیں دی جا سکتی، اگر تم جانتے ہو! وہ کہیں گے یہ باتیں اللہ ہی کے اختیار کی پھر تمھاری مت کہاں ماری جاتی ہے۔ ۸۴-۸۹

بلکہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ خدا نے کسی کو اپنی اولاد نہیں قرار دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود شریک ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود جو کچھ اس نے پیدا کیا ہوتا اس کو لے کر الگ ہو جاتا اور وہ ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔ خدا ایسی باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ غائب و حاضر کا جاننے والا ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں! ۹۰-۹۲

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ (۶۸)

استفہامیہ اسلوب بقصد زجر و ملامت

یہ اور آگے جو باتیں استفہامیہ اسلوب میں آئی ہیں سب بطور اظہارِ حسرت اور بقصد زجر و ملامت ہیں۔ 'قول' سے مراد یہاں قرآن ہے جس سے اعراض کا ذکر اوپر والی آیت میں ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ آخر یہ لوگ اس قرآن سے اس درجہ کیوں بدک رہے ہیں! کیا انھوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا ان کا گمان یہ ہے کہ یہ ان کے باپ دادا کے طریقہ کے خلاف ہے۔ چونکہ یہاں کلام زجر اور حسرت کے انداز میں ہے اس وجہ سے بات مجمل چھوڑ دی گئی ہے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں اس وجہ سے قرآن کی باتیں ان کے دلوں میں نہیں اترتیں۔ قرآن کو باپ دادا کی روایات کے خلاف سمجھ کر اس سے بدکنا بھی نری جہالت ہے۔ باپ دادا کا طریقہ بجائے خود اپنی صحت و صداقت کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کا عقل و فطرت کی کسوٹی پر پورا اترنا بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں آخر یہ لوگ اپنی ناک سے آگے کیوں نہیں دیکھتے! ان کے اصل جدِ اعلیٰ تو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ ہیں وہ تو اسی دین کے حامل اور داعی تھے۔ یہ لوگ اپنے ان اجدادِ کرام کی پیروی کیوں نہیں کرتے، اپنے انہی آباء کی لکیر کیوں پیٹے جا رہے ہیں جو دین سے بالکل بے خبر تھے!

أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ (۶۹)

قریش کو ایک سخت خطرے سے آگاہی

یہ اس سنتِ الٰہی کی روشنی میں، جو قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہو چکی ہے، قریش کو ایک سخت خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قوم پر اتمامِ حجت کے لیے ایک رسول بھیجتا ہے جو اسی قوم کے اندر سے ہوتا ہے۔ اگر قوم اس پر ایمان لاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو برومند کرتا اور زمین میں اس کو اقتدار بخشتا ہے اور اگر وہ رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اتمامِ حجت کے بعد وہ لازماً فنا کر دی جاتی

ہے۔ اس وجہ سے کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت کا مرحلہ ایک بڑا ہی نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ اسی مرحلہ میں اس کی زندگی یا موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ بدقسمت ہے وہ قوم جو اس مرحلہ کی نزاکت کو نہ سمجھے اور اپنے رسول کے معاملہ میں لاابالی پن کا مظاہرہ کرے۔ قریش کی اسی ناعاقبت اندیشی پر یہ ان کو تنبیہ ہے کہ کیا انھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس وجہ سے اس کا انکار کیے جا رہے ہیں یا یہ سب کچھ جان بوجھ کر ہو رہا ہے۔ دیدہ دانستہ ہو رہا ہے تو اس کھیل کا انجام معلوم ہے!

اَمْ يَقُولُونَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَاۗءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (۷۰)

رسول کو خبطی قرار دینے کی وجہ دراصل حق بیزاری ہے

یعنی اگر وہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ رسول کو خبط اور سودا لاحق ہے تو یہ خود ان کے اپنے پاگل ہونے کی دلیل ہے۔ رسول کو کوئی خبط و سودا نہیں ہے۔ وہ تو جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ بالکل حق ہے اور اس کی ایک ایک بات پوری ہو کے رہے گی۔ البتہ یہ لوگ خود حق سے بیزار ہیں۔ اس وجہ سے رسول کو دیوانہ قرار دے رہے ہیں۔ مریض کو جب طبیب کی تشخیص کردہ دوائیں کڑوی معلوم ہوتی ہیں اور وہ ان کو حلق سے اتارنے پر تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے کو مریض تسلیم کرنے کے بجائے الٹے طبیب ہی کے مشورے کو ہذیان قرار دیتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا۔ یہ اپنے باطل کو چھوڑ کر حق کے کڑوے کسیلے گھونٹ حلق سے اتارنے کے لیے تیار نہیں تھے اس وجہ سے رسول کو دیوانہ قرار دیتے تھے کہ اس طرح اپنی خرد باختگی پر کچھ پردہ ڈال سکیں۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاۗءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ (۷۱)

خواہشاتِ نفس اور حق کے درمیان بعد المشرقین ہے

اب یہ خواہشاتِ نفس اور حق دونوں کے اختلافِ مزاج کو واضح فرمایا ہے کہ ان دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ خواہشاتِ نفس کے مطالبے کچھ اور ہیں، حق کے تقاضے، ان سے بالکل الگ کچھ اور ہیں۔ اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، جیسا کہ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن اور پیغمبر کی باتیں ان کی خواہشوں کے مطابق ہوں تب یہ ان کو مانیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ اس پوری کائنات کی تباہی ہے۔ اس لیے کہ یہ خیر کی جگہ شر، عدل کی جگہ ظلم، نیکی کی جگہ بدی، امانت کی جگہ خیانت اور اس سے بڑھ کر یہ کہ توحید کی جگہ شرک اور قیامت کے بجائے انکارِ قیامت کے علم بردار ہیں۔ اگر یہ تمام اقدار ان کی خواہشوں کے مطابق تلپٹ ہو جائیں تو اس دنیا کا سارا اخلاقی نظام درہم برہم ہو جائے اور اگر اس کے اندر شرک کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو شرک کے ساتھ تو اس کائنات کا نظام ایک دن بھی باقی نہ رہ سکتا۔ اس حقیقت کو آگے اسی سورہ میں یوں واضح فرمایا ہے۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ (۹۱) (اللہ نے نہ تو اپنے لیے کوئی اولاد بنائی اور نہ کوئی معبود اس کے ساتھ شریک ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے اس کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا)

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو حق کو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلانا چاہتے ہیں اور اس دنیا کی نجات و فلاح حق کے پیچھے چلنے میں ہے۔ خالقِ کائنات اپنی دنیا کو ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ اب یہ لوگ خود فیصلہ کریں کہ حق کے پیچھے چل کر زندگی چاہتے ہیں یا باطل کے ساتھ چمٹے رہ کر موت اور ہلاکت! اگر زندگی مطلوب ہے تو یہ گھونٹ حلق سے اتارنے پڑیں گے، خواہ کڑوے لگیں یا میٹھے۔ اس سے الگ زندگی کی کوئی اور راہ نہیں ہے۔

یاددہانی سے اعراض کرنے والوں کا انجام

'بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ'۔ یہ دوسرے الفاظ میں وہی تنبیہ ہے جو اوپر 'اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ' کے الفاظ میں گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اس قرآن کو کسی افسانہ گو کی افسانہ گوئی سمجھے ہیں تو بہت غلط سمجھے ہیں۔ یہ ان کے حصہ کی وہ یاددہانی ہے جو اتمامِ حجت کے لیے ہم نے ان کی طرف بھیجی ہے۔ اگر اس یاددہانی سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو یاد رکھیں کہ ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو ان سے پہلے خدا کی یاددہانی کی ناقدری کرنے والی قوموں کا ہو چکا ہے۔ اوپر ہم اس سنتِ الٰہی کا حوالہ دے چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف اپنے رسول بھیجے اور ان رسولوں کے ذریعہ سے ان قوموں کو یاددہانی کی۔ جس قوم نے اس یاددہانی کی قدر کی اس نے فلاح پائی، جس نے اس کی قدر نہ کی وہ فنا کر دی گئی۔ یہاں اسی سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ کر کے آگاہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ اس یاددہانی سے اعراض کیے جا رہے ہیں اور اس کے عواقب سے بے خبر ہیں!

نبی کا زاد و راحلہ اس کے ساتھ ہوتا ہے

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَیْرٌ ۖ وَّهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (۷۲)

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپؐ کے مخالفین کے لیے ملامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان کے آگے جو کچھ پیش کر رہے ہو اس کا کوئی معاوضہ تو طلب کر نہیں رہے ہو کہ یہ اس کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں۔ تم نے تو مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہے ہو۔ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اس میں ان کی اپنی ہی محرومی ہے۔ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے تمھاری دعوت قبول نہ کی تو اس سے تمھیں کوئی نقصان پہنچا دیں گے تو بالکل غلط سمجھتے ہیں۔ تمھارے لیے تمھارے رب کا بخشا ہوا اجر ہی بہتر ہے اور وہ بہترین فضل فرمانے والا ہے۔ خدا کا رسول کوئی تاجر یا دکاندار نہیں ہوتا بلکہ ایک داعیِ حق ہوتا ہے۔ اس کی دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور یہی شان ان لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو نبیوں کے طریقے پر کام کرتے ہیں۔

صراطِ مستقیم سے انحراف کی اصل علت

وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ وَاِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ (۷۳-۷۴)

یعنی جہاں تک تمھاری دعوت کا تعلق ہے وہ تو زندگی کی صحیح شاہراہ پر چلنے کی دعوت ہے۔ اسی شاہراہ پر چل کر انسان منزلِ مقصود کو پہنچ سکتا ہے لیکن اس کو اختیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ اگر آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو تو آخر اس کو کیا پڑی ہوئی ہے کہ وہ اپنے نفس کی آزادیوں اور بے قیدگیوں پر پہرہ بٹھائے۔ اپنی نقد لذتوں کی قربانی تو وہی دے سکے گا جس کو ایک روزِ جزا کا انتظار ہو۔ جس کو اس قسم

کے کسی دن کا انتظار نہیں ہے وہ اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے چلے گا خواہ ان کی پیروی میں وہ صراطِ مستقیم سے کتنا ہی دور نکل جائے۔ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ آپ کی بتائی ہوئی راہ سے جو لوگ انحراف اختیار کیے ہوئے ہیں اس کا سبب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی پیچ و خم ہے، یہ تو بالکل سیدھی راہ ہے، خرابی جو کچھ ہے ان کے دلوں میں ہے۔ ان لوگوں کے دلوں میں آخرت پر ایمان نہیں ہے اور جن کے اندر آخرت پر ایمان نہ ہو وہ اس سیدھی راہ سے کج ہو کر ہی چلیں گے۔ حکمتِ دین کی اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیے کہ جب تک اس دنیا کے ساتھ آخرت کو نہ مانئے نہ اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نظر آئے گی اور نہ زندگی کی صحیح شاہراہ معین ہو سکے گی۔ اس حقیقت کو ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۷۵)

آنحضرتؐ کو تسلی تاریخ کی روشنی میں

اس آیت میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، شرط میں سے کچھ حصہ، بربنائے وضاحتِ قرینہ حذف ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی کہ اگر ہم ان کو بطور تنبیہ کسی مصیبت میں مبتلا کرتے کہ ان کے اندر کچھ خوفِ خدا اور تضرع پیدا ہو، پھر ان پر رحم کرتے، اور ان کی مصیبت دور کر دیتے تو یہ پھر اپنی اسی سرکشی میں پڑے ہوئے اسی طرح بھٹکتے رہتے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ذہنیت کے لوگوں کو عذاب کی نشانیاں بھی، جن کا یہ مطالبہ کرتے ہیں، کوئی نفع نہیں پہنچاتیں۔ اگر ان سے ان کی گردنوں میں ذرا خم پیدا ہوتا بھی ہے تو محض وقتی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ مصیبت کے دن گزرتے ہی ان کے لیڈر یہ سبق پڑھانا شروع کر دیتے ہیں کہ اس طرح کے نرم و گرم حالات تو قوموں کو پیش آیا ہی کرتے ہیں، اس کو ہمارے ایمان و اخلاق سے کیا تعلق! — یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ عذاب کی کوئی نشانی مانگتے ہیں تو اس کو کوئی اہمیت نہ دو۔ اس قماش کے لوگوں کو کوئی نشانی نفع نہیں پہنچاتی۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ (۷۶)

تنبیہی عذاب

'وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ' یعنی 'وَلَقَدْ اَخَذْنَا اَشْيَاعَهُمْ' ہم نے ان کے ہم مشربوں کو اس سے پہلے اپنے تنبیہی عذابوں میں پکڑا لیکن نہ تو ان کے دلوں میں خستگی اور فروتنی پیدا ہوئی اور نہ وہ اپنے رب کے آگے گریہ و زاری کرتے تھے۔ یہ پچھلی تاریخ کی روشنی میں اسی بات کی دلیل بیان ہوئی ہے جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی ہے کہ تاریخ شاہد ہے کہ اس قماش کے لوگ تنبیہات سے کوئی سبق نہیں لیتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو بھی کوئی تنبیہ کی گئی تو پیغمبر کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ اس سے کوئی سبق لیں گے۔ 'ھُمْ' سے مراد یہاں قریش نہیں بلکہ ان کے وہ ہم مشرب ہیں جو پچھلی امتوں میں گزر چکے تھے۔ عربی میں غایت مجانست و مشابہت کے اظہار کے مواقع میں اس طرح ضمیریں آتی ہیں۔ اس کی مثالیں قرآن اور کلامِ عرب میں موجود ہیں۔ اس میں یہ بلاغت ہے کہ اُن کو پکڑا تو گویا انہی کو پکڑا اس لیے کہ مرتکب دونوں ایک ہی جرم کے ہیں۔

'استکانۃ' اور 'تضرع' میں ظاہر و باطن کا فرق ہے۔ 'استکانۃ' دل کی شکستگی و خستگی کی تعبیر

ہے اور 'تضرع' سے مراد وہ گریہ وزاری اور دعا و فریاد ہے جو 'استکانۃ' کے نتیجہ کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔
میرے نزدیک یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ (۷۷)

'عذاب شدید' سے مراد

یعنی تنبیہی جھڑکیوں سے تو ان مغروروں کا دماغ درست ہونے والا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے گا جب ان کی اس تکذیب کے نتیجہ میں ہم ان پر اپنے عذاب شدید کے دروازے کھول دیں گے۔ 'عذاب شدید' سے مراد یہاں وہ فیصلہ کن عذاب ہے جو سنتِ الٰہی کے تحت ہر اس قوم پر آیا جس نے اپنے رسول کی تکذیب کر دی اور اپنی ضد پر اڑی رہ گئی۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں۔ اس عذاب کے ظہور کے بعد پھر قوم کو مہلت نہیں ملتی۔ اس کے تمام سہارے اور تمام امیدیں یک قلم ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف آیت کے آخری الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۷۸)

کان، آنکھ اور دل کا اصل مصرف

اوپر کے کلام میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور اس میں قریش کو جو تہدید و وعید ہے وہ غائب کے صیغہ سے ہے۔ اب یہ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ خدا نے جو تم کو کان، آنکھ اور دل عطا فرمائے ہیں تو کا ہے کے لیے عطا فرمائے ہیں! اسی لیے تو کہ ان سے نصیحت و حکمت کی وہ باتیں، جو تمہیں سنائی جا رہی ہیں سنو، اللہ کی وہ نشانیاں جو آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کی طرف تمہیں توجہ دلائی جا رہی ہے، ان کو دیکھو، اور ان سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں اور جو تمہارے سامنے نہایت واضح طور پر پیش کیے جا رہے ہیں ان پر غور کرو۔ کان، آنکھ اور دل دماغ کا اصلی مصرف یہی ہے لیکن تم عجیب شامت زدہ لوگ ہو کہ حق کو حق ماننے کے لیے دلیل کے بجائے تنبیہ کے ڈنڈے کا مطالبہ کر رہے ہو! مطلب یہ ہے کہ اگر عقل اور استدلال سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے آدمی صرف ڈنڈے ہی کی منطق سے قائل ہو تو اس میں اور گدھے میں کیا فرق رہا!

'قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ' اظہار حسرت و افسوس کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی بخشی ہوئی اتنی اعلیٰ نعمتیں پا کر ان کی بہت کم قدر کرتے ہو! شکر کی اصل حقیقت، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں نعمت کی قدر دانی ہے اور نعمت کی قدر دانی یہ ہے کہ آدمی اس سے صحیح فائدہ اٹھائے اور اپنے منعم کا شکر گزار ہو۔

وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۷۹)

توحید اور قیامت کی ایک جامع دلیل

یہ قیامت اور حشر کی طرف توجہ دلا دی کہ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ بس یہیں پیدا ہوئے یہیں مر کھپ جاؤ گے۔ جب ایک کسان اپنے کھیت میں بوتا ہے تو محض بونے کی خاطر نہیں بوتا بلکہ ایک دن وہ اس کو اکٹھا بھی کرتا ہے۔ اسی طرح جس نے تمہیں اس زمین میں پھیلایا ہے وہ ایک دن تمہیں جمع بھی کرے گا تو

یہ یاد رکھو کہ تم صرف اسی کے کھنتے میں جمع کیے جاؤ گے۔ آخر اس کی بوئی ہوئی فصل میں کوئی دوسرا کس طرح شریک بن جائے گا! غور کیجیے ان چند لفظوں کے اندر کس خوبی سے امکانِ قیامت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے، معاد کی ضرورت بھی بیان ہو گئی ہے اور توحید کی دلیل بھی واضح ہو گئی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۸۰)

اختلافِ لیل و نہار کے بعض اشارات

'اِخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ' سے مراد دن اور رات کی ایک دوسرے کے بعد، پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ، آمد و شد ہے۔ اس نشانی کی طرف قرآن نے جگہ جگہ توجہ دلائی ہے۔

دن اور رات کا پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ آنا اور جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اس کائنات کے خالق کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ یہ بجائے خود نہ آنے کے مجاز ہیں نہ جانے کے۔

ان کے نظام میں کسی کا دخل انداز نہ ہو سکنا اس بات کی شہادت ہے کہ متصرفِ حقیقی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

اختلافِ مزاج و صورت کے باوجود ان دونوں میں اس کائنات کی پرورش کے لیے جو سازگاری ہے وہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کائنات میں ایک ہی حکیم و قدیر کا ارادہ کار فرما ہے جو اس کے تمام اضداد میں ربط پیدا کرتا ہے اور ان کو کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

شب میں آرام کی نیند کے بعد صبح کو اٹھ کھڑے ہونا ہر انسان کے لیے قیامت کی یاددہانی ہے کہ اسی طرح برزخ کی نیند کے بعد جب اللہ تعالیٰ چاہے گا ہر شخص اٹھ کھڑا ہو گا۔

ان کے علاوہ بعض مزید اشارات بھی قرآن نے اختلافِ لیل و نہار سے نکالے ہیں اور ہم نے اس کتاب میں ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں فرمایا کہ وہی جو زندگی اور موت دیتا ہے اور جس کے دستِ تصرف میں رات اور دن کی آمد و شد ہے، وہی تمہارا حقیقی معبود ہے، اسی سے سابقہ پڑنا ہے اور اسی کی طرف تمہیں یہ بلایا جا رہا ہے تو تم کہاں بھٹکے ہوئے جا رہے ہو! کیا اتنی واضح حقیقت تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے!

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۸۱-۸۳)

وہی پرانا جواب

یعنی یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر واضح اور ثابت ہیں لیکن یہ ان کے دلوں میں کسی طرح نہیں اتر رہی ہیں۔ انھوں نے یہ سب کچھ سن کے وہی بات کہی جو ان کے اگلے ہم مشربوں نے کہی۔ انھوں نے کہا بھلا جب ہم مر کے مٹی اور ہڈی بن جائیں گے تو کیا دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! یہ اَن ہونی بات ہے! ابھی ڈراوا ہمیں سنایا جا رہا ہے اور اس سے پہلے یہی ڈراوا ہمارے اگلوں کو بھی سنایا گیا لیکن قیامت کو نہ آنا تھا نہ آئی نہ آئے گی۔ یہ سب پرانے فسانے ہیں جو بار بار دہرائے جا رہے ہیں۔ ہم ان دھمکیوں میں آنے والے نہیں ہیں!

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۸۴-۸۵)

منکرین کا تضادِ فکر

اب یہ ان منکرین کے تضادِ فکر کو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ ایک طرف تو یہ آسمان و زمین کا خالق و مالک اور مختارِ کل خدا ہی کو مانتے ہیں دوسری طرف یہ ایسی باتیں بھی مانتے ہیں جو اس کے بالکل ضد میں یا ان باتوں کا انکار کرتے ہیں جو ان کے اس سلمہ کے لازمی نتیجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مشرکینِ عرب کے متعلق ہم یہ بات اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کا خالق و مالک اور متصرّفِ حقیقی تو صرف خدا ہی کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ شرک کی ان اقسام میں بھی مبتلا تھے جن کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ رہی قیامت تو اس کو اول تو وہ ایک نہایت مستبعد چیز سمجھتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں مانتے تھے تو ان کا خیال تھا کہ ان کے سفارشی خدا کی گرفت سے ان کو بچا لیں گے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ اسی قسم کا تضادِ فکر ہے جس میں بالعموم آج کل کے مسلمان مبتلا ہیں۔ یہ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں اور اس اقرار کے جو لازمی نتائج ہیں ان کا انکار بھی کرتے ہیں۔ ایمان کے مدعی بھی ہیں اور ساتھ ہی نہایت دھڑلے سے وہ باتیں بھی مانتے اور کرتے ہیں جو ایمان کے بالکل منافی ہیں۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ ذرا ان مدعیانِ علم سے پوچھو کہ یہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے کس کا اور کس کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ 'اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کے الفاظ میں ان کے تضادِ فکر پر ایک قسم کی تعریض ہے اس لیے کہ جو علم متضاد افکار کا مجموعہ ہو وہ علم نہیں بلکہ جہل اور شدید قسم کا جہل ہے۔ فرمایا کہ تمھارے اس سوال کا جواب تو بہرحال وہ یہی دیں گے کہ یہ ساری چیزیں اللہ ہی کی اور اللہ ہی کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔ پھر ان سے کہو کہ 'اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ' اپنے اسی مسلمہ کی روشنی میں تم آخر اپنے افکار و عقائد کا جائزہ کیوں نہیں لیتے! اس کے بعد تم توحید کا کس طرح انکار کرتے ہو؟ یہ شرکا و شفعاء تم نے کہاں سے گھڑ لیے؟ قیامت تمھیں کیوں ایک عجیب چیز معلوم ہوتی ہے اور رسول کی دعوت سے تم اس طرح کیوں بدکتے ہو!!

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۸۶-۸۷)

فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ ساتوں آسمان اور عرشِ عظیم کا خداوند کون ہے؟ اوپر کا سوال زمین اور اہلِ زمین سے متعلق تھا، یہ سوال ساتوں آسمان اور عرشِ عظیم سے متعلق ہے۔ 'عرشِ عظیم' اللہ تعالیٰ کے ہمہ گیر اقتدارِ مطلق کی تعبیر ہے۔ اہلِ عرب جس طرح زمین کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے اسی طرح ساتوں آسمان اور عرشِ عظیم کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ وہ دنیا کی دوسری مشرک قوموں کی طرح آسمانوں اور زمین کے الگ الگ دیوتاؤں کے قائل نہیں تھے۔ فرمایا کہ وہ تمھارے اس سوال کا جواب بھی یہی دیں گے کہ یہ ساری چیزیں اللہ ہی کی اور اسی کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔ چونکہ 'مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ' کے سوال کا اصل مطلب یہ ہے کہ ان میں خدائی کس کی ہے اس وجہ سے اس کے جواب میں 'لِلّٰهِ' بالکل موزوں ہے۔ فرمایا کہ اگر وہ تمھارے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں دیتے ہیں تو پھر ان سے پوچھو کہ تم ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کے مالک

سے ڈرتے نہیں کہ اس کی خدائی میں دھاندلی مچاتے، اس کے احکام و قوانین کی خلاف ورزی کرتے اور دوسروں کو بلا کسی استحقاق کے اس کی خدائی میں شریک بناتے ہو! اگر اس کا قہر و غضب تم پر نازل ہو جائے تو آخر کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (۸۸ - ۸۹)

'ملکوت' سے مراد

'مَلَكُوْت' یہاں زمامِ اختیار و اقتدار کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ وہ تو جس کو چاہے پناہ دے سکتا ہے لیکن کسی دوسرے کی یہ شان نہیں ہے کہ اس کی پکڑ سے کسی کو چھڑا سکے؟ فرمایا کہ اس کا جواب بھی لامحالہ وہ یہی دیں گے کہ یہ سارے اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ مشرکینِ عرب جن معبودوں کو پوجتے تھے ان کے متعلق ان کا یہ تصور نہیں تھا کہ وہ ایسا اختیار و اقتدار رکھتے ہیں کہ اپنے زور و اقتدار سے وہ کسی کو خدا کی پکڑ سے بچا سکیں بلکہ وہ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں سمجھ کر ان کی پوجا محض اس امید پر کرتے تھے کہ یہ راضی رہیں تو ان کے طفیل میں خدا ان سے راضی رہے گا۔ اس سوال کے ساتھ بھی 'اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کے الفاظ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے جو میتھالوجی تیار کی ہے اس میں تو تم نے یہ درجہ کسی کو نہیں دیا لیکن اگر کوئی ہے اور تم اس کو جانتے اور مانتے ہو تو ذرا اس کا نام لو۔ پھر فرمایا کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار نہیں مانتے تو ان سے پوچھو کہ کس نے تم پر افسوں پھونکا ہے کہ بالکل تمھاری مت ماری گئی ہے اور تم خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی جے پکارتے ہو۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۹۰ - ۹۲)

مذکورہ بالا سوال و جواب پر استدراک

اب اس سارے سوال و جواب پر استدراک ہے کہ یہ جو کچھ مانتے ہیں یہ خود ان کے اپنے اعترافات کے بالکل خلاف ہے اس وجہ سے ہم نے اس قرآن میں جو کچھ پیش کیا ہے یہ حق ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں اس لیے کہ یہ خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلا رہے ہیں۔ خدا نے نہ کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہے، نہ کسی کو اپنی بیٹی اور نہ کوئی اس کا ساجھی اور شریک ہے۔ اگر اس کائنات کی تخلیق میں اور الٰہ بھی شریک ہوتے تو ہر الٰہ اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا اور یہ سارا نظام کب کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ اس طرح کی خرافات جو یہ بیان کرتے ہیں یہ خدا کی اعلیٰ صفات کے بالکل منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام غائب و حاضر کا خود علم رکھنے والا ہے تو اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک بنائے۔ وہ ان چیزوں سے برتر ہے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

یونانیوں اور ہندوؤں کی میتھالوجی میں ان کے دیوتاؤں کی جو خون ریز جنگیں مذکور ہیں یہاں ان پر بھی نظر رہے اور قدیم یونانیوں کا یہ عقیدہ بھی نگاہ میں رہے کہ مرد کو سورج نے پیدا کیا ہے اور عورت کو زمین نے۔ غور کیجیے کہ اگر سورج اپنے پیدا کیے ہوئے مردوں کو لے کر الگ ہو جائے تو زمین کی عورتوں کا کیا حشر ہوگا! قرآن نے یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کارخانۂ کائنات قائم ہی اس وجہ سے ہے کہ اس میں ایک ہی خالق و مالک کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر اس میں دوسرے اِلٰہ بھی شریک ہوتے تو اس کا قیام و بقا ناممکن تھا۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۹۳-۱۱۸

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی گئی ہے کہ اب فتح و نصرت کا وقت قریب ہے۔ اہلِ ایمان کامیاب و فتحمند اور آپ کے مخالفین دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی سے دوچار ہوں گے تو کچھ عرصہ ان کی شرارتوں سے درگزر کرو۔ فیصلہ کی گھڑی سر پر آگئی ہے۔ جس مدت کو یہ بہت طویل سمجھ رہے ہیں اور جس کے دھوکے میں اپنی شرارتوں میں دلیر ہوتے جا رہے ہیں، انجام سامنے آجانے کے بعد محسوس کریں گے کہ وہ پلک جھپکتے گزر گئی اور اس وقت اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۳-۱۱۸

قُلْ رَّبِّ إِمَّا تُرِيَنِّي مَا يُوعَدُونَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِي فِي الْقَوْمِ
الظّٰلِمِينَ ﴿۹۴﴾ وَإِنَّا عَلٰى أَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُونَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ
أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِينِ ﴿۹۷﴾ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ
يَّحْضُرُونِ ﴿۹۸﴾ حَتّٰى إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ﴿۹۹﴾
لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِنْ
وَّرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۱۰۰﴾ فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ
بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿۱۰۱﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا
أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خٰلِدُونَ ﴿۱۰۳﴾ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا

كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ
اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾
اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَ
اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ
وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ
الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا
يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ
اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا
لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ
الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ
ع ۱۶ ۶ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ
اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

ترجمۂ آیات ۹۳-۱۱۸

دعا کرو کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے وہ عذاب دکھائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو اے میرے پروردگار! مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کیجیو۔ اور بے شک ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جس عذاب سے ہم ان کو ڈرا رہے ہیں وہ تم کو دکھا دیں۔ ۹۳-۹۵

ان کی شرارتوں سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو، یہ جو کچھ ہرزہ سرائی کر رہے ہیں ہم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور دعا کرتے رہو کہ اے رب میں شیاطین کے وسوسوں سے تیری پناہ

مانگتا ہوں۔ اور اے میرے رب اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔ ۹۶-۹۸

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوگی تو وہ کہے گا کہ اے رب مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کماؤں! ہرگز نہیں! یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہنے والا بنے گا اور آگے ان کے ایک پردہ ہوگا اس دن تک کے لیے جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔ تو جب صُور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ آپس کا نسب کام آئے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے طالب مدد ہوں گے۔ پس جن کے پلّے بھاری ہوں گے وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلّے ہلکے ہوں گے تو وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ان کے چہروں کو آگ جھلسے گی اور اس میں ان کے منہ بگڑے ہوئے ہوں گے۔ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں تو تم ان کو جھٹلاتے تھے! کہیں گے اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب رہی اور ہم گمراہی میں پڑے رہے۔ اے ہمارے رب ہمیں اس جہنم سے ایک مرتبہ نکال، اگر ہم پھر ایسا کریں تو بے شک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں گے۔ حکم ہوگا، دفع ہو، اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ میرے بندوں کی ایک جماعت ان لوگوں کی تھی جو دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے تو تم نے ان کو مذاق بنایا، یہاں تک کہ ان کے ساتھ تمھارے اس شغل نے تم کو میری یاد سے غافل رکھا اور تم ان کی ہنسی اڑاتے رہے۔ آج میں نے ان کی استقامت کا صلہ دیا کہ وہی کامیاب ہونے والے بنے۔ ۹۹-۱۱۱

کہنے والا کہے گا، سالوں کے حساب سے زمین میں کتنی مدت رہے ہوگے! کہیں گے ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصّہ، یہ بات شمار کرنے والوں سے پوچھو۔ کہنے والا کہے گا تم تو بس تھوڑی

ہی مدت رہے۔ کاش تم اس بات کو جانتے ہوتے! ۱۱۲-۱۱۴

تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بس یوں ہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے! تو بڑی ہی برتر ذات ہے اللہ، بادشاہ حقیقی کی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عرش کریم کا مالک۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور اِلٰہ کو بھی پکارے گا، جس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا اور کافر فلاح نہیں پائیں گے! اور دعا کرو کہ اے رب! مجھے بخش اور مجھ پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۵-۱۱۸

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۝ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۹۳-۹۴)

وعدۂ عذاب کے باب میں پیغمبر کو بشارت

رسول کی تکذیب کی صورت میں قوم پر جو عذاب آیا کرتا ہے، قریش کے متکبرین کو جب اس سے ڈرایا جاتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے کہ اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لاؤ۔ ان کے اس مطالبہ کا جواب قرآن نے جگہ جگہ دیا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں ہے۔ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ - ۴۶ (اور یا تو ہم تمھیں دکھا دیں گے اس عذاب کا کچھ حصہ یا تم کو وفات دیں گے اور ان کی واپسی ہماری ہی طرف ہوگی) اسی طرح سورۂ رعد میں فرمایا ہے۔ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ - ۴۰ (اور یا تو ہم اس عذاب کا کچھ حصہ تم کو دکھا دیں گے جس سے ان کو آگاہ کر رہے ہیں یا تم کو وفات دیں گے اور تمھارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، محاسبہ ہمارے ذمہ ہے) بعینہٖ یہی مضمون سورۂ غافر کی آیت ۷۷ میں بھی ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک مکذبین کے لیے وعدۂ عذاب کا تعلق ہے وہ تو قطعی ہے۔ رہا اس کے ظہور کا وقت کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ظہور میں آئے گا یا آپ کی وفات کے بعد تو اس سوال کے جواب کو ان آیات میں مبہم چھوڑ دیا گیا تھا لیکن آیت زیر بحث اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے غلبہ و نصرت کے ظہور کا وقت اب بالکل قریب ہے، یہ بات آپ کی حیات مبارک ہی میں واقع ہوگی اور اس کا لازمی نتیجہ آپ کے دشمنوں کی ہلاکت بھی ہے۔ یہ اشارہ یوں نکلتا ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا تلقین کی گئی ہے کہ دعا کرو کہ اے رب اگر تو اس عذاب کو میری زندگی ہی میں ان ظالموں پر لانے والا ہے جس سے ان کو

ڈرایا جاتا رہا ہے تو مجھے اپنے دامنِ رحمت کے نیچے رکھیو، ان ظالموں میں شامل نہ کیجیو۔ اس دعا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو بشارت اور آپ کے مکذبین کے لیے جو آخری انذار ہے وہ بالکل واضح ہے اور یہ اشارہ بھی ہے کہ آپ کے اعداء آپ کی زندگی ہی میں پامال ہو گئے اور آپ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا اعلان کر کے تشریف لے گئے۔

وَإِنَّا عَلَىٰٓ أَن نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقَٰدِرُونَ (۹۵)

ناسازگار حالات کے علی الرغم اللہ کا ارادہ پورا ہوگا

یہ اسی بشارت کو، جو اوپر والی آیت میں مضمر ہے، مؤکد فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اس دور میں ابھی حالات بہت ناسازگار تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ معاندین کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر گھر سے ہجرت پر مجبور ہو رہے تھے۔ یہ باور کرنا کچھ آسان نہیں تھا کہ اسی تاریکی کے اندر سے عنقریب روشنی پیدا ہونے والی ہے۔ اس تردد کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اس بات پر پوری طرح قادر ہیں کہ تمہاری زندگی ہی میں تمہارے دشمنوں کو پامال کر دیں۔ حالات ہمارے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتے!

ہجرت کی طرف اشارہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کی تلقین صرف اس عذاب کی شدت کو نہیں ظاہر کر رہی ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس میں ہجرت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اے رب اگر یہ عذاب میری زندگی ہی میں آنے والا ہے تو اس کے آنے سے پہلے پہلے میری اور میرے باایمان ساتھیوں کی نجات کی راہ کھولیو۔ گویا دعا کے اسلوب میں آپ کو یہ بشارت بھی دے دی گئی کہ اس عذاب سے محفوظ رکھنے کا سامان آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے کر لیا ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ (۹۶)

عفو و درگزر کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر اور عفو و درگزر کی تلقین ہے کہ ان کے برے سلوک کا جواب بدستور اپنے اچھے سلوک سے دیتے رہو۔ جو ہرزہ سرائیاں اور بدتمیزیاں یہ کر رہے ہیں ہم ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ایک ایک شرارت کا مزہ ہم ان کو چکھائیں گے، تم ان کے رویہ سے دل گرفتہ نہ ہو۔ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑو۔ اب فیصلہ کا وقت قریب ہے۔

وَقُل رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَٰتِ الشَّيَٰطِينِ ۝ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ (۹۷-۹۸)

حصولِ صبر و عفو و درگزر کی دعا

یہ حصولِ صبر و عفو و درگزر کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے۔ 'شیطان' سے مراد شیاطین جن بھی ہیں جو دل میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور وہ شیاطین انس بھی جن کا رویہ یہاں زیر بحث ہے۔ فرمایا کہ برابر یہ دعا کرتے رہو کہ اے رب مجھے شیاطین جن کے وسوسوں سے بھی محفوظ رکھ اور ان شیاطین انس سے بھی محفوظ رکھ کہ وہ میرے پاس بحث و جدال اور شر و فساد کے لیے نہ آئیں۔

حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۝ لَعَلِّىٓ أَعْمَلُ صَٰلِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّآ ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۖ وَمِن وَرَآئِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۹۹-۱۰۰)

کفار کی بعد از وقت حسرت

یعنی یہ لوگ اپنی ان شرارتوں سے باز آنے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آ دھمکے گی اور اس عالم کے احوال و معاملات سے سابقہ پیش آئے گا تب ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ اس وقت بڑی لجاجت سے درخواست کریں گے کہ اے رب! مجھے ایک بار دنیا میں پھر جانے دے تاکہ جو مال و متاع وہاں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں جا کر کچھ نیکی کما لوں۔ کَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا فرمایا کہ یہ بات ہرگز ہونے والی نہیں ہے بس یہ ایک بات ہوگی جو بڑی حسرت کے ساتھ وہ کہے گا لیکن اس کی اس حسرت کے پورے ہونے کا وقت گزر چکا ہوگا۔ عمل کی مہلت بس اس دنیا کی زندگی تک ہے۔ اس مہلتِ حیات کے ختم ہونے کے بعد ان کے آگے ایک پردہ ہوگا جو اسی دن اٹھے گا جس دن وہ حساب و کتاب کے لیے اٹھائے جائیں گے۔ اس ٹکڑے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بات وہ کہنے کو تو کہے گا لیکن اگر اس کو دنیا میں پھر بھیج دیا جائے تو وہ کرے گا وہی جو کرتا رہا ہے۔ قرآن میں اس مفہوم کے لیے نظیر موجود ہے لیکن یہاں ہمارے نزدیک وہی مفہوم ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ اس کے نہایت واضح نظائر آخری گروپ کی سورتوں میں موجود ہیں۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (۱۰۱)

قیامت کے دن کی نفسی نفسی

یہ قیامت کے دن کی نفسی نفسی کی تصویر ہے کہ اس دن نہ کسی کا نسب کچھ کام آئے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے طالبِ مدد ہو سکیں گے۔ 'تَسَآءُل' کے معنی آپس میں ایک دوسرے سے طالبِ مدد ہونا ہے۔ مصیبت کے وقت میں نسبی و خاندانی عصبیت اور قومی و قبائلی تعاون و تناصر اس دنیا میں بڑا سہارا ہے اور عربوں میں اس چیز کو خاص طور پر بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں اپنے خاندان یا قبیلہ کی دہائی پکار دیتا تو اس کے قبیلہ کا ہر شخص اس کی حمایت میں کٹ مرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ فرمایا کہ صور پھونکے جانے کے بعد سارے نسب ختم ہو جائیں گے اور کوئی ایک دوسرے سے نہ طالبِ مدد ہو سکے گا اور نہ کوئی کسی کی مدد کر سکے گا۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ (۱۰۲-۱۰۴)

اس دن کسی کا حسب نسب کچھ کام نہیں آئے گا بلکہ صرف اس کا عمل کام آئے گا۔ جن کے پلے بھاری ہوں گے وہ تو کامیاب ہوں گے اور جن کے پلے ہلکے ہوئے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں رکھا، وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں پڑیں گے۔ اس جہنم میں ان کا حال یہ ہوگا کہ آگ ان کے چہروں کو جھلسے گی اور وہ منہ بسورے ہوئے ہوں گے۔

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ (۱۰۵-۱۰۷)

کفار کی فریاد اور اس کا جواب

یعنی جب وہ چیخیں چلائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب ملے گا کہ اب کیوں روتے چلاتے

ہو، اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے جب تم کو ہماری آیتیں سنائی جاتی تھیں تب تو تم ان کی تکذیب کرتے تھے! وہ اعتراف کریں گے کہ اے رب! یہ ہماری بدبختی اور شقاوت تھی جو ہم پر چھائی رہی کہ ہم نے اس دن کی تکذیب کی، بلاشبہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں لیکن اے ہمارے رب، ایک بار اور ہمیں موقع دے۔ اگر پھر ہم یہی کچھ کریں تو لاریب ہم اسی کے سزاوار ہیں۔

قَالَ اخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ (۱۰۸)

لفظ 'خَسَأ' کتے کو دھتکارنے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی اس التجا کا یہ جواب ملے گا کہ چلو دفع ہو! اسی میں پڑے رہو اور اب مجھ سے کوئی بات نہ کرو۔

اِنَّهٗ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْ عِبَادِیْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ ۚۖ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِیًّا حَتّٰۤی اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِیْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ۝ اِنِّیْ جَزَیْتُهُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۱۰۹ - ۱۱۱)

غربائے مسلمین کی دلداری

یہ اس غیرت کا بیان ہے جس کے سبب سے خدا ان اشقیاء کو بات کرنے سے روک دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تم میرے آگے زبان نہ کھولو، تم وہ شقی اور بدبخت لوگ ہو کہ جب میرے بندوں کی ایک جماعت میرے آگے 'رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ' کی دعا کرتی تھی تو تم نے ان کو مذاق بنا رکھا تھا اور اس شغل مذاق میں اس طرح تم منہمک رہے کہ تمہیں یہ بات یاد بھی نہ رہی کہ کبھی مجھ سے بھی تمہیں سابقہ پڑنے والا ہے اور تم پوری جسارت کے ساتھ ان کی ہنسی اڑاتے رہے تو آج میں نے ان کی صبر و استقامت کا ان کو صلہ دیا، اب وہ فائز المرام ہیں اور تم یہ بھاڑ جھونکو اور اسی میں جلو!

'فَرِیْقٌ مِّنْ عِبَادِیْ' میں لفظ 'فریق' اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں اس سے مراد خاص طور پر غربائے مسلمین ہیں جو اپنی غریبی اور بے کسی کے سبب سے متمردین قریش کے ظلم و ستم اور ان کے مذاق و استہزا کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ وہ تو تم سے مغفرت اور رحمت کی دعا کرتے تھے اور تم ان کی دعا اور نماز کو اپنی رعونت کے سبب سے ایک شغل تفریح بنائے ہوئے تھے۔ 'سِخْرِیّ' اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جس کو ایک ٹھٹھول اور مذاق بنایا جائے۔ کسی کو مذاق بنانا بجائے خود ایک بہت بڑی رعونت ہے اور یہ رعونت دہ چند ہو جاتی ہے اگر کوئی شقی اس کی دعا اور نماز کا مذاق اڑائے اس لیے کہ اس صورت میں وہ صرف اسی کا مذاق نہیں اڑاتا بلکہ خود خدا کا بھی مذاق اڑاتا ہے۔

'حَتّٰۤی اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِیْ' یعنی اس شغل تفریح میں تم ایسے منہمک رہے کہ کبھی تمہیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ کوئی تمہارا خدا بھی ہے جو تمہاری ان حرکتوں کو، جو تم اس کے ذاکر و شاغل اور صابر و شاکر بندوں کے ساتھ کر رہے ہو، دیکھ رہا ہے اور ایک دن وہ ضرور ان میں سے ایک ایک چیز کا انتقام لے گا۔

'اِنِّیْ جَزَیْتُهُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ' یعنی اب آنکھیں کھول کر دیکھ لو، وہ چیز تمہارے سامنے موجود ہے جس کو تم نے بھلائے رکھا۔ تمہارے تمام ظلم و ستم اور مذاق و تمسخر کے علی الرغم میرے جو بندے

یری بندگی پر جمے رہے میں نے آج ان کو ان کی استقامت کا بھرپور صلہ دے دیا۔ 'اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ' یہ اس صلہ کی تفصیل ہے کہ وہی کامیاب ہونے والے بنے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ ان کا مذاق اڑانے والے نامراد ہوئے۔ یہاں اس سورہ کی پہلی آیت 'قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ' کو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ جس بات سے سورہ کا آغاز ہوا تھا اب اسی پر سورہ کا اختتام ہو رہا ہے۔ یہ عود علی البدء کا اسلوب قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے اور نظم قرآن کے نہایت واضح دلائل میں سے ہے۔

غور کیجیے، ان آیات کا ان غربائے مسلمین پر کیا اثر پڑا ہوگا جو اس دور میں متکبرین کے ظلم اور تحقیر کا ہدف بنے ہوئے تھے ان کے صبر و عزیمت کو رب غیور کی اس دلداری سے کتنی غذا اور قوت حاصل ہوئی ہوگی!

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ۝ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱۲ - ۱۱۴)

طول حیات کا مغالطہ

اب یہ واضح فرمایا کہ ظہور قیامت کو یہ جو بہت بعید چیز سمجھے ہوئے اس مغالطہ میں ہیں کہ اگر وہ آئی بھی تو اس کے آنے میں اتنی دیر ہے کہ ابھی سے اس کی فکر میں اپنا عیش مکدر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ مغالطہ بہت جلد دور ہو جائے گا۔ نفخ صور کے بعد جب یہ اٹھیں گے تو ان کو محسوس ہوگا کہ جس زندگی کو وہ بہت طویل سمجھے ہوئے تھے وہ پلک جھپکتے ختم ہو گئی۔

'قٰلَ' کا فاعل یہاں اللہ تعالیٰ یا کوئی فرشتہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ 'قَالَ قَآئِلٌ' کے مفہوم میں ہے۔ یعنی قیامت کو جب یہ اٹھیں گے تو انہیں میں سے کوئی پوچھنے والا پوچھے گا کہ بھلا بتاؤ، دنیا میں ہم کتنی مدت رہے ہوں گے؟ دوسرے جواب دیں گے کہ بس ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم۔ 'فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ'۔ یہ جواب دینے والوں کی طرف سے بیزاری کا اظہار ہوگا کہ بھلا کسی کو کیا پتہ کہ ہم دنیا میں کتنے دن رہے، اگر کسی نے اس کا شمار رکھا ہو تو اس سے جا کے پوچھو! یعنی آج جس زندگی کے طول اور اس کے عیش پر ریجھے ہوئے ہیں۔ ایک دن آنے والا ہے جب اس کے متعلق کوئی سوال بھی طبیعت پر نہایت گراں گزرے گا۔ 'قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'۔ یہ بھی انہی میں سے کسی کی بات ہوگی جس میں کچھ ملامت و حسرت کا مفہوم بھی ہے، یعنی دنیا میں تم رہے تو بہت کم لیکن اس کو جاننے اور سمجھنے کا وقت وہ تھا جب تم دنیا میں تھے، اب تو اس کا وقت گزر چکا ہے۔

یہی مضمون سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۰۲-۱۰۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں یہ تصریح ہے کہ یہ باتیں انہی کے درمیان آپس میں ہوں گی۔ 'يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا' (وہ آپس میں سرگوشی کریں گے کہ بس تم ایک عشرہ دنیا میں رہے ہو گے) اسی سلسلہ میں ان کے سب سے زیادہ دانا و بینا کی یہ بات بھی نقل ہوئی ہے کہ 'اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا' (جب کہ ان میں جو سب سے زیادہ ہوش و گوش والا ہوگا کہے گا کہ بس تم ایک دن دنیا میں رہے ہو گے)۔ میرے نزدیک آیات زیر بحث میں بھی آخری قول ان کے 'اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً' کا نقل ہوا ہے۔

سورۂ کہف آیت ۱۹ میں اصحابِ کہف کا طویل نیند سے اٹھنے کے بعد جو مکالمہ مذکور ہوا ہے اور جو درحقیقت مثال ہے عالمِ برزخ کے بعد کی زندگی کی، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب ان کے اپنے ہی درمیان ہوگا۔

یہ ایک حقیقت ہے، جس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ غفلت کی زندگی کا سارا طول و عرض صرف اس وقت تک وسیع ہوتا ہے جب تک وہ حاصل رہتی ہے، جب گزر جاتی ہے تو بس ایک خواب معلوم ہوتی ہے!

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (۱۱۵)

جزاء و سزا صفاتِ الٰہی کا لازمی تقاضا ہے

یعنی اگر تم جزا و سزا سے بے پروا بیٹھے ہو تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم اسی طرح شترِ بے مہار چھوٹے پھرو گے اور ایک دن مر جاؤ گے اور تمہاری واپسی ہماری طرف نہیں ہونی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے یہ سمجھا ہے تو یہیں تم نے بہت ہی غلط سمجھا ہے۔

فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ (۱۱۶)

یہ اپنی صفات کی یاددہانی فرمائی ہے جس سے مقصود اسی مغالطہ کی تردید ہے جس میں جزا و سزا کے یہ منکرین مبتلا تھے۔ فرمایا کہ خدا کی ذات بہت ہی بلند و برتر ہے۔ اس بلند و برتر ہستی کی شان سے یہ بات نہایت بعید ہے کہ وہ کوئی کارِ عبث کرے اور محض کھیل تماشہ کے طور پر ایک پورا جہان پیدا کر ڈالے۔ وہ 'الْمَلِكُ الْحَقُّ' یعنی اس کائنات کا بادشاہِ حقیقی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی رعیت کے درمیان عدل و انصاف نہ کرے اور ظالم و مظلوم دونوں کو یکساں کر دے۔ 'لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ' یعنی اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے تو کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ اس کی پکڑ سے وہ کسی دوسرے کی سعی و سفارش سے اپنے کو بچا لے جائے گا۔ 'رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ' 'عرش' خدا کی حکومت کی تعبیر ہے اور لفظ 'کریم' قرآن میں باعزت اور بافیض کے معنی میں آیا ہے مطلب یہ ہے کہ خدا ایک باعزت اور بافیض عرش کا خداوند ہے تو اس کی حکومت ایک اندھیر نگری کس طرح ہو سکتی ہے!

وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِندَ رَبِّهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (۱۱۷)

یہ اوپر والے توحید کے مضمون کی مزید وضاحت فرما دی کہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی اس کی عبادت میں شریک کرے گا، جب کہ کسی شریک کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے، تو وہ یاد رکھے کہ خدا کے آگے اس کو ایک دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ اور یہ امر بھی وہ یاد رکھے کہ جو لوگ خدا کا کسی کو شریک ٹھہرائیں گے وہ کافر ہیں اور کافر فلاح نہیں پائیں گے۔ 'قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ' سے یہ سورہ شروع ہوئی تھی اور 'لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ' پر ختم ہو گئی۔

وَقُل رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ (۱۱۸)

دعا کے پیرایہ میں اہلِ ایمان کو تسلی و نصرت کی بشارت

یہ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے آپ کے ساتھیوں کو طلبِ مغفرت و رحمت کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ دعا وہی ہے جس کا حوالہ آیت ۱۰۹ میں گزر چکا ہے اور جس کا متکبرین مذاق اڑاتے تھے۔ اس دعا کی تلقین سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اپنے اسی موقف پر ڈٹے رہو اور

یہی دعا کرتے رہو۔ یہی تمھارے لیے مغفرت و رحمت کے دروازے کی کلید ہے۔ یہ دعا کے اسلوب میں اہلِ ایمان کے لیے فتح و نصرت کے ظہور کی بشارت ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللّٰهم اغفر وارحم وانت خیر الرّٰحمین۔

رحمان آباد
۱۰؍ اگست ۱۹۷۳ء

تدبرِ قرآن

۲۴

النّور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱- سورہ کا محل و مقام، عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ اس گروپ کی آخری سورہ ہے ــــ یہ مدنی ہے۔ اس کی حیثیت سابق سورہ ــــــ سورۂ مؤمنون ــــ کے تکملہ اور تتمہ کی ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ اس کی کوئی مثنیٰ سورہ نہیں ہے۔ ہم مقدمہ میں ذکر کر چکے ہیں کہ جو سورتیں اپنی سابق سورہ کے تکملہ و تتمہ کی حیثیت رکھتی ہیں وہ گویا سابق سورہ ہی کا جزو ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کے ساتھ ان کے کسی جوڑے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی مثالیں آگے بھی آئیں گی۔

یہاں سورۂ مؤمنون کی آیات ۱ ــ ۱۱ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں بیان ہوا ہے کہ خدا کے ہاں فوز و فلاح ان اہل ایمان کے لیے ہے جن کی نمازوں میں خضوع و خشوع ہے، جو لغویات سے احتراز کرنے والے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے اور اپنے شہوانی جذبات پر پورا قابو رکھتے ہیں، ان سے مغلوب ہو کر خدا کے مقرر کردہ حدود و قیود کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کا پاس و لحاظ رکھنے والے ہیں۔

جب تک مسلمان مکہ میں رہے ایمان کے یہ اثرات اور تقاضے ظاہر ہے کہ ان کی انفرادی زندگیوں ہی میں ابھر سکتے تھے اس لیے کہ مکہ میں ان کی کوئی اجتماعی تنظیم نہیں تھی لیکن ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ میں مجتمع ہو گئے اور ان کی ایک اجتماعی و سیاسی تنظیم بھی وجود میں آ گئی تب وقت آیا کہ اس ایمان کے تقاضے معاشرتی و سیاسی زندگی میں بھی نمایاں ہوں۔ چنانچہ جس رفتار سے حالات سازگار ہوتے گئے معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کے احکام نازل ہوئے اور ایمان کی اس نورانیت کی جگمگاہٹ، جو اب تک صرف افراد تک محدود تھی، ایک پوری ہیئت اجتماعی پر ضوفگن ہوئی۔

سورۂ نور اسی سلسلہ کی ایک سورہ ہے جس میں وقت کے خاص حالات کے مطابق اہل ایمان کو ان احکام و ہدایات سے آگاہ کیا گیا ہے جو ان کے نو تشکیل معاشرے کو ایمان کے تقاضوں سے منور کرنے اور منافیٔ ایمان مفاسد سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھے۔

اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ عمود کے ساتھ اس کے اجزاء کی مطابقت واضح ہو جائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) جرمِ زنا کی سزا کا بیان اور مسلمان کے لیے کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور کسی مومنہ کے لیے کسی زانی یا مشرک سے نکاح کی ممانعت۔

(۴-۵) قذف کی سزا اور اس کے لیے شہادت کا قانون۔

(۶-۱۰) اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے شریعت کی مطلوبہ شہادت پیش نہ کر سکے تو اس کا فیصلہ فریقین کی قسم سے ہوگا۔ اس قسم کے طریقہ کی وضاحت۔

(۱۱-۲۶) فتنۂ افک کی طرف ایک اجمالی اشارہ اور اس کے تعلق سے ان رخنوں کا سدِباب جو معاشرہ کی تباہی کا سبب ہو سکتے تھے۔ جن منافقین نے یہ فتنہ اٹھایا ان کی پردہ دری اور ان کو وعید۔ جن مسلمانوں نے اس معاملہ میں بے پروائی اور سہل انگاری سے نادانستہ منافقین کے مقصد کو تقویت پہنچائی ان کو تنبیہ کہ وہ آئندہ ان منافقین سے ہوشیار رہیں۔ یہ منافقین مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ کو مجروح کرنے کے درپے ہیں اس وجہ سے مسلمانوں کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ ایک دوسرے کے عزت و ناموس سے متعلق جو بات کوئی ان کے کان میں ڈال دے اس کو لے اڑیں بلکہ انھیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا چاہیے اور کسی کے باب میں کوئی الزام اس وقت تک قبول نہیں کرنا چاہیے جب تک اس کا ثبوت موجود نہ ہو۔

(۲۷-۳۱) اگر کسی مسلمان کو اپنے کسی دوسرے بھائی کے گھر میں جانے کی ضرورت پیش آئے تو وہ چند معین ضابطوں کی پابندی کرے تاکہ گھروں کے اندر بدنگاہی اور شیطان کو در اندازی کی راہ نہ ملے۔ ان ضابطوں کی وضاحت اور اس صورت میں گھر کی خواتین پر جو پابندیاں شریعت نے عائد کی ہیں ان کی تفصیل۔

(۳۲-۳۴) عقدِ بیوگان اور لونڈیوں غلاموں کے نکاح کی تاکید تاکہ معاشرہ شیطان کی رخنہ اندازیوں سے محفوظ رہے۔ غلاموں کو آزادوں کی سطح پر لانے اور غلامی کو ختم کرنے کے لیے مکاتبت کی ہدایت اور مکاتبت کے طلبگار غلاموں کی مالی امداد کی تاکید۔ نیز لونڈیوں سے پیشہ کرانے کی شدت سے ممانعت۔

(۳۵-۴۰) ایمان اور کفر کی تمثیل جس میں واضح فرمایا ہے کہ جس دل کے اندر ایمان ہوتا ہے اس کا ظاہر اور باطن دونوں مطلع انوار بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس نورِ ایمان سے محروم ہوتے ہیں ان کے اندر اور باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

(۴۱-۴۶) آفاق کے دلائل کی روشنی میں ایمان کی دعوت کہ اس کائنات میں متصرفِ حقیقی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ ہر چیز صرف اسی کی حمد و تسبیح کرتی ہے اس وجہ سے انسانوں کا بھی فرض ہے کہ اسی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان لائیں، اس کی عبادت و اطاعت میں کسی اور کو شریک کر کے اپنے آپ

کر اس کے غضب کا مستحق نہ بنائیں۔

(۴۷-۵۴) منافقین کو تنبیہ کہ ان کی یہ منقسم وفاداری کی پالیسی چلنے والی نہیں ہے کہ اپنے مفاد کے حد تک تو وہ خدا اور رسول کا کلمہ پڑھیں اور اگر کوئی بات ان کو اپنے مفاد کے خلاف نظر آئے تو خدا اور رسول کو چھوڑ کر اپنی من مانی کریں۔ اگر فوز و فلاح مطلوب ہے تو یکسوئی کے ساتھ رسول کا ساتھ دیں ورنہ جس وادی میں بھٹکنا چاہتے ہیں اس میں بھٹکتے پھریں، خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اصل چیز ایمان و اطاعت ہے، جھوٹی قسموں سے رسول کو جُل دینے کی کوشش نہ کریں۔ رسول کا کام اللہ کے دین کو پہنچا دینا تھا، وہ اس نے پہنچا دیا۔ اب لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے انجام کو اچھی طرح سوچ لے۔

(۵۵-۵۷) رسول کے راستباز ساتھیوں کو نہایت واضح الفاظ میں زمین کی خلافت کی بشارت کہ تمہارے مخالفین اور دین کے اعداء تمہارا یا تمہارے دین کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ تم نماز کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور پوری دل جمعی کے ساتھ رسول کی اطاعت پر جمے رہو، جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خوف کی حالت کو امن و اطمینان سے بدل دے گا۔

(۵۸-۶۱) پیچھے آیات ۲۷-۳۱ میں گھروں کے اندر کے پردے سے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں، بعد میں انہی سے متعلق کچھ سوالات پیدا ہوئے۔ ان آیات میں ان کے جواب دیے گئے ہیں اور ان کے ساتھ یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ آیات لوگوں کے سوالوں کے جواب میں بعد میں نازل ہوئی ہیں۔

(۶۲-۶۴) خاتمۂ سورہ ـــــ توضیحی آیات کے بعد اصل سلسلۂ کلام، اطاعتِ رسول سے متعلق، جو آیت ۵۶ میں گزرا پھر سامنے آگیا اور اسی اہم مضمون پر یہ عظیم سورہ ختم ہوئی ہے۔ اس خاتمہ میں مسلمانوں کو عموماً اور منافقین کو خصوصاً متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ کا رسول جب کسی اجتماعی کام کے لیے تمہیں بلائے تو اس کے بلانے کو کسی عام شخص کا بلانا نہ سمجھو کہ جی چاہا گئے، جی چاہا نہ گئے اور گئے بھی تو جب جی چاہا اٹھ کے چل دیے۔ بلکہ ضرور جاؤ اور جب تک اجازت نہ ملے اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھو۔ اسی اطاعت میں تمہاری دین و دنیا کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

اس تجزیہ مطالب سے عمود کے ساتھ اس سورہ کے اجزاء کا تعلق اچھی طرح واضح ہو گیا ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُوْرَةُ النُّوْرِ (۲۴)

مَدَنِيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا (۶۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۰

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ (١) اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ
مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ
اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا
طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (٢) اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ
مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ
ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (٣) وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ
يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا
لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (٤) اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا
مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٥) وَالَّذِيْنَ
يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ
اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (٦) وَالْخَامِسَةُ
اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (٧) وَيَدْرَؤُا عَنْهَا

الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۸
وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۹ وَلَوْ
ع لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۱۰ ع

ترجمۂ آیات ۱-۱۰

یہ ایک اہم سورہ ہے جو ہم نے نازل کی ہے اور اس کے احکام ہم نے فرض ٹھہرائے ہیں اور اس میں ہم نے نہایت واضح تنبیہات بھی اتاری ہیں تاکہ تم اچھی طرح یاد رکھو۔ ۱

زانی عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور خدا کے قانون کی تنفیذ کے معاملے میں ان کے ساتھ کوئی نرمی تمھیں دامن گیر نہ ہونے پائے اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر سچا ایمان رکھتے ہو اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے۔ ۲

زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور کسی زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور اہلِ ایمان پر یہ چیز حرام ٹھہرائی گئی ہے۔ ۳

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں، پھر اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کریں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ اصلی فاسق ہیں۔ جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں گے تو اللہ مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور ان کے پاس ان کی ذات کے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ان کی گواہی کا طریقہ یہ ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ وہ سچے ہیں اور پانچویں بار یہ کہیں کہ ان پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹے ہوں۔ اور عورت سے سزا کو یہ چیز دفع کرے گی کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب

ہو اگر یہ شخص سچا ہو۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کا کرم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ توبہ قبول فرمانے والا اور صاحبِ حکمت ہے تو تم اس کی پکڑ میں آجاتے۔ ۴-۱۰

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۱)

سورہ کی اہمیت کا اظہار

یہ سورہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سورۂ مؤمنون کے تکملہ و تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے بغیر کسی خاص تمہید کے محض ایک تنبیہ سے شروع ہو گئی ہے۔ حذفِ مبتدا، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، اس بات کا قرینہ ہے کہ مقصود مخاطب کی ساری توجہ کو خبر پر مرکوز کرانا ہے جس سے اس سورہ کی اہمیت و عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی یہ ایک عظیم سورہ ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے۔ "ہم نے نازل کیا ہے" یعنی اس کو کوئی معمولی چیز اور ہوائی بات نہ سمجھو بلکہ یہ ہمارا اتارا ہوا کلام اور ہمارا نازل کردہ فرمان ہے اس وجہ سے اس کی ہر بات کی تعمیل ہمارے فرمانِ واجب الاذعان کی حیثیت سے کی جائے۔ 'وَفَرَضْنٰهَا' یعنی اس میں جو احکام و ہدایات ہیں ان کی حیثیت فرائض کی ہے، سب بے چون و چرا ان کی اطاعت کریں، کسی معاملہ میں سہل انگاری و بے پروائی کو راہ نہ پانے دیں۔

سورہ کی تنبیہات کی طرف اشارہ

'وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' یہ ان تنبیہات کی طرف اشارہ ہے جو اس سورہ میں احکام و ہدایات کے بیان کے ساتھ ساتھ مقطع کی طرح بار بار وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہوں آیات ۱۰، ۱۴، ۱۷، ۲۰، ۳۴، ۴۶، ۴۴ اور ۵۰۔ ان تنبیہات کا مشترک مقصود یہ ہے کہ یہ احکام جو دیے جا رہے ہیں پورے اہتمام کے ساتھ ان کی پابندی کرو ورنہ یاد رکھو کہ خدا کی پکڑ بڑی ہی سخت چیز ہے۔ اس سورہ میں ان تنبیہات کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے تھی کہ اس میں خاندان و معاشرہ اور تعزیرات و حدود سے متعلق جو احکام دیے گئے ہیں وہ پچھلی امتوں کے لیے مزلّۂ قدم ثابت ہوئے جس کے سبب سے وہ امتیں خدا کے عتاب میں آئیں۔ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا عظیم فضل و احسان ہے کہ اس نے احکام کے ساتھ ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بھی بار بار آگاہ فرما دیا تاکہ لوگ اچھی طرح بیدار و ہوشیار رہیں۔ 'لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' سے اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲)

زنا کی سزا

معاشرے کے انتشار و فساد میں سب سے زیادہ دخل زنا کو ہے اس لیے کہ معاشرہ کے استحکام کا

انحصار رحمی رشتہ کی پاکیزگی اور اس کے ہر قسم کے اختلال و فساد سے محفوظ ہونے پر ہے اور زنا اس رشتہ کی پاکیزگی کو ختم کر کے معاشرے کو صنفی انتشار کی راہ پر ڈال دیتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ ایک پاکیزہ معاشرہ کے بجائے ڈھوروں ڈنگروں کا ایک گلہ بن کے رہ جاتا ہے۔ یہ اختلال و انتشار چونکہ صالح تمدن کی بنیاد کو اکھاڑ دینے والا ہے اس وجہ سے تمام آسمانی مذاہب میں زنا کو ایک مستوجب سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نے بھی بالکل پہلے ہی مرحلہ سے اس انتشار کو روکنے کے لیے احکام دیے۔
چنانچہ نساء کی آیات ۱۵-۱۶ میں اس سلسلہ کے ابتدائی احکام دیے گئے جب کہ حالات حدود و تعزیرات کے نفاذ کے لیے ابھی سازگار نہیں ہوئے تھے اور ساتھ ہی یہ اشارہ فرما دیا گیا کہ اس باب میں قطعی اور آخری احکام بعد میں نازل ہوں گے۔ چنانچہ اس آیت سے وہ وعدہ پورا ہو گیا۔ زانیہ اور زانی دونوں کے لیے یہ حکم ہوا کہ ان کو سو سو کوڑے مارے جائیں۔

تنفیذ حدود کے معاملہ میں مداہنت ایمان کے منافی ہے

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ یہاں 'دین' سے مراد یہی حد ہے جو زنا کی بیان ہوئی ہے۔ یعنی اس کی تنفیذ کے معاملے میں کسی نرمی یا مداہنت یا چشم پوشی کو راہ نہ دی جائے۔ نہ عورت کے ساتھ کوئی نرمی برتی جائے نہ مرد کے ساتھ، نہ امیر کے ساتھ نہ غریب کے ساتھ۔ خدا کے مقرر کردہ حدود کی بے لاگ اور بے رو رعایت تنفیذ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا لازمی تقاضا ہے۔ جو لوگ اس معاملے میں مداہنت اور نرمی برتیں ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان معتبر نہیں ہے۔ یہاں یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ سزا کے بیان میں عورت کا ذکر مرد کے ذکر پر مقدم ہے۔ اس کی وجہ جہاں یہ ہے کہ زنا عورت کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا وہاں یہ بھی ہے کہ صنف ضعیف ہونے کے سبب سے اس کے معاملہ میں جذبۂ ہمدردی کے ابھرنے کا زیادہ امکان ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے یہاں اس کے ذکر کو مقدم کر دیا تاکہ اسلوب بیان ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہے، عورت ہو یا مرد۔

حدود کے معاملہ میں یہود کی مداہنت

حدود کے معاملہ میں اس شدت کے ساتھ تاکید و تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ یہود نے اکثر حدود عملاً بالکل ساقط کر دیے تھے۔ زنا کی سزا ان کی شریعت میں رجم تھی لیکن عملاً صورت یہ تھی کہ اگر کوئی غریب اس جرم میں ماخوذ ہوتا تب تو اس پر یہ سزا نافذ کی جاتی لیکن کوئی امیر اس کا ارتکاب کرتا تو اس سے تعرض نہ کرتے۔ اور اب موجودہ زمانے میں تو یہ مستقل فلسفہ بن گیا ہے کہ جو لوگ جرائم کا ارتکاب

عصر حاضر کا فلسفہ اور اس کی برکات

کرتے ہیں وہ کسی ذہنی بیماری کے سبب سے کرتے ہیں اس وجہ سے وہ مستحق تربیت و اصلاح اور ہمدردی کے ہیں نہ کہ کسی سخت سزا کے۔ اس فلسفہ کی یہ برکت ہے کہ خدا کی زمین گنڈوں اور بدمعاشوں سے بھر گئی ہے اور کسی شریف آدمی کی بھی جان اور عزت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ آپ اپنے ہی ملک کو لیجیے۔ اگر آپ اپنے قانون و امن کے ذمہ داروں کے سامنے زنا کی اس سزا کا ذکر کیجیے جو

اور پر مذکور ہوئی ہے تو، ایمان کے بلند بانگ دعووں کے باوجود، اس کو وحشیانہ کہیں گے اور اگر مصلحت کی وجہ سے وحشیانہ نہ کہیں تو بہرحال اس کو وحشیانہ سمجھتے ہیں لیکن ملک کی صورتِ حال یہ ہے کہ بلا مبالغہ سال میں ہزاروں جانیں اور آبروئیں نہایت بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ، بدمعاشوں کے ہاتھوں اس طرح برباد ہوتی ہیں کہ ان کی خبریں ہر صبح کو اخباروں میں پڑھ پڑھ کر کلیجہ شق ہوتا ہے۔

چوروں اور زانیوں کے لیے تو ان حضرات کے جذبۂ رافت و ہمدردی کا یہ حال ہے کہ یہ ان کے لیے گویا خدائے رحمان و رحیم سے بھی زیادہ مہربان بن گئے ہیں کہ ان کا ہاتھ کاٹنے اور ان کو کوڑے مارنے کے تصور سے ان کا دل کانپتا ہے لیکن ان چوروں اور بدمعاشوں کے ہاتھوں خاندانوں کے خاندان جو آئے دن قتل و نہب اور بے عزتی و ناموسی کا شکار ہو رہے ہیں ان کی مظلومیت پر ان کے دل ذرا نہیں پسیجتے!

اسلامی حدود و تعزیرات کی برکت

اگر یہ حضرات اپنے دعوائے ایمان کی لاج رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو کم از کم دنیا کے تجربات ہی سے کچھ سبق حاصل کریں۔ اسی روئے زمین پر نجد و حجاز اور یمن کی حکومتیں بھی ہیں۔ ان میں اسلامی حدود و تعزیرات نافذ ہیں۔ اس اعداد و شمار کے زمانے میں آسانی سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں چوری، رہزنی، ڈکیتی اور زنا کے کتنے واقعات ہوئے اور کتنے چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے اور کتنے زانیوں کے کوڑے لگائے گئے۔ میرے پاس اعداد و شمار تو نہیں ہیں لیکن عینی شاہدوں کے بیانات بھی میرے علم میں ہیں اور میرا ذاتی مشاہدہ بھی ہے کہ وہاں نہ جرائم کا وجود ہے نہ مجرموں کا۔ یہ صرف اسلامی حدود و تعزیرات کا دبدبہ ہے کہ وہاں نہ چوری اور زنا کے واقعات ہوتے ہیں نہ چوروں کے ہاتھ کاٹنے اور زانیوں کو کوڑے مارنے کی نوبت آتی ہے۔ اگر کبھی کبھار کوئی اکا دکا کوئی واقعہ پیش آ جاتا ہے تو مجرم کو اس کی جو سزا ملتی ہے عوام کی سبق آموزی کے لیے وہی کافی ہوتی ہے۔ اس کے مقابل میں جب ہم اپنے ملک کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو سیدنا مسیح کے الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ "تم نے میرے باپ کے گھر کو چوروں اور ڈاکوؤں کا بھٹ بنا کے رکھ دیا ہے"۔

اسلامی حدود و تعزیرات کا ایک اہم مقصد

'وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' اسلامی حدود و تعزیرات کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ ان سے دوسروں کو عبرت و موعظت حاصل ہو۔ چنانچہ قرآن میں ان کو 'نَكَالٌ' سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی عبرت انگیز سزا کے ہیں۔ اس مصلحت کا تقاضا یہ ہوا کہ یہ سزائیں پبلک میں، مسلمانوں کی ایک جماعت کی موجودگی میں دی جائیں۔ اگر یہ جیلوں کی کوٹھڑیوں میں چپ چپاتے دے دی جائیں تو ان کی یہ مصلحت فوت ہو جاتی ہے۔ 'طَآئِفَةٌ' کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس لفظ کا اطلاق ایک شخص پر بھی ہوتا ہے۔ معلوم نہیں ان حضرات کی اس نادر تحقیق کا ماخذ کیا ہے!

آیت کے عموم پر فقہاء کی بعض قیدیں اور ان کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر

اس آیت کے ظاہر الفاظ کا جہاں تک تعلق ہے وہ تو ہر قسم کے زانی اور ہر قسم کی زانیہ کے لیے عام ہیں لیکن ہمارے فقہاء نے اس عموم پر بعض قیدیں عاید کی ہیں جن میں سے بعض صحیح ہیں، بعض ہمارے نزدیک غلط ہیں اور بعض محتاج تفصیل ہیں۔ اگرچہ ہمارے لیے فقہی مباحث میں زیادہ گھسنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن بعض ضروری باتوں کی طرف اشارہ ناگزیر ہے۔

- ایک یہ کہ اس حد کے اجراء و نفاذ کے لیے دارالاسلام یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک یہ شرط لازمی ہے۔ یہ احکام نازل ہی اس وقت ہوئے ہیں جب اسلامی حکومت مدینہ میں استوار ہو گئی ہے۔
- دوسری یہ کہ یہ حد صرف عاقل و بالغ پر نافذ ہو گی۔ نابالغ اور فاتر العقل اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ بات بھی بالکل بدیہی ہے۔ نابالغ اور مجنون ہر قانون میں مرفوع القلم سمجھے گئے ہیں۔
- تیسری یہ کہ غلام اور لونڈی پر صرف نصف حد جاری ہو گی۔ یہ بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کی دلیل سورۂ نساء آیت ۲۵ میں موجود ہے۔ اصل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں غلاموں کا عقلی و اخلاقی معیار اتنا پست ہو چکا تھا کہ ان کو یک بیک آزادوں کی صف میں نہیں لایا جا سکتا تھا اس وجہ سے ان کے معاملات میں اسلام نے ایک تدریج ملحوظ رکھی۔ یہاں تک کہ جب ان کی ذہنی و اخلاقی حالت بلند ہو گئی تو ان کے لیے مکاتبت کا وہ قانون نازل ہو گیا جو اسی سورہ میں آگے زیرِ بحث آئے گا۔ اس قانون کے بعد ہر ذی صلاحیت غلام کے لیے آزادی کی نہایت کشادہ راہ کھل گئی اور وہ حقوق اور ذمہ داریوں، دونوں میں، دوسروں کے ساتھ برابر کے شریک ہو گئے۔ آگے ہم اس مسئلہ کے بعض اہم پہلو واضح کریں گے۔
- چوتھی قید فقہاء کے ایک گروہ نے یہ عاید کی ہے کہ یہ حد صرف مسلمان پر نافذ ہو گی، غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اسلامی حکومت میں غیر مسلم رعایا اپنے پرسنل لا کے حد تک تو بے شک حکومت کے عام قوانین سے مستثنیٰ ہو گی لیکن حدود و تعزیرات سے، جن کا تعلق ملک کے امن و عدل سے ہے، اس کو مستثنیٰ رکھنا کس طرح ممکن ہے! اگر ایک مسلمان کو بجرمِ زنا آپ کوڑے لگائیں یا رجم کریں اور اسی جرم میں ایک غیر مسلم پر کوئی گرفت نہ کریں یا کوئی دوسری معمولی سزا دیں تو زنا کا سدِّ باب ناممکن ہو گا۔ یہی حال چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا کا ہے۔ اگر ایک اسلامی حکومت چوری کے جرم میں مسلمانوں کے تو ہاتھ کاٹے لیکن اپنی غیر مسلم رعایا کو اس حد سے مستثنیٰ رکھے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ مسلمانوں کو چوری سے روک کر اپنے ملک میں غیر مسلموں کو چوری کا لائسنس دے رہی ہے۔ یہ بات بالبداہت خلافِ عقل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔ آنحضرتؐ

نے بھی غیر مسلموں پر حدود جاری فرمائے اور خلفائے راشدین نے بھی۔ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی ریاست' میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

پانچویں قید تقریباً تمام فقہاء نے اس پر یہ عاید کی ہے کہ اس حد کا تعلق صرف اس زانی سے ہے جس کی شادی نہ ہوئی ہو یا شادی تو ہوئی ہو لیکن ابھی اس نے مباشرت نہ کی ہو۔ رہے وہ جن کی شادی بھی ہو چکی ہے اور جو مباشرت بھی کر چکے ہیں تو ان کے لیے سزا رجم کی ہے۔ اس رجم کا ثبوت وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے لاتے ہیں اور اس طرح وہ اس آیت میں بیان کردہ حد کو کنوارے اور کنواری کے لیے خاص کر دیتے ہیں یا یوں کہیے کہ شادی شدہ زانی اور زانیہ کے حد تک اس کو سنت کے ذریعہ سے منسوخ مانتے ہیں۔

اس آیت پر فقہاء کی یہ قید بڑی اہم ہے۔ اس کو تخصیص کہیے یا نسخ، مجرد اخبار احاد کی بنا پر قرآن کے کسی حکم عام کو اس طرح مقید یا منسوخ کر دینا بہرحال ایک ایسی بات ہے جس پر دل مطمئن نہیں ہوتا۔ چنانچہ خوارج اس نسخ یا تخصیص کو نہیں مانتے، وہ رجم کا انکار کرتے ہیں اور اس حد کو، جو آیت میں مذکور ہوئی ہے، ہر قسم کے زانیوں کے لیے عام مانتے ہیں۔

ان قدیم خوارج سے زیادہ اہم مسئلہ ہمارے جدید خوارج کا ہے۔ قدیم خوارج اس اعتبار سے غنیمت تھے کہ وہ صرف رجم کے منکر تھے۔ جلد کے منکر نہیں تھے۔ لیکن ہمارے جدید خوارج تو جلد کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں بھلا وہ رجم کی بات کب سننے والے ہیں! اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ رجم کا ماخذ قرآن میں کیا ہے اور اس آیت کے حکم اور رجم کے حکم میں تطبیق کی کیا شکل ہے؟ میں پہلے ان روایات پر ایک نظر ڈالوں گا جن سے فقہاء نے رجم پر استدلال کیا ہے۔ اس کے بعد قرآن میں رجم کی سزا کا جو ماخذ ہے اس کی نشان دہی کروں گا اور پھر یہ واضح کروں گا کہ رجم کی سزا کس طرح کے مجرموں کے لیے ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کو یہ سزا دی وہ کس قماش کے لوگ تھے۔ اگرچہ بحث طویل ہو رہی ہے، لیکن ان کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں ہے اس وجہ سے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

رجم کی سزا کے حق میں فقہاء کے استدلال کا ماخذ

فقہاء نے جس روایت کی بنا پر شادی شدہ کے حد تک اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے وہ عبادہ بن صامت سے بدیں الفاظ مروی ہے۔

عن النبی صلی اللہ علیہ	عبادہ بن صامت راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
وسلم خذوا عنی قد	کہ میں اس وقت جو کچھ بتا رہا ہوں اس کو میری طرف سے
جعل اللہ لهن سبیلا	محفوظ کرو۔ زانیہ عورتوں کے باب میں اللہ نے جو حکم نازل
البکر بالبکر جلد مائة	کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ نازل فرما دیا۔ پس اگر مرتکب زنا

وتغریب عام والثیب بالثیب	دونوں کنوارے ہوں تو ان کے لیے سو کوڑوں اور ایک سال کی جلاوطنی
الجلد والرجم۔	کی سزا ہے اور اگر دونوں شادی شدہ ہوں تو کوڑے اور رجم کی سزا ہے۔

اس روایت پر تنقید

اس روایت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کنوارے زانی کے لیے ایک ہی ساتھ کوڑے مارنے کی سزا کا حکم بھی ہے اور ایک سال کی جلاوطنی کا بھی۔ اسی طرح شادی شدہ کے لیے ایک ہی ساتھ کوڑے کی سزا بھی مذکور ہوئی ہے اور رجم کی سزا بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں سزائیں ساتھ ہی دی جائیں گی؟ اس کا جواب ہمارے فقہاء، حنفی اور شافعی دونوں، یہ دیتے ہیں کہ جلد اور رجم دونوں سزائیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں اور حدیث میں کوڑے مارنے کی جو سزا مذکور ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے تعامل سے منسوخ ہوگئی، شادی شدہ کے لیے صرف رجم کی سزا ہے۔

غور کیجیے، عبادہ بن صامت کی یہی روایت ہے جس کے بل پر سورۂ نور کی آیت کو منسوخ ٹھہرایا گیا حالانکہ قرآن کو قرآن کے سوا کوئی دوسری چیز منسوخ نہیں کرسکتی۔ پھر جب حدیث سے بھی بات نہیں بنی تو اس کو دوسری روایات سے منسوخ کر دیا گیا۔ ہمارے فقہاء کی اسی طرح کی باتیں ہیں جن سے لوگوں کے دلوں میں دین کے متعلق بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ میں آگے چل کر دکھاؤں گا کہ اگر روایت پر قرآن کی روشنی میں غور کیا جائے تو قرآن کے ساتھ اس کی مطابقت ہو جاتی ہے۔ نہ کسی چیز کو ناسخ ماننے کی ضرورت پیش آتی ہے، نہ کسی چیز کو منسوخ۔

فقہا کا ایک دوسرا ماخذ

دوسری روایت جو اس سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے، دل پر جبر کرکے، میں اس کو نقل کیے دیتا ہوں۔

عن ابن عباس قال قال عمرؓ	ابن عباس راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے
قد خشیت ان یطول بالناس	کہ جب لوگوں پر کچھ زمانہ گزر جائے گا تو وہ وقت آجائے گا کہ
زمان حتی یقول قائل لانجد	کہنے والے کہنے لگیں گے کہ رجم کی سزا کا ذکر اللہ کی کتاب میں تو
الرجم فی کتاب اللہ فیضلوا	ہم کہیں نہیں پاتے اور اس طرح وہ خدا کے ایک فریضہ کو جو اس
بترك فريضة انزلها الله و	نے نازل فرمایا ہے، ترک کرکے گمراہ ہو جائیں گے حالانکہ ہم نے خود
قد قرأنا الشيخ والشيخة	یہ آیت تلاوت کی ہے الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما
اذا زنيا فارجموهما البتة۔	البتۃ (بوڑھا بوڑھی جب زنا کے مرتکب ہوں تو ان کو لازماً سنگسار کرو)

اس روایت پر تنقید

میں نے جیسا کہ عرض کیا، اس روایت کو نہایت کراہت کے ساتھ، محض اس لیے نقل کیا ہے کہ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے راہ ان الجھنوں کو صاف کرنا ضروری ہے جو زنادقہ کی پھیلائی ہوئی ہیں اور ہمارے مفسرین اور فقہاء کی سادگی کی وجہ سے تفسیر اور فقہ کی کتابوں میں بھی ان کو جگہ مل گئی ہے۔

اس روایت پر غور کیجیے تو ہر پہلو سے یہ کسی منافق کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور مقصود اس کے گھڑنے سے قرآن کی محفوظیت کو مشتبہ ٹھہرانا اور سادہ لوحوں کے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا کرنا ہے کہ قرآن کی

بعض آیات قرآن سے نکال دی گئی ہیں۔

سب سے پہلے اس کی زبان پر غور کیجیے۔ کیا کوئی سلیم المذاق آدمی اس کو قرآن کی ایک آیت قرار دے سکتا ہے؟ اس کو تو قولِ رسولؐ قرار دینا بھی کسی خوش ذوق آدمی کے لیے ناممکن ہے چہ جائیکہ قرآن حکیم کی ایک آیت۔ آخر قرآن کے مخمل میں اس ٹاٹ کا پیوند آپ کہاں لگائیں گے! قرآن کی لاہوتی زبان اور افصح العرب والعجم کے کلام کے ساتھ اس عبارت کا کیا جوڑ ہے!

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کی ایک آیت تھی تو اس کو نکال کس نے دیا جب کہ اس کا حکم یعنی سزائے رجم باقی ہے؟ آیت کو نکال دینے اور حکم کو باقی رکھنے کا آخر کیا تُک ہے؟ اگر یہ قرآن کی ایک آیت تھی اور نکال دی گئی تو یہ اس بات کا ثبوت ہوا کہ رجم کا حکم پہلے تھا پھر منسوخ ہوگیا۔ پھر اس سے رجم کے حق میں استدلال کے کیا معنی!

تیسری بات یہ ہے کہ اس کو اگر صحیح باور بھی کر لیجیے جب بھی اس سے ہمارے فقہار کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ان کو ثبوت چاہیے شادی شدہ زانی کے رجم کا اور اس میں حکم بیان ہوا ہے بوڑھی زانیہ اور بوڑھے زانی کا۔ ہر شادی شدہ کا بوڑھا ہونا تو ضروری نہیں ہے! پھر دعویٰ اور دلیل میں مطابقت کہاں رہی!

بہرحال یہ روایت بالکل بیہودہ روایت ہے اور ستم یہ ہے کہ اس کو منسوب حضرت عمرؓ کی طرف کیا گیا ہے حالانکہ ان کے عہد مبارک میں اگر کوئی یہ روایت کرنے کی جرأت کرتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان کے دُرّے سے نہ بچ سکتا۔ ہمارے فقہار میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ جب وہ اپنے حریف سے مناظرہ پر آتے ہیں تو جو اینٹ پتھر انھیں ہاتھ آجائے وہ اس کے سر پر دے مارتے ہیں۔ پھر یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی زد خود دین پر کہاں تک پڑتی ہے۔

رجم کی سزا کا ماخذ اور اس کا محل

رجم کے ثبوت میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ یہی ہیں اور ان کا جو حال ہے وہ اوپر بیان ہو چکا۔ اب سوال یہ ہے کہ رجم کی سزا کا ماخذ کیا ہے؟ کس قسم کے مجرموں کے لیے یہ سزا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح کے زانیوں کو یہ سزا دی؟ ان سوالات پر غور کرنا اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ بات بالبداہت معلوم ہے کہ رجم کی سزا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض مجرموں کو دی اور خلفائے راشدین نے بھی دی۔ جو لوگ اس امرِ واقعی کا انکار کرتے ہیں وہ ہر چیز کا انکار کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے مجھے ان کی زیادہ فکر نہیں ہے البتہ چونکہ میں خود رجم کی سزا کا قائل ہوں اس وجہ سے ہیں قرآن سے اس سزا کا ماخذ اور اس کا موقع و محل واضح کرنا اپنی ایک ذمہ داری سمجھتا ہوں۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک تمہید اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔

مجرموں کی دو قسمیں

مجرم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جن سے چوری یا قتل یا زنا یا قذف کا جرم صادر ہو جاتا ہے لیکن ان کی نوعیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ معاشرہ کے لیے آفت اور وبال (NUISANCE) بن جائیں یا حکومت

کے لیے لا اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جو اپنی انفرادی حیثیت میں بھی اور جتھہ بنا کر بھی معاشرے اور حکومت دونوں کے لیے آفت اور خطرہ بن جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے مجرموں کے لیے قرآن میں معین حدود اور قصاص کے احکام ہیں جو اسلامی حکومت انہی شرائط کے مطابق نافذ کرتی ہے جو شرائط قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری قسم کے مجرمین کی سرکوبی کے لیے احکام سورۂ مائدہ کی آیات ۳۳-۳۴ میں دیے گئے ہیں اور ان کی تفصیل ہم ان کے محل میں کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے 'اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا' کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ آگے کی بحث کے لیے راہ صاف ہو جائے ہمارے الفاظ یہ ہیں۔

جرم کی نوعیت کے مطابق سزا

"اللہ و رسول سے محاربہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھہ جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظامِ حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول نے قائم فرمایا ہے۔ اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ و جہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کے ان اندرونی دشمنوں کی سرکوبی کے لیے تعزیرات کا ضابطہ بیان ہو رہا ہے جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوتے ہوئے، عام اس سے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم، اس کے قانون اور نظم کو چیلنج کریں۔ قانون کی خلاف ورزی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کرے، اپنے شر و فساد سے علاقے کے امن و نظم کو درہم برہم کر دے، لوگ اس کے ہاتھوں ہر وقت اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف سے خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اس نوع کے سنگین جرائم حکومت کے لیے لا اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطۂ حدود و تعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کی مجاز ہے۔"

اس کے بعد ہم نے رجم کا ماخذ ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

'اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا' یہ کہ فساد فی الارض کے یہ مجرمین قتل کر دیے جائیں۔ یہاں لفظ 'قتل' کے بجائے 'تقتیل' باب تفعیل سے استعمال ہوا ہے۔ باب تفعیل معنی کی شدت اور کثرت پر دلیل ہوتا ہے اس وجہ سے 'تقتیل' 'شر تقتیل' کے معنی پر دلیل ہو گا۔ اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ ان کو عبرت انگیز اور سبق آموز طریقہ پر قتل کیا جائے جس سے دوسروں کو سبق حاصل ہو۔ صرف وہ طریقہ اس سے مستثنیٰ ہو گا جو شریعت میں ممنوع ہے مثلاً آگ میں جلانا۔ اس کے ماسوا دوسرے طریقے جو گنڈوں

اور بدمعاشوں کو عبرت دلانے، ان کو دہشت زدہ کرنے اور لوگوں کے اندر قانون اور نظم کا احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھے جائیں، حکومت ان سب کو اختیار کر سکتی ہے۔ رجم یعنی سنگسار کرنا بھی ہمارے نزدیک 'تقتیل' کے تحت داخل ہے۔ اس وجہ سے وہ گنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کے عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائیں، جو زنا اور اغوا کو پیشہ بنالیں، جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت و آبرو پر ڈاکہ ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔"

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں رَجم کی سزا کا کوئی ذکر نہیں ہے، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ اس سزا کا ذکر سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ سے ماخوذ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت میں رَجم کے جو واقعات پیش آئے ان کی اس مخصوص نوعیت کے پیشِ نظر امام بخاریؒ نے اپنی 'الجامع الصحیح' میں انہیں آیتِ محاربہ کے تحت بیان کیا ہے اور 'کتاب المحاربین' ہی میں ایک ایسی روایت بھی لائے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں بعض لوگ رجم کی سزا کا ماخذ سورۂ مائدہ کی اس آیت کو سمجھتے تھے۔

اب آیئے ایک اجمالی نظر ان بعض واقعات پر بھی ڈال لیجیے جو عہدِ رسالت میں اس سزا کے نفاذ کے پیش آئے ہیں۔

ماعز کے جرم کی نوعیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں رَجم کا سب سے زیادہ مشہور واقعہ ماعز کے رجم کا ہے۔ اس شخص کے بارے میں کتابوں میں جو روایات ملتی ہیں ان میں نہایت عجیب قسم کا تناقض ہے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑا بھلا مانس تھا اور بعض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت بدخصلت گنڈا تھا۔ میری رہنمائی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رَجم کی سزا دلوائی اور اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی۔ اس وجہ سے میں ان روایات کو ترجیح دیتا ہوں جن سے اس کا وہ کردار سامنے آتا ہے جس کی بنا پر یہ مستحقِ رَجم ٹھہرا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کسی غزوہ کے لیے نکلتے تو یہ پیچھے سے دبک کے بیٹھ رہتا اور مردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر شریف بہوؤں بیٹیوں کا تعاقب کرتا۔ بعض روایات سے اس تعاقب کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے کہ اس طرح تعاقب کرتا جس طرح بکرا بکریوں کا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی شرارتوں کی رپورٹ ملتی رہی، لیکن چونکہ کسی صریح قانون کی گرفت میں یہ نہیں آیا تھا اس وجہ سے آپؐ نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ بالآخر یہ قانون کی گرفت میں آگیا۔ آپؐ نے اس کو بلوا کر نہایت تیکھے انداز میں پوچھ گچھ کی۔ وہ تاڑ گیا کہ اب بات چھپانے سے نہیں چھپ سکتی اس وجہ سے اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ جب یہ اقرار کر لیا تو آپؐ نے اس کے رَجم کا حکم دے دیا اور اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی۔ اس کے رجم کے بعد لوگوں کا عام تاثر، جو روایات سے معلوم ہوتا ہے، وہ یہ تھا کہ بہت سے لوگوں نے یہ کہا کہ اس شخص کی شامت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ یہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کے بعد اس کے بارے میں لوگوں کو کفِ لسان کی ہدایت فرمائی، لیکن عام تاثر لوگوں کا یہی تھا۔

یہاں ہم چند روایات اُن کے اصل الفاظ میں نقل کر رہے ہیں تاکہ حسبِ ذیل امور بالکل واضح ہو کر سامنے آجائیں :

ایک یہ کہ ماعز نے بھلے مانسوں کی طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا تھا، بلکہ وہ اپنے قبیلہ والوں کے اصرار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں، اس توقع پر آیا کہ خود حاضر ہو جانے سے غالباً وہ کسی بڑی سزا سے بچ جائے گا، حضورؐ کو اس کے جرم کی اطلاع پہلے سے مل چکی تھی اور اس نے آپؐ کی پوچھ گچھ کے نتیجے میں اقرارِ جرم کیا۔

دوسرے یہ کہ اس کا کردار ایک نہایت بدخصلت گنڈے کا کردار تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کسی غزوہ کے لیے نکلتے تو مردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر یہ جنس زدہ بدمعاشوں کی طرح عورتوں کا تعاقب کرتا۔

تیسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مغفرت کے لیے دعا کی نہ اس کا جنازہ پڑھا جو اس بات کی شہادت ہے کہ اس کو کٹر منافق قرار دیا گیا۔

روایات یہ ہیں :

(۱) .... قال: یا ابن اخی، انا اعلم الناس بهذا الحديث، كنت فيمن رجم الرجل، انا لما خرجنا به فرجمناه فوجد مس الحجارة، صرخ بنا: يا قوم ردوني الى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فان قومي قتلوني، وغروني من نفسي، واخبروني ان رسول الله صلى الله عليه وسلم غير قاتلي، فلم ننزع عنه حتى قتلناه، فلما رجعنا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم واخبرناه، قال: فهلا تركتموه وجئتموني به، ليستثبت رسول الله صلى الله عليه وسلم منه، فاما لترك حد فلا، قال: فعرفت وجه الحديث۔

(ابوداؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالك)

.... حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: 'بھتیجے! میں سب لوگوں سے زیادہ اس بات سے واقف ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے اس شخص کو رجم کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ ہم نے اسے باہر لا کر سنگسار کرنا شروع کیا۔ پتھر پڑے تو وہ چیخا 'لوگو! مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لے چلو۔ میرے قبیلے کے لوگوں نے مجھے مروا دیا۔ انھوں نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ وہ مجھے یہی کہتے رہے کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے قتل نہیں کرائیں گے۔' لیکن ہم نے اسے قتل کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ پس جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوٹے اور آپؐ کو اس جزع فزع کے بارے میں بتایا تو آپؐ نے فرمایا: 'تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا؟ تم اسے میرے پاس کیوں نہیں لائے؟' یہ آپؐ نے اس لیے فرمایا کہ آپ حقیقت معلوم کر سکیں۔ آپؐ نے یہ بات حد ساقط کرنے کے لیے نہیں فرمائی تھی، راوی بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد یہ حدیث میری سمجھ میں آگئی۔

(ب) .... فرميناه بجلاميد الحرة (يعني الحجارة) حتى سكت، قال: ثم قام رسول الله صلى الله عليه وسلم خطيبًا من العشي، فقال: اوكلما انطلقنا غزاة في سبيل الله، تخلف رجل في عيالنا له نبيب كنبيب التيس، على ان لا اوتى برجل فعل ذالك الا نكلت به. قال: فما استغفرله ولا سبه.

(صحيح مسلم، كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزناء)

'پس ہم نے اسے وادیٔ حرّہ کے پتھروں سے مارا، یہاں تک کہ وہ ختم ہوگیا۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ اسی دن عصر کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا: 'کیا ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب کبھی ہم جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے نکلتے تھے تو ایک ایسا شخص پیچھے ہمارے اہل وعیال میں رہ جاتا تھا جو شہوت کے جوش میں بکرے کی طرح ممیاتا تھا۔ سنو، مجھ پر لازم ہے کہ اس طرح کی حرکتیں کرنے والا کوئی شخص میرے پاس لایا جائے تو میں اسے عبرت ناک سزا دوں۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ آپ نے نہ اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور نہ اسے برا بھلا کہا۔

(ج) عن ابن عباسؓ ان ماعز بن مالك اتى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: انه زنى، فاعرض عنه، فاعاد عليه مرارًا، فسأل قومه: أمجنون هو؟ قالوا: ليس به باس. قال: افعلت بها؟ قال: نعم، فامر به ان يرجم، فانطلق به فرجم ولم يصل عليه.

(ابوداود، كتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالك)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ماعز بن مالک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو اس نے اقرار کیا کہ اس نے زنا کیا ہے۔ آپ نے اعراض کیا تو اس نے اپنا یہ اقرار کئی مرتبہ دہرایا۔ اس پر بھی آپ متامل رہے۔ پھر آپ نے اس کی قوم کے لوگوں سے پوچھا: کیا یہ پاگل ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، یہ بھلا چنگا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا: کیا تم نے واقعی اس لڑکی سے بدکاری کی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! پس آپ نے حکم دیا کہ اسے رجم کردیا جائے چنانچہ اسے لے جایا گیا اور رجم کردیا گیا اور اس کا جنازہ نہیں پڑھا گیا۔

(د) .... فامر به فرجم فكان الناس فيه فرقتين، قائل يقول لقد هلك لقد احاطت به خطيئته.

(صحيح مسلم، كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزناء)

.... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کے بارے میں حکم دیا اور اسے رجم کردیا گیا تو لوگ اس کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے ایک کی رائے تھی کہ اس کی شامت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ یہ ہلاک ہوگیا۔

(ھ) .... فامر به فرجم. فسمع النبي صلى الله عليه وسلم رجلين من اصحابه يقول احدهما لصاحبه: انظر

.... پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کے بارے میں حکم دیا تو اسے رجم کردیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے

الٰی ھٰذا الذی ستر اللّٰہ علیہ فلم تدعد نفسہ حتٰی رجم رجم الکلب۔ (ابوداود، کتاب الحدود، باب رجم ماعزبن مالک)

سنا: اس بدبخت کو دیکھو، اللہ نے اس کا پردہ ڈھانکے رکھا تھا، لیکن اس کے نفس نے اس کو نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ کتے کی طرح سنگ سار کر دیا گیا۔

غامدیہ کا واقعۂ رجم

ماعزؓ بن مالک اسلمی کے بعد دوسرا بڑا واقعہ غامدیہ کا ہے جو قبیلۂ غامد (قبیلۂ جُہَینہ کی ایک شاخ) کی ایک عورت تھی۔ اس کے بارے میں روایات میں جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے نہ اس کے کردار کے بارے میں کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ تھی۔ تھوڑی بہت تفصیلات جو بیان ہوئی ہیں، ان میں ماعزؓ کے واقعہ ہی کی طرح بہت سے امور باہم متناقض ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں اسے ٹالنے کی کوشش کی، لیکن یہ اپنے اقرار پر مُصِر رہی تو آپ نے فرمایا: 'اچھا، نہیں مانتی تو جاؤ، وضعِ حمل کے بعد آئیو'۔ حمل سے فارغ ہو کر وہ بچے کے ساتھ آئی تو آپ نے فرمایا: 'جا اور اس کو دودھ پلا، دودھ چھٹانے کے بعد آئیو'۔ پھر وہ دودھ چھٹانے کے بعد آئی تو اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا جو اس نے بچے کو کھلا کر حضورؐ کو دکھایا۔ تب آپ نے اس کے رجم کا حکم صادر فرمایا۔ اس کے برعکس بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اقرار کیا تو آپ نے اسے وضعِ حمل تک ایک انصاری کی نگرانی میں دے دیا۔ وضعِ حمل کے بعد اس نے اطلاع دی تو آپ نے فرمایا: 'اسے اس حالت میں رجم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے چھوٹے بچے کو کوئی دودھ پلانے والا بھی نہیں'۔ اس پر انصار میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا: 'اس کی رضاعت کی ذمہ داری مجھ پر ہے'، اس کے بعد آپ نے بغیر کسی توقف کے اس کے رجم کا حکم دے دیا۔

روایات کے مطالعہ سے بیان کا یہ تناقض ہی سامنے نہیں آتا، یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کوئی آزاد قسم کی عورت تھی، جس کا نہ کوئی شوہر تھا، نہ سرپرست جو اس کے کسی معاملے کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ہوتا۔ وضعِ حمل تک کی مدت اس نے ایک انصاری کے ہاں گزاری، اس کے اقرار سے لے کر سزا کے نفاذ تک، کسی موقع پر بھی اس کے خاندان یا قبیلہ کا کوئی آدمی مقدمہ کی کارروائی کے سلسلہ میں سامنے نہیں آیا۔ اگرچہ غامدیہ کے کردار کے بارے میں روایات محفوظ نہیں ہو سکیں، لیکن ہمارے نزدیک اس کا معاملہ بھی ماعزؓ کی طرح کا تھا جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رجم کرایا۔

اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بہت سی ڈیرے دالیاں ہوتی تھیں جو پیشہ کراتی تھیں اور ان کی سرپرستی زیادہ تر یہودی کرتے تھے جو ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسلامی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ان لوگوں کا بازار سرد پڑ گیا، لیکن اس قسم کے جرائم پیشہ آسانی سے باز نہیں آتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قماش کے کچھ مرد اور بعض عورتیں زیرِ زمین یہ پیشہ کرتے رہے اور تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے۔ بالآخر جب وہ قانون کی گرفت میں آئے تو سورۂ مائدہ کی اسی آیتِ محاربہ کے تحت جس کا حوالہ اوپر گزرا، آپ نے ان کو رجم کرایا۔

زنا بالجبر کے مجرم کو رجم کی سزا

زنا بالجبر کا جرم بھی چونکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے حرابہ اور فساد فی الارض ہی کے قبیل سے ہے، اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مرتکب کو، مجرد زنا کی سزا یعنی سو کوڑے کے بجائے سورۂ مائدہ کی آیتِ محاربہ کے تحت رجم ہی کی سزا دی ہے۔ اس مقدمہ میں مجرم، نماز کے لیے جاتی ہوئی ایک خاتون پر سرِراہ حملہ آور ہونے کی وجہ سے چونکہ کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا، اس لیے آپؐ نے اس کے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کے بارے میں بھی کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ حدیث میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے۔

عن علقمۃ بن وائل عن ابیہ، ان امرأۃ خرجت علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ترید الصلوٰۃ، فتلقاھا رجل، فتجللھا فقضی حاجتہ منھا، فصاحت، وانطلق فمرّ علیھا رجل، فقالت: ان ذاک فعل بی کذا وکذا۔ ومرّت عصابۃ من المھاجرین فقالت: ان ذلک الرجل فعل بی کذا وکذا، فانطلقوا، فاخذوا الرجل الذی ظنت انہ وقع علیھا فاتوھا بہ فقالت: نعم، ھو ھذا، فاتوا بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فلما امر بہ قام صاحبھا الذی وقع علیھا، فقال: یا رسول اللہ، انا صاحبھا، فقال لھا: اذھبی فقد غفر اللہ لکِ، وقال للرجل قولاً حسناً۔ وقال ابوداؤد: یعنی الرجل الماخوذ، وقال للرجل الذی وقع علیھا: ارجموہ۔

(ابوداؤد، کتاب الحدود، باب فی صاحب الحد یجیٔ فیقر، والترمذی، ابواب الحدود)

علقمہ بن وائل اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نکلی تو راستے میں ایک شخص نے اسے دیکھا۔ پس اس نے اس پر غلبہ پالیا اور اپنے نفس کی پیاس بجھائی۔ اس پر وہ چیخی چلائی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی اثنا میں ایک آدمی کا گزر اس طرف سے ہوا تو اس عورت نے اسے بتایا کہ ایک شخص نے اس طرح اسے رسوا کیا ہے۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ مہاجرین میں سے ایک گروہ بھی اس طرف آنکلا۔ اس نے انہیں بھی اپنی روداد سنائی تو وہ بھاگے اور اس شخص کو پکڑ لیا جس کے بارے میں اس عورت کا خیال تھا کہ اس نے اس سے زیادتی کی ہے۔ پس وہ اسے اس کے پاس لے آئے تو اس نے کہا: ہاں، یہ وہی ہے۔ چنانچہ وہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے تو آپؐ نے بلا تامل اسے سزا دینے کا حکم دے دیا۔ یہ دیکھ کر اصل مجرم کھڑا ہوگیا اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ میں تھا جس نے اس عورت سے زیادتی کی، اس پر آپؐ نے اس عورت سے کہا: 'جا، اللہ نے تجھے معاف کر دیا'، اور اس شخص سے کلماتِ خیر فرمائے جو شبہ میں پکڑا گیا تھا، پھر اس شخص کے بارے میں جس نے اس عورت سے بدکاری کی تھی، فرمایا: 'اسے رجم کردو'۔

خلاصۂ بحث

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رجم کی سزا کے جو واقعات احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں وہ عام قسم کے زانیوں کے واقعات نہیں ہیں، بلکہ ان بدمعاشوں کے واقعات ہیں جو اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں، کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اور اس فعل قبیح کو بطور پیشہ کے اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ قانون کے ہاتھ ان کی گردن تک پہنچنے والے ہیں تو اس قبیل کے مجرموں کی عام نفسیات کے مطابق اعتراف واقرار کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں تاکہ معاشرے اور قانون، دونوں کی ہمدردیاں حاصل کرسکیں۔ رہی یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجرموں کے شادی شدہ ہونے کی تحقیق بھی فرمائی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے قوانین کی طرح اسلامی شریعت کا بھی یہ مسلمہ اصول ہے کہ حدود و تعزیرات کے نفاذ میں مجرم کے احوال کی رعایت کی جانی چاہیے۔ اس رعایت میں عمر، شادی، دماغی حالت، ماحول، غرض ہر وہ چیز جو جرم کی محرک یا اس کے ارتکاب میں رکاوٹ بن سکتی ہے، عدالت کے پیش نظر رہے گی۔ احادیث میں 'ثیب'، 'بکر' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کا اطلاق عربیت کی رو سے جس طرح شادی شدہ اور غیر شادی شدہ پر ہوتا ہے، اسی طرح پختہ عمر کے آدمی اور الھڑ نوجوان پر بھی ہوتا ہے۔ ہمارے فقہاء کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے مجرم کی حالتوں میں سے ایک حالت کو مناطِ حکم قرار دے دیا، درآں حالیکہ اس کا تعلق مناطِ حکم سے نہیں ہے، اس طرح کی چیزیں تو ہر جرم کی سزا نافذ کرتے وقت ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ لہٰذا آیت زیر بحث کو جو لوگ منسوخ مانتے ہیں، ان کا خیال ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ قرآن کی کوئی آیت قرآن کے سوا کسی دوسری چیز سے منسوخ نہیں ہوتی ہے اور یہ ناسخ و منسوخ، دونوں قرآن میں موجود ہیں۔ منسوخ ہونا تو الگ رہا، اگر کسی آیت کی تحدید و تخصیص بھی ہوئی ہے تو اس کے قرائن و اشارات یا تو آیت کے سیاق و سباق اور اس کے موقع و محل میں مضمر ہیں یا خود قرآن کے دوسرے مقامات میں موجود ہیں۔

عبادہ بن صامتؓ کی روایت کا صحیح محل

اس روشنی میں اگر عبادہ بن صامتؓ کی روایت کی تاویل کیجیے تو اس کا بھی ایک موقع و محل نکل آتا ہے۔ وہ یوں کہ اس میں جو حرف 'او' ہے اس کو جمع کے بجائے تقسیم کے مفہوم میں لیجیے یعنی کوئی زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ، دونوں کی اصل سزا تو جلد (تازیانہ) ہی ہے لیکن اگر کوئی کنوارا تازیانہ کی سزا سے قابو میں نہیں آرہا ہے تو حکومت اس کو، اگر مصلحت دیکھے، مائدہ کی مذکورہ بالا آیت کے تحت جلاوطنی کی سزا بھی دے سکتی ہے اس لیے کہ اس آیت میں 'نفی' (جلا وطنی) کا اختیار بھی حکومت کو دیا گیا ہے۔ اسی طرح شادی شدہ زانی کی اصل سزا، جیسا کہ روایت سے واضح ہے، ہے تو تازیانہ ہی لیکن اگر کوئی شخص تازیانہ کی سزا سے قابو میں نہیں آرہا ہے اور معاشرے کے لیے ایک خطرہ بن چکا ہے تو اس کو حکومت تقتیل یعنی رجم کی سزا از روئے سورۂ مائدہ دینے کا اختیار رکھتی ہے۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً ؗ وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (۳)

خبر نہی کے مفہوم میں

'لَا یَنْکِحُ' یہاں خبر کے مفہوم میں نہیں بلکہ نہی کے مفہوم میں ہے۔ نہی کے اندر جب نہی کے ساتھ ارشاد و موعظت کا مفہوم بھی ہو تو وہ خبر کی صورت میں آتی ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت بقرہ ۲۲۸ کے تحت ہو چکی ہے۔ یہاں مقصود مسلم معاشرہ کی حسِ ایمانی کو بیدار کرنا ہے کہ تمہارے اندر زنا سے وہ

نفرت و بیزاری ہونی چاہیے کہ کوئی زانی اگر تمہارے اندر نکاح کرنا چاہے تو کوئی صاحبِ ایمان اس کو اپنی بیٹی دینے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس کو اگر نکاح کے لیے ملے تو کوئی زانیہ یا مشرکہ ہی ملے، کوئی مومنہ اپنے آپ کو اس کے حبالۂ عقد میں دینے پر راضی نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی زانیہ ہو تو کوئی باایمان اس سے نکاح نہ کرے۔ اس کو اگر کوئی نکاح کے لیے ملے تو کوئی زانی یا مشرک ہی ملے، کوئی مسلمان اس نجاست کو اپنے گھر میں لانے پر راضی نہ ہو۔ فرمایا کہ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ' زانیوں اور زانیات کے ساتھ ازدواجی رشتہ اہل ایمان کے لیے حرام ہے۔

زنا اور شرک کی باہمی مشابہت

آیت میں زانی اور مشرک اور زانیہ اور مشرکہ کا ایک ساتھ ذکر بڑا معنی خیز ہے۔ زنا اور شرک کی باہمی مشابہت پر ہم اس کتاب میں جگہ جگہ لکھ چکے ہیں۔ قدیم آسمانی صحیفوں میں مشرک کو چھنال عورت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہم اس کے محل میں اس تشبیہ کی بلاغت واضح کر چکے ہیں۔ زنا اسی طرح کی اخلاقی نجاست ہے جس طرح کی عقائدی نجاست شرک ہے۔ قرآن میں اسی وصفی اشتراک کی وجہ سے شرک اللہ مشرکین کو نجس کہا بھی گیا ہے۔

مسلم معاشرہ کی حسِ ایمانی کی بیداری کی ضرورت

معاشرہ کی ایمانی حس کو بیدار کرنے کی یہ ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مجرد قانون، خواہ وہ کیسا ہی بے لاگ اور حکیمانہ ہو، معاشرہ کی حفاظت اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک خود معاشرہ کے اندر برائی سے نفرت موجود نہ ہو۔ ہر قانون کے نفاذ کے لیے، بالخصوص جب کہ وہ ایک سخت قانون بھی ہو، لازماً ایسی شرطیں ہوتی ہیں کہ بہت سے مجرمین اپنے آپ کو اس کی زد سے بچائے رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے مجرمین سے نمٹنا خود معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو اپنی آنکھوں میں جگہ نہ دے بلکہ وہ جہاں بھی رہیں نکو بن کے رہنے پر مجبور ہوں۔ اگر وہ کسی شریف مسلمان سے رشتہ داری کے خواہش مند ہوں تو وہ ان کی درخواست ٹھکرا دے یہاں تک کہ اس طرح کے لوگ کسی شریف خاندان میں قرابت کا حوصلہ ہی نہ کر سکیں۔ یہ بیداری جرائم کے سدِباب کے لیے ناگزیر شے ہے۔

اس دور کی آفات میں سے صرف یہی ایک آفت نہیں ہے کہ حدود و تعزیرات اسلامی نہیں ہیں بلکہ اس سے بڑی آفت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر حسِ اسلامی نہیں ہے۔ اس زمانے میں اگر کوئی اپنی لڑکی کے لیے بر تلاش کرتا ہے تو اس کے اندر تمام وہ اوصاف تلاش کرتا ہے جو دنیاوی وجاہت کے پہلو سے ضروری خیال کیے جاتے ہیں لیکن بہت تھوڑے لوگ اب ایسے رہ گئے ہیں جو معاملہ کے اس پہلو کو نگاہ میں رکھتے ہوں جس کی طرف آیت میں رہنمائی فرمائی گئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴-۵)

قذف کے معاملہ میں شہادت اور سزا کا قانون

اب یہ قذف کے معاملہ میں شہادت اور سزا کا قانون بیان ہو رہا ہے کہ شریف اور آزاد مومنات پر جو لوگ زنا کی تہمت لگائیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جرم کے چار عینی شاہد پیش کریں۔ اگر وہ چار گواہ معتبر نہ پیش کر سکیں تو پھر حکم ہے کہ ان کو اسّی کوڑے مارو اور ہمیشہ کے لیے ان کو ساقط الشہادت قرار دے دو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اسلامی معاشرہ میں کسی کا ہمیشہ کے لیے مردود الشہادۃ قرار دے دیا جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ معاشرے کے اندر یہ اس کی عرفی حیثیت کے بالکل ختم ہو جانے کے ہم معنی ہے۔ اس امت کا اصلی مرتبہ یہ ہے کہ یہ 'شُهَدَآءُ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ' ہے۔ اگر کوئی شخص ساقط الشہادت قرار دے دیا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس امت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس کو جو اصلی سرفرازی حاصل ہوئی تھی وہ اس نے کھو دی۔

'اَلَّذِيْنَ' اگرچہ مذکر کے لیے آتا ہے لیکن اگر کوئی عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس حکم سے مستثنیٰ رہے اس وجہ سے یہ لفظ عورت اور مرد دونوں کے لیے علیٰ سبیل التغلیب عام ہوگا۔

لفظ 'مُحْصَنٰتُ' اس طرح کے سیاق میں 'حرایر' یعنی لونڈیوں کے مقابل میں شریف زادیوں کے لیے آتا ہے اس وجہ سے جو لوگ لونڈیوں اور غلاموں کے معاملے میں اس کی نصف سزا کے قائل ہیں ان کی بات مبنی بر دلیل ہے۔

توبہ اور اصلاح کے بعد اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس طرح کے لوگوں کے گناہ تو معاف ہو جائیں گے لیکن جہاں تک ساقط الشہادت ہونے کا تعلق ہے یہ چیز بدستور باقی رہے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ توبہ کا تعلق انسان کے دل سے ہے اور دل کا حال صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ آیت کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ مغفرت کا تعلق صرف توبہ سے ہے 'شہادت' سے اس کا تعلق نہیں ہے وہ ساقط الشہادت 'اَبَدًا' یعنی عمر بھر کے لیے رہیں گے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

لعان کا ضابطہ

اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور اس کی ذات کے سوا اس کے پاس کوئی گواہ نہ ہو تو اس صورت میں معاملہ کا فیصلہ قسم سے ہوگا۔ اس کو اصطلاحِ شریعت میں 'لعان' کہتے ہیں۔ اس کی شکل یہ ہوگی کہ مرد چار بار اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے گا کہ میں جو الزام لگا رہا ہوں اس میں سچا ہوں۔ پانچویں

بار یہ کہے گا کہ اگر وہ جھوٹا الزام لگا رہا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اگر عورت مرد کی اس قسم کی کوئی مدافعت نہ کرے تو اس پر زنا کی وہی حد جاری ہو جائے گی جو اوپر مذکور ہوئی ہے۔ اور اگر وہ اس الزام کو تسلیم نہیں کرتی تو اس کے لیے سزا سے بریت اس صورت میں ہو گی جب وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر یہ شخص سچ کہہ رہا ہے۔

'وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ' میں 'عذاب' سے مراد ظاہر ہے کہ وہی حد ہے جو اوپر آیت ۲ میں مذکور ہوئی ہے۔ اس کے سوا کسی اور سزا کو اس سے مراد لینا عربیت کے بالکل خلاف ہو گا۔

اگر کسی میاں بیوی کے درمیان ایک دوسرے کی تکذیب اور باہدگر ملاعنت کا یہ واقعہ پیش آ جائے تو فقہاء کی یہ رائے ہے کہ قاضی ان کے درمیان تفریق کرا دے گا۔ یہ رائے مبنی بر حکمت معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ معاملہ اس حد تک خراب ہو جانے کے بعد ان کے درمیان اس سازگاری کی توقع نہیں کی جا سکتی جو میاں بیوی کی طرح زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ (۱۰)

ایک تنبیہ — یہ آیت، جیسا کہ پہلی آیت میں اشارہ ہو چکا ہے، بطور تنبیہ و تذکیر ہے اور اس میں جواب شرط عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق، محذوف ہے۔ آگے آیت ۱۴ میں اس محذوف کو کھول بھی دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کے فضل و رحمت اور اس کے تواب و حکیم ہونے کی برکت ہے کہ وہ تم کو یہ روشن ہدایات اور واضح و پُرحکمت احکام دے رہا ہے کہ تمہارے لیے توبہ و اصلاح کی راہ کھلے ورنہ تم جس روش پر چل پڑے تھے یہ تو خدا کے غضب کو دعوت دینے والی تھی۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ احکام اس زمانہ میں نازل ہوئے ہیں جب مسلمانوں کے اندر، منافقین کی ریشہ دوانیوں سے، بعض نہایت سخت قسم کی، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، کمزوریاں ظاہر ہوئی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کمزوریوں پر سزا دینے کے بجائے اپنے فضل و رحمت سے ان کو ان احکام و ہدایات کے نزول کا سبب بنا لیا جو اسلامی معاشرہ کو شیاطین و منافقین کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۱-۲۶

آگے فتنۂ افک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس موقع پر مسلمانوں کی ایک جماعت سے صادر ہوئیں کہ وہ بھی منافقین کے اٹھائے ہوئے فتنہ میں نادانستہ شریک ہو گئے اور بے سوچے سمجھے اسی طرح کی باتیں بولنے لگے جس قسم کی باتیں منافقین پھیلانی چاہتے تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کے باہمی تعلق کی بنیاد اعتماد اور کامل حسن ظن پر ہونی چاہیے۔ اگر کوئی مسلمان اپنے دوسرے بھائی بہن کی نسبت کوئی بُری

بات سنے تو اس وقت تک وہ اس کو قبول نہ کرے اور نہ زبان پر لائے جب تک اس کی پوری تحقیق نہ ہو جائے۔ اسی سلسلہ میں منافقین اور ان کے سرپرستوں کی درپردہ اس خواہش اور کوشش کا سراغ دیا ہے کہ وہ طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ اکھاڑ دینے کے درپے ہیں اس وجہ سے ان سے پوری طرح ہوشیار رہنا چاہیے اور خود اپنے ہاتھوں ان کی مقصد برآری کا سامان نہیں کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے جو ضروری ہدایات ہیں وہ بھی اسی ذیل میں دی گئی ہیں اور جو لوگ بالکل نادانستہ اس فتنہ میں ملوث ہو گئے تھے ان سے درگزر کی ہدایت بھی فرمائی گئی ——— اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ آیات ۱۱-۲۶
بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَ
الَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱﴾ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ
ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ
مُّبِينٌ ﴿۱۲﴾ لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا
بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ
اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَفَضْتُمْ
فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۴﴾ إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم
مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا ۚ وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴿۱۵﴾
وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا
سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ﴿۱۶﴾ يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَن تَعُودُوا لِمِثْلِهِ
أَبَدًا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۷﴾ وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
حَكِيمٌ ﴿۱۸﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا
لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا

تَعْلَمُوْنَ ﴿١٩﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ
ع ۲ / ۸ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَ
مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ
اللّٰهَ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢١﴾ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ
مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ
الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾
يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ
اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿٢٥﴾ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ
وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا
ع ۳ / ۹ يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾

ترجمۂ آیات ۱۱-۲۶

جن لوگوں نے فتنۂ افک برپا کیا وہ تمہارے ہی اندر کا ایک گروہ ہے۔ تم اس چیز کو اپنے لیے بُری نہ خیال کرو بلکہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کے حساب میں پڑا اور جو اس فتنہ کا اصل بانی ہوا ہے اس کے لیے تو ایک عذابِ عظیم ہے۔ ۱۱

ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کی

بابت نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا بہتان ہے! ۱۲

آخر یہ لوگ اپنے اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہ کیوں نہ لائے! تو جب یہ لوگ گواہ نہیں لائے تو لازماً اللہ کے نزدیک یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ ۱۳

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، دنیا اور آخرت میں، تو جس چیز میں تم ملوث ہو گئے تھے اس کے باعث تم کو ایک عذابِ عظیم آ پکڑتا۔ خیال کرو جب تم اپنی زبانوں سے وہ بات نقل کر رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کی بابت تمھیں کوئی علم نہیں تھا! اور تم اس کو معمولی بات خیال کر رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی بات ہے! ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کو سنتے ہی تم نے کہہ دیا ہوتا کہ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں! معاذ اللہ یہ تو ایک بہت بڑا بہتان ہے! ۱۴-۱۶

اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو ایسی بات تم سے پھر کبھی صادر نہ ہو۔ اور اللہ تمھارے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کیے دے رہا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۱۷-۱۸

بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہو، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں ایک دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور اللہ رؤف و رحیم نہ ہوتا تو تم ایک آفت میں پھنس جاتے۔ ۱۹-۲۰

اے لوگو جو ایمان لائے ہو شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ اور جو شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ شیطان ہمیشہ بے حیائی اور برائی کی راہ سجھاتا ہے۔ اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا۔ بلکہ اللہ

ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ سمیع و علیم ہے۔ ۲۱

اور جو تم میں صاحبِ فضل اور کشادہ حال ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ قرابت مندوں، مسکینوں اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہ کریں گے بلکہ عفو و درگذر سے کام لیں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں بخشے! اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۲۲

بے شک جو لوگ پاکدامن، بھولی بھالی، باایمان عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہوئی اور ان کے لیے ایک بڑا عذاب ہے۔ اس دن جس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے سامنے ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ ان کا واجبی بدلہ پورا کر دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق اور واضح کر دینے والا ہے۔ ۲۳-۲۵

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہوں گی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہوں گی اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ یہ لوگ بری ہوں گے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ ۲۶

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۱)

فتنۂ افک — 'افک' جھوٹی، من گھڑت، خود تراشیدہ اور خلافِ حقیقت بات کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے اشارہ اس فتنہ کی طرف ہے جو غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر منافقین نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو متہم کرنے کے لیے برپا کیا۔ بعض جھوٹ ایسے ہوتے ہیں جن کا ذکر بھی زبان پر لانا گوارا نہیں ہوتا اور یہ جھوٹ تو تمام مسلمانوں کی ماں سے متعلق تراشا گیا تھا اس وجہ سے قرآن نے اس کی طرف لفظ 'افک' سے اشارہ کر کے اس کو نظر انداز کر دیا۔ بس اتنا پتہ دے دیا کہ اس کے ایجاد

کرنے والے اور اس کو پھیلانے والے کون لوگ ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ جس منبع فساد سے یہ بات چلی ہے اس کی پھیلائی ہوئی بات بجائے خود نہ قابلِ ذکر ہے اور نہ لائقِ غور و تحقیق البتہ اس سے جو سبق حاصل ہوتے ہیں وہ سب کے لیے حرزِ جان بنانے کے قابل ہیں۔ چنانچہ قرآن نے نفسِ واقعہ کی نوعیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذی فہم مسلمانوں کے اندر نفسِ واقعہ کے افترا و بہتان ہونے سے متعلق کوئی تردد نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ منافقین کا اٹھایا ہوا فتنہ ہے لیکن جب کوئی سنسنی پیدا کرنے والی بات عوام میں پھیلا دی جاتی ہے تو جو لوگ زیادہ معاملہ فہم نہیں ہوتے وہ بے سمجھے بوجھے اس کی نقل و روایت شروع کر دیتے ہیں[1]۔

منافقین کی طرف اشارہ

'عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ' سے اشارہ منافقین کے اس مارِ آستین گروہ کی طرف ہے جو مسلمانوں کے اندر گھسا ہوا تھا۔ ان کا سردار عبداللہ بن اُبی تھا۔ چونکہ اپنے ظاہری طور طریق میں یہ لوگ مسلمانوں سے الگ نہیں تھے اس وجہ سے ان کو مسلمانوں کے اندر گھس کر اپنا زہر پھیلانے کا موقع مل جاتا اور بہت سے سادہ لوح مسلمان ان کے چکموں میں آجاتے۔ یہاں قرآن نے 'عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ' کہہ کر انہی کی طرف انگلی اٹھائی ہے اور مقصود اس اشارے سے مسلمانوں کو ان کی طرف سے ہوشیار کرنا ہے کہ یہ تمہارے اندر ہی گھسے ہوئے ایک گروہ کا اٹھایا ہوا فتنہ ہے، ان سے ہوشیار رہو۔

اس فتنہ کے اندر خیر کے پہلو

'لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ' یعنی ان شریروں نے یہ فتنہ جو اٹھایا یہ تمہارے حق میں برا نہیں ہوا بلکہ اگر تم اس سے صحیح فائدہ اٹھاؤ تو اس میں تمہارے لیے بہت سے پہلو خیر کے ہیں۔

خیر کا ایک نمایاں پہلو تو اس کے اندر یہی تھا کہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اپنے اندر کے ایک

---

[1] تاریخ و سیرت کی کتابوں سے واقعہ کی نوعیت صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی مصطلق (واقع ۶ھ) سے مدینہ منورہ واپس ہو رہے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک الگ اونٹ پر ہم سفر تھیں۔ راستہ میں فوج نے شب میں کہیں پڑاؤ ڈالا۔ فوج کے کوچ سے پہلے ام المومنینؓ ضرورت سے باہر نکلیں۔ اتنے میں فوج کے کوچ کا حکم ہو گیا۔ قافلہ روانہ ہو گیا، اور ساتھ ہی ام المومنینؓ کا ساربان بھی یہ سمجھ کر روانہ ہو گیا کہ آپ اپنے ہودج میں سوار ہیں۔ ام المومنینؓ جب جگہ پر واپس آئیں اور دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو گیا تو شب میں اس کے سوا انھیں کوئی اور تدبیر نظر نہیں آئی کہ وہیں ٹھہر جائیں تاآنکہ اللہ تعالیٰ کوئی راہ پیدا کرے۔ حضرت صفوان صحابیؓ اس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلہ کے پیچھے پیچھے چلیں تاکہ بھولی بسری چیزوں کا جائزہ لے سکیں۔ جب صبح کو وہ پڑاؤ کی جگہ پر پہنچے اور دیکھا کہ ام المومنینؓ پیچھے رہ گئیں تو انھوں نے 'اِنَّا لِلّٰہِ' پڑھا۔ بالآخر اپنا اونٹ بٹھایا۔ ام المومنینؓ اس پر سوار ہو گئیں اور انھوں نے مہار پکڑ کر اونٹ کو قافلے سے جا ملایا۔ فوج کے کوچ و مقام کے دوران میں اس قسم کے واقعہ کا پیش آجانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن منافقین نے اسی ذرا سی بات کو ایک افسانہ بنا ڈالا۔

مارِ آستین گروہ کو اچھی طرح پہچان لینے کا موقع مل گیا۔ اگر یہ موقع نہ پیدا ہوتا تو معلوم نہیں اندر ہی اندر یہ سرطانی پھوڑا کیا شکل اختیار کرتا اور اس سے کیا مفاسد ظہور میں آتے!

دوسرا خیر کا **پہلو** اس کے اندر یہ نکلا کہ مسلمانوں کے اندر جو بعض کمزوریاں دبی ہوئی تھیں وہ اس امتحان سے اُبھر کر سامنے آگئیں اور بروقت ان کی اصلاح و تدبیر ہو گئی۔ معاشرہ کے تزکیہ کے نقطۂ نظر سے اس کی جو اہمیت ہے وہ بالکل واضح ہے۔

تیسرا پہلو اس میں خیر کا یہ ہے کہ اس واقعہ نے معاشرہ کی اصلاح و تنظیم سے متعلق بہت سے احکام و ہدایات کے نزول کے لیے ایک نہایت سازگار فضا پیدا کر دی۔ اگر اس فضا کے پیدا ہوئے بغیر یہ احکام اترتے تو بہت سے لوگوں پر ان کی حقیقی قدر و قیمت واضح نہ ہو سکتی۔

بانیٔ فتنہ کی طرف اشارہ

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ کِبْرٌ کسی جرم یا گناہ کے اصل اور بڑے حصہ کو کہتے ہیں۔ 'اَلَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ' یعنی جو اس فتنہ کا اصل برپا کرنے والا ہوا ہے، یہ اشارہ عبداللہ بن اُبَی کی طرف ہے۔ یہ نہایت خبیث منافق تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ متعدد فتنے برپا کر چکا تھا اور اس فتنے کی تو ساری ذمہ داری اصلاً اسی پر تھی۔ اوپر کے ٹکڑے میں مسلمانوں کو تسلی تھی کہ تمھارے لیے تو یہ فتنہ بہ اعتبار ے مُوجبِ خیر ہی ہوا ہے البتہ ان اشرار و مفسدین کے لیے یہ باعثِ ہلاکت ہوا۔ ان میں سے جس نے جس درجہ کا اس فتنہ میں حصہ لیا ہے وہ اپنے درجے کے اعتبار سے اس کی سزا بھگتے گا اور جو اس سارے طوفان کا اصل بانی ہے اس کے لیے تو آخرت میں ایک عذابِ عظیم ہے۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۱۲)

اسلامی معاشرہ کا اخلاقی اصول

اسلامی معاشرے میں ہر مسلمان مرد و عورت کا یہ حق ہے کہ دوسرے افرادِ معاشرہ ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھیں اور اس وقت تک ان کے اس حق کا احترام کریں جب تک دلیل سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اس حسنِ ظن کے حق دار باقی نہیں رہے۔ اس حق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے بارے میں کسی مسلمان کے کان میں کوئی ایسی بات پڑے جو اس حسنِ ظن کو مجروح کرنے والی ہو تو وہ اس کو ایک سوغات سمجھ کر فوراً قبول نہ کرے اور اس کی نقل و روایت نہ شروع کر دے بلکہ اس کو رد کر دے اور اس وقت تک اس کو باور نہ کرے جب تک اس کے سامنے اس کا کوئی معقول ثبوت نہ آجائے۔ اس طرح کے معاملات میں غیر جانبداری کا رویہ بھی جائز نہیں ہے کہ آدمی اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کر دے کہ دوسرا بدنام ہو رہا ہے، مجھے اس قضیے سے کیا سروکار! بلکہ حتی الامکان اسے اپنے بھائی کی مدافعت کرنی چاہیے، اس لیے کہ ہر مسلمان پر اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی عزت و آبرو کی حفاظت ایک فرض ہے۔ اسلامی معاشرہ کے اسی اخلاقی اصول پر یہاں مسلمانوں کو تنبیہ فرمایا ہے کہ جب تمھارے کانوں میں یہ بات پڑی تو آخر تم نے ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ ظن سے کام کیوں نہ لیا اور صاف صاف یہ کیوں نہ اعلان کر دیا کہ یہ کھلا ہوا بہتان اور ایک صریح

تہمت ہے۔

ہمارے معاشرہ کا فسادِ مزاج

ایک طرف اسلامی معاشرے کے اس اخلاقی اصول کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف اپنے معاشرے کا جائزہ لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج اس کے بالکل برعکس اصول کارفرما ہے۔ آج نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص سوءِ ظن کا مستحق ہے الا آنکہ کسی شخص کے ساتھ اپنی کوئی شخصی یا گروہی غرض وابستہ ہو اور دوسروں کی نسبت سنسنی پیدا کرنے والی افواہیں پھیلانا تو اس زمانے میں ایک مستقل فن اور ایک نہایت کامیاب پیشہ بن گیا ہے۔ ہماری قوم میں کتنے اہلِ قلم ہیں جن کا پیشہ ہی یہی ہے کہ وہ اسی طرح کی افواہوں کی تلاش میں

ہر دنی صبح اور رکھ کر کان پہ گھر سے قلم نکلے

یہ افواہیں نہایت جلی عنوانات سے اخبارات و رسائل میں چھپتی ہیں اور سب سے زیادہ کامیاب اخبارات و رسائل وہی ہیں جو اس طرح کی افواہیں ایجاد کرنے میں سب سے زیادہ شاطر ہیں۔ معاشرے کے فسادِ مزاج کا حال یہ ہے کہ لوگ اس طرح کی چیزیں پڑھتے ہیں اور ھٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ کہنا تو درکنار ان کی ہر بات پر اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہتے اور وحی و الہام سمجھ کر ان کی نقل و روایت کرتے ہیں۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۱۳)

الزام کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کا مطالبہ

یعنی ان مفتریوں کی بات لائقِ اعتناء ہو سکتی تھی تو اس صورت میں ہو سکتی تھی جب یہ شریعت کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش کرتے۔ یہ امر واضح رہے کہ اس طرح کے الزام کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی شہادت کا قانون اس سے بہت پہلے سورۂ نساء آیت ۱۵ میں نازل ہو چکا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان مفسدوں نے یہ الزام لگایا تھا تو ان کی شرعی اور قانونی ذمہ داری یہ تھی کہ یہ چار گواہ پیش کرتے لیکن جب وہ چار گواہ پیش نہ کر سکے تو خدا کے قانون کی رُو سے تو وہی جھوٹے ہیں۔ پھر جن لوگوں نے ان کی طرف سے ثبوت فراہم ہوئے بغیر ان کی بات باور کر لی، آخر کس سند کی بنیاد پر باور کر لی؟

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِىْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۴)

مسلمانوں کو پھر تنبیہ

'افاض فی الحدیث' کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بات میں سے بات نکالتے ہوئے آدمی کہیں سے کہیں جا پہنچے اور بات کا بتنگڑ بنا ڈالے۔ آیت ۱۰ کے بعد یہ پھر مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ اس معاملے میں تم جس روش پر چل نکلے تھے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم کو ایک عذابِ عظیم آ پکڑتا لیکن تم پر دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کی رحمت ہے اس وجہ سے اس نے درگزر فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اس فضل و رحمت کی قدر کرو، ایسا نہ ہو کہ کسی اسی طرح کے فتنہ میں پھر مبتلا ہو کر اپنے آپ کو مستحق عذاب بنا ڈالو۔

یہ خطاب سارے معاشرے سے ہے حالانکہ اس معاملے میں ملوث ہونے والے یا سہل انگاری و بے پروائی کو راہ دینے والے زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اس خطابِ عام کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے مفاسد کی نوعیت

وبائی امراض کی ہے۔ اگر چند افراد کے اندر بھی اس کا ظہور ہو تو ہر شخص کو خطرہ سے آگاہ ہو جانا چاہیے کہ مبادا یہ وبا عام ہو جانے اور پھر اس کے نتیجہ میں پورا معاشرہ خدا کی پکڑ میں آجائے۔

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا ۖ وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ (۱۵)

نقل و روایت کے معاملہ میں احتیاط کی ہدایت

یہ اسی بات کی سنگینی کا اظہار ہے جس کو کچھ لوگوں نے ایک معمولی بات سمجھ کر بے تکلف اس کی نقل و روایت شروع کر دی اور یہ انھوں نے نہ سوچا کہ جس چیز کو وہ معمولی سمجھ رہے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بڑی ہی سنگین بات ہے۔ کسی بات کو قبول کرنے کا اصلی راستہ عقل ہے نہ کہ زبان اور نقل و روایت کے قابل وہ بات ہوتی ہے جس کی بنیاد قابلِ اعتماد علم پر ہو نہ کہ افواہ پر۔ اگر عقل کو آدمی معطل کر دے اور اس کے پاس صرف گز بھر کی زبان رہ جائے تو نقد و درایت کے بغیر وہ کان میں پڑی ہوئی ہر بات کی روایت شروع کر دے گا اور اس طرح وہ خود بھی شیطان کے پھیلائے ہوئے فتنہ میں مبتلا ہوگا اور دوسروں کو بھی مبتلا کرے گا۔ اس آیت میں مسلمانوں کو اسی خطرہ سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اس معاملہ میں کچھ لوگوں نے عقل کے بجائے صرف زبان کو قبولِ روایت کا ذریعہ بنایا اور علم کے بجائے محض ایک افواہ کی روایت شروع کر دی۔ انھوں نے یہ بات ایک معمولی بات سمجھی حالانکہ اپنے نتائج و عواقب کے اعتبار سے یہ چیز نہایت خطرناک اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک جرم عظیم ہے۔

وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ (۱۶)

'سُبْحٰنَكَ' یہاں بالکل اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں ہم 'مَعَاذَ اللہ' بولتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب تمھارے سامنے ایک ایسی بات آئی تھی جو ثبوت و شہادت سے بالکل عاری تھی اور جس کی زد صرف ایک مومنہ کے عزت و ناموس ہی پر نہیں بلکہ ام المومنینؓ کے عزت و ناموس پر پڑ رہی تھی تو تم نے اس کو سنتے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ بے ثبوت و شہادت کسی مومنہ کی شان میں ایسی بات زبان سے نکالنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ 'مَعَاذَ اللہ'! یہ صریح بہتان ہے!

ان آیات سے روایت و درایت اور قبولِ روایت سے متعلق جو اصول نکلتے ہیں وہ بڑے اہم ہیں۔ اگر بحث کے اپنے حدود سے متجاوز ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ان کو واضح کرنے کی کوشش کرتے۔ اصحاب علم ان آیات کے اس پہلو پر نگاہ رکھیں۔

يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَن تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَدًا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۱۷-۱۸)

تنبیہ مزید

لفظ 'وَعْظ' کے اندر زجر اور نہی کا مفہوم خود مضمر ہے اس وجہ سے اس کے بعد حرف 'لَا' کے لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آیتیں بھی اسی طرح بطور تنبیہ ہیں جس طرح اوپر تین آیتیں گزر چکی ہیں۔ اس سورہ میں جو

ہدایات دی گئی ہیں وہ خدا کے قہر و غضب سے محفوظ رہنے کے لیے نہایت ضروری ہیں اس وجہ سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ یہ تنبیہات بار بار آ رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تمھیں تنبیہ کر رہا ہے کہ ایسی حرکت آئندہ پھر کبھی تم سے صادر نہ ہو۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ' یعنی اس طرح کی باتوں سے احتراز ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر ان سے احتراز نہ کیا گیا تو ایمان کا دعویٰ بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ 'وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ الاٰيٰتِ' یعنی اللہ نے اپنی ہدایات اچھی طرح واضح کر دی ہیں، اب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اور یہ یاد رکھو کہ اللہ علم و حکمت والا ہے اس وجہ سے جو کچھ اس نے بتایا ہے اسی میں تمھارے لیے خیر و برکت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احکام ایک علیم و حکیم کے بتائے اور سکھائے ہوئے ہیں، کسی کو خدا سے زیادہ علیم و حکیم ہونے کے خبط میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۹)

فتنہ برپا کرنے میں یہود کی سازش

یہ ان منافقین کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے یہ فتنہ برپا کیا۔ یہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہود کے زیر اثر تھے اور یہود پر یہ بات بہت شاق تھی کہ مسلمانوں کی اخلاقی برتری کی دھاک ان کے مخالفوں کے دلوں پر بھی بیٹھتی جا رہی ہے۔ عربوں کا معاشرہ دورِ جاہلیت میں بالکل 'خبیثون و خبیثات' کا معاشرہ بن چکا تھا اور یہود کا حال، اہل کتاب ہونے کے باوجود، ان سے بھی زیادہ بُرا تھا۔ اب جب انھوں نے دیکھا کہ اسی گندگی کے ڈھیر سے 'طیبون و طیبات' کا ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ ابھر رہا ہے جو ملائک کے لیے بھی قابل رشک ہے تو اس آئینہ میں ان کو اپنی تصویر بہت مکروہ نظر آئی۔ اس کا انتقام لینے کی تدبیر انھوں نے یہ سوچی کہ مسلمانوں کے اندر بھی برائی اور بے حیائی کا چرچا پھیلے اور اس کار خیر کے لیے انھوں نے اپنے زیر اثر اور پروردہ منافقین کو ذریعہ بنایا جنھوں نے خاص اہل بیت رسالت کو ہدف بنایا کہ اگر وہ اپنی اس سازش میں کامیاب ہو گئے تو مسلمانوں کے اخلاقی وقار کی ساری عمارت منہدم ہو جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے ان کی سازش کامیاب نہ ہونے دی ۔۔۔ اسی اشرار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جو لوگ یہ ارمان رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر برائی و بے حیائی کا چرچا ہو ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں ایک دردناک عذاب ہے۔

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ' یہ ان مسلمانوں کو تنبیہ ہے جو ان چھپے ہوئے مفسدین سے اچھی طرح آگاہ نہ ہونے کے باعث ان کے اٹھائے ہوئے فتنوں کے لپیٹ میں آ جاتے تھے اور اس موقع پر بھی کچھ لوگ آ گئے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۲۰)

شدید تنبیہ

بعینہٖ یہی آیت اوپر گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۱۰۔ بس یہ فرق ہے کہ وہاں 'تَوَّابٌ حَكِيْمٌ' ہے

اور یہاں رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ہے۔ 'لَوْ' کا جواب یہاں بھی محذوف ہے اور یہ حذف تنبیہ کی شدت پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہاری (خطاب مسلمانوں سے ہے) اس شدید غلطی پر تمہاری گرفت نہیں کی ورنہ تمہارے اندر کے لوگوں نے جس طرح اسلام کے دشمنوں کی مقصد برآری کا سامان کیا تھا اس پر تم سزاوار تھے کہ خدا کی گرفت میں آجاتے لیکن خدا رؤف و رحیم ہے اس وجہ سے اس نے، تمہاری غلطی کے باوجود، تمہیں توبہ اور اصلاح کی مہلت دی۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ وَمَنْ یَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ فَاِنَّهٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰی مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۲۱)

یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہات اوپر گزر چکی ہیں۔ فرمایا کہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ یہ بات اچھی طرح گرہ کر لو کہ شیطان جب بھی سجھائے گا برائی اور بے حیائی کی راہ ہی سجھائے گا، وہ کبھی نیکی اور بھلائی کی راہ نہیں سجھائے گا۔ یہ تنبیہ یوں تو عام ہے لیکن یہاں خاص طور پر اسی ہدایت کو مؤکد کر دیا ہے جو اوپر گزر چکی ہے کہ کسی کے عزت و ناموس کے معاملے میں ہر اس بات کی نقل و روایت نہ شروع کر دو جس کے باب میں تمہیں کوئی علم نہ ہو۔ جس بات کا کوئی ثبوت نہ ہو وہ محض ظن ہے اور ظن کی پیروی شیطان کی پیروی ہے۔

ایک لطیف اور باریک تنبیہ

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰی مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ یہ اسی سلسلہ کی ایک نہایت لطیف اور باریک تنبیہ ہے۔ جو لوگ دوسروں کے عزت و ناموس کے معاملے میں ہر قسم کی رطب و یابس باتیں بے پروائی سے قبول کر لینے اور ان کی بنا پر ان سے بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کا یہ رویہ غمازی کرتا ہے کہ وہ اپنے باب میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن بلکہ ایک قسم کے ادعائے تزکیہ میں مبتلا ہیں، خواہ ان کو اپنے اس باطن کا شعور ہو یا نہ ہو۔ اسی مخفی چور سے یہاں ان لوگوں کو آگاہ کیا ہے جنھوں نے ام المومنینؓ کے باب میں دشمنوں کی اڑائی ہوئی افواہ کو بغیر کسی نکیر کے قبول کر لیا۔ فرمایا کہ ہر شخص یاد رکھے کہ جس کو بھی کوئی پاکی و پاکیزگی حاصل ہوتی ہے محض اللہ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس کی توفیق شامل حال نہ ہو تو کوئی پاک نہیں ہو سکتا تو کسی کو اپنے تقویٰ و تزکیہ کا اتنا غرہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ دوسروں کے معاملے میں ہر قسم کی باتیں بے تحقیق قبول کر لے۔

'وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ' میں اس بات کی یاددہانی ہے کہ جو شخص اپنی ذات کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن میں مبتلا ہوتا ہے وہ اس بات کو نہ بھولے کہ خدا سمیع و علیم ہے۔ وہ ہر شخص کی مخفی سے مخفی بات کو بھی سنتا اور جانتا ہے۔

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۖ

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۗ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۲)

ان لوگوں سے درگزر کی ہدایت جو محض سادگی کے سبب سے اس فتنہ میں ملوث ہو گئے

اب یہ اسی اوپر والی بات پر عطف کر کے ان لوگوں کے باب میں عفو و درگزر کی ہدایت فرمائی جو محض اپنی سادگی کے سبب سے اس فتنہ کی سنگینی کا اندازہ نہ کر پائے اور اس کے نقل و روایت میں ملوّث ہو گئے۔ اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اصل حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اس بات کا اندیشہ تھا کہ بہت سے لوگ ان لوگوں کی امداد و سرپرستی سے دستکش ہو جائیں گے جنھوں نے کسی نوعیت سے اس جھوٹ کے پھیلانے میں حصہ لیا۔ روایات میں ہے کہ مسطحؓ ایک نادار صحابی حضرت ابوبکرؓ کے عزیز تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ان کی سرپرستی فرماتے تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ وہ بھی اس فتنہ میں شریک ہیں تو قدرتی طور پر آپ کو نہایت صدمہ ہوا اور آپ نے قسم کھالی کہ اب میں مسطح کی کبھی کوئی مدد نہیں کروں گا۔ اسی قسم کے رویہ کا اندیشہ دوسرے غیرت مند مسلمانوں کی طرف سے بھی تھا اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور رزق و مال کی کشادگی عطا فرمائی ہے وہ مستحق قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو، ان کی کسی غلطی کی بنا پر، اپنی سرپرستی و امداد سے محروم کر دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں بلکہ عفو و درگزر سے کام لیں، غلطیاں اور کوتاہیاں ہر ایک سے ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ درگزر فرماتا ہے۔ اگر وہ ہر ایک کی غلطی پر مواخذہ کرے اور اپنی عنایات سے اس کو محروم کر دے تو اس کے مواخذہ سے کون بچ سکتا ہے! تو جو لوگ اپنی غلطیوں پر اللہ کی مغفرت کے طلبگار ہیں انھیں چاہیے کہ وہ بھی دوسروں کی غلطیوں کو معاف کریں۔ اللہ غفور رحیم ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی پایا جائے۔

آیت میں 'اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ' کے الفاظ حق اور ذمہ داری کی یاد دہانی کے لیے ہیں کہ جن کو اللہ اپنے فضل و رزق کی کشادگی سے نوازتا ہے ان سے وہ یہ چاہتا ہے کہ جس طرح خدا نے ان کو کشادگی کے ساتھ، ان کی کوتاہیوں اور غلطیوں کے باوجود، دیا ہے اسی طرح وہ بھی اس کے بندوں کو فیاضی اور کشادگی کے ساتھ دیں اور ان کی کسی غلطی سے متاثر ہو کر ان کی مدد سے ہاتھ نہ کھینچیں۔

'اُولِی الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' کے الفاظ اظہارِ استحقاق کے لیے ہیں کہ جو لوگ قرابت مند بھی ہیں، مسکین بھی ہیں اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی صعوبات بھی برداشت کی ہیں وہ بہرحال اپنا ایک حق رکھتے ہیں اور وہ محض اس بنا پر اپنے اس حق سے محروم نہیں ہو جائیں گے کہ نادانستہ وہ کسی غلطی کے مرتکب ہو گئے۔

'اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ' میں اسی باریک حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہے۔ جس طرح کسی کے باب میں محض افواہوں کی بنا پر بدگمانی میں مبتلا ہو جانا خود اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن بلکہ ادعائے تزکیہ کی دلیل ہے اسی طرح کسی کی غلطی پر اس

سے درگزر نہ کرنا اور اس کو اپنی سرپرستی سے محروم کر دینا اپنے آپ کو غلطیوں سے مبرّا سمجھنے کے ہم معنی ہے اگرچہ آدمی کو اپنے اس مخفی خیال کا شعور نہ ہو۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حکمتِ دین کے پہلو سے یہ دونوں غلطیاں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ موزوں ہوا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ (۲۳-۲۵)

منافقین کے جرم کی شناعت اور ان کو تنبیہ

'مُحْصَنٰتٌ' یہاں پاکدامن شریف زادیوں کے مفہوم میں ہے اور 'غٰفِلٰتٌ' سے مراد دنیا کے چھل فریب سے ناآشنا بھولی بھالی خواتین ہیں۔ اگرچہ الفاظ عام ہیں اور مراد ان سے وقت کے مسلم معاشرہ کی تمام شریف زادیاں ہیں لیکن ان میں ایک لطیف اشارہ خاص طور پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف ہے۔ ان الفاظ کا سب سے اعلیٰ مصداق وہی ہو سکتی ہیں۔

'رَمْیٌ' کے اصلی معنی تو تیر مارنے کے ہیں لیکن یہ کسی پر تہمت اور بہتان لگانے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں 'غٰفِلٰتٌ' پر تہمت لگانے کے لیے اس لفظ کے استعمال میں ایک خاص بلاغت ہے۔ اس کے اندر یہ کنایہ ہے کہ جو لوگ بھولی بھالی پاکدامن بیبیوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ گویا سوتے میں ان کو اپنی تیراندازی کا ہدف بناتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں پر دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی پھٹکار ہے۔ نہ یہ دنیا میں برومند ہوں گے نہ آخرت میں۔ دنیا میں بھی عنقریب ان کی جڑ کٹ کے رہے گی اور آخرت میں تو ان کے لیے بہرحال عذابِ عظیم ہے ہی۔ ان منافقین پر اللہ تعالیٰ کی اس لعنت کا اثر بالآخر یہ ظاہر ہوا کہ اسلام کے غلبہ نے ان کا اور ان کے سرغنوں کا سرزمینِ عرب سے بالکل خاتمہ کر دیا۔

'يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ الآية' یعنی جس دن خدا کے عذابِ عظیم سے سابقہ پیش آئے گا اس دن نہ وہ خود کوئی عذر پیش کر سکیں گے اور نہ ان کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت ہوگی۔ اس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ پاؤں خود ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ آج وہ اپنی ان درپردہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں پر پردہ ڈال سکتے ہیں لیکن ان کی زبانوں اور ان کے ہاتھ پاؤں سے تو ان کی کوئی حرکت ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ انہی گواہوں سے خدا گواہی دلوا دے گا کہ انھوں نے کیا کیا تہمتیں تراشی ہیں اور کیا کیا شر و فساد برپا کیے ہیں۔

'يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ' لفظ 'دِيْن' یہاں بدلہ اور جزا کے معنی میں ہے۔ یعنی اس دن اللہ تعالیٰ ان کا واجبی بدلہ پورا پورا چکا دے گا۔ ان کے ساتھ نہ کوئی رعایت ہوگی نہ کوئی زیادتی۔

'وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ' یعنی آج تو ابھی حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے اس وجہ سے یہ اللہ کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ نہ یہ یقین ہے کہ اللہ سراپا حق و عدل ہے اس لیے

لازماً وہ حق کو غالب اور باطل کو نابود کر کے رہے گا اور نہ یہ یقین ہے کہ وہ ہر چیز کو واضح کرنے والا ہے۔
ان غلط فہمیوں نے ان کو ان کی شرارتوں میں بہت بے باک بنا دیا ہے لیکن اس دن ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ خدا سراپا حق و عدل ہے اور اسی کے ساتھ وہ 'مُبِیْنٌ' یعنی تمام حقائق کو آشکارا کرنے والا بھی ہے۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ
اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۲۶)

آخرت میں نفوس کی درجہ بندی اخلاق کے اعتبار سے ہوگی

یعنی اس دنیا میں تو ابھی حالات پر بہت کچھ پردہ پڑا ہوا ہے اور گھر و پشنیر دونوں رلے ملے ہوئے ہیں لیکن جب جزائے حق کا دن آئے گا تو اس دن نفوس کی درجہ بندی، جیسا کہ آیت وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (تکویر - ۷) میں ارشاد فرمایا ہے، اعمال و اخلاق اور ایمان و عقائد کے اعتبار سے ہوگی۔ اس دن خبیث عورتیں خبیث مردوں کے ساتھ باندھ دی جائیں گی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے ساتھ جوڑ دیے جائیں گے۔ اسی کے مقابل میں پاکیزہ اخلاق عورتوں کو پاکیزہ صفات مردوں کی رفاقت حاصل ہوگی اور پاکیزہ اخلاق مردوں کو پاکیزہ اخلاق بیویاں ملیں گی۔ اور یہ لوگ اس دن تمام خرافات اور بکواسوں سے جو ان کے خلاف کی جا رہی ہیں بالکل بری اور پاک ہوں گے اور ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہوگی ——— ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ دو لفظ آخرت کی تمام نعمتوں کی جامع تعبیر کے طور پر آتے ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۷-۳۴

اب آگے ان رخنوں کو بند کیا ہے جو معاشرے میں بدنگاہی، تہمت اور اخلاقی مفاسد کو راہ دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس آزادی پر چند قیدیں عاید کی ہیں جو زمانۂ جاہلیت کی سوسائٹی میں، دوسروں کے گھروں میں آنے جانے کے معاملہ میں، لوگوں کو حاصل تھی۔ پھر بیواؤں اور ذی صلاحیت لونڈیوں اور غلاموں کے نکاح کی ہدایت فرمائی ہے تاکہ شریروں کو سوسائٹی میں رخنہ اندازی کی کوئی راہ نہ ملے۔ اسی ذیل میں غلاموں کی آزادی کے لیے مکاتبت کی ایک کشادہ راہ کھول دی اور اس آزادی کے حصول کے لیے لوگوں کو ان کی امداد پر ابھارا تاکہ غلام آزادوں کی صف میں آئیں، ان کا اخلاقی معیار اونچا ہو اور معاشرے میں ایمان کی اساس پر کامل ہم آہنگی و یک رنگی پیدا ہو ——— اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۷-۳۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا
وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۲۷) فَاِنْ

لَّمْ تَجِدُوا فِيهَآ أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِن
قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا ۖ هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
عَلِيمٌ (۲۸) لَّيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ
فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ (۲۹) قُل
لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ ۗ
إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ (۳۰) وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ
أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ
مِنْهَا ۖ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا
لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ
أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا
مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ
الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ
لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ ۚ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۳۱) وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ
عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۚ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ
وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۳۲) وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ
يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ
أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا ۖ وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ
الَّذِي آتَاكُمْ ۚ وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا

لِتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ
اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ
ع ۴ ۱۰ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾

ترجمۂ آیات ۲۷-۳۴

اے ایمان والو، اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تعارف نہ پیدا کر لو اور گھر والوں کو سلام نہ کر لو۔ یہی طریقہ تمھارے لیے موجب خیر و برکت ہے تاکہ تمھیں یاد دہانی حاصل رہے۔ پس اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تمھیں اجازت نہ ملے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہی طریقہ تمھارے لیے پاکیزہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اور ان غیر رہائشی مکانوں میں داخل ہونے میں تمھارے لیے کوئی ہرج نہیں جن میں تمھارے لیے کوئی منفعت ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ ۲۷-۲۹

مومنوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی پردہ پوشی کریں۔ یہ طریقہ ان کے لیے پاکیزہ ہے۔ بے شک اللہ باخبر ہے ان چیزوں سے جو وہ کرتے ہیں۔ اور مومنہ عورتوں کو کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں مگر جو ناگزیر طور پر ظاہر ہو جائے اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکل مار لیا کریں اور اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کے سامنے یا اپنے باپوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے سامنے یا اپنے بیٹوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے تعلق کی عورتوں کے سامنے یا اپنے مملوکوں کے سامنے یا ایسے زیر کفالت مردوں کے سامنے جو عورت کی ضرورت کی عمر سے نکل چکے ہوں

یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی عورتوں کی پس پردہ چیزوں سے آشنا نہ ہوں۔ اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مار کے نہ چلیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو۔ اور اے ایمان والو، سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۳۰ - ۳۱

اور اپنی رانڈوں اور رنڈوؤں اور ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرو۔ اگر وہ تنگ دست ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔ اور جو لوگ نکاح کرنے کی مقدرت نہیں پا رہے وہ اپنے کو ضبط میں رکھیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے اور جو مکاتب ہونے کے طالب ہوں تمھارے مملوکوں میں سے تو ان کو مکاتب بنا دو اگر تم ان میں صلاحیت پاؤ اور ان کو اس مال میں سے دو جو خدا نے تم کو دیا ہے اور اپنی لونڈیوں کو پیشہ پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ عفت کی زندگی کی خواہاں ہیں، محض اس لیے کہ کچھ متاعِ دنیا تمھیں حاصل ہو جائے اور جو ان کو مجبور کرے گا تو اس اکراہ کے بعد اللہ ان کے لیے غفور رحیم ہے۔ اور بے شک ہم نے تمھاری طرف روشن آیتیں بھی اتاریں دی ہیں، اور ان لوگوں کی تمثیل بھی سنا دی ہے جو تم سے پہلے گزرے اور خدا ترسوں کے لیے موعظت بھی۔ ۳۲ - ۳۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۲۷)

گھروں کے اندر داخل ہونے کے لیے طلب اذن کی ہدایت

'اِسْتِيْنَاس' کے معنی متعارف و مانوس ہو جانے کے ہیں اور 'بُيُوْتٌ' سے مراد، جیسا کہ آگے والی آیت میں وضاحت آ رہی ہے، رہائشی مکانات ہیں جن میں کسی کے بیوی بچے رہتے ہوں۔ فرمایا کہ اگر کسی مسلمان کو اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے رہائشی مکان میں جانے کی ضرورت پیش آئے تو یوں ہی دندناتا ہوا نہ گھس جائے بلکہ پہلے انس و تعارف حاصل کرے جس کا شائستہ اور بابرکت طریقہ یہ ہے کہ دروازے پر کھڑا ہو

کر گھر والوں کو سلام کرے۔ اگر ادھر سے سلام کا جواب اور اجازت ملے تو گھر میں داخل ہو ورنہ واپس ہو جائے۔

سلام اپنے آپ کو متعارف کرانے اور طلب اذن کا نہایت پاکیزہ طریقہ ہے۔ آیت میں 'تَسْتَاْنِسُوْا' کے بعد 'وَتُسَلِّمُوْا' طریقۂ تعارف کی وضاحت کے لیے ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دروازے پر کوئی سلام کرے گا تو گھر والے معلوم کر ہی لیں گے کہ کون صاحب ہیں؟ کیا چاہتے ہیں اور گھر کے اندر ان کا داخل ہونا مناسب ہے یا نہیں اور اس وقت ان کا آنا مناسب ہے یا کسی اور وقت؟

اذن کے لیے سلام کا طریقہ

گھروں کے اندر داخل ہونے کے لیے طلب اذن کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو تمام مہذب قوموں میں ہمیشہ سے رہا ہے۔ عرب جاہلیت کے شرفاء میں بھی اس کا رواج تھا بلکہ ان کے ہاں اس کے لیے جو الفاظ تھے وہ تقریباً بالکل ان الفاظ کے ہم معنی ہیں جو اس وقت مغربی یا مغرب زدہ سوسائٹی میں رائج ہیں لیکن اسلام نے ان کو اختیار نہیں کیا بلکہ ان کی جگہ پر سلام کی ہدایت فرمائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلام کا طریقہ یہ بتایا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کرے، اگر کوئی جواب مل جائے فبہا اور اگر جواب نہ ملے تو تین بار تک سلام کر کے واپس لوٹ آئے۔

اس پابندی کے بعد ظاہر ہے کہ اس اندیشے کے امکانات کا سدباب ہو گیا کہ کوئی غیر مطلوب شخص کسی نامناسب وقت میں کسی کے زنانہ مکان کے اندر گھس آئے۔ اس کے بعد صرف وہی لوگ گھروں کے اندر آ سکتے تھے جو صاحب خانہ سے یا تو کوئی قرابت رکھتے ہوں یا صاحب خانہ کو ان پر پورا پورا اعتماد ہو۔

اس طریقہ کی برکتیں

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ یہ اس پابندی کی برکت واضح فرمائی ہے تاکہ طبائع پر یہ زیادہ شاق نہ ہو۔ فرمایا کہ یہ تمہارے لیے موجب خیر و برکت ہے تاکہ تمہیں یاددہانی حاصل ہوا کرے۔ گویا اس کی نوعیت دروازے پر ایک مبارک نوٹس کی ہے کہ گھر میں داخل ہونے والے کو بھی یاددہانی ہو جائے کہ وہ دوسرے کے حرم میں قدم رکھ رہا ہے جہاں اس کو کچھ خاص اخلاقی آداب کا لحاظ رکھنا ہے اور گھر والوں کو بھی آگاہی ہو جائے کہ ان کے اندر اس وقت ایک ایسا شخص موجود ہے جس کے معاملے میں ان کے اوپر کچھ حدود و قیود ہیں جن کا احترام دنیا اور آخرت دونوں میں موجب خیر و برکت ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۲۸)

یعنی اگر طلب اجازت کے بعد معلوم ہو جائے کہ گھر میں اس وقت اجازت دینے والا کوئی نہیں ہے تو جب تک اجازت نہ ملے گھر کے اندر داخل نہ ہو اور اگر واپس ہو جانے کے لیے کہا جائے تو واپس ہو جاؤ۔

'هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ' یعنی ہر چند ہے تو یہ دل پر شاق گزرنے والی بات لیکن اخلاقی پہلو سے یہی طریقہ پاکیزہ ہے۔ معلوم نہیں کیا حالات ہیں جس کی بنا پر گھر والوں نے اجازت نہیں دی۔ اس طرح کے

معاملات میں اپنے وقار سے زیادہ، صاحبِ خانہ کے مصالح ہی کے لحاظ میں حکمت اور شیطان کے فتنوں سے امان ہے۔

'وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ'۔ یہ مضمون یہاں معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ بار بار آیا ہے۔ آگے فرمایا ہے۔ 'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ'۔ پھر ارشاد ہوا ہے۔ 'اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ'۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کی یہ یاد دہانی اس وجہ سے کی جا رہی ہے کہ جن چیزوں سے یہاں روکا جا رہا ہے ان کے لیے نفس کے اندر چور دروازے بہت سے ہیں۔ جب تک خدا کے علیم و خبیر ہونے کا صحیح طور پر استحضار نہ ہو مجرد احکام و ہدایات سے ان رخنوں کو بند کرنا ممکن نہیں ہے۔ شیطان کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا ہے اور آدمی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ البتہ اگر اس تصور کا دل پر ہر وقت غلبہ رہے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے تو یہ چیز شیطان کی مخفی سے مخفی چالوں سے بھی انسان کو محفوظ رکھتی ہے۔

خدا کی صفتِ علم کی بار بار یاد دہانی کی حکمت

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ (۲۹)

'غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ' سے مراد قرینہ دلیل ہے کہ یہاں وہ مکانات ہیں جو غیر رہائشی ہیں یعنی جن میں آدمی کے بیوی بچے نہ رہتے ہوں۔ اوپر کی ہدایات سے واضح ہے کہ اجازت لینے کی یہ پابندی اصلاً بدنگاہی اور موقع تہمت سے بچانے کے لیے کی گئی ہے اس وجہ سے ان مکانوں کے لیے یہ پابندی ضروری نہیں ہے جو غیر رہائشی ہیں۔ ان میں آدمی بغیر اذن کے بھی جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ بھی 'فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ' کی قید لگی ہوئی ہے۔ یعنی کوئی منفعت اور ضرورت اس کے لیے داعی ہو۔ 'مَتَاعٌ لَّكُمْ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ مکانات ہوں ہی عام ضرورت کے مثلاً دکانیں، سرائیں، ہوٹل وغیرہ۔ مردانہ نشست گاہیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔

'غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ' سے مراد

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ'۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ اوپر گزر چکی ہے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ آدمی کے اندر اگر خدا کی صفتِ علم کا صحیح استحضار نہ ہو تو وہ اس آزادی سے بھی غلط فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایک شخص کسی کے زنانہ مکان میں، بدون اجازت، گھس جائے اور جب اس پر اعتراض ہو تو وہ یہ عذر کر دے کہ میں نے سمجھا کہ یہ مردانہ نشست گاہ یا دفتر ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (۳۰)

مذکورہ بالا اجازت کے بعد اگر کوئی شخص کسی کے مکان میں داخل ہو تو اس کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھے اور اپنی شرم کی جگہوں کی حفاظت کرے۔ 'قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ غضِ بصر اور حفاظتِ فروج تقاضائے ایمان ہے اور 'مِنْ اَبْصَارِهِمْ' کے 'مِنْ' سے یہ بات نکلتی

گھر کے اندر ہونے کے بعد کی احتیاطیں

ہے کہ مقصود صرف اس حد تک نگاہوں کو نیچی رکھنا ہے کہ گھر کی عورتوں سے اپنی نظر کو بچائے رکھے اس لیے کہ یہ ہدایت درحقیقت انہی کو پیشِ نظر رکھ کر دی گئی ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلی کہ اسلام نے یہ اجازت جو دی ہے وہ محض رفعِ حرج کے پہلو سے صاحبِ خانہ کے اعزہ و اقربا اور تعلق و اعتماد کے لوگوں کے لیے دی ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ ہر شخص کے گھر میں اس زمانے میں نہ مردانہ نشست گاہیں تھیں اور نہ آج ہو سکتی ہیں لیکن یہ ہدایات خود اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اگر مردوں کے الگ بیٹھنے کا گھر میں انتظام ہو تو قریبی اعزہ و اقربا کے سوا دوسرے مردوں کا گھر کی عورتوں سے الگ ہی بیٹھنا اسلام میں مطلوب ہے آگے کی آیات سے ان شاء اللہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

غضِ بصر کی ہدایت کی اہمیت

'غضِ بصر' کی ہدایت بڑی اہم ہدایت ہے۔ نگاہ ہی درحقیقت مرد و عورت کے درمیان اولین قاصد کا کام دیتی ہے۔ اگر اس کے اوپر ایمانداری کے ساتھ کوئی شخص پہرہ بٹھا دے تو وہ شیطان کے بہت سے فتنوں سے امان میں ہو جاتا ہے۔

حفظِ فروج میں اصل دخل لباس کو ہے

'حفظِ فروج' میں بڑا دخل اس چیز کو ہے کہ لباس باقرینہ ہو۔ اس زمانے میں فیشن کے شوق نے لباس میں ایسی ایجادیں کر دی ہیں کہ اس کا اصل مقصود ستر بالکل غائب ہو گیا ہے۔ صرف زینت کا مقصد باقی رہ گیا ہے اور زینت بھی وہ زینت جس کے اندر صریح بدقوارگی نمایاں ہے۔ پہلے تو صرف عورتوں ہی کا رونا تھا لیکن اب تو مردوں نے بھی وہ لباس اختیار کر لیا ہے کہ اس لباس میں وہ شریفوں کی کسی مجلس میں بھی جانے کا حق نہیں رکھتے چہ جائیکہ کسی باایمان مسلمان کے گھر کے اندر۔

'ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ'۔ یعنی گھروں کے اندر یہ احتیاطیں اخلاقی پاکیزگی کے نقطۂ نظر سے نہایت اعلیٰ اور اہم ہیں۔ بشرطیکہ ان احتیاطوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہر وقت مستحضر رہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، خواہ کتنے ہی مخفی طریقے سے کرے، خدا اس سے باخبر ہوتا ہے، اگر یہ حقیقت مستحضر نہ ہو تو نہ نگاہ کو آوارگی سے بچایا جا سکتا ہے نہ اعضا کو نمائش سے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا
ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ
اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ
اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَاۗءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا
يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

گھر کے اندر عورتوں کا پردہ

اب یہ عورتوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ اگر گھر کے اندر کوئی غیر محرم داخل ہو تو وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی شرم کی جگہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزیں اس کے سامنے نہ ظاہر ہونے دیں، صرف وہ زینت

اس سے مستثنیٰ ہے جس کا ظاہر ہونا ناگزیر ہے۔ زینت کی چیزوں کا اظہار صرف شوہر کے سامنے جائز ہے یا محرموں کے سامنے یا اپنے میل جول اور تعلق و خدمت کی عورتوں کے سامنے، یا اپنے مملوکوں کے سامنے یا ایسے مردوں کے سامنے جو بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کی کفالت و پرورش کا بار گھر والوں نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی جنسی معاملات سے ناآشنا ہوں۔ اور مزید یہ کہ اگر کسی غیر محرم کی موجودگی میں عورتوں کو گھر کے اندر نقل و حرکت کی ضرورت پیش آئے تو زمین پر پاؤں مار کے نہ چلیں کہ زیوروں کی جھنکار سنائی دے۔

یہ اس آیت کا سادہ مطلب ہوا۔ اس کے بعض اجزاء جو وضاحت طلب ہیں، ہم ان کی وضاحت بھی کیے دیتے ہیں۔

اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا مفہوم

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔ زینت کی چیزوں میں لباس بھی داخل ہے اور زیورات بھی۔ ان میں سے ہر چیز کو نہ تو چھپانا ممکن ہے نہ ہر چیز کا ظاہر ہونا ناگزیر ہے۔ لباس کا بھی ظاہری حصہ بہرحال ظاہر ہو کے رہے گا اور زیورات بھی بالخصوص ہاتھ کے بعض زیورات بغیر زحمت کے نہیں چھپائے جا سکتے۔ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے استثناء نے اس قسم کی غیر معمولی زحمتوں سے بچا کر صرف ان زینتوں کو چھپانے کی ہدایت فرمائی جن کے چھپانے میں زیادہ زحمت نہیں ہے۔

اوڑھنی مسلمان خواتین کے لباس کا ضروری جزو ہے

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ۔ خمار، دوپٹہ اور اوڑھنی کو کہتے ہیں۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اوڑھنی مسلمان خواتین کے لباس کا ایک ضروری جزو ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ کسی غیر محرم کی موجودگی میں عورتوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس اوڑھنی سے اپنے سر اور کمر کے ساتھ اپنے گریبانوں کو بھی چھپائیں[1] ـــــ ایک طرف اس حکم کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف اپنی قوم کی متبرجات کو دیکھیے کہ انھوں نے اوڑھنی کو دقیانوسیت قرار دے کر یک قلم خارج قرار دے دیا اور چاک گریباں اور سینہ کے ابھار کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا لازمۂ تہذیب ٹھہرا!

'أَوْ آبَائِهِنَّ'۔ لفظ 'آباء' اپنے وسیع معنوں میں اجداد و اعمام سب پر مشتمل ہے۔ محرم اعزہ کے نمایاں عناصر کے نام گنا دیے ہیں لیکن مراد وہ سب ہیں جو اس حکم میں داخل ہیں۔

'نِسَائِهِنَّ' سے مراد

'أَوْ نِسَائِهِنَّ' میں بعض فقہاء نے صرف مسلمان عورتوں کو مراد لیا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ میرے نزدیک اس بارے میں صاحب کشاف کی رائے صحیح ہے۔ انھوں نے اس سے میل جول اور تعلق و خدمت کی عورتوں کو مراد لیا ہے (من فی صحبتهن وخدمتهن من النساء) یہ امر ملحوظ رہے کہ ہر قسم کی اجنبی عورتوں کے سامنے عورتوں کے لیے اپنی زینت کا ظاہر کرنا فتنہ اور خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ بعض عورتیں

---

[1] اس پابندی سے صرف وہ بوڑھی عورتیں مستثنیٰ ہیں جو نکاح کی عمر سے گزر چکی ہیں۔ اگرچہ ان کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ بھی اس کا اہتمام رکھیں۔ اس کی وضاحت آگے آیت ۶۰ میں آئے گی جو اس آیت کی توضیح کے طور پر بعد میں نازل ہوئی۔

بڑی نظامہ ہوتی ہیں۔ ان سے بچ کے رہنے ہی میں سلامتی ہے۔ معلوم نہیں وہ کس آفت میں مبتلا کر دیں۔

'مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ' سے لونڈی اور غلام دونوں مراد ہیں

'أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ' سے مراد لونڈی اور غلام دونوں ہیں۔ بعض فقہاء نے اس سے صرف لونڈیاں کو مراد لیا ہے لیکن اس تخصیص کا کوئی قرینہ الفاظ میں موجود نہیں ہے۔ اگر صرف لونڈیاں ہی مراد ہوتیں تو صحیح اور واضح تعبیر 'أَوْ إِمَائِهِنَّ' کی ہوتی۔ ایک عام لفظ، جو لونڈیوں اور غلاموں دونوں پر مشتمل ہے، اس کے لیے استعمال نہ ہوتا۔ پھر یہاں اس سے پہلے 'نِسَائِهِنَّ' کا لفظ آ چکا ہے جو ان تمام عورتوں پر، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، مشتمل ہے جو میل جول اور خدمت کی نوعیت کی وابستگی رکھتی ہیں۔ اس کے بعد لونڈیوں کے علیحدہ ذکر کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں یہ بات قرآن کی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ آگے اسی سورہ میں، انہی احکام سے متعلق، بعض توضیحات آئیں گی جو بعد میں نازل ہوئیں۔ ان میں لونڈیوں اور غلاموں دونوں کو، تین مخصوص اوقات کے علاوہ، اجازت کے بغیر گھر میں آنے جانے کی اجازت دی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ 'طَوَّافُونَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ' کہ تم ایک دوسرے کے سامنے ہر وقت آمد و شد رکھنے والے ہو۔[1] ان وجوہ سے میں ان فقہاء کی رائے کو صحیح سمجھتا ہوں جو اس لفظ کو لونڈیوں اور غلاموں دونوں کے لیے عام مانتے ہیں۔ البتہ ان کے لیے بھی وہ پابندی ضروری ہوگی جو خود قرآن نے بیان کر دی ہے اور جس کی وضاحت آگے آیت ۵۸ میں آئے گی۔ لیکن اس بحث کی نوعیت اب مجرد ایک علمی بحث کی ہے، اس لیے کہ غلامی کا مسئلہ اب ختم ہو چکا ہے اور اس سلسلہ میں، دنیا کی تاریخ میں سب سے

ملازموں کا حکم

پہلے اسلام نے قدم اٹھایا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اب مسئلہ غلاموں کا نہیں بلکہ نوکروں اور ملازموں کا ہے۔ ان کے باب میں قرآن کے اشارات سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک بوڑھے ملازموں اور بچوں کا تعلق ہے ان کے لیے تین اوقات کے سوا، جن کی تفصیل آگے آئے گی، گھروں میں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ رہے جوان ملازم تو ان کے باب میں، میرے نزدیک، ان تمام ہدایات پر عمل کرنا ضروری ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ ان کے لیے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینا بھی ضروری ہے اور گھر میں ان کی موجودگی کی صورت میں ان پر اور گھر کی خواتین پر وہ پابندیاں بھی لازمی ہیں جو زیر بحث آیات میں بیان ہوتی ہیں۔

بڑھوں اور معذوروں کا حکم

'أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ' سے مراد وہ بوڑھے، معذور، نابینا اور اپاہج مرد مراد ہیں جو جنسی جذبات و خواہشات کے دور سے نکل چکے ہوں۔ اگر ایسے مردوں میں سے کسی کی کفالت و سرپرستی گھر والوں نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور وہ وہیں رہتے سہتے ہیں تو ان کے معاملے میں بھی وہ پابندیاں نہیں ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ میرے نزدیک یہی حکم بوڑھے ملازمین کا بھی ہے بس ان تین اوقات میں ان کے لیے اجازت کی ضرورت ہوگی جو آگے آیت ۵۸ میں مذکور ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو آیت ۵۸۔

'أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ' سے مراد وہ بچے ہیں جن کے اندر ابھی جنسی شعور بیدار نہیں ہوا ہے اور وہ عورتوں کے صنفی اعضاء کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتے جس نگاہ سے ایک مرد دیکھتا ہے۔ ان کے لیے اول اول اجازت لینے کی پابندی نہیں تھی لیکن بعد میں تین اوقات میں ان کے اوپر بھی پابندی عائد ہوگئی۔ تفصیل اس کی آگے آئے گی۔

اظہارِ زینت کا ایک مخصوص دائرہ ہے

'وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ' زینت کی چیزوں کے استعمال میں اصلی جذبہ نمائش کا ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ چیز انسان بالخصوص عورت کی فطرت میں داخل ہے لیکن اس کا ایک مخصوص دائرہ ہے۔ موجودہ زمانہ کی متبرجات کی طرح ہر جگہ اپنی زینت کی نمائش کرتے پھرنا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ غیر محرموں کی موجودگی میں اگر عورتوں کو گھر کے اندر چلنے پھرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس طرح زمین پر پاؤں مار کے نہ چلیں کہ زیورات کی جھنکار سنائی دے۔

مسلمانوں کو اجتماعی توبہ کی ہدایت

'وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ' یہ ہدایات چونکہ پورے مسلم معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کے لیے دی گئی ہیں اس وجہ سے سب کو خطاب کر کے رجوع الی اللہ کی دعوت دی گئی کہ سب مل کر اپنی اب تک کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کر لو اور زندگی کا وہ طریقہ اختیار کرو جس کی طرف قرآن تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔ یہی راستہ فوز و فلاح کا راستہ ہے۔ اس فوز و فلاح کے شرائط سورۂ حج آیت ۷۷ اور مومنون آیت ۱ کے تحت بیان ہو چکے ہیں۔ تفصیل کی ضرورت ہو تو ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

گھروں کے باہر کے پردے کے احکام سورۂ احزاب میں بیان ہوئے ہیں

اوپر کی دونوں آیتوں میں مردوں اور عورتوں دونوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں، سیاق و سباق اور آیات کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ گھروں کے اندر کے پردہ سے متعلق ہیں۔ رہا یہ سوال کہ کسی عورت کو کسی ضرورت سے گھر سے باہر قدم نکالنا پڑے تو اس صورت میں اس کو کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کا جواب یہاں نہیں دیا گیا ہے۔ اس کا جواب سورۂ احزاب میں آئے گا — ان شاء اللہ ہم وہاں اس پر تفصیل سے بحث کریں گے۔ ویسے ہم نے 'قرآن اور پردہ' کے عنوان سے ایک الگ رسالہ بھی لکھ دیا ہے جس میں قرآن کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ اندر اور باہر دونوں صورتوں کے لیے قرآن نے پردے کے نہایت قطعی احکام دیے ہیں۔ تفصیل کے طالب اس رسالہ کو پڑھیں۔ ان روشن احکام کے بعد بھی جن لوگوں کو قرآن میں پردے کا حکم کہیں نظر نہیں آتا ان کے بارے میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ان کو غیر محرم عورتوں سے جس غضِ بصر کی ہدایت فرمائی تھی وہ غضِ بصر ان حضرات نے قرآن سے کر لیا ہے۔ یہ لوگ قرآن کو چومتے تو بڑی عقیدت سے ہیں لیکن آنکھیں بند کر کے اور پھر چومنے کے بعد اس کو شاید بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں!

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۳۲)

ایامیٰ سے مراد

'ایامیٰ' 'ایّم' کی جمع ہے۔ ایّم اس مرد کو بھی کہتے ہیں جو بیوی سے محروم ہو اور اس عورت کو بھی

کہتے ہیں جو شوہر سے محروم ہو۔ یعنی رانڈ اور رنڈوے دونوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے بلکہ اپنے وسیع مفہوم میں یہ ان مردوں اور عورتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو بن بیاہے رہ گئے ہوں۔

لفظ 'صٰلِحِیْنَ' سے مراد

لفظ 'صٰلِحِیْنَ' یہاں جسمانی اور اخلاقی دونوں قسم کی صلاحیتیں رکھنے والوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ عربی میں یہ لفظ اس جامع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

رانڈوں اور رنڈووں کے نکاح کی ہدایت

معاشرے کے اندر اخلاقی مفاسد اور شیطان کی دراندازیوں کے لیے ایک وسیع دروازہ یہ چیز بھی کھولتی ہے کہ اس میں بہت سے مرد بیویوں سے محروم اور بہت سی عورتیں شوہروں سے محروم ہوں۔ اس سے ناجائز تعلقات کے امکانات بھی بہت بڑھ جاتے ہیں اور تہمتوں کے پھیلانے کے لیے شریروں کو مواقع بھی ہاتھ آتے ہیں۔ اس برائی کے پیدا ہونے میں جس طرح بعض حالات میں غربت کو دخل ہے اسی طرح بعض حالات میں، بالخصوص عورتوں کے معاملہ میں، خاندانوں، برادریوں اور قبیلوں کے رسم و رواج کو بھی بڑا دخل ہے۔ بعض خاندانوں اور برادریوں میں عقد بیوگان کو معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خرابیوں کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک معاشرے کے اندر ان کی اصلاح کا احساس نہ پیدا ہو۔ اس وجہ سے قرآن نے معاشرے کو ہدایت فرمائی کہ اپنے اندر کے رانڈوں اور رنڈووں اور بے نکاح مردوں اور عورتوں کے نکاح کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اس چیز کے لیے لوگوں کے اندر احساس پیدا کرو، اس کے مخالف رجحانات کی بیخ کنی کرو، جو لوگ غریب ہیں ان کی حوصلہ افزائی اور اعانت کرو تاکہ وہ بھی معاشرے کے اندر اپنا جائز مقام حاصل کریں اور ان کے مجرد رہنے کے سبب سے جو نقصانات ان کو اور معاشرہ کو پہنچ سکتے ہیں ان کا سدِ باب ہو۔

اسی طرح غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو اخلاقی و جسمانی اعتبار سے ذی صلاحیت ہیں ان کے بھی نکاح کر دو۔ ذی صلاحیت سے مراد وہ لونڈیاں اور وہ غلام ہیں جو اپنی ذمہ داریاں سنبھال سکتے اور اپنے حقوق و فرائض کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ہدایت بھی اس وجہ سے فرمائی گئی کہ اس طرح غلاموں کا اخلاقی و معاشرتی معیار اونچا ہوگا اور وہ بالتدریج معاشرہ کے صالح اجزا بن جائیں گے۔

ذی صلاحیت لونڈیوں اور غلاموں کے نکاح کی ہدایت

نکاح رزق و فضل میں اضافہ کرتا ہے

'اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ' اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ مردوں کے لیے شادی سے محروم رہ جانے کی عام وجہ غربت ہوتی ہے۔ غریب آدمی اول تو کسی کنبہ کی ذمہ داری اٹھانے سے خود بھی گھبراتا ہے لیکن وہ نہ بھی گھبرائے تو کوئی عورت اپنے آپ کو اس کے حبالۂ عقد میں دینے پر کب راضی ہوتی ہے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت دی کہ جو لوگ غریب ہیں وہ بھی اطمینان رکھیں اور دوسرے بھی یہ اطمینان رکھیں کہ نکاح فقر میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ خدا کے رزق و فضل میں اضافہ کرتا ہے۔ جو آدمی اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے نکاح کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی نظر کرم ہوتی ہے اور وہ اس کی دستگیری فرماتا ہے۔ آدمی جب تک بیوی سے محروم رہتا ہے وہ کچھ خانہ بدوش سا بنا رہتا ہے اور اس کی بہت سی

صلاحیتیں سکڑی اور دبی ہوئی رہتی ہیں۔ اسی طرح عورت جب تک شوہر سے محروم رہتی ہے اس کی حیثیت بھی اس بیل کی ہوتی ہے جو سہارا نہ ملنے کے باعث پھیلنے اور پھولنے پھلنے سے محروم ہو۔ لیکن جب عورت کو شوہر مل جاتا ہے اور مرد کو بیوی کی رفاقت حاصل ہو جاتی ہے تو دونوں کی صلاحیتیں اُبھرتی ہیں اور زندگی کے میدان میں جب وہ دونوں مل کر جدوجہد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی جدوجہد میں برکت دیتا ہے اور ان کے حالات بالکل بدل جاتے ہیں۔

'وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ'۔ یہ اسی بشارت کو مؤکد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا حوالہ دیا ہے کہ اللہ کے دامنِ کرم میں بڑی گنجائش ہے اور وہ سب کے حالات اور ضروریات سے اچھی طرح باخبر ہے۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

نکاح کی عدم مقدرت بدکاری کے جواز کے لیے عذر نہیں ہے

'وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا'۔ اوپر والی ہدایت تو معاشرہ کے لیے تھی لیکن افراد کی اخلاقی ذمہ داری بہرحال باقی رہے گی۔ اگر کوئی شخص نکاح کی مقدرت نہیں پا رہا ہے تو یہ چیز بدکاری کے جواز کے لیے کسی حال میں عذر نہیں بن سکتی۔ ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضبط میں رکھے اور خدا کے فضل و رحمت کا انتظار کرے۔ جو شخص اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے یہ جہاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے راہ کھولے گا۔ آیت کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے۔

مکاتبت کا مفہوم اور اس کا حکم

'وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ الآیہ'۔ 'کتاب' اور 'مکاتبت' ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا سے اس بات کا خواہاں ہو کہ وہ فلاں مدت کے اندر اس کو اتنی رقم یا اس کی کوئی معین خدمت انجام دے دے گا یا اس کے کسی کام کی تکمیل کر دے گا، جس کے بعد آقا اس کو آزاد کر دے۔ ایسی صورت میں حکم ہے کہ اس غلام کو مکاتب بنا دیا جائے۔ عام علماء تو اس حکم کو مندوب و مستحب کے مفہوم میں لیتے ہیں لیکن حضرت عمرؓ، ابن سیرینؒ اور داؤدؒ نے اس کو وجوب کے مفہوم میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک ایسے غلام کو مکاتب بنا دینا مالک پر واجب ہے۔ میرے نزدیک یہی مذہب قوی ہے۔ یہ احکام، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، معاشرہ کو دیے جا رہے ہیں اس وجہ سے اس صورت میں مالک کی حیثیت ایک خود مختار آقا کی باقی نہیں رہ جاتی ہے بلکہ ایک فریق کی بن جاتی ہے۔ اگر غلام اور آقا دونوں باہم دگر بطور خود معاملہ طے کر لیں تو بہتر ہے اور اگر ان کے درمیان کوئی نزاع واقع ہو تو اس کا فیصلہ معاشرے کے ذمہ دار لوگ کریں گے اور بدرجۂ آخر اگر ضرورت داعی ہو تو معاملہ عدالت میں بھی جا سکتا ہے۔

مکاتبت کے لیے صلاحیت

'اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا'۔ اس صورت میں صرف یہ چیز دیکھی جائے گی کہ مکاتبت کا مطالبہ کرنے والے غلام

کے اندر کارکردگی کی ایسی صلاحیت اور ذمہ داری کا ایسا احساس ہے یا نہیں کہ وہ مالک کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کو پورا کر سکے۔ اس شرط کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ امکان اس بات کا بھی تھا کہ کوئی نکھٹو غلام مالک سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مکاتبت کا مطالبہ تو کر بیٹھے لیکن اس میں کوئی صلاحیت کارکردگی نہ ہو اور وہ اس چیز کو محض پبلک سے اعانت مانگنے اور گداگری کا پیشہ اختیار کر لینے کا ایک بہانہ بنا لے اور معاشرے پر ایک بار بن کے رہ جائے۔ اس اندیشہ کی وجہ یہ تھی کہ کسی غلام کے مکاتب ہو جانے کے بعد اس کے باب میں قرآن نے لوگوں کو یہ ہدایت بھی، جیسا کہ آگے آرہی ہے، فرمائی ہے کہ لوگ اس کی دل کھول کر مدد کریں اور بیت المال سے بھی اس کی اعانت کی جائے تاکہ وہ مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کی طمع بہت سے ایسے غلاموں کے اندر بھی مکاتب بننے کا ارمان پیدا کر سکتی تھی جو خود تو ہاتھ پاؤں مارنے کی صلاحیت رکھنے والے نہ ہوتے لیکن مالک کی خدمت سے آزاد ہو کر معاشرے پر ایک بار بن جاتے اور اگر معاہدے کی شرائط پوری نہ کر پاتے تو لازماً ایک نزاع و اختلاف کا ذریعہ بنتے۔

لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ شرط کسی ذی صلاحیت غلام کی آزادی میں مانع نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس بات میں بھی، بصورتِ نزاع، آخری فیصلہ معاشرے اور قاضی کے اختیار میں تھا۔ اگر کسی غلام کو یہ شکایت ہوتی کہ اس کا مالک اس شرط کو بہانہ بنا کر اس کی آزادی میں رکاوٹ ڈالنا چاہتا ہے درآنحالیکہ وہ مکاتب بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے تو وہ اپنا معاملہ معاشرہ کے ذمہ داروں اور پنچوں کے سامنے بھی پیش کر سکتا تھا اور بدرجۂ آخر عدالت میں بھی لے جا سکتا تھا۔

مکاتب کی مدد انفاق فی سبیل اللہ ہے — ﴿وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ﴾ یہ معاشرے کو ابھارا ہے کہ جو غلام اپنی آزادی کے لیے کمر ہمت باندھیں تو، اپنے اس مال میں سے جو خدا نے تمھیں دے رکھا ہے، پورے حوصلہ سے، ان کی مدد کرو۔ یہ ترغیب مال داروں کو دی ہے اور ﴿مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ﴾ کے الفاظ ان کے اندر جذبۂ شکر ابھارنے کے لیے ہیں کہ جو چیز خدا کی دی ہوئی ہے اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہ کرو۔ اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ اس مقصد کے لیے انفاق کریں گے ان کا یہ انفاق فی سبیل اللہ ہوگا۔

اموالِ زکوٰۃ سے مکاتب کی مدد — یہ امر ملحوظ رہے کہ سلف اس بات پر متفق ہیں کہ ایسے غلاموں کی امداد اموالِ زکوٰۃ اور بیت المال سے بھی کی جائے۔ بیت المال میں غلاموں کی آزادی کے لیے اسلام نے ایک مستقل مد رکھی ہے جس کی وضاحت سورۂ توبہ میں ہو چکی ہے۔

مکاتبت کا حق لونڈیوں کو بھی حاصل ہوا — مکاتبت کا یہ حق اسلام نے جس طرح غلاموں کو دیا اسی طرح لونڈیوں کو بھی دیا۔ ﴿مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ کے الفاظ کی عمومیت بھی اس پر دلیل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا عمل بھی۔ روایات میں حضرت بریرہؓ اور حضرت جویریہؓ کے واقعات موجود ہیں۔

اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد تمام ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی نہایت

وسیع راہ کھل گئی۔ اس کے بعد صرف وہی غلام باقی رہے جو یا تو اپنی حالت پر قانع اور مطمئن تھے یا ان کے اندر ہاتھ پاؤں مارنے اور معاشرے کے اندر خود اپنی جگہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسے غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کا اعلانِ عام کر دیا جاتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ اپنے مالکوں کی سرپرستی سے بھی محروم ہو جاتے اور خود بھی اپنی کفالت کا انتظام نہ کر پاتے جس کے سبب سے وہ معاشرے پر ایک بار بن کے رہ جاتے۔

'وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا الآیۃ'

'فَتَيَات' یہاں لونڈیوں کے لیے استعمال کیا ہے اور مقصود اس لفظ کے استعمال سے معاشرے کے اندر ان کی عزت کو بڑھانا ہے۔ 'فتاۃ'، 'فتی' کی مؤنث ہے۔ جس طرح 'فتی' کے معنی جوان اور لڑکے کے ہیں اسی طرح 'فتاۃ' کے معنی لڑکی اور چھوکری کے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی اپنے غلام کو 'عبد' اور اپنی لونڈی کو 'امۃ' نہ کہے بلکہ 'فتی' (جوان) اور 'فتاۃ' (لڑکی) کہے۔ ظاہر ہے کہ لونڈیوں اور غلاموں کے لیے الفاظ کی یہ تبدیلی بھی انہی اصلاحات کا ایک جزو ہے جو ان کے معاشرتی درجے کو اونچا کرنے کے لیے ظہور میں آئیں اور اوپر مذکور ہوئیں۔ مقصود اس لفظ کی تبدیلی سے غلاموں اور لونڈیوں کے اندر احساسِ خودداری کو بیدار کرنا اور لوگوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا تھا کہ اب لوگ غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق اپنے قدیم تصورات کو بدلیں اور ان کو اپنے معاشرے کے بھائی بہن کی نگاہ سے دیکھیں۔

'إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا' کی قید یہاں بطور شرط کے نہیں بلکہ صورتِ واقعہ کی تعبیر کے لیے ہے۔ جب اسلام نے زنا پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا، غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کی ہدایت فرمائی اور مکاتبت کے ذریعہ سے لونڈیوں اور غلاموں کی آزادی کی ایک نہایت کشادہ راہ کھول دی تو قدرتی طور پر لونڈیوں کے اندر بھی ایک عام احساس بیدار ہوا کہ وہ اپنے اخلاقی معیار کو اونچا کریں اور ان میں سے جو اپنے مالکوں کے دباؤ کی وجہ سے پیشہ کراتی تھیں، وہ خواہش مند ہوئیں کہ یہ حرام پیشہ چھوڑ کر پاکدامنی کی زندگی بسر کریں اور اگر کوئی شکل پیدا ہو تو کسی کے قیدِ نکاح میں ہو کر زندگی گزاریں۔ اصلاحات کے اس دور میں اس رجحان کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا لیکن ان کی زد ان مالکوں کے مفاد پر پڑتی تھی جنھوں نے زمانۂ جاہلیت میں چکلے قائم کر رکھے تھے اور جو اپنی لونڈیوں سے پیشہ کراتے اور ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان میں سے بعض اسلام کے دور میں بھی، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں، خفیہ طور پر چکلے قائم کیے ہوئے تھے۔ مشہور منافق عبداللہ بن اُبیّ نے بھی، جس نے فتنۂ افک برپا کیا، ایک چکلہ قائم کر رکھا تھا۔ تاریخوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے خبیث لوگ آسانی سے اس بات پر راضی نہیں ہو سکتے تھے کہ یہ لونڈیاں ان کے چنگل سے نکل جائیں۔ چنانچہ وہ اپنے تمام ہتھکنڈے ان کو پاکدامنی کی زندگی بسر کرنے سے روکنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، باندازِ تنبیہ، فرمایا کہ اب ان لڑکیوں

کو جب کہ وہ پاک دامنی کی زندگی اختیار کرنا چاہتی ہیں، بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ ورنہ یاد رکھو کہ اکراہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ ان کو تو معاف کر دے گا البتہ وہ لوگ اپنا انجام سوچ لیں جو ان کی عفت کے ساتھ یہ گھنونا کھیل کھیل رہے ہیں! یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ بعض چکلے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، بعد کے مراحل میں، رجم بھی کرا دیا۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۳۴)

...ـنت کا ...ادہ

یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ اس سورہ میں بار بار آئی ہے۔ پیچھے بھی اس کی مثالیں گزر چکی ہیں اور آگے آیت ۴۶ میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ ان تنبیہات کے بار بار اعادہ کی حکمت کی طرف ہم اس سورہ کی پہلی ہی آیت کے تحت اشارہ کر آئے ہیں۔ 'وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ' سے اشارہ اس تمثیل کی طرف ہے جو آگے آیت ۳۵ میں آرہی ہے اور جس کی وضاحت آپ کے سامنے ان شاء اللہ آئے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمھاری طرف یہ نہایت واضح ہدایات نازل کر دی ہیں اور تمھاری حوصلہ افزائی کے لیے ان اسلاف صالحین کی تمثیل بھی پیش کر دی ہے جن کے نقش قدم کی تمھیں پیروی کرنی ہے۔ ان کے اندر ان لوگوں کے لیے بڑی نصیحت و موعظت ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔ رہے وہ لوگ جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں تو ان کے اوپر کوئی وضاحت و موعظت بھی کارگر نہیں ہوتی۔ وہ اپنا انجام خود دیکھیں گے۔

۶۔ غلامی کا بالتدریج خاتمہ

اس مجموعۂ آیات میں جو اہم ہدایات دی گئی ہیں ان کی بقدرِ ضرورت وضاحت آیات کے تحت ہو چکی ہے۔ البتہ غلامی سے متعلق ہم یہاں ان باتوں کو یکجا کر دینا چاہتے ہیں جن کی طرف پیچھے جگہ جگہ ہم اشارہ کر چکے ہیں تاکہ اس سلسلہ میں جو غلط فہمیاں لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔

غلامی اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو نہیں تھی بلکہ اس کو اسلام نے وقت کے بین الاقوامی اور ملکی حالات کے تحت محض اس لیے گوارا کر لیا تھا کہ اگر بیک گردشِ قلم اس کے خاتمہ کا اعلان کر دیا جاتا تو اس سے دشمن قوموں کو بھی شہ ملتی اور خود اپنے معاشرے کے اندر بھی نہایت سخت قسم کی معاشرتی اور معاشی الجھنیں پیدا ہو جاتیں۔ اس دور میں اول تو جنگی قیدیوں کے مسئلہ کا ایک معروف حل یہی تھا کہ جنگ میں جو قیدی گرفتار ہوں ان کو فاتحین غلام بنالیں ثانیاً ہر جگہ نخاسوں پر غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار ہوتا تھا اور ہر ذی استطاعت کے گھر میں ہر سن و سال کی لونڈیاں اور غلام موجود تھے۔ ایسے حالات میں اگر بیک وقت یہ اعلان کر دیا جاتا کہ تمام لونڈیاں اور غلام آزاد ہیں تو قطعِ نظر اس سے کہ اس سے مخالف قومیں فائدہ

اٹھائیں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا کہ ان تمام لونڈیوں اور غلاموں کو معاشرے میں کہاں کھپایا جائے؛ ان میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے افراد کی بھی تھی جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ خود اپنی کفالت کا بار اٹھا سکیں۔ غلامی کی صورت میں تو ان کی کفالت کی ذمہ داری قانوناً ان کے مالکوں کے اوپر تھی لیکن آزاد ہو جانے کی صورت میں ان کے لیے اس کے سوا کوئی سبیل باقی نہ رہتی کہ بھیک مانگیں اور معاشرے پر ایک بوجھ بنیں۔ بالخصوص لونڈیوں کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ تھا۔ ان کے بے سہارا ہونے میں بہت سے اخلاقی مفاسد کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ بیت المال، ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فوج کی کفالت کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان مصالح کی وجہ سے اسلام نے ان کی آزادی کی ایک ایسی راہ اختیار کی جس سے وہ خطرات بھی پیدا نہیں ہوئے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور بالتدریج تمام ذی صلاحیت غلام اور لونڈیاں آزاد ہو کر اسلامی معاشرہ کے جزو بھی بن گئے۔

یہاں اس مسئلہ کی تمام تفصیلات سے بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہوگی۔ البتہ ہم چند اہم مبادی کی طرف اشارہ کریں گے جن سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اسلام نے غلاموں کو آزادوں کی صف میں لانے کے لیے بالتدریج کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔

۱۔ اسلام نے اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مکی زندگی کے بالکل ابتدائی دور ہی سے 'فَكُّ رَقَبَةٍ' یعنی غلام آزاد کرنے کو ایک بہت بڑی معاشرتی نیکی قرار دیا۔ مکی سورتوں میں 'فَكُّ رَقَبَةٍ' اور اطعام فقراء کا ذکر بالکل ساتھ ساتھ ہوا ہے اور بعض آیات میں اس کو حصولِ سعادت کی راہ میں اولین قدم بتایا گیا ہے بالخصوص امراء و اغنیاء کے لیے۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح الفاظ میں غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ نہ صرف حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی بلکہ مالکوں پر ان کے انسانی حقوق کو شرعی درجہ دے دیا جس سے ان کے معاملہ میں مالکوں کی وہ خود مختاری اور مطلق العنانی ختم ہو گئی جو زمانۂ جاہلیت میں ان کو حاصل تھی۔

۳۔ بعض گناہوں اور کوتاہیوں کی صورت میں غلام آزاد کرنے کو کفارہ اور صدقہ ٹھہرایا گیا۔

۴۔ تمام ذی صلاحیت لونڈیوں اور غلاموں کے نکاح کر دینے کی ہدایت فرمائی گئی تاکہ معاشرے کے اندر ان کا اخلاقی و معاشرتی معیار اونچا ہو۔

۵۔ بیت المال اور اموالِ زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مستقل مد 'فِي الرِّقَابِ' بھی رکھی گئی تاکہ غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی مہم کو زیادہ سے زیادہ تقویت بہم پہنچائی جائے۔

۶۔ زمانہ جاہلیت میں جن مالکوں نے لونڈیوں سے پیشہ کرانے کے لیے چکلے قائم کر رکھے تھے ان کے چکلے زنا کے جرم قرار پا جانے کے بعد ختم ہو گئے اور اگر کسی نے خفیہ طور پر اس کاروبار کو جاری رکھنے کی کوشش

کی تو اس کو نہایت عبرت انگیز سزا دی گئی۔ یہاں تک کہ اس قبیل کے بعض مردوں اور عورتوں کو حضورؐ نے رجم بھی کرا دیا۔

۷۔ لونڈیوں اور غلاموں کے لیے 'عَبد' اور 'امۃ' کے تحقیر آمیز الفاظ استعمال کرنے کے بجائے 'فتیٰ' اور 'فتاۃ' کے الفاظ استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی گئی تاکہ اس گروہ سے متعلق لوگوں کے قدیم تصورات میں تبدیلی پیدا ہو۔

۸۔ اسیرانِ جنگ سے متعلق بھی بالعموم یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ خاص خاص سرغنوں کو تو بے تامل قتل کر دیا گیا لیکن عام قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دیا گیا۔

۹۔ آخر میں مکاتبت کو ایک قانونی حیثیت دے دی گئی جس کے بعد ہر ذی صلاحیت غلام اور لونڈی کے لیے آزادی کی نہایت کشادہ راہ کھل گئی۔ ان کی امداد و حوصلہ افزائی کے لیے عام لوگوں کو بھی، جیسا کہ اوپر گزرا ابھارا گیا اور ان کے لیے بیت المال میں بھی ایک خاص مد رکھی گئی۔ اس قانون نے عملاً غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد صرف وہ غلام بچ رہے جو ہاتھ پاؤں مارنے کی صلاحیت سے عاری تھے اور ان کے لیے یہی شکل معاشرے کے حق میں بھی اور خود ان کے حق میں بھی بہتر تھی ورنہ وہ معاشرے پر ایک بوجھ بنتے اور گداگری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے۔

ان تمام باتوں کے دلائل قرآن و حدیث میں نہایت تفصیل سے موجود ہیں۔ میں ان کو پیش کر سکتا ہوں لیکن بحث اپنے حدود سے متجاوز ہو جائے گی اس لیے صرف اشارات پر کفایت کرتا ہوں۔ پچھلے مباحث میں ان میں سے اکثر کے دلائل بیان ہو چکے ہیں اور اگر کسی بات کی دلیل نہیں بیان ہوئی ہے تو ان اشارات کی روشنی میں اہلِ علم خود ان کے دلائل نہایت آسانی سے فراہم کر سکتے ہیں۔

۷۔ آگے کا مضمون ـــــــ آیات ۳۵-۴۰

اب آگے وہ آیات آ رہی ہیں جن کی حیثیت اس سورہ کے اندر آفتابِ تاباں کی ہے۔ جس کا پرتو سورہ کے تمام اجزاء پر پڑ رہا ہے۔ ان میں ایمان اور کفر دونوں کی تمثیل بیان ہوئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ایمان سے انسان کے ظاہر اور باطن میں کیا روشنی پیدا ہوتی ہے اور اس سے کس طرح کے اعمال، انفرادی و اجتماعی زندگی میں، ظہور میں آتے ہیں اور کفر سے انسان کے ظاہر و باطن پر کس طرح کی تاریکی چھا جاتی ہے اور بالآخر وہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر کس طرح ہلاکت مسلط کر دیتی ہے۔ مقصود ان تمثیلوں کے پیش کرنے سے اہلِ ایمان پر یہ واضح کرنا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر گوشے کو ایمان کی نورانیت سے منور کریں اور اہلِ کفر پر یہ واضح کرنا ہے کہ اگر وہ کفر کی 'ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ' ہی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں، ایمان کی روشنی میں نہیں آنا چاہتے تو اپنے انجام کو اچھی طرح سوچ لیں! ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۵-۴۰

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ
اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ
شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ
وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَ
يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ (۳۵) فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ
اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ
الْاٰصَالِ ۙ (۳۶) رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ
الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءِ الزَّكٰوةِ ۽ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ
الْاَبْصَارُ (۳۷) لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ
وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۸) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ
كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ
شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۙ (۳۹)
اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ
سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ
وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۴۰)

ع ۵ ۶ ۱۱

ترجمۂ آیات ۳۵-۴۰

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ دل کے اندر اس کے نورِ ایمان کی تمثیل یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو۔ چراغ ایک ایسے شاداب درخت زیتون کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اُٹھے گا

روشنی کے اوپر روشنی! اللہ اپنے نور کی ہدایت جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اور اللہ یہ تمثیلیں لوگوں کی رہنمائی کے لیے بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے ـــ یہ طاق ایسے گھروں میں ہیں جن کی نسبت خدا نے امر فرمایا کہ وہ تعمیر کیے جائیں اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے۔ ان میں ایسے لوگ صبح و شام خدا کی تسبیح کرتے ہیں جن کو کاروبار اور خرید و فروخت اللہ کی یاد، نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتے۔ وہ ایک ایسے دن کی آمد سے اندیشہ ناک رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں سب مضطرب ہوں گے۔ کہ اللہ ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے اور ان کو اپنے فضل سے مزید نوازے اور اللہ جس کو چاہے گا بے حساب بخشے گا۔ ۳۵-۳۸

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی تمثیل یہ ہے کہ جیسے چٹیل صحرا میں سراب ہو جس کو پیاسا پانی گمان کرے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا البتہ اس کے پاس اللہ کو پائے گا پس وہ اس کا حساب چکا دے گا اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ یا یوں خیال کرو کہ جیسے ایک گہرے سمندر کے اندر تاریکیاں ہوں، موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو، اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ تاریکیوں پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہوں۔ اگر اپنا ہاتھ بھی نکالے تو اس کو بھی نہ دیکھ پائے اور جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔ ۳۹-۴۰

۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّ لَ

غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ يَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ (۳۵)

جو خدا کو نہیں مانتا اس کے لیے یہ کائنات بالکل ظلمات ہے

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یہ آسمان و زمین بلکہ یہ پوری کائنات اس شخص کے لیے ایک عالم ظلمات اور اندھیر نگری ہے جو خدا کو نہیں مانتا یا مانتا ہے لیکن خدا کی صفات اور ان کے مقتضیات کو نہیں تسلیم کرتا۔ ایسا شخص نہ یہ جان سکتا کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے اور نہ یہ جان سکتا کہ اس کے وجود میں آنے کی غایت اور مقصد کیا ہے؛ وہ خود اپنے متعلق بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کا مقصد وجود کیا ہے؛ وہ اس دنیا میں مطلق العنان اور بے مہار ہے یا پابند و محکوم؛ وہ مسئول ہے یا غیر مسئول؛ اس کے لیے کیا خیر ہے اور کیا شر؛ اسے ظلم کی روش اختیار کرنی چاہیے یا عدل کی؛ اسے صرف اپنے مفاد اور خواہشوں کی پیروی کرنی چاہیے یا ان سے کسی بالاتر نصب العین کی؛ ان سوالوں کے صحیح جواب ہی پر صحیح اور کامیاب زندگی کا انحصار ہے لیکن جو شخص خدا کو نہیں مانتا وہ ان سوالوں کا صحیح حل نہیں پا سکتا۔ وہ اندھیرے میں اندھے بھینسے کی طرح بھٹکتا پھرتا ہے اور بالآخر ایک دن قعر ہلاکت میں گر کر اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے۔

جو خدا کو مانتا ہے اس کو رات بھی دن کی طرح روشن ہے

البتہ جو شخص خدا کو اس کی صحیح صفات کے ساتھ مانتا ہے وہ اس کائنات کا سرا بھی پا جاتا ہے اور اس کا انجام بھی اس پر واضح ہو جاتا ہے۔ اس پر ان تمام سوالوں کے جواب بھی روشن ہو جاتے ہیں جن کو خدا کا نہ ماننے والا کبھی حل نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے یہ دنیا اس کے لیے اندھیر نگری نہیں رہتی بلکہ ایمان کے نور سے اس کے لیے اس کی ہر چیز جگمگا اٹھتی ہے اور اس کا ہر پہلو اس پر روشن ہو جاتا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے پورے دن کی روشنی میں اٹھاتا ہے اور جس سمت میں بھی چلتا ہے خدا کے ایمان کا نور اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی حقیقت اس ٹکڑے میں واضح فرمائی گئی ہے کہ اس آسمان و زمین کا نور اللہ ہے جس کے پاس یہ نور ہے وہ روشنی میں اور صراط مستقیم پر ہے۔ اور جو اس نور سے محروم ہے وہ ایک عالم ظلمات میں بھٹک رہا ہے اور کوئی دوسرا اس کو روشنی نہیں دے سکتا۔ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔

دل کے اندر نور ایمان کی تمثیل

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ۔ یہ تمثیل بیان ہو رہی ہے اس بات کی کہ جس دل کے اندر ایمان کی روشنی داخل ہوتی ہے وہ اس کی فطرت کے نور کے اوپر ایک اور نور کا اضافہ کر دیتی ہے جس سے اس کا باطن مطلع الانوار بن جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس نور ایمان کی تمثال قلب کے اندر یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ رکھ دیا گیا ہو۔ چراغ ایک گلوب کے اندر ہو اور گلوب کا شیشہ ایک چمکتے تارے کے مانند چمک رہا ہو۔

'مشکوٰۃ' سے مراد انسان کا دل ہے جس کو چراغ رکھنے کے طاق یا چراغ دان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چراغ کے لیے قاعدہ ہے کہ وہ گھر میں اونچی جگہ پر رکھا جاتا ہے تاکہ روشنی پورے گھر کے اندر پھیلے۔ انسان کے اندر دل ہی وہ جگہ ہے جہاں روشنی ہو تو وہ اس کے سارے ظاہر و باطن میں پھیلتی ہے۔ اس چراغ کی نسبت

فرمایا کہ وہ ایک شیشہ کے اندر بند ہے۔ شیشہ کے اندر بند ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ چراغ کی لَو ہوا کے جھونکوں سے منتشر نہیں ہونے پاتی بلکہ ایک مرکز پر مرتکز رہتی ہے جس سے اس کی تابانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک یہی حال ایمان کے فیض سے قلب کا ہوتا ہے۔ وہ بھی ڈانوا ڈول ہونے سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے۔ خواہ کیسے ہی حالات ہوں لیکن وہ ہر حال میں راضی و مطمئن رہتا ہے۔ ایسے ہی دل کو قرآن میں 'نفسِ مطمئنہ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور یہ سب سے بڑی دولت ہے جو انسان کو ایمان کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔

اس شیشہ کے متعلق فرمایا کہ وہ ایک چمکتے ستارے کی مانند ہے۔ شیشہ اگر میلا ہو تو وہ نہ صرف یہ کہ روشنی میں کوئی اضافہ نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے حجاب بن جاتا ہے۔ فرمایا کہ ایمان کی روشنی ہر قسم کی کثافت سے دل کو پاک و صاف کر کے آئینہ کی طرح اس کو مجلّی کر دیتی ہے۔

یُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۚ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ۚ

مبارکۃ اپنے لغوی مفہوم میں

'مُبٰرَكَةٍ' یہاں اپنے لغوی مفہوم میں ہے جس طرح زرخیز و شاداب زمین کو قرآن میں مبارک کہا گیا ہے اسی طرح یہاں شاداب اور ثمر آور درخت کے لیے لفظ 'مبارک' استعمال ہوا ہے۔

وسطِ باغ کے درخت کی خصوصیات

'لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ' یہ شجرۂ مبارکہ کی صفت ہے۔ یعنی یہ درخت نہ تو باغ کے شرقی جانب کا ہے اور نہ غربی جانب کا بلکہ وسطِ باغ کا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ باغ کے کناروں کے درخت بالخصوص، جو مشرق یا مغرب میں ہوں ہمیشہ دھوپ اور ہوا کی زد میں ہونے کے سبب سے اتنے اچھے پھل نہیں دیتے جتنے اچھے پھل وسطِ باغ کے درخت دیتے ہیں اس وجہ سے یہ قید بڑھا کر اس درخت کی غایت درجہ شادابی و ثمرباری کی طرف اشارہ فرما دیا۔

ایمان کی روشنی ان کو نصیب ہوتی ہے جن کی فطرت صالح ہوتی ہے

یہ اس چراغ کی مزید صفت بیان فرمائی کہ یہ ایک ایسے شاداب و زرخیز درخت زیتون کے روغن سے جلتا ہے جو نہ باغ کی مشرقی جانب کا ہے نہ مغربی جانب کا بلکہ وسطِ باغ کا ہے اور اس کا روغن اتنا صاف و شفاف ہے کہ معلوم ہوتا ہے آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔

یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ ایمان ان لوگوں کے سینوں کو اپنا نشیمن بناتا ہے جن کی فطرت ہر قسم کے فساد اور بگاڑ سے محفوظ ہو۔ جن کی فطرت کا روغن غیر فطری ملاوٹوں سے پاک ہوتا ہے وہ خود دعوتِ ایمان کی ذرا سی رگڑ سے بھڑک اٹھتا ہے اور اس طرح فطرت کے نور کے اوپر ایمان کے نور سے سینہ 'نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ' بن جاتا ہے۔

'یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ' 'ھدی یھدی' کا صلہ جب 'لِ' کے ساتھ آتا ہے تو وہ توفیق بخشی کے مفہوم پر بھی، جیسا کہ سورۂ یونس ۳۵ میں ہم واضح کر چکے ہیں، متضمن ہوتا ہے۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو ایمان و ہدایت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی

ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس نورِ ایمان سے انہی لوگوں کے دلوں کو منور فرماتا ہے جو اپنی فطرت کے روغن کو محفوظ رکھتے ہیں۔ جو اس روغن کو ضائع کر بیٹھتے ہیں یا اس کے اصل مزاج کو اپنے تیغ و انحراف سے بگاڑ لیتے ہیں ان کے دل ایمان کی روشنی کو نہیں پکڑتے۔ 'لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ' کے الفاظ اسی زیغ و انحراف سے محفوظ ہونے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان الفاظ میں ایک لطیف تلمیح یہود و نصاریٰ کی اس نزاع کی طرف بھی ہے جو قبلہ کے تعلق سے ان کے مابین، مشرق و مغرب کے باب میں، برپا ہوئی اور جس کے سبب سے وہ اصل نقطۂ وسط سے اتنے دور ہو گئے کہ ہمیشہ کے لیے امتِ وسط کے شرف سے محروم ہو گئے اور قبولِ اسلام کی سعادت ان کو حاصل نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مزید توفیق کے دروازے انہی کے لیے کھولتا ہے جو پہلے سے بخشی ہوئی توفیق کی قدر کرتے ہیں، جو اس کی قدر نہیں کرتے ان سے وہ ہدایت بھی واپس لے لی جاتی ہے جو فطرت کے ذریعہ سے ان کو بخشی جاتی ہے۔ سیدنا مسیحؑ کا ارشاد ہے کہ جو ایک پیسہ میں چور ہے اس کو ایک لاکھ کی امانت نہیں سونپی جاتی۔

'وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ'۔ 'لِلنَّاسِ' سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی لوگوں کی تعلیم و تذکیر کے لیے اللہ تعالیٰ یہ تمثیلیں بیان فرماتا ہے تاکہ لوگ ان سے ایمان کی قدر و قیمت پہچانیں اور اس کے نور سے اپنے دلوں کو منور کریں۔ تمثیلیں حقائق کو واضح کرنے کا سب سے اعلیٰ اور کارگر ذریعہ ہوتی ہیں۔ اگر لوگ ان سے بھی فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ ان کی محرومی ہی ہے!

'وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ' یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی مشیت ہمیشہ اس کے علم و حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے اس وجہ سے ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جس کا وہ سزاوار ہوتا ہے۔

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۙ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۶-۳۸)

'فی بیوت' کا کلام میں محل

'فِيْ بُيُوْتٍ' الآیۃ۔ 'فِيْ بُيُوْتٍ' کا تعلق میرے نزدیک 'مِشْكٰوةٍ' سے ہے۔ اس ظرف نے واضح کر دیا کہ اس تمثیل میں بت خانوں اور مے خانوں کے طاق کی مثال پیش نہیں کی گئی ہے بلکہ اللہ کے معابد کے طاقوں کی مثال پیش کی گئی ہے۔

تمثیل میں معابد کے ذکر کی وجہ

تمثیل میں ظاہر ہے کہ مشکوٰۃ سے مراد قلبِ سلیم یا بالفاظ دیگر قلبِ مومن ہے۔ یہ قلب ہر قالب میں نہیں پایا جاتا بلکہ خاص خاص قالبوں ہی میں پایا جاتا ہے اور یہ قالب ہر جگہ نہیں ملتے بلکہ ان کے ملنے کی اصل جگہ خدا کی مساجد اور اس کے معابد ہیں۔ زمخشریؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ ان کے نزدیک اصل تالیفِ کلام یوں ہے "فی بیت من بیوت اذن اللہ ان ترفع ...... الایۃ"

تمثیل میں اشارہ مساجد کے طاقوں کی طرف ہے

اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۔ 'رفع' یہاں بنانے اور تعمیر کرنے کے معنی میں ہے۔ مثلاً وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ (بقرہ ۱۲۷) (اور یاد کرو جب کہ ابراہیم بیت اللہ کی بنیادیں تعمیر کر رہے تھے) اور 'ذکر' یہاں نماز اور ذکر و دعوت کی ان تمام شکلوں پر حاوی ہے جو اللہ کی یاد اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے اختیار کی جائیں۔ 'اَذِنَ اللّٰهُ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گھر خدا کے حکم سے تعمیر ہوئے کہ ان میں اس کا کلمہ بلند کیا جائے۔ اگرچہ یہاں الفاظ عام ہیں لیکن ان کے اولین مصداق وہ معابد ہیں جو براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہوئے مثلاً بیت اللہ جس کی تعمیر کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کو دیا یا بیت المقدس جس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اذن سے فرمائی۔ پھر وہ معابد بھی انہی کے حکم میں داخل ہوں گے جو ان کی شاخوں کی حیثیت سے تعمیر ہوئے۔ رہے وہ معابد جو مشرکوں نے اذنِ الٰہی کے بالکل خلاف اپنے اصنام و اوثان کی پرستش کے لیے قائم کیے وہ اس حکم سے خارج ہیں۔ ان کی حیثیت نجاست خانوں کی ہے۔ ان کے طاق اس تمثیل میں مراد نہیں ہیں۔

يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝

مؤثر کے بعد اثر کا بیان

اوپر کی آیات میں ایمان کی تصویر و تمثیل ہے۔ جب بات مساجد کے ذکر تک پہنچ گئی تو وہیں سے حاملین ایمان کے ذکر کے لیے نہایت موزوں تقریب پیدا ہو گئی تاکہ واضح ہو جائے کہ اس ایمان کے جو لوگ حامل ہوتے ہیں ان کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ یہ مؤثر کی وضاحت کے بعد گویا اثر کا بیان ہوا تاکہ حقیقت عملی زندگی میں مصور ہو کر سامنے آ جائے۔ فرمایا کہ جن مساجد و معابد کے طاقوں کی یہاں تمثیل پیش کی گئی ہے ان میں صبح و شام اللہ کے ایسے بندے اس کی تسبیح کرتے ہیں جن کو تجارت اور بیع خدا کی یاد، نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتے اس لیے کہ وہ ایک ایسے دن کی آمد سے ہر وقت اندیشہ ناک رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں سب پر حالتِ اضطراب طاری ہوگی۔

'غدو و آصال' کا مفہوم

'غدو و آصال' عربی میں اس مفہوم میں بولے جاتے ہیں جس مفہوم میں ہم اپنی زبان میں صبح و شام کے الفاظ بولتے ہیں۔

'رجال' سے مراد

لفظ 'رجال' سے ان لوگوں کی غایت درجہ تعریف واضح ہو رہی ہے۔ یعنی یہ وہ مردانِ خدا ہیں کہ انھیں اس دنیا کی کوئی چیز بھی خدا سے غافل نہیں کرتی۔ انھیں ہر چیز سے زیادہ خدا کی رضا مطلوب ہے۔

'تجارۃ' اور 'بیع' کا مفہوم

'تجارۃ' اور 'بیع' میں سے پہلا لفظ تو عام تجارتی کاروبار کے مفہوم میں ہے اور بیع بیچنے کے معنی میں مشہور ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ اگر کسی چیز کے بیچنے کا موقع ہو تو تاجر اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ تجارت تو درکنار اس طرح کے مواقعِ طمع بھی ان کو خدا سے غافل نہیں کرتے اور مومن کی اصل شان یہی ہے کہ وہ تجارت اور بیع و شرا سب کچھ کرے لیکن خدا کی یاد اور اس کے فرائض کی بجا آوری

سے غافل نہ ہو۔

نماز اور زکوٰۃ

نماز اور زکوٰۃ کا ذکر دین کے دو بنیادی فرائض کی حیثیت سے آیا ہے۔ انہی کے تحت درحقیقت پورا دین ہے۔ اس کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔

'تقلب قلوب و الابصار' کا مفہوم

'تتقلب فیہ القلوب والابصار' قیامت کے ہول کی تصویر ہے۔ یعنی اس دن ان لوگوں کو کسی کل چین نہیں پڑے گا جنھوں نے زندگی اس دن سے غفلت میں گزاری۔ ان کے دل اڑے جا رہے ہوں گے اور ان کی یہ بدحواسی ان کی نگاہوں سے ظاہر ہو گی۔

لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۸)

'لِ' ثمرۂ فعل کے اظہار کے لیے

یہ 'لِ' لامِ علت نہیں ہے بلکہ یہ وہ لام ہے جو کسی فعل کے انجام، نتیجہ اور ثمرہ کے بیان کے لیے آتا ہے۔ مثلاً فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا (قصص: ۸) (اور فرعون کے گھر والوں نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ان کے لیے دشمن اور غم بنے) امرؤ القیس کا ایک مشہور شعر ہے۔ ؎

وما ذرفت عیناک الا لتضربی
بسہمیک فی اعشار قلب مقتل

اس میں بھی غور کیجیے، 'لتضربی' پر 'لِ' نتیجۂ فعل ہی کے بیان کے لیے ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ آخرت کے اندیشہ سے اس دنیا میں، اللہ کی رضا جوئی کے لیے کر رہے ہیں اس کا صلہ ان کو ان کے اعمال سے کہیں بہتر ملے گا اور پھر مزید براں اللہ ان کو اپنے فضل سے نوازے گا اور اللہ جن کو اپنے فضل سے نوازتا ہے ان کو بے حساب بخشتا ہے 'بے حساب' یعنی جس کا ان کو سان گمان بھی نہیں ہو گا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۳۹)

کفر اور اہل کفر کے ظاہر و باطن کی تمثیل

ایمان اور حاملینِ ایمان کے ایمان و عمل کی تمثیل بیان کرنے کے بعد یہ کفر اور اہلِ کفر کے ظاہر و باطن کی تمثیل بیان ہو رہی ہے کہ اُدھر جس درجے کی روشنی ہوتی ہے اِدھر اسی درجے کی تاریکی ہوتی ہے۔ اہلِ ایمان کی تمثیل میں پہلے مؤثر یعنی ایمان کو نمایاں فرمایا تھا اس کے بعد اثر یعنی عمل کو اور اہلِ کفر کی تمثیل میں پہلے اثر کو نمایاں فرمایا ہے، اس کے بعد مؤثر کو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان ایک گہری حقیقت ہے جس کی جڑیں انسانی فطرت کے اعماق کے اندر اتری ہوئی ہوتی ہیں اور درحقیقت اسی کے بابرکت اثرات و ثمرات ہوتے ہیں جو زندگی کے اعمال و اخلاق میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس کفر گھورے پر اُگے ہوئے ایک درخت کے مانند ہوتا ہے جس کے زہریلے پھل تو اعمال کی (؟) صورت میں سامنے ہوتے ہیں لیکن فطرت کے اندر اس کی کوئی جڑ نہیں ہوتی جس کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہو۔

فرمایا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ان کی اور ان کے اعمال کی تمثیل یوں ہے کہ جیسے کسی چٹیل ریگستان میں سراب ہو جس کو پیاسا پانی سمجھ کر اس کی طرف بڑھے لیکن جب وہاں پہنچے تو اس پر یہ راز کھلے کہ وہ جس چیز کو لہریں لیتا ہوا پانی سمجھا وہ درحقیقت چمکتی ہوئی اور لہریں لیتی ہوئی ریت تھی اور یہ دیکھ کر وہ بالکل عاجز و درماندہ ہو کر رہ جائے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن! بالآخر وہیں پیاس سے تڑپ کر دم توڑ دے۔ فرمایا کہ یہی حال ان کفار کا قیامت کے دن ہوگا۔ یہ بھی جب اپنے اعمال کے پاس پہنچیں گے تو ان پر یہ راز کھلے گا کہ ان کے سارے اعمال 'هَبَآءً مَّنْثُوْرًا' خاک اور راکھ ہو کر پراگندہ ہو گئے۔ البتہ اس دن اپنے اعمال کی جگہ وہ اپنے رب سے دوچار ہوں گے اور وہ ان کا حساب پورا کر دے گا اور وہ چشم زدن میں حساب چکا دینے والا ہے۔

کفار کی محرومی کی تصویر روزِ قیامت

'حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ' سے لے کر آخر آیت تک اس محرومی کی تصویر ہے جس سے ان کفار کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا یعنی پوری بات یوں ہے کہ 'حَتّٰى اذا جاء الکافر اعمالہ یوم القیٰمۃ' چونکہ تمثیل میں اصل مقصد آخرت کی محرومی ہی کو واضح کرنا تھا اس وجہ سے کلام کا رخ بے تکلف اس کی طرف مڑ گیا اور ضمیر مفعول میں رعایت مشبہ بہ یعنی سراب کی ہے۔

قرآن میں لفظ کفار کا مفہوم

لفظ کفر (اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا) کہیں قرآن میں صرف منکرین خدا کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ قرآن کے مخاطبوں میں کوئی گروہ بھی منکر خدا نہیں تھا بلکہ سب مشرک تھے۔ انھیں مشرکوں کو قرآن نے کہیں کفار کہا ہے اور کہیں مشرکین اس سبب سے کہ شرک درحقیقت کفر ہی ہے۔ دین میں خدا کا صرف مان لینا ہی مطلوب نہیں بلکہ اس کی تمام صفات اور ان صفات کے تمام تقاضوں کے ساتھ ماننا مطلوب ہے۔ جو شخص خدا کو اس کی صفات اور ان کے مقتضیات کے ساتھ نہیں مانتا ہے اس کے سارے اعمال قیامت کے دن بالکل بے وزن ہو کے رہ جائیں گے خواہ اس نے وہ کتنی ہی کھکراہٹ کے انجام دیے ہوں۔

'وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ یہ درحقیقت اس مغالطہ کو دفع کرنے کے لیے فرمایا ہے جس میں بعض لوگ مبتلا ہوتے ہیں کہ آخرت اور حساب کتاب اگر ہے بھی تو یہ اتنی دور کی بات ہے کہ اس کے لیے ابھی سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی دنیا اور اتنے بے شمار اشخاص و افراد کے تمام اعمال و اقوال کا حساب کتاب کون کر سکتا ہے! فرمایا کہ جن لوگوں نے اس قسم کے اوہام میں پڑ کر ساری زندگی بطالت اور بدمستی میں گزار دی وہ آخرت میں دیکھیں گے کہ سارا حساب کتاب پلک جھپکتے ان کے سامنے آ گیا۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۴۰)

لجی کا مفہوم

'بَحْرٍ لُّجِّيٍّ' گہرے سمندر کو کہتے ہیں۔ 'لُجّ' سمندر کا وہ حصہ جہاں پانی سب سے زیادہ گہرا ہو۔ 'لُجّی' اسی کی طرف نسبت ہے۔

کفار کی ذہنی تاریکی کی تمثیل

اوپر والی آیت میں اہل کفر کے اعمال کی مثال تھی۔ اب یہ ان کی ذہنی تاریکی کی تمثیل ہے کہ وہ خدا کو نہ ماننے یا صحیح طور پر نہ ماننے کے سبب سے ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر زندگی گزارتے ہیں۔ اس اندھیرے کی مثال یہ ہے کہ گہرا سمندر ہو، رات اندھیری ہو، موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو اور اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں اور یہ ان تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر گھرے ہوئے ہوں۔ حال یہ ہو کہ اگر ہاتھ بھی نکالیں تو وہ بھی سجھائی نہ دیتا ہو۔ فرمایا کہ روشنی تو خدا کے ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کو اس کی بدبختی کے سبب سے خدا نے ایمان کی توفیق نہیں بخشی اس کو کہیں سے بھی روشنی حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ جب تک ایمان کی شاہراہ پر نہیں آئے گا اسی طرح تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا اور دن بدن اس کی تاریکیوں میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

۹۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۱-۵۷

ایمان اور کفر کی حقیقت واضح کر دینے کے بعد آگے کی آیات میں ایمان باللہ کی دعوت ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات میں اسی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا تصرف ہے، کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے اس وجہ سے سب اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کریں۔ پھر خاص طور پر منافقین کو تنبیہ کی ہے کہ اب ان کی منقسم وفاداری کی پالیسی نہیں چل سکتی، وہ یا تو یکسو ہو کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں داخل ہو جائیں ورنہ یاد رکھیں کہ اللہ اس سرزمین میں اپنے مخلص بندوں کو اقتدار بخشے گا اور ان کے تمام دشمن، خواہ چھپے ہوئے ہوں یا کھلے ہوئے، ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۱-۵۷

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۖ
كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٤١﴾
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ ﴿٤٢﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ
يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ
يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهِ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ
فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۖ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ
يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ ﴿٤٣﴾ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَعِبْرَةً

لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿٤٤﴾ وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّاءٍ ۖ فَمِنْهُم مَّن يَمْشِي
عَلَىٰ بَطْنِهِ ۖ وَمِنْهُم مَّن يَمْشِي عَلَىٰ رِجْلَيْنِ ۖ وَمِنْهُم مَّن يَمْشِي عَلَىٰ
أَرْبَعٍ ۚ يَخْلُقُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤٥﴾ لَّقَدْ
أَنزَلْنَا آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ ۚ وَاللَّهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٤٦﴾
وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُم
مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٧﴾ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ
وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٤٨﴾ وَإِن
يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ﴿٤٩﴾ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ
أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ
بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا ع ١٢
إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ
اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٥٢﴾ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ
جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۖ قُل لَّا تُقْسِمُوا ۖ طَاعَةٌ
مَّعْرُوفَةٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٣﴾ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ
أَطِيعُوا الرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا
حُمِّلْتُمْ ۖ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ
الْمُبِينُ ﴿٥٤﴾ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَ

لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ
ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾ ع ۷ ۱۴

ترجمۂ آیات ۴۱-۵۷

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے بھی پروں کو پھیلائے ہوئے۔ ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح معلوم ہے اور اللہ باخبر ہے اس چیز سے جو وہ کر رہے ہیں۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ ہی کی طرف ہے سب کی واپسی۔ ۴۱-۴۲

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہانکتا ہے بادلوں کو، پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے، پھر ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔ پھر دیکھتے ہو کہ ان کے بیچ سے مینہ نکلتا ہے۔ اور آسمان سے ـــــ اس کے اندر کے پہاڑوں سے ـــــ اولے برساتا ہے۔ پس جن پر چاہتا ہے ان کو نازل کرتا ہے اور جن سے چاہتا ہے ان کو ہٹا دیتا ہے۔ اس کی بجلی کی کوند معلوم ہوتا ہے کہ نگاہوں کو اُچک لے جائے گی۔ اللہ ہی ہے جو رات اور دن کو گردش دیتا ہے۔ بے شک ان چیزوں کے اندر اہلِ نظر کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے۔ ۴۳-۴۴

اور اللہ نے پیدا کیا ہر جاندار کو پانی سے، تو ان میں سے بعض تو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض دو پاؤں سے چلتے ہیں اور ان میں سے بعض چار پیروں پر چلتے ہیں۔ اللہ جو چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۵

ہم نے واضح کر دینے والی آیات اتار دی ہیں اور اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ

کی ہدایت دیتا ہے۔ ۴۶

اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی۔ پھر ان میں سے ایک گروہ پھر جاتا ہے اور یہ لوگ درحقیقت مومن نہیں ہیں اور جب یہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ پہلوتہی کرتا ہے۔ اور اگر حق ان کو ملنے والا ہو تو اس کی طرف نہایت فرمانبردارانہ آتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا یہ ابھی شک میں پڑے ہوئے ہیں یا ان کو اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے ساتھ ناانصافی کریں گے بلکہ یہ لوگ خود ہی ظالم ہیں۔ اہلِ ایمان کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی کسی باہمی نزاع کے فیصلہ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا اور درحقیقت یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے اور جو اس سے ڈریں گے اور اس کے حدود کی پاسداری کریں گے، وہی لوگ ہیں جو فائز المرام ہوں گے۔ ۴۷-۵۲

اور انھوں نے پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر تم ان کو جہاد کا حکم دو گے تو وہ ضرور نکلیں گے۔ کہہ دو کہ قسمیں نہ کھاؤ۔ بس دستور کے مطابق اطاعت اصل چیز ہے! جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ رسول پر صرف وہ ذمہ داری ہے جو اس پر ڈالی گئی ہے اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو راہ یاب ہو گے اور رسول پر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ ۵۳-۵۴

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عملِ صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے

اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔ ۵۵

اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے اور ان کافروں کی نسبت یہ گمان نہ کرو کہ یہ زمین میں ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور وہ بے شک نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۵۶-۵۷

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۴۱)

اس کائنات کی ہر چیز اپنے عمل سے خدا کی تسبیح کی دعوت دیتی ہے

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ حج کی آیت ۱۸ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کی پوری وضاحت کر چکے ہیں۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے اور ان کی ظاہری حالت، جو ہمارے مشاہدے میں آتی ہے، اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جس طرح وہ اپنے ظاہر میں ہر آن اپنے رب کے آگے سرفگندہ اور اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم ہیں اسی طرح ان کا باطن بھی ہر لمحہ اپنے رب کی تسبیح و تقدیس میں مصروف ہے۔ اگرچہ ہم ان کی زبان اور ان کی حرکات سے اچھی طرح آشنا نہ ہونے کے سبب سے، جیسا کہ فرمایا ہے۔ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (اسراء - ۴۴) ان کی تسبیح و نماز کو سمجھ نہیں سکتے۔ یہ ساری چیزیں اپنی زبان حال سے انسان کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ بھی اس حمد و تسبیح میں ان کے ساتھ شامل ہو اور انہی کی طرح صرف اپنے رب ہی کی بندگی کرے۔ اگر وہ اس سے کوئی الگ راہ اختیار کرتا ہے تو گویا وہ ساری دنیا سے بالکل جدا راہ اختیار کرتا ہے اور ایک ایسی راگنی چھیڑتا ہے جو اس کائنات کے مجموعی نغمہ سے بالکل بے جوڑ ہے۔ اس میں خدا کی راہ اختیار کرنے والوں کی ہمت افزائی بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو تنہا یا اقلیت میں نہ سمجھیں۔ اس راہ کا مسافر کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ یہ راہ قافلوں سے بھری ہوتی ہے۔ اس میں ساری کائنات اس کی ہم سفر ہے۔ اگر تھوڑے سے ناشکرے انسان اس سے الگ ہوں تو ان کی علیحدگی سے وہ کیوں بددل اور مایوس ہو جب کہ خدا کے آسمان و زمین، اس کے شمس و قمر، اس کے دریا اور پہاڑ اور اس کے سارے چرند و پرند ہر وقت اس کے ہم رکاب ہیں۔

فضا کے پرندوں کی عبادت کی طرف اشارہ

'وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ' یہ آسمان و زمین کے درمیان کی چیزوں میں سے پرندوں کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ پرندے بھی فضا میں اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے خدا ہی کی تسبیح کرتے ہیں۔ دوسرے مقام میں پرندوں کے نغموں اور چہچہوں کا حوالہ ہے۔ یہاں ان کے پروں کے پھیلانے کا ذکر ہے جو خدا کے آگے ان کے افتراش کی تصویر ہے۔

ہر چیز کی عبادت کا طریقہ الگ الگ ہے

'كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ' یعنی یہ نہ خیال کرو کہ دنیا کی ہر چیز کے لیے خدا نے نماز اور تسبیح کا ایک ہی طریقہ ٹھہرایا ہے بلکہ اس نے ہر چیز کو تسبیح و عبادت کے الگ الگ طریقے الہام فرمائے ہیں، اور ہر چیز نے اپنی نماز و تسبیح کا طریقہ اچھی طرح سیکھ لیا ہے اور وہ اسی طریقہ کے مطابق خدا کی حمد و تسبیح کرتی ہے۔

'وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ' یعنی اگر تم ان کی تسبیح و عبادت کو نہیں جانتے تو اس سے کچھ فرق پیدا نہیں ہوتا۔ خدا ان کے ان تمام کاموں سے واقف ہے جو وہ کرتے ہیں اور خدا ہی تم کو ان کے اس کام سے آگاہ کر رہا ہے تاکہ تم اس سے سبق حاصل کرو۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (۴۲)

عبادت کا حقدار صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے

یہ اس بات کی دلیل ارشاد ہوئی کہ کیوں ہر چیز خدا ہی کی حمد و تسبیح کرتی ہے اور کیوں سب کو اسی کی حمد و تسبیح کرنی چاہیے۔ فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے اور سب کی واپسی بھی بالآخر خدا ہی کی طرف ہونی ہے۔ نہ اس کائنات کے نظام میں کسی کا کوئی دخل ہے اور نہ آخرت میں خدا کے سوا کوئی اور مرجع و ماویٰ بننے والا ہے تو جب یہاں اور وہاں ہر جگہ سارا اختیار و اقتدار اسی کو حاصل ہے تو اس کے سوا کسی دوسرے کی تسبیح و عبادت کس حق کی بنا پر کی جائے!

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ (۴۳)

رحمت اور نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ اس کائنات میں سارا اختیار و اقتدار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ وہی اس میں اپنے اختیارِ مطلق سے جو تصرف چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کی حکمت کے سوا اور کوئی اس میں دخیل نہیں ہے۔ دیکھو، زمین پیاسی ہوتی ہے، کسی کی طاقت نہیں کہ آسمان سے پانی کی ایک بوند ٹپکا دے۔ وہی اپنی ہواؤں سے بادلوں کو ہانک کر لاتا ہے، ان کے الگ الگ ٹکڑوں کو باہم جوڑ کر ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے۔ پھر ان سے ابرِ رحمت برساتا اور ساری زمین کو جل تھل کر دیتا ہے۔ اسی طرح دیکھو، اس کی رحمت کی طرح اس کی نقمت بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ انہی بادلوں کو جس کے لیے وہ چاہے عذاب بنا دیتا ہے وہ ان کے لیے پانی کے بجائے اپنے اندر گویا اولوں کے پہاڑ چھپائے ہوئے نمودار ہوتے ہیں۔ پھر جن پر

اس کا حکم ہوتا ہے وہ اولوں کی سنگ باری کر کے ان کو تباہ کر دیتے ہیں اور جن کو وہ چاہتا ہے اس آفت سے بچا لیتا ہے۔ کسی دوسرے کی مجال نہیں کہ وہ اس آفت سے اپنے کو یا دوسروں کو بچا سکے۔ ان بادلوں کے اندر جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک کا یہ حال ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کو اچک لے جائے گی۔

یہ امر واضح رہے کہ اس ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و نقمت دونوں پر اپنے تنہا اختیار کو واضح فرمایا ہے۔ پہلے ٹکڑے میں رحمت کی تمثیل ہے اور دوسرے ٹکڑے میں، جو 'وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ' سے شروع ہوتا ہے، اس کے عذاب کی تمثیل ہے۔ اس میں اشارہ سرما کے ان بادلوں کی طرف ہے جو تُند ہواؤں، شدید کڑک دمک اور اولوں کے ساتھ نمودار ہوتے اور ان سے ایسی بے پناہ ژالہ باری ہوتی کہ بستیاں کی بستیاں ان کے نیچے ڈھک جاتیں۔ گویا ان کے اندر اولوں کے پہاڑ ہیں۔ قرآن نے عذابِ الٰہی سے جن قوموں کی تباہی کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض قومیں اسی آفت سے تباہ ہوئیں۔ ہم ان کا ذکر ان کے محل میں کر چکے ہیں۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ (۴۴)

رات اور دن کی آمد و شد پر تنہا اللہ ہی کا اختیار ہے

اسی طرح رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کو لانا بھی خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ رات میں دن ظاہر کر دے یا دن میں رات نمودار کر دے یا ان کی آمد و شد میں منٹ یا سیکنڈ کا فرق ہی پیدا کر دے۔ فرمایا کہ ان تمام باتوں کے اندر جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، اہلِ نظر کے لیے بڑا سامان عبرت ہے۔ 'عبرۃ' کا مفہوم ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا ہے۔ یعنی جو لوگ وہ نظر رکھتے ہیں جو ظاہر کے اندر باطن اور جزئیات کے اندر کلیات کو دیکھ لینے والی ہے ان کو ان شاہدات کے بعد اس بات میں ذرا بھی شک باقی نہیں رہ سکتا کہ یہ کائنات ایک خدائے حکیم و قدیر کی بنائی ہوئی ہے جو اس ساری کائنات پر یکہ و تنہا حاکم و متصرف ہے اس وجہ سے تنہا وہی حقدار ہے کہ اس کی عبادت و اطاعت کی جائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہی 'عبرۃ' انسانیت کا اصلی جوہر ہے۔ اگر یہ جوہر کسی کے اندر نہیں ہے تو وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے اور جو آنکھ ظاہر کے اندر باطن کو نہ دیکھ سکے وہ کور ہے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَاۗبَّةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓي اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۵)

تعددِ انواع تعددِ آلہہ کی دلیل نہیں

یعنی انواع و اجناس اور اشکال و صور کا اختلاف و تعدد بھی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کائنات میں مختلف ارادے کار فرما ہیں، جیسا کہ نادان مشرکوں نے سمجھا، بلکہ یہ اس دنیا کے خالق کی

قدرت وحکمت کی دلیل ہے۔ ایک ہی پانی سے اس نے تمام جانداروں کو وجود بخشا۔ ان میں سے بعض پیٹوں کے بل رینگتے ہوئے چلتے ہیں، بعض دو ٹانگوں پر چلتے ہیں، بعض چار پیروں پر چلتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دو ٹانگوں والوں کا خالق الگ اور چار ٹانگوں والوں کا خدا الگ ہے! سب کا خالق ایک ہی ہے۔ وہی اپنی قدرت سے جو چاہے پیدا کرتا ہے اور جس کو جو شکل و صورت چاہتا ہے دیتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے اس وجہ سے سب کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اسی کے حوالہ اور اسی کی بندگی و اطاعت کریں۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴۶)

ہدایت وضلالت کے معاملہ میں سنتِ الٰہی

یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ آیت ۳۴ میں گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ آنکھیں کھول دینے والی اور صراطِ مستقیم کو دکھا دینے والی آیتیں اتار دی ہیں۔ اب ہم اپنی سنت کے مطابق ان لوگوں کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دیں گے جو اس کے طالب بنیں گے۔ رہے ناقدرے اور ناشکرے لوگ تو وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہیں گے، یہاں تک کہ ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا نے اپنی مشیت کو اپنی سنت کے تحت رکھا ہے جو اس اعتبار سے تو مطلق ہے کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا اس کو بدل نہیں سکتا لیکن اس کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے۔

وَیَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ (۴۷)

منافقین کے رویہ پر تبصرہ

تفویض الی اللہ کی عام دعوت کے بعد اب یہ خاص طور پر منافقین کو لیا ہے جن کے فتنے اس دور میں، جیسا کہ فتنۂ افک سے معلوم ہوتا ہے، بہت بڑھ گئے تھے۔ فرمایا کہ جہاں تک زبانی اظہار و اعلان کا تعلق ہے یہ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اللہ و رسول کے ایمان اور اطاعت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب اس دعوئے ایمان و اطاعت کے امتحان کا وقت آتا ہے تو یہ بالکل پھسڈی ثابت ہوتے ہیں۔

'وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ' یعنی اس قسم کے مدعیانِ ایمان اللہ کے نزدیک مومن نہیں ہیں۔ ایمان کا حق صرف کلمہ پڑھ دینے سے پورا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے شرط لازم ہے کہ اللہ و رسول کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے۔ اگر کوئی شخص یہ شرط پوری نہیں کرتا تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا اور پکا منافق ہے۔

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۴۸)

رسول کی عدالت سے کترانے والے منافقین

یہ ان کے نفاق اور عدم ایمان کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ جب ان کے درمیان کوئی قضیہ پیدا ہوتا ہے اور ان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ اس کو اللہ اور رسول کے سامنے پیش کریں تاکہ اللہ کا رسول اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کرے تو ان میں سے ہر ایک گروہ برابر اعراض کی روش اختیار کرتا ہے۔ اللہ

کی طرف دعوت کے معنی ظاہر ہے کہ اللہ کے قانون کے سامنے پیش کرنے کی دعوت کے ہیں جس کا ترجمان اللہ کا رسول ہوتا ہے۔ اللہ کا رسول جو فیصلہ کرے وہی اللہ کا فیصلہ ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ و رسول کے ایمان کا مدعی ہے لیکن اپنے معاملات کے فیصلہ کے لیے دوسروں کی طرف رجوع کرتا ہے، رسول کی عدالت سے کتراتا ہے تو وہ منافق ہے۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو اس کتاب میں دوسرے مقام میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے کہ ابتداءً جب تک اطرافِ مدینہ میں یہود بھی اپنے اپنے دائروں میں اثر و رسوخ رکھتے رہے، منافقین کی یہ روش رہی کہ وہ اپنے فیصلے انہی کی عدالتوں میں لے جاتے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ یہود نے شریعتِ الٰہی کو محرّف کرکے بالکل خواہشاتِ نفس کے سانچے میں ڈھال لیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے حکام کو رشوت دے کر بڑی آسانی سے خریدا جا سکتا تھا۔ اس صورتِ حال سے منافقین یہ فائدہ اٹھاتے کہ اگر ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے اپنے حسبِ منشا فیصلہ حاصل کر سکنے کی توقع ہوتی تب تو اپنے ایمان و اسلام کی نمائش کے لیے نہایت فرمانبردارانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں مقدمہ لاتے اور اگر یہ توقع نہ ہوتی تو یہود کی عدالتوں سے رجوع کرتے۔

وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (۴۹)

یعنی اگر انھیں یہ اندازہ ہوتا کہ پیشِ نظر قضیہ میں اسلام کے قانون کا فیصلہ ان کے حق میں ہے تب تو نہایت فرمانبردارانہ معاملہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لاتے اور اگر یہ اندازہ ہوتا کہ اسلام کا قانون ان کے مفاد کے خلاف ہے تو یہود کی عدالتوں میں لے جاتے۔ ان کی اس روش کو قرآن نے 'تحاکم الی الطاغوت' سے تعبیر کیا ہے اور اس کو شرک قرار دیا ہے جس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵۰)

'مرض' کا مفہوم

لفظ 'مَرَض' جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، قرآن میں حسد کی تعبیر کے لیے بھی آیا ہے اور نفاق کی تعبیر کے لیے بھی۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے نفاق مراد ہے۔ حسد و نفاق دونوں کا دل کی بیماری کی حالت ہونا واضح ہے۔

'ارتیاب' کا مفہوم

'اِرْتِیَاب' کے معنی مبتلائے شک ہونے کے ہیں۔ یہ شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے باب میں بھی ہو سکتا ہے اور اسلام کے مستقبل کے باب میں بھی۔ منافقین کی مذبذب پالیسی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ ڈرتے تھے کہ مسلمانوں اور ان کے مخالفوں میں جو کشمکش اس وقت برپا ہے اس میں آخری بازی معلوم نہیں کس کی رہے تو مصلحت یہی ہے کہ دونوں کے ساتھ تھوڑا تھوڑا تعلق باقی رکھا جائے تاکہ دونوں میں سے جس کی بھی فتح ہو اپنا مفاد محفوظ رہے۔

'حیف' کا مفہوم 'حیف' کے معنی ظلم و جور کے ہیں۔

منافقین کی پالیسی کا پوسٹ مارٹم فرمایا کہ ان منافقین نے یہ 'نیمے دروں نیمے بروں' کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے یہ تین حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو ان کے دلوں کے اندر نفاق کا روگ ہے، یا وہ رسول کی رسالت اور اسلام کے مستقبل کی طرف سے ابھی شک میں ہیں یا انھیں اندیشہ ہے کہ اگر وہ اپنے معاملات اللہ و رسول کی عدالت میں لائیں گے تو اللہ و رسول ان کے ساتھ ناانصافی کریں گے۔ اب وہ خود فیصلہ کریں کہ وہ ان تینوں میں سے کسی ایک بیماری میں مبتلا ہیں یا بیک وقت تینوں ہی میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے جو بات بھی ہو بہرحال وہ ایمان کے منافی ہے۔

منافقین کے رویہ پر تبصرہ 'بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ' یعنی انھیں اللہ و رسول سے ظلم و ناانصافی کا اندیشہ ہے حالانکہ وہ یہ روش اختیار کر کے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ وہ اپنے گمان میں اپنے مستقبل کے مفاد کو محفوظ کر رہے ہیں حالانکہ انھوں نے ایک گرتی دیوار کے سایہ میں پناہ لی ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۱)

سچے مسلمانوں کی شان یہ سچے مسلمانوں کی شان بتائی کہ ان کو جب کسی معاملہ کے فیصلہ کے لیے اللہ و رسول کی طرف بلایا جائے تو ان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ وہ یہ کہتے ہوئے اس کو قبول کریں کہ 'ہم نے سنا اور مانا' فرمایا کہ جو لوگ اس طرح ہر لوث اور ہر طمع و خوف سے بالاتر ہو کر اپنے آپ کو اللہ و رسول کے حوالہ کریں گے درحقیقت دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے حقیقی مفاد کو محفوظ کرنے والے وہی ہیں نہ کہ یہ لوگ جو بیک وقت کفر و اسلام دونوں سے اپنے مفاد کے حد تک دوستی رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ دو کشتیوں کے سوار لازماً ڈوب کے رہیں گے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۵۲)

'يَتَّقْهِ' میں تخفیف کی وجہ سے لفظ کی شکل کچھ بدل گئی ہے لیکن اس قسم کی تخفیف عربی میں معروف ہے۔

'خشیت' اور 'تقویٰ' سے مراد 'خشیۃ' اور 'تقویٰ' یہاں دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک 'خشیۃ' یہاں دل کی حالت کی تعبیر کے لیے ہے اور 'تقویٰ' سے مراد حدود الٰہی کی پاسداری ہے۔ یعنی ایک کا تعلق باطن سے ہے، دوسرے کا تعلق ظاہر سے۔

اصلی فائز المرام گروہ فرمایا کہ اصل فائز المرام ہونے والے وہ لوگ ہیں جو نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں، اپنے تمام ذاتی اغراض و مفادات سے بالاتر ہو کر، اللہ و رسول کی اطاعت کریں اور ان کے دلوں میں اللہ کا خوف ہو اور وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں خدا کے حدود کی پوری پوری پاسداری کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نجات و فلاح کے لیے اوّل تو مجرد دعوائے ایمان کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بھی شرط لازم ہے۔ ثانیاً محض اطاعت بھی کافی نہیں ہے بلکہ اس اطاعت کے ساتھ خدا کی خشیت اور تقویٰ بھی

ہونا ضروری ہے۔ فرمایا کہ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ، یہی لوگ فائز المرام ہونے والے ہیں۔ رہے وہ مفاد پرست جو محض اپنے مفاد کے حد تک اللہ و رسول کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اللہ اور رسول کو ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵۳)

منافقین کی روش جہاد کے معاملہ میں

سمع و طاعت کا عہد کرنے کے باوجود منافقین جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے کتراتے تھے اسی طرح جہاد سے بھی کتراتے تھے۔ زبان سے لاف زنی کا تو یہ حال تھا کہ جب جہاد کا ذکر آتا تو بڑی زور دار قسمیں کھا کھا کے حضورؐ کو یقین دلاتے کہ جب آپ کا حکم ہوگا ہم جان و مال سے حاضر ہیں لیکن جب وقت آتا تو کترا جاتے۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ قسمیں زیادہ نہ کھاؤ، قسمیں عمل کا بدل نہیں بن سکتیں۔ اصل شے جو مطلوب ہے وہ اصول کے مطابق اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ اگر یہ چیز موجود نہیں ہے تو خالی خولی قسموں سے تم کتنے دن اپنے کردار پر پردہ ڈالے رکھ سکو گے!

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، یعنی ان جھوٹی قسموں سے تم دوسروں کو دھوکا دے سکتے ہو لیکن اس علام الغیوب کو کس طرح دھوکا دے سکتے ہو جو تمہارے ہر قول و فعل سے اچھی طرح باخبر ہے۔

قرآن میں منافقین کے زیادہ قسمیں کھانے کا ذکر دوسرے مقامات میں بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔ اس کی نفسیاتی وجہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ جن کے پاس کردار کی شہادت موجود نہیں ہوتی وہ اپنے کو معتبر ثابت کرنے کے لیے قسموں ہی کو ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کے دلوں کے اندر یہ چور چھپا ہوا ہوتا ہے کہ جب تک وہ قسم نہیں کھائیں گے مخاطب ان کی بات باور نہیں کرے گا۔ ثقہ اور صاحب کردار آدمی کو اپنے کردار پر اعتماد ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو قسم کھانے کی ضرورت زیادہ پیش نہیں آتی۔

طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ میں تالیف کلام

طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ اسی طرح کا جملہ ہے جس طرح فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ہے۔ یہ خبر محذوف کا مبتدا بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ اگر نکرہ موصوف ہو تو اس کے اندر مبتدا ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور مبتدائے محذوف کی خبر بھی۔ دونوں ہی صورتوں میں مفہوم میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوگا اس لیے کہ اس قسم کے حذف سے اصل مقصود مخاطب کی پوری توجہ کو مذکور پر مرتکز کرنا ہوتا ہے اور یہ چیز دونوں ہی صورتوں میں یہاں حاصل ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۵۴)

منافقین کو تہدید و نصیحت

یہ منافقین کو تنبیہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اگر اس چیز سے منہ موڑو گے تو یاد رکھو کہ تم رسول کا کچھ نہیں بگاڑو گے بلکہ اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔ تمہارے معاملے میں رسول کے اوپر صرف اتنی ہی ذمہ داری ہے جو اللہ کی طرف سے اس پر ڈالی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اللہ کا دین تمہیں واضح طور پر پہنچا دے۔

سو اس نے اپنا یہ فرض بحسن و خوبی ادا کر دیا۔ اب یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ وہ تمھیں ایمان و ہدایت کے راستہ پر چلا بھی دے۔ ایمان و ہدایت کی راہ اختیار کرنے کی ذمہ داری خود تمھارے اوپر ہے اور خدا کے ہاں تمھی کو اس کی جواب دہی کرنی ہے کہ رسول کی بات تم نے کیوں نہیں مانی اور یہ ہدایت کی راہ کیوں نہیں اختیار کی؟

'وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا'۔ اس فقرے میں تہدید اور نصیحت دونوں ہے۔ یعنی رسول کی اطاعت کرو، فوز و فلاح کی راہ اسی سے پاؤ گے ورنہ یاد رکھو کہ اپنی شامت بلاؤ گے۔

رسول کی ذمہ داری صرف بلاغِ مبین ہے

'وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ'۔ یہ رسول کی ذمہ داری واضح فرما دی کہ خدا کی طرف سے اس پر ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ واضح طور پر لوگوں کو اللہ کا دین پہنچا دے۔ اب اس کے بعد اگر تم اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتے ہو تو اس کا خمیازہ خود بھگتو گے۔

ایمان کا لازمی تقاضا اطاعت

ان آیات میں دیکھیے بار بار ایمان کا لازمی تقاضا اللہ اور رسول کی اطاعت کو بتایا گیا ہے اور اللہ کی اطاعت کا راستہ رسول کی اطاعت کو قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بغیر مجرد 'اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُولِ' کہہ دینے سے اگر ایمان کا حق ادا ہو جاتا تو یہ منافقین اس اقرار و اعلان میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ وہ تو 'اٰمَنَّا' کے ساتھ 'اَطَعْنَا' کا بھی اقرار کرتے تھے اور اپنے دعوے کی صداقت پر نہایت پکی پکی قسمیں بھی کھاتے تھے۔ پھر آخر وہ 'فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ' کے سزاوار کیوں ٹھہرے!

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵۵)

رسول کے پیرؤوں کے لیے غلبہ و تمکن کی بشارت

یہ منافقین کے اس شک پر ضرب لگائی ہے جو اسلام کے مستقبل سے متعلق اپنے دلوں میں وہ رکھتے تھے اور جس کی طرف اوپر 'اَمِ ارْتَابُوْا' کے الفاظ سے اشارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ پوری راست بازی کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کر لیں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہو چکا ہے کہ اللہ ان کو اس سرزمین میں اسی طرح اقتدار بخشے گا جس طرح پچھلے رسولوں کی امتوں کو اس نے اقتدار بخشا اور ان کے دین کو، جس کو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، اس ملک میں مستحکم کرے گا اور ان کی اس خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔

یہاں جس وعدے کا حوالہ ہے اس کا ذکر سورۂ انبیاء، سورۂ حج اور سورۂ مؤمنون میں پوری وضاحت کے ساتھ گزر چکا ہے۔

'كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ' سے سابق رسولوں اور ان کی امتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ہم رسولوں کے باب میں اس سنتِ الٰہی کا حوالہ بار بار دے چکے ہیں کہ رسول اور اس کے پیرؤوں کے لیے اس دنیا میں غلبہ لازمی ہے۔ رسول کے اتمامِ حجت کے بعد اس کے جھٹلانے والے لازماً تباہ کر دیے

گئے اور قیادت و سیادت کی باگ ان کے بعد ان لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو رسول پر ایمان لائے۔

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ۔ یعنی اس دینِ اسلام کو جس کو ان کے لیے اللہ نے پسند فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔ وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا' اس دین کو اس سرزمین میں متمکن کرے گا۔ یعنی اسی دین کا قانون اس ملک میں چلے گا اور اسی کی اساسات پر اس ملک کا نظامِ اجتماعی و سیاسی استوار ہوگا۔ اس دین کے سوا کسی اور دین کا اقتدار اس ملک میں باقی نہیں رہے گا۔

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔ یعنی اس وقت اس دین کے دشمنوں کے سبب سے جو خوف و اندیشہ کی حالت ہے، یہ ایک عارضی حالت ہے۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب اس خوف کی حالت کو اللہ تعالیٰ امن سے بدل دے گا اور اس ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک کسی کی مجال نہ ہوگی کہ وہ اللہ کے دین یا اس دین کے عاملوں کے لیے کوئی خطرہ پیدا کر سکے۔

يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا۔ یعنی اس سرزمین پر تنہا میری ہی عبادت ہوگی، میرے سوا کسی اور کی عبادت نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ فتح مکہ کے بعد جس طرح پورا ہوا وہ تاریخ کی ایک ایسی حقیقت ہے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ پورے جزیرۂ عرب کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرما دیا کہ 'لا يجتمع فيها دينان' (اس میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے)

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ یعنی آج تو ابھی امتحان اور آزمائش کا مرحلہ ہے اس وجہ سے ان لوگوں کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے جو اللہ کے دین کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن آگے فیصلہ کی گھڑی بھی آنے والی ہے اس وقت وہ لوگ اپنا انجام دیکھ لیں گے جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ' سے مقصود اس کے لازم کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۵۶)

یہ علاج بتایا ہے کہ اگر اپنے دلوں کو نفاق، خوف اور شک کے امراض سے پاک رکھنا چاہتے ہو تو نماز کا اہتمام کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رسول کے ہر حکم کی بے چون و چرا اطاعت کرو۔ اگر یہ راہ اختیار کرو گے تو تم پر اللہ کی رحمت ہوگی اور تم دنیا اور آخرت دونوں میں فائز المرام ہو گے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ وَلَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۵۷)

ان منافقین کے دلوں پر اسلام کے مخالفین خصوصاً قریش کی جو ہیبت طاری تھی یہ اس کو دور فرمایا ہے کہ ان کافروں کے متعلق یہ خیال نہ کرو کہ یہ ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔ یہ اس زمین میں بھی ہمارے قابو میں ہیں اور آخرت میں تو ان کے لیے بہرحال دوزخ ہے ہی اور یاد رکھو کہ وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔

۱۱- آگے کا مضمون ___ آیات ۵۸-۶۴

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ آیات ۲۷-۳۱ میں پردہ سے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے بارے میں جو سوالات و شکوک بعض لوگوں کے ذہنوں میں بعد میں پیدا ہوئے ان کی وضاحت ان آیات میں کی گئی ہے۔ یہ آیات چونکہ اصل احکام کے بعد نازل ہوئی ہیں اس وجہ سے ان کو سورہ کے آخر میں رکھا گیا اور ان کے ساتھ یہ تصریح بھی ہے کہ یہ آیات بطور وضاحت نازل ہوئی ہیں۔

آخر میں تین آیتیں منافقین سے متعلق ہیں جن کا ذکر اوپر آیات ۴۷-۵۰ میں ہوا ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں بھی بعد میں مزید تنبیہ کے طور پر نازل ہوئی ہیں اس وجہ سے اصل سلسلۂ کلام سے الگ ان کو آخر میں جگہ دی گئی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۸-۶۴ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِيَسْتَـْٔذِنكُمُ ٱلَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُمْ وَٱلَّذِينَ
لَمْ يَبْلُغُوا۟ ٱلْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَٰثَ مَرَّٰتٍ ۚ مِّن قَبْلِ صَلَوٰةِ ٱلْفَجْرِ وَ
حِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ ٱلظَّهِيرَةِ وَمِنۢ بَعْدِ صَلَوٰةِ ٱلْعِشَآءِ ۚ
ثَلَٰثُ عَوْرَٰتٍ لَّكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوَّٰفُونَ
عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلْءَايَٰتِ ۗ وَٱللَّهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٨﴾ وَإِذَا بَلَغَ ٱلْأَطْفَٰلُ مِنكُمُ ٱلْحُلُمَ فَلْيَسْتَـْٔذِنُوا۟
كَمَا ٱسْتَـْٔذَنَ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمْ ءَايَٰتِهِۦ ۗ
وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٩﴾ وَٱلْقَوَٰعِدُ مِنَ ٱلنِّسَآءِ ٱلَّٰتِى لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا
فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَن تَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَٰتٍۭ بِزِينَةٍ ۖ
وَأَن يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٦٠﴾ لَّيْسَ عَلَى ٱلْأَعْمَىٰ
حَرَجٌ وَلَا عَلَى ٱلْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى ٱلْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰٓ
أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا۟ مِنۢ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ ءَابَآئِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَٰتِكُمْ
أَوْ بُيُوتِ إِخْوَٰنِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَٰتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَٰمِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّٰتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ

أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ ۚ
لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا
فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ۚ كَذَٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۶۱) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ ع ۸ ۱۴
الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ
لَمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ
فَأْذَنْ لِمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَحِيمٌ (۶۲) لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۚ
قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ
يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيمٌ (۶۳) أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ قَدْ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ
عَلَيْهِ وَيَوْمَ يُرْجَعُونَ إِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيمٌ (۶۴) ع ۹ ۱۵

ترجمۂ آیات ۵۸-۶۴

اے ایمان والو، تمھارے غلام اور لونڈیاں بھی اور تمھارے اندر کے وہ بھی جو ابھی بلوغ کو نہیں پہنچے ہیں، تین وقتوں میں اجازت لیا کریں۔ ایک نماز فجر سے پہلے، دوسرے دوپہر کو جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو، اور نماز عشا کے بعد۔ یہ تین اوقات تمھاری بے پردگی کے ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ تمھارے اور ان کے اوپر بدون اجازت آنے جانے میں کوئی قباحت نہیں۔ تم ایک دوسرے کے پاس آمد و شد رکھنے والے ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے

لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور جب تم میں سے وہ جو بچے ہیں بلوغ کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ وہ بھی اسی طرح اجازت لیں جس طرح ان کے پہلوں نے اجازت لی۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور عورتوں میں سے بڑی بوڑھیاں، جو اب نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، اگر اپنے دوپٹے اتاریں تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں اور یہ بات کہ وہ بھی احتیاط کریں ان کے لیے بہتر ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۵۸-۶۰

نہ نابینا پر کوئی تنگی ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی ہے اور نہ مریض پر کوئی تنگی ہے اور نہ خود تمھارے اوپر کوئی تنگی ہے اس بات میں کہ تم اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اپنے زیرِ تولیت کے گھروں سے یا اپنے دوستوں کے گھروں سے کھاؤ پیو، خواہ اکٹھے ہو کر یا الگ الگ۔ بس یہ بات ہے کہ جب گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو جو اللہ کی طرف سے ایک بابرکت اور پاکیزہ دعا ہے۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ۶۱

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ اور جب کسی اجتماعی معاملہ کے لیے رسول کے پاس ہوتے ہیں تو اس وقت تک وہاں سے نہیں ٹلتے جب تک اس سے اجازت نہ لے لیں۔ جو لوگ تم سے اجازت لے کر جاتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ تو جب وہ اپنی کسی ضرورت سے اجازت مانگیں تو تم ان میں سے جس کو چاہو اجازت دے دیا کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو۔ بے شک اللہ

غفور رحیم ہے۔ ۶۲

تم لوگ رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں سے اچھی طرح باخبر رہا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جایا کرتے رہے ہیں۔ پس وہ لوگ جو اس کے حکم سے گریز کرتے رہے ہیں اس بات سے ڈریں کہ ان پر کوئی آزمائش آجائے یا ان کو ایک دردناک عذاب آپکڑے۔ آگاہ رہو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم جس حال پر ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے اور جس دن یہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا وہ اس سے ان کو باخبر کرے گا اور اللہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے۔ ۶۳-۶۴

۱۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَیْسَ عَلَیْكُمْ وَلَا عَلَیْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْیَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝ (۵۸-۵۹)

غلاموں اور بچوں کے لیے تین اوقات میں اجازت لینے کی پابندی

پیچھے آیت ۲۷ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں گھروں میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کی جو شرط لگائی ہے اس سے غلاموں اور نابالغ بچوں کو مستثنیٰ رکھا تھا۔ لیکن ان پر بھی یہ قید عائد کردی گئی کہ تین اوقات میں وہ بھی اجازت لیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت جب تم قیلولہ کے لیے کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ ان تین اوقات میں خاص احتیاط کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ اوقات بے تکلفی اور بے پردگی کے ہیں۔ فجر سے پہلے اور عشاء کے بعد کے اوقات کا بے پردگی کے اوقات ہونا تو واضح ہے۔ دوپہر کا وقت بھی عام طور پر آرام کا ہوتا ہے۔ خاص طور پر عرب میں گرم ملک ہونے کی وجہ سے، اس وقت لوگ قیلولہ کرتے ہیں۔ ان اوقات میں غلاموں اور بچوں کا بے اجازت گھر میں داخل ہونا اس بات کا محتمل

تھا کہ وہ گھر والوں کو کسی ایسے حال میں دیکھ لیں جس میں دیکھنا پسندیدہ نہ ہو۔ اس وجہ سے یہ پابندی عائد کر دی گئی۔ اور ان پابندیوں کے عائد کرنے میں ایک تدریج ملحوظ رکھی گئی تاکہ یہ طبائع پر زیادہ شاق نہ ہوں۔ ان تین اوقات کے سوا ان پر اجازت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کی حکمت یہ واضح فرمائی ہے کہ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْکُمْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَعْضٍ تم ہر وقت ایک دوسرے کے پاس آمد و شد رکھنے والے ہو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی تنگی میں ڈالنا پسند نہیں فرمایا۔

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْکُمُ الْحُلُمَ الاٰیۃ: لیکن یہ نابالغ بچے بھی اجازت لینے کی قید سے مستثنیٰ صرف اس وقت تک ہیں جب تک نابالغ ہیں۔ بالغ ہونے کے بعد ان پر بھی وہ تمام پابندیاں عائد ہو جائیں گی جو دوسروں کے لیے مذکور ہوئی ہیں۔ اس دلیل کی بنا پر کہ یہ بچپن سے گھر میں آتے جاتے رہے ہیں ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہوگی۔

یہ دونوں آیتیں توضیحی ہیں

ان دونوں آیتوں کے ساتھ دیکھ لیجیے، یہ تصریح موجود ہے کہ یہ بعد میں سابق احکام کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہیں اور یہ وضاحت خدا کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی یہ جانتا ہے کہ بندوں کی تربیت و اصلاح کے لیے کیا احکام دیے جائیں اور وہ کس ترتیب و تدریج کے ساتھ نازل کیے جائیں۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْہِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَہُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَۃٍ ؕ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّہُنَّ ؕ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۶۰)

بوڑھی عورتوں کے لیے ایک رخصت

یہ آیت بھی توضیحی آیات میں سے ہے۔ پیچھے آیت ۳۱ میں عورتوں کو گھر کے اندر کسی غیر محرم کی موجودگی میں، جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں یہ ہدایت بھی ہے وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِہِنَّ عَلٰی جُیُوْبِہِنَّ وہ اپنی اوڑھنیوں کے آنچل سے اپنے گریبان ڈھانک لیا کریں۔ اس حکم عام سے یہاں ان عورتوں کو مستثنیٰ کر دیا جو اب نکاح کی عمر سے گزر چکی ہیں۔ یعنی اگر وہ اوڑھنیوں کا یہ اہتمام نہ کریں تو اس میں چنداں ہرج نہیں ہے بشرطیکہ وہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔ اگرچہ پسندیدہ بات ان کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ بھی احتیاط کو ملحوظ رکھیں جو دوسری عورتوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ بڑی بوڑھیوں کے لیے یہ رعایت ان کی آسانی کے لیے رکھی گئی ہے لیکن اس میں بھی فتنہ کا ایک پہلو ہے۔ جس طرح بعض مردوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ بوڑھے ہو جاتے ہیں لیکن ناک لگی ہی رہ جاتی ہے اسی طرح بعض عورتوں میں بھی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ بوڑھی ہو جاتی ہیں لیکن اپنے زیورات اور اپنی ثروت کی نمائش کا شوق ان کے اندر سے نہیں نکلتا۔ چونکہ یہ چیز بجائے خود آدمی کے دین کے لیے ایک فتنہ ہے اس وجہ سے اس کی طرف توجہ دلا دی کہ وہ اس رخصت سے کوئی غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔

وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ، یہاں تنبیہ کے لیے ہے۔ یعنی ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا سے کوئی

بات مخفی نہیں رہتی۔ وہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَن
تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا
مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا ۚ فَإِذَا
دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ
لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۶۱)

پردہ کا مقصد معاشرتی روابط کا انقطاع نہیں

یہ آیت بھی توضیحی آیات میں سے ہے۔ جب گھروں کے اندر جانے پر وہ پابندیاں عائد کر دی گئیں جو پیچھے بیان ہوئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ اسلام سوشل آزادیوں کو محدود کرنا چاہتا ہے کہ خاص اپنے عزیزوں، قریبوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں بھی اب کوئی شخص آزادی و بے تکلفی کے ساتھ نہیں آ جا سکتا۔ بہت سے لوگ جو معذور و مجبور تھے اور اپنی مجبوری کے سبب سے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی کے گھروں پر گزارہ کرتے تھے انھوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ اب ان کی آزادی محدود ہو گئی۔ دور جاہلیت میں چونکہ غیر محدود آزادی ویسے بھی لوگوں کو حاصل رہی تھی اس وجہ سے اس کے مقابل میں اتنی پابندی بھی بعض طبائع پر شاق گزری۔ اس طرح کے لوگوں کے شبہ کو دور کرنے کے لیے یہ وضاحت فرما دی گئی کہ بعض احتیاطی پابندیوں کے عائد کرنے سے نہ یہ مقصود ہے کہ اندھے، لنگڑے اور مریض اپنے تعلق کے لوگوں کے سہارے سے محروم ہو جائیں اور نہ یہ مطلب ہے کہ اعزہ واقربا اور دوستوں کے ساتھ معاشرتی روابط منقطع ہو جائیں۔ لوگ ایک دوسرے کے ہاں آئیں جائیں، ملیں جلیں، کھائیں پئیں۔ انفرادی طور پر بھی اور تقریبات میں اجتماعی طور پر بھی۔ ان چیزوں پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ مطلوب جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ جب لوگ گھروں میں داخل ہوں تو سلام کر کے داخل ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مبارک اور پاکیزہ طریقۂ تحیت و دعا ہے جس سے باہمی تعلقات کی خوش گواری میں اضافہ ہوتا ہے اور شیطان کی دراندازیوں کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس پابندی کو گراں نہ سمجھو۔ اس میں تمام تر تمھاری ہی فلاح و بہبود پیش نظر ہے۔

'اَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ' سے مراد

'اَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ' سے مراد، میرے نزدیک، وہ گھر ہیں جن کی تولیت کسی شخص پر ذمہ داری ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی یتیم کا ولی ہے۔

'كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ': یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ یہ کسی سابق حکم کی، جیسا کہ ہم نے تصریح کی، وضاحت ہے۔ 'لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جن لوگوں نے ان ہدایات کو ناروا پابندی پر محمول کیا، یہ محض ناسمجھی کی بنا پر کیا۔ قرآن نے یہ وضاحت اس لیے فرمائی ہے کہ اس

قسم کے لوگوں کی یہ نافہمی دور ہو اور وہ ان احکام کی افادیت و برکت کو اچھی طرح سمجھیں۔

اس آیت میں تمام رشتہ داروں اور قرابت داروں کا اس تصریح کے ساتھ الگ الگ جو ذکر آیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں مشترک خاندانی نظام کا رواج نہیں تھا بلکہ ہر بالغ شادی کے بعد اپنا الگ گھر بساتا تھا۔ اور اس تصریح سے وہ بات بھی نکلی جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ اس سورہ میں زیر بحث وہ پردہ ہے جو اعزہ و اقربا اور تعلق و اعتماد کے لوگوں کے گھروں کے اندر آنے جانے کی صورت میں مردوں اور عورتوں دونوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہاں اس پردے کی وضاحت نہیں ہے جو عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں اختیار کرنا چاہیے۔ اس کی وضاحت جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سورۂ احزاب میں ہوئی ہے اور ہم وہاں ان شاء اللہ اس پر مفصل گفتگو کریں گے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۶۲﴾

اجتماعی کاموں سے کھسکنے والے منافقین کو تنبیہ

یہ اور اس کے بعد کی آیات، منافقین کے اس ذکر سے متعلق ہیں جو آیت ۵۰ پر ختم ہوا ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات بطور تنبیہ مزید بعد میں نازل ہوئی ہیں اس وجہ سے ان کو بعد میں نازل ہونے والی آیات کے ساتھ جگہ دی گئی تاکہ ان کی پوری اہمیت واضح ہو۔ فرمایا کہ اصل مومن وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر سچا اور پکا ایمان رکھتے ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ فعل 'آمَنُوا' یہاں اپنے کامل مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ 'وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ' یہ ان کے رسوخ ایمان کی ایک علامت بیان ہوئی ہے کہ جب وہ کسی اجتماعی کام کے لیے رسول کے ساتھ ہوتے ہیں تو منافقین کی طرح یہ نہیں کرتے کہ جب چاہا وہاں سے چپکے سے کھسک گئے بلکہ انھیں کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو رسول سے اجازت لے کر وہاں سے ٹلتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اجازت لیتے ہیں وہی سچے مومن ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ مومن نہیں بلکہ پکے منافق ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اپنی کسی واقعی ضرورت کے لیے اجازت کے طالب ہوں تو ان میں سے، جس کو چاہو، اجازت دے دیا کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر چند اس طرح کی اجازت مانگنا کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے اس لیے کہ رسول کی معیت و نصرت سے بڑھ کر، بالخصوص جب کہ کوئی اجتماعی ضرورت درپیش ہو، کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا لیکن انسانی کمزوریوں کو پیش نظر رکھ کر رسول کو یہ اجازت دے دی گئی کہ اگر وہ کسی کو اجازت دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں اور اس کی اس کمزوری کے لیے اللہ سے استغفار کریں۔

لَّا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا ۚ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۶۳﴾

خطاب، باعتبار الفاظ، اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ کلام کا رخ منافقین ہی کی طرف ہے۔ فرمایا کہ اگر رسول کسی اجتماعی کام کے لیے دعوت دیں تو اس کو دوسروں کے بلانے کی طرح نہ سمجھو بلکہ ہر شخص کا فرض ہے کہ رسول کی ہر دعوت پر لبیک کہتا ہوا ان کی خدمت میں حاضر ہو۔

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا۔ مضارع سے پہلے یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ 'تسلّل' کے معنی چل دینے اور چپکے سے کھسک جانے کے ہیں۔ 'لِوَاذًا' کے معنی ایک دوسرے کی آڑ اور پناہ لیتے ہوئے۔

یہ منافقین کو تنبیہ ہے کہ اللہ ان لوگوں سے برابر آگاہ رہا ہے جو رسول کے بلائے ہوئے اجتماعات سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جایا کرتے رہے ہیں کہ پرسش ہو تو یہ عذر کر سکیں کہ ان کو حضورؐ کے حکم کی خبر نہیں ہوئی۔ اس اسلوبِ بیان میں جو غصہ اور عتاب مضمر ہے وہ زبان کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

'فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ الآیۃ'۔ 'مخالفۃ' یہاں گریز اور فرار کے مفہوم پر متضمن ہے اس وجہ سے اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آیا ہے۔ مخالفین کی مخالفت کی نوعیت درحقیقت گریز و فرار ہی کی تھی۔ وہ اپنی بزدلی کے سبب سے سامنے تو 'اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا' ہی کہتے لیکن درپردہ گریز و فرار کی کوشش کرتے۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے وہ اس بات کو نہ بھولیں کہ اس کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی کسی بہت بڑی آزمائش میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں اور کسی دردناک عذاب میں بھی گرفتار ہو سکتے ہیں۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ یَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِ ؕ وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْهِ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۶۴)

یہ اس سورہ میں منافقین کو آخری تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ جس حال میں تم رہے ہو، یا ہو اس سے اللہ برابر باخبر رہا ہے اور ہے۔ اس کے بعد ان سے منہ پھیر کر فرمایا کہ یہ لوگ اس دن کو یاد رکھیں جس دن اللہ کے حضور ان کی پیشی ہوگی اور اللہ ان کا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے رکھ دے گا۔ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

ان سطروں پر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس گروپ کی اس آخری سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں سے درگزر فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰه رب العٰلمین۔

رحمان آباد

۲۴ ستمبر ۱۹۷۳ء

تدبّرِ قرآن

۲۵

الفرقان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

د۔ سورتوں کے چوتھے گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورہ فرقان سے سورتوں کا چوتھا گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں آٹھ سورتیں ___ فرقان، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، سجدہ ___ مکی ہیں، آخر میں صرف ایک سورہ ___ احزاب ___ مدنی ہے۔ سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے کا اصول دوسرے گروپوں کی طرح اس میں بھی مرعی ہے۔ البتہ سورۂ احزاب کی حیثیت خلاصۂ بحث یا سورۂ نور کی طرح تکملہ و تتمہ کی ہے۔ اسلامی دعوت کے تمام ادوار ___ دعوت، ہجرت، جہاد ___ اور تمام بنیادی مطالب ___ توحید، رسالت، معاد ___ اس میں بھی زیر بحث آئے ہیں البتہ اسلوب، انداز اور مواد استدلال دوسرے گروپوں سے اس میں فی الجملہ مختلف نظر آئے گا۔

اس گروپ کا جامع عمود اثباتِ رسالت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے خلاف قریش اور ان کے حلیفوں نے جتنے اعتراضات و شبہات اٹھائے اس گروپ کی مختلف سورتوں میں، مختلف اسلوبوں سے، ان کے جواب بھی دیے گئے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا اصل مرتبہ و مقام بھی واضح فرمایا گیا ہے۔ اسی کے ضمن میں قرآن پر ایمان لانے والوں کو، مرحلۂ امتحان سے گزرنے کے بعد، دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح کی بشارت دی گئی ہے اور جو لوگ اس کی تکذیب پر اڑے رہیں گے، اتمام حجت کے بعد، ان کو ان کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے۔

یہ پورے گروپ پر ایک اجمالی نظر ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر گروپ کی ایک ایک سورہ کی الگ الگ تفسیر شروع کرتے ہیں۔

ب۔ سورہ کا عمود

اس سورہ کا عمود قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع ہے۔ مخالفین نے جو شبہات و اعتراضات، قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اٹھائے وہ اس میں نقل کر کے ان کے جواب دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی مخالفین کے اعتراض و انکار کے اصل محرکات کا بھی پتہ دیا گیا ہے اور قرآن کی جن باتوں سے وہ خاص طور پر متوحش تھے، مثلاً

دعوتِ توحید یا انذارِ عذاب، وہ مزید دلائل سے مبرہن کی گئی ہیں۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا تجزیہ یہ ہے۔

(۱-۹) قرآن کا نزول سب سے بڑی برکت والی ہستی کی طرف سے سب سے بڑی برکت و رحمت کا نزول ہے لیکن توحید اور قیامت کے منکرین اس کو افتراء اور سازش قرار دے رہے ہیں۔ ان باتوں کا حوالہ جو مخالفین آنحضرت صلعم اور قرآن سے برگشتہ و بدگمان کرنے کے لیے لوگوں میں پھیلاتے تھے۔

(۱۰-۳۴) مخالفین کے اعتراضات و مطاعن کا جواب، اور اس مخالفت کے پسِ پردہ محرک کی طرف اشارہ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو صبر و استقامت کی تلقین اور تکذیب کرنے والوں کے انجام بد کا بیان۔

(۳۵-۴۴) رسولوں اور ان کے مکذبین کی تاریخ کی طرف ایک اجمالی اشارہ جس سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صبر و استقامت کی تلقین ہے کہ جو لوگ اس کتاب کی تکذیب کر رہے ہیں یہ نہ خیال کرو کہ یہ سننے سمجھنے والے لوگ ہیں۔ یہ چوپایوں سے بھی زیادہ لایعقل اور اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ تم ان پر حجت تمام کردو۔ یہ اسی راہ پر چلیں گے جس پر چل رہے ہیں اور اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو ان کے لیے مقدر ہے۔ تم اپنے فرض کی ادائیگی کے ذمہ دار ہو، ان کے رُخ موڑ دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔

(۴۵-۶۰) قرآن کی دعوت کے اساسی مسائل ــــ توحید و معاد ــــ کے اثبات میں آفاق کے بعض دلائل کی طرف اشارہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی تلقین کہ مخالفین کے مطالبۂ معجزات سے بے پروا ہو کر اسی قرآن کے ذریعہ سے ان پر اتمامِ حجت کرو۔ اس قرآن میں گوناگوں اسالیب سے وہ ساری باتیں واضح کردی گئی ہیں جن کا واضح ہونا اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ اگر لوگ اس کو نہیں مانتے تو تمہارا کام صرف انذار و تبشیر ہے۔ تم اپنا فرض ادا کر کے ان کو ان کے حال پر چھوڑو، ان بے سروپا اعتراضات کو کوئی اہمیت نہ دو جو انھوں نے محض قرآن کی مخالفت کے لیے بطور بہانہ ایجاد کیے ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہے۔

(۶۱-۷۷) اس دنیا کے روز و شب تذکیر و تنبیہ کے لیے کافی ہیں بشرطیکہ انسان یاددہانی حاصل کرنا اور اپنے رب کا شکرگزار بندہ بننا چاہے۔ جن لوگوں کے اندر انابت اور خشیت ہوتی ہے وہ اس طرح اکڑا نہیں کرتے جس طرح یہ متمردین اکڑ رہے ہیں بلکہ ان کی روش ان سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ خدا کے ذاکر و شاکر بندوں کی صفات کا بیان۔ آخر میں متمردینِ قریش کو تنبیہ کہ تمھیں جو اس درجہ اہمیت دی گئی اور تمھارے لیے تعلیم و دعوت کا یہ اہتمام کیا گیا تو اس لیے نہیں کہ تمھارے بغیر خدا کا کوئی کام بند ہے یا بند ہوجائے گا بلکہ مقصود صرف تمھاری صلاح و فلاح تھی۔ اب اگر تم خدا کی اس نعمت کی قدر نہیں کر رہے ہو تو وہ چیز لازماً پیش آکے رہے گی جو اس ناقدری کا لازمی نتیجہ ہے۔

مطالب کے اس تجزیہ سے سورہ کا عمود اور نظام اچھی طرح واضح ہوگیا ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ واللہ الموفق للخیر والسداد۔

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ (۲۵)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۷۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ آیات ۱-۹
نَذِيْرَا ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ
وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ
تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ
يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ
مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ
اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛۚ فَقَدْ جَآءُوْ
ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۛۚ﴿۴﴾ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى
عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۵﴾ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۶﴾ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا
الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ
مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ
جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾

ع ۱/۱۶ انْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ﴿٩﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۹

بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دینے والی کتاب اتاری تاکہ وہ اہلِ عالم کے لیے ہوشیار کر دینے والا بنے! وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے اپنے لیے کوئی اولاد نہیں بنائی اور اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا ساجھی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک خاص اندازہ ٹھہرایا۔ اور لوگوں نے اس کے سوا دوسرے معبود بنائے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، وہ خود مخلوق ہیں اور جو خود اپنے لیے بھی نہ کسی ضرر پر اختیار رکھتے ہیں نہ کسی نفع پر اور نہ ان کو موت پر کوئی اختیار ہے نہ زندگی پر اور نہ مرنے کے بعد زندہ کرنے پر۔ ۱ - ۳

اور کافر کہتے ہیں کہ یہ محض جھوٹ ہے جس کو اس شخص نے گھڑا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے ظلم اور جھوٹ دونوں باتوں کا ارتکاب کیا! اور کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کے فسانے ہیں جو اس نے لکھوائے ہیں تو وہ اس کو صبح اور شام لکھ کر تعلیم کیے جاتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اس کو اس نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید کو جانتا ہے۔ بے شک وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے! ۴ - ۶

اور کہتے ہیں کہ کیا بات ہے اس رسول کی کہ یہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے! اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ لوگوں کو ڈرانے والا بنتا! یا اس کے لیے کوئی خزانہ اتارا جاتا یا اس کے لیے کوئی باغ ہوتا جس سے وہ اپنی معاش حاصل کرتا! ـــــ اور ان ظالموں نے کہا کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ شخص کے پیچھے لگ لیے ہو! دیکھو، تمھارے اوپر کیسی کیسی پھبتیاں چست کر رہے ہیں! پس یہ بالکل کھوئے گئے ہیں اور نہ کوئی راہ

نہیں پا رہے ہیں۔ ۷-۹

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا (۱)

قرآن اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے

جس طرح 'تعاظم' اور 'تعالیٰ' اور اس باب کے دوسرے صیغوں کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اسی طرح 'تبارک' کے اندر بھی مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی بڑی ہی بابرکت اور بافیض ہستی ہے وہ جس نے لوگوں کے انذار کے لیے، اپنے بندے پر، ایک ایسی کتاب اتاری جو حق اور باطل کے درمیان امتیاز کے لیے ایک حجت قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس نعمت کی قدر اور اس کتاب کی روشنی میں اپنی گمراہیوں کی اصلاح کریں، طرح طرح کے اعتراضات اٹھا کر اس کی مخالفت اور اللہ کے رسول سے کسی معجزے یا کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو اس کتاب کے بجائے وہ اپنے رسول کو کسی تازیانۂ عذاب سے مسلح کر کے بھی بھیج سکتا تھا، اس کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں تھا، لیکن اس نے اپنی عظیم مہربانی کی وجہ سے یہ پسند فرمایا کہ وہ لوگوں کو ایک ایسی روشنی دکھائے جو لوگوں کو پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کر کے فوز و فلاح کی راہِ سعادت کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن کو 'فرقان' کے لفظ سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ یہ کتاب اپنے دعاوی اور اپنے پیش کرنے والے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے بجائے خود دلیل و حجت ہے، یہ کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو رسول کے ہاتھوں تقسیم ہونے والی اس نعمتِ عظمیٰ سے متمتع ہونے کے بجائے اس سے ایسی چیزوں کا مطالبہ کریں جو ان کے لیے خیر کے بجائے تباہی کا باعث ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک خاص برمحل التفات

'عَلٰی عَبْدِهٖ' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک خاص التفات پایا جاتا ہے۔ اس التفات کا یہاں ایک خاص محل ہے۔ آگے کفار کے وہ اعتراضات نقل ہوئے ہیں جو وہ نہایت تحقیر آمیز انداز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ یہ اعتراضات زیادہ تر مکہ اور طائف کے دولت مندوں کے اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی مالی برتری کے گھمنڈ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی اسباب و وسائل سے بے تعلقی پر خاص طور پر چوٹیں کرتے اور اس چیز کو آپ کی رسالت کی تردید کی ایک بہت بڑی دلیل کی حیثیت سے پیش کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں منکرین کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندۂ خاص پر 'فرقان' کی شکل میں جو نعمتِ عظمیٰ اتاری ہے اس کے بعد وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ خلق کے انذار کے وہ جس مشن پر مامور ہے اس کی تکمیل کے لیے وہ جس زاد و راحلہ کا محتاج ہے وہ سب بدرجۂ کمال اس کے پاس موجود ہے۔

یہ آیت اس سورہ کی تمہید ہے۔ اس کے یہ مضمرات جو ہم نے واضح کیے ہیں وہ آگے کے مباحث سے ان شاء اللہ مزید واضح ہو جائیں گے۔

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا (۲)

قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ خالق کائنات کا فرمان واجب الاذعان ہے

اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی فیض بخشی کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اب یہ اپنی توحید اور کبریائی و یکتائی کا حوالہ دیا ہے جس سے مقصود اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ جس نے خلق کے انذار و تذکیر کے لیے یہ کتاب اتاری ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس وجہ سے کوئی اس کتاب کو کسی سائل کی درخواست نہ سمجھے بلکہ یہ اس کائنات کے بادشاہِ حقیقی کا فرمان واجب الاذعان ہے۔ اگر اس کی تکذیب کی گئی تو جس نے اس کو اتارا ہے وہ اس کی تکذیب کا انتقام لینے کے لیے کوئی کمزور ہستی نہیں ہے۔ وہ اس کا انتقام لے گا اور جب انتقام لے گا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ بن سکے گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ یعنی اگر کسی نے اس کے بیٹے بیٹیاں فرض کر کے ان کی عبادت شروع کر رکھی ہے اور اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ اس کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے تو وہ اس خیالِ خام کو دل سے نکال دے۔ نہ خدا کے کوئی بیٹی ہے نہ بیٹا، نہ اس کی بادشاہی میں کوئی اور ساجھی ہے۔ وہ اپنی بادشاہی کا یکہ و تنہا مالک ہے، وہ کسی مددگار و شریک کا محتاج نہیں ہے۔

خدا کی یکتائی کی دلیل

وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۔ یہ اس کی توحید و یکتائی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور ہر چیز کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کے ٹھہرائے ہوئے اندازہ سے سرِ مو کم و بیش یا آگے پیچھے ہو سکے۔ انسان کو پیدا کیا تو اس کے لیے زندگی اور موت کی ایک حد معین کر دی کوئی اس حد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ابر و ہوا سب اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے پابند ہیں۔ سورج اور چاند، جن کو نادانوں نے معبود بنا کر پوجا، ایک مخصوص محور و مدار کے ساتھ لگے بندھے ہوئے ہیں اور اپنے وجود سے شہادت دے رہے ہیں کہ وہ ایک خدائے عزیز و حکیم کے پیدا کیے ہوئے اور اسی کے مقرر کیے ہوئے حدود و قیود کے پابند ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف دوسرے مقام میں یوں توجہ دلائی ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (یٰسٓ: ۳۸)

اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے!

اس سے زیادہ وسیع الفاظ میں یہی بات یوں فرمائی گئی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۱)

اور ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں لیکن ہم ان کو ایک خاص اندازے ہی کے ساتھ اتارتے ہیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۳)

یہ اسی مضمون کی توضیح مزید ہے اور اس میں اظہار تعجب کا مضمون بھی مضمر ہے کہ اصل حقیقت تو یہ ہے جو بیان ہوئی لیکن قرآن اور رسول کے ان مخالفین کا حال یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے سوا ایسی چیزوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے جو نہ صرف یہ کہ کسی چیز کو پیدا کر سکنے پر قادر نہیں بلکہ وہ خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں؛ اور جو دوسروں کو کوئی نقصان یا نفع پہنچانا تو درکنار، خود اپنے کو بھی کسی نقصان سے بچانے یا کوئی نفع پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتی ہیں اور جن کو نہ موت پر کوئی اختیار، نہ زندگی پر اور نہ مرنے کے بعد زندہ کرنے پر! ــــــ مطلب یہ ہے کہ ایسے بے بس فرضی معبودوں کے بل پر قرآن کے پیش کردہ حقائق کو جھٹلانا محض ان کی خرد باختگی ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا (۴)

قرآن سے عوام کو بدگمان کرنے کے لیے قریش کے لیڈروں کا پروپیگنڈا

یہ مخالفین کے وہ اقوال نقل ہو رہے ہیں جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے وہ پھیلاتے تھے۔ ہم دوسرے مقام میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ جہاں تک قرآن کے زور بیان اور اس کی تاثیر و تسخیر کا تعلق ہے اس کے انکار کی تو قریش کے لیڈروں کے اندر ہمت نہیں تھی۔ اس کے اعتراف پر تو وہ مجبور تھے۔ البتہ یہ کوشش ان کی تھی کہ ان کے عوام پر قرآن کے کتاب آسمانی ہونے کا تصور جو بیٹھتا جا رہا ہے وہ بیٹھنے نہ پائے بلکہ وہ اس کو اسی درجے میں رکھیں جس درجہ میں اعلیٰ شاعروں یا زوردار خطیبوں کا کلام رکھا جاتا ہے۔ ان کو اصلی کد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت اور قرآن کے وحی الٰہی ہونے سے تھی۔ اس کی تردید میں وہ یہ کہتے تھے کہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے یہ بالکل جھوٹ ہے۔ یہ وحی الٰہی نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنے ذہن کا گھڑا ہوا کلام ہے جس کو وہ جھوٹ موٹ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں تاکہ اس طرح ہم پر اپنی برتری کی دھونس جمائیں۔

وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ۔ اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے ایک اور جھوٹ اس کے ساتھ وہ یہ لگا دیتے کہ اس کتاب کی تصنیف میں کچھ دوسرے لوگوں کے ذہن بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ شریک ہیں۔ اس اضافے کی ضرورت اس وجہ سے انھوں نے محسوس کی ہو گی کہ قرآن میں پچھلے انبیاء کی سرگزشتوں اور ان کی تعلیمات کے حوالے بھی تھے جن کے جاننے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر یہ وحی الٰہی نہیں ہے تو آخر یہ باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح معلوم ہو گئیں اور وہ بھی ایسی تفصیل اور صحت کے ساتھ کہ پچھلے صحیفوں پر ایمان کے مدعیوں کو بھی اس تفصیل و صحت کے ساتھ معلوم نہیں تھیں۔ اس سوال کے جواب میں انھوں نے اس کے ساتھ اس جھوٹ کا بھی اضافہ کر دیا کہ کچھ دوسرے ہاتھ بھی اس سازش میں

شریک ہیں۔ مخالفین کے اس قول میں جو ابہام ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب الزام جھوٹا ہو تو اس کے لیے ابہام ہی کا اسلوب موزوں ہوتا ہے۔ اگر اس کے لیے تصریح کا اسلوب اختیار کیا جائے تو اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ مخالفین کا یہ اشارہ کن لوگوں کی طرف تھا؟ اس سوال کے جواب میں ہمارے مفسرین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس ابہام کا مبہم رہنا ہی ٹھیک ہے اس لیے کہ الزام لگانے والوں کا مقصد محض ایک الزام لگانا تھا نہ کہ فی الواقع کسی شخص یا اشخاص کا سراغ دینا۔ قریش نے اس مبہم الزام سے اپنے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہوگی کہ قرآن میں آسمانی کتابوں کے انداز کی جو باتیں اور حکمتیں ہیں ان کو وحی کا نتیجہ نہ سمجھو بلکہ بعض اہل کتاب یا دوسری قوموں کے تعلیم یافتہ اشخاص جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی بن گئے ہیں وہ ان کو اس طرح کی باتیں بتاتے ہیں اور وہ ان کو اپنے فصیح و بلیغ الفاظ میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ان کے اوپر فرشتہ وحی لایا ہے۔ اس مسئلہ پر سورۂ نحل کی آیت ۱۰۳ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

'ظلم' اور 'زور' کا مفہوم

'فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا'۔ 'جَآءُوْ' یہاں مرتکب ہونے کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ 'ظُلْمٌ' سے مراد ان کا وہ شرک ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے اور 'زُوْر' سے اشارہ ان کے اس قول کی طرف ہے جو قرآن کے باب میں نقل ہوا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ شرک کے ظلم عظیم کے بھی مرتکب ہوئے اور ساتھ ہی قرآن کی مخالفت میں ایک بہت بڑے جھوٹ کے بھی ـــــ یہ کہہ کر بات ختم کر دی ہے۔ اس کے نتیجے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اس ڈھٹائی کے ساتھ اتنے بڑے بڑے جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں، اندازہ کر لو کہ وہ کس انجام کے مستحق ہیں!

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۵)

'اِكْتَتَبَ فُلَانٌ' کا صحیح مفہوم لغت میں یہ ہے کہ سأل ان یکتب لہٗ اس نے درخواست کی کہ اس کے لیے لکھ دیا جائے۔

تملیٰ کے بعد علیٰ کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ تلقٰی علیہ یا تقرء علیہ کے مضمون پر متضمن ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ اس کو لکھوائے جاتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ اس کو لکھ کر تعلیم کیے جاتے ہیں۔ یہاں یہ دوسرے معنی میں ہے، اس لیے کہ قریش جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی ہیں۔ آپ لکھنا نہیں جانتے۔

قریش کی طرف سے آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش

یہ اوپر والے الزام ہی کی مزید وضاحت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن میں ہے کیا، محض اگلوں کے فسانے ہیں جو اس میں دہرائے گئے ہیں! اس شخص نے کچھ لوگوں سے یہ فرمائش کی کہ اس کے لیے یہ لکھ دیے جائیں چنانچہ وہ صبح و شام اس کے لیے لکھتے ہیں اور یہ شخص انہی کی لکھی ہوئی چیزوں کو ہمارے

سامنے وحی الٰہی کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو اس کتاب میں کوئی ایسی حکمت ہے جس سے مرعوب ہوا جائے اور نہ اس کے پیش کرنے والے کا یہ دعویٰ ہی صحیح ہے کہ یہ وحی آسمانی ہے جو اضطراراً اس کے اوپر نازل ہوتی ہے بلکہ پچھلی قوموں اور پچھلے نبیوں کے کچھ جھوٹے سچے قصے ہیں جو اس شخص نے فرمائش کر کے دوسرے لوگوں سے لکھوائے ہیں۔ اس طرح انھوں نے قرآن کی حکمت کے اثر کو بھی مٹانے کی کوشش کی اور اس کے وحی آسمانی ہونے کے دعوے کو بھی مشتبہ کرنا چاہا لیکن ظاہر ہے کہ ان کی یہ کوشش آفتاب پر خاک ڈالنے کے ہم معنی تھی۔ قرآن نے تاریخ جس حکمت کے ساتھ پیش کی تھی اس کی زد براہِ راست متمردین قریش کے غرور پر پڑتی تھی اور اس کے آئینہ میں ان کو اپنا مستقبل نہایت بھیانک نظر آتا تھا اس وجہ سے وہ جھلا کر اس کو ماضی کا افسانہ کہتے تھے لیکن حقیقت کو افسانہ کہہ کر اپنے ہی دل کو تسلی دی جا سکتی ہے نہ دوسروں ہی کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک سلمان فارسیؓ اور ایک ابوفکیہہ رومیؓ یا دو چار اہل کتاب مل کر قریش کے زعم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن جیسی معجز کتاب تصنیف کر سکتے تھے تو قریش کے پاس تو ہزاروں عربی و عجمی اور لاکھوں اہل کتاب تھے، آخر انھوں نے ان کی مدد سے ایک قرآن تیار کر کے کیوں نہ پیش کر دیا کہ اس کے معجزہ ہونے کا دعویٰ باطل ہو جاتا! لیکن جب وہ قرآن کی مسلسل تحدّی کے باوجود اس کی کوئی نظیر نہ پیش کر سکے تو ان کی اس مہمل بات کو کون باور کر سکتا تھا کہ یہ عظیم کتاب بعض عجمیوں یا بعض اہل کتاب کی ایجاد ہے۔ چونکہ یہ بات بالبداہت مہمل تھی اس وجہ سے قرآن نے اس کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ آگے والی آیت میں صرف اصل حقیقت کا اظہار فرما دیا جس میں ان بوالفضولوں کی اس بوالفضولی پر ایک لطیف طنز بھی ہے۔

معترضین پر ایک لطیف طنز اور ان کو تنبیہ

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (۶)

فرمایا کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ اس کتاب کو اتارنے والا وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کے سارے بھیدوں اور تمام اسرار و رموز سے خود اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ اس کی تصنیف میں کسی عربی و عجمی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا عالم و حکیم ہو وہ اس کتاب سے بصیرت و رہنمائی تو حاصل کر سکتا ہے لیکن اس طرح کی کتاب تصنیف کرنا تو درکنار وہ اس کے علم و حکمت میں کوئی اضافہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت اس کتاب کی سطر سطر سے واضح ہے کہ اس کا اتارنے والا وہی ہے جو اس کائنات کے تمام بھیدوں سے واقف اور اس کے ظاہر و باطن اور آغاز و انجام ہر چیز سے باخبر ہے چنانچہ اس نے ماضی کی خبریں بھی سامنے رکھ دی ہیں، حاضر کی ذمہ داریاں بھی واضح کر دی ہیں اور مستقبل کے نتائج سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا، یعنی وہ چونکہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اس وجہ سے اس نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ جو لوگ توبہ و اصلاح کرنا چاہیں وہ توبہ و اصلاح کر کے اس کی رحمت

کے مستحق بن جائیں مطلب یہ ہے کہ وہ اتارنے کو تو عذاب بھی اتار سکتا ہے۔ وہ حق کے دشمنوں کے رویہ سے اچھی طرح باخبر ہے لیکن وہ اپنی رحمت کے سبب سے عذاب میں جلدی نہیں کرتا بلکہ چاہتا ہے کہ لوگ ہدایت کی راہ اختیار کریں تاکہ اس کی مغفرت کے سزاوار رہوں۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ بہرحال وہ سارے حالات و معاملات سے اچھی طرح واقف ہے۔ اگر لوگوں نے صحیح روش نہ اختیار کی تو اس کا جو انجام ہونا ہے وہ بھی سامنے آکے رہے گا۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۷-۸)

یہ مخالفین کے بعض اور اعتراضات کا حوالہ دیا ہے۔

معترضین کے بعض اور اعتراضات رسول پر

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ کے اسلوب میں استعجاب اور طنز و استہزا دونوں ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ خوب رسول ہیں کہ اللہ کے رسول ہونے کے مدعی ہیں اور حال یہ ہے کہ ہمارے ہی طرح یہ بھی کھانے پینے کے محتاج ہیں اور اپنی ضروریات و احتیاج کی فراہمی کے لیے ہماری طرح یہ بھی بازاروں میں پھرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر خدا کو کوئی رسول ہی بھیجنا ہوتا تو کیا ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو رسول بناتا، آخر اس کے پاس فرشتوں کی ایک فوج ہے ان میں سے کسی کو اس نے رسول بنا کر کیوں نہ بھیجا۔

لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا۔ یعنی اگر کسی بشر ہی کو رسول بنایا تھا تو کم از کم یہ تو ہونا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہوتا جو ساتھ ساتھ منادی کرتا پھرتا کہ لوگو، یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ جس چیز سے ڈرا رہے ہیں اس سے ڈرو۔ یا آسمان سے ان کے لیے کوئی خزانہ اتار دیا جاتا یا ان کے پاس کوئی شاندار باغ ہوتا جس سے یہ اپنی معاش حاصل کرتے اور عام آدمیوں کی طرح ان کو بازاروں میں جوتیاں چٹخاتے نہ پھرنا پڑتا! مطلب یہ ہے کہ جب ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو آخر ہم ان کو اللہ کا رسول کس طرح مان لیں!

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ یعنی مذکورہ بالا اعتراضات کے بعد یہ ظالم لوگ مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ کہتے ہیں کہ اگر تم لوگوں نے ایک ایسے شخص کو رسول مان لیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم لوگ ایک ایسے شخص کے پیرو بن گئے ہو جس پر کسی نے جادو کر کے اس کی عقل کو مختل کر دیا ہے جس کے سبب سے وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا (۹)

معترضین کی حواس باختگی

یہ آیت بعینہٖ سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۴۸۔ وہاں ہم واضح کر چکے

ہیں کہ 'ضربِ مثل' کا محاورہ جس طرح کوئی تمثیل بیان کرنے یا کوئی حکمت کی بات کہنے کے لیے آتا ہے اسی طرح کسی پر اعتراض کرنے یا اس پر پھبتی چست کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اعتراض باطل کے مفہوم میں یہ لفظ آگے اسی سورہ کی آیت ۳۲ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ پھبتی یا اعتراض ہی کے مفہوم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخالفین کی مذکورہ بالا خرافات نقل کرنے کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ دیکھو، یہ تمہارے اوپر کیسی کیسی پھبتیاں چست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن کوئی بات بنتی نظر نہیں آتی ہے تو جس کے منہ میں جو آتا ہے وہی بک دیتا ہے۔

فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا۔ یعنی مخالفت کے جنون میں بالکل کھوئے گئے ہیں۔ اعتراض کی کوئی راہ نہ پا رہے ہیں، نہ پا سکیں گے۔ محض اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس طرح یہ حقیقت کو کب تک جھٹلا سکیں گے! یہ امر ملحوظ رہے کہ جب کوئی شخص کسی سچی بات کی دیدہ و دانستہ مخالفت کرتا ہے تو وہ اسی طرح کی حواس باختگی کا مظاہرہ کرتا ہے جس طرح کی حواس باختگی ان اعتراضات کے اندر پائی جاتی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰-۳۴

آگے مذکورہ بالا اعتراضات کے جواب بھی دیے۔ ان کے اصل محرکات پر بھی روشنی ڈالی اور اس اندھی بہری مخالفت کا جو انجام ان لوگوں کے سامنے آنے والا ہے اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا۔ اسی ضمن میں بعض نئے اعتراضات بھی زیر بحث آ گئے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو صبر و استقامت کے ساتھ ان تمام خرافات کو نظر انداز کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ آیات ۱۰-۳۴
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَیَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾ بَلْ كَذَّبُوْا
بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا ﴿۱۱﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ
مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَیُّظًا وَّزَفِیْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا
مَكَانًا ضَیِّقًا مُّقَرَّنِیْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا الْیَوْمَ
ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِیْرًا ﴿۱۴﴾ قُلْ اَذٰلِكَ خَیْرٌ اَمْ جَنَّةُ

الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ لَهُمْ
فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾ وَيَوْمَ
يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ
عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ
يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ
اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ
بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ
مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ
اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا
ع بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾ وَقَالَ
الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى
رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ
الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا
مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً
مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾
وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ
يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾
وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ

الرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴿٢٨﴾
لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۗ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْإِنْسَانِ
خَذُولًا ﴿٢٩﴾ وَقَالَ الرَّسُولُ يٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ
مَهْجُورًا ﴿٣٠﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ۗ
وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيرًا ﴿٣١﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ
عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ مع
رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ
أَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿٣٣﴾ اَلَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلٰى وُجُوهِهِمْ إِلٰى جَهَنَّمَ ۙ
أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٣٤﴾ ع ۳ ۱۴ ۱

ترجمۂ آیات ۱۰-۲۱

بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جو چاہے تو تمھیں اس سے بھی کہیں بہتر چیزیں بخش دے — ایسے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں، اور تمھارے لیے محل بنوا دے۔ بلکہ ان لوگوں نے قیامت کو جھٹلا دیا ہے اور ہم نے قیامت کے جھٹلانے والوں کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ وہ دور ہی سے جب ان کو دیکھے گی تو وہ اس کا بپھرنا اور دھاڑنا سنیں گے۔ اور یہ جب اس کی کسی تنگ جگہ میں باندھ کر ڈال دیے جائیں گے تو اس وقت اپنی ہلاکت کو پکاریں گے۔ آج ایک ہی ہلاکت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی ہلاکتوں کو پکارو! ان سے پوچھو، کیا یہ بہتر ہے یا وہ جنت ابد جس کا خدا ترسوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے! وہ ان کے لیے صلہ اور ٹھکانا ہو گی۔ اس میں ان کے لیے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تیرے رب کا وعدہ ہے جس

کے ایفا کی اس پر حتمی ذمہ داری ہے۔ ۱۰-۱۶

اور اس دن کو خیال کرو جس دن ان کو اور جن چیزوں کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں، وہ اکٹھا کرے گا پس ان سے پوچھے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا انھوں نے خود ہی صحیح راہ کھوئی؟ وہ جواب دیں گے کہ معاذ اللہ! ہمیں یہ حق کہاں تھا کہ ہم تیرے سوا دوسروں کو کارساز بنائیں! بلکہ تو نے ان کو اور ان کے آبا و اجداد کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ وہ تیری یاد بھلا بیٹھے اور ہلاک ہونے والے بنے ۔۔۔ یہ لو، انھوں نے تو تمھاری بات ہی جو تم کہتے تھے تمھیں جھوٹا ٹھہرا دیا! سو اب تم نہ تو عذاب کو ٹال سکتے اور نہ اپنی کوئی مدد کر سکتے۔ اور جو بھی تم میں سے شرک کا مرتکب ہو گا ہم اس کو ایک بڑا عذاب چکھائیں گے۔ ۱۷-۱۹

اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں میں سے جن کو بھی بھیجا وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ اور ہم نے تم کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے تو بولو، صبر کرتے ہو! اور تمھارا رب سب دیکھ رہا ہے۔ ۲۰

اور جو ہمارے حضور پیشی کا اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے یا ہم اپنے رب ہی کو دیکھتے! انھوں نے اپنے جی میں اپنے کو بہت بڑا سمجھا اور بڑی اکڑ دکھائی! جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لیے کوئی خوش آئند بات نہیں ہو گی اور وہ پناہ پناہ پکار اٹھیں گے! اور ہم ان کے ہر اس عمل کی طرف، جو انھوں نے کیا ہو گا، بڑھیں گے اور اس کو پراگندہ غبار بنا دیں گے۔ اس دن جنت والے بہترین ٹھکانے اور نہایت خوب آرام گاہ میں ہوں گے۔ ۲۱-۲۴

اور جس دن کہ آسمان ایک بدلی کے ساتھ پھٹے گا اور فرشتوں کے پرے کے بعد پرے اتارے جائیں گے، اس دن حقیقی بادشاہی خدائے رحمان ہی کی ہوگی اور وہ دن کافروں پر بڑا ہی کٹھن ہوگا! اور جس دن اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا حسرت سے اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول کی معیت میں راہ اختیار کی ہوتی! ہائے میری بدبختی! کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا! اسی نے مجھے گمراہ کر کے اس یاددہانی سے برگشتہ کیا بعد اس کے کہ وہ میرے پاس آچکی تھی! اور شیطان انسان کے ساتھ بڑا ہی بے وفائی کرنے والا ہے! اور رسول کہے گا کہ اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو پس انداز کردہ چیز بنایا۔ اور اسی طرح ہم نے مجرموں میں سے ہر نبی کے دشمن بنائے اور تیرا رب رہنمائی اور مدد کے لیے کافی ہے۔ ۲۵-۳۱

اور ان کافروں نے کہا کہ اس کے اوپر پورا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتار دیا گیا؟ ہم نے ایسا ہی کیا تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم تمھارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔ اور یہ لوگ جو اعتراض بھی اٹھائیں گے ہم اس کا صحیح جواب اور اس کی بہترین توجیہ تمھیں بتا دیں گے۔ جو لوگ جہنم کی طرف اپنے مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے وہ اپنے ٹھکانے کے اعتبار سے بدتر اور راہ کے اعتبار سے گمراہ تر ہیں۔ ۳۲-۳۴

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا (۱۰)

اعتراضات کا جواب — جس طرح نقل اعتراضات کی تمہید لفظ 'تبارک' سے اٹھائی ہے اسی طرح جواب کی تمہید بھی اسی لفظ سے اٹھائی ہے اور سب سے پہلے معترضین کے اس اعتراض کو لیا ہے جو سب سے آخر میں آیت ۸ میں نقل

ہوا ہے۔ فرمایا کہ خدا کی ذات بڑی ہی بافیض اور بڑی ہی صاحب جود و کرم ہے۔ اس کے پاس نہ باغوں کی کمی ہے اور نہ خزانوں کی۔ یہ ایک باغ کو کہتے ہیں۔ خدا اگر چاہے تو تمھارے لیے بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں اور بہت سے ایوان و محل تیار کرا دے اور یہ سب کچھ تمھیں ایک دن ملنے والا ہے۔ لیکن ان لوگوں کی نگاہیں چونکہ اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہیں، آخرت کی زندگی کا، جو اصل زندگی ہے یہ کوئی تصور نہیں رکھتے اس وجہ سے یہ اپنے دنیوی اسباب و وسائل پر نازاں اور تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ دارالانعام نہیں ہے۔ یہاں کی غربت و امارت دونوں امتحان کے لیے ہے۔ انعام کا گھر آخرت ہے۔ جو وہاں کامیاب ہوا وہ ہمیشہ کے لیے کامیاب ہے اور جو وہاں نامراد ہوا وہ ہمیشہ کے لیے نامراد ہے اور وہاں کی کامیابی ان لوگوں کے لیے ہے جو اس دنیا میں خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ ۖ وَأَعْتَدْنَا لِمَن كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا (۱۱)

یہ ان کے اصل مغالطہ کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اپنی دنیوی کامرانیوں کو جو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھے ہوئے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت کے منکر ہیں۔ حالانکہ انھیں نہیں معلوم کہ جو لوگ آخرت کے منکر ہیں ہم نے ان کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے اگرچہ اس دنیا میں ان کے پاس کتنے ہی مربعے، کتنے ہی باغ اور کتنی ہی کوٹھیاں ہوں!

دوزخ اور اہل دوزخ کی تصویر

إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا (۱۲)

تَغَيُّظ کے معنی غصہ سے بھرنے اور زفیر کے معنی چیخنے اور دھاڑنے کے ہیں۔ یہ اس دوزخ کی صفت بیان ہوئی ہے جو ان ظالموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھی ہے۔ فرمایا کہ وہ ان سے انتقام کے جوش میں پہلے سے بھری ہوئی ہے اور ان کو دور ہی سے دیکھ کر اس طرح دھاڑے گی جس طرح بھوکا شیر دھاڑتا ہے۔

وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا (۱۳)

یہ تصویر ہے ان ظالموں کے عذاب دوزخ کی۔ فرمایا کہ جب یہ اس کی کسی نہایت تنگ جگہ میں، باندھ کر ڈال دیے جائیں گے تو وہاں وہ اپنی موت کو پکاریں گے۔ یعنی اول تو جگہ تنگ اور پھر اس میں بھی وہ باندھ کر اور زنجیروں میں جکڑ کر ڈالے جائیں گے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (الہمزۃ: ۸-۹) یعنی وہ ان کے اوپر سے بند ہوگی اور وہ اس کے اندر لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے۔ ایک اور مقام میں ان کے لیے سلاسل اور اغلال کا ذکر بھی آیا ہے۔

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا۔ ثبور کے معنی موت اور ہلاکت کے ہیں یعنی اس وقت وہ موت کی دہائی دیں گے اس لیے کہ اس عذاب سے رہائی کی واحد شکل جو ان کو نظر آئے گی وہ یہی ہوگی کہ کسی طرح موت

آئے وہ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دے لیکن وہاں موت بھی نہیں آئے گی۔ دوسرے مقام میں تصریح ہے کہ وہاں موت ان پر ہر طرف سے پل پڑ رہی ہوگی لیکن وہ مریں گے نہیں بلکہ برابر لَا يَمُوْتُ وَلَا يَحْيٰى کے ضیق میں مبتلا رہیں گے۔

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا (۱۴)

اس دن ان سے کہا جائے گا کہ آج ایک ہی موت کی دہائی نہ دو بلکہ بہت سی موتوں کی دہائی دو۔ یعنی آج تم پر نئی نئی بے شمار مصیبتیں ٹوٹیں گی اور تم کو ہر مصیبت پر اسی طرح واویلا کرنا ہے لیکن تمھارا یہ سارا واویلا بالکل بے سود ہوگا۔ یہ بات قولاً بھی ہو سکتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہنم کے داروغوں کے ذریعہ سے ان کو کہلائی جائے گی اور صورتِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہم کر چکے ہیں۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ۝ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا (۱۵-۱۶)

جنت اور اہلِ جنت کی تصویر

اب یہ اس اصل مدعا کا ذکر ہے جس کے لیے دوزخ کی یہ ساری تفصیل سنائی گئی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ جو لوگ تمھیں طعنہ دیتے ہیں کہ تمھارے پاس کوئی باغ کیوں نہ ہوا ان سے پوچھو کہ یہ دوزخ بہتر ہے جو ان کے لیے تیار ہے یا وہ جنتِ خلد جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں سے وعدہ فرما رکھا ہے! یعنی تمھاری نگاہیں چونکہ اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہیں اس وجہ سے تم اپنے باغوں اور محلوں پر نازاں اور مومنین کی بے مائگی پر طعنہ زن ہو۔ اگر تمھیں آخرت کا علم ہوتا اور تم یہ جان سکتے کہ وہاں تمھارے لیے کیا عذاب تیار ہے اور اہلِ ایمان کے لیے کس ابدی بادشاہی کا اہتمام ہے تو تم ان غریب اہلِ ایمان پر رشک کرتے اور اپنی شامتِ اعمال پر اپنے سر پیٹتے لیکن تمھیں تو اس دنیا کے غرور نے اس طرح اندھا کر دیا ہے کہ اپنی ناک سے آگے تمھیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

اس جنت سے متعلق یہاں چار باتیں فرمائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ اہلِ ایمان کو ان کے اعمال کے صلے اور بدلے کے طور پر ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو یہ اطمینان دلا دے گا کہ یہ تم نے اپنی سعی و عمل سے حاصل کی ہے اور تم اس کے پوری طرح حقدار ہو۔

دوسری یہ کہ یہ ان کی ابدی قیام گاہ ہوگی۔ اس سے محروم ہونے کا ان کو کبھی کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔

تیسری یہ کہ اس میں وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمیشہ کے لیے ملے گا۔

چوتھی یہ کہ اس جنت کا اہلِ ایمان سے اللہ تعالیٰ نے حتمی وعدہ فرمایا ہے اور از خود اپنے اوپر اس کا ایفاء واجب اور اپنے بندوں کے آگے اس کے لیے اپنے کو ذمہ دار و مسئول ٹھہرایا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَاۗءِ اَمْ هُمْ

ضَلُّوا السَّبِيلَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا (۱۷-۱۸)

آخرت میں انبیاء و صالحین کا اپنے پرستاروں سے اعلانِ براءت

اوپر آیات ۲-۴ میں ان شرکاء کا ذکر گزر چکا ہے جن کے اعتماد پر یہ مشرکین آخرت سے بے پروا ہو کر قرآن اور رسول کا مذاق اڑا رہے تھے۔ یہاں انہی کو پیشِ نظر رکھ کر فرمایا کہ حشر کے دن اللہ ان کے ساتھ ان کے ان معبودوں کو بھی جمع کرے گا جن کو یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں اور ان سے سوال کرے گا کہ کیا تم لوگوں نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا انھوں نے اپنی راہ خود گم کی؟ وہ جواب دیں گے کہ معاذ اللہ ہمارے لیے یہ کس طرح روا تھا کہ ہم تیرے سوا کسی اور کو اپنا ولی و کارساز بناتے یا دوسروں کو اس کا حکم دیتے! اصل بات یہ ہے کہ تو نے معیشتِ دنیا کی جو فراوانی ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو بخشی اسی میں ان کی کئی پشتیں گزر گئیں جس کے سبب سے وہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اسی عیش کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اسی میں جئیں گے اور اسی میں مریں گے، وہ اس کے پیدائشی حق دار ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ آخرت اول تو کوئی شے ہے نہیں اور اگر بالفرض ہے تو جس طرح اس دنیا میں ہم سب پر بالا ہیں اسی طرح آخرت میں بھی سب پر بالا رہیں گے۔ ان کے اس مغالطے نے ان کو راہِ حق سے برگشتہ رکھا اور جن لوگوں نے ان کو اصل حقیقت کی یاد دہانی کی اپنی اس دنیوی برتری کو اپنے برحق ہونے کی دلیل قرار دے کر انھوں نے ان کو جھٹلا دیا اور ہلاک ہونے والے بنے۔

اس جواب سے صاف واضح ہے کہ یہ ان انبیاء و صلحاء و ملائکہ کا جواب ہو گا جن کی پرستش کی گئی ہے۔ رہے مشرکین کے وہ خیالی اصنام و اوثان جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو اگرچہ جمع تو، جیسا کہ وَمَا يَعْبُدُونَ کے عموم سے ظاہر ہوتا ہے، ان کی مورتیں بھی کی جائیں گی لیکن ان سے کسی سوال و جواب کا کیا سوال! البتہ قرآن میں دوسرے مقامات میں یہ تصریح موجود ہے کہ یہ بھی اپنے پوجنے والوں کے ساتھ جہنم میں جھونک دی جائیں گی تاکہ جن بدقسمت لوگوں نے ان کی پرستش کی ان پر واضح ہو جائے کہ جن کے آگے انھوں نے زندگی بھر ڈنڈوت کی ان کا کیا حشر ہوا!

یہاں انبیاء و صلحاء کا جو جواب نقل ہوا ہے بعینہٖ وہی جواب حضرت مسیحؑ کی زبان سے سورۂ مائدہ کی آیات ۱۱۵-۱۱۸ میں نقل ہوا ہے، اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

اصل سببِ انکار

وَلَٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو سورۂ حدید کی آیت ۱۶ میں یوں فرمائی گئی ہے کہ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ (ان لوگوں کو عیش و رفاہیت کا طویل زمانہ ملا اس وجہ سے ان کے دل سخت ہو گئے) آیت میں 'ذکر' سے مراد وہ یاد دہانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو برابر آخرت کو یاد رکھنے کی کی گئی۔ یہ مضمون انبیاء آیت ۴۴ اور قصص آیت ۴۵ میں بھی بیان ہوا ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

قَوْمًا بُوْرًا ۔ بُوْر واحد، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی شور زمین کے بھی ہیں اور فاسد و ناکارہ آدمی کے بھی۔ یہاں یہ قوم کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہلاک ہونے والی قوم کے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا (۱۹)

ایک بلیغ اسلوب

یہاں مستقبل کی بات کو بتقاضائے بلاغت ماضی کی شکل میں کر دیا ہے۔ فرمایا کہ یہ لو، انھوں نے تو تمھاری اس بات کو جھٹلا دیا جو تم کہتے تھے! تمھارا دعویٰ تو یہ تھا کہ انھوں نے تمھیں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور تم جن باتوں کو اختیار کیے ہوئے ہو انہی کی ہدایت کے مطابق اختیار کیے ہوئے ہو لیکن ان کا کہنا تو یہ ہے کہ اپنی عبادت کا کسی کو حکم دینا تو درکنار، وہ اس بات کے بھی ایک لمحہ کے لیے روادار نہیں کہ کسی کو اپنا ولی و کارساز بنائیں۔

ظلم عظیم کی سزا عذاب کبیر

فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ، الآیۃ۔ یعنی اس آخری اتمام حجت اور قطع عذر کے بعد تمھارے لیے کوئی راہ فرار باقی نہ رہ جائے گی۔ نہ تم خود اپنے سے عذاب کو ہٹا سکو گے اور نہ اپنی یا کسی دوسرے کی کوئی مدد ہی کر سکو گے اور تم میں سے جو بھی شرک کے مرتکب ہوں گے ہم ان کو ایک عذاب عظیم چکھائیں گے۔ یہ امر واضح رہے کہ شرک کی سزا عذاب کبیر اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک کی حیثیت ظلم عظیم کی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا (۲۰)

تمام رسول بشر تھے

اس آیت میں اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن آیت کے الفاظ خود شاہد ہیں کہ کلام کا رخ عام لوگوں کی طرف ہے چنانچہ اس میں ضمیریں اور فعل واحد بھی استعمال ہوئے ہیں اور جمع بھی۔ یہ معترضین کے اس اعتراض کا جواب ہے جو اوپر آیت ۷ میں نقل ہوا ہے۔ فرمایا کہ اگر تم بشر ہو، کھانا بھی کھاتے ہو اور بازاروں میں لین دین کے لیے بھی تمھیں جانا پڑتا ہے تو ان میں سے کوئی بات بھی منصب رسالت کے منافی نہیں ہے۔ تم سے پہلے جتنے رسول بھی ہم نے بھیجے وہ سب بلا استثناء کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں عام آدمیوں کی طرح چلتے پھرتے بھی تھے۔ قرآن کا یہ جواب بالکل واضح ہے اس لیے کہ یہ معترضین حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کو نہ صرف نبی و رسول مانتے تھے بلکہ ان کی ذریت اور ان کے دین کے وارث ہونے پر ان کو بڑا فخر و ناز تھا لیکن ان میں سے کسی کے متعلق بھی ان کا یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ مافوق بشر تھے بلکہ ان کو وہ بشر ہی تسلیم کرتے تھے۔ اسی طرح بنی اسرائیل بھی اپنے انبیاء میں سے کسی کے مافوق البشر ہونے کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ قرآن نے دوسرے مقام میں قریش کے ان معترضین سے کہا ہوا

ہے کہ اگر تم نبوت و رسالت کی تاریخ سے بے خبر ہو تو ان اہل کتاب سے پوچھ لو جو انبیاء و رسل کی تاریخ سے واقف ہیں کہ ان کے انبیاء کھانا کھاتے تھے یا نہیں اور انھیں بازاروں میں چلنے پھرنے کی ضرورت پیش آتی تھی یا نہیں؟ عیسائیوں نے اگرچہ پال کے زمانہ سے حضرت عیسیٰ کو مافوق بشر بنانے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کے اور ان کی والدہ ماجدہ کے کھانا کھانے سے وہ بھی انکار نہیں کر سکتے اس لیے کہ انجیلوں میں یہ چیز نہایت تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کو بھی ان کے متعلق دعوائے الوہیت کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ (مائدہ: ۷۵) (ماں بیٹا دونوں کھانا کھاتے تھے)

انبیاء اور ان کی قوموں کے لیے امتحان

وَجَعَلْنَا بَعْضَکُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَۃً۔ بعینہٖ یہی مضمون انعام آیت ۵۳ میں گزر چکا ہے۔ وہاں فرمایا ہے۔ وَکَذٰلِکَ فَتَنَّا بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْٓا اَھٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا (اسی طرح ہم نے ایک کو دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے تاکہ یہ متکبرین کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل سے منتخب کیا!) یعنی مسلمانوں کی غربت ان کفار کے لیے فتنہ بن گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تمام نعمتوں اور مال وجاہ کے وارث اور مالک ہم ہیں تو یہ دین اگر کوئی خدائی دین ہوتا تو وہ ان قلاش مسلمانوں کو کس طرح ملتا، وہ بھی لازماً ہمیں ملتا اور اگر اللہ انسانوں ہی میں سے کسی کو نبی بنانے والا ہوتا تو طائف یا مکہ کے کسی رئیس کو بناتا نہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے غریب آدمی کو اس منصب پر سرفراز کرتا! اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنایا ہے۔ یعنی تمہاری غربت ان کے لیے قبولِ حق کی راہ میں حجاب بن گئی ہے۔ حق تو یہ تھا کہ وہ نعمت پاکر خدا کے شکر گزار بندے بنتے لیکن یہ نعمت ان کے لیے استکبار کا سبب بن گئی اور اس استکبار کے نشہ میں انھوں نے تمہاری پیش کردہ دعوت پر غور کرنے اور اس کو اختیار کرنے کے بجائے تمہیں اعتراضات و مطاعن کا ہدف بنا لیا اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے صبر کا امتحان ہے۔

عربیت کا ایک بلیغ اسلوب

اَتَصْبِرُوْنَ۔ یہ مسلمانوں کو خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ وہ تو اپنے شکر کے امتحان میں بالکل ناکام رہے، اب تم بتاؤ کہ تم ان کے طنز و استہزاء اور ان کی مخالفت و عداوت کے مقابل میں ثابت قدم رہنے والے بنتے ہو یا نہیں؟ عربیت کا ذوق رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جب امر کے اندر ترغیب و تشویق اور حث و تحریض کا مفہوم پیدا کرنا ہو تو وہ خبر یہ اسلوب کے قالب میں آتا ہے اور اگر اس پر حرفِ استفہام آجائے تو اس کے اندر مزید زور پیدا ہو جاتا ہے۔ ھَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ (شعراء: ۳۹) کے تحت اس اسلوب کی مزید وضاحت آئے گی اور پیچھے بھی اس کی بعض عمدہ مثالیں گزر چکی ہیں۔ یہ مسلمانوں کو اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ اگر تمہارے مخالفین اپنے امتحان میں ناکام رہے تو ان کو ان کی قسمت کے حوالہ کرو، تمہارے سامنے صبر کے امتحان کا جو مرحلہ ہے اس میں کامیابی کے لیے عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھو۔

وَکَانَ رَبُّکَ بَصِیْرًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا نگرانِ حال ہے۔ اس کی نصرت پر پورا بھروسہ رکھو۔

اگر تم ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ تمھیں ان تمام مخالفتوں کے علی الرغم منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔

اس آیت میں فتنہ کو اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اس نے اپنے بندوں کے امتحان کے لیے اس دنیا میں جاری فرمائی ہے۔ اس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۚ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيرًا ۝ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا (۲۱-۲۲)

منکبرین کے استکبار پر ایک ضرب

'اَلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا' سے قرآن میں متکبرین کے اس گروہ کو تعبیر کیا گیا ہے جو خدا کے حضور پیشی کے اندیشے سے بالکل بےخوف تھا۔ اس گروہ کا جہل و غرور اور اس کا گھمنڈ دوسرے کفار و معاندین سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا اس وجہ سے اس کا ذکر 'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' کے لفظ سے نہیں ہوا بلکہ ایسی صفت کے ساتھ ہوا ہے جس سے اس کا غرور پوری طرح بے نقاب ہو سکے۔ اس گروہ کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس خدا کا فرشتہ آتا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے، تو آخر ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے یا ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ خود خدا بے حجاب ہو کر سامنے آئے اور ہم اس کو دیکھیں۔ یہ مطالبہ ظاہر ہے کہ وہی لوگ کر سکتے تھے جو بالکل ہی سرپھرے، مغرور اور ساتھ ہی پہلے سرے کے احمق ہوں۔ اس وجہ سے ان کی اس احمقانہ بات کا جواب دینے کے بجائے ان کے اس غرور پر ضرب لگائی۔ فرمایا کہ ان لوگوں نے بڑی اکڑ دکھائی کہ خدا اور فرشتوں کو دیکھنے کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو اندازہ نہیں کہ خدا اور فرشتوں کا دیکھنا کیا ہوتا ہے! خدا تو در کنار جب وہ دن آئے گا جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو وہ ان کے لیے کوئی خوش آیند دن نہیں ہوگا بلکہ اس دن پناہ! پناہ! پکار اٹھیں گے! آگے اس دن کی ہولناکی کی مزید تفصیل آرہی ہے۔

'حِجْرًا مَّحْجُوْرًا' کا مفہوم

'حِجْرًا مَّحْجُوْرًا' کے ایک معنی تو سخت پردہ اور اوٹ کے ہیں۔ اس معنی میں یہ لفظ اسی سورہ کی آیت ۵۳ میں آگے آئے گا۔ دوسرے یہ استعاذہ کے الفاظ سے ہے اور سیبویہ کی رائے یہ ہے کہ جب یہ اس مفہوم میں آتا ہے تو بالکل اسی شکل میں استعمال ہوتا ہے اور فعل محذوف سے منصوب ہوتا ہے جس طرح 'مَعَاذَ اللّٰهِ' استعمال ہوتا ہے۔

وَقَدِمْنَآ إِلٰى مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنثُورًا (۲۳)

منکرین کے اعمال کی بے وقعتی

فرمایا کہ ان لوگوں کو اپنی جن خدمات اور جن کارناموں پر بڑا ناز ہے اور جن کی بنا پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں بھی وہ ملک و قوم کے سربرآوردہ سمجھے جانے کے حق دار ہیں اور اگر آخرت کوئی چیز ہے تو وہاں بھی ان کو بڑے سے بڑے مراتب ملیں گے، ہم ان کے ان اعمال کو منتشر ذرات بنا کر اڑا دیں گے۔ اس لیے

کہ ہمارے ہاں اس عمل کی کوئی قدر نہیں ہے جو خالص ہماری رضا کے لیے نہ کیا گیا ہو۔ قَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا
کے الفاظ سے اسلوب بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ہم خود آگے بڑھ کر ان کے ہر عمل کو ٹھکرا دیں گے،
خواہ وہ عمل بڑا ہو یا چھوٹا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اعمال کی انتہائی تحقیر کی دلیل ہے۔

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا (۲۴)

بہترین قیام گاہ　یہ ان کے مقابل میں اہل جنت کا حال بیان ہوا کہ جن کو یہ اس دنیا میں نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اس دن بہترین مستقر اور اعلیٰ ترین آرامگاہ میں ہوں گے۔ 'مقیل' قیلولہ کی جگہ کو کہتے ہیں لیکن یہ اپنے عام استعمال میں آرام گاہ اور عیش گاہ کے مفہوم میں آتا ہے۔ امرؤالقیس کا مصرع ہے 'فِقِدْ فی مَقِيلٍ نحسه متغيب' (ایسی عیش گاہ میں عیش کر جو ہر نحوست سے محفوظ ہے) 'خیر' اور 'احسن' یہاں تقابل کے مفہوم میں نہیں ہیں بلکہ یہ خوب ترین اور بہترین کے مفہوم میں ہیں۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ○ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ
وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا (۲۵-۲۶)

قیامت کے دن فرشتوں کا ظہور　یہ بھی اسی جواب کا حصہ ہے جو اوپر فرشتوں کو دیکھنے کا مطالبہ کرنے والوں کو دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو چاہیے کہ اس دن کا تصور کریں جس دن آسمان پھٹے گا اور اس سے ایک بدلی نمودار ہوگی اور اس کے اندر سے فرشتوں کے پرے کے پرے، یکے بعد دیگرے، اتارے جائیں گے۔ فرمایا کہ اس دن کسی کی کچھ پیش نہیں جانے کی۔ جن معبودوں پر ان لوگوں کو بڑا ناز و اعتماد ہے وہ بھی ان کے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ حقیقی بادشاہی اس دن خدائے رحمان ہی کی ہوگی اور کافروں پر یہ دن بڑا ہی کٹھن ہوگا! یہ امر ملحوظ رہے کہ حقیقی اختیار اور حقیقی بادشاہی یوں تو ہمیشہ خدا ہی کی ہے لیکن اس دنیا میں اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا ہے اس وجہ سے نادانوں کو مغالطہ ہوتا ہے اور وہ اپنی خدائی کا ڈنکا بجانے لگتے ہیں لیکن قیامت کے دن ہر شخص پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سارا زور و اختیار صرف اللہ ہی کو حاصل ہے، دوسرے کسی کو بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ○ يٰوَيْلَتٰى
لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ○ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ
لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۷-۲۹)

قیامت کے دن مکذبین رسول کی حسرت　ہاتھ کاٹنا اظہار حسرت و ندامت کی تعبیر ہے۔ اور یہ تعبیر ہماری زبان میں بھی موجود ہے۔ 'الظالم' سے مراد یہاں اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا، یعنی ہر وہ شخص جس نے رسول کی مخالفت کی۔

فرمایا کہ ان لوگوں کو چاہیے کہ اس دن کا تصور کریں جس دن ہر وہ شخص جو آج اندھا بہرا بن کر رسول کی

ـت کر رہا ہے اور اس طرح خود اپنی جان پر ظلم ڈھا رہا ہے نہایت حسرت کے ساتھ اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا کہ کاش میں نے اللہ کے رسول کے ساتھ اس کی بتائی ہوئی راہ اختیار کرلی ہوتی اور اپنی بدبختی سے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا جس نے مجھے خدا کی یاد دہانی سے، جب کہ وہ میرے پاس آچکی تھی، برگشتہ کرکے گمراہی میں ڈالا!

'اَضَلَّنِیْ' کے بعد 'عن' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ 'صرف' کے معنی پر متضمن ہے یعنی اس نے مجھے اپنی ان گمراہ کن باتوں سے، جو اس نے رسول اور اللہ کی کتاب کے خلاف کہیں، مجھے گمراہ اور رسول کے بتائے ہوئے راستہ سے برگشتہ کیا۔ ان باتوں کا حوالہ آیات ۴، ۲۱، ۳۰، ۳۲، ۴۱ اور ۴۲ میں موجود ہے۔

'بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ' میں اپنی بدبختی کا اعتراف ہے کہ اگر اللہ کی ہدایت میرے پاس نہ آئی ہوتی تو میں کوئی عذر بھی پیش کرسکتا تھا لیکن اب میں کیا عذر کرسکتا ہوں جب کہ میرے اوپر حجت تمام کی جاچکی ہے۔

'وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا' 'خَذُوْل' کے معنی وقت پر ساتھ چھوڑ دینے والا، بے وفا اور غدار۔

میرے نزدیک یہ اظہار حسرت کرنے والوں کے قول کا جزو نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ ان کے قول پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے برمحل تذکیر و تنبیہ ہے کہ شیطان اس طرح عین وقت پر دغا دینے والا اور ساتھ چھوڑ دینے والا ہے۔ لفظ 'شیطان' یہاں جنس کے مفہوم میں ہے۔ اس سے شیاطین جن و انس دونوں مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو یہ ناہنجار لوگ ایک دوسرے کے ساتھی، لیڈر اور پیرو ہیں۔ ہر ضلالت کے پھیلانے اور ہر حق کو دبانے میں ایک دوسرے کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں لیکن جب آخرت کا مرحلہ پیش آئے گا تو ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ پیرو کہیں گے کہ فلاں نے ہمیں گمراہ کیا، اگر اس نے نہ ورغلایا ہوتا تو ہم سیدھی راہ پر ہوتے، اور لیڈر جواب دیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہمارا ساتھ دیا، ہم نے تو تمہیں وہی بنایا جو تم خود بنتے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۳۰)

قیامت کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے رب سے شکوہ

'رسول' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن کو جھٹلانے والے خود اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے رب سے شکوہ کریں گے کہ اے رب! میں نے تیری کتاب، پوری دلسوزی کے ساتھ، اپنی اس قوم کے سامنے پیش کی لیکن ان لوگوں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی بلکہ نہایت ناقدری کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔ حضور کا یہ شکوہ ان اشقیاء کے تابوت میں آخری کیل ہوگا جس کے بعد ان کے لیے زبان کھولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی۔ یہ بات سورہ مائدہ میں تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ قیامت کے دن انبیاء اپنی اپنی قوموں کے معاملہ میں گواہی دیں گے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ۗ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيرًا (۳۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ اشقیاء تمہاری مخالفت جو کر رہے ہیں یہ انبیاء کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر دور کے مجرمین نے اسی طرح اپنے رسولوں کی مخالفت کی ہے۔ لفظ 'مجرمین' اوپر آیت ۲۲ میں گزر چکا ہے۔ یہ لفظ ان گمراہ کرنے والے لیڈروں کے لیے استعمال ہوا ہے جن کا رویہ اس سورہ میں زیر بحث ہے۔ فرمایا کہ یہی جرائم پیشہ لوگ ان تمام فسادات کے ذمہ دار ہوتے ہیں جن کی نبی اصلاح کرنا چاہتا ہے اور ان تمام مفاسد سے ان کا مفاد وابستہ ہوتا ہے اس وجہ سے وہ نبی کی دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کرتے بلکہ اپنے تمام اوچھے ہتھیاروں سے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن تم اطمینان رکھو، تمہارا رب ہر مشکل میں تمہاری رہنمائی اور مدد کے لیے کافی ہے۔

یہ بات چونکہ سنتِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہے، اس لیے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ باطل کو بھی ایک حدِ خاص تک زور آزمائی کی مہلت دی ہے، اس وجہ سے اس کو منسوب اپنی طرف فرمایا۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں۔ انعام کی آیت ۱۱۳ میں یہ مضمون زیادہ وضاحت سے گزر چکا ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيلًا (۳۲)

قرآن کے بیک وقت نہ اترنے کی وجہ

یہ ان معترضین کا چوتھا اعتراض نقل ہوا ہے۔ وہ قرآن کے خلاف لوگوں میں یہ خیال بھی پھیلاتے تھے کہ اگر یہ خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے تو آخر یہ پوری کی پوری بیک وقت کیوں نہیں نازل کر دی گئی، خدا کے لیے تو کچھ سوچنے اور اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اس کو تھوڑی تھوڑی اتارے! یہ اعتراض وہ اپنے اسی پروپیگنڈے کو تقویت پہنچانے کے لیے کرتے تھے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں کچھ دوسرے لوگ بھی شریک ہیں۔ چنانچہ جتنی مقدار میں وہ تیار کر پاتے ہیں اتنی اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو سکھاتے ہیں، اور یہ اس کو وحیِ الٰہی بنا کر ہمیں سناتے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم نے اس کو اسی طرح اتارا ہے تاکہ اس طرح ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو ایک خاص تدریج و اہتمام کے ساتھ نازل کیا تاکہ لوگ اس کو سیکھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اتار دینے کو تو ہم پوری کتاب ایک ہی دفعہ نازل کر سکتے تھے لیکن سوال تمہارے تحمل اور لوگوں کی تعلیم و تربیت کا بھی تھا۔ اگر یہ پوری کتاب ایک ہی مرتبہ میں نازل کر دی جاتی تو نہ تم ہی اس بارِ گراں کو اٹھا سکتے اور نہ لوگوں ہی کے اوپر صحیح طریقہ سے اتمامِ حجت ہو سکتا اس وجہ سے اللہ نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا تاکہ تم بھی اس کو برداشت کر سکو اور لوگ بھی اگر سیکھنا چاہیں تو اس کو سیکھ سکیں۔ ایک استاذ اگر چاہے تو پوری کتاب ایک ہی نشست میں شاگردوں کو سنا دے لیکن کیا اس طرح شاگرد کتاب کو محفوظ بھی کر سکیں گے!

'وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا'۔ 'تَرْتِيْلٌ' کے معنی اہتمام کے ساتھ پڑھنے اور سنانے کے ہیں۔ اس کا عطف اس فعل پر ہے جو 'کَذٰلِكَ' کے بعد محذوف ہے۔ یہ بات یہاں بطور اظہارِ احسان ارشاد ہوئی ہے کہ یہ ہماری نہایت درجہ لوگوں پر مہربانی ہے کہ ہم نے ان کو ایک ساتھ پوری کتاب نہیں پکڑا دی بلکہ اس کو نہایت اہتمام و تدریج کے ساتھ سبق سبق کر کے پڑھا اور سنا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیز ممنون و شکر گزار ہونے کی ہے نہ کہ اعتراض و نکتہ چینی کی لیکن ان ظالموں نے اس چیز کو بھی ایک وجہِ اعتراض بنا لیا۔

آسمانی صحیفوں میں سے کوئی صحیفہ بھی بیک دفعہ نازل نہیں ہوا

یہ امر ملحوظ رہے کہ آسمانی صحائف میں سے کوئی صحیفہ بھی بیک دفعہ نہیں نازل ہوا ہے۔ جن لوگوں نے یہ خیال کیا ہے، ان کا خیال ان صحائف سے بے خبری پر مبنی ہے۔ تورات بھی پوری کی پوری بیک دفعہ نہیں نازل ہوئی۔ بیک دفعہ اس کے صرف احکامِ عشرہ نازل ہوئے ہیں جو الواح میں لکھ کر حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئے۔ لیکن تورات صرف احکامِ عشرہ ہی پر تو مشتمل نہیں ہے اس میں تو شریعتِ موسوی کے تمام احکام و قوانین ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی پوری زندگی میں درجہ بدرجہ نازل ہوئے۔ ان میں بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے متعلق قرآن اور تورات دونوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کی ہجرت سے پہلے نازل ہوئے ہیں، بہت سے احکام دریا کے عبور کے بعد یا صحرائے سینا کی زندگی کے دور میں نازل ہوئے ہیں۔ اسی طرح انجیل تمام تر سیدنا مسیحؑ کے مواعظِ حکمت پر مشتمل ہے جو مختلف مواقع پر حسبِ اقتضائے حالات، آپ پر نازل ہوئے اور آپ نے ان سے اپنی قوم کو انذار کیا۔ یہی حال زبور کا ہے۔ یہ حضرت داؤدؑ کی منظوم مناجاتوں اور تلقینات پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً آپ پر القا ہوئیں۔ غرض یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی بیک دفعہ، مابین الدفتین، نازل ہوئی۔ آخر ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا! حضرات انبیاء علیہم السلام کوئی مصنف نہیں تھے کہ پوری پوری کتابیں لکھ کر ایک ہی دفعہ لوگوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیں۔ وہ داعی، معلم اور مزکّی ہوتے تھے۔ انھیں ایک پوری مریض قوم کا علاج اور تزکیہ کرنا ہوتا تھا۔ ان کے اس فرضِ منصبی کا فطری اور قدرتی تقاضا یہ تھا کہ وہ اس اصلاح کی راہ میں تدریج کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں اور ہر قدم پر ضرورت کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی حاصل ہو۔ جہاں تک مجھے علم ہے علمائے اہلِ کتاب بھی اپنی کتابوں میں سے کسی کتاب کے بیک دفعہ نازل ہونے کے مدعی نہیں ہیں۔ اور اگر کوئی ہے تو اس کا دعویٰ خود اس کی کتاب کی تصریحات کے صریح خلاف ہے۔ ہمارے مفسرین یہ بات جو لکھتے ہیں کہ تورات، زبور اور انجیل بیک دفعہ نازل ہوئی ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (۳۳)

آیت ۹ کے تحت ہم واضح کر آئے ہیں کہ 'ضربِ مثل' کا محاورہ اعتراض و نکتہ چینی کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ اعتراض ہی کے مفہوم میں ہے اور آیت میں اس کا مقابل لفظ 'حق' استعمال ہوا ہے جس سے یہ بات نکلی کہ اس سے مراد یہاں اعتراض باطل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دہانی

معترضین کے تمام اعتراضوں کا مسکت اور دل نشین جواب دینے کے بعد یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم مطمئن رہو۔ یہ لوگ جو اعتراض باطل بھی تمھارے خلاف اٹھائیں گے اس کے جواب کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ ہم اس کا صحیح جواب اور اس کی بہترین توجیہ و تفسیر تم پر نازل کر دیں گے۔ اس اطمینان دہانی کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت و رسالت اور قرآن کی جو دعوت لوگوں کو دی وہ خدا کے حکم سے دی، اس میں کوئی ادنیٰ دخل بھی آپ کی اپنی خواہش کو نہیں تھا۔ آپ کے اس دعوے اور دعوت کی وجہ سے پوری قوم آپ کی دشمن بن کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ اگر مخالفین کے ان تمام حملوں کی مدافعت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ اپنے اوپر نہ لیتا تو تمام خلق کا منہ آپ کس طرح بند کر سکتے تھے۔

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا (۳۴)

گمراہوں کی گمراہی کی اصل منزل

'يُحْشَرُوْنَ' کے بعد 'عَلٰى' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ 'يُسْحَبُوْنَ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت بھی ہوگئی ہے۔ فرمایا ہے۔ 'يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ' جس دن وہ اپنے منہوں کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے۔

یہ آیت اوپر کی آیت ۲۴ کے مقابل میں ہے۔ اس میں اہل جنت کو اچھے انجام کی بشارت دی ہے اس میں اہل دوزخ کے انجام کا ذکر فرمایا ہے کہ سب سے زیادہ برے ٹھکانے میں اور سب سے زیادہ راہ کھوئے ہوئے وہ لوگ ہوں گے جو منہوں کے بل گھسیٹ کر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے۔

'وَاَضَلُّ سَبِيْلًا' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں گمراہوں کو اپنی گمراہی کی اصل منزل کا پتہ نہیں ہوتا اس وجہ سے وہ یہ اندازہ نہیں کر پاتے کہ جس راہ پر وہ چل رہے ہیں وہ ان کو کہاں لے جائے گی۔ آخرت میں جب ان کی گمراہی کی اصل منزل ــــ دوزخ ــــ سامنے آجائے گی تب انھیں اندازہ ہوگا کہ وہ کہاں سے چلے اور کہاں پہنچے!

۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۳۵-۴۴

آگے حضرت موسیٰؑ اور حضرت نوحؑ اور ان کے درمیان کی ان قوموں کا اجمالی حوالہ ہے جن کے اندر رسولوں کی بعثت ہوئی۔ مقصود اس حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا اور آپ کی قوم کو تنبیہ کرنا ہے کہ ان قوموں کو بھی اللہ نے اپنی تعلیمات و ہدایات سے آگاہ کیا لیکن انھوں نے ان کی قدر کرنے کے بجائے ان تعلیمات کے پیش کرنے والوں کا مذاق اڑایا جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ وہ نہایت تباہ کن انجام سے دوچار ہوئیں۔ اس سورہ میں واقعات کی طرف صرف اشارہ ہے۔ آگے کی سورہ میں، جو اس کی مثنیٰ ہے، ان واقعات کی تفصیل آئے گی۔ واقعات کی ترتیب صعودی بھی ہے اور نزولی بھی۔ پہلے

حضرت موسیٰؑ کا ذکر فرمایا ہے جو سلسلۂ بنی اسرائیل کے سب سے زیادہ جلیل القدر صاحب کتاب و شریعت نبی و رسول ہیں۔ اس کے بعد حضرت نوحؑ کا ذکر فرمایا ہے جن سے حضرت آدمؑ کے بعد، گویا سلسلۂ رسالت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نیچے سے اوپر کی طرف اشارہ ہوا۔ پھر درمیان کی دوسری امتوں کا ذکر فرمایا اور ان کے ذکر میں ترتیب نزولی یعنی اوپر سے نیچے کی طرف ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۵-۴۴
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾
فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾
وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ
وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَاَصْحٰبَ
الرَّسِّ وَقُرُوْنًاۢ بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ؗ
وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ
السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ وَ
اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ
رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ
وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾
اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾
اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ
ع ۴ ۲ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾

ترجمۂ آیات ۳۵-۴۴

اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارونؑ کو اس کا مددگار بنایا۔ پس ہم نے ان کو حکم دیا کہ تم دونوں ان لوگوں کے پاس جاؤ جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے۔ پس ہم نے ان لوگوں کو بالکل ہی پامال کر کے رکھ دیا۔ اور قوم نوح کو بھی ہم

نے ہلاک کیا جب کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا ہم نے ان کو غرق کر دیا اور ہم نے ان کو لوگوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا دیا اور ان ظالموں کے لیے ہم نے ایک دردناک عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔ اور عاد، ثمود، اصحاب رسّ اور ان کے درمیان بہت سی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا اور ہم نے ان میں سے ہر ایک کے لیے اپنی تعلیماتِ حکمت واضح کیں اور بالآخر ہر ایک کو نیست و نابود کر دیا۔ اور یہ لوگ تو اس بستی پر سے گزرے بھی ہیں جس پر تباہی کی بارش برسائی گئی، کیا یہ اس کو دیکھتے نہیں رہے ہیں! بلکہ یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے متوقع نہیں رہے ہیں۔ ۳۵-۴۰

اور جب بھی یہ تمھیں دیکھتے ہیں بس تمھیں مذاق بنا لیتے ہیں۔ اچھا یہی ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے! اس شخص نے تو ہمیں ہمارے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم ان پر جمے نہ رہتے! اور عنقریب، جب یہ عذاب دیکھیں گے، جان لیں گے کہ سب سے زیادہ بے راہ کون ہے۔ بھلا یہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے تم اس کے ذمہ دار ہوگے! کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں! یہ تو بس چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔ ۴۱-۴۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا (۳۵)

حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حضرت ہارونؑ کا ذکر انعام محبت کے پہلو سے

حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حضرت ہارونؑ کا ذکر ان کے مددگار کی حیثیت سے بار بار جو آتا ہے اس سے مقصود اس احسان اور اتمامِ محبت کے پہلو کو نمایاں کرنا ہوتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ ایک رسول کے ساتھ اپنے ایک دوسرے پیغمبر کو اس کی مدد کے لیے مامور فرمایا۔ دوسرے مقام میں یہ تفصیل گزر چکی ہے کہ اظہار و بیان کے پہلو سے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام اپنے اندر ایک کمی

محسوس فرماتے تھے اس وجہ سے انھوں نے دعا فرمائی کہ حضرت ہارونؑ کو ان کا شریکِ کار بنا دیا جائے کہ ان کی زبان آوری اور فصاحت کی مدد سے وہ پوری قوت و اعتماد کے ساتھ تبلیغِ حق کر سکیں تاکہ دعوت و اتمامِ حجت کے پہلو سے ادائے فرض میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان دونوں نبیوں نے بیک وقت فرعونیوں کو دعوت دی لیکن انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس احسان و اہتمام کی کوئی قدر نہ کی۔

فَقُلْنَا اذْهَبَا إِلَى الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيرًا (۳۶)

مقصود یہاں چونکہ اجمالی اشارہ ہے اس وجہ سے پوری بات دو فقروں میں سمیٹ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ان دونوں رسولوں کو اپنی نشانیوں کے ساتھ ان لوگوں کی طرف بھیجا لیکن انھوں نے ان تمام نشانیوں کو سحر قرار دے کر ان کی تکذیب کر دی جس کی سزا بالآخر ان کو یہ ملی کہ ہم نے ان کو یک قلم پامال کر دیا۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی ہے کہ جن کے دل مسخ ہو چکے ہوتے ہیں وہ کسی طرح بھی ہدایت قبول نہیں کرتے یہاں تک کہ وہ دو دو رسولوں اور ان کے تمام معجزات کی بیک وقت تکذیب کر دیتے ہیں اور اس میں ساتھ ہی قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ اگر انھوں نے بھی فرعون اور اس کی قوم کی روش کی تقلید کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کا انجام ان سے کچھ مختلف ہو!

وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً ۖ وَأَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا (۳۷)

ایک رسول کا انکار تمام رسولوں کا انکار ہے

حضرت نوحؑ کی قوم نے اگرچہ تکذیب ایک ہی رسول — حضرت نوحؑ — کی کی لیکن یہاں لفظ جمع 'الرسل' استعمال ہوا ہے اس کی وجہ ہمارے نزدیک وہی ہے جس کا ذکر ہم سورۂ ہود کی آیت ۵۹ کے تحت کر آئے ہیں کہ تمام رسولوں کا پیغام چونکہ ایک ہی اور ان کے بھیجنے والا بھی ایک ہی ہے اس وجہ سے ایک کا انکار سب کا انکار ہے۔ اس طریقِ تعبیر سے مقصود اس جرم کی سنگینی کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو لوگ کسی رسول کی تکذیب کرتے ہیں وہ سوچ لیں کہ یہ بات کہاں سے کہاں تک پہنچتی ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں آگے والی سورہ میں بھی آئیں گی۔

'وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً'۔ یعنی ہم نے ان کے اس انجام کو بعد والوں کے لیے ایک درسِ عبرت بنا دیا کہ وہ اس سے سبق لیں کہ جو لوگ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں بالآخر ان کا حشر یہ ہوا کرتا ہے۔

'وَأَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا'۔ یعنی اس قسم کے ظالموں کی سزا اسی دنیا کے عذاب پر بس نہیں ہے بلکہ ان کے لیے آخرت میں بھی ہم نے نہایت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

وَعَادًا وَثَمُودَا وَأَصْحَابَ الرَّسِّ وَقُرُونًا بَيْنَ ذَٰلِكَ كَثِيرًا (۳۸)

یہاں فعل 'أَهْلَكْنَا' بر بنائے قرینہ حذف ہے۔

اصحاب الرس کون تھے؟

'اصحاب الرس' کی تحقیق میں مجھے افسوس ہے کہ اب تک کامیابی نہ ہوسکی۔ ابن جریرؒ نے متعدد نام ذکر کیے ہیں لیکن ان میں سے کسی پر ان کو خود بھی اطمینان نہیں ہے۔ انھوں نے بحث کے آخر میں یہ ظاہر بھی کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی کے متعلق بھی وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

صاحب کشاف نے دوسرے ناموں کے ساتھ قوم شعیبؑ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے بلکہ اسی کو مقدم رکھا ہے لیکن یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ سورۂ قٓ میں اصحاب الرس اور اصحاب الایکہ دونوں نام الگ الگ دو مستقل قوموں کے لیے آئے ہیں اور اصحاب الایکہ سے خود قرآن کی تصریح کے مطابق، جیسا کہ آگے والی سورہ میں وضاحت آئے گی، اصحاب مدین یعنی حضرت شعیبؑ کی قوم کے لوگ مراد ہیں۔ اگر اصحاب الرس سے قوم شعیب مراد ہوتی تو پھر اس کے ساتھ اصحاب الایکہ کے ذکر کا کیا محل تھا!

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ارض القرآن میں اس سے اسماعیلی قبائل کے بارہ سلسلوں میں سے قیدما کو مراد لیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اس کے حالات بالکل مجہول ہیں۔ حالات کے مجہول ہونے سے قطع نظر بنی اسماعیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی رسول کی بعثت ثابت نہیں ہے اور یہاں اصحاب الرس کا ذکر جس سیاق میں آیا ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ ان کی طرف رسول کی بعثت ہوئی اور انھوں نے عاد و ثمود کی طرح اس کی تکذیب کی۔

بہرحال ان کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عرب کی اقوام بائدہ میں سے کسی قوم کا حوالہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیجا لیکن اس نے اس رسول کی تکذیب کی اور سنت الٰہی کے مطابق مستحق عذاب ٹھہری۔ شعرائے جاہلیت میں زہیر نے وادی رس کا ذکر کیا ہے۔ ع

وھن و وادی الرس کالید للفم (اور وہ اور وادی رس اس طرح تھے جس طرح منہ کو ہاتھ)

تاریخ کی نارسائی

'وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا' (اور ان کے درمیان اور بھی کتنی قومیں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا) قرآن میں اس بات کا جگہ جگہ ذکر ہے کہ انبیاء و رسل صرف اتنے ہی نہیں ہیں جتنے قرآن میں بیان ہوئے ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ جو لوگ ہر چیز کو تاریخ کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ تاریخ کی نارسائی سے ناواقف ہیں۔ تاریخ کی رسائی بہت محدود ہے اور اس کا بیشتر حصہ رطب و یابس ہر قسم کے مواد پر مشتمل ہے۔ اس دنیا کے احوال سے سب سے زیادہ باخبر اس کا خالق ہی ہے اس وجہ سے اصلی اعتماد اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ہونا چاہیے نہ کہ تاریخ کی کتابوں پر۔ اگر قرآن نے کسی تاریخی واقعہ کا ذکر کیا ہے تو وہ ہمارے علم میں ایک بابرکت اضافہ ہے۔ اگر تاریخ سے بھی اس کی تائید ہو جائے تو فبہا، نہ ہو تو اس کو تاریخ کی نارسائی پر محمول کیجیے۔

وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ ۖ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا (۳۹)

'ضرب مثل' کا مفہوم

'ضربِ مثل' یہاں پوری وضاحت و تفصیل اور تذکیر و تنبیہ کے تمام لوازم کے ساتھ حقائق واضح کر دینے کے مفہوم میں ہے۔ جب کسی کو کوئی بات اچھی طرح ذہن نشین اور اس کے عواقب و نتائج سے پوری طرح آگاہ کر دینا ہو تو اس کے لیے حقائق کو مصوّر و ممثّل کر دینے والی تمثیلیں اور تاریخ کے احوال و واقعات سب سے زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔ حضرات انبیاء چونکہ لوگوں پر اللہ کی حجت تمام کرنے کے لیے آئے اس وجہ سے انھوں نے صرف اصول و ضوابط بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ تمثیلات اور تاریخ کے احوال و واقعات سے ان کو اچھی طرح مدلّل و مبرہن بھی کر دیا۔ چنانچہ آپ قرآن میں دیکھتے ہیں کہ ہر حقیقت امثال و واقعات سے اس طرح واضح کر دی جاتی ہے کہ ایک ہٹ دھرم کے سوا کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہی طریقہ تمام رسولوں نے اختیار فرمایا۔ اس کے بعد بھی جو لوگ نہیں سمجھے ظاہر ہے کہ وہ لوگ عقل و دل سے سمجھنے والے لوگ نہیں تھے بلکہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننے والے تھے۔ ایسوں کے بارے میں سنتِ الٰہی، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں، یہ ہے کہ وہ اس قہرِ الٰہی سے تباہ کر دیے جاتے ہیں جس کی وہ تکذیب کرتے اور جس کو آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ ہم نے ان تمام قوموں کو اچھی طرح سمجھا دیا لیکن جب انھوں نے سمجھنے سے انکار کر دیا تو بالآخر ان کو بالکل پامال بھی کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حشر تمھاری قوم کا بھی ہونا ہے اگر اس نے قرآن کی قدر نہ کی۔

وَلَقَدْ أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۚ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا (۴۰)

آنکھوں میں بصیرت آخرت کے تصور سے پیدا ہوتی ہے

یہ اشارہ قوم لوط کی بستی کی طرف ہے۔ 'أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ' سے مراد وہ عذاب ہے جو ان پر آیا۔ اس عذاب کی نوعیت ہم نے اس کتاب میں اس کے محل میں واضح کی ہے۔ اگر اس کی پوری تحقیق مطلوب ہو تو مجموعۂ تفاسیر فراہیؒ میں سورۂ ذاریات کی تفسیر پڑھیے۔

یہ قریش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ دوسری قوموں کے احوال و مقامات سے دور یا نابلد ہیں تو کیا اس قوم کے آثار سے بھی ناآشنا ہیں جو ہمارے نہایت ہولناک عذاب کا نشانہ بنی! اس بستی پر سے تو یہ آئے دن اپنے تجارتی سفروں میں گزرتے ہیں! کیا اس کے آثار بھی یہ نہیں دیکھتے رہے ہیں! دیکھتے تو رہے ہیں لیکن چونکہ یہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے اس وجہ سے سب کچھ دیکھنے کے باوجود اندھے بنے ہوئے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قریش کے تجارتی قافلے قومِ لوط کی بستیوں کے کھنڈروں پر سے برابر گزرتے تھے۔ اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

اس آیت میں یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آدمی کی آنکھوں کے اندر بصیرت آخرت کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو آدمی بظاہر ٹک ٹک دیکھتا تو ہے لیکن اسے نظر کچھ نہیں آتا۔

وَإِذَا رَأَوْكَ إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا ۖ أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ۝ إِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا أَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۚ وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا (۴۱-۴۲)

یعنی اللہ نے تو ان پر یہ فضل فرمایا کہ تمھارے اور قرآن کے ذریعہ سے ان پر دنیا اور آخرت کے حقائق واضح کیے لیکن ان کی محرومی اور بدبختی کا یہ حال ہے کہ جب بھی تمھیں دیکھتے ہیں تمھارا مذاق اڑاتے اور طنز و تحقیر کے انداز میں کہتے ہیں کہ اچھا یہی ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے! ان حضرت نے تو ہمیں ہمارے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم ان کی عبادت پر جمے نہ رہتے! فرمایا کہ آج تو ان کو اپنی حماقت پر جمے رہنے پر بڑا ناز ہے لیکن کل کو جب یہ اپنی اس جہالت کے نتیجہ میں عذاب سے دوچار ہوں گے تب انھیں اندازہ ہوگا کہ ہمارے پیغمبر نے ان کو گمراہ نہیں کرنا چاہا تھا بلکہ اس نے ان کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کی تھی جس کو اختیار نہ کر کے بالآخر وہ کہاں سے کہاں پہنچے! 'مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا' میں جس حقیقت کی طرف اشارہ ہے اس کی وضاحت ہم اوپر آیت ۳۴ کے تحت کر آئے ہیں کہ گمراہوں کو اپنی گمراہی کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس کا انجام سامنے نہ آئے۔ وہ اپنی خواہشوں کے غلام ہوتے ہیں اور وہ خواہشیں ان کو اس طرح اندھا بنا دیتی ہیں کہ کوئی تذکیر و تنبیہ بھی ان پر کارگر نہیں ہوتی۔

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ۝ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (۴۳-۴۴)

خواہشوں کے غلام چوپایوں سے بھی بدتر ہیں۔

'أَرَأَيْتَ' کے اسلوب خطاب پر اس کے محل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جن لوگوں نے اپنی عقل کو معطل کر کے اپنی باگ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے بھلا تم ان کی ہدایت و اصلاح کے ذمہ دار کس طرح بن سکتے ہو! انسان کے اندر رہنمائی کا چراغ عقل ہے نہ کہ نفس کی خواہشیں تو جو لوگ اس چراغ کو گل کر کے اپنی خواہشوں کے پرستار بن جائیں گے آخر ان کو رستہ دکھانا کس کے بس میں ہے! یہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ خواہشیں جتنی بھی ہیں وہ سب اندھی ہیں۔ وہ صرف اپنے مطالبے کو پورا کرنا چاہتی ہیں۔ ان کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ کیا حق ہے کیا باطل اور کیا خیر ہے کیا شر؟ تو جو شخص ان کا پیرو بن جاتا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ گویا وہی اس کی معبود ہیں، وہ اس طرح شیطان کے پھندے میں پھنس جاتا ہے کہ اس سے اس کے لیے چھوٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

'اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ' الآیۃ' یعنی تم (خطاب پیغمبرؐ سے ہے) اس طرح جو ان کی اصلاح کی فکر میں اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہو تو کیا یہ توقع رکھتے ہو کہ ان کے اندر سننے اور سمجھنے کی کچھ صلاحیت ابھی باقی ہے۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے تو یہ صحیح نہیں ہے یہ اپنی سننے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ضائع کر کے بالکل چوپایوں کے مانند بلکہ چوپایوں سے بھی بدتر بن چکے ہیں۔

یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ عقل و خرد کو معطل کر کے خواہشوں کی پرستش کرنے والوں کے لیے قرآن نے چوپایوں کی تعبیر جو اختیار فرمائی ہے یہ کوئی مبالغہ کا اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ بیان حقیقت ہے۔ چوپائے بہر حال اور بہر شکل اپنی اس جبلت پر قائم رہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کی پیروی میں سرمو اپنی جبلت سے انحراف نہیں اختیار کرتے۔ لیکن انسان جب اپنی خواہشوں کا غلام بن جاتا ہے تو وہ جبلت اور فطرت کے تمام حدود توڑ کر چوپایوں سے بھی بدتر بن جاتا ہے۔

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۵-۶۲

اوپر کے مجموعہ آیات میں آپ نے دیکھا کہ تاریخ کے شواہد کی روشنی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔ اب آگے کی آیات میں بعض آفاقی و کائناتی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن سے ان تمام باتوں کی تصدیق و تائید ہو رہی ہے جو آپؐ اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ ان نشانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین بھی فرمائی گئی ہے کہ تمھیں اپنے مفوضہ فریضہ کے ادا کرنے کے لیے جن دلائل و براہین سے مسلح ہونا چاہیے وہ گوناگوں اسلوبوں سے قرآن میں واضح کر دیے گئے ہیں تو تم اسی کتاب کے ذریعہ سے ان لوگوں پر اللہ کی حجت تمام کرنے کی کوشش کرو اور ان کے ان نت نئے مطالبات و اعتراضات کی کوئی پروا نہ کرو جو وہ تمھیں زچ کرنے یا محض اپنی ساکھ جمائے رکھنے کے لیے کر رہے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۵-۶۲ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ
جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا
یَّسِیْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا
وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ وَهُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ
یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْیِ ۦَ بِهٖ بَلْدَةً

مَيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿٤٩﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ
بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٥٠﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا
فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۖ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا
كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ
اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٥٣﴾ وَهُوَ الَّذِيْ
خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿٥٤﴾
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ الْكَافِرُ
عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿٥٥﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٥٦﴾ قُلْ
مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ
سَبِيْلًا ﴿٥٧﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۗ وَ
مع كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۛ﴿٥٨﴾ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۛ اَلرَّحْمٰنُ
فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿٥٩﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا
ع ٥/١٦ الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩﴿٦٠﴾ السجدة تَبٰرَكَ الَّذِيْ
جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾ وَهُوَ
الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ
اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾

ترجمۂ آیات ۴۵-۶۲
کیا تم نے اپنے رب کی اس قدرت کی طرف نگاہ نہیں کی کہ کس طرح وہ سایہ کو پھیلا دیتا

ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو اسی طرح ساکن چھوڑ دیتا! پھر ہم سورج کو اس پر ایک دلیلِ راہ بناتے ہیں پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ ۴۵-۴۶

اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے شب کو پردہ پوش اور نیند کو دافع کلفت بنایا اور دن کو وقت نشور بنایا۔ ۴۷

اور وہی ہے جو اپنے بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے اور ہم آسمان سے پاکیزہ پانی اتارتے ہیں کہ اس سے مردہ زمین کو از سرِ نو زندہ کر دیں اور اس کو پلائیں اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو۔ ۴۸-۴۹

اور ہم نے اس کو ان کے درمیان گوناگون اسلوبوں سے واضح کر دیا ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں لیکن اکثر لوگ ناشکری ہی پر اڑے ہوئے ہیں۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک نذیر بھیج دیتے تو تم ان ناشکروں کی بات کا دھیان نہ کرو اور اسی کے ذریعہ سے ان سے پورا پورا جہاد کرو۔ ۵۰-۵۲

اور وہی ہے جس نے ملایا دو دریاؤں کو۔ ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار اور دوسرے کا نہایت شور و تلخ اور ان کے درمیان اس نے ایک پردہ اور ایک مضبوط بند کھڑا کر دیا۔ ۵۳

اور وہی ہے جس نے انسانوں کو پانی سے پیدا کیا اور پھر ان کو نسبی اور سسرالی رشتوں سے جوڑا اور تیرا رب بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔ ۵۴

اور یہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو نہ انھیں کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں نہ کوئی نقصان اور یہ کافر اپنے رب کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ہم نے تو تم کو بس ایک خوشخبری دینے والا اور ایک آگاہ کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ تم کہہ دو کہ میں تم سے اس

کا کوئی صلہ نہیں مانگ رہا ہوں بس یہ ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب تک پہنچانے والی راہ اختیار کرے۔ اور اپنے زندہ خداوند پر، جو مرنے والا نہیں ہے، بھروسہ رکھو اور اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ رہنے کے لیے کافی ہے۔ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ ادوار میں، پھر وہ اپنے عرش پر متمکن ہوا۔ وہ رحمان ہے پس اس کی شان باخبر سے پوچھو! اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدائے رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں، رحمان کیا ہے! کیا ہم اس چیز کو سجدہ کریں جس کا حکم تم ہمیں دیتے ہو! اور یہ چیز ان کی نفرت کو اور بڑھاتی ہے۔ ۵۵-۶۰

بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک منوّر چاند بنایا اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو یکے بعد دیگرے آنے والا بنایا ان کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں یا شکرگزار بننا چاہیں۔ ۶۱-۶۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا (۴۵-۴۶)

رات اور دن کا تصرف خدا کے اختیار میں ہے

'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب یہاں فرداً فرداً ہر مخاطب سے ہے۔ اور 'ظِلّ' سے مراد یہاں شب کا سایہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ تمام دنیا پر پھیلا دیتا ہے اور اگر وہ اس کو مستقل طور پر مسلّط کر دے تو کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کو ہٹا سکے۔ یہ اسی کی شان اور قدرت ہے کہ وہ ہر روز اس سایہ کو پھیلاتا اور ہر روز اس کو سمیٹتا ہے۔ اس دنیا کے بقا کے لیے جس طرح اس کا پھیلایا جانا ضروری ہے اسی طرح اس کا سمیٹا جانا بھی ناگزیر ہے اور ان دونوں باتوں میں سے کسی پر بھی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سوا کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ وہی اپنے سورج کو ہر روز بھیجتا ہے جو اس تاریکی کے اندر دلیلِ راہ بنتا اور اس کو آہستہ آہستہ کافور کرتا ہے۔ یہی مضمون سورۂ قصص میں یوں بیان ہوا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (قصص ۷۱-۷۳)

ان سے کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ رات کو تمہارے اوپر قیامت تک کے لیے مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے روشنی کو لائے گا، کیا تم سنتے نہیں! ان سے پوچھو کہ بتاؤ، اگر اللہ تمہارے اوپر دن کو قیامت تک کے لیے مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے شب کو لائے گا جس میں تم سکون پا سکو! کیا تم دیکھتے نہیں! یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اسی کے شکر گزار بنو۔

'وَجَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا' جس طرح کسی چیز کی دلیل اس کو کھولتی اور واضح کرتی ہے اسی طرح سورج شب کی عالمگیر تاریکی کے اندر دلیلِ راہ بنتا، اس کو ہٹاتا اور کھولتا ہے۔ اگر وہ روشنی نہ دکھائے تو سب بھٹکتے ہی رہ جائیں، کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس گنبدِ بے در کے اندر سے نکلنے کی کوئی راہ بھی ہے یا نہیں!

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (۴۷)

رات اور دن کے فوائد و منافع

یہ اسی روز و شب کی نشانیوں کی طرف ایک دوسرے زاویہ سے توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے شب کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا، تم اس کی راحت بخش چادر اوڑھ کر آرام سے سو رہتے ہو اور تمہاری نیند کو تمہارے لیے دافع کلفت بنایا جو تمہیں از سرِ نو زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے تازہ دم اور چاق و چوبند بنا دیتی ہے پھر دن کو تمہارے لیے از سرِ نو اٹھنے کا وقت بنایا کہ تم خدا کے رزق و فضل کے طالب بنو اور یہ ہر صبح کو قیامت کے دن اٹھنے کی یاد دہانی بھی کرتا ہے کہ جس طرح تم شب میں سونے کے بعد صبح کو اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح موت کی نیند کے بعد صبحِ قیامت کو جاگ پڑو گے۔ لفظ 'نشور' یہاں نہایت خوبی کے ساتھ موت کے بعد کی زندگی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دیکھنے والی آنکھیں اور سوچنے والے دل و دماغ ہوں تو روزانہ رات اور دن کی آمد و شد اور ان کے فوائد و منافع میں خدا کی قدرت، رحمت، ربوبیت، حکمت، توحید اور قیامت کی اتنی نشانیاں موجود ہیں کہ قرآن کی ہر بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ کافی ہیں۔ لیکن یہ نشانیاں ان کے لیے نافع ہیں جن کے اندر سوچنے سمجھنے اور عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ جن کے اندر یہ ارادہ نہیں پایا جاتا وہ

ان تمام نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے نئی نشانیوں ہی کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ آگے یہ مضمون آیت ۴۶ میں بھی آ رہا ہے اور سورۂ نمل کی آیات ۸۶-۸۷ میں بھی آئے گا جس سے اس کے بعض دوسرے پہلو بھی روشنی میں آئیں گے۔

وَهُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۙ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا (۴۸-۴۹)

بارش کی نشانیوں کی طرف اشارہ

'رَحْمَتُهٗ' یہاں بارش کے مفہوم میں ہے اور یہ لفظ اس معنی میں جگہ جگہ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ رات اور دن کی آمد و شد کے اندر اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا مشاہدہ ہو رہا ہے ان کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ بارش کی رحمت کی طرف توجہ دلائی جو ہر چند روز تو نہیں آتی لیکن اس زمین کا ہر جاندار اس کا محتاج ہے اور جب آتی ہے تو ہمیں پروردگار کی ان تمام صفات اور نشانوں کا مشاہدہ کرا دیتی ہے جس پر قرآن کی دعوت کی بنیاد ہے۔

فرمایا کہ وہی خدا تمھارا رب ہے جو باران رحمت سے پہلے موسمی ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے جو مختلف اطراف سے بادلوں کو ہانک کر لاتی ہیں، پھر ان کو تہ بر تہ اکٹھا کرتی ہیں، پھر جہاں کے لیے رب کا حکم ہوتا ہے وہاں وہ بادل پاکیزہ اور پاکیزگی بخش پانی برسا دیتے ہیں جس سے مردہ زمین از سر نو حیات تازہ حاصل کر لیتی ہے اور خدا کی مخلوقات میں سے بے شمار چوپائے اور انسان اس سے سیراب ہوتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ غور کرو، کیا یہ دنیا جس کے ہر گوشے میں اتنی حکمتیں اور قدرتیں نمایاں ہیں بغیر کسی خالق کے وجود میں آ گئی ہے؟ یہ سب کچھ محض کسی اندھی بہری علت العلل کا کرشمہ ہے؟ آسمان سے لے کر زمین تک ابر، ہوا، بارش اور انسان و حیوانات کی ماحتاج میں یہ ربط آپ سے آپ پیدا ہو گیا ہے؟ کیا اضداد کی اس باہمی ہم آہنگی کے مشاہدہ کے بعد یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں؟ کیا رحمت و ربوبیت کا یہ اہتمام انسان پر رب رحمان و رحیم کی طرف سے کوئی ذمہ داری عاید نہیں کرتا؟ کیا ہر بارش کے بعد زمین کی از سر نو زندگی اس حقیقت کی یاد دہانی نہیں کر رہی ہے کہ جو حکیم و قدیر اپنی قدرت و حکمت کا یہ مشاہدہ برابر کرا رہا ہے اس کے لیے لوگوں کے مرنے اور مٹی میں مل جانے کے بعد ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے؟

انسانوں اور چوپایوں کے ساتھ 'كَثِیْرًا' کی صفت لانے سے مقصود یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں ایسی مخلوقات بھی ہیں جن کو اس نے پانی کا محتاج نہیں بنایا ہے لیکن بہت سی مخلوقات ایسی ہیں جو اپنی زندگی کے لیے پانی کی محتاج ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر چوپایوں اور انسانوں کا ذکر فرمایا جو نمایاں اور برتر ارضی مخلوقات میں سے ہیں۔ ان کے

ذکر کے ساتھ ان کے توابع اور دوسری مخلوقات آپ سے آپ ان کے تحت آ گئے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٥٠﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ (۵۰-۵۲)

آنحضرتؐ کی طرف ایک التفات

یہاں قرینہ دلیل ہے کہ ضمیر مفعول کا مرجع قرآن ہے جس کی تائید و تصویب ہی کے لیے اوپر کے دلائل بیان ہوئے ہیں۔ یہ نشانیوں کے ذکر کے بیچ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے کہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے ان کی وضاحت کے لیے ہم نے اس قرآن کو لوگوں کے درمیان گوناگوں اسلوبوں سے سنا دیا ہے لیکن ان کی اکثریت اس نعمت کی قدر کرنے کی بجائے ناشکری اور انکار ہی پر اڑی ہوئی ہے تو اب نہ قصور تمہاری سعی کا ہے اور نہ ہمارے اہتمام تذکیر و تعلیم کا بلکہ سارا قصور ان لوگوں کا اپنا ہے۔

قرآن کے دلائل کے گوناگوں پہلو

'تَصْرِيْف' کے مفہوم کی وضاحت دوسرے مقام میں ہو چکی ہے کہ قرآن نے ہر حقیقت کو اتنے گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دیا ہے کہ صرف ضدی اور ہٹ دھرم ہی ان کو جھٹلا سکتا ہے۔ 'بَيْنَهُمْ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ مخاطب قوم کے ہر طبقہ اور ہر گروہ پر حجت تمام کر دی گئی ہے۔ یہ نہیں ہوا ہے کہ تبلیغ و تعلیم کی یہ جد و جہد کسی خاص گروہ ہی کے اندر محدود رہی ہو۔

'وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا' یعنی اگر ہم دیکھتے کہ تمہارے اکیلے ہونے کے باعث دعوت و تبلیغ کے کام میں کوئی کسر رہی جا رہی ہے تو ہم ہر بستی میں ایک ایک منذر بھیج دیتے۔ ہمارے لیے یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن کمی تمہاری طرف سے نہیں ہے بلکہ ساری خرابی خود ان لوگوں کے اندر ہے جو اپنے کان بند اور اپنی عقلیں معطل کیے ہوئے ہیں۔

'فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا' - تو یہ لوگ نت نئے مطالبات تمہارے سامنے محض تمہیں زچ کرنے کے لیے جو پیش کر رہے ہیں ان کی کوئی پروا نہ کرو۔ بلکہ اسی قرآن کے ہتھیار سے اس جہاد میں برابر لگے رہو۔ 'جِهَادًا كَبِيْرًا' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر چند ہے تو یہ جہاد نہایت کٹھن، اگر ان لوگوں کی طلب کے مطابق کوئی عذاب ان پر بھیج دیا جائے تو چشم زدن میں سارے تصفیہ کا فیصلہ ہو سکتا ہے لیکن حکمتِ الٰہی یہی ہے کہ عذابِ الٰہی کے بجائے اس کتاب ہی کے ذریعہ سے تم ان کے ساتھ جہاد کرو تاکہ ان کے اوپر اچھی طرح اللہ کی حجت پوری ہو جائے اور جس کے اندر ادنیٰ رمق بھی حق کو قبول کرنے کی ہے وہ اگر چاہے تو حق کو قبول کرے اور کسی کے لیے بھی عنداللہ کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

'اطاعت' کا مفہوم

لفظ 'طَاعَة' یہاں کسی کی بات ماننے اور اس کا لحاظ کرنے کے مفہوم میں ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا

بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

کائنات کے اضداد کی باگ خدا کے ہاتھ میں ہے

'مرج' کے معنی چھوڑنے کے ہیں اور فرات کے معنی ہیں غایت درجہ شیریں و خوشگوار۔

'حِجْرًا مَّحْجُوْرًا' کی وضاحت آیت ۲۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں یہ مضبوط آڑ اور محکم اوٹ کے مفہوم میں ہے۔ 'حِجْرًا مَّحْجُوْرًا' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح 'ظِلًّا ظَلِیْلًا' وغیرہ ترکیبیں ہیں۔

انفسات کی آیات کے بعد یہ پھر آفاق کی نشانیوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کی ایک اور عظیم نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ وہی خدا ہے جو ایک طرف سے شیریں پانی کے دریا کو چھوڑتا ہے دوسری طرف سے کھاری پانی کے سمندر کو۔ دونوں کی موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ نہیں ہوتا کہ شیریں پانی کھاری بن جائے یا کھاری پانی شیریں بلکہ دونوں اپنے اپنے حدود کے اندر اپنی مزاجی خصوصیات باقی رکھتے ہیں۔ خدائے قدیر و حکیم ان کے درمیان ایک ایسی غیر مرئی دیوار کھڑی کر دیتا ہے جو نہ کسی کو نظر آتی ہے اور نہ دونوں کا باہمی ٹکراؤ اس کو توڑ ہی سکتا ہے۔ یہ اس بات کی صاف شہادت ہے کہ اس کائنات میں جتنے بھی اضداد ہیں سب ایک بالاتر حکیم و قدیر کے تصرف کے تحت ہیں۔ وہ جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جس جگہ چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ وہ خدا کے مقررہ حدود سے سرِمو تجاوز کر سکیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اضداد کے وجود سے مشرک قوموں کو سب سے زیادہ گمراہی پیش آئی ہے۔ انھوں نے اس کائنات کو اضداد کی ایک رزم گاہ سمجھ لیا اور ان میں سے ہر ضد کو دیوتا قرار دے کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ قرآن نے اس مغالطہ کو مختلف اسلوبوں سے رفع فرمایا ہے جن کی وضاحت ہم نے ان کے محل میں کی ہے۔ یہاں بھی اسی حقیقت کی طرف ایک نئے اسلوب سے توجہ دلائی ہے کہ اس کائنات میں جو اضداد ہیں وہ مطلق العنان نہیں ہیں بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ ان کی باگ ایک بالاتر قوت کے ہاتھ میں ہے۔ اسی چیز کی طرف سورۂ رحمان میں بھی اشارہ فرمایا ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ۝ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (۱۹: ۲۰)

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۚ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ﴿۵۴﴾

اضداد میں توافق کی ایک نفسی دلیل

'نَسَبًا وَّصِهْرًا' یعنی ذَا نَسَبٍ وَّصِهْرٍ۔ 'نسب' کا مفہوم تو واضح ہے۔ 'صِهْر' اس قرابت کو کہتے ہیں جو سسرالی رشتہ سے وجود میں آئے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے پانی سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا پھر ان دونوں کے اندر ایسے فطری داعیات ودیعت فرمائے کہ انسان ایک طرف نسبی تعلقات رکھنے والا بن سکے اور دوسری طرف سسرالی روابط کے ساتھ جڑ سکے اور اس طرح اس خاندان اور معاشرت و اجتماعیت کی تعمیر کرنے والا بنے جس کے لیے خالق حکیم و قدیر نے اس کو وجود بخشا ہے۔ 'وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا' یعنی یہ قدرت و اختیار صرف خدا ہی کو حاصل ہے

کہ وہ ایک ہی پانی سے اضداد کو وجود میں لاتے اور پھر ان اضداد کو اپنی قدرت و حکمت سے ایک سلک میں پرو دے۔ یہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ ایک ہی حکیم و تدبیر کا ارادہ اس پوری کائنات پر متصرف ہے۔ وہی اپنی قدرت سے ایک ہی مادہ سے اضداد کو وجود میں لاتا اور پھر اپنی بے نہایت حکمت سے ان اضداد کے اندر وابستگی و پیوستگی پیدا کرتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اوپر کی آیات میں آفاقی دلائل بیان ہوئے تھے اور یہ دلیل انفسی دلائل میں سے ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۭ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰي رَبِّهٖ ظَهِيْرًا (۵۵)

شیطان سے دوستی اور خدا سے پیکار

آفاق و انفس کے دلائل و شواہد تو اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ کائنات کا خالق و مالک اللہ وحدہٗ لاشریک ہے جو پوری قدرت و حکمت کے ساتھ اس کے نظام کو چلا رہا ہے لیکن یہ احمق لوگ ایسی چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں جو نہ انھیں کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں، نہ کوئی نقصان۔

'وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰي رَبِّهٖ ظَهِيْرًا'۔ 'کَافِرٌ' یہاں اسم جنس کے مفہوم میں ہے اور اس سے مراد وہ مشرکین ہی ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے اس لیے کہ شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے کفر ہی ہے۔ 'ظہیر' کے معنی مددگار کے ہیں اور جب اس کے ساتھ 'علٰی' آئے تو اس کے اندر حریف و مد مقابل کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل حقیقت تو وہ ہے جو بیان ہوئی لیکن یہ کافر اپنے رب حقیقی کے مقابل میں شیطان کے مددگار اور اپنے پروردگار کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور خدائے واحد کی بندگی کی اس دعوت کی اپنی پوری قوت سے مخالفت کر رہے ہیں جو خدا کا رسول ان کو دے رہا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (۵۶)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھاری ذمہ داری صرف انذار و تبشیر ہے۔ تم اپنی دعوت ان لوگوں کو پہنچا دو اور اس کی تکذیب کے نتائج سے اچھی طرح آگاہ کر دو۔ اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا ان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اس کی بابت تم سے کوئی پرسش نہیں ہونی ہے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۵۷)

یعنی ان کو صاف صاف سنا دو کہ میں اس دعوت کا کوئی صلہ تو تم سے مانگ نہیں رہا تھا کہ تمھارے رد و قبول کا مجھ پر کوئی اثر پڑے۔ میں نے تمھارے رب کا پیغام تمھیں پہنچایا ہے اور مدعا صرف یہ ہے کہ جو اپنے رب کی راہ اختیار کرنا چاہے وہ اس کو اختیار کرے۔ اگر اس کو اختیار کرو گے تو اس کا نفع تمہی کو ہوگا، اگر نہ اختیار کرو گے تو اس کا خمیازہ تمہی بھگتو گے۔ اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہی مضمون سورۂ سبا میں یوں بیان ہوا ہے: قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ (۴۷)

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۚ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا (۵۸)

یعنی اپنے خدائے حی لایموت پر بھروسہ رکھو۔ وہ زندہ خدا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس پر بھروسہ کرنے والے کبھی محروم و نامراد نہیں ہوتے۔ اس میں ایک لطیف تعریض مشرکین کے ان مردہ خداؤں پر ہے جن کی نسبت فرمایا ہے کہ نہ وہ کوئی نفع پہنچا سکتے نہ نقصان۔

'وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ' یہ حصول صبر و توکل کا وسیلہ ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و توکل کی تلقین فرمائی گئی ہے وہاں زیادہ سے زیادہ خدا کی تسبیح و تحمید میں مشغول رہنے اور اہتمامِ نماز کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس پر اس کے محل میں ہم وضاحت کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا۔ یعنی اپنے ان مخالفین کا معاملہ اپنے رب کے حوالہ کرو۔ وہ ان کے تمام جرائم سے پوری طرح باخبر ہے اور جب باخبر ہے تو ان کے ساتھ وہی کرے گا جس کے یہ سزاوار ہیں۔

الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا (۵۹)

چند صفاتِ الٰہی کی طرف اشارہ

یہ اسی خدائے حی لایموت کی مزید صفات بیان ہوئیں کہ اسی نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ چھ دنوں سے مراد، جیسا کہ اعراف ۵۴ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں، خدائی ایام ہیں جن کے طول و عرض کو وہی جانتا ہے۔ ہم ان کو اپنی زبان میں چھ ادوار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کائنات کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر نہیں آگئی ہے بلکہ اس کے خالق نے اس کو نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہے۔

'ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ' یعنی اس اہتمام سے اس کائنات کو پیدا کر کے اس کا خالق کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے جیسا کہ احمقوں نے گمان کیا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ ایک کارِ عبث ہوتا اور ایک مدبر و حکیم کی شان کے یہ بات بالکل خلاف ہے کہ وہ کارِ عبث کرے۔ بلکہ وہ بالفعل اپنی اس کائنات کے عرشِ حکومت پر متمکن ہے اور اس کے سارے انتظام کی نگرانی فرما رہا ہے۔ اس میں جو ارتقا ہوا ہے وہ خود بخود نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے خالق کی تدبیر و حکمت سے ہوا ہے اور اس کے نظم و نسق میں اس کے سوا کسی کو بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا۔ 'اَلرَّحْمٰنُ' خبر ہے، اس کا مبتدا محذوف ہے۔ یعنی جس نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے وہ رحمان ہے۔ مخاطب کی پوری توجہ خبر پر مرکوز کرنے کے لیے مبتدا کو حذف کر دیا۔ یہاں صفتِ رحمان کی تذکیر سے مقصود خاص طور پر اس کائنات کے باغایت و با مقصد ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا خالق رحمان ہے اور اپنی اس رحمت ہی کے لیے اس نے اس کو

پیدا کیا ہے۔ اس کی اس صفت کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اس کی یہ رحمت اس کے کامل عدل کے ساتھ ظہور میں آئے۔ اس مضمون کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

خدا اپنی صفات کو خود ہی جانتا ہے

'فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا' میں خطاب عام مخاطبوں سے ہے جن سے اوپر سے بحث چلی آ رہی ہے اور ضمیر مجرور کا تعلق 'خبیر' سے ہے۔ 'سوال' کے ساتھ 'ب' کا صلہ اسی صورت میں آتا ہے جب یہ لفظ استہزا، کے مفہوم پر متضمن ہو۔ یہاں اس کا محل نہیں ہے۔ 'خبیر' سے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات والاصفات کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور اس کی تنکیر اظہار تفخیم کے لیے ہے۔ فرمایا کہ خدا نے اپنی جو صفتیں بیان فرمائی ہیں اس کی حقیقی صفتیں وہ ہیں نہ کہ وہ جو تم نے اپنے جی سے گھڑ کر اس کی طرف منسوب کر رکھی ہیں۔ اگر اس کی صفتیں معلوم کرنی ہیں تو اٹکل کے تیر تکّے نہ چلاؤ بلکہ اسی خبیر سے معلوم کرو جو اپنی صفات سے سب سے زیادہ واقف خود ہے۔ بالکل اسی اسلوب میں سورۂ فاطر میں ارشاد فرمایا ہے: وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ (۱۴) (اور قیامت کے دن تمھارے شرکا، تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے اور ایک باخبر سے بڑھ کر تمھیں کوئی دوسرا خبر نہیں دے سکتا) ظاہر ہے کہ یہاں 'خبیر' سے مراد اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اپنی کتاب اور اپنے رسول کے واسطہ سے لوگوں کو اصل حقائق سے آگاہ فرما رہا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا (۶۰)

اسم رحمان پر قریش کا اعتراض اور اس کا جواب

یعنی اس کائنات کے خالق کی سب سے بڑی صفت تو رحمان ہے لیکن ان نادانوں کا حال یہ ہے کہ جب ان کو خدائے رحمان کو سجدہ اور اس کی عبادت کی دعوت دی جاتی ہے تو بڑی رعونت کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ یہ رحمان کیا چیز ہے؟ کیا ہم ہر اس چیز کو سجدہ کریں جس کا تم ہمیں حکم دیتے ہو؟ 'وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا' یعنی بجائے اس کے کہ مطلوبِ حقیقی کی طرف رہنمائی سے وہ خوش ہوں اور صدقِ دل سے اس کی قدر کریں، یہ چیز ان کی نفرت اور بیزاری کو بڑھاتی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ کے تحت ہم تفصیل کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ اہل عرب اگرچہ خدا کے لیے اسم رحمان سے ناواقف نہیں تھے، ان کے لٹریچر میں اللہ اور رحمان دونوں نام ملتے ہیں لیکن اسم رحمان زیادہ معروف اہل کتاب کے ہاں تھا، مشرکین عرب زیادہ تر اسم اللہ ہی بولتے تھے۔ قریش کے لیڈروں نے اس چیز کو بھی قرآن کے خلاف اپنی قوم کو بھڑکانے کا ایک بہانہ بنا لیا۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ انھوں نے قرآن کے خلاف یہ بدگمانی پیدا کرنے کی بھی کوشش کی تھی کہ اس کی تصنیف میں بعض علماء اہل کتاب بھی شریک سازش ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ لفظ رحمان پیش کرتے کہ دیکھو اس کتاب میں لفظ 'رحمان' بار بار آتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ اہل کتاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پردے میں ہمارے

اوپر اپنے دینی تصورات کو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ بدگمانی کی فضا میں اس طرح کے اُشغلے عوام کو بھڑکانے کے لیے بڑے کارگر ہوتے ہیں۔ اس سے قومی اور مذہبی دونوں ہی قسم کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا ہے چنانچہ بہت سے جاہلوں کے اندر اسمِ رحمان کے خلاف ایک شدید قسم کی عصبیت و نفرت پیدا ہو گئی۔ قرآن نے ان کی اس حماقت پر سورۂ بنی اسرائیل میں بھی توجہ دلائی ہے اور یہاں بھی کہ یہ نام تمھارے لیے بے شمار برکتوں اور رحمتوں کا خزانہ ہے۔ دوسروں کی ضد میں اپنے کو اس بابرکت نام کی برکتوں سے کیوں محروم کرتے ہو!

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ○ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (۶۱-۶۲)

اصل ضرورت نشانیوں کی نہیں بلکہ نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے ارادہ کی ہے

اوپر کی آیاتِ التفات کے بعد یہ آخر میں پھر آیاتِ آفاق کی طرف توجہ دلائی کہ جہاں تک نشانیوں کا تعلق ہے ان کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت کسی نئی نشانی کی نہیں بلکہ نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے جذبے اور ارادے کی ہے۔ جن کے اندر یہ جذبہ اور ارادہ نہیں پایا جاتا وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔

لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔ 'تَذَكُّر' عقل کا فعل ہے اور 'شکر' دل کا۔ اللہ تعالیٰ نے عقل اور دل کو بیدار کرنے والی نشانیوں سے اس کائنات کے چپّہ چپّہ کو معمور کر رکھا ہے لیکن ان سے صحیح فائدہ اٹھانا انسان کے اپنے ارادے پر منحصر ہے اور اس ارادے کے امتحان ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اسی پر اس کے تمام شرف کا انحصار ہے۔ اس معاملہ میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔

بروج سے مراد

جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا۔ 'بروج' کی وضاحت سورۂ حجر کی آیت ۱۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے وہ قلعے اور دیدبان مراد ہیں جو اس نظامِ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے اس لیے بنائے ہیں کہ شیاطینِ جن و انس ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ ان قلعوں اور دیدبانوں میں اللہ کے کرّوبیوں کا پہرہ رہتا ہے جو استراقِ سمع کرنے والے شیاطین کی نگرانی کرتے ہیں۔ یہ انتظام اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرمایا ہے کہ ملاءِ اعلیٰ کے حدود میں اس کے مقرب فرشتوں کے سوا کسی اور کی رسائی نہ ہو سکے۔ صرف وہی ان حدود میں داخل ہوتے ہیں اور وہی اس کی وحی اور اس کی اتارکی ہوئی غیب کی خبریں اس کے نبیوں اور رسولوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس واسطہ کے سوا غیب کی باتیں معلوم کرنے کا کوئی اور واسطہ نہیں ہے اس وجہ سے غیب دانی کے دوسرے مدعی خواہ وہ کاہن و منجم ہوں یا کوئی اور، سب جھوٹے ہیں ــــ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس انتظام کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے 'تبارک' کی اسی تمہید کے ضمن میں کیا ہے جس سے سورہ کا آغاز فرمایا ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یکسر خیر و برکت

ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ وحی کے چشمۂ صافی کو ہر قسم کی شیطانی دراندازیوں سے بالکل محفوظ رکھے اس لیے کہ روح اور دل کی زندگی اور دنیا و آخرت کی تمام صلاح و فلاح کا انحصار اسی پر ہے۔ یہاں ان اشارات پر اکتفا فرمائیے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ان شاء اللہ آخری گروپ کی سورتوں میں آئے گی۔

'خِلْفَةً' کا مفہوم وہی ہے جو قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں 'اختلاف اللیل والنہار' کے الفاظ سے تعبیر ہوا ہے یعنی رات اور دن کی ایک دوسرے کے پیچھے گردش۔ یہ گردش جن حقائق کی یاد دہانی کرتی ہے ان کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۳-۷۷

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کے اوصاف گنائے ہیں جن کی عقل و دل کی صلاحیتیں زندہ ہیں اور وہ اس کی نشانیوں اور اس کی نازل کی ہوئی کتاب سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ تصویر ان لوگوں کی ہے جو آگے بڑھ کر قرآن پر ایمان لانے والے بنے اور اسی تصویر سے ان لوگوں کا ظاہر و باطن بھی بالکل بے نقاب ہو گیا ہے جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۳-۷۷

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ
قِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ
اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾
وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ
قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ
ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ
فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ

يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ وَ
مَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَ
الَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَ
الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ
وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰۗىِٕكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا
صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ
مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاۗؤُكُمْ ۚ فَقَدْ
كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع

ترجمۂ آیات ۶۳-۷۷

اور خدائے رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور جو راتیں اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں گزارتے ہیں اور جو دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ بے شک اس کا عذاب بالکل چمٹ جانے والی چیز ہے۔ بے شک وہ نہایت ہی برا مستقر اور نہایت ہی برا مقام ہے۔ ۶۳-۶۶

اور جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے اور نہ تنگی اور اس کے درمیان کی معتدل راہ اختیار کرتے ہیں۔ ۶۷

اور جو نہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتے اور نہ اس جان کو جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا بغیر کسی حق کے قتل کرتے اور نہ بدکاری کرتے اور جو کوئی ان باتوں کا مرتکب

ہوگا وہ اپنے گناہوں کے انجام سے دوچار ہوگا۔ قیامت کے دن اس کے عذاب میں درجہ بدرجہ اضافہ کیا جائے گا اور وہ اس میں خوار ہو کر ہمیشہ رہے گا۔ مگر وہ جو توبہ کر لیں گے، ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے تو اللہ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور عمل صالح اختیار کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی طرف لوٹتا ہے۔ ۶۸-۷۱

اور جو کسی باطل میں شریک نہیں ہوتے اور اگر کسی بے ہودہ چیز پر سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے یاددہانی کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔ اور جو دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی جانب سے آنکھوں کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا سربراہ بنا۔ ۷۲-۷۴

یہ لوگ ہیں کہ ان کو ان کی ثابت قدمی کے صلے میں بالاخانے ملیں گے اور ان میں ان کا خیر مقدم تحیت و سلام کے ساتھ ہوگا۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ خوب ہوگا وہ مستقر اور مقام۔ ۷۵-۷۶

کہہ دو کہ میرے رب کو تمہاری کیا پروا ہے اگر تمہیں دعوت دینا مدِنظر نہ ہوتا! سو تم نے اس کی تکذیب کر دی تو وہ چیز عنقریب لازم ہو کر رہے گی۔ ۷۷

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۶۳)

'هَوْنٌ' اور 'سَلٰمٌ' کا مفہوم

'هَوْنٌ' کے معنی خاکساری اور فروتنی کے ہیں اور 'سَلٰمٌ' جس طرح خیر مقدم کے مواقع کے لیے ہے اسی طرح ان مواقع کے لیے بھی ہے جب کسی سے خوبصورتی اور شائستگی کے ساتھ علیحدہ ہونا اور اس سے پیچھا چھڑانا مقصود ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر سے علیحدہ ہوتے وقت جو سلام کیا وہ اسی طرح کا سلام تھا۔

عباد الشیطان کے بعد عباد الرحمٰن کا بیان

اوپر کی آیات میں ان متمردین کا ذکر گزر چکا ہے جو کبر و غرور کے نشہ میں نہ کسی بات کو سننے کے لیے تیار تھے نہ سمجھنے کے لیے، یہاں تک کہ ان کے لیے خدا کا محبوب نام 'رحمان' بھی ایک چڑ بن کر رہ گیا تھا، وہ اس کے سننے کے بھی روادار نہ تھے۔ اب ان کے مقابل میں یہ 'عباد الرحمان' کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں جس سے مقصود ایک طرف تو متمردین قریش کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دینا ہے جو ان کے آگے انسانیت کے اصلی حسن و جمال کو بے نقاب کر دے تاکہ اس طرح ان پر بھی ان کے ظاہری و باطنی عیوب اچھی طرح واضح ہو جائیں اور مسلمانوں پر بھی نہایت عمدہ پیرائے میں واضح ہو جائے کہ خدائے رحمان کے بندوں کو اس دنیا میں کیا روش اختیار کرنی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر و باطن کو کن محاسن سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔

استکبار شیطان کی سنت ہے

یہاں موقع کلام کے تقاضے سے سب سے پہلے جس صفت کا حوالہ دیا ہے وہ فروتنی و خاکساری ہے۔ فرمایا کہ ہمارے یہ بندے زمین میں اکڑتے اور اتراتے نہیں بلکہ نہایت تواضع کے ساتھ چلتے ہیں۔ یہ چلنے میں خاکساری ان کے باطن کے ایک عکس کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہے۔ اصل مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کے دلوں پر خدا کی عظمت و کبریائی کی ایسی ہیبت طاری رہتی ہے کہ یہ چیز ان کے ہر اس قدم سے نمایاں ہوتی ہے جو وہ زمین پر رکھتے ہیں۔ انسان کے اندر استکبار ہو تو یوں تو وہ اس کی ہر حرکت سے نمایاں ہوتا ہے لیکن اس کی چال خاص طور پر اس کا مظہر ہوتی ہے اس وجہ سے یہاں خاص طور پر اس کا حوالہ دیا۔ مقصود در اصل، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی ہے کہ ان کے دل استکبار سے پاک ہیں۔ استکبار کی حقیقت حق کے آگے اکڑنا ہے۔ اگر ایک شخص ہر حق کے آگے، خواہ وہ بڑا ہو چھوٹا، سر تسلیم خم کر دے تو وہ عباد الرحمٰن میں شامل ہے اگرچہ وہ حق کی حمیت و حمایت میں سینہ تان کر اور سر اونچا کر کے چلے اور اگر وہ حق کے آگے سرکشی کرے تو وہ اولیائے شیطان میں سے ہے اگرچہ وہ اپنی چال میں مصنوعی طور پر کتنی ہی مسکینی پیدا کر لے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ استکبار ابلیس کی سنت ہے اور یہ وہ لس کی گانٹھ ہے جس کے ہوتے آدمی کے اندر کسی نیکی کا نشو و نما پانا ناممکن ہے۔

بدتمیزوں سے الجھنا عباد الرحمٰن کی شان کے خلاف ہے

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا۔ 'مُخَاطَبَة' یہاں اُلجھنے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی جب اس طرح کے اُجڈ اور بدتمیز لوگ، جن کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر پھبتیاں اوپر مذکور ہوئی ہیں، ان سے الجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کو اپنے تمسخر و استہزا کا ہدف بناتے ہیں تو وہ سنتِ ابراہیمی پر عمل کرتے ہیں، ان سے الجھنے کے بجائے ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ 'سلام'، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، کسی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا ایک شائستہ اور بابرکت طریقہ ہے۔ اس طرح اگر کسی سے علیحدگی اختیار کی جائے تو توقع ہے کہ اس کے اندر خیر کی کوئی رمق ہو گی تو وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کرے گا اور الجھنے الجھانے کے بجائے بات سننے اور سمجھنے کی طرف مائل ہو گا اور اگر کسی کے

اندر خیر کی کوئی رمق ہی نہیں ہے اور وہ بحض مجادلہ و مناظرہ کے درپے ہے تو ایسے شخص کو منہ لگانا عباد الرحمٰن کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ مضمون سورۂ قصص کی آیت ۵۵ میں وضاحت سے آئے گا۔

وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ہ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۖ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۶۴-۶۶)

عباد الرحمٰن کی خلوت کی زندگی

اوپر کی آیت میں ان کی جلوت کی زندگی کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس آیت میں ان کی خلوت کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فرمایا کہ وہ اپنی راتیں اپنے رب کے آگے سجود و قیام میں گزارتے ہیں۔ سُجَّدًا وَّقِیَامًا کے اسلوبِ بیان سے جو شوق و اضطراب نمایاں ہو رہا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے صرف فرض نمازیں مراد نہیں ہیں بلکہ یہ تہجد کے سجود و قیام کی شب بیداریوں اور بے قراریوں کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی راتیں نہ عیش کدوں میں گزارتے اور نہ نرم و گرم بستروں میں، دنیا و عاقبت سے بے فکر ہو کر سوتے بلکہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر عذابِ جہنم سے بچائے جانے کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔

اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا۔ غرام، لازم ہو جانے والی اور چمٹ جانے والی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ ٹکڑا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اس اندیشے کی تائید و تصدیق کے طور پر ہے جس کے باعث وہ اپنی راتیں اس بے چینی و بے قراری میں گزارتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس طرح عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں تو یہ بالکل صحیح اور نہایت عاقبت اندیشانہ کام کر رہے ہیں اس لیے کہ عذابِ جہنم ایک ایسی چمٹ جانے والی چیز ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہوگا۔ اس سے بچنے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے اسی زندگی میں کیا جا سکتا ہے اور صرف خدا ہی کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔ 'مُسْتَقَرّ' اور 'مُقام' یوں تو ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن جب یہ دونوں ایک ساتھ استعمال ہوں تو ان کے درمیان کچھ فرق ہو جاتا ہے۔ میں ان کے مواقعِ استعمال پر غور کرنے سے جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ 'مُسْتَقَرّ' میں مستقل قیام گاہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور 'مُقام' عارضی جائے قیام کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہنم ایک ایسی ہولناک جگہ ہے کہ مستقل مستقر کی حیثیت سے تو درکنار ایک عارضی منزل کی حیثیت سے بھی وہ گوارا کیے جانے کے قابل نہیں ہے حالانکہ کوئی بری سے بری جگہ بھی ایسی ہو سکتی ہے کہ کسی پہلو سے وہ وقتی طور پر گوارا کی جا سکے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (۶۷)

انفاق کے لیے اہتمام

یہ ان کے اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو ان کے اندر انفاق فی سبیل اللہ کے لیے پایا جاتا ہے۔ فرمایا کہ جب وہ اپنی ضروریات پر خرچ کرتے ہیں تو اس میں احتیاط و کفایت شعاری ملحوظ رکھتے ہیں۔ نہ وہ اس میں اسراف کو راہ دیتے ہیں نہ بخالت کو۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے مال میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں۔ اس وجہ سے وہ اپنی ضروریات کو ان کے حدود سے متجاوز نہیں ہونے دیتے تاکہ دوسروں کے حقوق ادا کر سکیں۔

اگرچہ متوسط درجہ کی زندگی کے لیے کوئی ایک معین معیار مقرر کرنا مشکل ہے۔ اس میں حالات کے تغیر کے اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے لیکن یہ فرق اتنا باریک نہیں ہے کہ ایک عام آدمی اس کو معلوم نہ کر سکے۔ اپنی قوم اور اپنے معاشرے کے معیار کو سامنے رکھ کر ہر صاحب مال اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا کیا معیار رکھے کہ اپنے دوسرے غریب بھائیوں اور اپنے دین کی بھی خدمت کر سکے۔ اس معاملہ میں سلف صالحین نے ہمارے لیے جو نمونہ چھوڑا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو الاؤنس دینے کے بجائے آدمی کا غالب رجحان دوسرے پہلو کی طرف رہنا چاہیے یعنی وہ اپنا معیار زندگی اونچا کرنے کے خبط میں مبتلا ہونے کے بجائے زیادہ سے زیادہ انفاق فی سبیل اللہ کرے۔ اس راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا بھی اسراف نہیں ہے۔ رہے وہ لوگ جو معیار زندگی اونچا کرنے کی تونس میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو وہ شیطان کے بھائی بن جاتے ہیں اور ان کو کبھی خدا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ جس معاشرے میں یہ بیماری عام ہو جاتی ہے بالآخر اس پر اشتراکیت کا عذاب مسلط ہو کر رہتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا (۶۸)

'اَثَام' کے معنی جوہری نے نتیجۂ گناہ کے لیے ہیں۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جس طرح کوئی فعل یا اسم لاتے ہیں اور مقصود اس سے اس کا ثمرہ و نتیجہ ہوتا ہے۔ 'فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا' میں بھی یہی اسلوب ملحوظ ہے۔ فرمایا کہ نہ وہ اپنے رب کا کسی کو شریک ٹھہراتے اور نہ کسی جان کو ناحق قتل کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے۔ 'النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ' میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جان کو محترم ٹھہرایا ہے اور اس پر تعدی حرام ہے الا آنکہ وہ کسی ایسے جرم کا ارتکاب کرے جس کے نتیجہ میں وہ قانون الٰہی کی اس حفاظت سے محروم ہو جائے۔ یہ تینوں جرائم — شرک، قتل اور زنا — حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلہ کے سب سے بڑے جرائم میں سے ہیں۔ اس بات پر تمام آسمانی مذاہب کا اتفاق ہے۔ فرمایا کہ خدائے رحمان کے بندے ان جرائم کے پاس نہیں پھٹکتے۔ جو لوگ ان کے مرتکب ہو رہے ہیں یاد رکھیں کہ وہ ان کے انجام سے لازماً دوچار ہوں گے۔

جرائم سے اجتناب

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا (۶۹)

'مُضَاعَفَة' کے معنی کسی شے پر اضافہ کرنے کے ہیں۔ عام اس سے کہ یہ اضافہ دوگنا ہو یا اس سے زیادہ۔ اور استعمالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر تدریجی اضافہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے جس طرح 'لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً' میں ہے۔

یہ اسی نتیجۂ جرائم کا بیان ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا۔ فرمایا کہ جو لوگ ان جرائم میں سے کسی جرم کے مرتکب ہوں گے وہ قیامت میں ان کی سزا اس طرح بھگتیں گے کہ بالتدریج ان کی سزا میں اضافہ

ہی ہوتا جائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کچھ سزا بھگت کر وہ چھوٹ جائیں یا آہستہ آہستہ ان کی سزا میں کچھ تخفیف ہو جائے بلکہ وہ نہایت ذلت کی حالت میں اس عذاب میں ہمیشہ مبتلا رہیں گے۔ عذاب پر ذلت کے اضافہ نے اس کی سنگینی دو چند کر دی ہے۔ عذاب ایسا بھی ہو سکتا ہے جو عذاب تو ہو لیکن اس میں ذلت نہ ہو لیکن اس عذاب میں ذلت کی مار بھی ہوگی۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ باتیں قریش کے متکبرین کو سنائی جا رہی ہیں اور استکبار کی اصل سزا دائمی ذلت ہی ہے۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا (۷۰-۷۱)

توبہ کے اثرات — فرمایا کہ اس نتائج اعمال کے عذاب سے صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو توبہ و اصلاح کر کے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کر لیں گے۔ توبہ کے شرائط و آداب پر ہم نساء ۱۷-۱۸ کے تحت مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ 'یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ' کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ توبہ کر کے ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں ان کی نیکیاں ان کے اعمال نامے کے پچھلے گناہوں کو محو کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی جگہ پر ان کی نیکیوں کو رکھ دیتا ہے جو ان کے گناہوں کو ڈھانک لیتی ہیں۔

توبہ کرنے والوں کے لیے عظیم بشارت — وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا۔ یہ ٹکڑا بالکل وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا کے مقابل میں ہے اور اس میں توبہ کرنے والوں کے لیے عظیم بشارت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے گناہوں کے ساتھ ہی مریں گے وہ تو بہر حال اپنے گناہوں سے دوچار ہوں گے لیکن جو توبہ کر لیں گے وہ نہایت سرخروئی کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوٹیں گے۔ 'مَتَابًا' کی تاکید تفخیم شان کے لیے ہے یعنی یہ لوٹنا نہایت عزت و شان کا ہوگا۔ سیدنا مسیحؑ نے کھوئی ہوئی بھیڑ والی تمثیل میں نہایت بلاغت سے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے توبہ کرنے والے بندے کی توبہ سے کس قدر خوش ہوتا ہے اور اس کو اپنے کس درجے کے فضل و کرم سے نوازتا ہے۔ وہی بات اس آیت سے واضح ہو رہی ہے۔

اس میں توبہ کے لیے حوصلہ افزائی کا یہ پہلو بھی ہے کہ بسا اوقات آدمی گناہ کی زندگی چھوڑنے سے اس وجہ سے گھبراتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے یہ زندگی چھوڑ دی تو اسے اپنے لیے ایک نیا ماحول تلاش کرنا پڑے گا جو ایک نہایت مشکل کام ہے۔ یہ آیت ایسے لوگوں کو تسلی دیتی ہے کہ جو لوگ برائی اور برے ماحول کو چھوڑتے ہیں ان کو اللہ کی معیت اور سرپرستی حاصل ہوتی ہے اور جن کو یہ چیز حاصل ہو وہ ہر چیز سے مستغنی ہیں۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۷۲)

لغویات سے احتراز — 'زُوْر' کذب و باطل کو کہتے ہیں اور 'لَغْو' سے مراد وہ باتیں اور کام ہیں جو ثقہ و سنجیدہ لوگوں کے شایانِ شان نہ ہوں۔ فرمایا کہ ہمارے یہ بندے کسی باطل کام میں شریک نہیں ہوتے اور اگر کسی لغو چیز

کے پاس سے گزرنا ہی پڑ جائے تو نہایت وقار و شرافت سے وہاں سے گزر جاتے ہیں جس طرح ایک گندی جگہ سے ایک صفائی پسند آدمی گزر جاتا ہے۔ سورۂ قصص آیت ۵۵ میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے۔ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ز سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ز لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (اور جب وہ لغو باتیں سنتے ہیں تو ان سے اعراض کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے ساتھ تمھارے اعمال، ہمارا سلام لو، ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے)

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۷۳)

قرآن کے مخالفین پر تعریض

اس آیت میں اللہ کے ان بندوں کی تعریف بھی ہے اور ساتھ ہی اس میں قرآن کے ان اندھے بہرے مخالفین پر تعریض بھی جو قرآن کو محض اعتراض و نکتہ چینی کے لیے سنتے تھے۔ فرمایا کہ ہمارے ان بندوں کو قرآن کے ذریعہ سے جب تعلیم و تذکیر کی جاتی ہے تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کی مخالفت کے لیے اس پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے۔ یہ مضمون سورۂ جن آیت ۱۹ اور معارج آیات ۳۶-۳۷ میں تفصیل سے آئے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۷۴)

اہل و عیال کی عاقبت کی فکر

یہ لوگ اپنی عاقبت کی فکر کے ساتھ اپنے اہل و عیال اور اپنی آل و اولاد کی عاقبت کی بھی برابر فکر رکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ، ہر شخص اپنے اہل و عیال کا چرواہا بنایا گیا ہے اور قیامت کے روز ہر شخص سے اس کے گلہ کے خیر و شر سے متعلق پرسش ہونی ہے۔ اس ذمہ داری کا کما حقہٗ احساس رکھنے کی وجہ سے وہ اپنے اہل و عیال کے اندر ان لاابالی لوگوں کی طرح زندگی نہیں گزارتے جن کو صرف اپنے عیش دنیا کی فکر ہوتی ہے، اس امر سے انھیں کوئی بحث نہیں ہوتی کہ ان کے اہل و عیال نیکی کی راہ پر چل رہے ہیں یا بدی کی۔ ان لوگوں کے لاابالی پن کا ذکر سورۂ قیامہ اور سورۂ مطففین میں آئے گا۔ اللہ کے بندوں کا حال اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان کو دنیا سے زیادہ اپنے متعلقین کی آخرت کی فکر رہتی ہے کہ ان میں سے کوئی شیطان کی راہ نہ اختیار کرے۔ سورۂ طور کی آیت اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ (۲۶) (اور ہم اس سے پہلے اپنے اہل و عیال میں ڈرنے والے تھے) میں ان کے اسی فکر و اندیشہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس اندیشے کی وجہ سے وہ برابر اپنے رب سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے رب! ہم کو ہمارے اہل و عیال کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب کر، ان کے اعمال و اخلاق تیری پسند اور ہماری تمناؤں کے مطابق ہوں اور ہم اس دنیا میں صالحین و متقین کے سربراہ ہوں اور آخرت میں بھی صالحین و متقین کے سربراہ کی حیثیت سے اٹھیں، فساق و فجار کے امام کی حیثیت سے نہ اٹھیں۔

ہم نے اس آیت کی جو تاویل کی ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ یہ قیادت و سیادت کے حصول کی

دعا نہیں ہے بلکہ ہر صاحب کنبہ کو بالفعل جو سیادت حاصل ہوتی ہے اس کی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کی دعا ہے۔ اس آیت کی تفسیر ہم نے اپنی کتاب 'توضیحات' میں بھی لکھی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

اُولٰٓئِکَ یُجۡزَوۡنَ الۡغُرۡفَۃَ بِمَا صَبَرُوۡا وَ یُلَقَّوۡنَ فِیۡہَا تَحِیَّۃً وَّ سَلٰمًا ۙ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ حَسُنَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّ مُقَامًا (۷۵-۷۶)

تواضع کا صلہ جنت کی عالی مقامی

فرمایا کہ یہ لوگ جو مذکورہ بالا صفات سے متصف ہیں اپنے ان اوصاف و اعمال کے صلے میں جنت کے بالاخانے پائیں گے۔ انھوں نے دنیا میں تواضع اور فروتنی کی زندگی گزاری اس وجہ سے یہ جنت کی عالی مقامی کے سزاوار ہوں گے۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا ہے 'مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے'۔

'بِمَا صَبَرُوۡا' سے یہ بات واضح ہوئی کہ ان اوصاف کا پیدا کرنا اور ان کو برقرار رکھنا کوئی سہل بازی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے بڑے صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ 'وَ یُلَقَّوۡنَ فِیۡہَا تَحِیَّۃً وَّ سَلٰمًا' یعنی جو لوگ اس امتحانِ صبر میں پورے اتر جائیں گے وہ بے شک اس بات کے سزاوار ہوں گے کہ خدا کے فرشتے مبارک سلامت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں۔

'حَسُنَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّ مُقَامًا' اوپر دوزخ کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے مقابل میں یہ الفاظ جنت کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مستقر ہونے کی حیثیت سے بھی خوب ہے اور مقام ہونے کے اعتبار سے بھی خوب ہے!

قُلۡ مَا یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡ لَا دُعَآؤُکُمۡ ۚ فَقَدۡ کَذَّبۡتُمۡ فَسَوۡفَ یَکُوۡنُ لِزَامًا (۷۷)

مخالفین کو دھمکی

یہ آخر میں مخالفین کو دھمکی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ان لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میں جو تمھارے پیچھے اس طرح پڑا ہوا ہوں تو اس وجہ سے نہیں کہ تمھارے بغیر خدا کا کوئی کام بند ہے یا بند ہو جائے گا۔ میرے رب کو تمھاری یا کسی کی کیا پروا ہو سکتی ہے! مقصود صرف تمھیں حق کی دعوت دینا ہے اور اس میں فائدہ سر تا سر تمھارا ہی ہے نہ کہ میرا اور میرے رب کا۔ اب اگر تم نے اس دعوت کو جھٹلا دیا ہے تو اس کا جو انجام ہے اس کے لیے تیار رہو، وہ لازمی ہے۔ عنقریب اس سے سابقہ پیش آ کے رہے گا۔ یہاں اس سنتِ الٰہی کو یاد رکھیے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہے۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

رحمان آباد — ۳۰ر نومبر ۱۹۷۳ء

تدبرِ قرآن

۲۶

الشّعراء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ — سورۂ فرقان — کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا اثبات ہے لیکن نہج استدلال اور اسلوبِ بیان اس کا سابق سورہ سے مختلف ہے۔

سابق سورہ میں جن انبیائے کرام کی سرگزشتوں کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا گیا تھا اس میں ان کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کاہن اور شاعر ہونے کا جو الزام لگاتے تھے اس میں اس الزام کی خاص طور پر تردید فرمائی ہے۔

اس میں ہر پیرے کے بعد آیات اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ بطور ترجیع آٹھ بار وارد ہوئی ہیں۔ اس ترجیع سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ آپ کی صداقت کے ثبوت کے لیے آپ سے کسی نشانی عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے وہ اس میں خاص طور پر مخاطب ہیں۔ ان کو تاریخ کے حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ رسولوں اور ان کے مکذبین کی تاریخ سے سبق لیں۔ ان لوگوں کی روش کی تقلید نہ کریں جو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال لیجیے تاکہ عمود کے ساتھ اس کے مختلف اجزا کا تعلق اور اس کا مجموعی ربط و نظام اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱ - ۹) تمہید، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر قرآن کے مخالفین اس پر ایمان نہیں لا رہے ہیں، کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں تو آپ اس چیز سے پریشان نہ ہوں۔ اگر اللہ چاہے گا تو کوئی ایسی نشانی اتار دے گا جو ان سب کی گردنیں قرآن کے آگے جھکا دے گی لیکن قرآن کی صداقت کسی خارجی نشانی کی محتاج نہیں ہے۔ یہ اپنی صداقت کی دلیل خود اپنے اندر ہی رکھتا ہے۔ اگر یہ لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں تو جن خطرات سے

قرآن ان کو آگاہ کر رہا ہے وہ سب ایک ایک کرکے پیش آکر رہیں گے۔ اس کائنات میں نشانیوں کی کمی نہیں ہے لیکن جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کے لیے کوئی نشانی کارگر نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کو خدا جب چاہے پکڑ سکتا ہے، وہ عزیز و غالب ہے، کوئی اس کے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا لیکن وہ نہایت رحیم بھی ہے اس وجہ سے لوگوں کی سرکشی کے باوجود ان کو مہلت دیتا ہے۔

(۱۰ - ٦۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت جس میں وہ واقعات اجمالاً بیان ہوئے ہیں جو فرعون کے پاس جانے کے حکم سے لے کر اس کی غرقابی تک پیش آئے۔ سرگزشت کے آخر میں انہی آیات کی ترجیع ہے جن کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

(٦۹ - ۱۰۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ توحید کا حوالہ جو انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی۔ اسی ذیل میں ان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جو اپنے مزعومہ شرکا و شفعا کے بل پر آخرت سے بے پروا ہیں۔ آخر میں آیاتِ ترجیع ہیں۔

(۱۰۵ - ۱۲۲) حضرت نوحؑ کی دعوت اپنی قوم کو اور قوم کا متکبرانہ جواب اور انجام کار اس کی غرقابی۔ آخر میں آیاتِ ترجیع۔

(۱۲۳ - ۱۴۰) حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت اپنی قوم عاد کو۔ قوم کی طرف سے ان کی متکبرانہ تکذیب اور اس کے نتیجہ میں عذابِ الٰہی کا ظہور — آخر میں آیاتِ ترجیع۔

(۱۴۱ - ۱۵۹) حضرت صالحؑ کی دعوت قومِ ثمود کو، قوم ثمود کی تکذیب اور اس کا انجام — آخر میں آیاتِ ترجیع۔

(۱٦۰ - ۱۷۵) حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت، ان کی قوم کا رویہ اور اس کا انجام — آخر میں آیاتِ ترجیع۔

(۱۷٦ - ۱۹۱) حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی دعوت کے ساتھ اہلِ مدین کا سلوک اور بالآخر ان کا حشر۔ اس سرگزشت کے آخر میں بھی انہی آیات کی ترجیع ہے جن کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

(۱۹۲ - ۲۲۷) خاتمۂ سورہ جس میں تمہید کے مضمون کی پوری وضاحت فرما دی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات تفسیر میں آئیں گی۔ یہاں اجمالاً مندرجہ ذیل امور ذہن میں رکھیے۔

(ا) قرآن کا منبع وحیِ الٰہی ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت روح الامین کے ذریعہ سے آنحضرتؐ پر نازل فرمایا ہے۔

(ب) اس کا عربی مبین میں نازل ہونا اہلِ عرب پر اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو یہ ان کی انتہائی محرومی و بدبختی ہے۔

(ج) اس کے دلائل پچھلے انبیاؑ کے صحیفوں میں موجود ہیں اور علمائے اہلِ کتاب ان سے واقف ہیں۔

(د) یہ کفار کے لیے انذار و تنبیہ ہے تاکہ مواخذہ سے پہلے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا جائے تو جو لوگ اس کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں وہ اس کے نتائج دور تک سوچ لیں۔

(ھ) اس کو جنوں اور شیطانوں کی وحی قرار دینا محض خرد باختگی ہے۔ شیاطین جس قسم کے لوگوں پر اترتے ہیں ان کی علامات کی طرف اشارہ۔

(و) یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ قرآن اور شعر، پیغمبر اور شاعر میں امتیاز کرنے والی بعض کسوٹیوں کی طرف اشارہ۔

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ (۲۶)

مَكِّيَّةٌ ــــــــ اٰيَاتُهَا ۲۲۷

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۹
طٰسٓمّٓ (۱) تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲) لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ
اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۳) اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ
اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۴) وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ
مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ (۵) فَقَدْ كَذَّبُوْا
فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۶) اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى
الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (۷) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸) وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
ع ۱ ۹ ۵ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۹)

ترجمۂ آیات ۱-۹
یہ طٰسٓمّٓ ہے۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ شاید تم اپنے آپ کو اس فکر میں ہلاک کر کے رہو گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے! اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی اتار دیں پس ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی ہی رہ جائیں۔ اور ان کے پاس خدائے رحمان کی طرف سے جو تازہ یاد دہانی بھی آتی ہے یہ اس سے اعراض کرنے والے ہی بنے رہتے ہیں۔ سو انھوں نے جھٹلا دیا تو جس چیز کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں اب اس کی تنبیہات ان کے آگے

ظاہر ہوں گی۔ ۱-۶

کیا انھوں نے زمین کی طرف نگاہ نہیں کی! ہم نے اس میں کتنی نوع بنوع کی فیض بخش چیزیں اُگا رکھی ہیں! اس میں بے شک، بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور بے شک تمھارا رب غالب بھی ہے، مہربان بھی۔ ۷-۹

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰسٓمٓ (۱)

'طٰسٓمٓ' ہمارے نزدیک مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ہم نے ترجمہ میں یہ محذوف کھول دیا ہے۔ یعنی یہ سورہ 'طٰسٓمٓ' ہے۔

تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ (۲)

آفتاب آمد دلیل آفتاب! 'کتاب مبین' سے مراد ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے جس نے نہایت فصیح و بلیغ زبان میں اپنی دعوت کے ہر پہلو کو گوناگوں اسلوبوں سے بالکل مدلّل و مبرہن کر دیا ہے۔ قرآن کی اس صفت کے ذکر سے یہاں مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ جو کتاب لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ اپنی صحت و صداقت کی خود سب سے بڑی دلیل ہے۔ کسی خارجی شہادت کی محتاج نہیں ہے اس وجہ سے جو لوگ اس کی تصدیق کے لیے کسی معجزہ یا نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کا مطالبہ درخورِ اعتناء نہیں ہے، آپ اس کی پروا نہ کریں۔ آفتاب اپنی دلیل خود ہوتا ہے۔ اس پر خارج سے کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۳)

دل نواز تسلی وہی تسلی کا مضمون جو اوپر والی آیت میں مخفی تھا اس آیت میں نہایت دل نواز پیرائے میں واضح ہو گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں کا اس 'کتاب مبین' پر ایمان نہ لانا آپ کے دل پر اتنا شاق ہے کہ معلوم ہوتا ہے آپ اس غم میں اپنے کو ہلاک کر کے رہیں گے حالانکہ قصور نہ آپ کا ہے نہ اس کتاب کا، سارا قصور ان لوگوں کا خود اپنا ہے کہ ایک بالکل واضح حقیقت کو جھٹلانے کے لیے مختلف قسم کے بہانے تلاش کر رہے ہیں۔ آپ کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے۔ اس کا حق آپ نے پورا پورا ادا کر دیا اور ادا کر رہے ہیں، پھر ایسے ناقدروں کے پیچھے آپ اپنے کو کیوں ہلکان کریں!

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِیْنَ (۴)

عربیت کا ایک اسلوب

آیت میں بظاہر 'خاضعین' کی جگہ 'خاضعۃ' ہونا تھا لیکن 'اعناقھم' میں مضاف الیہ کی رعایت سے 'خاضعین' آیا ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ اس کی بعض مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔

پیغمبر کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے تہدید

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے ساتھ کفار کے لیے دھمکی بھی مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے کوئی نشانی دیکھنے ہی پر اڑے ہوئے ہیں تو یاد رکھیں کہ ہمارے پاس نشانیوں کی کمی نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں آسمان سے کوئی ایسی نشانی اتار سکتے ہیں جس کے آگے سب کی گردنیں جھک جائیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ سوچ سمجھ کر اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان لائیں۔ ہمارے ہاں معتبر ایمان وہی ہے جو اختیار و ارادہ کے ساتھ لایا جائے نہ کہ مجبور ہو کر۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی ہے کہ جب ایمان کے باب میں سنتِ الٰہی یہ ہے تو آپ ان لوگوں کے مطالبات سے پریشان کیوں ہوں، ان کے معاملے کو خدا پر چھوڑ دیں!

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۵-۶)

دوا سے مریض کی بیزاری اور اس کا انجام

یہ ذرا مختلف الفاظ میں وہی مضمون ہے جو سورۂ فرقان کی آخری آیت میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تذکیر و تعلیم کے اس سارے اہتمام سے، جو ربِ رحمان نے ان کے لیے کیا، مقصود یہی تھا کہ یہ لوگ سوچیں سمجھیں اور زندگی کی صحیح روش اختیار کریں لیکن ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جتنی ہی ان کے علاج کی تدبیر کی گئی اتنی ہی دوا اور طبیب سے ان کی نفرت بڑھتی گئی۔ اللہ نے تازہ بتازہ، نو بنو اسلوبوں سے ان کو یاد دہانی کی لیکن وہ اعراض کرنے والے ہی بنے رہے اور قرآن و رسول دونوں کا انھوں نے مذاق اڑایا۔ ان کی اس روش کے بعد اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی چیز بھی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ جس قرآن کا انھوں نے اب تک مذاق اڑایا ہے، اس نے جن نتائج سے ان کو خبردار کیا ہے وہ ایک ایک کر کے ان کے سامنے آئیں۔ چنانچہ وہ ان کے سامنے آئیں گے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (۷)

'زوج' کے معنی قسم اور نوع کے ہیں۔ 'من کل زوج' یعنی نوع بنوع چیزیں۔ 'کریم' یہاں فیض بخش اور منفعت رساں کے مفہوم میں ہے۔ اہلِ عرب انگور کو 'کرم' کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام انھوں نے انگور کی غایت درجہ منفعت رسانی ہی کی وجہ سے رکھا۔

زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ آخر یہ لوگ آسمان سے اترنے والی کسی نشانیِ عذاب ہی کے منتظر کیوں ہیں؟ اس زمین پر پھیلی ہوئی ان گوناگوں نعمتوں کو کیوں نہیں دیکھتے جن کو ربِ رحیم و کریم نے اسی لیے پیدا کیا ہے کہ لوگ ان سے فائدہ بھی اٹھائیں اور بصیرت و یاد دہانی بھی حاصل کریں!

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ○ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۸ - ۹)

یعنی اگر یہ کسی نشانی ہی کے طالب ہیں تو اس سے بڑی نشانی اور کیا چاہیے! یہاں ان تمام دلائلِ توحید و قیامت و جزا کو ذہن میں مستحضر کر لیجیے جو قرآن میں تفصیل سے مذکور ہوئے ہیں اور جن کی شہادت میں قرآن نے زمین کی انہی نعمتوں اور برکتوں کا حوالہ دیا ہے۔ آگے سورۂ لقمان کی آیت ۱۰ اور سورۂ سجدہ کی آیت ۲۷ کے تحت اس مضمون کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

'وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ' یعنی یہ بات نہیں ہے کہ نشانیوں کی کمی ہے۔ نشانیوں سے تو اس زمین کا چپہ چپہ معمور ہے لیکن جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کا کیا علاج!

خدائے عزیز و رحیم کی سنت امہال

'وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ' یہ وہی اوپر والی بات اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کی روشنی میں واضح فرمائی ہے کہ تمھارا خداوند عزیز بھی ہے اور ساتھ ہی رحیم بھی۔ 'عزیز' یعنی غالب، وہ جو چاہے کر سکتا ہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ اگر وہ ان پر فوراً کوئی عذاب نازل کر دے تو کوئی اس کی پکڑ سے ان کو بچا نہ سکے گا لیکن وہ رحیم بھی ہے اس وجہ سے عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا کہ جو لوگ توبہ اور اصلاح کرنی چاہیں وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر لیں اور اس کی رحمت کے سزاوار بن جائیں۔ یہاں مبتدا کے اعادہ سے مقصود خاص طور پر ان صفات پر زور دینا اور لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرنا ہے اس لیے کہ خدا کی ان صفات کو مستحضر نہ رکھنے ہی کے باعث نادانوں کو یہ مغالطہ پیش آیا کہ وہ خدا کی ڈھیل کو اپنے رویہ کی صحت و صداقت کی دلیل سمجھ بیٹھے اور نہایت غرور کے ساتھ ان لوگوں کا مذاق اڑایا جنھوں نے ان کو اصلاح کی دعوت دی ــــ یہ آیات اس سورہ میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بار بار آئیں گی اس وجہ سے ان کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے تاکہ آگے اس کے اعادے کی ضرورت نہ پیش آئے۔

۲- آگے کا مضمون ــــ آیات ۱۰-۶۸

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا بیان

آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی وہ سرگزشت جس کی طرف پچھلی سورہ میں اجمالی اشارہ فرمایا گیا تھا، تفصیل کے ساتھ آ رہی ہے۔ یہ سرگزشت اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا ہے اور پھر فرعون اور اس کی فوج کی غرقابی پر ختم ہوتی ہے۔ اس دور کے تمام اہم واقعات کی طرف اس میں اشارے ہیں۔ یوں تو اس سرگزشت کا ہر حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے بھی سرمایۂ تسکین و تسلی اور آپؐ کے مخالفین کے لیے سبق آموز ہے لیکن سورہ کے عمود کے پہلو سے خاص چیز جو اس میں قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ اغراض و شہوات کے غلام بن کر اپنے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ضائع کر بیٹھتے ہیں ان پر کوئی بڑے سے

بڑا معجزہ بھی کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ ان کی آنکھیں صرف اس وقت کھلتی ہیں جب ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۶۸

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ
اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾
وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ
لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ
اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ
اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾
وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ
فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ
فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ
نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ
وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ
اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ
رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ
اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا
بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ
لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ

مُّبِينٍ ﴿٣٠﴾ قَالَ فَأْتِ بِهِۦٓ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿٣١﴾ فَأَلْقَىٰ
عَصَاهُ فَإِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿٣٢﴾ وَنَزَعَ يَدَهُۥ فَإِذَا هِىَ
بَيْضَآءُ لِلنَّٰظِرِينَ ﴿٣٣﴾ قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُۥٓ إِنَّ هَٰذَا لَسَٰحِرٌ ع ۲
عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِۦ فَمَاذَا
تَأْمُرُونَ ﴿٣٥﴾ قَالُوٓا۟ أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَٱبْعَثْ فِى ٱلْمَدَآئِنِ
حَٰشِرِينَ ﴿٣٦﴾ يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيمٍ ﴿٣٧﴾ فَجُمِعَ ٱلسَّحَرَةُ
لِمِيقَٰتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٣٨﴾ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ﴿٣٩﴾
لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ ٱلسَّحَرَةَ إِن كَانُوا۟ هُمُ ٱلْغَٰلِبِينَ ﴿٤٠﴾ فَلَمَّا جَآءَ
ٱلسَّحَرَةُ قَالُوا۟ لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ
ٱلْغَٰلِبِينَ ﴿٤١﴾ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٢﴾ قَالَ
لَهُم مُّوسَىٰٓ أَلْقُوا۟ مَآ أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٤٣﴾ فَأَلْقَوْا۟ حِبَالَهُمْ وَ
عِصِيَّهُمْ وَقَالُوا۟ بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ ٱلْغَٰلِبُونَ ﴿٤٤﴾ فَأَلْقَىٰ
مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿٤٥﴾ فَأُلْقِىَ ٱلسَّحَرَةُ
سَٰجِدِينَ ﴿٤٦﴾ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِرَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ مُوسَىٰ وَ
هَٰرُونَ ﴿٤٨﴾ قَالَ ءَامَنتُمْ لَهُۥ قَبْلَ أَنْ ءَاذَنَ لَكُمْ إِنَّهُۥ لَكَبِيرُكُمُ
ٱلَّذِى عَلَّمَكُمُ ٱلسِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُونَ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ
وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَٰفٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٩﴾ قَالُوا۟
لَا ضَيْرَ إِنَّآ إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّا نَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا

خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥١﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ ع ۳ ۱۸ ۷
اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿٥٢﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ
حٰشِرِيْنَ ﴿٥٣﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿٥٤﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا
لَغَآئِظُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ
جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿٥٧﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿٥٨﴾ كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿٥٩﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا تَرَاۗءَ الْجَمْعٰنِ
قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ
سَيَهْدِيْنِ ﴿٦٢﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ
الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾ وَاَزْلَفْنَا
ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿٦٥﴾ ثُمَّ
اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٦﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٦٧﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٦٨﴾ ع ۴ ۱۷ ۸

ترجمۂ آیات ۱۰-۶۸

اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ ظالم قوم ـــــ قوم فرعون ـــــ کے پاس جاؤ، کیا وہ ڈریں گے نہیں! اس نے کہا، اے میرے رب! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ بھنچتا ہے اور میری زبان رواں نہیں ہے تو ہارون کے پاس پیغام بھیج اور ان کے ایک گناہ کا بار بھی میرے اوپر ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ ۱۰-۱۴!

فرمایا، ہرگز نہیں! پس تم دونوں ہماری نشانیوں کے ساتھ جاؤ، ہم تمھارے ساتھ

سننے والے ہیں۔ تو فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم خداوند عالم کے رسول ہیں کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔ اس نے کہا، کیا ہم نے تم کو بچپن میں اپنے اندر پالا نہیں؟ اور تم نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے اندر بسر کیے اور تم نے اپنی وہ حرکت کی جو کی اور تم ناشکروں میں سے ہو! ۱۵-۱۹

موسیٰ نے جواب دیا کہ میں نے یہ اس وقت کیا اور میں خطا واروں میں سے تھا تو جب مجھے تم لوگوں سے اندیشہ ہوا تو میں تم سے بھاگا۔ پھر میرے رب نے مجھے قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور مجھے رسولوں میں سے بنایا۔ اور یہ احسان ہے جو تم مجھے جتا رہے ہو جس کے عوض تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! ۲۰-۲۲

فرعون نے پوچھا اور یہ رب العالمین کیا چیز ہے! اس نے جواب دیا کہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا خداوند، اگر تم لوگ یقین کرنے والے بنو! اس نے اپنے اردگرد والوں سے کہا، سنتے نہیں ہو! اس نے کہا، تمہارا بھی رب اور تمہارے اگلے آباء و اجداد کا بھی رب! فرعون نے کہا، تمہارا یہ رسول، جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، بالکل خبطی ہے۔ موسیٰ نے کہا، مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر تم عقل رکھتے ہو! وہ بولا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمھیں قید کر کے رہوں گا۔ موسیٰ نے کہا، کیا اس صورت میں بھی کہ جب میں تمہارے پاس کوئی واضح نشانی لے کر آیا ہوں؟ اس نے کہا، وہ پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ تو اس نے اپنا عصا ڈال دیا اور وہ دفعتہً ایک صریح اژدہا بن گیا اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ یکایک دیکھنے والوں کو چٹا نظر آیا۔ فرعون نے اپنے اردگرد کے درباریوں سے کہا، بے شک یہ بڑا

ہی ماہر جادوگر ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے تو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو! ۳۴-۳۵

انھوں نے کہا کہ اس کو اور اس کے بھائی کو ابھی ٹالیے اور شہروں میں ہرکارے بھیجیے جو آپ کے پاس تمام ماہر جادوگروں کو لائیں۔ تو ساحر ایک معین دن کے مقررہ وقت کے لیے جمع کیے گئے اور لوگوں کو منادی کر دی گئی کہ لوگو، جمع ہو تاکہ ہم ساحروں کا ساتھ دیں اگر وہ غالب رہنے والے ثابت ہوں۔ تو جب ساحر جمع ہوئے تو انھوں نے فرعون سے کہا، کیا ہمارے لیے کوئی صلہ بھی ہے اگر ہم ہی غالب رہنے والے ہوئے! اس نے کہا، ہاں! اور اس وقت تم مقربین میں سے بھی ہو گے۔ ۳۶-۴۲

موسیٰ نے ان سے کہا پیش کرو جو کچھ تم پیش کرنے والے ہو۔ انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں اور بولے کہ فرعون کے اقبال کی قسم، ہم ہی غالب رہنے والے ہوں گے! تو موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو یکایک وہ نگلنے لگا اس سوانگ کو جو وہ رچاتے تھے۔ تو ساحر بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ بولے کہ ہم ایمان لائے خداوند عالم، موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔ ۴۳-۴۸

اس نے کہا، تم نے اس کو مان لیا قبل اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں۔ بے شک وہی تمھارا گرو ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے۔ تو تم عنقریب جان لو گے! میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا اور تم سب کو سولی دوں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ کوئی ڈر نہیں، ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹیں گے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری غلطیاں بخش دے گا کہ ہم پہلے ایمان لانے والے بنے۔ ۴۹-۵۱

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی، ہمارے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ۔ بے شک تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ پس فرعون نے شہروں میں ہرکارے بھیجے کہ یہ لوگ مٹھی بھر ہیں اور یہ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں اور ہم ایک مستعد جمعیت ہیں۔ ۵۲-۵۶

پس ہم نے نکالا ان کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور ایک باعزت مقام سے۔ اسی طرح ہم کرتے ہیں اور ہم نے ان چیزوں کا وارث بنایا بنی اسرائیل کو۔ ۵۷-۵۹

پس انھوں نے ان کا تعاقب کیا صبح تڑکے۔ تو جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا، ہم تو پکڑے گئے! موسیٰ نے کہا، ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۶۰-۶۲

پس ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا دریا پر مارو۔ پس وہ پھٹ گیا اور ہر حصہ ایک عظیم تودے کے مانند بن گیا۔ اور ہم قریب لائے وہیں دوسروں کو اور ہم نے موسیٰ اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو نجات دی، پھر دوسروں کو غرق کر دیا۔ ۶۳-۶۶

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب، وہ عزیز و رحیم ہے۔ ۶۷-۶۸

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۙ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ (۱۰-۱۱)

یہ حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب مدین سے واپس ہوتے ہوئے وادیٔ مقدس طویٰ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کلام سے مشرف فرمایا اور ان کو منصبِ رسالت پر سرفراز کر کے فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت فرمائی۔

ایک خاص اسلوبِ بیان

'اَلَا یَتَّقُوْنَ' کا اسلوبِ بیان فرعون اور اس کی قوم کے غایت درجہ طغیان و فساد کو ظاہر کر رہا ہے

اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کیا یہ ظالم لوگ اسی طرح بگٹٹ اپنی سرکشی میں بڑھتے ہی چلے جائیں گے اور اس کے انجام اور خدا کے قہر و غضب سے نہیں ڈریں گے؟ آگے آیات ۱۲۵، ۱۴۳، ۱۶۲ اور ۱۷۸ سے معلوم ہوگا کہ بعینہٖ اسی اسلوب سے دوسرے انبیائے کرام نے بھی اپنی اپنی قوموں کو انذار فرمایا ہے۔ اس اسلوبِ خطاب میں حسرت، غصہ، زجر و ملامت اور عذابِ الٰہی کے قرب کی جو وعید ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ہ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ہ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ہ (۱۲-۱۴)

نبوت پا کر حضرت موسیٰؑ کے اندیشے — حضرت موسیٰؑ اس عظیم ذمہ داری سے بہت ڈرے اور یہ ڈرنا ذمہ داری کے صحیح احساس کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ مدین جانے سے پہلے ہی انھیں یہ اندازہ اچھی طرح ہو چکا تھا کہ فرعونیوں کے سامنے کوئی حق بات کہنا کتنا مشکل ہے۔ نیز وہ اپنے اندر قوتِ بیان کی کمی بھی محسوس فرماتے تھے اور قبطی کی موت کا جو واقعہ ان کے ہاتھوں ہو چکا تھا اس کی بنا پر بھی وہ اندیشہ ناک تھے کہ فرعون اور اس کے اعیان ان کے خلاف غصہ میں بھرے بیٹھے ہوں گے وہ ان کو آسانی سے معاف کرنے والے نہیں ہیں، بالخصوص اس صورت میں جب کہ وہ ان کے سامنے رسالت کا دعویٰ لے کر جائیں گے اور ان کے ظلم و تعدی پر ان کو انذار کریں گے۔ اپنے یہ اندیشے ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت موسیٰؑ نے اپنی یہ گزارش بھی پیش کر دی کہ اگر مرضیِ الٰہی یہی ہے کہ میں یہ بارِ گراں اٹھاؤں تو میری مدد کے لیے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے بھائی ہارون کو میرا شریکِ کار بنا دیا جائے جو فصیح اللسان آدمی ہیں۔ تاکہ ہم دونوں مل کر اس خدمت کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکیں۔

قَالَ کَلَّا ج فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ہ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۱۵-۱۷)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطمینان دہانی — اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے اس اندیشے کی تو پوری شدت کے ساتھ تردید فرما دی کہ قبطی انھیں قتل کر دیں گے لیکن حضرت ہارونؑ کے بارے میں ان کی درخواست، جیسا کہ دوسرے مواقع میں تصریح اور یہاں اشارہ ہے، منظور فرمائی اور ان کو حکم دیا کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کوئی اندیشہ نہ رکھو۔ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ، اطمینان دہانی کا نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ دوسرے مقام میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے: اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی (طٰہٰ-۴۶) (میں تم دونوں کے ساتھ سنتا اور دیکھتا ہوں تو مجال ہے کہ کوئی تمھیں گزند پہنچا سکے!)

فرعون کی طرف ایک کے بجائے دو رسول — اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ کے مددگار، شریکِ رسالت کی حیثیت سے تھے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت ہو گئی۔ فرمایا ہے:

'إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ' (طٰہٰ: ۴۷) (ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں) فرعون کے سامنے اس امر واقعی کا اظہار اتمام حجت کے پہلو سے ہوا ہے کہ ایک چھوڑ دو دو رسول، اللہ نے اس کی طرف بھیجے ہیں اگر اس کے بعد بھی اس نے صحیح روش اختیار نہ کی تو اس کی شامت ہی ہے۔

أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ سے متعلق مولانا فراہیؒ کا نقطۂ نظر

'أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ' کی وضاحت سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ ہم کر چکے ہیں۔ تورات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کو عید قربانی منانے کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں لے جانا چاہتے تھے، لیکن یہ تصریح تورات میں نہیں ہے کہ بیابان میں کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ ان کو حج و قربانی کے لیے مکہ معظمہ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے مولانا کا یہ خیال ایک نظریے کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے، ان کے دلائل میرے سامنے نہیں ہیں اس وجہ سے میں پوری طرح اس پر مطمئن نہیں ہوں۔ میں اپنا رجحان اعراف کی تفسیر میں ظاہر کر چکا ہوں۔ بعض باتیں مولاناؒ کے اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔ ممکن ہے آگے کسی موزوں مقام پر میں ان کی وضاحت کروں۔ فرعون کو انذار کے ساتھ یہ حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی تنظیم اور ان کے اندر دین کے احیاء و تجدید کے سلسلہ میں پہلی ہدایت ہوئی۔

تورات میں اس واقعہ کے ابہام کی وجہ

اس امر خاص میں تورات کے بیان کے اندر جو ابہام ہے اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو حضرت موسیٰ نے اس کو فرعون پر ظاہر نہ کرنا چاہا ہو اس وجہ سے اس کو مبہم ہی رکھا ہو یا یہ ہوا کہ یہود نے اس کے اظہار کو اپنے مصالح کے خلاف پا کر جس طرح حضرت اسماعیلؑ اور خانہ کعبہ کی ساری تاریخ پر پردہ ڈال دیا اسی طرح اس بات پر بھی پردہ ڈال دیا۔

'أَنْ أَرْسِلْ' اصل میں 'بِأَنْ أَرْسِلْ' ہے۔ عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق 'ب' حذف ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس پیغام کے ساتھ رسول بن کر آئے ہیں۔

قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ۝ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ (۱۸-۱۹)

فرعون کا حضرت موسیٰؑ کو حقارت آمیز جواب

یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ حذف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے بموجب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو ساتھ لے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس گئے اور انذار کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ بھی رکھا۔ بھلا فرعون یہ تصور کہاں کر سکتا تھا کہ کوئی اس کے سامنے اتنا بڑا دعویٰ اور اتنا اہم مطالبہ لے کر آئے گا اور وہ بھی ایک اسرائیلی! اس نے نہایت حقارت آمیز انداز میں کہا کہ کیا تم وہی نہیں ہو جس کی پرورش بچپن میں ہم نے اپنے گھر میں کی ہے اور کیا تم وہی نہیں ہو جس نے وہ حرکت کی جو تم نے کی! بے شک تم بڑے ہی ناشکرے ہو! 'کافر' یہاں لغوی یعنی ناشکرے کے معنی میں ہے اور 'وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ' سے اس کا اشارہ قبطی کے واقعۂ قتل

کی طرف تھا جس کی سنگینی کی تعبیر کے لیے اس نے یہ ابہام کا اسلوب اختیار کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ 'یار قدرِ خود ناشناس! تم ہمارے پروردہ اور ہمارے مجرم ہونے کے باوجود ہمارے سامنے اپنی نبوت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کا مطالبہ لے کر اٹھے ہو!'

قَالَ فَعَلْتُهَآ إِذًا وَّأَنَا مِنَ الضَّآلِّينَ ۞ فَفَرَرْتُ مِنكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَّجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ (۲۰-۲۱)

ضال کا مفہوم — 'ضَآلّ' یہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس مفہوم میں وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ: ۷) میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی سرگشتہ، جویائے راہ، کھویا ہوا۔

حضرت موسیٰ کا اعترافِ حق اور اظہارِ حق — حضرت موسیٰ نے جہاں تک قبطی کے واقعہ کا تعلق تھا صاف صاف اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور فرمایا کہ بے شک مجھ سے یہ فعل صادر تو ہوا لیکن اس وقت ہوا جب مجھے میرے رب کی طرف سے علم کی صحیح روشنی حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ میں ابھی جستجوئے علم کی راہ میں سرگشتہ اور کھویا ہوا تھا، چنانچہ جب مجھ سے یہ فعل صادر ہو گیا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اس نادانستہ فعل پر آپ لوگ مجھے قتل کر دیں گے تو میں یہاں سے نکل گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھے علم و حکمت کی روشنی اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور مجھے اپنے رسولوں میں سے بنایا اور اب میں ایک رسول کی حیثیت سے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ میری موجودہ حیثیت میری سابق حالت سے بالکل مختلف ہے۔ اس گزرے ہوئے واقعہ کو نظر انداز کر کے میری بات پر دھیان دیجیے۔

قبطی کے قتل کے واقعہ کی نوعیت پر ہم سورۂ طٰہٰ میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں کہ یہ محض حمایتِ مظلوم کے جذبہ کے تحت حضرت موسیٰ سے بالکل بلاقصد صادر ہو گیا جس پر حضرت موسیٰ کو نہایت ندامت ہوئی۔ انھوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

تنہا عقل رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے — اس امر پر بھی ہم سورۂ ہود میں گفتگو کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے قبل بھی فطرتِ سلیم پر ہوتے تھے لیکن تنہا فطرت اور عقل زندگی کے پُرپیچ راستوں میں انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اس میں بہت سے موڑ ایسے آتے ہیں جہاں انسان کی عقل سرگشتہ و حیران رہ جاتی ہے اور جب تک اس کو خدا کی رہنمائی حاصل نہ ہو وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسی حکمت و معرفت کو حضرت موسیٰ نے یہاں 'حُکم' سے تعبیر فرمایا ہے۔ آگے آیت ۸۳ کے تحت اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (۲۲)

حضرت موسیٰ کا بلیغ جواب — یہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے اس اظہارِ احسان کا جواب دیا ہے جس کا ذکر آیات ۱۸-۱۹ میں گزرا ہے اور غور کیجیے کہ کس قدر بلیغ جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ تم اپنا یہ احسان مجھے اپنے اس ظلمِ عظیم کو جائز ثابت کرنے کے لیے جتا رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ احسان ہے تو سہی، اس کا

شکریہ! لیکن اس احسان کے بدلے میں تمھیں یہ حق تو نہیں حاصل ہو سکتا کہ تم تمام بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھو اور میں اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھاؤں!

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۳)

دعوائے رسالت کا استہزاء

فرعون اپنے طعنہ اور اظہار احسان، کا جواب تو ایسا مسکت پا گیا کہ اس کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی اس وجہ سے اس نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کے دعوائے رسالت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ اوپر آیت ۱۶ میں گزر چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارون علیہما السلام نے اس کے سامنے اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اس نے 'رب العالمین' کا مذاق اڑایا کہ یہ رب العلمین کیا چیز ہے جس کے تم دونوں رسول بن کر آئے ہو! اس کا مطلب یہ تھا کہ سب سے بڑے دیوتا کا اوتار اور رب العلمین تو میں ہوں، تو میرے ہوتے اور کون رب العلمین ہے جس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا!

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (۲۴)

دعوت کی راہ میں ایک قدم اور آگے کی طرف

حضرت موسیٰؑ نے اس کے اس گستاخانہ طنز کے جواب میں اپنی دعوت کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ فرمایا کہ تمھارا رب العلمین وہی ہے جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا رب ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'مَا بَيْنَهُمَا' کے تحت سورج چاند، سب آ گئے اور فرعون، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، سورج دیوتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔

'اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ' یعنی اصل حقیقت یہ ہے جو میں نے واضح کر دی ہے۔ اس کو مانو یا نہ مانو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔ بلکہ خود تم لوگوں پر ہے۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (۲۵)

فرعون کی بوکھلاہٹ

حضرت موسیٰؑ کا جواب فرعون کے کبر پر ایک کاری ضرب تھا اس وجہ سے وہ تلملا اٹھا اور درباریوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا کہ تم لوگ سن رہے ہو، یہ شخص کیا کہہ رہا ہے!

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۶)

دعوت کی راہ میں مزید ایک قدم اور آگے کی طرف

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے اس غیظ و غضب کی کوئی پروا کیے بغیر اپنی دعوت کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ فرمایا کہ تمھارا بھی رب اور تمھارے اگلے آباء و اجداد کا بھی رب! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ باطل ادیان کی بنیاد تمام تر پچھلوں کی تقلید ہی پر ہوتی ہے اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے لگے ہاتھوں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ اگر اس معاملے میں تم نے اپنے باپ دادا کی روایات پر بھروسہ کیا ہے تو یہ بھروسہ بے بنیاد ہے۔ ان کا رب بھی وہی ہے جس کی دعوت میں دے رہا ہوں۔ اگر انھوں نے اس کو چھوڑ کر کسی اور کو رب بنایا تو یہ ان کی ضلالت و جہالت ہے۔ ان کی کورانہ تقلید کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (۲۷)

فرعون کی جھنجھلاہٹ

حضرت موسیٰ نے جب ان کے آباو اجداد کی گمراہی بھی واضح کر دی تو فرعون کا پارہ بہت چڑھ گیا۔ غصہ سے جھنجھلا کر اس نے نہایت تحقیر انگیز، طنزیہ انداز میں، درباریوں سے کہا کہ تمھارا یہ رسول، جو بزعم خویش تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مجھے تو ایک بالکل دیوانہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب یہ شخص ہمارے آباو اجداد کو بھی احمق اور گمراہ ثابت کر رہا ہے تو اس کے پاگل ہونے میں کیا شبہ رہا! 'رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ' میں طنز کے ساتھ لوگوں کو اکسانے کی خواہش بھی مضمر ہے کہ دیکھ لو، یہ شخص ہے جو مدعی ہے کہ تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے!

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۸)

فرعون کی خدائی پر آخری ضرب

حضرت موسیٰ نے فرعون کی اس بدتمیزی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ اس کو بالکل نظر انداز کر کے اپنی دعوت کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ فرمایا کہ وہی مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے بشرطیکہ تم لوگ عقل سے کام لو اور سوچنے سمجھنے والے ہو! یہ فرعون کی خدائی پر حضرت موسیٰ کی آخری ضرب تھی۔ وہ اپنے آپ کو سورج کا اوتار سمجھتا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اس پر واضح کر دیا کہ جس کو نہ مشرق پر کوئی اختیار نہ مغرب پر اگر وہ اپنے آپ کو 'رب' سمجھتا ہے تو یہ اس کی اور اس کو رب ماننے والوں کی عقل کا فتور ہے۔ آپ لوگ اپنی عقل سے کام لو گے تو یہ بات ایسی واضح ہے کہ کسی کو اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (۲۹)

فرعون کی دھمکی

جب فرعون نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ اس کی کسی بات کو سرے سے لائق اعتنا ہی نہیں سمجھتے بلکہ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنی ایک بات کے بعد دوسری بات پہلی سے بھی بڑھ چڑھ کر کہہ گزرتے ہیں اور ہر بات اس کی خدائی پر ایک سخت سے سخت تر ضرب کی نوعیت رکھتی ہے تو وہ بالکل بے حوصلہ ہو کر چلا اٹھا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو یاد رکھو کہ میں تمھیں قید کر کے چھوڑوں گا۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ (۳۰)

معجزات کی نشانی

اس کا گمان ہوگا کہ اس کھلی ہوئی دھمکی کے بعد حضرت موسیٰ سہم جائیں گے لیکن انھوں نے نہایت متانت اور وقار کے ساتھ فرمایا کہ کیا تمھارا یہی فیصلہ اس صورت میں بھی ہوگا جب میں تمھیں کوئی نہایت واضح نشانی اس بات کی دکھا دوں کہ میں خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں؟

قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۳۱)

فرعون نے کہا اگر تم اپنی سچائی کی کوئی نشانی رکھتے ہو تو اس کو دکھاؤ۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۚ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَاۗءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (۳۲-۳۳)

فرعون کے اس مطالبے پر حضرت موسیٰ نے عصا اور ید بیضا کے دونوں معجزے دکھائے۔ ان معجزات کی حقیقت

تفسیر سورۂ طٰہٰ میں ہو چکی ہے۔ یہاں صرف یہ چیز خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ معجزے حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی طلب پر اس وقت دکھائے ہیں جب اس نے ان کی دعوتِ توحید کے جواب میں، جو تمام تر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے دلائل پر مبنی تھی، ان کو قید کرنے کی دھمکی دی ہے۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ (۳۴-۳۵)

معجزات کی قاہری اور فرعون کی ہوشیاری

ان معجزات کی قاہری ایسی نمایاں تھی کہ فرعون اور اس کے درباری سب ہک دک رہ گئے۔ لیکن فرعون نے نہایت ہوشیاری سے لوگوں کو مرعوبیت سے بچانے کی کوشش کی۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کے اس کارنامے کی تو داد دی اس لیے کہ اس سے مفر نہیں تھا لیکن ساتھ ہی یہ تاثر بھی لوگوں کو دینے کی کوشش کی کہ یہ محض فنِ جادوگری میں مہارت کا کرشمہ ہے۔ اس کو نبوت و رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید برآں حضرت موسیٰؑ کے خلاف ایک سیاسی بدگمانی پیدا کرنے کے لیے ذہنوں میں یہ وسوسہ بھی ڈال دیا کہ یہ شخص اپنے جادو کے زور سے لوگوں کو اپنے حق میں ہموار کرنا اور ہم کو اس ملک سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں نہایت وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت اس بدگمانی کے پھیلنے کے لیے فضا نہایت سازگار تھی۔ اس ہوّے سے ڈرا کر فرعون نے درباریوں سے پوچھا کہ اس خطرے کی مدافعت کے لیے آپ لوگ کیا مشورہ دیتے ہیں!

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ (۳۶-۳۷)

درباریوں کا مشورہ

درباریوں نے مشورہ دیا کہ بہتر ہے کہ ان کے جادو کا توڑ جادو ہی سے کیا جائے لیکن عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرانا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ اس میں شکست اور جگ ہنسائی کا اندیشہ ہے۔ اس وجہ سے بروقت تو ان کو ٹالیے اور مملکت کے تمام شہروں میں اپنے خاص آدمیوں کو بھیج کر تمام ماہر جادوگروں کو بلوائیے اور ان سے ان کا مقابلہ کرائیے۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۙ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ (۳۸-۴۰)

حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کی تیاری

درباریوں کے اسی مشورے پر عمل کیا گیا۔ ایک خاص دن میں، ایک معین وقت پر، ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو مرکز میں جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح بھی ہے کہ ایک دن میلہ کا اور وقت چاشت کا مقرر ہوا اور مقابلہ کے لیے میدان ایک ایسا منتخب ہوا جس میں ہر سمت کے لوگوں کو پہنچنے میں یکساں سہولت ہو۔ مزید برآں وقتِ موعود پر لوگوں کو جمع ہونے کے لیے خوب ابھارا بھی گیا کہ ہمارے ساحر اس وقت ملک کو ایک بہت بڑے خطرے سے بچانے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی اور ان کا ساتھ دینے کے

ہے اس موقع پر ضرور موجود ہو۔ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ کے استفہامیہ اسلوب میں حث و تحریض اور تشویق و ترغیب کا جو مفہوم مضمر ہے وہ عربی کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ اس کی بعض مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ میں یہ مضمون مضمر ہے کہ ہمارے یہ ساحر اس وقت ہمارے قومی وقار کے تحفظ کے لیے میدان میں اتر رہے ہیں، تو ہم میں سے ہر شخص کو اس بات کا آرزومند ہونا چاہیے کہ ان کو اس مقابلے میں فتح حاصل ہو اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۴۱-۴۲)

فرعون کی طرف سے ساحروں کی حوصلہ افزائی

ساحر جب فرعون کے سامنے حاضر ہوئے تو انھوں نے عام پیشہ وروں کی طرح یہ التجا پیش کی کہ اگر ہم اس مقابلے میں غالب رہے تو سرکار سے بھرپور انعام ملے گا نا! فرعون نے ان کو اطمینان دلایا کہ انعام تو جو ملنا ہے وہ ملے ہی گا۔ مزید برآں تم پر اس جانب کی یہ نوازش بھی ہو گی کہ تم مقربین بارگاہِ شاہی میں شامل کیے جاؤ گے!

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ (۴۳-۴۴)

حضرت موسیٰ اور ساحروں کا مقابلہ

جب میدانِ مقابلہ میں حضرت موسیٰ اور ساحروں کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت موسیٰ نے ساحروں ہی کو پہل کرنے کا موقع دیا۔ فرمایا کہ جو ہنر تم دکھانا چاہتے ہو دکھاؤ۔ ان کے پاس جو رسیاں اور لاٹھیاں تھیں وہ انھوں نے پانسہ کے تیروں کی طرح پھینکیں اور ساتھ ہی یہ قسم کھائی کہ فرعون کے اقبال کی قسم ہم ہی غالب رہیں گے! بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ میں 'ب' ہمارے نزدیک قسمیہ ہے۔ فرعون کو چونکہ ان کے ہاں دیوتا کی حیثیت حاصل تھی اس وجہ سے کوئی اہم قدم اٹھاتے ہوئے وہ اس کے عزت و اقبال کی قسم کھاتے۔ تورات میں ان کے شواہد موجود ہیں۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ (۴۵)

سحر و ساحری کے طلسم پر عصائے موسیٰ کی ضرب کاری

جواب میں حضرت موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور وہ ان کے اس سارے سوانگ کو، جو وہ اب تک لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے رچاتے رہے تھے، نگلنے لگا۔ مَا يَاْفِكُوْنَ کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ صرف یہی نہیں ہوا کہ اس موقع پر ساحروں نے جو کرتب دکھایا عصائے موسیٰ نے اس کا بھرم کھول دیا، بلکہ اس نے ان کے اب تک کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اس لیے کہ یہی ہنر کا شاہکار تھا جب اس کا یہ حشر ہوا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ عصائے موسیٰ نے سحر و ساحری کے سارے طلسم ہی کو باطل کر دیا۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (۴۶ - ۴۸)

ساحروں کا اعترافِ حق

ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ سحر و معجزہ کے فرق کو سب سے زیادہ پرکھنے والا ایک ساحر ہی ہو سکتا ہے اگر اس کے اندر اعترافِ حق کی رمق ہو۔ ان ساحروں کے اندر یہ رمق موجود تھی اس وجہ سے وہ اس کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑے، علی رؤس الاشہاد اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اور اس تصریح کے ساتھ کہ ہم ایمان لائے رب العالمین، موسیٰ اور ہارون کے رب پر! اوپر آیات ۱۶ اور ۲۴ میں فرعون کے اس غیظ و غضب کا ذکر گزر چکا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پیش کردہ 'رب العالمین' کے خلاف وہ ظاہر کر چکا تھا۔ ساحروں نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر اسی رب العالمین پر اپنے ایمان کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ اتنی وضاحت اور بھی کر دی کہ موسیٰ اور ہارون کے رب پر، تاکہ کسی ادنیٰ اشتباہ کی بھی کوئی گنجائش کسی کے لیے باقی نہ رہے۔ یہ ہے ایمان کا ایک ادنیٰ کرشمہ!

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۴۹)

فرعون کی طرف سے سازش کا [illegible]

بھرے میدان میں اس طرح کی شکست سے ظاہر ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں کی نہایت سخت رسوائی ہوئی لیکن فرعون آسانی سے شکست ماننے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے حالات کو سنبھالنے کے لیے فوراً ایک سازش کا ہتھکنڈا کھڑا کر دیا۔ ساحروں سے کہا، تم نے میری اجازت کے بغیر اس طرح سب کے سامنے اس شخص پر اپنے ایمان کا جو اعلان کیا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادو کی تعلیم دی ہے۔ تمہاری اور اس کی پہلے سے ملی بھگت تھی کہ اس طرح تم سب کے سامنے اپنی شکست مان لو گے جس سے اس کی دھاک سب کے دلوں پر بیٹھ جائے گی اور ملک کے اندر انقلاب برپا کرنے کی راہ اس شخص کے لیے ہموار ہو جائے گی۔ یہ مملکت کے خلاف تم نے ایک سازش کی ہے اس وجہ سے میں تم کو اور تمہارے اس گرو کو وہ سزا دوں گا جو حکومت کے باغیوں کو دی جاتی ہے۔ پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں گے اور پھر عبرتِ عام کے لیے تم کو سولی پر لٹکایا جائے گا۔

[illegible] ثبوت

یہاں اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ کے الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ فرعون کا مطلب یہ تھا کہ اگر فی الواقع تم نے اس شخص کو راست باز آدمی سمجھا تھا تو تمہاری خیر خواہی کا تقاضا یہ تھا کہ تم یہ بات پہلے میرے علم میں لاتے اور میں اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرتا لیکن تم نے میری اجازت کے بغیر سب کچھ بطورِ خود کر ڈالا جو اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ یہ فتح و شکست کا سارا ڈراما تمہاری ایک سازش ہے۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ

اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۰-۵۱)

'لَا ضَيْرَ'، 'ضَيْر' کے معنی حرج اور ضرر کے ہیں۔ اور 'اَنْ كُنَّا' اصل میں 'لِاَنْ كُنَّا' ہے۔ زبان کے معروف قاعدے کے مطابق 'ل' یہاں حذف ہوگیا ہے۔

نورِ ایمان کا کرشمہ

فرعون نے دھمکی تو بہت بڑی دے دی لیکن اس کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب یہ ساحر وہ ساحر نہیں ہیں جنھوں نے بڑی لجاجت سے اس سے انعام کی درخواست کی تھی بلکہ نورِ ایمان کی ایک ہی جھلک نے ان کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں پہنچ کر فرعون اور اس کی ساری سلطنت کی ان کی نگاہوں میں بالِ مگس کے برابر بھی وقعت باقی نہیں رہی ہے۔ انھوں نے بڑی بے خوفی کے ساتھ جواب دیا کہ اگر ہم کو یہ سزا ملی جس کی دھمکی دی گئی ہے تو اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے، ہم بہرحال اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور اگر ہم تیرے نزدیک اس بنا پر سازش کی سزا کے مستحق ہیں کہ تیری اجازت کے بدون ہم نے موسیٰؑ پر ایمان لانے میں سبقت کی ہے تو ہم اس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں اس لیے کہ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ہونے کے صلے میں ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہماری تمام غلطیاں معاف فرما دے گا۔

اگرچہ تماشا کے لیے یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ ساحر ایک ہی جست میں معرفت کے اس مرتبۂ بلند پر پہنچ گئے لیکن یہ بات تعجب کی نہیں ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے بھی اپنے ان پڑھ شاگردوں سے فرمایا تھا کہ جب میرے نام پر تم کو لوگ عدالتوں میں پکڑ وائیں گے تو پہلے سے نہ سوچنا کہ کیا جواب دو گے، وقت پر روح القدس خود تمھارے دل میں بات ڈالے گا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (۵۲)

حضرت موسیٰؑ کی ہجرت اور فرعون کی جانب سے ان کا تعاقب

یہاں سرگزشت کا کچھ حصہ محذوف ہے۔ ہم دوسرے محل میں، قرآن اور تورات دونوں کی روشنی میں، یہ واضح کر چکے ہیں کہ اس مقابلے میں شکست کھا جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان ایک عرصے تک کشمکش چلتی رہی۔ اس دوران میں مصر پر بہت سی آفتیں نازل ہوئیں جن سے ملک تباہی کے کنارے آ لگا۔ ان مصائب سے تنگ آ کر فرعون کے درباریوں نے اس کو مشورہ دیا کہ بنی اسرائیل جہاں جانا چاہتے ہیں ان کو وہاں جانے کی اجازت دے دی جائے ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا۔ بالآخر فرعون نے مجبور ہو کر اجازت تو دے دی لیکن جب حضرت موسیٰؑ اپنی پوری قوم کو ساتھ لے کر نکلے تو اس کی رائے بدل گئی، اس نے فوراً ہر جگہ اپنے آدمی بھیج دیے کہ تمام علاقوں کے سردار اپنے تمام فوجیوں اور تمام سامانِ جنگ کے ساتھ مرکز میں پہنچیں تاکہ بنی اسرائیل کا تعاقب کیا جائے۔

آیت میں اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کو بذریعہ وحی یہ ہدایت کر دی کہ تم راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر نکل جاؤ اور ساتھ ہی اس بات سے بھی آگاہ کر دیا کہ اگرچہ فرعون نے تم کو جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن اس کے باوجود تمھارا تعاقب کیا جائے گا۔ اس خطرے سے

تمھیں ہوشیار رہنا چاہیے۔

فَأَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ۝ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيلُونَ ۝ وَإِنَّهُمْ لَنَا لَغَائِظُونَ ۝ وَإِنَّا لَجَمِيعٌ حَاذِرُونَ (۵۳-۵۶)

فرعون خود اپنی تدبیر کے جال میں

چنانچہ فرعون نے سرداروں اور فوجیوں کو اکٹھا کرنے کے لیے مملکت کے تمام شہروں میں اپنے آدمی دوڑا دیے اور چونکہ قبطی حضرت موسیٰؑ کے کارناموں سے بہت مرعوب تھے اس وجہ سے ان کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا بھی زور و شور سے کیا گیا کہ اسرائیلیوں کی حیثیت ہی کیا! وہ مٹھی بھر تو ہیں لیکن ہاتھی سے گنا کھانے چلے ہیں! وہ اپنی حرکتوں سے ہمیں غصہ دلا رہے ہیں، لیکن ہم ایک بھاری جمعیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چوکس اور بیدار ہیں! ہم ہرگز ان کو اس بات کا موقع نہیں دیں گے کہ وہ ملک میں کوئی گڑبڑ پیدا کریں یا ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں!!

فَأَخْرَجْنَاهُمْ مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ (۵۷-۵۸)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تدبیر سے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے باغوں اور چشموں اور اپنے خزانوں اور دولت کدوں سے نکلیں اور اپنے تمام لاؤ لشکر اور سروسامان سمیت سمندر میں غرق ہوں۔

كَذَٰلِكَ ۖ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (۵۹)

ایک بلیغ حذف

كَذَٰلِكَ کے بعد نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی ہم مجرموں اور رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ اس حذف سے کلام میں جو زور پیدا ہو گیا ہے وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں ہے۔

ضمیر مفعول کا ایک مخصوص اسلوب

وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ میں ضمیر مفعول سے مراد بعینہٖ وہی نعمتیں نہیں ہیں جن سے قبطیوں کو اللہ تعالیٰ نے نکالا بلکہ اسی نوع کی وہ نعمتیں ہیں جو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے کے بعد سرزمین فلسطین میں حاصل ہوئیں۔ چنانچہ دوسرے مقام میں اس کی تصریح بھی ہے۔ فرمایا ہے: ...... وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ...... (الاعراف-۱۳۷) (اور وہ لوگ جو دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے تمام مشرق و مغرب کا مالک بنایا جس میں ہم نے اپنی برکتیں رکھی تھیں) اس آیت میں 'ارض مبارک' سے مراد ظاہر ہے کہ سرزمین فلسطین ہے۔ مصر سے نکلنے اور صحرا گردی کا دور ختم ہونے کے بعد ہی یہ زرخیز علاقہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں آیا ہے۔ مصر یا مملکت مصر کے کسی علاقے پر بنی اسرائیل کا قبضہ تاریخوں سے ثابت نہیں ہے۔

ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ ہم نے ضمیر کا مرجع معین کرنے میں یہاں تکلف سے کام لیا ہے۔ آیت کا ظاہر مفہوم تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن باغوں، چشموں اور خزانوں سے اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو بے دخل کیا انہی کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ اعلیٰ عربی میں ضمیریں اس طرح بھی آتی ہیں۔ اس کتاب میں ہم اس کی متعدد مثالیں ذکر کر چکے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں اس کی ایک نہایت واضح مثال موجود ہے۔ مسلمانوں کو بنی اسرائیل کے سوالات کی نوعیت کے سوالات کرنے سے ان الفاظ میں روکا گیا ہے۔

قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ (المائدۃ ۵ - ۱۰۲)	اسی طرح کے سوالات تم سے پہلے ایک قوم کے لوگوں نے کیے تو وہ ان کو نباہ نہ سکنے کے سبب سے کافر ہوئے۔

ظاہر ہے کہ یہاں ضمیر کا مرجع جن سوالات کی طرف ہے بعینہٖ وہی سوالات بنی اسرائیل نے نہیں کیے تھے بلکہ اسی قبیل کے سوالات کیے تھے۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی بعینہٖ وہی باغ، چشمے اور خزانے مراد نہیں ہیں جن کا سابق آیت میں ذکر ہے بلکہ اسی نوع کی وہ نعمتیں اور برکتیں مراد ہیں جو بنی اسرائیل کو مصر سے ہجرت کے بعد علاقۂ فلسطین میں حاصل ہوئیں۔

فَأَتْبَعُوهُم مُّشْرِقِينَ ۝ فَلَمَّا تَرَاءَى الْجَمْعَانِ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمُدْرَكُونَ ۝ قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ (۶۰ - ۶۲)

بالآخر صبح تڑکے فرعونیوں نے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ آگے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کا لشکر تو وہ بہت گھبرائے کہ اب تو ہم مارے گئے۔ تورات میں ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ کیا مصر میں ہمارے دفن ہونے کے لیے جگہ نہیں تھی کہ تم نے یہاں لا کر ہمیں مروانے کا سامان کیا! حضرت موسیٰ نے ان کو اطمینان دلایا کہ گھبراؤ نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ہمارے لیے راہ کھولے گا۔ اگرچہ آگے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کی فوجیں، بظاہر تمھیں راہ مسدود نظر آ رہی ہے لیکن میرے رب نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ تمھیں ہرگز کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ خدا اپنی قدرت کا کرشمہ دکھائے گا اور ہمارے لیے راہ کھول کر رہے گی۔ تورات میں یہ ماجرا یوں بیان ہوا ہے!

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا۔۔۔۔۔۔ اور مصری فوج نے فرعون کے سب گھوڑوں اور رتھوں اور سواروں سمیت ان کا پیچھا کیا۔۔۔۔۔۔ اور جب فرعون نزدیک آ گیا تب بنی اسرائیل نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ مصری

ان کا پیچھا کیے چلے آتے ہیں اور وہ نہایت خوف زدہ ہوگئے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی۔ اور موسیٰ سے کہنے لگے کیا مصر میں قبریں نہ تھیں کہ تو ہم کو وہاں سے مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا ہے؟ .... تب موسیٰ نے لوگوں سے کہا ڈرو مت، چپ چاپ کھڑے ہو کر خداوند کی نجات کے کام کو دیکھو جو وہ آج تمہارے لیے کرے گا کیونکہ جن مصریوں کو تم آج دیکھتے ہو ان کو پھر کبھی ابد تک نہ دیکھو گے۔ خداوند تمہاری طرف سے جنگ کرے گا اور تم خاموش رہو گے۔“

(خروج: باب ۱۴: ۵-۱۴)

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۚ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۚ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۚ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ (۶۳-۶۶)

قدرت خداوندی کا کرشمہ

یہ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کے اعتماد علی اللہ کا امتحان تھا۔ اس امتحان میں بنی اسرائیل تو اپنی روایت کے مطابق بالکل ناکام رہے لیکن حضرت موسیٰؑ سو فیصد کامیاب ہوئے۔ اس امتحان سے گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا۔ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ اپنا عصا سمندر پر مارو۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایسی ہوا چلی کہ سمندر کا پانی پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ دونوں طرف پانی کی دیوار کھڑی ہوگئی اور بیچ میں سے خشک راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر اس راستہ پر چلے۔ تدبیر الٰہی فرعونیوں کو بھی اسی مقام پر لائی اور انھوں نے بنی اسرائیل کے تعاقب میں اپنے رتھ اور گھوڑے سب ان کے پیچھے ڈال دیے۔ اس کے بعد حکم الٰہی سے وہ ہوا جس نے سمندر کے پانی کو پھاڑ کر راستہ پیدا کیا تھا رک گئی۔ حضرت موسیٰؑ تو اپنی قوم کے ساتھ بخیریت کنارے پر پہنچ گئے، ادھر سمندر کا پانی برابر ہونے لگا اور فرعونی اس کی لپیٹ میں آگئے۔ انھوں نے پیچھے بھاگنے کی کوشش کی لیکن بھاگنے کا وقت گزر چکا تھا۔ بالآخر پوری فوج غرق ہوگئی۔

تورات میں یہ ماجرا یوں بیان ہوا ہے:-

”پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہوگیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا اور مصریوں نے تعاقب کیا اور فرعون کے سب گھوڑے اور رتھ اور سوار ان کے پیچھے پیچھے سمندر کے بیچ میں چلے گئے۔ ....

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور ان کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آگیا اور مصری الٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی

میں مصریوں کو تہہ وبالا کردیا۔ خروج : باب ۲۱: ۲۷-۲۱)

آیت میں لفظ 'طَوْد' جو آیا ہے اس کے معنی پہاڑ اور تودے کے ہیں۔ تورات میں اسی مفہوم کو دیوار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے مقام عبور سے متعلق استاذ امام مولانا فراہی کی رائے علمائے اہل کتاب کی رائے سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی یہ رائے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں ظاہر فرمائی ہے اس رائے کے حق میں ان کے دلائل چونکہ میرے علم میں نہیں ہیں اس وجہ سے میں اس باب میں ابھی متردد ہوں۔ سورۂ ذاریات مجموعہ تفاسیر فراہی میں شامل ہے۔ تحقیق کے طالب اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ (۶۷-۶۸)

ترجیع

یہ سرگزشت کے آخر میں وہی ترجیع ہے جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو نشانی ہی مطلوب ہے تو اس سرگزشت کے اندر بڑا سامان عبرت موجود ہے لیکن جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ نشانیوں ہی کے مطالبے کرتے رہ جاتے ہیں۔ بڑی سے بڑی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی فرعونیوں کی طرح ان کی اکثریت کو ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے سرکشوں کو جب چاہے پکڑ سکتا ہے، وہ 'عزیز' ہے لیکن وہ ان کو توبہ و اصلاح کے لیے مہلت دیتا ہے اس لیے کہ وہ 'رحیم' بھی ہے۔

۴- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۶۹-۱۰۴

حضرت ابراہیم کی دعوت اور ان کی قوم کے ردّعمل کا بیان

آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کے ردّعمل کا ذکر ہے اور آخر میں وہی آیات ترجیع ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس سرگزشت کے سنانے سے بھی مقصود وہی ہے جو پچھلی سرگزشت کے سنانے سے ہے۔

ایک بات یہاں خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ پچھلی سورہ میں حضرت موسیٰؑ کے ذکر کے بعد حضرت نوحؑ کا ذکر آگیا تھا، بیچ کے انبیاء میں سے کسی کا ذکر نہیں آیا تھا۔ اس سورہ میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت نے اس خلا کو بھر دیا۔ اس لیے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان سب سے زیادہ جلیل القدر نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۹-۱۰۴

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ۝٦٩ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ۝٧٠ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ۝٧١ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۝٧٢ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ۝٧٣ قَالُوا

بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ
تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ
اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۷﴾ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِيْ
هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِيْ
يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ
الدِّيْنِ ﴿۸۲﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ
لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ
النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ
يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ
بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ
لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾
وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾
تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾
وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيْقٍ
حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
ع ۵ ۶ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

ترجمۂ آیات ۶۹-۱۰۴

اور ان کو ابراہیم کی سرگزشت سناؤ۔ جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھلا یہ تم لوگ کن چیزوں کی پرستش کرتے ہو! انھوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر ان کی پوجا پر جمے رہیں گے! ۶۹-۷۱

اس نے کہا، کیا یہ تمھاری سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو یا تمھیں نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں! انھوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے ہوئے پایا ہے۔ ۷۲-۷۴

اس نے کہا، کیا تم نے ان چیزوں پر غور کیا ہے جن کو تم پوجتے رہے ہو، تم بھی اور تمھارے اگلے آباء و اجداد بھی! یہ سب میرے تو دشمن ہیں، بجز اللہ رب العالمین کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہ میری رہنمائی فرماتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے اور جو مجھے موت دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور وہ جس سے میں متوقع ہوں کہ جزا کے دن میرے گناہ معاف کرے گا۔ ۷۵-۸۲

اے میرے رب! مجھے قوت فیصلہ عطا فرما اور مجھے زمرۂ صالحین میں شامل کر اور بعد والوں میں میرا نیک ذکر قائم رکھ اور مجھے باغ نعمت کے وارثوں میں سے بنا۔ اور میرے باپ کی مغفرت فرما، بے شک وہ گمراہوں میں سے تھا اور جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے اس دن مجھے رسوا نہ کیجیو۔ ۸۳-۸۷

جس دن نہ مال کام آدے گا اور نہ اولاد بس وہ فائز المرام ہوں گے جو تندرست و پاک دل لے کر حاضر ہوں گے اور جنت خدا ترسوں کے لیے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے لیے بے نقاب کی جائے گی۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے تھے وہ کہاں ہیں! کیا وہ تمھاری مدد کریں گے یا اپنا دفاع کریں گے!

پس وہ اس میں اوندھے جھونک دیے جائیں گے ، وہ بھی اور سارے گمراہ بھی اور ابلیس کے سارے لشکر بھی۔ ۸۸ - ۹۵

اور وہ اس میں باہم جھگڑتے ہوئے کہیں گے ، خدا کی قسم! ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جب کہ تم کو خداوندِ عالم کا ہمسر ٹھہراتے رہے۔ اور ہم کو تو بس مجرموں نے گمراہ کیا تو نہ اب ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی سرگرم دوست! پس ہمیں ایک مرتبہ اور لوٹنا نصیب ہو کہ ہم ایمان لانے والوں میں سے بنیں! ۹۶ - ۱۰۲

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان میں کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۰۳-۱۰۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ‎ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ‎ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ (۶۹-۷۱)

سوال بطور

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال استفہام کی نوعیت کا نہیں بلکہ استخفاف کی نوعیت کا تھا۔ یعنی یہ کیا فضول اور بے حقیقت چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو! ان کی قوم نے ان کا جواب حمیتِ جاہلیت کے پورے جوش و غرور کے ساتھ دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور تمھارے علی الرغم اسی طرح ان کو پوجتے رہیں گے، تم کتنا ہی زور لگاؤ لیکن ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ‎ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ‎ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ (۷۲-۷۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کی بے حقیقتی واضح کرنے کے لیے سوال کیا کہ جب تم ان سے دعا و فریاد کرتے ہو تو کیا یہ تمھاری دعا و فریاد سنتے ہیں یا تمھیں کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں یا پہنچا سکتے ہیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کی پرستش کرتے ہو! قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ یہ باتیں ہم نہیں جانتے۔ بس ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے پایا ہے، سو ہم اسی طرح کرتے رہیں گے۔ اپنے آباء و اجداد کے طریقے کو ہم تمھارے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے اس دور کی باتیں نقل ہو رہی ہیں۔ جب وہ تمام عقلی و نقلی اور آفاقی و انفسی دلائل سے اپنی قوم پر حجت تمام کر چکے ہیں۔ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ اس کے بعد انھوں نے قوم سے اعلان برأت کر کے ہجرت فرمائی ہے۔ اس مرحلے میں ظاہر ہے کہ نبی کی دعوت کا انداز بدل جاتا ہے اور قوم کے جواب کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے اس کی نوعیت قوم کی عقل اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی آخری کوشش کی ہوتی ہے اور قوم جو کچھ جواب دیتی ہے اس کی نوعیت آخری ضد اور ہٹ دھرمی کے مظاہرے کی۔ یہ دونوں ہی باتیں یہاں سوال و جواب سے واضح ہو رہی ہیں۔

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (۷۵-۷۷)

حضرت ابراہیمؑ کا اعلانِ برأت

'اَفَرَءَيْتُمْ' کے اسلوب میں تعجب اور اظہارِ نفرت و بیزاری کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یعنی ذرا ان چیزوں پر نگاہ تو ڈالو جن کو تمھارے باپ دادا پوجتے رہے اور جن کی پرستش پر تمھیں بھی ناز ہے۔ یہ بالکل بے حقیقت چیزیں ہیں۔ ان کے بارے میں میرا یہ فیصلہ سن لو کہ یہ ساری چیزیں میری دشمن ہیں اور میں ان سے بیزار ہوں۔ میں اللہ رب العالمین کے سوا کسی چیز کی پرستش نہیں کرتا۔ 'یہ چیزیں میری دشمن ہیں' یعنی یہ شیطان کے ایجاد کیے ہوئے پھندے ہیں اور شیطان بنی نوع انسان کا دشمن ازلی ہے جس کا اصل کام ہی یہ ہے کہ وہ خلقِ خدا کو صراطِ مستقیم سے روکے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا وہ اعلان برأت ہے جس کے بعد انھوں نے ہجرت فرمائی۔ سورۂ والصافات میں ان کا کلمہ ہجرت یوں نقل ہوا ہے: 'اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (۹۹)' (میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہ میری رہنمائی فرمائے گا) اسی ہجرت کا اعلان عنکبوت کی آیت ۲۶ میں ہے۔ پیغمبر اپنے ماحول کا نہایت خیرخواہ، دوست، مشفق اور ہمدرد ہوتا ہے لیکن جب ماحول خود اس کا دشمن بن جاتا ہے اور اس کی ہدایت کی قدر کرنے کے بجائے اس سے اپنی ضلالت کی قدر کرانا چاہتا ہے تو وہ ان کو اپنا دشمن سمجھ کر اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ان کا دشمن ہوں بلکہ یوں فرمایا کہ وہ میرے دشمن ہیں۔

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (۷۸-۸۲)

ربِ حقیقی کی صفات

اپنی قوم کے بتوں کی بے حقیقتی واضح کرنے کے بعد یہ حضرت ابراہیمؑ نے اس ربِ حقیقی کی صفات بیان فرمائی ہیں جو عبادت و اطاعت کا اصلی حق دار ہے۔

عقلی پرورش

'اَلَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ' یعنی میری عبادت کا اصلی حق دار وہ ہے جس نے مجھے

پیدا کیا اور وہ پہری رہنمائی فرماتا ہے۔ یہ بیانِ واقعہ بھی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خلق اور ہدایت میں لزومِ عقلی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں صرف پیدا ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس نے ہمارے اندر نہایت اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت فرمائیں اور پھر ہمیں ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور اجاگر کرنے کا سلیقہ عطا فرمایا۔ اس نے ہمیں نہایت اعلیٰ فطرت پر پیدا کیا اور ہمیں عقل عطا فرمائی جو حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کرنے والی اور جزئیات سے کلیات اور محسوسات سے معقولات تک پہنچنے والی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ہ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی' (الاعلیٰ: ۲-۳) (جس نے ہمارا خاکہ بنایا پھر اس کے نوک پلک سنوارے اور جس نے ہمارے اندر صلاحیتیں ودیعت فرمائیں، پھر ان کے استعمال کے لیے ہماری رہنمائی فرمائی)۔

روحانی پرورش یہ ہدایت خدا کی صفتِ خلق کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، لازمی تقاضا ہے۔ جس خدا نے اس اہتمام اور اس حکمت کے ساتھ انسان کو پیدا کیا ہے اس کی رحمت و حکمت سے یہ بات بعید تھی کہ وہ پیدا کر کے اس کو یوں ہی بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ نہ صرف ایک کارِ عبث ہوتا بلکہ یہ ایک ظلم بھی ہوتا جو اس کی شان کے منافی ہے۔ اس وجہ سے اس نے جس طرح انسان کی تمام مادّی ضروریات کا اہتمام فرمایا اسی طرح اس کی اس روحانی ضرورت کا بھی اہتمام فرمایا اور چونکہ انسان کے اصلی کمال کا انحصار اس کی اسی ضرورت کے کماحقہٗ پورے ہونے پر تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس معاملے کو تنہا اس کی عقل پر نہیں چھوڑا بلکہ اس کی ہدایت کے لیے نبوت و رسالت کا انتظام بھی فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کی سزاوار وہ ذات ہے جو ان تمام افضال و عنایات کا منبع ہے نہ کہ یہ پتھر کی مورتیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں، نہ نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان!

'وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ہ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ' روحانی و عقلی ربوبیت کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کی مادّی پرورش کی طرف توجہ دلائی کہ میرا رب وہ ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں کبھی بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہ اپنے فضل و رحمت سے مجھے شفا بخشتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرک قومیں اپنے معبودوں کو کائنات کا خالق و مالک نہیں مانتی رہی ہیں بلکہ وہ ان کو رزق و فضل کا ذریعہ سمجھتی رہی ہیں اور خاص طور پر اس وہم کو ان کے شرک میں بڑا دخل رہا ہے کہ بیماری ان کی ناراضگی سے لاحق ہوتی ہے اور شفا ان کی خوشنودی سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کے ان اوہام پر بھی ضرب لگائی کہ ان میں سے کسی چیز میں بھی ان اصنام کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ ساری چیزیں اس کائنات کے رب کے اختیار میں ہیں۔

'وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ' کا اسلوبِ بیان بھی قابلِ توجہ ہے۔ کھلانے، پلانے اور شفا دینے

کے افعال کی نسبت تو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی لیکن بیمار ہونے کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ اس کی وجہ سوءِ ادب سے احتراز بھی ہے اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ نعمتیں جس قدر بھی بندے کو ملتی ہیں وہ سب خدا کے فضل وجود سے ملتی ہیں لیکن اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بسا اوقات اس کے کسی عمل پر مترتب ہوتی ہے۔ ہر چند وہ پہنچتی تو خدا کے اذن و حکم ہی سے ہے لیکن اس میں انسان کی اپنی غفلت کو بھی دخل ہوتا ہے اس وجہ سے وہ بندے کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی پہلو کو مدِنظر رکھ کر یہاں یہ فرمایا کہ 'جب میں بیمار پڑتا ہوں' یہ نہیں فرمایا کہ 'وہ مجھے بیمار کرتا ہے'۔

پرورش، ہدایت سے روزِ جزا کی دلیل

وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ۔ یہ اس خلق و ہدایت اور اہتمام ربوبیت کے لازمی نتیجہ کی طرف توجہ دلائی کہ وہی ہے جو مجھے ایک دن موت دے گا اور پھر لازماً اس کے بعد ایک دن زندہ بھی کرے گا۔ جب اس نے مجھے پیدا کیا اور اس میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوبارہ زندہ کر دینے میں کیوں مشکل پیش آئے گی اور ایسا ہونا اس کے اس سارے اہتمام ہدایت و ربوبیت کا لازمی تقاضا بھی ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ میرے لیے ہدایت اور پرورش کا یہ اہتمام فرمائے اور پھر یہ زندگی یوں ہی تمام ہو جائے۔

وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ۔ یہ اس روزِ جزا و سزا کے ظہور کی طرف اشارہ ہے جس سے اس دنیا کی زندگی کے بعد لازماً ہر شخص کو سابقہ پیش آتا ہے، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس کے ظہور کی خبر دینے کی بجائے اپنی اس توقع کا اظہار فرمایا جو اپنے رب سے وہ اس دن کے پیش آنے پر رکھتے ہیں۔ گویا اس دن کا پیش آنا تو ایک بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے البتہ اس کے لیے ہر شخص کو تیاری کرنی چاہیے اور اپنے رب سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ جو اس سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاریں گے وہ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا۔

حالات کے تقاضے سے ایک خاص اسلوبِ کلام

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کے سامنے اپنی دعوت کے تمام مبادی رکھ دیے ہیں جن کے اندر نہایت گہرا منطقی ربط بھی ہے لیکن انھوں نے ان کو پیش کرنے میں دعویٰ اور دلیل کا اسلوب اختیار کرنے کے بجائے اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار کا انداز اختیار فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مرحلہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اعلانِ براءت و ہجرت کا تھا۔ اس مرحلے میں قوم کو مخاطب کر کے بحث و استدلال کے انداز میں کچھ کہنا بے سود تھا اس وجہ سے انھوں نے اپنے ذاتی تاثرات نہایت بلیغ انداز میں ان کے سامنے رکھ دیے کہ شاید اس طرح ان کے دل میں کوئی بات اتر جائے۔ اگر دلوں میں زندگی کی کچھ رمق ہوتی ہے تو یہ اسلوب بعض اوقات نہایت موثر ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔

رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ (۸۳-۸۴)

ہجرت کے وقت حضرت ابراہیم کی دعا

یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا ہے جو اعلانِ برارت و ہجرت کے اس نازک موقع پر انھوں نے کی ہے۔

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا 'حُكْمٌ' سے مراد، جیسا کہ آیت ۱۴ کے تحت گزر چکا ہے، وہ صحیح قوتِ فیصلہ ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کو خاص طور پر عطا ہوتی ہے۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ ایک نہایت اہم قدم اٹھا رہے تھے اور اس بات کے محتاج تھے کہ آگے کے تمام مراحل میں ان کو صحیح فیصلہ کی توفیق اور خدا کی رہنمائی حاصل ہو اس وجہ سے انھوں نے سب سے پہلے اسی کے لیے دعا فرمائی۔

'وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ' حق کی خاطر اپنے خاندان اور اپنی قوم سے بھی انھوں نے اعلانِ برارت فرما دیا تھا اس وجہ سے یہ دعا بھی فرمائی کہ ان بروں کی جگہ اچھوں کی معیت و رفاقت حاصل ہو۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

دعوت کے فروغ کے لیے حضرت ابراہیم کی دعا

وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ 'لِسَانٌ' کے معنی یہاں شہرت اور چرچا کے ہیں اور اس کی اضافت چونکہ 'صدق' کی طرف ہے اس وجہ سے اس سے مراد ذکرِ جمیل ہوگا بلکہ اس کے اندر پائیداری اور دوام و استمرار کا مفہوم بھی پیدا ہو جائے گا۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت کے فروغ و استحکام کے لیے دعا فرمائی کہ آنے والی نسلوں میں وہ پھیلے اور اس کو پائیداری نصیب ہو۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو جو قبولیت حاصل ہوئی تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال موجود نہیں ہے۔ بنی اسرائیل میں جتنے نبی و رسول آئے سب انہی کی دعوت لے کر آئے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعوت کو ایک عالمگیر اور زندۂ جاوید دعوت بنا دیا۔

وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ○ وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ○ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ (۸۵-۸۷)

آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے جنت کی اور اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔

'وَلَا تُخْزِنِي' ذیعہ باپ کے حق میں ایک نہایت مؤثر سفارش ہے۔ آدمی کے اعزہ و اقربا بالخصوص ماں باپ کی رسوائی خود اس کی رسوائی کے ہم معنی ہوتی ہے اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے باپ کی بھی مغفرت فرما کہ اس کا جہنم میں پڑنا آخرت میں میرے لیے رسوائی کا سبب نہ بنے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دعا سے اپنے باپ کا حق انتہائی دلسوزی کے ساتھ ادا کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل بالکل بے لاگ ہے۔ باپ کے حق میں ان کی دعا قبول نہیں ہوئی بلکہ بعد میں آپ کو اس کے لیے دعا کرنے سے بالکل روک دیا گیا۔

يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (۸۸-۸۹)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم کی بات کی تکمیل

یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا جزو نہیں ہے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کی تکمیل و توضیح ہے۔ فرمایا کہ اس دن کسی کے مال و اولاد اس کے کچھ کام نہیں آئیں گے، صرف وہی لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں باریاب ہوں گے جو قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ کسی کی اولاد اگر کچھ کام آنے والی بن سکتی تو اس اعتبار سے آزر سے زیادہ خوش قسمت کون تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا فرزند عطا فرمایا لیکن جب وہ بھی اپنے باپ کے کچھ کام نہ آسکے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

'قلبِ سلیم' سے مراد

'قلبِ سلیم' سے مراد شرک و نفاق کی ہر آلائش سے بالکل پاک اور محفوظ دل ہے۔ جس دل میں کسی اور کی حصہ داری یا نفاق کی بیماری ہو اس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔

وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ (۹۰-۹۱)

نیکوکاروں کی تشریف و تکریم

'اِزْلَاف' کے معنی قریب لانے کے ہیں۔ یہ نیکوکاروں کی تشریف و تکریم کی طرف اشارہ ہے کہ جنت ایک پیشکش کی طرح ان کے سامنے پیش کی جائے گی۔ اس دنیا میں انھوں نے جو نیکی کمائی اس کے صلے میں وہ ان کے لیے پہلے سے آراستہ و پیراستہ تیار ہوگی۔ اس دن انھیں اس کے لیے کوئی سفر نہیں کرنا پڑے گا بلکہ وہ خود ان کے سامنے لائی جائے گی۔ اسی طرح دوزخ بھی گمراہوں کے لیے بالکل تیار ہے۔ قیامت کے دن بس اس کا پردہ اٹھا دیا جائے گا اور جس چیز کو وہ نہایت بعید سمجھ کر اس سے بالکل نچنت رہے وہ دیکھ لیں گے کہ اس کے ظہور میں صرف پردہ اٹھنے کی دیر تھی۔

وَقِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ مِن دُونِ اللَّهِ هَلْ يَنصُرُونَكُمْ أَوْ يَنتَصِرُونَ (۹۲-۹۳)

بدکاروں کا حشر

'نَصْر' کے معنی دوسرے کی مدد کرنے اور 'اِنْتِصَار' کے معنی خود اپنی مدافعت کرنے کے ہیں۔

فرمایا کہ اس وقت دوزخ میں پڑنے والوں سے کہا جائے گا کہ تم خدا کے سوا جن کی پرستش کرتے رہے ہو، بتاؤ، اب وہ کہاں ہیں! کیا وہ تمھاری یا خود اپنی ہی کوئی مدافعت کر سکتے ہیں!

فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ ۝ وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ (۹۴-۹۵)

'کَبّ' کے معنی منہ کے بل گرانے اور پچھاڑنے کے ہیں۔ اسی سے 'کَبْکَبَ' ہے جس کے اندر حرف کی زیادتی نے مبالغہ کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ یعنی اس تفضیح کے بعد وہ اور ان کے سارے اصنام و الٰہہ اور ان کے وہ لیڈر جن کی انھوں نے پیروی کی اور ابلیس کا سارا لشکر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

قَالُوا وَهُمْ فِيهَا يَخْتَصِمُونَ ۝ تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۹۶-۹۸)

لیڈروں اور پیروؤں ...

'اِخْتِصَام' کے معنی آپس میں لڑنے جھگڑنے کے ہیں۔ یہ جھگڑا جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات

میں تصریح ہے اکفر و شرک کے علمبردار لیڈروں اور ان کے پیروؤں میں ہو گا۔ پیرو لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم نے تمھاری پیروی میں یہ روزِ بد دیکھا تو کیا آج تم ہمارے اس عذاب میں کچھ حصہ بٹاؤ گے؟ لیڈر جواب دیں گے کہ ہم جیسے خود تھے ویسا ہی ہم نے تم کو بنایا، تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی! اسی جھگڑے کی طرف اجمال کے ساتھ یہاں اشارہ فرمایا ہے کہ پیرو اپنے سر پیٹیں گے اور اپنے لیڈروں سے قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم کھلی ہوئی گمراہی میں رہے کہ ہم نے تم کو خداوندِ عالم کا ہمسر ٹھہرایا۔ 'اِذْ نُسَوِّیْکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کی تفسیر ابن کثیرؒ نے ان الفاظ میں کی ہے: ای نجعل امرکم مطاعا کما یطاع امر رب العلمین (یعنی ہم تمھارے احکام کی اس طرح اطاعت کرتے رہے جس طرح خداوندِ عالم کے احکام کی اطاعت کرنی چاہیے تھی) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین جن ہستیوں کی پرستش کرتے تھے، خواہ وہ فرشتے ہوں یا جنات، وہ تو محض ان کی مفروضہ خیالی ہستیاں تھیں اس وجہ سے ان سے کسی سوال و جواب کا معاملہ خارج از بحث ہے۔ قیامت کے دن ان کے پرستاروں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ محض ان کے اپنے رکھے ہوئے نام تھے جن کا کوئی مسمّیٰ موجود نہیں ہے۔ البتہ جن لوگوں نے ان کی پرستش کی بنا ڈالی، جنھوں نے لوگوں کو خدا کی بندگی سے ہٹا کر ان کی طرف موڑا اور ان کی حمیت و حمایت میں خدا کے رسولوں کی تکذیب کی، وہ لوگ موجود ہوں گے۔ ان کو مخاطب کر کے ان کے پیرو وہ بات کہیں گے جو اوپر مذکور ہوئی۔

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ۝ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۹۹-۱۰۲)

پیروؤں کا اپنی بدبختی پر ماتم

اوپر والی بات تو پیرو اپنے لیڈروں کو مخاطب کر کے کہیں گے اور یہ باتیں وہ نہایت حسرت و ندامت کے ساتھ خود اپنے آپ کو ملامت اور اپنی بدبختی پر ماتم کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہمیں ان مجرموں ہی نے گمراہ کیا۔ اگر یہ نہ گمراہ کرتے تو ہم ہدایت پر ہوتے اور یہ روزِ بد نہ دیکھتے۔ قرینہ دلیل ہے کہ لفظ 'مُجْرِمُوْنَ' وہ اپنے لیڈروں کے لیے استعمال کریں گے۔

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ۔ یہ اظہارِ حسرت کے الفاظ ہیں یعنی جن کی شفاعت کی امید پر زندگی بھر ان کی پرستش کی وہ بھی سب ہوا ہو گئے اور جن کا عمر بھر جھنڈا اٹھائے پھرے ان میں سے بھی آج کوئی ہماری حمایت و مدافعت کے لیے نظر نہیں آتا!

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً الاٰیۃ۔ یہ وہ اپنی تمنا کا اظہار کریں گے کہ کاش ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا کہ ہم ان مجرموں سے اظہارِ براءت کرتے اور ایمان لانے والوں میں سے بنتے۔ لیکن ان کی یہ تمنا بس تمنا ہی رہے گی۔ اس کے پورے ہونے کا وقت ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل چکا ہو گا۔ ان آیات میں آبا و اجداد اور اپنے لیڈروں کی اندھی تقلید پر چلنے والوں کو اچھی طرح متنبہ کر دیا گیا ہے

کہ قیامت کے دن کسی کے لیے یہ عذر کچھ نافع نہیں ہو گا کہ اس کو دوسروں نے گمراہ کیا اس وجہ سے وہ گمراہی میں پڑا بلکہ ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۱۰۳-۱۰۴)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اس کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔

۶- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۵-۱۲۲

حضرت نوحؑ کی دعوت کا بیان

آگے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت، ان کی قوم کی طرف سے ان کی تکذیب اور اس کے نتیجہ میں قوم پر عذاب کا نزول اور آخر میں انہی آیات کی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۰۵-۱۲۲

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۣ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٠٥﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿١٠٦﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٠٨﴾
وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١١٠﴾ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ
اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿١١١﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٢﴾
اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰي رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٤﴾
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٥﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ
مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿١١٦﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ
بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾
فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿١١٩﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا
بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٢﴾

النصف

ع ۶/۱۸/۱۰

ترجمۂ آیات ۱۰۵-۱۲۲

نوح کی قوم نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان کو آگاہ کیا، کیا تم لوگ ڈرتے نہیں! میں تمھارے لیے ایک معتبر رسول ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں اس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو عالم کے خداوند کے ذمہ ہے تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ انھوں نے جواب دیا، کیا ہم تمھیں مان لیں اور حال یہ ہے کہ تمھاری پیروی رذیلوں نے کی ہے! اس نے کہا، مجھے اس کی کیا خبر جو وہ کرتے رہے ہیں؛ ان کا حساب کرنا تو میرے رب ہی کا کام ہے، اگر تم سمجھو! اور میں مومنوں کو تو دھتکارنے والا ہوں نہیں، میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۱۰۵ - ۱۱۵

انھوں نے کہا، اے نوحؑ! اگر تم باز نہ رہے تو تم سنگسار ہو کر رہو گے۔ ۱۱۶

اس نے دعا کی، اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا تو میرے اور ان کے درمیان بالکل واضح فیصلہ فرما دے اور مجھ کو اور میرے ساتھ جو اہلِ ایمان ہیں ان کو نجات دے تو ہم نے اس کو اور اس کے ساتھ والوں کو بھری کشتی میں نجات دی۔ پھر اس کے بعد باقیوں کو ہم نے غرق کر دیا۔ ۱۱۷ - ۱۲۰

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے۔ اور ان کے اندر کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۲۱ - ۱۲۲

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ (۱۰۵)

قوم نوحؑ نے تکذیب اگرچہ ایک ہی رسول ـــــ حضرت نوحؑ ـــــ کی کی تھی لیکن لفظ 'مُرْسَلِين'

جمع استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ ردّ و قبول کے معاملے میں اصل اعتبار درحقیقت رد یا قبول کرنے والوں کی ذہنیت کا ہوتا ہے۔ جب تمام نبیوں کی دعوت وہی رہی ہے جو حضرت نوحؑ نے دی تو جن لوگوں نے ان کی دعوت رد کر دی انھوں نے گویا ہر نبی و رسول کی دعوت رد کر دی۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح تمام انبیاء کی دعوت یکساں رہی ہے اسی طرح ان کی تکذیب کرنے والوں کی ذہنیت بھی ہمیشہ یکساں رہی ہے۔ اور پھر اس کا انجام بھی ہمیشہ ایک ہی ہوا ہے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں یہ سرگزشت بیان ہوئی ہے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکذبین اس سے سبق حاصل کریں۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ (۱۰۶-۱۰۷)

رسول امین

'أَلَا تَتَّقُونَ' میں دعوت بانداز انذار و تنبیہ ہے اور 'رَسُولٌ أَمِينٌ' میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ میں کوئی مفتری اور جھوٹا مدعی نہیں ہوں، جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے، بلکہ خدا کا رسول ہوں اور پوری دیانت و امانت کے ساتھ تمھیں وہی باتیں پہنچا رہا ہوں جن کے پہنچانے کا مجھے حکم ہوا ہے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۱۰۸)

تم سلامتی چاہتے ہو تو اپنی اس ضد اور سرکشی کو چھوڑو اور اللہ کی پکڑ سے ڈرو جس کا راستہ یہ ہے کہ میری بات سنو اور مانو اور ان سرکشوں کی پیروی سے باز آؤ جو تمھیں ہلاکت کی راہ دکھا رہے ہیں۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۱۰۹-۱۱۰)

حقیقت پر غور کرنے کی ترغیب اور اظہار بے نیازی

اس فقرے میں مخاطبوں کو حقیقت پر غور کرنے کے لیے ترغیب بھی ہے اور ساتھ ہی بے نیازی کا اظہار بھی۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ جو کچھ تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں محض تمھاری خیر خواہی کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں اس پر تم سے کسی صلے اور معاوضے کا طالب نہیں ہوں کہ تم اس سے گھبرا کر میری باتیں سننے سے گریز کرو۔ اگر تم میری باتیں سنو اور مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔ میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے اور وہ مجھے اس سے محروم نہ فرمائے گا۔ خواہ تم میری بات مانو یا نہ مانو۔ تو میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ اللہ کے غضب سے ڈرو اور میری مانو!

قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ (۱۱۱)

خوئے بد را بہانہ بسیار

حضرت نوحؑ کی اس مخلصانہ اور دردمندانہ نصیحت کا جواب قوم کے متکبرین نے یہ دیا کہ تمھاری پیروی تو ہماری قوم کے اراذل و انفار نے کی ہے تو ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اعیان و اشراف ہو کر ان کے پہلو بہ پہلو تمھاری مجلس میں بیٹھیں۔ مطلب یہ کہ اگر ہمیں اپنے قریب لانا چاہتے ہو تو پہلے ان لوگوں کو اپنے سے دور کرو۔ قوم کا یہ معارضہ اس بات کی دلیل ہے کہ جہاں تک حضرت نوحؑ کی دعوت کا تعلق ہے اس کی تردید کے لیے ان متمردین کے پاس کوئی بات باقی نہیں رہی تھی لیکن وہ کسی صورت میں اپنی شکست

ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے انھوں نے اپنی رعونت کی تسکین کے لیے آخر میں یہ بہانہ ڈھونڈ لیا کہ حضرت نوحؑ کے ساتھی غریب اور پست حال لوگ ہیں تو ہم ان کے ساتھی کس طرح بن سکتے ہیں! خوئے بدرا بہانہ بسیار!

قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي لَوْ تَشْعُرُونَ ۝ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۱۱۲-۱۱۵)

شرافت و رذالت کا انحصار آدمی کے اعمال پر ہے

حضرت نوحؑ نے ان کے اس معارضے کا جواب دیا اور سبحان اللہ، کتنا بلیغ جواب دیا! فرمایا کہ مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ شرافت و رذالت کا انحصار تو آدمی کے عمل و کردار پر ہے نہ کہ نسب و خاندان اور مال و جائداد پر، تو مجھے کیا معلوم کہ اب تک ان کا عمل کیا رہا ہے؟ ان کے ماضی کا احتساب میرے رب کے ذمہ ہے۔ میرے سامنے تو ان کا حاضر ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے رب پر ایمان لائے اور اس سے ڈرنے والے ہیں۔

لَوْ تَشْعُرُونَ۔ یعنی اگر اس حقیقت کا احساس تمھیں بھی ہوتا تو تم بھی وہی کہتے جو میں کہہ رہا ہوں لیکن تمھارے ذہنوں میں یہ غلط احساس سمایا ہوا ہے کہ شرافت و رذالت کا انحصار مال و دولت پر ہے۔ اس وجہ سے ان کی غریبی تمھارے لیے قبولِ حق میں حجاب بن گئی ہے۔

وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ۔ مطلب یہ کہ اگر تم اپنے ایمان کی شرط یہ ٹھہراتے ہو کہ میں ان مومنوں کو اپنے پاس سے دھتکار دوں تو یہ تو میں کرنے سے رہا۔ اگر تم اس چیز کے سبب سے ایمان نہیں لاتے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میں صرف ایک نذیر مبین ہوں۔ میں نے اپنا فرض انذار ادا کر دیا۔ اب جو ایمان نہیں لائے گا، اس کی مسئولیت خود اس پر ہے۔ اس کے باب میں مجھ سے کوئی پرسش نہیں ہوگی۔

قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ (۱۱۶)

قوم کی آخری دھمکی

بحث کے میدان میں پسپا ہو جانے کے بعد حضرت نوحؑ کی قوم نے ان کو یہ آخری دھمکی دی کہ اگر تم اپنی اس دعوت سے باز نہ آئے تو یاد رکھو کہ بالآخر ہم تم سے جان چھڑانے کے لیے تم کو سنگسار کر کے رہیں گے۔ الفاظ سے یہ بات صاف نکل رہی ہے کہ سنگسار کرنے کی دھمکی وہ پہلے بھی دیتے رہے تھے۔ لیکن حضرت نوحؑ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی بالآخر قوم نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا کہ ہماری دھمکی کو صرف دھمکی نہ خیال کرو ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں کر گزریں گے۔

قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۱۱۷-۱۱۸)

حضرت نوحؑ کی دعا فتح و نصرت کے لیے

قوم کے اس فیصلہ کن اعلان کے بعد جب حضرت نوحؑ اس کے ایمان لانے سے بالکل مایوس ہو گئے

تب انھوں نے، رسولوں کی معروف سنت کے مطابق، اپنے رب سے دعا کی، اے میرے رب! میری قوم نے میری تکذیب کر دی تو اب تو میرے اور اس کے درمیان آخری فیصلہ فرما دے اور مجھ کو اور میرے ساتھ جو اہلِ ایمان ہیں ان کو نجات دے۔ 'فتحاً' کی تاکید سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت نوحؑ نے یہ دعا اس فتح و نصرت کے ظہور کے لیے فرمائی ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کی قوم کی ہلاکت اور رسول اور اس کے ساتھیوں کی نجات کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ فِی الۡفُلۡكِ الۡمَشۡحُوۡنِ ۝ ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا بَعۡدُ الۡبٰقِیۡنَ (۱۱۹-۱۲۰)

تیر بہدف دعا — حضرت نوحؑ کی یہ دعا بالکل صحیح وقت پر زبان سے نکلی اس وجہ سے تیر بہدف ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کو جس عذاب کی دھمکی دی تھی وہ طوفان کی شکل میں نمودار ہوا جس نے ساری قوم کو غرق کر دیا، صرف حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھی اس سے محفوظ رہے۔

'اَلۡفُلۡكِ الۡمَشۡحُوۡنِ'۔ 'شحن' کے معنی کسی چیز کو پُر کرنے کے ہیں۔ یہاں کشتی کے لیے اس صفت کے ذکر سے مقصود بالاجمال ان چیزوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جن کو کشتی میں رکھنے کی حضرت نوحؑ کو ہدایت ہوئی تھی اور جن کی تفصیل دوسرے مقامات میں گزر چکی ہے۔ یہ کشتی خاص اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان ساری چیزوں کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی جن کو طوفان سے بچانا مقصود تھا۔ چنانچہ وہ چیزیں اس میں بھر لی گئیں، باقی ساری چیزیں غرق ہونے کے لیے چھوڑ دی گئیں۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ (۱۲۱-۱۲۲)

ترجیع — یہ آخر میں وہی ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو تاریخ کی اس سرگزشت میں بہت بڑی نشانی موجود ہے لیکن یہ ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ یہ ایمان نہ لانے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور ان کی اکثریت کوئی بڑی سے بڑی نشانی دیکھ کر بھی ایمان لانے والی نہیں ہے۔ تمھارا رب جب چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے، وہ ہر چیز پر غالب ہے لیکن وہ ان کو اس لیے مہلت دے رہا ہے کہ وہ عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ رحیم بھی ہے۔

۸- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۲۳-۱۴۰

حضرت ہودؑ کی دعوت کا بیان — یاد ہوگا، سابق سورہ میں دو جلیل القدر نبیوں ـــ حضرت موسیٰؑ اور حضرت نوحؑ ـــ کا ذکر کر کے درمیان کی قوموں کا ذکر صرف ان کا اجمالی حوالہ دے کر چھوڑ دیا تھا۔ اس سورہ میں آگے ان اقوام کے حالات کی تفصیل آرہی ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور بالآخر وہ کس انجام کو پہنچیں۔ ترتیب بیان بالکل تاریخی ہے اور ہر سرگزشت کے خاتمہ پر انھیں آیات کی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہیں۔ سب سے پہلے قوم عاد کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

آیات ۱۲۳-۱۴۰

كَذَّبَتْ عَادُ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿۱۲۳﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا
تَتَّقُونَ ﴿۱۲۴﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۲۶﴾
وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۲۷﴾
أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ
تَخْلُدُونَ ﴿۱۲۹﴾ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا
اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۳۱﴾ وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۳۲﴾
أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۱۳۴﴾ إِنِّي أَخَافُ
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ
لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ ﴿۱۳۶﴾ إِنْ هَٰذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۳۷﴾
وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۹﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ
ع ۱۸/۱۱ الرَّحِيمُ ﴿۱۴۰﴾

ترجمۂ آیات قوم عاد نے رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان کو آگاہ کیا کہ
۱۲۳-۱۴۰ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں! میں تمھارے لیے ایک رسول امین ہوں۔ تو اللہ سے ڈرو اور
میری بات مانو! اور میں اس پر تم سے کسی صلے کا طالب تو ہوں نہیں، میرا اجر تو بس عالم
کے رب کے ذمہ ہے۔ ۱۲۳-۱۲۷

کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے رہو گے اور شاندار محل بناتے رہو گے
گویا تمھیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ اور جب بھی تم کسی پر حملہ آور ہوتے ہو تو جبارانہ حملہ آور

ہوتے ہو۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمھیں مدد پہنچائی جن کو تم جانتے ہو۔ اس نے تمھاری مدد کی چوپایوں اور اولاد سے اور باغوں اور چشموں سے۔ بے شک میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ ۱۲۸-۱۳۵

انھوں نے جواب دیا، ہمارے لیے یکساں ہے، خواہ تم نصیحت کرو یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ یہ بات تو بس اگلوں سے چلی آرہی ہے اور ہم پر ہرگز عذاب آنے والا نہیں ہے۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا پس ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ بےشک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تمھارا رب وہ غالب اور مہربان ہے۔ ۱۳۶-۱۴۰

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِيْنَ ۚ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۚ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (۱۲۳-۱۲۶)

تمام رسولوں کی ملت ایک ہے اس وجہ سے ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے

'مُرْسَلِيْنَ' کے جمع لانے کی وجہ آیت ۱۰۵ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ کسی ایک رسول کی تکذیب درحقیقت تمام رسولوں کی تکذیب ہے۔ اسی بنیاد پر قرآن نے اہل کتاب کے دعوائے ایمان کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنے والا قرار دیا۔ تمام رسولوں کی دعوت اور ان کی ملت ایک ہے اس وجہ سے ان میں سے کسی ایک کو جھٹلانے والا سب کو جھٹلانے والا ہے۔

'اَخُوْهُمْ هُوْدٌ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام ان کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں تھے جس کے ماضی و حاضر سے وہ ناواقف ہوں بلکہ انہی کے بھائی بند اور انہی کے اندر وہ پلے بڑھے تھے۔ جس شخص کی پوری زندگی ان کے سامنے ہو اور اس میں کہیں حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہو، اگر اس کو انھوں نے جھوٹا اور مفتری قرار دیا تو اس کو ان کی شامت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے!

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۲۷)

بدکنے والوں کو ملامت

اس آیت کے اندر جو پہلو ترغیب و تودیع کے ہیں ان کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ مزید برآں اس میں ان بدکنے والوں کو ملامت بھی ہے جو حضرت ہودؑ کی بات سننے کے لیے کسی طرح تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ فرمایا کہ خدا کے بندو، میری بات سنو تو سہی، میں نے اس پر کوئی ٹکٹ تو نہیں لگا رکھا ہے جو تم پر گراں گزر رہا ہے، میرا اجر تو میرے رب کے ذمہ ہے، میں تم سے اس پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں میں تو تمھیں یہ بالکل مفت دے رہا ہوں۔

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (۱۲۸-۱۲۹)

'رِیْع' اس بلند زمین کو کہتے ہیں جو دور سے نظر آئے۔

'اٰیَۃ' یہاں نشانی اور یادگار کے مفہوم میں ہے۔

'مَصَانِعُ' قلعوں اور گڑھیوں کے لیے بھی آتا ہے اور محلوں اور ایوانوں کے لیے بھی۔

'لَعَلَّکُمْ' فصیح عربی میں 'کَاَنَّکُمْ' یعنی 'گویا کہ' کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔

فسادِ تمدن پر تنبیہ

یہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس کے فاسد تمدن پر متنبہ فرمایا کہ مکانوں اور عمارتوں کی تعمیر ضرورت کے لیے ہے نہ کہ محض نمائش اور تفاخر و تنافس کے لیے۔ تمہارا حال یہ ہے کہ شوقِ تعمیر کا جنون اس طرح تم پر مستولی ہے کہ تمھارا ہر دولت مند اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ ہر بلند اور خوش منظر جگہ پر اس کی دولت و ثروت کی کوئی یادگار اور اس کے قیام و تفریح کے لیے کوئی کوٹھی اور بنگلہ بن جائے۔ اور یہ کام کسی واقعی انفرادی یا اجتماعی ضرورت کو سامنے رکھ کر نہیں ہو رہا ہے بلکہ بالکل عبث محض نمائش اور تفاخر کے لیے ہو رہا ہے۔ اور اس میں تمھارے انہماک کا یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ تم نے گزرگاہ کو منزل سمجھ کر یہیں ڈیرے ڈال دیے ہیں اور تمھاری ساری توجہ اسی کی تعمیر و ترقی پر مرکوز ہے۔ کسی کو ہوش ہی نہیں کہ اصل منزل آگے ہے اور اس کے لیے بھی کوئی تیاری ضروری ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کے اعیان و امراء کو خطاب کر کے فرمائی ہے۔ جب آخرت کو نظر انداز کر کے صرف دنیا مطلوب بنتی ہے تو تمدن کا مزاج بالکل فاسد ہو جاتا ہے۔ جن کے پاس وسائل و ذرائع ہوتے ہیں وہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کوٹھی کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی قابلِ ذکر جگہ ایسی نہ رہ جائے جہاں ان کی کوئی شاندار یادگار تعمیر نہ ہو جائے۔ دوسری طرف حال یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں غرباء کے پاس سر چھپانے کے لیے جھونپڑے بھی نہیں ہوتے اور ان میں سے کتنے انھی شاندار کوٹھیوں کے سامنے فٹ پاتھوں پر سردی سے ٹھٹھر کر یا لو سے جھلس کر مر جاتے ہیں۔
تمدن کا یہ فسادِ اول تو اس بات کا نتیجہ ہے کہ حاجیات و ضروریات سے پہلے لوگ کمالیات و تعیشات

کے میدان میں مقابلہ شروع کر دیتے ہیں اور دوسرا سبب اس کا آخرت فراموشی ہے۔ حضرت ہودؑ نے یہاں فساد کے ان دونوں اسباب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ پہلے سبب کی طرف لفظ 'تَعْبَثُوْنَ' اشارہ کر رہا ہے اور دوسرے سبب کی طرف 'لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ'۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ہودؑ کی یہ تشخیص اگرچہ اپنی قوم کے تمدن سے متعلق ہے لیکن یہ ٹھیک ٹھیک ہماری قوم کے تمدن پر بھی منطبق ہو رہی ہے۔ یہاں ان اشارات پر کفایت فرمائیے۔ إِنْ شَاءَ اللّٰہ سورۂ نمل کی تفسیر میں ہم صالح اور فاسد تمدن پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (۱۳۰)

فساد فی الارض پر تنبیہ

اوپر کی آیت میں قوم کے داخلی فسادِ مزاج کی طرف اشارہ تھا۔ یہ ان کے خارجی فساد فی الارض کی طرف اشارہ ہے۔ جنگ اگر محض اپنی قوت و صولت کے مظاہرے اور دوسروں کو مغلوب و محکوم بنانے کے لیے ہو تو یہ فساد فی الارض ہے۔ یہ جائز صرف اس صورت میں ہے جب یہ کسی شر و فساد کے مٹانے کے لیے ہو۔ اس صورت میں بلا شبہ یہ ایک بہت بڑی نیکی بلکہ خدا کی عبادت بن جاتی ہے۔ صالحین کے ہاتھوں دنیا میں جو جہاد ہوئے ہیں وہ ہمیشہ یا تو مدافعت میں ہوئے ہیں یا استیصالِ فتنہ کے لیے اور یہ دونوں صورتیں حمایتِ حق اور اعلائے کلمۃ اللّٰہ کی ہیں۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کو اس برائی سے بھی روکنے کی کوشش کی۔ فرمایا کہ تمھاری جنگیں سب جبارانہ ہیں۔ تم دوسروں کو اپنا غلام و محکوم بنانے کے لیے خدا کی زمین میں خونریزی کرتے ہو جو فساد فی الارض ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝
وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۳۱-۱۳۵)

'فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ' یہ بات تقریباً ہر رسول سے قرآن میں منقول ہوئی ہے۔ یہ نہایت دلسوزی و دردمندی کے ساتھ قوم کو گویا آخری مرحلے میں تذکیر و تنبیہ ہے کہ اب بھی وقت گزرا نہیں ہے اللّٰہ سے ڈرو۔ اپنی اس غلط روش سے باز آ جاؤ اور اپنے مفسد لیڈروں کی پیروی کرنے کے بجائے میری بات مانو۔

انعام کے اندر استدراج کا پہلو

'وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ' یہ حضرت ہودؑ نے قوم کو خدا کے جلال و جبروت کے بجائے اس کے انعامات کے حوالہ سے ڈرایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مال و اولاد اور باغوں اور چشموں کی جو نعمتیں خدا نے تمھیں دے رکھی ہیں ان کو بتانے اور گنانے کی ضرورت نہیں ہے، تم خود اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے ہو۔ یہ نعمتیں جس نے دی ہیں اس لیے نہیں دی ہیں کہ تم آخرت کو پس پشت ڈال کر اور سرکش و جبار بن کر زمین میں پھیلو بلکہ اس لیے دی ہیں کہ اس کے شکر گزار اور فرماں بردار بن کر زندگی بسر کرو ورنہ یاد رکھو کہ ایک ہولناک دن کا عذاب تم پر منڈلا ہی رہا ہے۔ اس عذاب سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً قوم پر آیا ہے۔

جن کے اندر خدا کی معرفت ہوتی ہے وہ اس کے ابتلاء سے زیادہ اس کے انعام کی صورت میں اس سے ڈرتے ہیں کہ مبادا اس انعام کا حق ادا نہ ہو سکے اور یہ انعام استدراج کی صورت اختیار کر لے لیکن خدا کے اس بھید کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ (۱۳۶)

قساوتِ قلب کی آخری حد

حضرت ہودؑ کی اس ساری دلسوزی و دردمندی اور اس تمام تذکیر و تنبیہ کا جواب قوم نے نہایت تحقیر و استہزاء کے ساتھ یہ دیا کہ آپ ہمیں نصیحت فرمائیں یا نہ فرمائیں، ہمارے لیے دونوں یکساں ہے۔ ہم بہرحال آپ کی بات ماننے والے نہیں ہیں۔ 'اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ' کے الفاظ پر اچھی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر ایک مخفی قسم کا طنز بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ماننا تو الگ رہا ہماری نگاہوں میں تو آپ کی اس بے قراری و بے چینی کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے جو ہمارے مستقبل سے متعلق آپ ظاہر کرتے ہیں۔ ہم تو اس کو محض ایک خبط و جنون سمجھتے ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ بسا اوقات آدمی اپنے کسی ناصح مشفق کی نصیحت قبول کرنے سے گریز بھی کرتا ہے تو کم از کم اس کے دل میں ناصح کی ہمدردی و خیر خواہی کی قدر ہوتی ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ میں اس کی نصیحت قبول کر سکوں یا نہ کر سکوں لیکن یہ مجھے نصیحت کرتا رہے۔ لیکن یہ دل کی قساوت کی آخری حد ہے کہ آدمی نہ صرف یہ کہ ناصح کی بات قبول نہ کرے بلکہ اس کی ہمدردی اور دل سوزی کو بھی ٹھکرا دے۔ حضرت ہودؑ کی قوم نے یہی روش اختیار کی۔ جب انھوں نے نہایت دل سوزی کے ساتھ فرمایا کہ میں اپنی باتوں کی تم سے کوئی قیمت تو مانگ نہیں رہا ہوں، کم از کم میری بات سنو تو سہی! قوم نے ان کی اس دردمندانہ التجا کا یہ جواب دیا کہ آپ اپنے گھر بیٹھو، ہمیں آپ کی ان نصیحتوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۱۳۷ - ۱۳۸)

'خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ' وہ روایت جو پہلوں سے چلی آ رہی ہے۔

یعنی عذاب کا جو ڈراوا تم ہمیں سنا رہے ہو، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے بھی اس قسم کے ڈراوے سنائے جاتے رہے ہیں لیکن یہ محض ڈراوے تھے۔ نہ پہلے عذاب آیا نہ اب ہم پر کوئی عذاب آنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے جیسے وہمی لوگ اس قسم کی باتیں پہلے بھی کرتے رہے ہیں۔ ہم اس قسم کے فرضی اندیشوں میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ مضمون سورۂ مومنون: ۸۳ میں بھی گزر چکا ہے اور آگے سورۂ نمل آیت ۶۸ میں بدیں الفاظ آیا ہے۔ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (اس کی دھمکی ہمیں بھی سنائی جا رہی ہے اور اس سے پہلے ہمارے آبا و اجداد کو بھی سنائی جا چکی ہے۔ یہ محض اگلوں کے فسانے ہیں)

یہ امر ملحوظ رہے کہ اس دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسے خلا کا نہیں گزرا ہے جس میں غافلوں کو جھنجھوڑنے

والوں نے عذاب اور قیامت سے لوگوں کو نہ ڈرایا ہو لیکن غافلوں نے ہمیشہ وہی روش اختیار کی جو قوم ہود نے اختیار کی۔ قیامت کو انھوں نے اس لیے افسانہ قرار دیا کہ اس کا ذکر تو چلا آ رہا ہے لیکن وہ آتی نہیں۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ نہ وہ آتی ہے، نہ آئے گی بلکہ یہ محض وہمیوں کا پھیلایا ہوا افسانہ ہے۔

اسی طرح قوموں پر جو عذاب آئے ان کی یاد دہانی بھی بالکل بے اثر رہی۔ وقت کے دانشوروں نے ان کی توجیہ یہ کرلی کہ اس طرح کے نرم و گرم دن تو قوموں کی زندگی میں پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ان کو ہمارے عقائد و اعمال سے کیا تعلق!

فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنٰهُمْ ۗ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۗ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۱۳۹ - ۱۴۰)

فرمایا کہ اس طرح انھوں نے ہود علیہ السلام کو جھٹلا دیا جس کے بعد ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد وہی آیات ترجیع ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے مخاطبوں کے لیے تہدید و وعید ہے کہ اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو تاریخ کی اس سرگزشت میں بہت بڑی نشانی موجود ہے۔ لیکن یہ لوگ ایمان نہ لانے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں اور جو لوگ بہانے ڈھونڈتے ہیں سنتِ الٰہی کے مطابق ایک وقت خاص تک بہرحال ان کو بھی مہلت ملتی ہے لیکن وہ خدائے عزیز کی پکڑ سے کہاں بھاگ کر جا سکیں گے!

۱۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۴۱-۱۵۹

حضرت صالحؑ کی دعوت کا بیان

آگے قوم ثمود اور ان کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کی سرگزشت ہے اور آخر میں انہی آیات کی ترجیع ہے جن کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں جو یکسانی رہی ہے وہ بھی اس سے واضح ہے اور ان کی قوموں کے رویے اور ان کے انجام میں جو یک رنگی رہی ہے وہ بھی اس سے نمایاں ہے۔ اب بعینہٖ اسی روش کا مظاہرہ اپنے رسول کے ساتھ قریش کر رہے تھے تو آخر ان کا انجام اس سے مختلف کیوں ہوتا جو ان کے دوسرے پیشروؤں کا ہوا ـــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۴۱-۱۵۹

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝۱۴۱ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صٰلِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝۱۴۲ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝۱۴۳ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ۝۱۴۴ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾
وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ
بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ
الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾
قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ
فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ
لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ
فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾
فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
ع ۱۹ ۱۲ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾

ترجمۂ آیات ۱۴۱-۱۵۹ ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی صالحؑ نے ان کو متنبہ کیا کہ کیا تم لوگ خدا سے ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے خدا کا ایک امانت دار رسول ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں تم سے اس پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو بس عالم کے رب ہی کے ذمہ ہے۔ ۱۴۱-۱۴۵

کیا تم انہی نعمتوں میں جن میں یہاں ہو، ہر خطرے سے محفوظ، چھوڑے رکھے جاؤ گے! باغوں اور چشموں میں! کھیتیوں اور گتھم گتھا خوشوں والے کھجوروں کے باغوں میں! اور پہاڑوں میں تراش تراش کر خوش خوش گھر بناتے رہو گے! تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو اور حد سے گزر جانے والوں کی بات نہ مانو، جو ملک میں فساد

برپا کر رہے ہیں اور اصلاح نہیں کر رہے ہیں۔ ۱۴۶-۱۵۲

وہ بولے کہ تم تو بس ایک سحر زدہ معلوم ہوتے ہو۔ تم تو بس ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ تو تم کوئی نشانی لاؤ، اگر تم سچے ہو۔ ۱۵۳-۱۵۴

اس نے کہا، یہ ایک اونٹنی ہے۔ ایک دن پانی پینے کی باری اس کی ہے اور ایک معین دن کی باری تمھارے لیے ہے۔ اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچائیو ورنہ تم کو ایک ہولناک دن کا عذاب آ پکڑے گا۔ پس انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو انھیں پچھتانا پڑا۔ بالآخر ان کو عذاب نے آ دبوچا۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۵۵-۱۵۹

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (۱۴۱-۱۴۴)

قوم کی تہمت کا جواب اور بدعمل لیڈروں کی پیروی سے احتراز کی ہدایت

بعینہٖ یہی آیات اوپر والی سرگزشت میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت ہو چکی ہے۔ حضرت صالحؑ کا یہ ارشاد کہ میں ایک رسول امین ہوں جواب ہے قوم کی اس تہمت کا کہ انھوں نے خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ بالکل جھوٹ موٹ کیا ہے اور عذاب کا ڈراوا محض دھونس جمانے کے لیے سنا رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں کوئی جھوٹا مدعی اور مفتری نہیں ہوں بلکہ خدا کا رسول ہوں اور بے کم و کاست، پوری امانت داری کے ساتھ، تمھیں وہی سنا رہا ہوں جس کے سنانے کے لیے بھیجنے والے نے مجھے بھیجا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ میں یہ تنبیہ ہے کہ اپنے گمراہ کرنے والے لیڈروں کے چکمے میں نہ آؤ۔ اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو ورنہ یاد رکھو کہ وہ روزِ بد دور نہیں ہے جس کی تمھیں خبر دے رہا ہوں۔

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۴۵)

بے نیازی خدمتِ خلق کے لیے ایک لازمی شرط ہے

اس میں ترغیب و تودیع اور اظہارِ بے نیازی کے جو مختلف پہلو ہیں ان کی طرف پیچھے اشارہ

ہو چکا ہے۔ بے نیازی خدمتِ خلق کے لیے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ لوگوں کی زبانیں بند کر دینا کسی کے بس میں نہیں ہے لیکن حضراتِ انبیاء علیہم السلام نے برملا اس امر کا اعلان فرمایا کہ ہم تم سے کچھ مانگنے کے لیے نہیں بلکہ تمھیں دینے کے لیے آئے ہیں۔ یہ مقام ہے بہت مشکل لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں دعوتِ حق کو فروغ ایسے ہی بے نیازوں کے ذریعے سے ہوا ہے جو خلق سے کسی صلے کے طالب نہیں ہوتے ہیں۔

اَتُتۡرَكُوۡنَ فِىۡ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيۡنَ ۙ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ۙ وَّزُرُوۡعٍ وَّنَخۡلٍ طَلۡعُهَا هَضِيۡمٌ ۚ وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا فٰرِهِيۡنَ (۱۴۶ - ۱۴۹)

نعمت کے ساتھ شکرِ نعمت نہ ہو تو وہ استدراج ہے۔

اوپر والی بات بطور تمہید تھی۔ یہ اس اصل خطرے سے حضرت صالحؑ نے قوم کو آگاہ فرمایا جو بالکل سامنے تھا لیکن دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں مغروروں کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی مادی فربہی کو اپنی صحت و توانائی گمان کیے بیٹھے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے آگاہ فرمایا کہ یہ فربہی صحت نہیں بلکہ ایک ناگہانی موت کا الارم ہے۔ اوپر حضرت ہودؑ کی سرگزشت میں ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ نعمت کے ساتھ اگر شکرِ نعمت موجود نہ ہو تو وہ استدراج ہے جو بالآخر قوم کے لیے تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو توجہ دلائی اور الفاظ سے صاف واضح ہے کہ یہ اس دور میں توجہ دلائی ہے جو قوم کی ترقی و عروج کا دور تھا۔

نعمت منعم کی ایک امانت ہے

'فِىۡ مَا هٰهُنَاۤ' سے اشارہ اس رفاہیت و خوش حالی کی طرف ہے جو قوم کو حاصل تھی۔ بعد کے الفاظ سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ نعمت و رفاہیت اگر کسی کے لیے غفلت کا باعث ہو تو یہ اس کی ہلاکت کی دلیل ہے۔ ہر نعمت منعم کی شکر گزاری کا حق واجب کرتی ہے اور اس شکر گزاری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ برابر چوکنا رہے کہ مبادا کسی نعمت کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہو جائے۔ نعمت کسی کا حق نہیں بلکہ منعم کی طرف سے ایک امانت ہے اس وجہ سے جس کی تحویل میں جتنی ہی زیادہ امانت ہو اس کو اتنا ہی زیادہ فکرمند اور بیدار رہنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص نعمت پا کر نچنت ہو کر سو رہے کہ یہ نعمت اس کا حق ہے اور وہ اس میں عیش کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے تو وہ نہایت احمق ہے۔ نعمت کے اندر بے فکری، جس کو آیت میں 'اٰمِنِيۡنَ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے، بالآخر وہی نتیجہ پیدا کرتی ہے جو ریشم کے کیڑے کے سامنے آتا ہے کہ جو ریشم وہ اپنے اوپر تنتا ہے اسی کے اندر وہ گھٹ کر مرتا اور وہی اس کا کفن بنتا ہے۔ قرآن میں ربوبیت سے قیامت پر جو جگہ جگہ استدلال کیا گیا ہے اس میں بھی یہی پہلو ہے کہ ہر نعمت کے ساتھ مسئولیت لازمی ہے۔ اس پر انسان کی فطرت اور اس کی عقل گواہ ہے۔ صرف وہی اس کا انکار کر سکتے ہیں جن کی فطرت مسخ اور عقل ماؤف ہو چکی ہو۔

'طَلۡعُهَا هَضِيۡمٌ' یعنی داخل بعضها فی بعض، وہ کھجور جس کے خوشے آپس میں گتھم گتھا ہوں۔

'فِیْ جَنّٰتٍ ...... طَلْعُهَا هَضِيْمٌ' یہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، 'فِیْ مَا هٰهُنَآ' کے اجمال کی تفصیل ہے۔ ہم دوسرے مقام میں وضاحت کر چکے ہیں کہ عرب میں اچھے باغ کا تصور یہ تھا کہ انگوروں، اناروں کا باغ ہو اور اس کے نیچے نہریں جاری ہوں۔ بیچ بیچ میں مختلف چیزوں کی کاشت کے لیے قطعات ہوں اور کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہو۔ یہاں انہی اجزاء کو الگ الگ گنا کر سوال فرمایا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ ساری چیزیں تمھیں دے کر باغ کا اصل مالک اس سے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہے اور اس کی بابت تم سے کوئی پرسش نہیں ہونی ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ یہی حقیقت تمثیل کی صورت میں، انجیلوں میں بھی بار بار واضح فرمائی گئی ہے۔

'وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ' 'فَرِهٌ' کے معنی خوش ہونے، مگن ہونے، اکڑنے اور اترانے کے ہیں۔ یہ حالت کسی کے بخت اور عاقبت نااندیش ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اوپر لفظ 'اٰمِنِیْنَ' جو آیا ہے اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ چنانچہ سورۂ حجر کی آیت ۸۲ میں اسی مضمون کو 'اٰمِنِیْنَ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود نے فن سنگ تراشی میں بہت ترقی کی تھی۔ ان کے امراء و اغنیاء پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر اپنے لیے شاندار پہاڑی ایوان و محل بنواتے اور جس طرح اوپر قوم عاد کے ذکر میں گزرا ہے ان کا یہ ذوق بھی محض ان کے تفاخر کا نتیجہ تھا۔ لفظ 'فٰرِهِيْنَ' ان کے اس ذوق کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ محض تفاخر کے لیے دولت کا اسراف خدا اور آخرت سے بے فکری کا نتیجہ ہے اور اس سے جو تمدن وجود میں آتا ہے اس میں خلق کے لیے خیر و رفاہیت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا اس وجہ سے قانونِ قدرت میں اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ وہ بہت جلد شاندار کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو اسی خطرے سے آگاہ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ جو کچھ تم بنا رہے ہو یہی بنانے کے لیے تم ہمیشہ چھوڑے رکھے جاؤ گے۔ اب اس کی مہلت تمام ہونے والی ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۱۵۰-۱۵۲)

وہی تنبیہ جو آیت ۱۴۴ میں گزری ہے حضرت صالح علیہ السلام نے پھر دہرائی کہ اب بھی وقت باقی ہے، خدا سے ڈرو اور میری بات مانو۔ یہاں کھل کر یہ بات بھی فرما دی کہ اپنے ان لیڈروں کے چکمے میں نہ آؤ جو خدا کے حدود کو لانگ کر بہت دور نکل چکے ہیں۔ یہ ملک میں فساد برپا کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ مدعی اصلاح کے ہیں اور ان کی ذمہ داری بھی یہی تھی کہ یہ اصلاح کرتے لیکن یہ اصلاح نہیں کر رہے ہیں بلکہ اصلاح کے نام سے افساد کر رہے ہیں۔ ہم تفسیر سورۂ **بقرہ** میں یہ واضح

کر چکے ہیں کہ جس طرح اس کائنات کے بقا کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے اندر ایک ہی خدا کا ارادہ کار فرما ہے اسی طرح اس زمین کی صلاح کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے اندر اسی ایک خدا کا قانون چلے۔ اگر خدا کے قانون کے سوا کوئی اور قانون اور نظام اس میں چلایا جائے تو یہ اس زمین کے امن و عدل کو درہم برہم کرتا ہے اگرچہ اس کو کتنے ہی خوبصورت نام اور کتنے ہی نیک ارادے کے ساتھ چلایا جائے۔

قَالُوٓا۟ إِنَّمَآ أَنتَ مِنَ ٱلْمُسَحَّرِينَ ۝ مَآ أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَأْتِ بِـَٔايَةٍ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ (۱۵۳-۱۵۴)

حضرت صالحؑ کو ان کی قوم کا جواب

مُسَحَّرٌ میں مَسْحُوْرٌ سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قوم نے حضرت صالحؑ کی اس دردمندانہ تذکیر و تنبیہ کا یہ جواب دیا کہ تم تو ہم کو ایک بالکل ہی سحر زدہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کسی نے تم پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ تمھاری عقل بالکل ہی ماری گئی ہے جس کے سبب سے ہماری اس تہذیب و ترقی میں تمھیں ہر طرف خطرے ہی خطرے نظر آ رہے ہیں اور اس خطرے سے تم ہمیں بھی ڈرا رہے ہو۔ آخر تمھارے ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ ہم تمھیں خدا کا رسول مان لیں اور تمھارے ڈراووں سے مرعوب ہو کر اپنی اس تمام تہذیب و ترقی کی بساط لپیٹ کر رکھ دیں! تم بھی تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ اگر خدا کو کوئی رسول ہی بھیجنا تھا تو آخر اس نے ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو رسول بنا کر کیوں بھیجا؟ کسی فرشتے یا کسی مافوق بشر ہستی کو کیوں نہیں بھیجا؟ بہرحال ہم تو تمھیں ایک جھوٹا اور لاف زن سمجھتے ہیں۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ہمیں کوئی ایسی نشانی دکھاؤ جس کو دیکھ کر ہم جان جائیں کہ بے شک تم خدا کے رسول ہو، اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم پر وہ عذاب آ جائے گا جس کے تم ڈراوے سنا رہے ہو۔

قَالَ هَٰذِهِۦ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ۝ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۵۵-۱۵۶)

قوم کے لیے عذاب کی نشانی کا تعین

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے اس فیصلہ کن جواب کے بعد ایک اونٹنی کو، جو ہو سکتا ہے کہ انہی کی رہی ہو، نامزد کر دیا کہ یہ عذاب کی نشانی ہے۔ یہ عذاب کے مقابل میں ایک بند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تم نے اس بند کو توڑا تو تم پر عذاب الٰہی آ دھمکے گا۔ خبردار اس کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ ساتھ ہی بطور امتحان یہ ہدایت بھی دے دی کہ مویشیوں کے پانی پلانے کے گھاٹ پر ایک دن پانی پینے کی باری اس کی ہوگی اور ایک دن تمھارے مویشیوں کے لیے خاص ہوگا۔ جو دن اونٹنی کی باری کا ہو اس میں کوئی اس سے مزاحم نہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے جانوروں کے پانی پلانے کا گھاٹ ایک ہی تھا۔ حضرت صالحؑ نے اس پابندی سے اس معاملے کو ایک سخت آزمائش بنا دیا تاکہ قوم کی جسارت پوری طرح بے نقاب ہو جائے۔ مقصود یہ دیکھنا تھا کہ اگر اس تنبیہ کے بعد بھی لوگوں نے اونٹنی کو گزند پہنچانے کی جسارت کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد وہ خود ان پر بھی ہاتھ اٹھانے سے باز نہیں رہیں گے

اور جب قوم رسول کے معاملے میں طغیان کی اس حد تک بڑھ جاتی ہے تو سنتِ الٰہی کے بموجب وہ عذاب کی گرفت میں آجاتی ہے۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ (۱۵۷)

ایک کی بدبختی سب کے لیے موجبِ عذاب

بھلا یہ اشرار اس پابندی کو کب گوارا کرنے والے تھے کہ ایک دن گھاٹ پر حضرت صالحؑ کی اونٹنی بلا شرکتِ غیرے، پانی پیے اور دوسرے دن وہ پلائیں۔ چنانچہ انھوں نے جسارت کر کے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ اس فعل کا ارتکاب اگرچہ کیا ایک ہی شخص نے لیکن قرآن نے اس کو منسوب پوری قوم کی طرف کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی شرارت پر دوسرے راضی ہوں، اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جرم کے ارتکاب میں سب شریک ہیں چنانچہ اس کے نتیجہ میں جو عذاب آیا وہ سب پر آیا۔

'فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ' عذاب کی تعبیر ہے۔ یعنی بالآخر انھیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اس جرم کے ارتکاب کے بعد وہ اس پر پچھتائے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جرم کے بعد ان کو تین دن کی مہلت ملی۔ یہ مہلت ظاہر ہے کہ اسی لیے ملی تھی کہ اگر اب بھی ان کو اپنے اس جرم کا احساس ہو جاتے تو وہ توبہ و استغفار سے خدا کے عذاب سے اپنے کو بچا سکتے ہیں لیکن اس مہلت سے بھی انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۱۵۸-۱۵۹)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

۱۲- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۶۰-۱۷۵

حضرت لوطؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت کا بیان

آگے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کی سرگزشت ہے۔ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام نے اپنی اپنی قوموں کو ان کے تمدنی فساد پر متنبہ فرمایا اور حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس کی ایک نہایت شدید اخلاقی برائی پر متنبہ فرمایا ــــــ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ برائیاں کبھی منفرد نہیں ہوتیں بلکہ یہ خدا اور آخرت سے بے خوفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کا فساد زندگی کے ہر گوشے میں پھیلا ہوا ہوتا ہے البتہ قوموں کے مزاج اور ان کے ماحول کے اعتبار سے ان کا بروز کسی خاص پہلو میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس سورہ میں وہی نمایاں پہلو زیرِ بحث آئے ہیں۔ حضرت لوطؑ نے قوم کی اس مہلک بیماری کے عواقب سے آگاہ کیا لیکن قوم نے ان کی باتوں کی کوئی پروا نہیں کی اور بالآخر اسی انجام کو پہنچی جس سے انھوں نے آگاہ کیا۔ اس سرگزشت کا خاتمہ بھی اسی ترجیع پر ہوا ہے جو اوپر گزر چکی

ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام سرگزشتوں کے سنانے سے مقصود ایک ہی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٦٠﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا
۱۶۰-۱۷۵ تَتَّقُونَ ﴿١٦١﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٦٢﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٦٣﴾
وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٤﴾
أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ
رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿١٦٦﴾ قَالُوا لَئِنْ لَمْ
تَنْتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ ﴿١٦٧﴾ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِنَ
الْقَالِينَ ﴿١٦٨﴾ رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٦٩﴾ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ
أَجْمَعِينَ ﴿١٧٠﴾ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ﴿١٧١﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ﴿١٧٢﴾
وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِينَ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٧٤﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
ع ۹ ۱۶ ۱۳ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٧٥﴾

ترجمۂ آیات قوم لوط نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی لوط نے کہا کہ کیا تم
۱۶۰-۱۷۵ لوگ خدا سے ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے ایک دیانتدار رسول ہوں۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اس پر تم سے کسی صلے کا طالب نہیں ہوں۔ میرا صلہ تو بس خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۶۰-۱۶۴

کیا تم خلق میں سے مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو! اور تمھارے رب نے تمھارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑتے ہو! بلکہ تم لوگ نہایت ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو! ۱۶۵-۱۶۶

وہ بولے کہ اے لوط! اگر تم باز نہ آئے تو تم لازماً یہاں سے نکال چھوڑے جاؤ گے۔" اس نے کہا، میں تمھارے اس عمل سے سخت بیزار ہوں۔ اے رب! تو مجھے اور میرے اہل کو ان کے عمل کے انجام سے نجات دے۔ تو ہم نے اس کو اور اس کے سارے اہل کو نجات دی، صرف ایک بڑھیا پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ چھوڑ دی گئی۔ پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر برسایا نہایت ہولناک برسانا۔ تو کیا ہی بری تھی وہ بارش جو ان پر برسی جن کو انجام سے آگاہ کیا جا چکا تھا! ۱۶۸-۱۷۳

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۷۴-۱۷۵

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۶۰-۱۶۴)

یہ آیات اوپر کی سرگزشتوں میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت ہو چکی ہے۔

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ۝ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ (۱۶۵-۱۶۶)

قوم لوط کی دیوثیت

یہ ان کی سب سے بڑی معصیت کی طرف اشارہ ہے۔ ہم دوسرے مقام میں وضاحت کر چکے ہیں کہ امرد پرستی قوم لوط میں فیشن بن گئی تھی۔ یہ دیوثیت اگر کسی قوم میں فیشن کی حیثیت حاصل کر لے تو وہ قوم خدا کی زمین پر نجاست کا ایک ڈھیر بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی زمین کو پاک کر دیتا ہے۔

قوم کے اندھے پن کی طرف اشارہ

'اَلذُّكْرَانَ' کے بعد 'مِنَ الْعٰلَمِيْنَ' کے الفاظ سے قوم کے اندھے پن کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ خلق میں سے تمھیں اس مقصد کے لیے مرد ہی ملے حالانکہ اس ضرورت کے لیے خدا نے جو چیز بنائی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے بلکہ اندھوں کو بھی نظر آ سکتی ہے! ان کے اسی اندھے پن کی طرف

سورۂ نمل میں یوں اشارہ فرمایا ہے۔ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ - ۵۴ (کیا تم اس کھلی ہوئی بےحیائی کا ارتکاب کرتے ہو درآنحالیکہ تم آنکھیں رکھتے ہو!)

الٹی گنگا بہانے کا انجام

وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم۔ یہ اس اندھےپن کی وضاحت بھی ہے اور اس ذوقِ فاسد کا لازمی نتیجہ بھی۔ جن لوگوں کے اندر یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے ان کی فطرت بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ عورت کی رغبت ان کے اندر بالکل مردہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگ بنجر کو سیراب کرتے اور کھیتوں کو خشک ہونے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور پھر یہ الٹی گنگا بہانے کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے وہ نکلتا ہے۔

بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ: یہ انتہائی غم و حسرت کا فقرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے جرم کے گھنونےپن کی تعبیر سے الفاظ قاصر ہیں۔ تم فطرت کے تمام حدود توڑ کر بہت دور نکل گئے ہو!

قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ (۱۶۷)

قوم کی فیصلہ کن دھمکی

قوم نے اس تمام دلسوزی و دردمندی کا جواب یہ دیا کہ اے لوط! اگر تم اپنی اس نصیحت و ملامت سے باز نہ آئے تو یاد رکھو کہ تم یہاں سے نکال کر چھوڑے جاؤ گے! فقرے کا تیور صاف بتا رہا ہے کہ اخراج کی یہ دھمکی پہلی دھمکی نہیں بلکہ آخری فیصلہ کن دھمکی ہے۔ یہ دھمکی وہ پہلے بھی دیتے رہے تھے۔ اس کی طرف قرآن میں اشارات موجود ہیں لیکن اس دھمکی کا انداز سابق دھمکیوں سے مختلف ہے۔ اب انھوں نے اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ اپنی زبان بند کرو ورنہ یاد رکھو کہ ہم تم کو نکالنے کی جو دھمکی دیتے رہے ہیں وہ پوری کر کے رہیں گے۔

قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُم مِّنَ الْقَالِينَ (۱۶۸)

'قلی' کے معنی شدید بغض و نفرت کے ہیں۔ حضرت لوطؑ نے قوم کی فیصلہ کن دھمکی کا جواب بھی بھرپور دیا۔ فرمایا کہ میں تو تمہارے اس عمل سے شدید بغض و نفرت رکھنے والوں میں سے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجھ سے بیزاری و عناد کا سبب یہ ہے کہ میں تمہارے اس عمل پر تمہیں ملامت کرتا ہوں تو تمہاری یہ دھمکی مجھے اس سے نہ روک سکتی اور نہ ذرا اس میں مجھے نرم کر سکتی۔ خوب کان کھول کر سن لو کہ میں اس سے شدید بغض و نفرت رکھنے والوں میں سے ہوں تو تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کر گزرو۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

دھمکی کا بھرپور جواب

'مِنَ الْقَالِينَ' میں لفظ جمع لانے سے کلام میں زیادہ زور پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ہی تنہا اس سے بیزار نہیں ہوں بلکہ ہر وہ انسان جس کی فطرت سلیم اور عقل مستقیم ہے اس سے بیزار ہوگا اور میں انہی میں ہوں۔ میں تمہارے اس عمل کے ساتھ کسی طرح تمہارا ساتھی بننا گوارا نہیں کرتا۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ (۱۶۹)

حضرت لوطؑ کی دعا

'مِمَّا یَعْمَلُوْنَ' میں عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق مضاف محذوف ہے۔ یعنی 'من عقوبۃ ما یعملون' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ۔

حضرت لوطؑ نے قوم کی اس دھمکی کے بعد اندازہ فرما لیا کہ اب فیصلہ کی آخری گھڑی قریب آگئی ہے۔ ان لوگوں نے جب میرے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو سنتِ الٰہی کے مطابق ان پر عذاب بھی لازماً آئے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے متعلقین اور اپنے ساتھیوں کے لیے دعا مانگی کہ اے رب اس نابکار قوم کے اعمال کے نتیجے میں جو عذاب اس پر آنے والا ہے اس سے مجھ کو اور میرے اہل کو محفوظ رکھیو! لفظ 'اھل' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ اس کے اندر اتباع بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر کچھ لوگ حضرت لوطؑ پر ان کی قوم میں سے، ایمان لائے ہوں گے تو وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ اَجْمَعِیْنَ ۝ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ۝ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ۝ وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ (۱۷۰-۱۷۳)

اس کے بعد قوم لوط پر عذاب آگیا۔ اس عذاب کی نوعیت کی تفصیل ہم سورۂ حجر کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

'عَجُوْز' سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے جس کی ساری ہمدردیاں اپنی قوم کے ساتھ تھیں۔ اس وجہ سے حضرت لوطؑ کے اہل میں سے ہونے کے باوجود یہ عذاب کی گرفت میں آگئی۔ لفظ 'عجوز' یہاں اس کے لیے بطور تحقیر استعمال ہوا ہے۔

قریش کو تنبیہ

'فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ' میں قریش کے لیے انذار و تنبیہ ہے کہ جن لوگوں کو کسی رسول کے ذریعہ سے انذار کیا جاتا ہے اگر وہ اس انذار کو خاطر میں نہیں لاتے تو ان پر اسی طرح خدا کے غضب کی بارش ہوتی ہے اور یہ بارش نہایت ہی بری بارش ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۱۷۴-۱۷۵)

یہ آخر میں وہی ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

۱۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۷۶-۱۹۱

حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت کا بیان

آگے حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم اصحاب مدین کی سرگزشت ہے۔ جس طرح اوپر حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کے اخلاقی فساد پر اس کو متنبہ کیا اسی طرح حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو اس کے معاشی فساد پر متنبہ کیا لیکن اس قوم نے بھی اپنے رسول کے ساتھ وہی روش اختیار کی جو اس کی پیشرو قوموں نے

اختیار کی اور بالآخر اسی انجام سے دوچار ہوئی جس سے دوسری قومیں دوچار ہوئیں۔ یہ سرگزشت بھی اسی ترجیع پر تمام ہوتی ہے جو اوپر ہر سرگزشت کے خاتمہ پر وارد ہوتی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۷۶-۱۹۱

كَذَّبَ أَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾
وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾
أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي
الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾
قَالُوْا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا
وَإِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ
السَّمَآءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّيْ أَعْلَمُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ إِنَّهُ كَانَ
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾ ع ۱۰ ۱۶ ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۷۶-۱۹۱

اصحاب الایکہ نے بھی رسولوں کی تکذیب کی جب کہ شعیب علیہ السلام نے ان کو آگاہ کیا، کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں طلب کرتا۔ میرا صلہ تو بس خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۷۶-۱۸۰

تم لوگ پورا پورا ناپ کرو اور خسارہ پہنچانے والوں میں سے نہ بنو اور صحیح ترازو سے

پورا کرو۔ اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور زمین میں مفسد بن کر نہ پھیلو اور اس ذات سے ڈرو جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور تم سے پہلوں کو بھی۔ ۱۸۱-۱۸۴

انھوں نے جواب دیا کہ تم تو ایک بالکل سحر زدہ ہو۔ اور تم تو بس ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو۔ اور ہم تو تم کو بالکل جھوٹوں میں سے خیال کرتے ہیں۔ ۱۸۵-۱۸۶

تو اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان سے ٹکڑے گراؤ۔ اس نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا پس ان کو بادل والے دن کے عذاب نے آ دبوچا اور بے شک وہ ایک ہولناک دن کا عذاب تھا۔ ۱۸۷-۱۸۹

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب بڑا ہی عزیز و رحیم ہے۔ ۱۹۰-۱۹۱

۱۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ (۱۷۶)

اصحاب ایکہ سے مراد اہل مدین ہیں

اَیْکَۃ جھاڑی، بن اور جنگل کو کہتے ہیں۔ مدین کے پاس ایک جنگل بھی تھا اس وجہ سے اصحاب مدین، اصحاب الایکہ کے نام سے بھی مشہور تھے۔ بعض مفسرین نے اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین کو دو الگ الگ قومیں سمجھا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت شعیبؑ کی بعثت ان دونوں قوموں کی طرف ہوئی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّىْ لَـكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَاۤ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ‌ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۷۷-۱۸۰)

یہ آیات اوپر کی سرگزشت میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کے ہر جزو کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ۝ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (۱۸۱-۱۸۲)

ناپ تول میں کمی نظام کائنات کے منافی ہے

اصحاب مدین تجارت پیشہ تھے اور اس پیشے میں انھوں نے بڑی ترقی کر لی تھی لیکن جب خدا اور آخرت سے غفلت ہو تو شیطان ہر چیز کے اندر گھس کر فساد پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے

اندر ناپ تول میں کمی کرنے کی بیماری پھیل گئی۔ یہ معاشی فساد ایک شدید قسم کی متعدی بیماری ہے جو کسی قوم میں پیدا ہو جائے تو ہر دکاندار اور ہر تاجر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر بے ایمانی، ناپ تول میں دغابازی، ملاوٹ، تہ بازاری اور چور بازاری کی ایسی ایسی شکلیں ایجاد ہو جاتی ہیں کہ معاشرے کا ہر شخص چیخ اٹھتا ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک میزان کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اسی میزان پر یہ آسمان و زمین قائم ہیں۔ اگر یہ درہم برہم ہو جائے تو یہ آسمان و زمین درہم برہم ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ نظام انسانوں کو یہ رہنمائی دیتا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر ہر شعبۂ زندگی میں صحیح میزان کے قیام کا پورا پورا اہتمام رکھیں ورنہ ان کا سارا معاشی و معاشرتی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ یہاں اشارے پر کفایت کیجیے۔ ان شاء اللہ سورہ رحمان کی تفسیر میں ہم اس نکتہ پر وضاحت سے گفتگو کریں گے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (۱۸۳)

اشیاء میں ملاوٹ

یعنی ناپ تول میں کمی اور ڈنڈی مار کر کے لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو۔ اسی کی ایک نہایت ہی مجرمانہ صورت اشیاء میں ملاوٹ بھی ہے کہ کوئی شخص گندم میں جَو، گھی میں چربی، شکر میں ریت، گوشت میں چھیچھڑے اور دودھ میں پانی ملا کر فروخت کرے۔ اس طرح وہ بظاہر خریدار کو وزن یا پیمانہ کے اعتبار سے تو چیز پوری کر دیتا ہے لیکن اس کے اندر اصل شے ایک ثلث کے بقدر بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ اور اس میں مضر صحت اشیاء کی جو ملاوٹ ہوتی ہے وہ مزید برآں۔ یہاں تک کہ آدمی بازار کی کوئی چیز کھاتا ہے تو اس کا دل دھڑکتا رہتا ہے کہ وہ کوئی کھانے کی چیز کھا رہا ہے یا زہر نگل رہا ہے۔

حرام خوری کا موٹاپا راس آنے والی چیز نہیں ہے

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ یعنی میزان حق و عدل کو درہم برہم کر کے اگر تم نے دنیا میں ترقی کی تو یہ ترقی کوئی مبارک ترقی نہیں ہے۔ دنیا میں بڑھو تو مفسد بن کر نہ بڑھو بلکہ مصلح بن کر پھلو پھولو۔ اگر حرام کی نفع اندوزی سے موٹے ہوئے تو یہ مٹاپا راس آنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کا انجام نہایت مہلک ہو گا۔

وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ (۱۸۴)

خدا کے ہاں سب کے لیے ایک ہی باٹ اور ترازو ہے

جِبِلَّةَ کے معنی خلق و خلقت کے ہیں۔ یہ حضرت شعیبؑ نے تاریخ سے سبق حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی کہ جس خالق نے اگلوں کو پیدا کیا اسی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے۔ اگر اس نے اگلوں کو تمدن و معاشرت میں فساد پیدا کرنے کے سبب سے نیست و نابود کر دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے معاملے میں اس کی سنت بدل جائے اور وہ تمہیں تمہارے اس معاشی فساد پر سزا نہ دے۔ اگر تمہارا خدا ان کے خدا سے کوئی الگ ہوتا تب تو تم یہ توقع کر سکتے تھے کہ تمہارے لیے اس نے کوئی الگ قانون بنایا ہو گا لیکن خدا وہی ہے اور لا ریب وہی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے پاس اگلوں کے لیے کوئی اور باٹ اور ترازو ہو تمہارے لیے کوئی اور۔ خدا تو سب کے لیے ایک ہی ترازو سے تولے گا تو اس سے ڈرو اور اپنی اس روش کی اصلاح کرو

قَالُوٓا۟ إِنَّمَآ أَنتَ مِنَ ٱلْمُسَحَّرِينَ ۝ وَمَآ أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِن نَّظُنُّكَ لَمِنَ ٱلْكَٰذِبِينَ ۝ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ (۱۸۵-۱۸۷)

مکذبین کا مطالبۂ عذاب

قوم نے حضرت شعیبؑ کی اس درد مندانہ تنبیہ کا وہی جواب دیا جو دوسرے رسولوں کے مکذبین سے منقول ہوا ہے۔ اول یہ کہ یہ الٹی پلٹی باتیں جو تم کر رہے ہو یہ اس بات کا قرینہ ہیں کہ تم پر کسی نے نہایت سخت قسم کا جادو کر دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب تم ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو تو ہم تمھیں خدا کا بھیجا ہوا رسول کس طرح مان لیں؟ تیسرا یہ کہ اگر تم سچ مچ رسول ہو، اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم پر آسمان ٹوٹ پڑے گا تو ہم پر آسمان سے کچھ ٹکڑے گرا کر دکھاؤ۔ 'کِسَف' جمع ہے 'کِسْفَۃٌ' کی۔ دوسری سورتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے قوم کو آگاہ کیا تھا کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم پر اسی طرح کا کوئی عذاب آئے گا جس طرح کے عذاب عاد، ثمود اور قوم لوطؑ پر آئے۔ ان کے اس انذار کے جواب میں قوم نے ان کے سامنے یہ مطالبہ رکھ دیا۔

قَالَ رَبِّىٓ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۸۸)

حضرت شعیبؑ کی طرف سے تفویض الی اللہ

یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان سے ٹکڑے گرانا میرے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ تمھاری کارستانیوں سے اچھی طرح باخبر ہے تو میں اس معاملے کو اسی کے حوالہ کرتا ہوں۔ اس کی حکمت کا جو تقاضا ہوگا وہ ظہور میں آئے گا اور بالکل ٹھیک وقت پر ظہور میں آئے گا۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ ٱلظُّلَّةِ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۸۹)

عذاب یوم الظلہ

قوم شعیب کے عذاب کی نوعیت ہم سورۂ اعراف آیت ۹۱ کی تفسیر کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ تفصیل کے طالب وہاں دیکھ لیں۔ اس عذاب کی تعبیر سورۂ ہود آیت ۹۴ میں لفظ 'صَیْحَۃ' سے کی گئی ہے جس کے معنی ڈانٹ اور کڑک کے ہیں۔ یہاں اسی کی تعبیر 'عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّۃِ' سے کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دور سے دیکھنے میں غبار یا ابر یا دھوئیں کے ایک ستون یا سائبان کی شکل میں نظر آیا۔ یہ قرینہ جیسا کہ ہم قوم لوطؑ کی سرگزشت میں بیان کر چکے ہیں حاصب کے عذاب کا ہے۔ حاصب کے عذاب میں حاصب، 'رَجْفَۃ'، 'صَیْحَۃ' اور 'ظُلَّۃ' سب جمع ہو جاتے ہیں۔

إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ (۱۹۰-۱۹۱)

یہ آخر میں وہی ترجیع ہے جو اوپر ہر سرگزشت کے بعد آئی۔

۱۶- آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۹۲-۲۲۷

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں اور سلسلۂ کلام، سورہ کی تمہید، یعنی اصل عمود، سے جڑ گیا ہے۔

وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ قرآن کا کتاب الٰہی ہونا بالکل واضح ہے۔ جو لوگ اس کو ماننے کے لیے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ محض نہ ماننے کا ایک بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو کوئی ایسی نشانی بھی ان کو دکھا سکتا ہے جس کے آگے ان کی اکڑی ہوئی گردنیں جھک جائیں لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس طرح کی کوئی نشانی دیکھنے کے بجائے یہ عقل و بصیرت سے کام لیں۔ تاہم اگر ان کی یہی ہٹ دھرمی قائم رہی تو قرآن ان کو جن خطرات سے آگاہ کر رہا ہے ان میں سے ایک ایک خطرہ ان کے سامنے آ کے رہے گا۔ اس کے بعد اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی سرگزشتیں شروع ہو گئی تھیں کہ اگر ان کو کسی نشانی ہی کی طلب ہے تو ان واقعات سے کیوں سبق نہیں لیتے؟ ان میں سے ہر واقعہ کے اندر نشانی موجود ہے۔ اگر انہی قوموں کی روش انھوں نے بھی اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ساتھ خدا کا معاملہ اس سے مختلف ہو جو ان قوموں کے ساتھ ہوا۔ سرگزشتوں کا یہ سلسلہ حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت پر ختم ہوا۔ اس کے بعد تاریخی اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی سرگزشت چونکہ اوپر نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی تھی اس وجہ سے یہاں اس کو نہیں لیا بلکہ کلام اصل عمود کی طرف لوٹ آیا کہ یہ قرآن خدا کا اتارا ہوا کلام ہے۔ یہ کوئی شیطانی القاء نہیں ہے اور نہ یہ کوئی شاعری ہے۔ اس کی پیشین گوئیاں پچھلے صحیفوں میں بھی موجود ہیں اور علمائے بنی اسرائیل ان سے واقف ہیں۔ اگر یہ بدقسمت لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں تو پیغمبرؐ کو ان کی کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنی ساری توجہ اپنے ایمان لانے والے ساتھیوں پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ یہ شامت زدہ لوگ خود اپنا انجام بہت جلد دیکھ لیں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیت ۱۹۲-۲۲۷ وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ ﴿۱۹۳﴾
عَلٰى قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِىٍّ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۹۵﴾
وَاِنَّهٗ لَفِىۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمۡ يَكُنۡ لَّهُمۡ اٰيَةً اَنۡ يَّعۡلَمَهٗ
عُلَمٰٓؤُا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوۡ نَزَّلۡنٰهُ عَلٰى بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِيۡنَ ﴿۱۹۸﴾
فَقَرَاَهٗ عَلَيۡهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكۡنٰهُ فِىۡ
قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ

الْأَلِيمَ ﴿٢٠١﴾ فَيَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٠٢﴾ فَيَقُولُوا هَلْ
نَحْنُ مُنظَرُونَ ﴿٢٠٣﴾ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿٢٠٤﴾ أَفَرَأَيْتَ إِن
مَّتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَاءَهُم مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَا أَغْنَىٰ
عَنْهُم مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾ وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا
مُنذِرُونَ ﴿٢٠٨﴾ ذِكْرَىٰ وَمَا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٢٠٩﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ مع
بِهِ الشَّيَاطِينُ ﴿٢١٠﴾ وَمَا يَنبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٢١١﴾ إِنَّهُمْ
عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ ﴿٢١٢﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتَكُونَ
مِنَ الْمُعَذَّبِينَ ﴿٢١٣﴾ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿٢١٤﴾ وَاخْفِضْ
جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢١٥﴾ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ
إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢١٦﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿٢١٧﴾
الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ﴿٢١٨﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ﴿٢١٩﴾
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٢٢٠﴾ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ
الشَّيَاطِينُ ﴿٢٢١﴾ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ﴿٢٢٢﴾ يُلْقُونَ السَّمْعَ
وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ﴿٢٢٣﴾ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ﴿٢٢٤﴾ أَلَمْ
تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ﴿٢٢٥﴾ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا
يَفْعَلُونَ ﴿٢٢٦﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ
كَثِيرًا وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ
ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ﴿٢٢٧﴾ ع ۱۱ ۳۶ ۱۵

ترجمۂ آیات ۱۹۲ - ۲۲۷

اور بے شک یہ نہایت اہتمام سے خداوندِ عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو تمھارے قلب پر امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے تاکہ تم لوگوں کو آگاہ کر دینے والوں میں سے بنو۔ واضح عربی زبان میں! اور اس کا ذکر اگلوں کے صحیفوں میں بھی ہے۔ کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں؟ ۱۹۲ - ۱۹۷

اور اگر ہم اس کو کسی عجمی پر اتارتے اور وہ ان کو یہ سناتا تو وہ اس پر ایمان لانے والے نہ بنتے۔ ہم مجرموں کے دلوں میں اس کو اسی طرح داخل کرتے ہیں۔ یہ اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ پس وہ ان پر اچانک آ دھمکے گا اور وہ اس سے باخبر نہ ہوں گے۔ اس وقت کہیں گے، کیا ہمیں کچھ مہلت ملے گی! ۱۹۸ - ۲۰۳

کیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں! بھلا بتاؤ تو کہ اگر ہم ان کو چند سال اور بہرہ مند رکھیں پھر ان پر وہ عذاب آجائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو یہ بہرہ مندی ان کے کس کام آئے گی! ۲۰۵ - ۲۰۷

ہم نے کسی بستی کو بھی ہلاک نہیں کیا مگر اس کے لیے پہلے ہوشیار کرنے والے بھیجے، یاددہانی کے لیے اور ہم ظالم نہیں ہیں۔ ۲۰۸ - ۲۰۹

اور اس کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں۔ نہ یہ ان کے لیے لائق ہے اور نہ یہ ان کے بس کا ہے۔ وہ سن گن لینے سے معزول کیے جا چکے ہیں۔ ۲۱۰ - ۲۱۲

پس تم اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارنا کہ تم بھی سزاوارِ عذاب ٹھہرو۔ اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ اور جن اہلِ ایمان نے تمھاری پیروی کی ہے ان کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو۔ ۲۱۳ - ۲۱۵

اگر یہ لوگ تمھاری نافرمانی کر رہے ہیں تو ان کو سنا دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔ اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ رکھو۔ اس خدا پر جو تمھیں دیکھتا ہے اس وقت جب تم اٹھتے ہو اور دیکھتا ہے تمھاری آمد و شد کو سجدہ کرنے والوں کے درمیان۔ بےشک وہ سمیع و علیم ہے۔ ۲۱۶-۲۲۰

کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کن پر اترتے ہیں! وہ لپاٹیوں بدکاروں پر اترتے ہیں جو کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ۲۲۱-۲۲۳

اور شاعروں کی پیروی گمراہ کرتے ہیں۔ کیا نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں! اور وہ کہتے ہیں وہ جو کرتے نہیں۔ بس وہ اس سے مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے، جنھوں نے نیک اعمال کیے، جنھوں نے اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا اور جنھوں نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور یہ جنھوں نے ظلم کیا ہے عنقریب جان لیں گے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہونا ہے۔ ۲۲۴-۲۲۷

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ (۱۹۲-۱۹۴)

قرآن کا مرتبہ و مقام

'إِنَّهُ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ چونکہ اصل سیاق کلام، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، واضح ہے اس وجہ سے ضمیر مرجع کے بغیر آ گئی ہے۔

'تَنْزِيلٌ' کے معنی اہتمام کے ساتھ اتارنے کے ہیں۔ یہ قرآن کے منکرین و مخالفین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یہ قرآن کاہنوں کے کلام کی طرح کوئی شیطانی القا نہیں ہے بلکہ نہایت اہتمام سے اتارا ہوا اللہ رب العالمین کا کلام ہے۔ اس وجہ سے اس کی قدر کریں۔ اس کی تکذیب کر کے اپنی شامت نہ بلائیں۔

'نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ'۔ 'الرُّوحُ الْأَمِينُ' حضرت جبریل علیہ السلام کا لقب ہے۔ امین کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضرت جبریلؑ کے حوالہ کیا وہ بے کم و کاست

بغیر کسی ادنیٰ تغیر و تبدل کے، انھوں نے پیغمبر کو پہنچایا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی خیانت نہیں کی ہے۔
یہ امر بیاں ملحوظ رہے کہ اسلام دشمنی کے جوش میں یہود اور روافض نے حضرت جبریلؑ پر نعوذ باللہ خیانت کا الزام بھی لگایا ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں اس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

'عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ'۔ ضمیر کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی اس وحی کا مہبط تمہارا نفس نہیں بلکہ قلب ہے جو انسان کے وجود کا سب سے اشرف و اعلیٰ حصہ ہے اس وجہ سے اس شبہے کا کوئی امکان نہیں ہے کہ اس میں کسی نفسانی وسوسہ یا شیطانی دندغہ کو کوئی دخل ہو۔ اگرچہ آیت میں خطاب ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن کلام کا مقصود مخالفین پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ یہ کلام، پاک منبع سے نکلا ہے، پاک ذریعہ سے اترا ہے اور پاک ترین محل میں اس نے اپنا مستقر بنایا ہے۔

'لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ' یہ اس کلام کے اس اہتمام و شان کے ساتھ اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ یہ اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم ان لوگوں کو، جو خدا اور آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں اس غفلت کے نتائج و عواقب سے اچھی طرح آگاہ کر دو۔ یعنی یہ کلام محض کلام نہیں ہے بلکہ یہ انذار ہے اور تم ایک منذر ہو اس وجہ سے لوگ اس کو گوشِ ہوش سے سنیں ورنہ ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار رہیں جن کی یہ خبر دے رہا ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۱۹۵)

اہل عرب کو تنبیہ

یہ اہل عرب پر اظہار احسان ہے کہ اللہ نے یہ تم پر خاص فضل فرمایا ہے کہ اس نے اس کلام کو نہایت واضح عربی زبان میں اتارا ہے۔ یہ چیز تمہارے لیے باعث شرف بھی ہے اور اس میں تمہارے اوپر اتمام حجت بھی ہے۔ اب تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تم اس کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ اس اہتمام کے بعد بھی اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو اس کی ذمہ داری تمہارے ہی اوپر ہوگی۔

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۱۹۶-۱۹۷)

قرآن کے حق میں سابق صحیفوں کی شہادت

یہ قرآن کے حق میں سابق صحیفوں کی شہادت کا حوالہ ہے کہ اس کا ذکر اور اس کی پیشین گوئی انبیائے سابقین کے صحیفوں میں بھی موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم و دعوت سے متعلق تورات، زبور اور انجیل میں جو پیشین گوئیاں ہیں ہم ان کا حوالہ ان کے محل میں دے چکے ہیں۔ ان پیشین گوئیوں سے بنی اسرائیل کے علماء اچھی طرح آگاہ تھے۔ اگرچہ ان کی اکثریت نے ان کو چھپایا لیکن ان کے اندر ایسے علمائے حق بھی تھے جنھوں نے ان کا برملا اظہار کیا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی لائے۔ قرآن نے ان کی اس حق پرستی کی جگہ جگہ نہایت شاندار الفاظ میں تعریف فرمائی ہے۔

انھی پیشین گوئیوں اور انھی علماء کا حوالہ دے کر یہ قرآن کے مخالفین سے سوال کیا ہے کہ کیا قرآن اور

اس کے داعی کی صداقت کی یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ وہ کسی مزید نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ یہ امر ملحوظ رہے کہ دینی معاملات میں اہل عرب اہل کتاب کی برتری تسلیم کرتے رہے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے جوش میں وہ ایسے اندھے ہو گئے کہ جن اہل کتاب نے ان کی پیٹھ ٹھونکی ان کو تو انھوں نے اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھا لیکن جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کی ان کو انھوں نے، جیسا کہ پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے، قرآن کی تصنیف میں شریک سازش قرار دے دیا۔

آیت وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ کی یہ تاویل جو ہم نے کی ہے نہایت واضح ہے۔ اس کے شواہد پیچھے بھی اس کتاب میں گزر چکے ہیں۔ آگے بھی آئیں گے لیکن معلوم نہیں کہ کس طرح بعض فقہاء کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ انھوں نے اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ قرآن کسی عجمی زبان میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ — ترجمہ اصل قرآن کا قائم مقام نہیں

یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کسی دوسری زبان میں اگر قرآن کو منتقل کیا جائے گا تو وہ قرآن نہیں ہوگا بلکہ اس کا ترجمہ ہوگا اور ترجمہ اور اصل میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ پورے قرآن کو تو درکنار قرآن کی کسی ایک سورہ بلکہ ایک آیت کے ترجمہ کو قرآن کی سورہ یا اس کی آیت کا قائم مقام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جو لوگ قرآن کے ایجاز اور اس کے اعجاز سے واقف ہیں ان کا تجربہ تو یہ ہے کہ بعض آیات کا مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے۔ مترجم ان میں کوئی ابہام یا اشکال بھی محسوس نہیں کرتا، لیکن برسوں کی محنت کے بعد بھی جب وہ ان کا ترجمہ کرنے بیٹھتا ہے تو، ترجمہ کی زبان پر پوری قدرت رکھنے کے باوجود، وہ صاف محسوس کرتا ہے کہ ترجمہ میں آیت کی بلاغت تو درکنار اس کے پورے مفہوم کو بھی وہ ادا نہیں کر پایا۔ قرآن تو خیر ایک معجز کتاب ہے، دوسرے آسمانی صحائف، جن کے معجز ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا ہے، ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان کے ترجموں کو ان کی اصل کا قائم مقام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں بڑا دخل اس چیز کو بھی ہے کہ ان کے صحیفوں کی اصل زبان مٹ گئی اور انھوں نے ان کے ترجموں ہی کو اصل کا قائم مقام قرار دے کر انہی پر اپنی تمام فقہ اور سارے علم کلام کی بنیاد رکھ دی۔ پال نے نصاریٰ کو گمراہ کرنے میں انجیلوں کے ترجموں سے جو کام لیا ہے اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ بہرحال ہمارے نزدیک یہ استنباط اس آیت سے بالکل بے جوڑ اور بجائے خود بالکل غلط بلکہ دین کے لیے ایک شدید فتنہ ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جن فقہاء کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کسی غلط فہمی کی بنا پر منسوب کی گئی ہے لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے الگ ہے اس وجہ سے ہم اس کی تحقیق میں پڑنا نہیں چاہتے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَٰهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ۝ فَقَرَأَهُۥ عَلَيْهِم مَّا كَانُوا۟ بِهِۦ مُؤْمِنِينَ (۱۹۸ - ۱۹۹)

یہ اسی امتنان و احسان کے مضمون کی، جو آیت ۱۹۶ میں گزرا، مزید وضاحت فرمائی کہ اگر یہ قرآن کسی عجمی پر عجمی زبان میں اترا ہوتا اور وہ ان کو سناتا تب تو وہ یہ عذر کرتے کہ عربی کے لیے عجمی قرآن کے کیا

معنی! لیکن اب وہ کیا عذر پیش کریں گے جب کہ اللہ نے انہی کی بہترین زبان میں اور انہی کے بہترین شخص پر اس کلام کو نازل فرمایا! سورہ حٰمٓ السجدہ میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے: وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ (۴۴) (اور اگر ہم اس کو عجمی قرآن بناتے تو یہ کہتے کہ اس کی آیات کھولی کیوں نہ گئیں! کلام عجمی اور مخاطب عربی) سورۂ نحل کی آیت ۱۰۳ میں بھی اس مضمون کے ایک پہلو کی وضاحت ہوئی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ (۲۰۰-۲۰۳)

'سَلَكَ' کے معنی کسی چیز کو کسی چیز کے اندر داخل کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مخالفینِ قرآن کی اصل بیماری

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ قرآن سے جو بدک رہے ہیں اس کا سبب قرآن کی کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ ان کے دلوں کی خرابی ہے۔ مسلسل مجرمانہ زندگی بسر کرنے کے سبب سے ان کے دل اس قدر فاسد ہو چکے ہیں کہ ان کے اندر اب کوئی صحیح چیز قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ ایک غلط روش پر پختہ ہو جانے کے باعث ان کے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے قرآن کی سیدھی باتیں ان کے دلوں کو چیرتی ہوئی داخل ہوتی ہیں اور ان کی طبیعتیں اس کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہیں۔ جس کا معدہ فاسد ہو چکا ہو اس کو صالح سے صالح غذا بھی دیجیے تو اس کی طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی بلکہ وہ قے کر دیتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہو چکا ہے اور یہ بات سنتِ الٰہی کے تحت ہوئی ہے۔ اس لیے کہ جو لوگ اپنی فطرت مسخ کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے۔ اب یہ لوگ قرآن کی صداقت اسی وقت تسلیم کریں گے جب اس عذاب کو دیکھ لیں گے جس کی قرآن ان کو خبر دے رہا ہے۔ وہ عذاب ان پر اچانک آئے گا۔ اس کے ظہور سے پہلے ان کو اس کی کوئی خبر بھی نہ ہوگی۔ اس وقت وہ نہایت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کیا ہمیں کچھ تھوڑی سی مہلت اور ملے گی کہ ہم اپنے رویے کی اصلاح کر لیں لیکن اس کا وقت گزر چکا ہو گا۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ۝ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ (۲۰۴-۲۰۷)

[illegible] یہ سوال اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ جو چیز شدنی ہے وہ بہرحال شدنی ہے۔ اگر اس میں کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب یہ اس سے مامون ہو گئے۔ اگر ہم نے ان کو چند سال اور کھانے پینے کی مہلت دے دی تو اس سے کیا فرق پیدا ہو جائے گا بالآخر تو ان کو اسی چیز سے سابقہ پیش آنا ہے جس سے ان کو آگاہ کیا جا

رہا ہے، ان کے اندر رسول کی بعثت نے اب یہ فیصلہ کن مرحلہ ان کے سامنے کر دیا ہے۔ اس میں اگر تاخیر ہو رہی ہے تو یہ مصلحتِ الٰہی سے ہو رہی ہے۔ اس تاخیر کے سبب سے اگر یہ اس سے نچنت ہو کر اس کا مذاق اڑا رہے ہیں تو یہ ان کی بدبختی ہے۔

وَمَآ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ۞ ذِكۡرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ (۲۰۸ - ۲۰۹)

قریش کو تنبیہ

یہ اس سنتِ الٰہی کی یاد دہانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قوموں کے معاملے میں اختیار فرمائی ہے کہ وہ عادل اور رحیم ہے اس وجہ سے انذار اور اتمامِ حجت کے بغیر وہ کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا۔ ذِکۡرٰی یہاں رسولوں کے مقصدِ بعثت کی وضاحت کے لیے ہے اور اسلوبِ بیان واضح کر رہا ہے کہ مقصود اس پر خاص طور پر زور دینا ہے کہ بغیر اس یاددہانی کے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا۔ بغیر یاددہانی کے ہلاک کرنا ظلم ہوتا اور اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ سنتِ الٰہی کے مطابق تذکیر کے لیے ایک منذر آگیا ہے۔ اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو اس کا جو لازمی نتیجہ ہے وہ تمہارے سامنے آکر رہے گا اور یہ کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ عین عدل ہوگا۔

وَمَا تَنَزَّلَتۡ بِهِ الشَّيٰطِيۡنُ (۲۱۰)

اوپر آیت ۱۹۲ میں جو بات مثبت پہلو سے فرمائی ہے وہی بات یہاں منفی پہلو سے ارشاد ہوئی ہے۔ ان مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام ہے۔ شیاطین کا اتارا ہوا نہیں ہے جیسا کہ تم (یعنی قریش) سمجھتے یا کہتے ہو۔

وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهُمۡ وَمَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ۞ اِنَّهُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ (۲۱۱ - ۲۱۲)

یہ دلیل ارشاد ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ شیطانی کلام نہیں ہو سکتا۔

اس بات کے

پہلی دلیل اس کی یہ ہے کہ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهُمۡ یعنی اس طرح کا کلام اتارنا شیاطین کے لائق کام نہیں ہے اس لیے کہ یہ شیاطین کے مقصد اور ان کے مشن کے بالکل خلاف ہے۔ یہ کلام اتار کر آخر اپنے ہی ہاتھوں وہ اپنی سلطنت برباد کیوں کریں گے! بعینہٖ یہی بات سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے وقت کے فقیہوں اور فریسیوں کے جواب میں فرمائی تھی جب انھوں نے آپ کے معجزات کے اثر کو مٹانے کے لیے عوام میں یہ پھیلانا شروع کیا کہ یہ بدروحوں کو لوگوں کے اندر سے نکالنے کا جو کرشمہ دکھاتے ہیں یہ بھوتوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ ان کے جواب میں سیدنا مسیحؑ نے جو کچھ فرمایا وہ انجیل میں یوں نقل ہوا ہے۔

"لیکن ان میں سے (اشارہ فقیہوں اور فریسیوں کی طرف ہے) بعض نے کہا یہ تو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے .... مگر اس نے (حضرت مسیحؑ نے) ان کے خیالات کو جان کر ان سے کہا جس سلطنت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ

پڑے وہ برباد ہو جاتا ہے۔ اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہو جائے تو اس کی سلطنت کس طرح قائم رہے گی؟ (لوقا: باب ۱۱-۱۶-۱۸)

بعینہٖ یہی بات قرآن نے 'مَا یَنۡۢبَغِیۡ لَہُمۡ' کے دو لفظوں میں فرما دی ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ 'وَمَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ' وہ اس طرح کا کلام نازل کر بھی نہیں سکتے۔ قرآن نے قریش کو یہ تحدی بار بار کی کہ اگر تم اس کلام کو انسانی کلام سمجھتے ہو تو اس کے مانند کوئی کلام اپنے شریکوں شاعروں، کاہنوں اور جنوں کی مدد سے پیش کرو۔ لیکن وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ کلام جنات و شیاطین کے بس کا کام نہیں ہے۔ اگر ان کے بس کا ہوتا تو ان کے ساتھ سب سے زیادہ گہری دوستی تو قریش اور اس کے کاہنوں کی تھی۔ آخر انھوں نے ان کی مدد کیوں نہیں کی!

تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ 'اِنَّہُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ' یعنی ان کو ملأ اعلیٰ کی باتوں کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اگر تمھارا یہ گمان ہے کہ یہ ملأ اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لے لیتے ہیں تو یہ محض واہمہ ہے۔ اب تک اگر یہ کچھ کان لگانے اور ٹوہ لینے کی کوشش کرتے بھی رہے ہیں تو اب اس سے بھی روک دیے گئے ہیں۔ سورۂ جن میں خود جنات کی زبان سے ان کا اعتراف یوں نقل ہوا ہے۔

وَاَنَّا لَمَسۡنَا السَّمَآءَ فَوَجَدۡنٰہَا مُلِئَتۡ حَرَسًا شَدِیۡدًا وَّشُہُبًا ۝ وَّاَنَّا کُنَّا نَقۡعُدُ مِنۡہَا مَقَاعِدَ لِلسَّمۡعِ ؕ فَمَنۡ یَّسۡتَمِعِ الۡاٰنَ یَجِدۡ لَہٗ شِہَابًا رَّصَدًا ۝ (جن: ۸-۹)

اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ اس کو مضبوط پہرے اور شہابوں سے بھر دیا گیا ہے اور ہم اس میں مختلف ٹھکانوں میں کچھ سننے کے لیے بیٹھتے تھے لیکن اب جو کوئی کان لگائے گا تو ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

سورۂ جن کی یہ آیت نظام ملکوت میں ایک اہم انتظام کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو قرآن کو ہر قسم کی شیطانی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان شاء اللہ سورہ کی تفسیر میں ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ (۲۱۳)

چند آیات التفات

یہ اور آگے کی چند آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں۔ خطاب اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں جو عتاب ہے اس کا رخ مکذبین و منکرین کی طرف ہے۔ فرمایا کہ اصل حقیقت یہ ہے جو تم پر ظاہر کر دی گئی ہے تو تم بہر حال اللہ واحد کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ کرو بلکہ ان لوگوں کی تمام مخالفت کے علی الرغم اپنے موقف حق پر جمے رہو کہ اس عذاب سے محفوظ رہو جو ان مکذبین پر آیا چاہتا ہے۔

قریبی خاندان کو انذار کا حکم

وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۝ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (۲۱۴-۲۱۵)

یعنی اس عذاب سے جس کی خبر دی جا رہی ہے، اپنے اہل خاندان کو ہوشیار کر دو۔ یہ تمھارے

عزیز و اقارب ہیں اس وجہ سے تمہاری خیر خواہی کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی خاندان ہی تھا جس کو بیت اللہ کی تولیت اور اہل عرب کی دینی و دنیاوی پیشوائی کا منصب حاصل تھا اس وجہ سے قرابت اور سیاست دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ان کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیں۔ اگر وہ اصلاح قبول کر لیتے تو دوسروں کی اصلاح کا معاملہ بہت آسان ہو جاتا۔ اسی وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے اپنے زمانہ کے قائدین کو انذار کیا ہے۔ عوام کی طرف اس وقت توجہ فرمائی ہے جب قائدین نے اپنے رویہ سے مایوس کر دیا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے پہلے سارا زور یہود کے علماء پر صرف فرمایا لیکن جب وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے تو انھوں نے عوام کی طرف توجہ فرمائی۔ اسی پہلو سے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے عشیرۂ اقربین کے انذار کی ہدایت ہوئی کہ قرابت کا حق بھی ادا ہو جائے اور اگر وہ اصلاح قبول کر لیں تو آگے کے لیے دعوت کی راہ بھی صاف ہو جائے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ جو لوگ ایمان لا چکے تھے ان کے معاملے میں آپ کو یہ ہدایت ہوئی کہ جس طرح کسی خطرے کو محسوس کر کے مرغی اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتی ہے اسی طرح تم ان لوگوں کو اپنی شفقت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھو کہ ان میں سے کوئی غفلت کے سبب سے اس عذاب کی زد میں نہ آ جائے جس کی خبر دی جا رہی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آپ پر ایمان لانے والوں میں اس عشیرۂ اقربین کے بہت کم افراد شامل تھے جن کے اوپر انذار کی ہدایت ہوئی ہے بلکہ یہ زیادہ تر عوام کے طبقہ کے غریب و نادار لوگ تھے جن کو قریش کے اکابر نہایت حقیر سمجھتے تھے لیکن ان کے لیے اس شفقت و رحمت کی ہدایت ہوئی اور اُن کے لیے اُس انذار کی۔

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ (۲۱۶)

یعنی اگر تمہارے عشیرۂ اقربین کے لوگ تمہارے انذار کو خاطر میں نہ لائیں تو تم ان سے صاف الفاظ میں اعلانِ برأت کر دو کہ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو میں اس کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ اعلانِ برأت انذار کا آخری مرحلہ ہے۔ اس کے بعد رسول کے مکذبین کے لیے عذاب اور رسول اور اس کے ساتھیوں کے لیے ہجرت کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ یہ اعلانِ برأت تمام انبیاء علیہم السلام سے منقول ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے جس طرح اعلانِ برأت کیا وہ پیچھے گزر چکا ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (۲۱۷)

یعنی اس اعلانِ برأت کے نتائج کی پروا نہ کرو بلکہ اپنے رب عزیز و رحیم پر پورا بھروسہ رکھو کہ وہ آگے کے مراحل میں، ہر مشکل اور ہر خطرے میں، تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی مدد فرمائے گا۔

وہ عزیز ہے، اس وجہ سے جو کچھ وہ کرنا چاہے گا کر ڈالے گا۔ کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور رحیم ہے اس وجہ سے وہ اپنے ان بندوں کو اپنی رحمت سے نوازے گا جو اس کی خاطر اپنے عزیزوں قریبوں کو چھوڑیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس اعلانِ برأت کے بعد پیغمبر اور اس کے ساتھی اپنے ماحول سے کٹ کر ایک نئے ماحول سے جڑتے ہیں اور یہ نیا ماحول بالکل پردۂ خفا میں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ مرحلہ نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ اپنوں کو دشمن بنا لینا درآنحالیکہ مستقبل بالکل مجہول ہو کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ یہ بازی وہی لوگ کھیل سکتے ہیں جن کو اپنے رب پر پورا بھروسہ ہو کہ وہ عزیز بھی ہے اور رحیم بھی۔

الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ۝ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۲۱۸-۲۲۰)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی شب خیزی، فکرمندی اور طلب رضائے الٰہی میں سرگرمی و مستعدی کی نہایت شاندار و دل نواز انداز میں تعریف و تحسین ہے کہ اپنے اس رب پر پورا بھروسہ رکھو جو تمھیں اس وقت دیکھتا ہے جب تم شب میں تہجد کے لیے اٹھتے ہو، اور اس سے دعا و مناجات کرتے ہو اور یہ کوشش بھی کرتے ہو کہ تمھارے دوسرے ساتھی بھی اس شب خیزی و دعا و مناجات کی برکتوں اور سعادتوں سے بہرہ مند ہوں۔ تمھاری یہ ساری سرگرمیاں تمھارے رب کے علم میں ہیں۔ وہ سمیع و علیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس کے علم میں ہیں تو یہ ضائع جانے والی نہیں۔ تمھارا رب عزیز و رحیم ہر مشکل میں تمھاری مدد فرمائے گا۔

حِیْنَ تَقُوْمُ کی تاویل

حِیْنَ تَقُوْمُ کی تاویل میں مفسرین سے مختلف اقوال منقول ہیں اور ان میں سے ہر قول کی صحت کا احتمال ہے لیکن تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ کے قرینہ کی بنا پر میں زیادہ قوی ان لوگوں کے قول کو سمجھتا ہوں جنھوں نے اس سے قیام لیل کو مراد لیا ہے۔ ہم یہ بات مختلف مقامات پر بدلائل واضح کر چکے ہیں کہ دعوت کے مراحل جتنے ہی سخت ہوتے گئے ہیں تدریجی طور پر اتنی ہی آپؐ کی شب بیداری میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے تاکید میں بھی اضافہ ہوتا گیا ہے۔ آخری گروپ کی سورتوں میں اس کی تفصیلات ان شاء اللہ آئیں گی۔ یہاں آپؐ کی انہی سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے کہ تمھاری شب بیداریوں کو خدا دیکھ رہا ہے۔ یہ چیز ضائع جانے والی نہیں ہے۔ یہ مضمون سورۂ طور کی آیت ۴۸ اور سورۂ قٓ کی آیت ۴۰ میں بھی آئے گا۔ وہاں ہم ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ۔ تَقَلُّبٌ کے معنی آمد و شد اور ایاب و ذہاب کے ہیں۔

نبی اور صحابہؓ کی شب خیزی کی تحسین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خود شب کی دعا و مناجات کا اہتمام فرماتے تھے۔ اسی طرح اپنے صحابہ کو بھی اس کی تاکید فرماتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپؐ مسجد میں جا کر یہ روح پرور منظر دیکھتے بھی تھے کہ لوگ دعا و عبادت میں مشغول ہیں۔ اوپر آیت ۲۱۵ میں آپؐ کو مومنین کے باب میں یہ ہدایت جو فرمائی گئی کہ ان کو اپنی شفقت کے بازوؤں کے نیچے رکھو، یہ بھی اسی کا ایک پہلو ہے کہ آپؐ کی طرح آپؐ کے ساتھی بھی پوری طرح چوکنے اور بیدار رہیں۔ انجیلوں میں سیدنا مسیحؑ کے بارے میں بھی آتا ہے کہ جب

آزمائش کا آخری مرحلہ آیا ہے تو وہ ایک پہاڑی پر جا کر دعا میں مشغول ہو گئے اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت فرمائی کہ وہ جاگیں اور دعا کریں کہ فتنہ میں نہ پڑیں۔ پھر وہ بار بار اپنے شاگردوں کے پاس یہ دیکھنے کے لیے آئے کہ وہ دعا کر رہے ہیں یا نہیں۔ شاگرد سو جاتے تو وہ ان کو بار بار جگاتے کہ دعا کرو تا کہ فتنہ سے محفوظ رہو۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ اوپر توکل کی ہدایت کے ساتھ اپنی صفات عزیز و رحیم کا حوالہ دیا ہے۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی شب بیداریوں کا حوالہ دینے کے بعد اپنی صفات سمیع و علیم کا حوالہ دیا ـــــ موقع و محل بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انہی صفات کے استحضار پر توکل کی بنیاد ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ؕ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۙ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (۲۲۱-۲۲۲)

شیاطین کن پر اترتے ہیں؟

اوپر کی آیات میں آپ نے دیکھا کہ پوری وضاحت کے ساتھ قرآن کے منبع و مصدر، اس کے مامون و محفوظ واسطۂ نزول اور اس کے پاک و مطہر حامل کا ذکر ہوا ہے اور اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ یہ کوئی القائے شیطانی ہے۔ یہ ساری باتیں قرآن کے ان مخالفین کی تردید میں فرمائی گئی ہیں جو نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ آپؐ ایک کاہن ہیں اور جس طرح کاہنوں پر شیاطین غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں اسی طرح ان پر بھی شیاطین یہ کلام القاء کرتے ہیں جس کو یہ ہمارے سامنے وحی الٰہی کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اب یہ خلاصۂ بحث کے طور پر ان الزام لگانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا اگر تم فی الواقع یہ جاننا چاہتے ہو کہ شیاطین کن پر اترتے ہیں تو آؤ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ یہ کن پر اترتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ ان لپاڑیوں اور نابکاروں پر اترتے ہیں جو ان کی طرف کان لگاتے ہیں اور ان میں اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کاہنوں کی تصویر ہے جن کے دام فریب میں مشرکین عرب پھنسے ہوئے تھے۔ ان صفات کے ساتھ ان کا ذکر کر کے، ان کا پورا کردار سامنے کر دیا ہے۔ ان کی پہلی صفت یہ بتائی ہے کہ یہ 'اَفَّاكٍ' یعنی بالکل لاغی، دروغ باف اور لپاڑیے ہوتے ہیں۔ یہ سادہ لوحوں کو بیوقوف بنانے کے لیے طرح طرح کے جھوٹ گھڑتے ہیں اور پھر اس دعوے کے ساتھ ان کو پیش کرتے ہیں کہ یہ باتیں ان پر غیب سے القاء ہوئی ہیں۔ ان کی دوسری صفت 'اَثِيْمٌ' بیان ہوئی ہے یعنی اخلاقی اعتبار سے یہ ہر قسم کے گناہوں میں آلودہ ہیں۔ آخر میں ان کے اس بھگل کی تصویر پیش کی گئی ہے جو عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ لوگ اختیار کرتے تھے۔ ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ احمق لوگ جب کسی معاملے میں غیب کی باتیں معلوم کرنے کے لیے ان سے رجوع کرتے تو یہ لوگ کچھ عملیاتِ سفلیہ کے ساتھ مراقبہ کرتے اور پھر ایک مقفّٰی کلام کی صورت میں (جو اکثر بالکل بے معنی یا ذو معانی ہوتا) اپنا الہام پیش کرتے کہ یہ ان پر غیب سے فلاں جن نے القاء کیا ہے۔ ان کے اس مراقبہ کو یہاں 'القائے سمع' سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ وہ مراقبہ میں اس طرح بیٹھتے گویا ہاتف غیب سے کوئی بات سننے کے لیے کان لگائے ہوتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ

رہے کہ مراقبہ کا یہ طریقہ تمام مشرک قوموں میں رہا ہے۔ کاہن، پروہت، جوگی، عامل، متصوفین اور قبروں کے مجاورین اسی طرح کی نمائش کر کے ارواحِ غیب سے رابطہ پیدا کرنے کا دعویٰ کرتے اور لوگوں کو بیوقوف بناتے رہے ہیں۔

کہانت کے جھوٹے مدعی

وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ کاہنوں میں بعض بعض تو عملیاتِ سفلیہ کے جاننے والے ہوتے اور ان کے ذریعہ سے وہ بعض جنات سے تعلق پیدا کر لیتے تھے جو ان پر جھوٹ سچ کچھ القاء بھی کرتے تھے لیکن اکثر کاہن محض اس پیشہ کو عوام فریبی کا ایک کامیاب پیشہ سمجھ کر کاہن ہونے کے مدعی بن جاتے اور لوگوں کو اُلّو بناتے پھرتے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں سے اکثر اپنے اس باطل پیشۂ کہانت میں بھی سچے نہیں ہیں بلکہ جھوٹے ہیں۔ اگر ایک شخص ساحر ہو اور وہ اپنے کو ساحر کی حیثیت سے پیش کرے تو گو سحر و ساحری ایک باطل شے ہے لیکن وہ اپنے دعوے میں سچا ہے لیکن ایک شخص ساحر نہ ہو اور ساحر ہونے کی نمائش کرے تو وہ لپاٹیا ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۝ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۲۴-۲۲۷)

آنحضرتؐ پر شاعر ہونے کے الزام کی تردید

اوپر کی آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کہانت کے الزام کی تردید ہوئی۔ اب آگے کی آیات میں شعر و شاعری کے الزام کی تردید آ رہی ہے۔ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر یا قرآن کو جو شعر کہتے تھے تو شعر یا شاعری کے معروف معنی میں نہیں کہتے تھے۔ آخر وہ ایسا کہہ بھی کیسے سکتے تھے، معروف معنی میں نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنے کی کوئی وجہ تھی اور نہ قرآن کو شعر کہنے کی۔ اصل یہ ہے کہ جب قریش نے دیکھا کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت دلوں کو مفتوح کرتی جا رہی ہے اور اس طرح اس کے خدائی کتاب ہونے کا دعویٰ روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا ہے تو اس کے توڑ کے لیے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن میں جو بلاغت و جزالت ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی کلام ہے بلکہ جس طرح ہمارے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں بلاغت ہوتی ہے اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام میں بھی بڑی بلاغت ہے جو دلوں کو مسحور کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ ان کو اگر رکھو تو اپنے بلند رتبہ شاعروں ہی کے درجے میں رکھو، ان کو خدا کا رسول اور ان کے کلام کو وحیِ الٰہی کا درجہ و مرتبہ دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے اندر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اہلِ عرب یہ تصوّر رکھتے تھے کہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ یہ تصوّر دے کر وہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ دعویٰ کہ ان کے اوپر خدا کی طرف سے ایک فرشتہ یہ کلام لے کر اترتا ہے محض واہمہ ہے۔ یہ فرشتہ نہیں بلکہ اسی طرح کا کوئی جن ہے جس طرح کا جن ہر بڑے شاعر کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

الزام لگانے والوں کے اس ذہنی پس منظر کو سامنے رکھ کر اب قرآن کے جواب پر غور کیجیے۔ قرآن نے یہاں تین کسوٹیاں معترضین کے سامنے رکھ دی ہیں کہ ان پر پرکھ کر وہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ کلام شعر اور اس کا پیش کرنے والا کوئی شاعر ہے یا یہ کلام، کلام ربانی اور اس کا سنانے والا اللہ کا رسول ہے۔

فیصلہ کے لیے تین کسوٹیاں پہلی کسوٹی: درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ (٢٢٤) پہلی کسوٹی یہ ہے کہ درخت اپنے پھل اور آدمی اپنے ساتھیوں سے پہچانا جاتا ہے۔ تم اپنے شاعروں کو دیکھو کہ ان کے کلام نے کس طرح کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا اور ان کو متاثر کیا ہے اور پھر پیغمبرؐ کو دیکھو کہ ان کے کلام و پیغام نے کس طرح کے لوگوں کو اپنی طرف جذب کیا ہے؟ اگر انصاف سے دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ ان شعراء کے ساتھی گمراہ، اوباش، عیاش اور شر پسند قسم کے لوگ بنے ہیں اور اس کے بالکل برعکس پیغمبرؐ کے کلام نے ان لوگوں کو متاثر کیا ہے جو شریف نیک طینت، صالح فطرت اور خدا ترس ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عرب کی سوسائٹی میں شاعری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عوام کی باگ بالکل انہی کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہ جو آگ بھڑکا دیتے ان کے پیرو عوام نتائج سے بے پروا ہو کر، بے خطر اس میں کود پڑتے۔ بکر و تغلب کی مشہور لڑائی، جس کے متعلق مشہور ہے کہ نصف صدی تک جاری رہی، اس کی آگ بھڑکانے میں سب سے زیادہ دخل مشہور شاعر مہلہل کے اشعار کو تھا۔ اخلاقی اعتبار سے اس شاعری کا جو حال تھا اس کا اندازہ ان کے سب سے بڑے شاعر امرء القیس کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے بڑے شاعروں میں اس کی فحاشی کی مثال نہیں مل سکتی۔ یہاں تک کہ اہل عرب بھی، اس کو اپنا سب سے بڑا شاعر ماننے کے باوجود اس کو الملک الضلیل، 'رند بادشاہ' کہتے تھے۔ اس کی شاعری میں اگر مکارم اخلاق کی باتیں ملتی ہیں تو وہ بطور مفاخر کے ملتی ہیں اور ان کے ساتھ بھی ایسے گھنونے مفاسد چپکے ہوئے تھے کہ ان کا ضرر ان کے نفع پر غالب ہو گیا تھا۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں جوئے اور شراب کی بحث میں ہم اس مسئلہ پر لکھ آئے ہیں۔ تفصیل کی ضرورت ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ظاہر ہے کہ جو شاعر اس مزاج اور اس قماش کے ہوں گے وہ اسی قسم کے لوگوں کو اپنے اردگرد جمع کر سکیں گے جو ان کے ہم مشرب اور ہم رنگ ہوں۔

دوسری کسوٹی: شاعروں کا کوئی معین ہدف نہیں ہوتا

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ (٢٢٥) یہ دوسری کسوٹی ہے کہ ان شاعروں کی شاعری کا کوئی معین ہدف نہیں۔ جو وارد وہ دل پر گزر گیا، اگر اس کو ادا کرنے کے لیے ان کو کوئی اچھوتا اسلوب ہاتھ آ گیا تو اس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیں گے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رحمانی ہے یا شیطانی، روحانی ہے یا نفسانی، اس سے خیر کی تحریک ہو گی یا شر کی۔ ان کے اشعار پڑھیے تو ایک شعر سے معلوم ہو گا کہ ولی ہیں، دوسرے شعر سے معلوم ہو گا کہ شیطان ہیں۔ ایک ہی سانس میں وہ نیکی اور بدی دونوں کی باتیں بے تکلف کہتے ہیں اور چونکہ اچھوتے اور مؤثر اسلوب سے کہتے ہیں اس وجہ سے پڑھنے والے دونوں

سے متاثر تو ہوتے ہیں لیکن نفس کو زیادہ مرغوب چونکہ بدی کی باتیں ہیں اس وجہ سے اس کے نقوش تو دلوں پر قائم رہ جاتے ہیں، نیکی کا اثر غائب ہو جاتا ہے اور اس طرح اگر ان کے کلام میں کچھ افادیت ہوتی بھی ہے تو وہ ان کے تضادِ فکر میں غائب ہو جاتی ہے ___ جھاڑ جھنکاڑ کے جنگل میں اگر کچھ صالح پودے بھی لگا دیے جائیں تو وہ مثمر نہیں ہوتے۔

اس کے بالکل برعکس قرآن کی ہم آہنگی و ہم رنگی کا حال یہ ہے کہ اس کا مخصوص و معین ہدف ہے اور شروع سے لے کر آخر تک اس کی ہر آیت اسی ہدف پر پہنچتی ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ اس کے اندر کوئی کسی تضاد و تناقض کی نشان دہی کر سکے اور قرآن نے اپنے اس معین ہدف کی صداقت ایسے مضبوط دلائل سے ثابت کر دی ہے کہ ایک ہٹ دھرم کے سوا کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے کلام کو شعر اور اس کے پیش کرنے والوں کو شاعر کہنے کا کیا تک ہے!

تیسری کسوٹی: شاعر صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (۲۲۶) یہ تیسری کسوٹی ہے کہ شاعر گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے غازی نہیں ہوتے۔ وہ اپنے شعروں میں تو اپنے آپ کو رزم کے رستم و اسفندیار اور کوچۂ عشق کے مجنوں و فرہاد کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن یہ محض لاف زنی ہوتی ہے، عملی اعتبار سے وہ بالکل صفر ہوتے ہیں۔ وہ خیالی دنیا میں رہتے ہیں اور ان کی ساری رزم و بزم بالکل خیالی ہوتی ہے۔ جن مکارمِ اخلاق کی تعریف میں وہ آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں ان پر عمل کرنے کی انھیں کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ اسی طرح اپنی جس رندی کا وہ اپنے شعروں میں اشتہار دیتے ہیں وہ بھی درحقیقت اپنی ہوس کا اشتہار دیتے ہیں۔ عملی اعتبار سے وہ اس میں بھی بزدل ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس پیغمبر کو دیکھو کہ وہ جو کلام پیش کر رہے ہیں اس کا سب سے بڑا عملی نمونہ وہ خود ہیں۔ جس خدا ترسی، جس بندگیٔ رب، جس ایثار اور جس قربانی کی دعوت وہ خلق کو دیتے ہیں اس پر سب سے آگے بڑھ کر اور سب سے زیادہ عمل وہ خود کرتے ہیں اور ان کا کٹر سے کٹر دشمن بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ ان کا کوئی قول و فعل ہر مو اس کتاب سے منحرف ہے جو وہ لوگوں کو خدا کی کتاب کی حیثیت سے سنا رہے ہیں تو ایک ایسے قدسی صفات شخص کو ان شاعروں کی صف میں کھڑے کرنے کے کیا معنی جن کے اقوال و اعمال میں ادنیٰ مطابقت بھی نہیں ہے!

دربارِ رسالت کے شعراء کا استثناء

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۲۷) یہ اس عام کلیہ سے جو شعراء سے متعلق مذکور ہوا، استثناء ہے اور یہ اشارہ ہے دربارِ رسالت کے شاعروں کی طرف۔ فرمایا کہ یہ لوگ بےشک ایمان کی دولت سے بہرہ مند ہیں۔ ایمان نے ان کی شاعری کا ایک ہدف معین کر دیا ہے اس وجہ سے یہ چوپاٹی تیر نہیں پھینکتے بلکہ ان کا ہر شعر کلمۂ حق کی حمایت میں اور رفعِ ذکرِ الٰہی کے لیے ہوتا ہے اور

یہ صرف گفتار کے غازی نہیں ہیں بلکہ تقویٰ اور عملِ صالح کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا یعنی ان کے کلام میں عشق و ہوس اور مفاخر و مطاعن کے بجائے زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر اور اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے۔ وَانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا یعنی اگر انھوں نے اپنے شعروں میں دوسروں سے متعلق کچھ کہا ہے تو وہ ہجو نہیں ہے بلکہ اپنے حق کی حمایت و مدافعت میں کہا ہے جب کہ ان پر زیادتی کی گئی ہے۔ ہر مظلوم کو اپنی اور دوسرے مظلوموں کی مدافعت کا حق حاصل ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ۔ جب ان لوگوں کی مظلومی کا ذکر آگیا تو ساتھ ہی ان ظالموں کے انجام کی طرف بھی اشارہ فرما دیا جو اس ظلم کے مرتکب ہوئے۔ فرمایا کہ ابھی تو ان کے ظلم کی مدافعت زبان سے ہو رہی ہے لیکن عنقریب وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں!

شعراء اور ان کی شاعری پر قرآن نے یہ تنقید جو کی ہے اگرچہ اصلاً اس کا تعلق جاہلیت کے شعراء اور ان کی شاعری سے ہے لیکن انصاف سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تنقید ٹھیک ہمارے شعراء اور ان کی شاعری پر بھی منطبق ہو رہی ہے۔ اور یہ بات میں ان عام شاعروں کو سامنے رکھ کر نہیں عرض کر رہا ہوں جو صرف تک بندی کرتے ہیں۔ ایسے شاعروں کی خرافات پڑھنے کا اتفاق مجھے کبھی مشکل ہی سے پیش آیا ہے۔ میں یہ بات ان بلند رتبہ شاعروں کو پیش نظر رکھ کر عرض کر رہا ہوں جن کے شاعر ہونے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن کی اس کسوٹی پر ان کے کلام کو جانچیے تو مشکل سے گنتی کے چند شاعر ایسے نکلیں گے جو اس کسوٹی پر پورے اتریں گے۔ باقی سب فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ اور يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ کے مصداق اور ان کے مداح اور پیرو بھی انہی کی طرح غَاوُونَ میں داخل ہیں۔

ہمارے شعراء اور ان کی شاعری

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ جو باتیں قلم سے صحیح نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صحیح نکلی ہیں اور اگر کوئی بات غلط نکلی ہے تو وہ میرے علم کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ضرر سے مجھ کو بھی محفوظ رکھے اور اس کتاب کے قارئین کو بھی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین۔

رحمان آباد

۲۰ جنوری ۱۹۷۴ء

تدبرِ قرآن

۲۷

النّمل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ یہ قرآن کوئی شاعری اور کہانت نہیں ہے بلکہ اللہ کا اتارا ہوا کلام ہے لیکن جو لوگ اس پر ایمان نہیں لانا چاہتے وہ اس کے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن ان کو جس چیز سے ڈرا رہا ہے جب وہ اس کو دیکھ لیں گے تب اس پر ایمان لائیں گے اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ وہ عذاب کو دعوت دینے کے بجائے رسولوں اور ان کے جھٹلانے والوں کی تاریخ سے سبق حاصل کریں۔ اس سورہ میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و بشارت بنا کر نازل فرمایا ہے لیکن اس پر ایمان وہی لائیں گے جن کے دلوں کے اندر آخرت کا خوف ہے۔ جو لوگ اس دنیا کے عیش و آرام میں مگن ہیں وہ اپنے ان مشاغل سے دستبردار نہیں ہو سکتے جن میں وہ مشغول ہیں۔ ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دیے گئے ہیں کہ اب کوئی تذکیر و تنبیہ بھی ان پر کارگر نہیں ہو سکتی۔ پچھلی سورہ میں بحث کی بنیاد صفاتِ الٰہی میں سے صفات — عزیز و رحیم — پر رکھی ہے جن کے تمام پہلوؤں کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اس سورہ کی بنیاد صفات — حکیم و علیم — پر ہے کہ یہ قرآن خدائے حکیم و علیم کا اتارا ہوا ہے تو وہ جو کچھ کرے گا وہ حکمت اور علم پر مبنی ہوگا۔ پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو اپنے ربِ حکیم و علیم پر بھروسہ رکھنا چاہیے کہ وہ ان کو اچھے انجام سے ہمکنار کرے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) سورہ کی تمہید، جو سورۂ بقرہ کی تمہید سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ اس میں واضح فرمایا ہے کہ یہ قرآن بجائے خود نہایت واضح اور عقل و دل کو اپیل کرنے والی کتاب ہے، لیکن جو لوگ آخرت کو نہیں ماننا چاہتے وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ وہ جن دلچسپیوں میں منہمک ہیں شیطان نے ان کی نگاہوں میں وہ اس طرح کھبا دی ہیں کہ اب وہ ان کے پیچھے اندھے ہو چکے ہیں۔ وہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔

(۷-۱۴) حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا ابتدائی حصہ جس میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کو نہایت واضح نو نشانیوں کے ساتھ فرعون کے پاس رسول بنا کر بھیجا لیکن فرعون اور اس کی قوم نے یہ یقین کرنے کے باوجود کہ یہ خدائی نشانیاں ہیں حضرت موسیٰؑ کی رسالت تسلیم نہیں کی اور بالآخر وہ ہلاک ہو کر رہے۔

(۱۵-۴۴) اللہ تعالیٰ کے صالح و مصلح بندوں کا ذکر کہ نعمت ان کو اندھا نہیں بناتی بلکہ جتنا ہی ان نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اتنی ہی منعمِ حقیقی کے آگے ان کی فروتنی اور سرافگندگی بڑھتی جاتی ہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہما السلام

پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہوئے ان میں سے بعض کا حوالہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعمت و جاہ اور حکمت و سائنس میں سے جو کچھ ان کو بخشا وہ کسی کو بھی نہیں بخشا لیکن انھوں نے ہر نعمت کو اللہ کا فضل جانا اور یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھی کہ یہ نعمتیں دے کر اللہ تعالیٰ ان کا امتحان کر رہا ہے کہ وہ اس کے شکر گزار بندے بنتے ہیں یا ناشکرے۔

(۴۵-۵۳) مفسدین فی الارض کے انجام کو واضح کرنے کے لیے قوم ثمود کی مثال کا حوالہ۔ پچھلی سورہ میں بھی ان کے فساد فی الارض کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس سورہ میں اس کی مزید وضاحت ہوئی ہے کہ ان کی جمعیت بہت بھاری تھی۔ ان کے نو نہایت جنگجو قبائل تھے اور یہ برابر جنگ و فساد میں سرگرم رہتے تھے۔ حضرت صالحؑ نے ان کی اصلاح کی کوشش کی لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی بات سنی نہیں بلکہ ان کے قتل کے بھی درپے ہو گئے۔ بالآخر ان پر اللہ کا فیصلہ کن عذاب آیا اور ان کی پرشوکت تعمیرات جن پر ان کو ناز تھا، کھنڈروں کی شکل میں تبدیل ہو گئیں۔ ان کھنڈروں کے آثار قریش کی عبرت کے لیے موجود تھے۔

(۵۴-۵۸) قوم لوطؑ کی سرگزشت کی طرف اجمالی اشارہ۔ حضرت لوطؑ نے ان کے اخلاقی فساد کی اصلاح کی کوشش فرمائی اور اس کے برے انجام سے ان کو ڈرایا لیکن وہ ان کی بات سننے کے بجائے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنے اندر سے نکال دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں کہ ہمیں نصیحت کرنے اٹھے ہیں۔ بالآخر ان پر بھی خدا کا عذاب آیا جس نے ان کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ ان کے آثار پر سے بھی قریش کو اکثر گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔

(۵۹-۶۸) اس کائنات کی گوناگوں نشانیوں اور نعمتوں میں سے ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے مخاطبوں سے سوال کہ ان میں سے کس چیز کو تم خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکتے ہو؟ جب ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب نہیں کر سکتے تو آخر اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی کیوں پرستش کرتے ہو اور ان کے بل پر اللہ اور اس کے رسول سے کیوں لڑنے اٹھ کھڑے ہوئے ہو! آخر میں اس بات کی طرف اشارہ کہ جہاں تک شرک اور [illegible] کا تعلق ہے ان کے حق میں تو کوئی دلیل یہ پیش نہیں کر سکتے لیکن آخرت کے معاملے میں یہ سخت تضاد فکر میں مبتلا ہیں۔ اس کو یہ محض اگلوں کا افسانہ کہتے ہیں اور یہی چیز درحقیقت ان کی ساری سرکشی کا سبب ہے۔

(۶۹-۹۳) خاتمۂ سورہ، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ نہ ان کے حال پر غم کرو، نہ ان کی چالوں سے پریشان ہو۔ اگر یہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ جو مہلت ملی ہوئی ہے اس پر اللہ کا شکر کرو، اپنی شامت نہ بلاؤ۔ تم اپنا فرض ادا کر دو۔ اگر یہ نہیں سنتے تو تمھارا کام مُردوں اور بہروں کو سنانا نہیں ہے۔ تم یہ اعلان کر دو کہ مجھے اسی قرآن کے سنانے کی ہدایت ہوئی ہے۔ جو اس پر ایمان لائے گا اس کا نفع اسی کو پہنچے گا اور جو اس کا انکار کرے گا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میں صرف ایک مُنذر ہوں۔ لوگوں پر کوئی داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجا گیا ہوں۔

سُوْرَةُ النَّمْلِ (۲۷)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰیَاتُهَا ۹۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۶ طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝١ هُدًى وَّبُشْرٰى
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝٢ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝٣ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝٤ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ
الْعَذَابِ وَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝٥ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى
الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝٦ الثلثة

ترجمۂ آیات ۱-۶ یہ طٰسٓ ہے۔ یہ قرآن اور ایک واضح کتاب کی آیات ہیں۔ یہ ہدایت و بشارت ہے ان ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہی ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۱-۳

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے ہیں، پس وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے دنیا میں بھی برا عذاب ہے اور آخرت میں وہی ہیں جو بڑے خسارے میں ہوں گے۔ اور بے شک یہ قرآن تم کو ایک

حکیم و علیم کی طرف سے تعلیم کیا جا رہا ہے۔ ۴-۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۱)

'طٰسٓ' یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔

(قرآن اپنے دعوے پر خود حجت ہے)

'تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ'۔ لفظ 'قُرْاٰن' کتاب آسمانی کے لیے معروف ہے اس کے ساتھ 'کِتَابٍ مُّبِیْنٍ' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ یہ اپنے ہر دعوے پر خود ایسی حجت ہے کہ اس کی صحت و صداقت کو جانچنے کے لیے کسی خارجی شہادت اور کسی معجزہ و نشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ صفت یہاں اس کے ان معترضین و مخالفین کو سامنے رکھ کر لائی گئی ہے جو اس کی تصدیق کے لیے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہاں ان دونوں لفظوں نے اس کی عظمت کے پہلو کو بھی واضح کر دیا ہے اور اس کی حجت کے پہلو کو بھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کا اتارا ہوا قرآن ہے کوئی مذاق و استہزا کی چیز نہیں ہے اور اتمامِ حجت کے پہلو سے یہ خود اپنے وجود کے اندر مکمل ہے تو جو لوگ اس کو ہنسی مسخری میں ٹالنا چاہتے ہیں وہ سوچ لیں کہ ان کی اس حرکت کے نتائج کیا کچھ نکل سکتے ہیں!

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ (۲-۳)

(قرآن ہدایت و بشارت ہے)

یعنی اس کے مخالفین اس کی قدر کریں یا نہ کریں لیکن یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت و بشارت بن کر نازل ہوئی ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کو یہ زندگی کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی بھی کر رہی ہے اور دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح کی بشارت بھی دے رہی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا ذکر یہاں ان اہلِ ایمان کی جامع صفت کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ ان دونوں چیزوں کی حیثیت دین میں تمام نیکیوں کے شیرازے کی ہے، خواہ وہ حقوق اللہ سے تعلق رکھنے والی ہوں یا حقوق العباد سے۔ ان کا ذکر ہو گیا تو گویا سب کا ذکر ہو گیا۔

(جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں وہی اس قرآن پر ایمان لائیں گے)

'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ'۔ میں حصر اور تاکید کا اسلوب یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو لوگ نماز اور زکوٰۃ کا یہ اہتمام کر رہے ہیں درحقیقت وہی لوگ آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں اور اسی چیز نے ان کو اس کتاب پر ایمان لانے کی توفیق بخشی ہے۔ رہے وہ لوگ جن پر یہ چیزیں شاق ہیں تو وہ آخرت کے یقین سے محروم ہیں اور اس قسم کے لوگ اس کتاب پر ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ (۴)

منکرین قرآن کا سبب انکار

یہ منکرین کے اصل سبب انکار کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں بلکہ اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی نگاہوں میں ان کے اعمال اس طرح کھبا دیے گئے ہیں کہ اب ان سے ہٹ کر کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔ یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ جو لوگ اسی دنیا کو مقصود و مطلوب بنا کر اپنی تمام ذہانت و قابلیت اسی کی طلب میں لگا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال و مشاغل کو اس طرح ان پر مسلط کر دیتا ہے کہ پھر نہ وہ ان کے چھوڑنے ہی پر آمادہ ہوتے اور نہ ان سے چھوٹ ہی سکتے۔ وہ انہی کے اندر بھٹکتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک دن فرشتۂ اجل آکر ان کو دبوچ لیتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۵)

مکذبین رسول پر اس دنیا میں بھی عذاب آیا

اس آیت میں عذاب آخرت کا چونکہ مستقلاً ذکر ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ 'سُوْٓءُ الْعَذَابِ' کا تعلق عذاب دنیا سے ہے۔ یہاں ذکر مکذبین رسول کا ہے اور مکذبین رسول پر اس دنیا میں بھی، جیسا کہ ہم اس کے محل میں ذکر کر چکے ہیں، لازماً عذاب آتا ہے اس وجہ سے فرمایا کہ ان کے لیے دنیا میں بھی برا عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔ 'وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ' میں اسی طرح حصر اور تاکید کا اسلوب ہے جس طرح اوپر 'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ' میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ساری زندگی چونکہ دنیا ہی کو مطلوب و مقصود بنا کر گزاری، آخرت کا ان کو کبھی دھیان ہی نہیں آیا، یہاں تک کہ اسی دنیا کے عشق میں انھوں نے قرآن کا بھی مذاق اڑایا تو آخرت میں سب سے زیادہ خسارے میں تو یہ لوگ ہوں گے ہی!

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (۶)

آنحضرتؐ کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لاتے بلکہ تمھاری مخالفت کے درپے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو بلکہ مطمئن رہو کہ یہ کلام تمھارے اوپر جس ذات کی طرف سے اتارا جا رہا ہے وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے تو جو کچھ اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہوگا وہی ہوگا اور اسی میں تمھارے لیے خیر ہے۔ جب وہ حکیم و علیم تمھارے اوپر اس کلام کو نازل فرما رہا ہے تو وہ تمھیں تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ ہر قدم پر تمھاری رہنمائی فرمائے گا اور تمھیں منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷-۱۴

آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے اس حصہ کا اجمالی حوالہ ہے جب ان کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اور نو معجزات سے مسلح کر کے ان کو فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت فرمائی۔ یہاں اس سرگزشت کے حوالہ سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر تین باتوں کی طرف

متوجہ کرتا ہے۔

پہلی یہ کہ آپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح قرآن کی وحی سے سرفراز فرمایا جس طرح حضرت موسیٰ کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے جو آپ پر ہوا ہے۔ نہ آپ کو اس نئے تجربے سے پریشان ہونا چاہیے اور نہ دوسروں کو اس سے متوحش ہونے کی کوئی وجہ ہے۔

دوسری یہ کہ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے ایک دو نہیں بلکہ اکٹھے نو معجزات دیے اور جن لوگوں کو وہ معجزے دکھائے گئے ان کو یقین تھا کہ یہ خدائی معجزات ہیں لیکن پھر بھی وہ ایمان نہیں لائے۔

تیسری یہ کہ مفسدین کو اللہ تعالیٰ ایک خاص مدت تک ڈھیل دینے کے بعد لازماً فنا کر دیتا ہے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷-۱۴

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا
بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ (٧) فَلَمَّا
جَاءَهَا نُودِيَ أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ
اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (٨) يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (٩)
وَأَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّىٰ مُدْبِرًا وَلَمْ
يُعَقِّبْ ۚ يَا مُوسَىٰ لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ (١٠)
إِلَّا مَن ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ (١١)
وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۖ فِي
تِسْعِ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (١٢)
فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (١٣) وَجَحَدُوا
بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ (١٤) ع

ترجمۂ آیات ۷-۱۴

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا، میں نے ایک آگ سی دیکھی ہے۔ میں وہاں سے یا تو کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا کوئی انگارا تاکہ تم تاپو۔ تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے اردگرد ہیں! اور پاک ہے اللہ، عالم کا خداوند! ۷-۸

اے موسیٰ، یہ تو میں ہوں، خدائے عزیز و حکیم! اور تم اپنا عصا ڈال دو۔ تو جب اس نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا گویا سانپ ہو تو وہ پیچھے کو مڑا اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ ڈرو نہیں، میرے حضور پیغمبروں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ ہاں مگر جو کسی برائی کا مرتکب ہوا پھر اس نے برائی کے بعد اس کو بھلائی سے بدل دیا تو میں بخشنے والا اور مہربان ہوں۔ ۹-۱۱

اور تم اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو، وہ بغیر کسی مرض کے سفید نکلے گا۔ نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس جاؤ۔ وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔ پس جب ان کے پاس ہماری آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں آئیں انھوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ اور انھوں نے ظلم اور گھمنڈ کے سبب سے ان کا انکار کیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کو تسلیم کیا تو دیکھو کیا ہوا ان مفسدین کا انجام! ۱۲-۱۴

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ (۷)

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت حضورؐ کے لیے سبق آموز

حضرت موسیٰؑ کی یہ سرگزشت پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے اور اس کے ہر جزو کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ یہاں ہم اس کے صرف اس پہلو کو مدِ نظر رکھیں گے جس کا تعلق سورہ کے نظام سے ہے۔ نبوت و رسالت کے

متعلق یہ بات معلوم ہے کہ یہ کوئی عام تجربے کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تجربہ صرف انہی لوگوں کو ہوا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس کارِ خاص کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ اس وجہ سے جن کو یہ چیز عطا ہوئی ان کو بھی اس کے اسرار و رموز سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگا اور جن کے سامنے اس کی دعوت پیش کی گئی انھوں نے بھی اس کو بالعموم ایک انوکھی اور عجیب چیز سمجھا اور اس کے خلاف طرح طرح کے شبہات و اعتراضات اٹھائے۔ ان دونوں ہی چیزوں کا واحد علاج یہی ہو سکتا تھا کہ ان نبیوں کے حالات سنائے جائیں جو اس سلسلہ کے تمام مراحل سے گزر چکے تھے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے مشاہدات و تجربات سے طمانیت و سکینت حاصل ہو اور آپ کے معترضین و مخالفین پر بھی ان کی حجت قائم ہو سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر آپ سے سب سے زیادہ مشابہ نبی و رسول سیدنا موسیٰ تھے جن کی زندگی کے حالات بھی تفصیل کے ساتھ تورات میں موجود تھے اور ان پر ایمان کی مدعی ایک قوم بھی موجود تھی جو بدقسمتی سے قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی، جیسا کہ آگے اس سورہ میں بھی اس کی طرف اشارہ آئے گا، مخالفت کر رہی تھی۔ اس وجہ سے حضرت موسیٰ کے حالات و تجربات اس مرحلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی سب سے زیادہ تسکین بخش ہو سکتے تھے اور مخالفین کے لیے بھی سب سے زیادہ سبق آموز ہو سکتے تھے بشرطیکہ وہ ان سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ انہی دونوں مقصدوں سے یہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے۔ مخاطب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں لیکن روئے سخن مخالفین کی طرف بھی ہے۔

نبوت ایک موہبتِ ربانی ہے

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نبوت و رسالت ایک خاص موہبتِ ربانی اور فضلِ یزدانی ہے۔ اس کو اکتساب یا طلب و تمنا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مصنف، شاعر، خطیب، کاہن، ساحر، منجم، جوتشی اور اس قبیل کے سارے ہی لوگ اپنے فن اور پیشہ کو سیکھنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور اس کی طلب و تمنا میں ایک عمر کھپاتے ہیں تب کہیں ان کو اپنے فن میں کچھ درخور حاصل ہوتا ہے لیکن نبی و رسول کی تربیت اللہ تعالیٰ خود اپنی نگرانی میں کرتا ہے۔ نبی نہ کسی کا شاگرد ہوتا، نہ وہ کسی مدرسہ میں بیٹھتا اور نہ اس کے ذہن میں نبوت کا کوئی گمان یا ارمان ہوتا بس اللہ تعالیٰ ہی، زندگی کے نشیب و فراز کے امتحانوں سے گزار کر، اس کو اس کارِ خاص کے لیے تیار کرتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی تربیت مصر کے زندان میں ہوئی۔ حضرت داؤدؑ نے اپنی نسبت خود فرمایا ہے کہ "مجھے خداوند نے بھیڑ سالہ سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا" اسی طرح حضرت موسیٰ، جن کی سرگزشت یہاں بیان ہو رہی ہے، مدین میں حضرت شعیبؑ کی بکریاں چراتے رہے۔ وہاں سے مصر کے لیے واپس ہوتے ہوئے اندھیری اور ٹھنڈی رات میں راستہ بھول گئے۔ دور سے ایک روشنی دکھائی دی۔ انھوں نے گھر والوں سے کہا تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ مجھے آگ نظر آئی ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں، اگر کچھ لوگ وہاں ہوئے تو ان سے راستہ کا پتہ کرتا ہوں ورنہ آگ ہی کا کوئی انگارہ لاتا ہوں کہ تم لوگ اس سردی میں تاپ سکو۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ط وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸)

رب العالمین کی ندا حضرت موسیٰؑ کو

حضرت موسیٰ تو آگ لینے گئے لیکن وہاں یہ آواز سنائی دی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں۔ مجہول کا صیغہ ابہام اور تفخیم کو ظاہر کر رہا ہے یعنی حضرت موسیٰ کو ایک ہاتف کی آواز تو سنائی دی لیکن وہ یہ متعین نہ کر سکے کہ یہ کس کی آواز ہے اور کہاں سے آ رہی ہے۔ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا یہ اسی آواز کی تفصیل ہے کہ یہ آگ نہیں ہے بلکہ اس روشنی کے پردے میں اللہ تعالیٰ کی بابرکت ذات اپنے بابرکت کروبیوں کے جلو میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اپنی اور اپنے کروبیوں دونوں کی مبارکی کا حوالہ اس موقع پر صرف بیانِ حقیقت کے لیے نہیں بلکہ حضرت موسیٰ کو مانوس کرنے کے لیے بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ حضرت موسیٰؑ کے لیے نہایت اہم تھا۔ دامنِ کوہ اور اندھیری رات میں، بالکل خلافِ توقع، اس آواز کو سن کو حضرت موسیٰؑ پر نہیں معلوم کیا گزری ہوگی اور نہ معلوم کیا گزرتی اگر اس کا پہلا ہی کلمہ برکت کی بشارت کا نہ ہوتا۔ اس مبارک کلمہ نے حضرت موسیٰؑ کی بڑی ڈھارس بندھائی ہوگی کہ جو آواز ان کو سنائی دی ہے اس کے پیچھے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ یہ منبع خیر و برکت سے ایک بابرکت آواز آئی ہے۔

وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تنزیہہ کا کلمہ ہے اور یہ اسی مضمون کی تاکید مزید ہے جو اوپر والے ٹکڑے میں بیان ہوا ہے۔ یعنی اللہ، عالم کا رب، ہر عیب سے پاک اور منزّہ ہے اور یہ اسی کی تجلّی ہے جو تمہیں نظر آئی ہے تو اس پر بھروسہ رکھو۔ وہ تمہارے ساتھ وہی کرے گا جو اس کی رحمت و ربوبیت کے شایانِ شان ہے۔ اس سے کسی گزند کا اندیشہ نہیں ہے۔ اور وہ تمام عالم کا رب ہے اس وجہ سے اس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔

يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۹)

صفات عزیز و حکیم کا تعارف

اوپر کی بات تو ہاتفِ غیب کی آواز تھی جو حضرت موسیٰؑ کو سنائی دی۔ اب یہ خود حضرت موسیٰؑ کو خطاب کر کے رب العزت نے اپنا تعارف کرایا کہ میں ہی خدائے عزیز و حکیم ہوں۔ ان صفات سے تعارف کرانے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتی کہ حضرت موسیٰؑ ان سے ناواقف تھے۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے اور ایک مدت تک حضرت شعیبؑ کی صحبت و معیت میں رہے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے۔ مقصود ان کی تذکیر ہے اس مہم کے لیے ان کے قلب کو مضبوط کرنا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور فرمانا چاہا۔ پچھلی سورہ میں 'الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ' کی صفات بار بار آئی ہیں اور ان کے مضمرات ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہاں 'عزیز' کے ساتھ 'حَكِيْمُ' کی صفت آئی ہے۔ جس سے مقصود اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جس ذات نے تم کو اس وقت خطاب و کلام سے مشرف فرمایا ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے کوئی اس کے کسی ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا اور ساتھ

ہی وہ حکیم ہے اس کا ہر ارادہ حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اور اسلوب کلام چونکہ حصر در حصر کا ہے۔ اس وجہ سے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ میرے مقابل میں کسی اور کے زور و اقتدار یا میری حکمت و مصلحت کے مقابل میں کسی اور کی حکمت و مصلحت کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ غور کیجیے کہ ان صفات کی معرفت اس مہم کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے کتنی ضروری تھی جس پر حضرت موسیٰؑ مامور کیے جا رہے تھے اور جس کا ذکر آگے کی آیات میں آ رہا ہے۔ خدا کی انہی صفات کی معرفت نے حضرت موسیٰؑ کے اندر وہ عزیمت پیدا کی کہ وہ بنی اسرائیل جیسی نکمی قوم کے ساتھ فرعون جیسے جبار کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قدم پر فیروزمندی عطا فرمائی۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ (۱۰)

انبیاءؑ کے معاملہ میں ایک خاص قابلِ توجہ پہلو

اوپر کی آیات میں حضرت موسیٰؑ کو پیشِ نظر مہم کے لیے ذہنی و قلبی طور پر تیار کرنے والی تعلیمات ہیں۔ اس کے بعد ان کو وہ عظیم ظاہری نشانیاں دی گئیں جن سے فرعون کے مقابلہ کے لیے ان کا مسلح ہونا ضروری تھا۔ ان میں سب سے اہم نشانی عصا کی تھی جس سے بعد کی تمام نشانیوں کا ظہور ہوا۔ اس نشانی کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے اور یہ بات بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ بالکل پہلے ہی مرحلے میں حضرت موسیٰؑ کو یہ نشانیاں کیوں دی گئیں۔ یہاں صرف ایک بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے

نبوت کے ابتدائی مشاہدات نبی کے لیے نامانوس ہوتے ہیں

اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق، عصا کو زمین پر ڈال دیا اور وہ سانپ کے مانند رینگنے لگا تو حضرت موسیٰؑ ایسا ڈر کے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس واقعہ کا یہ پہلو ہمارے نزدیک اس حقیقت کے اظہار کے لیے یہاں خاص طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ نبوت کے ابتدائی مرحلہ کے مشاہدات نبی کے لیے بالکل نامانوس، نہایت انوکھے اور عجیب ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ شروع شروع میں ان سے گھبراتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اس کو ان سے مانوس کر دیتا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ حضرات انبیاء علیہم کو یہ چیز طلب اور ارمان پر نہیں ملی ہے بلکہ بالکل خلافِ توقع اس کا ظہور ہوا ہے اور بڑے اندیشوں، بڑی فکروں اور بہت ہی احتیاط کے ساتھ انھوں نے ایک فریضۂ الٰہی کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری اٹھائی ہے جب کہ ان کو پوری طرح یہ شرح صدر حاصل ہو گیا ہے کہ جو مشاہدے ان کو ہو رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہیں اور وہ ایک خاص فریضہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے نبوت میں جو مشاہدے ہوتے اور ان کے سبب سے آپؐ پر شروع شروع میں جو کیفیت طاری رہی اس کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف آخری گروپ کی سورتوں میں اشارات ہیں۔ ان شاء اللہ ان کے محل میں ہم ان کی وضاحت کریں گے۔

حضرت موسیٰؑ کی تسکین

يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ۔ جب حضرت موسیٰؑ اپنے عصا کو سانپ

حضرت موسیٰؑ کے لیے پہلی نشانی

کی صورت میں دیکھ کر بھاگے اور پیچھے مڑ کے بھی دیکھنے کی انھیں جرأت نہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت دل نواز انداز میں تسلی دی کہ موسیٰؑ! تم نہ ڈرو، اس سے تم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس سے جو خطرہ پیش آئے گا وہ تمھارے دشمنوں کو پیش آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کے رسولوں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ وہ بالکل مامون و محفوظ ہوتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجے جاتے ہیں ان لوگوں کے لیے خطرہ ہے اگر وہ رسولوں پر ایمان نہیں لاتے۔ مطلب یہ ہے کہ تم خدا کے رسول ہو اور یہ عصا تمھارے لیے ایک تلوار ہے تو تم اس سے کیوں ڈرو، اس سے ڈریں تمھارے دشمن!

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ ... سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۱)

حضرت موسیٰؑ کے ایک اندیشہ کا ازالہ

اللہ تعالیٰ کے نیک اور سلیم الفطرت بندوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب ان کو کوئی اندیشے کی حالت پیش آتی ہے تو فوراً ان کا ذہن اپنی کسی غلطی کی طرف جاتا ہے کہ مبادا یہ اسی کا خمیازہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا ذہن اس موقع پر قبطی کے قتل کے واقعہ کی طرف منتقل ہوا ہو۔ اگرچہ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے توبہ کر لی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول بھی فرما لی تھی لیکن حضرات انبیاء اور صالحین اپنا محاسبہ کرنے میں بڑے محتاط ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ کے وعدہ بشارت کو مؤکد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ میرے کسی بندے سے اگر کوئی غلطی صادر ہو جاتی ہے، پھر وہ توبہ و اصلاح سے اس کی تلافی کر دیتا ہے تو میں اس کو معاف کر دیتا ہوں، میں بڑا ہی غفور و رحیم ہوں۔ اس بات کو یہاں عام صیغے میں فرما کر اس کے فیض کو ہمہ گیر کر دیا ہے کہ یہ معاملہ کچھ تمھارے ہی لیے خاص نہیں ہے بلکہ میں اپنے ہر بندے کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہوں۔

وَاَدْخِلْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِہٖ ؕ اِنَّہُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ (۱۰)

حضرت موسیٰؑ کے لیے دوسری نشانی

یہ دوسری نشانی ہے جو اسی موقع پر عطا ہوئی۔ اس کی وضاحت بھی پیچھے سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ وغیرہ میں ہو چکی ہے۔ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ کے ساتھ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ کی قید حضرت موسیٰؑ کے اس تردد کے رفع کرنے کے لیے تھی کہ ہاتھ کے سفید ہونے سے ان کو کسی مرض کا وہم نہ ہو۔ قرآن کے اسلوب بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ اطمینان دہانی ان کو یہ معجزہ دیتے وقت ہی کر دی گئی تھی اور یہی بات قرینِ عقل و فطرت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو عصا کے معجزے سے جو تشویش ہوئی تھی اسی طرح کی تشویش ان کو اس معجزے سے بھی ہوتی اگر یہ اطمینان دہانی ان کو نہ کر دی جاتی۔ اس سے ضمناً تورات کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں برص کے مانند سفیدی تھی۔ اس پر تفسیر سورۂ طٰہٰ میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

[illegible]

فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِہٖ اس سے پہلے فعل اِذْھَبْ محذوف ہے۔ یعنی نو نشانیوں سے مسلح ہو کر فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جاؤ، وہ بڑے ہی نافرمان ہو گئے

ہیں۔ ابتداءً تو حضرت موسیٰؑ کو عصا اور ید بیضا کی دو ہی نشانیاں دی گئیں لیکن ان کے اندر بہت سی نشانیاں مضمر تھیں جو بعد کے مراحل میں ظاہر ہوئیں۔ ان نشانیوں کی تفصیل، تورات کے حوالوں کے ساتھ بقرہ، اعراف اور طٰہٰ وغیرہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ یہ تمام نشانیاں حضرت موسیٰؑ کے عصا سے ظاہر ہوئیں اس وجہ سے عصا کی صورت میں حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے مقابلہ کے لیے گویا پوری میگزین دے دی گئی۔ یہ امر بھی یہاں واضح رہے کہ ان نو نشانیوں سے بھی صرف وہ نشانیاں مراد ہیں جو فرعون اور اس کی قوم کے مقابل میں ظاہر ہوئیں۔ وہ نشانیاں جو اس عصا کے ذریعہ سے خاص بنی اسرائیل کے لیے ظاہر ہوئیں وہ ان سے بالکل الگ ہیں اور ان کی تعداد بھی، تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ کم نہیں ہے، بہت ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰیٰتُنَا مُبۡصِرَۃً قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ (۱۳)

حضرات انبیاء کے معجزات آنکھیں کھول دینے والے ہوتے ہیں

'مُبۡصِرَۃً' کے معنی ہیں آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام سے جو معجزات ظہور میں آئے ان کا معجزہ ہونا دیکھنے والوں سے مخفی نہیں رہا۔ ان کی قاہریت نے اندھوں کی آنکھیں بھی کھول دیں لیکن جو لوگ نہیں ماننا چاہتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے ان معجزات کو بھی جادو قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ خود جادوگروں نے بھی علی الاعلان اعتراف کر لیا کہ یہ جادو نہیں ہے لیکن پھر بھی ہٹ دھرموں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی، اس کو جادو ہی کہتے رہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جو اوپر گزر چکی ہے کہ ایک ساحر کا انتہائی کمال یہ ہوتا ہے کہ اس کی لٹھیا سانپ کی طرح رینگنے لگ جائے اور اس کرتب کے لیے نہ جانے وہ کیا کیا پاپڑ بیلتا ہے تب کہیں جا کر اس کو اپنے فن میں کچھ دخل حاصل ہوتا ہے اور اس پر اس کو بڑا ناز ہوتا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کا حال یہ ہوا کہ وہ اپنے عصا کو سانپ کی طرح رینگتے دیکھ کر ڈر کے بھاگے اور اس وقت تک ان کو قرار نہیں آیا جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی نہیں دی، پھر بھی ظالموں نے ان کو ایک ماہر جادوگر اور ان کی نشانیوں کو 'سحر مبین' قرار دیا۔

وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَیۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ (۱۴)

منکروں کے انکار کا اصل سبب ان کا ظلم اور علو ہوتا ہے

یہ آخر میں وہ اصل مدعا سامنے رکھ دیا گیا ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ دعوتِ حق کو قبول نہیں کرنا چاہتے وہ ایک دو نہیں بلکہ نو نو معجزات دیکھ کر بھی اپنے انکار کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ ان کے دل اقرار کرتے ہیں کہ داعی کی بات حق ہے لیکن زبانوں سے وہ برابر اس کی تکذیب ہی کرتے رہتے ہیں۔ ان کے انکار کی اصل علت یہ نہیں ہوتی کہ حق ان پر اچھی طرح واضح نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل سبب ان کا ظلم اور علو ہوتا ہے۔ وہ خدا اور اس کے بندوں کے حقوق تلف کرنے کے خوگر ہو جاتے ہیں اور یہ عیب بھی اس سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے اور ان کے اندر استکبار پیدا ہو جاتا ہے جس کے سبب سے اپنی خواہش کے خلاف کسی بڑے سے بڑے حق کے آگے بھی جھکنے

کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے۔ ایسے مفسدین کا انجام وہی ہوتا ہے جو فرعون اور اس کی قوم کا ہوا۔

۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۵-۴۴

اوپر کی آیات سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ حق کے انکار کا اصل سبب حقیقت کا خفا نہیں بلکہ لوگوں کا ظلم و استکبار ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نعمت عطا فرماتا ہے وہ نعمت ان کے لیے فتنہ بن جاتی ہے اور وہ بجائے اس کے کہ خدا کے زیادہ سے زیادہ شکر گزار اور اس کے فرمانبردار بندے بنیں خدا سے اکڑنے والے اور اس کی زمین میں فساد برپا کرنے والے بن جاتے ہیں۔ اب ان کے مقابل میں اللہ کے صالح و مصلح بندوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان پر اللہ کی نعمتیں جتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہیں ان کی گردنیں ثمربار شاخ کی طرح خدا کے آگے اتنی ہی جھکتی جاتی ہیں۔ اس کردار کی عملی مثال کے طور پر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو عظمت و شوکت عطا فرمائی ان کے ہم عصر حکمرانوں میں کسی کو بھی وہ حاصل نہیں ہوئی اور جن اسباب و وسائل پر ان کو تصرف بخشا ان پر کسی کو بھی تصرف حاصل نہ ہوا لیکن یہ سب کچھ پا کر وہ کسی ظلم یا استکبار میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کا ایک امتحان جانا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی اور اس امتحان میں پورے اترے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ
فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ
دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ
لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ
يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ
يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ
جُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَ
قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ

عَلٰى وَالِدَىَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِىْ بِرَحْمَتِكَ
فِىْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِىَ لَاۤ اَرَى
الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَاۤئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا
اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّىْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ
بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ
بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّىْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ
كُلِّ شَىْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ
لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ
عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِىْ
يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ
وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدة
قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ
بِّكِتٰبِىْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّىْۤ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾
اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ ۙ
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَىَّ وَاْتُوْنِىْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِىْ ع ۲ ۱۷
فِىْۤ اَمْرِىْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا
نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِىْ

مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا
وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ
اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌ ۢبِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ
سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۡ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ
بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ
لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾
قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ
مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ
تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ
عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ
طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۣ
لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ
وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ
اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ
قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ
مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي
الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ

قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي
وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۴۴﴾ ع

ترجمۂ آیات

اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو بڑا علم عطا فرمایا اور انھوں نے کہا کہ شکر ہے اللہ کے لیے جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہمیں فضیلت عطا فرمائی۔ ۱۵

اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔ اور اس نے کہا، اے لوگو، ہمیں پرندوں کی بولی کا علم بھی عطا ہوا ہے اور دوسری بھی سب چیزیں ہمیں بخشی گئی ہیں۔ بے شک یہ نہایت ہی کھلا ہوا فضل ہے۔ ۱۶

اور سلیمان کے جائزے کے لیے اس کا سارا لشکر۔ جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے۔ اکٹھا کیا گیا اور ان کی درجہ بندی کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے، ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو، اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمھیں پامال نہ کر ڈالے اور انھیں اس کا احساس بھی نہ ہو۔ پس وہ اس کی بات سے خوش ہو کر مسکرایا اور دعا کی، اے میرے رب مجھے سنبھالے رکھ کہ میں تیرے فضل کا شکر گزار رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا اور میں ایسے نیک کام کروں جو تجھے پسند ہوں اور تو اپنے فضل سے مجھے اپنے صالح بندوں کے زمرے میں داخل کر۔ ۱۷-۱۹

اور اس نے پرندوں کی فوج کا جائزہ لیا تو بولا کہ کیا بات ہے، میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں! وہ موجود ہے یا غیر حاضروں میں ہے! میں اس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا یا پھر وہ کوئی واضح عذر میرے سامنے پیش کرے۔ زیادہ دیر نہیں گزری کہ وہ آیا

اور اس نے کہا کہ میرے علم میں وہ چیز ہے جو آپ کے علم میں نہیں ہے اور میں ملک سبا سے ایک سچی خبر لایا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت اس پر حکمرانی کر رہی ہے اور اس کو سب کچھ حاصل ہے اور اس کا تخت بہت بڑا ہے۔ میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سوا سورج کو پوجتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے ہیں، پس ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے، پس وہ راہ یاب نہیں ہو رہے ہیں۔ ۲۰-۲۴

(شیطان نے ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے) کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ ۲۵-۲۶

اس نے کہا، ہم دیکھیں گے کہ تم نے سچ کہا ہے یا تم جھوٹوں میں سے ہو۔ یہ میرا نامہ لے کر جاؤ اور ان کے پاس ڈال دیجیو اور ہٹ کر دیکھیو کہ کیا ردِ عمل وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۲۷-۲۸

اس نے کہا، اے اہلِ دربار، ایک گرامی نامہ میرے پاس ڈالا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، تم لوگ میرے مقابل میں سرکشی نہ کرو اور میرے پاس مطیع ہو کر حاضر ہو۔ اس نے کہا، اے درباریو، میرے اس معاملے میں مجھے رائے دو۔ میں کسی معاملے کا اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتی جب تک آپ لوگ موجود نہ ہوں۔ ۲۹-۳۲

انھوں نے جواب دیا کہ ہم طاقت اور اعلیٰ جنگی صلاحیت رکھنے والے لوگ ہیں، فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے تو غور فرما لیجیے کہ کیا حکم دیتی ہیں۔ ۳۳

اس نے کہا، بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو درہم برہم اور اس کے معززین کو ذلیل کر کے چھوڑتے ہیں اور یہی یہ لوگ بھی کریں گے اور میں ان کے پاس

اپنے سفیر ہدیہ کے ساتھ بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ سفیر کیا جواب لاتے ہیں۔ ۳۴-۳۵

تو جب سفیر سلیمان کے پاس پہنچا، اس نے کہا کیا تم لوگ میری مدد مال سے کرنا چاہتے ہو! مجھے خدا نے جو دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو اس نے تم کو دیا ہے۔ بہ تمہی لوگ ہو کہ اپنے ہدیوں پر خوش ہوتے ہو! ان کے پاس واپس جاؤ، ہم ان پر ایسی فوجوں سے چڑھائی کریں گے کہ وہ ان کے مقابلے کی تاب نہ لا سکیں گے اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ خوار ہوں گے۔ ۳۶-۳۷

سلیمان نے کہا، اے درباریو! تم میں سے کون اس کا تخت ان لوگوں کے میرے حضور میں فرمانبردارانہ حاضر ہونے سے پہلے پہلے لائے گا؟ جنوں میں سے ایک سرہنگ نے کہا، میں اس کو آپ کے پاس آپ کے اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے پہلے حاضر کر دوں گا۔ اور میں اس کام پر قدرت رکھنے والا اور ایک امانت دار ہوں۔ جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا، میں اس کو آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے حاضر کر دوں گا۔ پس اس نے اس کو اپنے سامنے موجود دیکھا تو اس نے کہا یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ میرا امتحان کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی نفع کے لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو میرا رب بے نیاز و کریم ہے۔ ۳۸-۴۰

اس نے حکم دیا کہ اس کے تخت کی شکل بدل دو، دیکھیں وہ پہچانتی ہے یا نہ پہچاننے والوں میں سے ہو کے رہ جاتی ہے۔ پس جب وہ آئی تو اس سے سوال کیا گیا کہ کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا، گویا کہ وہی ہے اور ہم کو اس سے پہلے علم حاصل ہو چکا تھا اور ہم فرمانبرداروں میں تھے۔ اور اس کو روک رکھا تھا ان چیزوں نے جن کو اللہ

کے ماسوا وہ پوجتی رہی تھی۔ وہ ایک کافر قوم میں سے تھی۔ ۴۱-۴۳

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ تو جب اس نے اس (کے فرش) کو دیکھا اس کو گہرا پانی گمان کیا اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں۔ سلیمان نے کہا یہ تو شیشوں سے بنا ہوا محل ہے! اس نے کہا، اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا، اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ رب العلمین کے حوالہ کیا۔ ۴۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۵)

عِلْم سے مراد

'عِلْمًا' سے مراد وہ حکمت و معرفت بھی ہے جو حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو حاصل ہوئی جس کا مظہر زبور اور امثال ہیں اور سائنس کا وہ علم بھی ہے جس کی بدولت انھوں نے وہ عظیم سلطنت قائم کی جو اپنی بری و بحری قوت کے اعتبار سے اپنے زمانے کی سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت تھی۔ سورۂ انبیاء کی تفسیر میں اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا جذبۂ شکر

'وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ الاٰیۃ' یہ ان کے شکر و سپاس کی تعبیر ہے کہ اپنے زمانے کی سب سے زیادہ طاقت ور حکومت کے فرماں روا اور ایجادات و صنائع میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہونے کے باوجود ان کے اندر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گھمنڈ نہیں پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ ان کے اپنے ذاتی کارنامے ہیں بلکہ وہ برابر اپنے رب کے شکر گزار رہے کہ یہ عزت و فضیلت ان کو اللہ نے عطا فرمائی ہے۔

'عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ' کے اندر یہ حقیقت مضمر ہے کہ اصل عزت و فضیلت ایمان کی عزت و فضیلت ہے۔ جس کو یہ حاصل نہیں ہے اس کے لیے عزت و فضیلت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ عزت و فضیلت کی بات ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ اپنے باایمان بندوں میں سرفرازی بخشے۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ (۱۶)

حضرت سلیمانؑ کے فضائلِ نوع

یعنی حضرت داؤدؑ کے بعد حضرت سلیمانؑ ان کے وارث ہوئے۔ جیسا نامور باپ تھا اس سے بڑھ

کرنا مور بیٹھا ہوا۔ سورۂ انبیاء میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنی بری فوج کے ساتھ ساتھ اپنی بحری طاقت کو بڑی ترقی دی۔ ان کا بحری بیڑا دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور بیڑا تھا۔ اس آیت سے اور آگے کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو پرندوں کی بولی کا بھی خاص علم عطا ہوا تھا اور ان کی تربیت کر کے وہ اپنی فوج میں ان سے نامہ بری، خبر رسانی اور سراغ رسانی کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر لیتے تھے اور اس طرح انھوں نے گویا اپنی ایک فضائی فوج بھی مرتب کر لی تھی لیکن یہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود انھوں نے تنگ ظرفوں کی طرح یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں اب ایک ناقابل تسخیر طاقت بن گیا ہوں بلکہ آیت کا سیاق صاف اس بات کی دلیل ہے کہ جب ان کی فوجی قوت میں یہ شاندار اضافہ ہوا ہے تو بجائے اس پر فخر کرنے کے انھوں نے اپنی قوم کو یہ پیغام دیا کہ لوگو، ہمیں پرندوں کی بولی کا علم بھی حاصل ہو گیا ہے اور دوسرے اسباب و وسائل بھی، جو ترقی کے لیے ضروری ہیں، ہمیں حاصل ہیں تو یہ ہمارے اوپر خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے اس کھلے ہوئے فضل کا حق یہ ہے کہ ہم اس کے زیادہ سے زیادہ شکر گزار اور اس کے سب سے بڑھ کر اطاعت گزار بنیں۔ تورات میں اگرچہ حضرت سلیمانؑ کو ایک بالکل دنیا دار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کی طرف نعوذ باللہ شرک و بت پرستی کی نسبت بھی کی گئی ہے لیکن کتاب سلاطین میں یہ تصریح موجود ہے کہ انھوں نے اپنی عظمت و شوکت کو برابر اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیا اور اپنی قوم کو بھی اس فضل و نعمت پر خدا ہی کا شکر گزار رہنے کی تاکید فرمائی۔

منطق الطیر کا علم

'عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ' سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ پرندوں کے اندر بھی نطق و ادراک ہے اور حضرت سلیمانؑ کو ان کے نطق کا خاص علم عطا ہوا تھا۔ اگر ہم ان کے نطق کو نہیں سمجھتے تو ہمارا نہ سمجھنا اس کی نفی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن میں صاف تصریح ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے لیکن ہم اس کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اسی طرح قرآن میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ جتنے بھی چرند پرند ہیں سب ہماری ہی طرح الگ الگ امتیں ہیں۔ سورۂ نحل کی تفسیر میں ہم قرآن کے اس ارشاد کے مضمرات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کو تو پرندوں کی بولی کا خاص علم عطا ہوا تھا جن کو یہ علم نہیں ملا ہے وہ بھی یہ جانتے ہیں کہ جتنے بھی حیوانات ہیں سب اپنی نفرت، محبت، عتاب، التفات، خوشی، غم، فکر مندی، طمانیت، استمالت، ملاعبت اور اپنے دوسرے جذبات کی تعبیر کے لیے الگ الگ بولیاں بھی اختیار کرتے ہیں اور ان کے اظہار کے لیے ان کی [illegible] الگ ہوتی ہیں۔ جو لوگ کسی مقصد خاص کے لیے ان جانوروں کی تربیت کرتے ہیں وہ ان کی آوازوں اور اشارات کو اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح اپنے ہم جنسوں کی بولی اور ان کے اشارات کو سمجھتے ہیں۔ پھر ان سے بھی زیادہ ان لوگوں کا علم ہے جنھوں نے سائنٹفک طریقے

پران حیوانات کا تجربہ و مشاہدہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے علمی تجربہ و مشاہدے سے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کو پڑھیے تو انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ بڑے جانور تو درکنار ننھی سی چیونٹی کے اندر بھی قدرت نے جو دانش و بینش، جزرسی و ہوشیاری اور جو فہم و فراست ودیعت فرمائی ہے وہ ایسی ہے کہ اس سے انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ آج کتوں سے سراغ رسانی اور جاسوسی کے سلسلے میں جو کام لیے جا رہے ہیں کیا وہ کم حیرت انگیز ہیں! جب انسان اپنے تجربات اور اپنی تجرباتی سائنس کے ذریعے جانوروں کے اتنے اسرار دریافت کر سکتا ہے اور ان سے یہ کچھ کام لے سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اگر حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولی کا خاص علم دے دیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بولی درحقیقت آوازوں ہی کی ترکیب و تالیف سے وجود میں آتی ہے۔ جو چیزیں ادراک و شعور اور جذبات رکھتی ہیں وہ اپنے ادراک و شعور اور جذبات کی تعبیر کے لیے مختلف قسم کی آوازیں نکالتی ہیں اور انہی کی تالیف و ترکیب سے بولی وجود میں آتی ہے۔ اشارات بھی اسی میں داخل ہیں۔ ان کو غیر ناطق زبان سمجھیے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۱۷)

'حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ' میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی حضرت سلیمانؑ کے جائزہ اور ملاحظہ کے لیے ان کی ساری فوج جمع کی گئی۔

حضرت سلیمانؑ کی فوج

'وَزْع' کے اصل معنی روکنے، تھامنے اور سنبھالنے کے ہیں۔ آگے آیت ۱۹ میں اسی معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے لیکن فوج کے تعلق سے جب یہ لفظ آئے تو اس کے معنی تربیت دینے اور درجہ بندی و صف بندی کرنے کے ہوتے ہیں۔

اب یہ حضرت سلیمانؑ کی افواج کی ایک پریڈ کا ذکر فرمایا ہے جس میں ان کی تمام فوج، جو جنوں انسانوں اور پرندوں پر مشتمل تھی، ان کے ملاحظہ کے لیے اکٹھی کی گئی۔ 'فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ' یعنی مقصود اس اجتماع سے ان کی ترتیب اور الگ الگ درجہ بندی تھی۔ یہاں اس پریڈ کے ذکر سے اصل مدعا، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، یہ دکھانا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی فوج کیسی حیرت انگیز صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں، جنوں اور پرندوں پر مشتمل تھی۔ لیکن جب ان کے فوجیوں کی طرف سے ان کی حیرت انگیز صلاحیتیں ظاہر ہوئیں تو وہ بجائے اس کے کہ ان سے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوں اور یہ ڈھنڈورا پیٹیں کہ میں اب دنیا میں ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن گیا ہوں، انھوں نے اپنا سر نہایت تواضع کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھکا دیا کہ اے رب! اگر تو نے مجھ پر یہ فضل فرمایا ہے تو مجھے سنبھال کہ میں کہیں بہک نہ جاؤں بلکہ ہمیشہ تیرا شکرگزار اور فرمانبردار بندہ رہوں۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ

سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۸)

وادیٔ نمل کی وضاحت

'وَادِ النَّمْلِ' سے کوئی مخصوص وادی بھی مراد ہو سکتی ہے جو اسی نام سے معروف رہی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن نے اس کا ذکر اس نام سے محض اس خصوص کی وجہ سے کیا ہو کہ اس میں چیونٹیاں بہت تھیں۔ چیونٹیاں، چیونٹے اور اس نوع کے تمام حشرات اپنے گڑھے انہی علاقوں میں بناتے ہیں جن کا ماحول ہر اعتبار سے ان کے لیے سازگار رہو۔

حضرت سلیمانؑ حشرات کی بولی بھی سمجھتے تھے

یہ ذکر اسی پریڈ کے موقع کا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کی فوجیں مارچ کرتی ہوئی چیونٹیوں کی وادی میں پہنچیں تو ایک چیونٹی نے اپنے دَل کو خطرے سے آگاہ کیا کہ اے چیونٹیو! اپنی بلوں میں گھس جاؤ، مبادا سلیمانؑ اور اس کی فوجیں تمھیں پامال کر دیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ یعنی حضرت سلیمانؑ کی دَل بادل فوج کی راہ میں تو پہاڑ بھی گرد ہیں، اس کو بھلا اس بات کا احساس کہاں ہو گا کہ ہمارے حقیر وجود اس کے پاؤں تلے روندے گئے۔

چیونٹیوں کے عجائبات

چیونٹیوں کے متعلق سائنس نے جو حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں اس سے قطع نظر ایک عام آدمی بھی اگر ان کے کسی بڑے دَل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے دیکھے تو ان کے عسکری نظام اور فوجی ڈسپلن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ پوری فوج ایک قائد کی قیادت میں مارچ کر رہی ہے۔ دَل کے دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ان کے رضاکاروں اور اسکاؤٹوں کی لائن ہوتی ہے جو اپنے معین حدود کے اندر برابر تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ وہ نگرانی کی ڈیوٹی پر مامور ہیں۔ جونہی ان کو کسی خطرے کا احساس ہوتا ہے وہ اپنے حدود کے اندر اس سے دَل کو آگاہ کرتے ہیں اور دَل اپنے آپ کو اس سے بچانے کی تدبیر اختیار کرتا ہے۔ وہ منظر ان کا خاص طور پر دیدنی ہوتا ہے جب ان کا کوئی قبیلہ مستقل طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام کے لیے اپنے تمام غذائی ذخائر اور اپنے تمام اولاد و احفاد کے ساتھ ہجرت کرتا ہے۔ میں نے بعض مرتبہ ان کی اس مہاجرت کا غور سے مشاہدہ کیا ہے۔ اگر میں ان مشاہدات کو قلم بند کروں تو ایک طویل داستان بن جائے۔

چیونٹیوں کے یہ کارنامے تو ہما و شما کو بھی نظر آتے ہیں لیکن سائنس دانوں نے ان کے جن عجائب کا انکشاف کیا ہے۔ ان کے بعد تو اس امر میں کسی شبہے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ وہ بھی، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے، ہماری ہی طرح امتیں ہیں۔ ان کی بعض قسمیں ہماری ہی طرح بعض جانوروں کو پالتی ہیں اور ان کو اپنے اغراض و ضروریات کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ اپنے لیے کھیت بناتی اور ان میں بیج بوتی ہیں اور جب فصل تیار ہوتی ہے تو درو کے بعد اس کو تہ خانوں میں محفوظ کر دیتی ہیں۔ ان کی باقاعدہ فوج بھی ہوتی ہے جو مخصوص افسروں کی کمان میں دشمن پر حملہ آور ہوتی ہے۔ ان کے ہاں

تربیت اور ٹریننگ کا باقاعدہ نظام ہے۔ غرض وہ ساری خصوصیات ان کے اندر بھی پائی جاتی ہیں جو انسانوں کے اندر پائی جاتی ہیں بس صرف شکل و صورت اور درجہ و مرتبہ کا فرق ہے۔

یہاں چیونٹی کی طرف جس 'قول' کی نسبت کی گئی ہے اگرچہ وہ اشاروں کی زبان سے بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ، جیسا کہ مریم ۲۶ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں، اشارے سے کوئی بات کہنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہاں آیت سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ اس سے مسموع قول مراد ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ چیونٹیوں کی صرف وہی قسمیں نہیں ہیں جن سے ہم اپنے علاقوں میں آشنا ہیں بلکہ سائنس کی تحقیقات نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بے شمار قسمیں مختلف علاقوں اور زمینوں میں پائی جاتی ہیں جن میں صامت و ناطق ہر قسم کی چیونٹیاں ہیں۔ حضرت سلیمانؑ جس طرح پرندوں کی بولی سمجھتے تھے اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان حشرات کی آواز بھی سنتے اور سمجھتے تھے۔ اور یہ علم ان کے پاس خداداد تھا۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصّٰلِحِينَ (۱۹)

'فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا' میں لفظ 'ضحک' خوشی اور ابتہاج و سرور کے مفہوم میں ہے۔ جس طرح ہود آیت ۷۱ میں ہے۔ مجرد 'تَبَسَّمَ' استخفاف و تحقیر کی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ 'ضَاحِكًا' کی قید نے معین کر دیا کہ یہ تبسم خوشی اور سرور کی نوعیت کا تھا۔

وہ حقیقت جس کے لیے مذکورہ واقعہ بیان ہوا ہے

'أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ' لاية۔ 'وزع' کے معنی کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔ یہاں یہ تھامنے اور سنبھالنے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی حضرت سلیمانؑ نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب جب تو نے میرے علم میں یہ افزونی عطا فرمائی ہے کہ میں حشرات و ہوام کی بولی بھی سمجھنے لگا ہوں تو ایسا نہ ہو کہ میں غرور و طغیان میں مبتلا ہو کر تیری راہ سے بھٹک جاؤں بلکہ تو میری باگ اپنے ہاتھ میں رکھ اور مجھے توفیق دے کہ تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر جو فضل عظیم فرمایا ہے میں اس کا حق ادا کر سکوں اور میرے ہاتھوں وہ کام انجام پائیں جو تیری رضا کے مطابق ہوں اور آخرت میں مجھے صالحین کی معیت حاصل ہو۔

یہی وہ اصل حقیقت ہے جس کے اظہار کے لیے اوپر والا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے جن کی نظر اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہے اور وہ خدا سے بے خبر ہیں ان کو جب کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ اس پر اتراتے اور اکڑتے ہیں گویا انھوں نے کوئی بڑا تیر مارا ہے اور پھر اس غرور اور اکڑ کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں اور صلاحیتوں کو خدا کی رضا کے کاموں میں صرف کرنے کے بجائے شیطان کی مقصد برآری میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن حضرت سلیمانؑ

کا حال یہ تھا کہ اپنی ہر سائنس اور کاردانی کو انھوں نے اپنے رب کا فضل جانا اور اس سے برابر ڈرتے رہے کہ ان کا کوئی قدم خدا کی پسند کے خلاف نہ اٹھے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِينَ ۝ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَاذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَٰنٍ مُّبِينٍ (۲۰-۲۱)

حضرت سلیمان کی فضائی فوج

اسی پریڈ کے موقع پر جب انھوں نے اپنے پرندوں کی فوج کا جائزہ لیا تو ہُدہُد کو غائب پایا، اس پر غضبناک ہو کر فرمایا کہ کیا بات ہے میں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ موجود ہے، مجھے نظر نہیں آیا ہے، یا غیر حاضر ہے؟ یا تو وہ اپنی اس غیر حاضری کے لیے کوئی معقول عذر پیش کرے ورنہ یا تو میں اس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح کر چھوڑوں گا۔

'اَمْ کَانَ مِنَ الْغَآئِبِیْنَ' سے پہلے برنبائے قرینہ اتنی بات محذوف ہے کہ وہ موجود ہے میں دیکھ نہیں رہا ہوں یا ....

'سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ' اصل میں دلیل و حجت کے مفہوم میں آتا ہے۔ یہاں یہ اپنی صفائی میں کسی عذرِ معقول کے لیے آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی فوج میں باقاعدہ تربیت پائے ہوئے مختلف قسم کے پرندے بھی تھے جن سے وہ پیغام رسانی، سراغ رسانی اور دریافتِ احوال کی مہمات میں کام لیتے تھے اور چونکہ وہ پرندوں کی بولی سمجھتے تھے اس وجہ سے وہ موجودہ زمانے کے سائنس دانوں سے بدرجہا اعلیٰ طریقہ پر یہ کام لیتے تھے۔

تجسس احوال کے لیے پرندوں کی فوج

پیغام رسانی اور دریافتِ احوال وغیرہ کے سلسلہ میں پرندوں سے کام لینے کا طریقہ موجودہ زمانے میں بھی موجود ہے اور قدیم زمانے میں بھی یہ پایا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حالات کے ضمن میں اہل تورات نے اس قسم کے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن حضرت نوحؑ کے حالات میں یہ ذکر ہے کہ جب انھوں نے یہ اندازہ کرنا چاہا کہ طوفان کا پانی اتر گیا ہے یا نہیں تو کشتی سے ایک کبوتری اڑائی۔ کچھ دیر کے بعد وہ کبوتری اپنی چونچ میں زیتون کی ایک تازہ شاخ لے کر آئی جس سے حضرت نوحؑ نے یہ اندازہ فرمایا کہ اب پانی اتر گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خبر رسانی اور تجسس احوال وغیرہ کی مہمات کے لیے پرندوں کی تربیت کا فن بہت قدیم بلکہ ابتدائے تاریخ سے موجود ہے۔ کبوتر کی نامہ بری تو خیر معروف ہی ہے۔ حضرت نوحؑ کے مذکورہ بالا واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرندہ تجسس احوال کے مقصد کے لیے بھی بہت زیرک ہے۔ موجودہ زمانہ کی سائنس نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ فلسطین کے علاقے میں ہُدہُد کی کثرت ہے۔ یہ پرندہ بھی اس مقصد کے لیے کبوتر ہی کی طرح ہوشیار ہے اس وجہ سے

حضرت سلیمانؑ نے اپنی فوج میں اس سے کام لیا۔

حضرت سلیمانؑ نے جس انداز سے ہُدہُد کی غیر حاضری پر عتاب فرمایا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرندے فوجی ڈسپلن کے تحت تھے۔ انھیں اس نظم کی پوری پوری پابندی کرنی پڑتی تھی اور کسی خلاف ورزی کی صورت میں انھیں فوجی ضوابط کے تحت سزا بھگتنی پڑتی تھی۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِن سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ۝ إِنِّي وَجَدتُّ
امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ۝ وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ
مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ (۲۲-۲۴)

ہُدہُد کی رپورٹ ملک سبا کے بارے میں

'فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ'۔ 'مَكَثَ' کا فاعل، میرے نزدیک، حضرت سلیمانؑ ہیں۔ یعنی ہُدہُد پر جو عتاب انھوں نے فرمایا اس کے بعد زیادہ دیر نہیں گزری کہ ہدہد آگیا اور اس نے اپنی کارگزاری کی یہ رپورٹ پیش کی کہ میں ملک سبا سے ایک ایسی سچی اطلاع لے کر آیا ہوں جو حضور کے علم میں نہیں ہے۔ سبا عرب کا وہی مغربی جنوبی علاقہ ہے جہاں یمن، حضرموت اور عسیر واقع ہیں۔ ہُدہُد کے قول کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت سلیمانؑ اس ملک اور اس کے حالات سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔ اتنے قریب کے ملک سے حضرت سلیمانؑ بالکل بے خبر کیسے ہو سکتے تھے جب کہ تورات اور قرآن دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے حالات اور ان کی حکمت سے، جیسا کہ آگے وضاحت آرہی ہے، فی الجملہ واقف تھیں۔ جب ملکۂ سبا واقف تھیں تو حضرت سلیمانؑ کے ناواقف ہونے کے کیا معنی جن کا بحری بیڑا دور دور کے ممالک تک سفر کرتا تھا۔ ہدہد کا مطلب یہ تھا کہ اس ملک سے متعلق میں تازہ تفصیلی رپورٹ لے کر آیا ہوں جس سے حضور کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ 'أَحَطتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ' کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے۔ ان الفاظ کا صحیح مدعا یہ ہے کہ حضور والا اس ملک سے متعلق جو کچھ جانتے ہیں میں اس سے کسرے زائد معلومات حاصل کر کے آیا ہوں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ہُدہُد نے یہ بات اپنی غیر حاضری کے عذر کے طور پر پیش کی ہے اس وجہ سے اس نے اپنی رپورٹ کا قابلِ وثوق ہونا بھی واضح کیا اور تازہ معلومات پر مشتمل ہونا بھی۔ اس طرح کا اضافہ ہر ملک کا سفیر اور مخبر اپنے ملک کے حکمران کی معلومات میں کرتا ہے اور کر سکتا ہے اس وجہ سے اس میں حضرت سلیمانؑ کے علم اور ان کی معلومات کی تحقیر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

'إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً .... الآیۃ' ملک کے حکمران سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ ان پر ایک عورت حکومت کر رہی ہے اور اندازِ کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عورت کی حکمرانی اس کی نظر میں ایک تعجب انگیز امر ہے۔ ملک کے وسائل و ذرائع سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ 'أُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ' یعنی ملک کی رفاہیت و ترقی سے متعلق جو چیزیں ضروری ہیں وہ سب اس کو حاصل ہیں۔ ملک کی عظمت سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ 'لَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ' اس کا تخت بہت بڑا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ اس زمانے کے بادشاہوں کے تخت و تاج چونکہ سونے چاندی اور زر و جواہر سے آراستہ ہوتے تھے اس وجہ سے ان کی بڑائی بیشتر انہی چیزوں کی بڑائی سے ناپی جاتی تھی۔

ملک کی مذہبی و اخلاقی حالت سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ ملکہ اور اس کی قوم کے لوگ سب آفتاب پرست ہیں اور یہ آفتاب پرستی اور ان کے دوسرے اعمال و اخلاق اس طرح شیطان نے ان کی نگاہوں میں کھبا دیے ہیں کہ صحیح راہ — توحید اور خدا پرستی کی راہ — ان کو سجھائی نہیں دے رہی ہے۔

اَلَّا يَسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِىْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۵-۲۶)

ایک تضمین

میرے نزدیک یہ دو آیتیں ہُدہُد کے قول کا جزو نہیں ہیں بلکہ یہ اسی قسم کی تضمین ہے جس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہُدہُد کی بات 'فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ' کے ساتھ اس بات کو ملا کر کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان نے ان کو اس خدا کی بندگی سے روک دیا جو آسمان و زمین کی تمام مخفیات کو بے نقاب کرتا ہے اور جو تمہارے تمام سر و علانیہ سے اچھی طرح واقف ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عرش عظیم کا مالک وہی ہے۔

اس کے تضمین ہونے کے قرائن بالکل واضح ہیں، ان کی مزید وضاحت تحصیل حاصل ہوگی۔ 'مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ' کے صیغہ ہائے خطاب ہُدہُد کی زبان سے بالکل ناموزوں ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی فرما سکتا تھا۔

'يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' میں 'خَبْءٌ' 'مَخْبُوْءٌ' کے مفہوم میں ہے۔ یعنی زمین و آسمان کی تمام پوشیدہ چیزوں کو بے نقاب تو اللہ تعالیٰ کرتا ہے لیکن نادان لوگ پوجا غیر اللہ کی کرتے ہیں۔ آسمان کی پوشیدہ چیزوں سے یہاں اشارہ سورج، چاند، زہرہ، مشتری اور بارش وغیرہ کی طرف خاص طور سے ہے جن میں سے سورج کی پوجا سب سے بڑے دیوتا کی حیثیت سے اہل سبا کرتے تھے۔ زمین کی پوشیدہ چیزوں سے اشارہ ان چیزوں کی طرف ہے جو اس سے اگتی یا برآمد ہوتی ہیں۔ مثلاً درخت، نباتات، دریا اور چشمے وغیرہ۔ فرمایا کہ ان تمام چیزوں کا خالق و مالک تو اللہ وحدہٗ لا شریک ہے اور وہ تمہارے تمام پوشیدہ و علانیہ سے واقف بھی ہے تو دوسری چیزوں کی بندگی کرنے کے کیا معنی!

'لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ'۔ یعنی اصل عرش عظیم کا، جو تمام آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے، مالک وہی ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ اس کے عرش کے آگے کسی کے عرش کی بھی، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو، کوئی وقعت و حیثیت نہیں ہے۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِىْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ (۲۷-۲۸)

ایک قرین قیاس بات

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا، جلد ہی تمہارے سچے یا جھوٹے ہونے کا امتحان ہوا جاتا ہے۔

میرا یہ نامہ لے کر جاؤ اور ان کے آگے ڈال دو۔ پھر پرے ہٹ کر دیکھو کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد ان کی طرف سے کوئی نہ کوئی ردِ عمل لازماً ظاہر ہوگا جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے یوں ہی سبا تک جانے کی بڑ ہانکی ہے یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت سبا کا مسئلہ پہلے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیرِ غور تھا اور عجب نہیں کہ اس کے زیرِ غور ہی ہونے کے سبب سے ہُدہُد نے اس ملک کے حالات کے جائزہ کے لیے یہ پرواز کی ہو۔ اگر پہلے سے کوئی اسکیم نہ ہوتی تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ مجرد ہُدہُد کے صدق و کذب کی جانچ کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام ملکۂ سبا کو الٹی میٹم بھیج دیں۔ آگے اس خط کا حوالہ آ رہا ہے اور اس کی نوعیت بالکل الٹی میٹم کی ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ کی ہدایت کا مدعا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خط ان کے سامنے ڈال کر فوراً وہاں سے واپس نہ آجانا بلکہ یہ جائزہ لینے کی بھی کوشش کرنا کہ اس خط پر ان کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ پرے ہٹنے کی ہدایت ہُدہُد کو حضرت سلیمانؑ نے اس لیے فرمائی کہ وہ لوگ بے تکلف اظہارِ خیال کر سکیں اور ایک غیر ملک کے قاصد کی موجودگی کے باعث کوئی جھجک نہ محسوس کریں لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس زمانے میں پرندوں کے ذریعہ سے نامہ بری تو ایک معروف بات تھی لیکن یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ کا نامہ بر ہُدہُد باتوں کو سنتا اور سمجھتا بھی ہے کم از کم اس مرحلے تک ملک سبا کے لوگوں کے علم میں اس کے ہونے کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

قَالَتْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَؤُا۟ إِنِّىٓ أُلْقِىَ إِلَىَّ كِتَٰبٌ كَرِيمٌ ۝ إِنَّهُۥ مِن سُلَيْمَٰنَ وَإِنَّهُۥ بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ۝ أَلَّا تَعْلُوا۟ عَلَىَّ وَأْتُونِى مُسْلِمِينَ (۲۹-۳۱)

حضرت سلیمانؑ کا نامہ ملکۂ سبا کے نام

نامہ کے موصول ہونے کے بعد ملکہ نے فوراً اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ ان کو بتایا کہ إِنِّىٓ أُلْقِىَ إِلَىَّ كِتَٰبٌ كَرِيمٌ (میرے پاس ایک معزز گرامی نامہ ڈلوایا گیا ہے) اس اندازِ تعارف سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ پرندوں کے ذریعہ سے خطوط بھیجنے اور بھجوانے کا طریقہ اس زمانے میں کم از کم بادشاہوں کے ہاں، ایک معلوم و معروف طریقہ تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ملکہ کو بھی اس طرح، بغیر کسی قاصد کے، خط آنے پر تعجب ہوتا اور درباری بھی اس پر تعجب کا اظہار کرتے لیکن نفسِ خط کے وصول ہونے پر نہ ملکہ نے کسی تعجب کا اظہار کیا نہ ان کے درباریوں نے بلکہ ملکہ نے بھی اس کا ذکر ایک عام واقعہ کی حیثیت سے کیا اور درباریوں نے بھی اس کو عادی واقعہ ہی کی حیثیت سے سنا۔

دوسری یہ کہ ملکہ نے اس خط کا ذکر ایک معزز خط کی حیثیت سے کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ خط — حضرت سلیمانؑ — کی عزت و عظمت ان کے اور ان کے درباریوں کے دل میں پہلے سے موجود تھی۔ اس کے شواہد تورات اور تالمود میں بھی موجود ہیں۔ اور آگے قرآن میں بھی اس کے اشارات آ رہے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ یہ ملکہ نے اصل خط کا خلاصہ پیش کیا کہ یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ہوا ہے۔ قدیم زمانے کے سلاطین و امراء کے خطوط و فرامین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ان کا آغاز مرسل اور مرسل الیہ کے نام سے ہوتا۔ ملکہ نے چونکہ خط کا پورا متن نہیں بلکہ خلاصہ ہی پیش کیا اس وجہ سے مرسل کے نام اور اس کے بعد خاص طور پر اس کے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے شروع ہونے کا ذکر کیا۔ اس سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نے خط کے اس سرنامہ کو خاص طور پر اہمیت دی اور یہ چاہا کہ اس کے اندر جو دعوتی روح ہے اس کو اس کے درباری بھی سمجھیں۔

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ۔ یہ حضرت سلیمانؑ کے خط کا اصل مدعا ملکہ نے بتایا کہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ میرے مقابل میں سرکشی نہ کرو بلکہ میری اطاعت میں داخل ہو جاؤ۔

اگرچہ قرینہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نے حضرت سلیمانؑ کے خط کا خلاصہ پیش کیا ہے لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ قدیم زمانے میں خطوط اور فرامین طویل نہیں لکھے جاتے تھے بلکہ نہایت مختصر اور قلّ و دلّ ہوتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط سے بھی اسی کی شہادت ملتی ہے اس وجہ سے اگر حضرت سلیمانؑ کا خط اتنا ہی رہا ہو جب بھی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

حضرت سلیمانؑ کا مطالبہ اہل سبا سے تورات کی کتاب سلاطین سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے گرد و پیش کی تمام ریاستیں اور حکومتیں یا تو خود ان کی باجگزار اور ماتحت بن گئی تھیں یا حضرت سلیمانؑ نے ان کو طاقت کے زور سے اپنے زیرنگین کر لیا تھا اور ایسا انھوں نے اس اصول کے تحت کیا تھا کہ کفر و شرک کا اقتدار خدا کی زمین میں سب سے بڑا فساد ہے جس کو مغلوب کرنا اہل حق کے فرائض میں سے ہے۔ اس اصول کے تحت اہل سبا سے بھی انھوں نے مطالبہ کیا کہ وہ سیدھے سیدھے ان کی ماتحتی میں داخل ہو جائیں، سرکشی کی روش نہ اختیار کریں کہ ان کے خلاف ان کو کوئی اقدام کرنا پڑے۔ 'مُسْلِمِیْنَ' یہاں اطاعت اور فرمانبرداری کے مفہوم میں ہے۔ اسلام لانے کے مفہوم میں نہیں ہے۔ ایک صحیح اسلامی حکومت کو یہ حق تو حاصل نہیں ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام لانے پر مجبور کرے لیکن اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اقتدار پر متمکن نہ رہنے دے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ خدا کی زمین میں خدا کے قانون کے سوا کسی اور قانون کی بالادستی خدا سے بغاوت اور فساد فی الارض ہے۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ (۳۲)

ملکۂ سبا کا مشورہ اپنے درباریوں سے خط کا مضمون سنا کر ملکہ نے درباریوں سے مشورہ طلب کیا کہ آپ لوگ اس معاملے میں رائے دیجیے کہ مجھے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اور ساتھ ہی اہل دربار کی دلجوئی و استمالت کے لیے یہ بھی کہا کہ میں کسی اہم معاملے کا فیصلہ اس وقت تک نہیں کرتی جب تک آپ لوگوں کی موجودگی میں آپ لوگوں کا مشورہ نہ حاصل

کرلوں۔ اس دل جوئی کی ضرورت ملکہ نے غالباً اس لیے محسوس کی کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے جنگ کے لیے، جیسا کہ آگے کے حالات سے واضح ہوگا، تیار نہیں تھیں اور ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کے اعیان بھی معاملہ پر اسی طرز سے سوچیں جس طرز سے وہ سوچ رہی ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ کوئی شخصی حکومت بھی اس معنی میں شخصی نہیں ہوا کرتی کہ بادشاہ اپنی ذات کے سوا ہر شخص سے بالکل مستغنی ہو۔ اس معنی میں شخصی تو فرعون کی حکومت بھی نہیں تھی۔ آخر وہ بھی اپنے اعیان اور درباریوں سے مشورہ کرتا تھا! اسی طرح ملکہ سبا نے بھی اپنے اعیان سے مشورہ کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ملکۂ سبا کی حکومت جمہوری یا شورائی تھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اس کو کہہ سکتے ہیں تو اعیانی حکومت کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص مفہوم میں

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ (۳۳)

درباریوں کا مشورہ — درباریوں نے کہا کہ ہم وسائل جنگ اور افراد کی تعداد کے اعتبار سے بھی طاقتور ہیں اور ہمارے آدمی جنگی مہارت و بسالت کے اعتبار سے بھی ممتاز و نامور ہیں تو آپ اگر جنگ کا فیصلہ فرمائیں تو ہم حریف سے ہیٹے نہیں ہیں لیکن فیصلہ بہرحال آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ غور فرمالیجیے کہ کیا حکم دیتی ہیں۔

'اُولُوْا قُوَّةٍ' سے انھوں نے اپنی عددی قوت اور وسائل جنگ کی طرف اشارہ کیا اور 'اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ' سے اپنی جنگی مہارت و بصیرت اور جراءت و بسالت کی طرف۔ جنگ کے لیے یہی دو چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درباریوں کا رجحان جنگ کی طرف تھا اور انھوں نے اپنا یہ رجحان ملکہ کے سامنے ظاہر کر دیا۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۳۴)

ملکہ کی رائے — ملکہ نے درباریوں کے اس رجحان کی تائید نہیں کی۔ حضرت سلیمانؑ کی قوت و صولت اور ان کی دانش و حکمت سے متعلق ان کو بہت سی باتیں پہنچ چکی تھیں۔ اس وجہ سے جنگ کے رجحان کی انھوں نے حوصلہ شکنی کی اور اس کے عواقب سے اپنے درباریوں کو ڈرایا کہ بادشاہ لوگ جب کسی ملک یا شہر کو فتح کرتے ہیں تو اس کو بالکل تلپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں اور ان کے ہاتھوں ملک کے معززین کو ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے بصورت غلبہ سلیمانؑ اور ان کے فوجی بھی لازماً یہی کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جنگ سے احتراز ہی میں خیر ہے۔

وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (۳۵)

ملکہ کی مصالحت کی پالیسی — ملکہ نے جنگ کے بجائے مصالحت و استمالت کی پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ میں پہلے اپنے سفیروں کے ذریعے سے حضرت سلیمانؑ کے پاس تحفے بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ ہمارے اس جذبۂ خیرسگالی کا ان پر کیا اثر پڑتا ہے اور ہمارے سفیر ان کی طرف سے کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔

'فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ' سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ملکہ کو اپنی اس سفارت کی کامیابی

کی کچھ زیادہ توقع نہیں تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ حضرت سلیمانؑ کے سامنے سوال اصول کا ہے۔ ان کو تحفوں اور ہدیوں سے رام کرنا ممکن نہیں ہے لیکن وہ جنگ سے بچ کر معاملے کو طے کرنے کی کوئی ایسی راہ نکالنا چاہتی تھیں جو ان کے اور ان کے اہلِ ملک کے لیے بہتر ہو اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے مزاج میں سلامت روی اور عاقبت بینی تھی۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ (۳۶)

حضرت سلیمانؑ کا جواب ملکۂ سبا کے وفد کو

ملکہ نے اپنی تجویز کے مطابق تحائف و ہدایا کے ساتھ ایک وفد حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بھیجا۔ 'جَآءَ' واحد کا صیغہ وفد کے لحاظ سے آیا ہے یعنی 'فَلَمَّا جَآءَ مَنْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ'۔ ملکہ کے اوپر کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے اور حضرت سلیمانؑ کے آگے کے الفاظ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ایک پورا وفد حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا لیکن حضرت سلیمانؑ نے ان کے تحائف و ہدایا قبول نہیں فرمائے۔ بلکہ صاف لفظوں میں ان کو جواب دے دیا کہ آپ لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہیں، میں مال کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے میرے رب نے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو آپ لوگوں کے پاس ہے۔ 'فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ' کے اجمال میں مال و جاہ اور حکمت و حکومت کی وہ ساری نعمتیں شامل ہیں جو حضرت سلیمانؑ کو حاصل تھیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اس قسم کے ہدیوں اور تحفوں سے آپ ہی لوگ خوش ہوتے ہیں۔ میں اس کا متمنی نہیں ہوں۔

حضرت سلیمانؑ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرا مطالبہ آپ کی ملکہ اور آپ کی حکومت سے اطاعت کا ہے۔ میں صرف دوستی کا خواہشمند نہیں ہوں کہ ان تحفوں سے خوش ہو جاؤں کہ ہمارے درمیان دوستی کی رسم و راہ قائم ہو گئی۔ مال و متاع میرے پاس بہت ہے اور وہ بہر شکل آپ لوگوں کے مال سے بہتر ہے۔ آپ لوگ تو اس طرح کی چیزوں سے خوش ہوتے ہیں اس لیے کہ آپ لوگوں کی نظر میں ساری قدر انھی چیزوں کی ہے لیکن میرے پیشِ نظر اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ میرے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ میں تحفوں سے خوش ہو کر شرک و کفر کے اقتدار کو خدا کی زمین پر جائز تسلیم کر لوں۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۳۷)

حضرت سلیمانؑ نے رئیسِ وفد کو یہ جواب دیا کہ تم اپنی ملکہ اور ان کے اعیان کے پاس جاؤ۔ ہم ان پر ایسی افواجِ قاہرہ سے حملہ کریں گے جن کے مقابلہ کی تاب وہ نہ لا سکیں گے اور ان کو اس ملک سے اس طرح ذلیل کر کے نکالیں گے کہ وہ خود اپنی نظروں میں خوار ہو کر رہ جائیں گے۔

'قِبَلٌ' کے معنی قوت، طاقت اور مقدرت کے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کو اپنے قاصد کے ذریعہ سے یہ

بات معلوم ہو چکی تھی کہ ملکۂ سبا کے درباریوں کو اپنے اسباب و وسائل اور اپنی شجاعت و بسالت پر بڑا ناز ہے اس وجہ سے انھوں نے ان کو آگاہ فرمایا کہ میری فوج کے مقابلہ میں ان کا یہ سارا غرہ ختم ہو جائے گا۔

'اَذِلَّۃً' کے ساتھ 'وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ' کے اضافہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ میری فوجیں اس طرح ان کو ذلیل کر کے ملک سے نکالیں گی کہ وہ خود اپنی نظروں میں بھی خوار ہو کے رہ جائیں گے۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم جنگ میں تو شکست کھا جاتی ہے لیکن اس کا حوصلہ باقی رہتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میری فوجیں اس طرح ان کے کس بل نکال دیں گی کہ پھر یہ جنگ کا کبھی نام بھی لینے کی جرأت نہیں کریں گے۔

قَالَ یٰٓاَیُّھَا الْمَلَؤُا اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِھَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ (۳۸)

حضرت سلیما[ن]
کی ایک
تدبیر

سفیروں کو واپس کر دینے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے یہ اندازہ اچھی طرح فرما لیا کہ یہ لوگ جنگ کا خطرہ مول لینے کی جرأت نہیں کریں گے بلکہ بہت جلد ان کے مطالبہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیں گے۔ اس سے پہلے پہلے انھوں نے یہ چاہا کہ ملکہ اور اس کے درباریوں کے سامنے ان کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو جائے جو ان کو بالکل ہی مرعوب کر دے۔ چنانچہ انھوں نے یہ ارادہ فرمایا کہ ملکہ کے اس تخت کو، جس کی شان و عظمت کی ان کے قاصد نے خبر دی تھی، اپنے دربار میں منگوا لیں۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے درباریوں سے فرمایا کہ تم میں سے ایسا کون ہے جو ملکہ کے تخت کو، قبل اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس فرماں بردارانہ آئیں حاضر کر دے؟

قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ وَاِنِّیْ عَلَیْہِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ (۳۹)

'عِفْرِیْتٌ' کے معنی کاردان، شاطر اور چالاک کے ہیں اور ساتھ ہی اس کے اندر تگڑے، زورآور اور لیڈر ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے میں نے اس کا ترجمہ سرہنگ کیا ہے۔

جنوں کے ایک
سرہنگ کی
پیشکش

یہ بحث اپنے مقام میں گزر چکی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا علم بھی عطا ہوا تھا جس کے ذریعہ سے انھوں نے بہت سے جنوں کو مسخر کر کے اپنی حکومت کی مختلف قسم کی خدمات میں لگا رکھا تھا۔ جب حضرت سلیمانؑ نے درباریوں کے سامنے مذکورہ بالا خواہش کا اظہار کیا تو اس کی تعمیل کے لیے سب سے پہلے ایک شاطر جن نے اپنی خدمات پیش کیں کہ اگر حضور یہ خدمت میرے سپرد فرمائیں تو میں آپ کی اس مجلس کے برخاست ہونے سے پہلے پہلے ملکہ کے تخت کو حاضر کر سکتا ہوں۔ ساتھ ہی اس نے یہ اطمینان بھی دلایا کہ میں اس تخت کو اٹھا لانے کی قوت بھی رکھتا ہوں اور دیانت دار بھی ہوں اس وجہ سے حضور اطمینان رکھیں کہ میں اس میں کوئی تصرف نہیں کروں گا۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۟ ۖ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ؕ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ

لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (۴۰)

ایک عالمِ کتاب کا کارنامہ

جب ایک جن نے یہ پیشکش کی تو دربار کے ایک عالم کتاب کی غیرت جوش میں آگئی۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہوئی! یہ دربار کے برخاست ہونے تک تخت کے لانے کا وعدہ کرتا ہے میں آپ کی پلک جھپکتے اس کو حاضر کیے دیتا ہوں۔ اتنے میں حضرت سلیمانؑ نے دیکھا کہ تخت ان کے سامنے موجود ہے۔

علم کتاب سے مراد ظاہر ہے کہ خدا کی کتاب و شریعت یعنی تورات کا علم ہے۔ اس عالمِ کتاب کو معلوم ہوتا ہے کہ اس علم میں بھی درخور حاصل تھا جس کا ذکر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہاروت و ماروت کے ضمن میں وضاحت سے کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ خواص کلمات و اسمائے الٰہی کا علم ہے جو سحر و شعبدے وغیرہ جیسے علوم سفلیہ کے مقابلہ کے لیے دو فرشتوں کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بابل کی اسیری کے زمانہ میں، عطا ہوا تھا۔ یہ علم بجائے خود پاکیزہ ہے لیکن اس کی نوعیت ایک شمشیر دودم کی ہے جس کو ناسد اغراض میں استعمال کر کے انسان فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ بقرہ میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ فرشتوں نے اس علم کو فتنہ سے تعبیر بھی فرمایا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے تک تو ان کے شدید احتساب کے سبب سے اس علم کو کوئی غلط مقاصد میں استعمال کرنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن بقرہ میں اس بات کی تصریح ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے بعد یہود اسی علم کے ہو کے رہ گئے۔ تورات سے ان کو کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی بلکہ مزید ستم یہ کیا کہ اس کو انھوں نے عملیات سفلیہ کا ضمیمہ بنا لیا اور اپنے عوام کو یہ باور کرایا کہ حضرت سلیمانؑ کی تمام عظمت و شوکت انھی چیزوں کے بل پر قائم تھی۔

یہ علم، تورات یا آسمانی صحیفوں کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ یہ ان سے الگ ہے۔ یہ ایک خاص دور میں، ایک خاص ضرورت و مصلحت کے تحت، بنی اسرائیل کو عطا ہوا تھا جس کی وضاحت بقرہ کی تفسیر میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں اَلَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کتاب و شریعت کے علم کے ساتھ بھی ایسا علم حاصل کیا جا سکتا ہے جس کی تاثیر و تسخیر کا مقابلہ شیاطین جن و انس اپنی عملیات سفلیہ کے زور سے نہیں کر سکتے۔

حضرت سلیمانؑ کی شکر گزاری

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ۔ الآیۃ یہ وہ اصل مدعا ہے جس کے لیے یہ واقعہ سنایا گیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ فی الواقع ملکہ سبا کا تخت ان کے سامنے موجود ہے، اور اس کے لیے نہ انھیں خود کچھ کرنا پڑا اور نہ کسی جن و شیطان سے ان کو مدد لینی پڑی بلکہ ان کے دربار کے ایک عالم کتاب نے اللہ کے نام و کلمات کے ذریعے سے، یہ کارنامہ کر دکھایا تو بجائے اس کے کہ وہ اس پر مغرور ہوں اور اترائیں وہ فوراً پکار اٹھے کہ یہ سب میرے رب کا فضل ہے اور وہ یہ فضل کر کے میرا امتحان کر رہا ہے کہ میں اس کا شکر گزار و فرماں بردار بندہ بنتا ہوں یا ناشکرا! جو شخص نعمت پا کر خدا کا شکر گزار رہتا ہے وہ خدا کو کوئی نفع نہیں پہنچاتا بلکہ اپنے ہی کو نفع پہنچاتا ہے۔ میرا رب تو بالکل بے نیاز ہے لیکن اس بے نیازی کے

ساتھ ساتھ وہ کریم بھی ہے اس وجہ سے وہ ان لوگوں کو بھی اپنی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا جو اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اس کے خلاف بغاوت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ (۴۱)

حضرت سلیمانؑ کا ایک تفنن

حضرت سلیمانؑ کے پیش نظر تخت کے منگوا لینے سے مقصود مجرد اس کا منگوا لینا تو تھا نہیں بلکہ وہ اس طرح ملکہ اور اس کے اعیان کے سامنے اس علمِ حق کی سطوت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشا تھا۔ انھوں نے چاہا کہ جب ملکہ آئیں تو وہ اس تخت کو دکھا کر ان سے پوچھیں کہ جس تخت پر آپ فروکش ہوتی ہیں وہ اسی طرح کا ہے یا اس سے کچھ مختلف ہے! یہ ایک قسم کا تفنن تھا جس کے لیے انھوں نے اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ تخت کی ہیئت میں فی الجملہ تبدیلی کر دی جائے تاکہ ملکہ صاحبہ کے لیے ان کا اپنا تخت ایک پہیلی بن جائے اور ہم دیکھیں کہ یہ پہیلی بوجھنے میں وہ کامیاب ہوتی ہیں یا ناکام رہ جاتی ہیں!

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ (۴۲)

ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے دربار میں

ملکہ نے تحائف کے ساتھ جو وفد حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بھیجا تھا اس کی ناکام واپسی کے بعد ملکہ نے حضرت سلیمانؑ سے براہ راست ملاقات کا ارادہ فرمایا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن سے بھی، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، اس کی تائید ہوتی ہے کہ ملکہ حضرت سلیمانؑ کی حکمت سے بہت متاثر تھیں۔ اس صورتِ حال کے پیدا ہو جانے کے بعد انھوں نے چاہا کہ وہ براہِ راست حضرت سلیمانؑ سے گفتگو کر کے ان کے علم و حکمت سے بھی مستفید ہوں اور اپنے سیاسی مسئلہ کا بھی کوئی حل تلاش کریں چنانچہ وہ اپنے بہت سے وزرا و اعیان کے ساتھ حضرت سلیمانؑ سے ملاقات کے لیے آئیں۔ یہاں ان کے سامنے وہ پہیلی رکھی گئی جس کا ذکر اوپر ہوا۔ ان کا تخت دکھا کر ان سے سوال کیا گیا کہ آپ کا تخت ایسا ہی ہے یا اس سے کچھ مختلف؟ ملکہ یہ منظر دیکھ کر بالکل ہک دک رہ گئیں! بڑی احتیاط کے ساتھ بولیں کہ یہ تو گویا وہی ہے! اس کے ساتھ انھوں نے صاف لفظوں میں یہ اعتراف کر لیا کہ حضرت سلیمانؑ کی عظمت و شوکت کا علم اس سے پہلے بھی ہمیں تھا اور ہم قلبی طور پر ان کے مطیع و منقاد رہے ہیں۔ 'مِنْ قَبْلِهَا' میں ضمیر کا مرجع یہ واقعہ یا معجزہ ہے جو ملکہ کے مشاہدہ میں آیا۔ ملکہ کے اس قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے کارناموں اور ان کے علم و حکمت سے تنہا وہی متاثر نہیں تھیں بلکہ ان کے دوسرے بہت سے وزرا و امرا بھی متاثر تھے۔ اور یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے۔ آخر ملکہ کے تاثرات سے ان کے دوسرے مقربین متاثر کیوں نہ ہوتے؟ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ اس موقع پر وہی مقربین ملکہ کے ساتھ رہے ہوں۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ (۴۳)

[illegible]

یہ قرآن نے توجیہ بیان کی ہے اس بات کی کہ حضرت سلیمانؑ کے علم و حکمت سے اس قدر متاثر اور قلبی طور پر ان کی مطیع و منقاد ہونے کے باوجود آخر ملکہ اتنے عرصے تک ایک غلط دین پر کیوں جمی رہ گئیں ؟ فرمایا کہ اس کا سبب ان کے وہ اصنام تھے جن کو وہ پوجتی رہی تھیں اور ان کی وہ کافر قوم جس کی وہ ایک فرد تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ روایات اور قومی روابط کی زنجیریں ہر شخص آسانی سے نہیں توڑ سکتا۔ کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر حق واضح ہوتا ہے لیکن وہ اپنے ماحول کے بندھنوں میں ایسے بندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان سے رہائی حاصل کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ صرف صاحبِ توفیق ہی ہوتے ہیں جو راہ کے ان بھاری پتھروں کو ہٹانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ مشکل یوں تو ہر ایک کی راہ میں ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو سیادت و قیادت کا منصب حاصل ہوتا ہے ان کے لیے یہ مشکل دوچند بلکہ دہ چند ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کے بالکل ہی غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ مدعی تو وہ ہوتے ہیں لوگوں کے لیڈر ہونے کے لیکن چلتے ہیں لوگوں کے پیچھے پیچھے۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۚ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۴)

حضرت سلیمانؑ کے شیش محل کے اندر ملکہ کی حیرانی

اس کے بعد حضرت سلیمانؑ کے خدام کی طرف سے ملکہ سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ محل کے اندر تشریف لے چلیں۔ ملکہ محل کے اندر داخل ہوئیں تو ان کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ انھوں نے فرش پر قدم رکھا تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی گہرے پانی کے حوض میں اتر رہی ہیں اور جس طرح ایک پانی میں اترنے والا اپنے پائنچے چڑھا لیتا ہے بالکل بے ساختہ، غیر ارادی طور پر، انھوں نے بھی اپنے پائنچے چڑھا لیے۔ اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ یہ پانی کا حوض نہیں بلکہ یہ محل اور اس کا یہ فرش شیشہ سے بنایا گیا ہے۔

مقصود اس بیان سے یہ دکھانا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیری کمال کا یہ حال تھا کہ ان کے شیش محل میں پہنچ کر ملکۂ سبا جیسی صاحبِ تاج و اورنگ بھی فرش کو حوض سمجھیں اور بے ساختہ ان سے ایسی حرکت صادر ہوگئی جس سے ثابت ہوگیا کہ یہ منظر ان کو زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

معلوم ہوتا ہے محل کا فرش شیشہ کی دبیز تختیوں سے بنایا گیا تھا اور اس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا اس وجہ سے کوئی انجان جب فرش پر قدم رکھتا تو اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا وہ کسی حوض میں اتر رہا ہے۔ ایک دیہاتی جب کسی متمدن شہر کے ایوانوں اور محلوں میں داخل ہوتا ہے تو اس کو اس طرح کی حیرانی بہت پیش آتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل کا جمال یہ تھا کہ اس کے اندر دیہاتی تو درکنار ملکۂ سبا بھی ایک دیہاتی بن گئیں۔

ملکۂ سبا کا اعتراف و اعلان

قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ ایک طرف حضرت سلیمانؑ

کی حکمت و معرفت اور دوسری طرف یہ شان و شکوہ، ان دونوں چیزوں نے مل کر ملکہ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بے تحاشا پکار اٹھیں کہ اے رب! میں نے اپنی جان پر بڑا ظلم ڈھایا کہ اب تک شرک و بت پرستی میں گرفتار اور قومی رسوم و روایات کی پرستار بنی رہی۔ اب میں اپنے آپ کو سلیمانؑ کے ساتھ خداوند عالم کے حوالہ کرتی ہوں۔ ملکہ نے یہ اعلان کر کے اپنے آپ کو اللہ رب العلمین کی اور اپنی حکومت کو حضرت سلیمانؑ کی ماتحتی میں دے دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ شیش محل بھی اللہ کی ایک نشانی ہے جس کے ساتھ عبدیت و انابت اور شکرگزاری و دانائی کا وہ جمال ہو جو حضرت سلیمانؑ کے اندر تھا۔ اس سے خلق کو رہنمائی ملتی ہے اور وہ آنکھوں کو خیرہ کرنے کے بجائے ان کو بصیرت بخشتا ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو پھر وہ کبر و غرور کا ایک نشان اور ایک ظلمت خانہ ہے اگرچہ کوئی اس کا نام قصر ابیض (WHITE HOUSE) ہی کیوں نہ رکھ چھوڑے۔

عبدیت کا جمال اور شکوہ خسروی

حضرت سلیمانؑ کے اس شیش محل سے متعلق یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ نہ دوسروں کی مدد امداد کے قرض سے بنا تھا اور نہ اپنے ملک کے لوگوں کو بھوکوں مار کے بنا تھا۔ بلکہ یہ اس وقت بنا جب حضرت سلیمانؑ کی قوم کی رفاہیت کا یہ حال تھا کہ تورات میں آتا ہے کہ ملک کے اندر سونے کی اتنی کثرت تھی کہ چاندی کی وہاں کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ علاوہ ازیں خود قرآن سے، سورۂ سبا کی تفسیر میں ان شاء اللہ واضح ہو جائے گا کہ حضرت سلیمانؑ نے صرف ایوان و محل ہی نہیں تعمیر کیے تھے بلکہ ان ایوانوں کے پہلو بہ پہلو عظیم لنگر خانے بھی قائم کیے تھے جہاں سے ضرورت مندوں کو پیٹ بھر کر روٹی ملتی تھی۔ بہرحال تعمیر و تمدن بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ جس طرح عبدیت کے جمال کے ساتھ خسروی شکوہ میں کوئی خرابی نہیں ہے اسی طرح خلق کی رفاہیت کے ساتھ تعمیرات کے شکوہ میں بھی کوئی خرابی نہیں ہے۔ خرابی درحقیقت عدم توازن میں ہے اور اس عدم توازن سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بڑے ہی صاحب توفیق لوگوں کا کام ہے۔

ملکۂ سبا کا ذکر تورات میں

ملکہ سبا کی یہ سرگزشت تورات میں اس تفصیل و وضاحت سے نہیں آئی ہے لیکن اس کے بھی ضروری حصے پر نظر ڈال لیجیے تاکہ قرآن مجید اور تورات میں جو قدر مشترک ہے وہ سامنے آجائے۔ تورات میں ملکہ کی آمد اور ان کے تاثرات کا یوں ذکر ہوا ہے۔

> اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سنی تو وہ آئی .... اور وہ بہت بڑی جلو کے ساتھ یروشلم میں آئی اور اس کے ساتھ اونٹ تھے جن پر مصالح اور بہت سا سونا اور بیش بہا جواہر لدے تھے اور جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارہ میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی .... اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری حکمت اور اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا، دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے — اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے

کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آکر اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ نہ لیا اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم .... اور سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا دیا۔ علاوہ ازیں سلیمان نے اس کو اپنی شاہانہ سخاوت سے بھی عنایت کیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔" (۱-سلاطین : باب ۱۰-۱-۱۳)

تورات کا یہ بیان اگرچہ ادھورا ہے لیکن قدرِ مشترک اس میں بھی موجود ہے۔

تورات کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے بعد ملکہ اپنی مملکت کو واپس چلی گئیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے اور قرآن میں کوئی چیز اس کے خلاف نہیں جاتی۔ جب ملکہ نے سیاست اور مذہب دونوں میں حضرت سلیمانؑ کی اطاعت کر لی اور ان کے بہت سے وزراء و اعیان بھی ملکہ کے ہم خیال تھے اور وہ اپنی مملکت کی بلا شرکت غیرے بادشاہ اور اپنی رعایا میں مقبول تھیں تو دین اور سیاست دونوں کے نقطۂ نظر سے یہی بات صحیح تھی کہ وہ اپنے ملک میں جا کر اپنی حکومت ان اصولوں کے مطابق چلائیں جو حضرت سلیمانؑ نے ان کو بتائے۔ بعض تفسیری روایات میں یہ جو آیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ان سے نکاح کر کے ان کو اپنے حرم میں داخل کر لیا، یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ سند کے اعتبار سے بھی یہ روایات ضعیف ہیں۔

۶۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۴۵-۵۸

اوپر فرعون کے تمرّد، حضرت سلیمانؑ کی شکرگزاری اور ملکۂ سبا کی سلامت روی کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں اور یہ دکھایا گیا ہے کہ علو و استکبار کا انجام کیا ہوتا ہے اور شکرگزاری و فروتنی کا صلہ کیا ملتا ہے۔ اب خاص عرب کی اقوام بائدہ میں سے دو قوموں ــــ قوم ثمود و قوم لوط ــــ کے افساد اور ان کے انجام کا حوالہ دیا تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ یہ دور کے ملکوں ــــ مصر، فلسطین اور یمن ــــ کے واقعات ہیں۔ بلکہ خود اپنے ملک کے اندر کی ان قوموں کے انجام سے بھی سبق لیں جن کے علو و استکبار کے نتائج کی داستان سنانے کے لیے ان کے عالی شان تعمیرات کے کھنڈر آج بھی ان کے سامنے موجود ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا آیات ۴۵-۵۸
هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ

قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا
اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تُفْتَنُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي
الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿٤٨﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ
ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٤٩﴾
وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٠﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥١﴾
فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٣﴾ وَلُوْطًا
اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿٥٤﴾ اَئِنَّكُمْ
لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۗ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تَجْهَلُوْنَ ﴿٥٥﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا
اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ
وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ
مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٥٨﴾ ع ۴ / ۱۴ / ۱۹

ترجمۂ آیات ۴۵ - ۵۸

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو اس پیغام کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا کہ لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ تو دو فریق بن کر آپس میں جھگڑنے لگے۔ اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، تم بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہوئے ہو؟ تم

اللہ سے مغفرت کیوں نہیں مانگتے کہ تم پر رحم کیا جائے! ۴۵-۴۶

انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو یہ سب تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی نحوست سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا، تمھارا نصیبہ اللہ کے پاس ہے بلکہ یہ تو تم آزمائے جا رہے ہو۔ ۴۷

اور شہر میں نو خاندان تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے اللہ کی قسم کھا کر عہد کیا کہ ہم اس کو اور اس کے لوگوں کو چپکے سے ہلاک کر دیں گے پھر ہم اس کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے آدمی کی ہلاکت میں شریک نہیں ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔ اور انھوں نے بھی چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی اور وہ باخبر بھی نہ ہوئے۔ تو دیکھو کیسا ہوا ان کی چال کا انجام! ہم نے ان کو اور ان کی پوری قوم کو ہلاک کر دیا۔ پس یہ ہیں ان کے گھر ویران پڑے ہوئے بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے! بے شک اس کے اندر بڑا سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ اور ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جو ڈرتے تھے۔ ۴۸-۵۳

اور ہم نے لوط کو بھی رسول بنا کر بھیجا۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم کھلی آنکھوں دیکھتے ہوئے اس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو! کیا تم لوگ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو! بلکہ تم بڑے ہی جاہل ہو! تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ انھوں نے کہا کہ لوط کے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں! تو ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو نجات دی بجز اس کی بیوی کے، اس کو ہم نے پیچھے رہ جانے والوں میں شمار کر رکھا تھا۔ اور ہم نے ان پر برسایا ایک ہولناک برسانا، پس کیا ہی بری بارش ہوئی ان لوگوں پر جن کو آگاہ کیا جا چکا تھا! ۵۴-۵۸

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاھُمۡ صٰلِحًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا ھُمۡ فَرِیۡقٰنِ یَخۡتَصِمُوۡنَ (۴۵)

حضرت صالحؑ کی دعوت اور اس کا ردِ عمل۔ یعنی حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو اللہ واحد کی بندگی اور اسی کی اطاعت کی دعوت دی۔ یہ ایک ایسی دعوت تھی جس میں کسی اختلاف و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اس کا سب کو خیر مقدم کرنا تھا لیکن ہوا یہ کہ کچھ لوگ تو حضرت صالحؑ پر ایمان لائے اور دوسرے بہت سے اشرار و مفسدین اس دعوتِ حق کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرح قوم دو گروہوں میں بٹ گئی اور دونوں میں بحث و نزاع شروع ہو گئی۔

قَالَ یٰقَوۡمِ لِمَ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبۡلَ الۡحَسَنَۃِ ۚ لَوۡلَا تَسۡتَغۡفِرُوۡنَ اللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (۴۶)

دعوتِ حق کے مخالفین کا عام حربہ، جیسا کہ قرآن میں جگہ جگہ واضح ہو چکا ہے، یہی رہا ہے کہ رسول نے قوم کو جس عذاب سے ڈرایا قوم نے اسی عذاب کا مطالبہ شروع کر دیا کہ اس عذاب کو آنکھوں سے دکھا دو تب ہم مانیں گے کہ تم خدا کے رسول اور اپنی بات میں سچے ہو۔ یہی مطالبہ حضرت صالحؑ کی قوم نے بھی کیا۔ حضرت صالحؑ نے نہایت دردمندی کے ساتھ سمجھایا کہ لوگو! میں تمھیں خدا کی رحمت کی دعوت دے رہا ہوں تو تم اس رحمت سے پہلے خدا کی نقمت کے لیے کیوں جلدی مچا رہے ہو، عذاب کے مطالبہ کے بجائے تم اپنے جرائم کی معافی کیوں نہیں مانگتے کہ خدا کی رحمت کے مستحق بنو! 'سَیِّئَۃ' سے مراد، یہاں قرینہ دلیل ہے کہ عذاب اور نقمت ہے اور 'حَسَنَۃ' سے استغفار جس کا ثمرہ خدا کی رحمت ہے ۔۔۔ یہ امر ملحوظ ہے کہ اس مرحلے میں بعینہٖ یہی رویہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ ان کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ اگر اس دعوت کی تکذیب کا انجام ان کی ہلاکت ہے تو اس ہلاکت کی کوئی نشانی ان کو دکھا دی جائے تب وہ مان جائیں گے کہ بے شک قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اس کا لانے والا اللہ کا رسول ہے۔ ان لوگوں کو گویا حضرت صالحؑ کی زبان سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ تم کو روٹی دی جا رہی ہے تو پتھر نہ مانگو۔ روٹی کی جگہ پتھر مانگنے والوں کا انجام بہت عبرت انگیز ہو چکا ہے اور تمھاری بدبختی ہی ہو گی اگر اس سے سبق نہ حاصل کرو۔

قَالُوا اطَّیَّرۡنَا بِکَ وَبِمَنۡ مَّعَکَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تُفۡتَنُوۡنَ (۴۷)

ہم اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اعراف ۹۴ کے تحت کر چکے ہیں کہ رسولوں کی بعثت کے زمانے میں ایسی آزمائشوں کا ظہور خاص طور پر ہوا ہے جس سے قوم کے اندر انابت و خشیت پیدا ہو تاکہ لوگوں کے دل رسول کی دعوت کی طرف مائل ہوں اور وہ متنبہ ہوں کہ اگر انھوں نے رسول کی بات نہ مانی تو ان پر وہ فیصلہ کن عذاب آ جائے گا جس کی رسول خبر دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام دعوتِ حق کے لیے فضا کو

سازگار بنانے کے لیے فرمایا لیکن لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے یا تو اپنے لیڈروں کے اس مغالطے سے اپنے کو تسلی دے لی کہ اس طرح کے نرم و سخت دن تو قوموں پر آیا ہی کرتے ہیں، ان کو کسی کی تصدیق و تکذیب سے کیا تعلق! یا ان آفتوں کو رسول اور اس کے ساتھیوں کے کھاتے میں ڈال دیا کہ یہ ان کی نحوست کے نتائج ہیں جن سے ہم دوچار ہو رہے ہیں، یہ ہمارے معبودوں اور ہمارے باپ دادا کے دین کے مخالف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس وجہ سے ہمارے معبودوں اور بزرگوں کی مار ان پر پڑی ہے اور ان کی لائی ہوئی آفت میں ہم بھی حصہ پا رہے ہیں۔

یہ جو ہم نے عرض کیا ہے اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کتاب میں پیچھے اس پر مفصل بحثیں گزر چکی ہیں۔ یہاں آیت زیر بحث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب ہم نے اپنی سنت کے مطابق ان کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے دل رسول کی دعوت کی طرف مائل ہوں اور وہ ڈریں کہ اگر انھوں نے رسول کی تکذیب کی تو فی الواقع وہ عذاب الٰہی کی گرفت میں آجائیں گے تو ان تنبیہات سے متاثر ہونے کے بجائے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست ہے کہ ہم ان آفتوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے ہٹ دھرم لوگوں کا کیا علاج! اگر عذاب نہیں آتا تو اس کی نشانی مانگتے ہیں اور اگر نشانی دکھاؤ تو اس کو پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کی نحوست پر محمول کرتے ہیں۔

قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ۔ لفظ 'طائر' پر تفسیر پر بحث اعراف ۱۳۱ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں لفظ 'طائر' نصیبہ اور قسمت کے مفہوم میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائشیں اور آفتیں جو پیش آرہی ہیں ان کو تم ہماری نحوست کا نتیجہ قرار دے رہے ہو حالانکہ ان سب کا سر رشتہ خدا کی تدبیر و تقدیر اور اس کی مشیت و حکمت سے ہے۔ یہ ہماری نحوست کے سبب سے نہیں ظاہر ہو رہی ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری آزمائش ہو رہی ہے۔ ان آزمائشوں میں ڈال کر وہ تمھیں دیکھ رہا ہے کہ تم میں کچھ صلاحیت قبول حق کی ہے یا اب تم بالکل ہی مردہ اور دفن کر دیے جانے کے لائق ہو چکے ہو!

وَكَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۴۸)

'رھط' کا مفہوم 'رَهْط' کے معنی قبیلہ اور خاندان کے ہیں۔ سورۂ ہود میں حضرت شعیبؑ کی سرگزشت میں یہ لفظ گزر چکا ہے۔ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (۹۱) (اور ہم تو تم کو اپنے اندر ایک کمزور آدمی خیال کرتے ہیں اور تمھارے خاندان کا خیال نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے) استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی شکل میں جمع اور واحد دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جن لوگوں نے اس کا ترجمہ شخص کیا ہے ہمارے نزدیک انھوں نے غلط ترجمہ کیا ہے۔

مفسدین کی قوت جمعیت اب یہ مفسدین کی قوت و جمعیت کو واضح فرمایا ہے کہ شہر میں نو خاندان تھے جو سب کے سب حضرت صالحؑ

کی دعوت کے مخالف تھے اور حضرت صالحؑ ان کے اندر تبلیغ دانتوں کے اندر ایک زبان کی حیثیت رکھتے تھے۔ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ یعنی یہ تمام خاندان برابر افساد میں سرگرم تھے اور کسی قیمت پر اصلاح قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اصلاح کا واحد راستہ خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت میں داخل ہونا ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام نے اسی کی دعوت دی ہے۔ اس وجہ سے اس دعوت کی مخالفت افساد فی الارض ہے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۴۹)

حضرت صالحؑ کے خلاف ان کی قوم کے لیڈروں کی سازش

تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ میرے نزدیک یہاں بدل کے محل میں ہے۔ یعنی مذکورہ بالا مفسدین کے تمام خاندانوں نے اللہ کی قسم کے ساتھ آپس میں یہ عہد کیا کہ ہم پوشیدہ طور پر صالحؑ اور ان کے آل و اتباع کو ختم کر دیں گے، پھر ان کے خون کا اگر کوئی مدعی ان کے وارثوں میں سے کھڑا ہوا تو ہم ان سے یہ کہہ دیں گے کہ ان کے آدمی کے قتل میں ہمارا ہاتھ نہیں ہے اور ان کو پوری طرح اطمینان دلا دیں گے کہ ہم بالکل سچے ہیں۔ پوشیدہ طور پر قتل کی یہ سکیم، عہد و پیمان کے ساتھ، اس لیے بنائی گئی کہ یہ لوگ حضرت صالحؑ کو کھلم کھلا قتل کرنے سے ڈرتے تھے کہ اس طرح ان کے خاندان سے ایک مستقل نزاع پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں کسی خاندان کے آدمی کا مارا جانا کوئی آسان معاملہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے قاتل اور مقتول کے خاندانوں میں قتل و قصاص کی ایک لامتناہی جنگ چھڑ جاتی تھی۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے ان کو کھلم کھلا سنگسار کرنے کے بجائے ان کو اور ان کے اہل کو خفیہ طور پر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور ساتھ ہی یہ پوشیدہ عہد و پیمان بھی ہوا کہ اس منصوبہ میں سب شریک ہوں تاکہ افشائے راز نہ ہو اور اگر ہو بھی تو حضرت صالحؑ کے ورثا، قاتلوں کی بھاری جمعیت سے مرعوب ہو کر کسی انتقامی کارروائی کی جرأت نہ کر سکیں۔ یاد ہو گا، اسی قسم کا منصوبہ قریش کے تمام خاندانوں نے دارالندوہ میں بیٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بنایا تھا کہ سب مل کر آپؐ کو ایک ساتھ قتل کریں تاکہ آپؐ کا خاندان قصاص کے مطالبہ کی جرأت نہ کر سکے۔ اس مرحلے میں یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لیے سنایا گیا ہے کہ تمھارے معاند اشرار بھی اسی قسم کی سازشیں کر رہے ہیں یا کریں گے لیکن جس طرح اللہ نے حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت فرمائی اسی طرح وہ تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی بھی حفاظت فرمائے گا۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۵۰-۵۱)

مفسدین کی چال کے مقابل میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر

ان مفسدین نے جو چال چلی اس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا۔ اس کے مقابل میں اللہ تعالیٰ نے جو تدبیر اختیار فرمائی اس کا ذکر سورۂ شعراء اور بعض پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ دیکھ لو، ان کی چال کا

انجام کیا ہوا! اَنَّا دَمَّرۡنٰہُمۡ وَقَوۡمَہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ' یہ اسی انجام کی وضاحت ہے کہ ہم نے ان مفسدین اور ان کی ساری قوم کو پامال کر کے رکھ دیا۔

فَتِلۡكَ بُیُوۡتُہُمۡ خَاوِیَۃًۢ بِمَا ظَلَمُوۡا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ○ وَ اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ (۵۲-۵۳)

'تِلۡكَ' کا اشارہ یہاں اس بات پر دلیل ہے کہ گویا قریش کو ان کے سامنے کی ایک چیز کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی دور کی داستان نہیں ہے بلکہ ثمود کی شاندار تعمیرات کے کھنڈر اپنی داستانِ عبرت سنانے کے لیے تمھارے ملک میں موجود ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ثمود، عاد کے بقایا میں سے تھے اس وجہ سے تعمیرات کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا اور ان کے تباہ شدہ آثار موجود تھے جن پر سے قریش کے قافلوں کو وقتاً فوقتاً گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ 'بِمَا ظَلَمُوۡا' یعنی 'بِمَا ظَلَمُوۡٓا اَنۡفُسَہُمۡ' یہ انجام بد اس وجہ سے ان کو دیکھنا پڑا کہ حضرت صالحؑ کی تکذیب کر کے انھوں نے خود اس کے اسباب پیدا کیے۔

'اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ' یہاں فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے یعنی جو لوگ جاننے اور سمجھنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کے لیے اس سرگزشت میں بڑا درسِ عبرت موجود ہے، لیکن جو لوگ کچھ سننا سمجھنا چاہتے ہی نہ ہوں ان کے اوپر کوئی موعظت بھی کارگر نہیں ہو سکتی!

'وَ اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ' یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ نے نجات بخشی۔ ان کی خاص صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ خدا اور اس کے عدل و انتقام سے ڈرنے والے تھے۔

وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ (۵۴)

حضرت لوطؑ اور قوم لوط کا بیان

یہ اوپر والے واقعہ پر معطوف ہے اس وجہ سے یہاں فعل محذوف ہے۔ یعنی 'اَرۡسَلۡنَا لُوۡطًا'۔

'اَلۡفَاحِشَۃ' کھلی ہوئی بے حیائی و بے شرمی کو کہتے ہیں جس کے بے حیائی ہونے میں کسی اختلاف و نزاع کی گنجائش نہ ہو۔ اس کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

'وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ' یعنی کوئی برائی مخفی قسم کی ہو تو اس میں مبتلا ہو جانا تو چنداں تعجب کی بات نہیں ہے لیکن ایک کھلی ہوئی بے حیائی میں، آنکھیں رکھتے ہوئے مبتلا ہو جانا بدبختی اور اندھے پن کی آخری حد ہے۔ اگر ایک شخص اندھا ہو اور اس کے پاؤں غلاظت پر پڑ جائیں تو اس کے لیے عذر ہے لیکن تمھارے لیے کیا عذر ہے جب کہ تم دونوں آنکھیں رکھتے ہوئے غلاظت کھا رہے ہو!

اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَہۡوَۃً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تَجۡہَلُوۡنَ (۵۵)

استفہام یہاں اظہارِ تعجب و حیرت و کراہت کے لیے ہے۔ 'مِنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ' کی قید ان کے اندھے پن کو واضح کر رہی ہے کہ تقاضائے شہوت کے لیے ایک فطری اور جائز چیز کے موجود ہوتے تمھارا یہ انحراف تمھاری فطرت کے مسخ ہونے کی دلیل ہے۔ لفظ 'جَہۡل' جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، جذبات و خواہشاتِ نفس

سے اس طرح مغلوب ہو جانے کے لیے آتا ہے کہ آدمی عقل و ہوش بالکل ہی کھو بیٹھے۔ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ۔ یعنی تمھاری عقلیں بالکل ہی ماؤف و مغلوب ہو گئی ہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (۵۶)

حضرت لوطؑ کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکانے کی کوشش

اس کھلی ہوئی بے حیائی کے حق میں کوئی دلیل تو وہ گھڑ نہیں سکتے تھے لیکن اس کو چھوڑنے کے لیے بھی وہ تیار نہیں تھے اس وجہ سے واحد چارۂ کار ان کے پاس یہی رہ گیا کہ کسی نہ کسی طرح حضرت لوطؑ کی سرزنش سے پیچھا چھڑائیں۔ قوم کے سرغنوں نے اپنے آدمیوں کو ورغلایا کہ لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس بستی سے نکال دو۔ 'اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' (یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں) اس فقرے میں جو زہر ہے وہ اہلِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اپنی قوم کے جذبات بھڑکانے کے لیے انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ دیکھو ان کے نزدیک ہماری پوری قوم کی قوم تو بدمعاشوں اور گنڈوں کی قوم ہے بس یہی گنتی کے چند نفوس پاک دامن رہ گئے ہیں! جب کوئی برائی وبائے عام کی شکل اختیار کر لے تو اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو اس طرح کے زہر آلود طعنوں سے بڑی آسانی کے ساتھ نکو بنایا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ آج بیگمات کی کسی مجلس میں بے پردگی کے خلاف دو کلمے کہہ کر اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔

لفظ 'آل' پر ہم دوسرے محل میں بحث کر کے واضح کر چکے ہیں کہ یہ اہل و عیال اور اتباع سب پر مشتمل ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (۵۷)

لفظ 'اھل' بھی، جیسا کہ ہم اس کے محل میں وضاحت کر چکے ہیں، اہل و عیال اور اتباع و صحابہ سب کے لیے آتا ہے اور یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں ذمہ داری بقدرِ انعام ہے

'قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ' سے صرف یہی بات نہیں واضح ہوتی کہ حضرت لوطؑ کی بیوی اس نجات سے محروم رہی بلکہ یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ اس پتھراؤ کا نشانہ بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص طور پر تاک رکھا تھا جو قوم لوط پر ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبر کی بیوی ہو کر بھی اس کی ہمدردیاں اپنی نابکار قوم کے ساتھ ہی رہیں تو دوسروں کے مقابل میں خدا کے غضب کی وہ زیادہ مستحق تھی۔ اللہ تعالیٰ جن کو تعلیم و ہدایت کے جتنے ہی زیادہ مواقع میسر فرماتا ہے، اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتے تو ان کو سزا بھی اسی کے حساب سے ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ذمہ داری بقدرِ انعام ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ (۵۸)

قوم لوط کا انجام

یعنی لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو تو اللہ تعالیٰ نے نجات بخشی اور بقیہ پوری قوم پر، فرمایا کہ، ہم نے ایک نہایت بری بارش برسائی۔ اس بارش سے مراد اس پتھراؤ کی بارش ہے جس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر

چکی ہے: 'فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بری بارش نتیجہ تھی اس بات کا کہ ان لوگوں پر اللہ نے اپنے ایک رسول کے ذریعہ سے اتمام حجت فرما دیا تھا۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی جب وہ اندھے بہرے ہی بنے رہے تو مستحق ٹھہرے کہ وہ سنگسار کر کے زمین میں دفن کر دیے جائیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قوم ثمود کی طرح قوم لوط کی بستیاں بھی قریش کی گزرگاہ تھیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں قوموں کا خاص طور پر اس سورہ میں ذکر فرمایا کہ دور اور قریب دونوں کے آثار کی طرف ان کو توجہ دلا دی جائے۔

۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۵۹-۹۳

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں اوپر بیان کیے ہوئے واقعات کے نتائج سامنے رکھ دیے گئے ہیں خاص طور پر قرآن کی دعوتِ توحید پورے زور کے ساتھ، اس کے آفاقی و انفسی دلائل کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ نیز منکرین کے اصل سبب انکار سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ ان کی ساری سخن سازیوں کے پس پردہ یہ چیز ہے کہ یہ آخرت کے بارے میں متردد ہیں حالانکہ وہ ایک حقیقت ہے۔ آفاق و انفس کے دلائل پکار پکار کر اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ یہی بات، یاد ہوگا، تمہید کی آیات میں بھی فرمائی گئی ہے۔ اس طرح خاتمۂ سورہ کا مضمون تمہید کے ساتھ مربوط ہو گیا ہے۔

مطالب کے بیچ بیچ میں بھی اور سورہ کے آخر میں خاص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ قرآن کے انکار اور تمہاری تکذیب کے لیے جو مطالبات و اعتراضات پیش کر رہے ہیں تم ان کی پروا نہ کرو۔ تمہارا کام اندھوں اور بہروں کو دکھانا اور سنانا نہیں ہے۔ تم ان کو صاف بتا دو کہ میرے اوپر اس قرآن کو پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اس کو ماننا اور نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر یہ اس کو نہیں مانیں گے تو قرآن جن باتوں سے ان کو آگاہ کر رہا ہے ان میں سے ایک ایک چیز ان کے سامنے آ کے رہے گی۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۹-۹۳ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۭ آٰللّٰهُ خَيْرٌ
۲۰ الجزء اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ
السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَاۗىِٕقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ
اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَمَّنْ
جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ
وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا

يَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾ أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ
خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ﴿٦٢﴾ أَمَّنْ
يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ
يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٦٣﴾ أَمَّنْ
يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ
أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٦٤﴾ قُلْ
لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ
أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ
مِنْهَا ۖ بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُونَ ﴿٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا ع ۵ ۱
وَآبَاؤُنَا أَئِنَّا لَمُخْرَجُونَ ﴿٦٧﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هَٰذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا
مِنْ قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٦٨﴾ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ
فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿٧٠﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٧١﴾ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي
تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٧٢﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ
لَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا
يُعْلِنُونَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ
مُبِينٍ ﴿٧٥﴾ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي

هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٧٦﴾ وَإِنَّهُ لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٧٧﴾ إِنَّ رَبَّكَ
يَقْضِي بَيْنَهُم بِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿٧٨﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۖ إِنَّكَ
عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ﴿٧٩﴾ إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ
إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٨٠﴾ وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن
تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ﴿٨١﴾ وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ
أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا
لَا يُوقِنُونَ ﴿٨٢﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّن يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا ع ٦
فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿٨٣﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُم بِآيَاتِي وَلَمْ
تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨٤﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِم
بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنطِقُونَ ﴿٨٥﴾ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِيَسْكُنُوا
فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٨٦﴾ وَيَوْمَ
يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَن
شَاءَ اللَّهُ ۚ وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ ﴿٨٧﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً
وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ إِنَّهُ خَبِيرٌ
بِمَا تَفْعَلُونَ ﴿٨٨﴾ مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا وَهُم مِّن فَزَعٍ
يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ ﴿٨٩﴾ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ
هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ
هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ

مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩١﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ
لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿٩٢﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾ ع ۱۱ ۳

ترجمۂ آیات ۵۹-۹۳

کہہ دو کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے اور اس کے ان بندوں پر سلامتی و رحمت ہے جن کو اس نے برگزیدہ کیا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں! ۵۹

(کیا تمھارے یہ معبود بہتر ہیں) یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ پس ہم نے اس پانی سے خوش منظر باغ اگائے۔ تمھارے امکان میں نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگا سکتے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ یہ راہِ حق سے انحراف اختیار کرنے والے لوگ ہیں! ۶۰

(کیا تمھارے یہ اصنام سزاوارِ شکر ہیں) یا وہ جس نے زمین کو ٹھکانا بنایا اور جس نے اس کے درمیان نہریں جاری کیں اور اس کے لیے اس نے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان جس نے پردہ ڈال دیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے! بلکہ ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے! ۶۱

(کیا تمھارے یہ شرکا مستحقِ عبادت ہیں) یا وہ جو محتاج کی دادرسی کرتا ہے جب کہ وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کے دکھ کو دور کرتا ہے اور تم کو زمین کی وراثت دیتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے! بہت ہی کم تم لوگ یاددہانی حاصل کرتے ہو! ۶۲

(کیا تمھارے یہ دیوی دیوتا لائقِ پرستش ہیں) یا وہ جو بحر و بر کی تاریکیوں میں تمھاری رہنمائی کرتا ہے اور جو ہواؤں کو اپنے بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ

کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہیں؟ اللہ بہت ہی برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں! ۶۳

(کیا تمھارے مزعومہ شفعاء لائقِ بندگی ہیں) یا وہ جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرے گا اور جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے! کہو کہ تم اپنی دلیل لاؤ، اگر تم سچے ہو! ۶۴

کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، اللہ کے سوا کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے اور انھیں پتہ بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ۶۵

بلکہ آخرت کے باب میں ان کا علم الجھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ لوگ اس کے بارے میں مبتلائے شک ہیں، بلکہ یہ لوگ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ کافر کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے آباؤ اجداد بھی تو کیا ہم دوبارہ نکالے جائیں گے! اس کی دھمکی ہمیں بھی دی گئی اور اس سے پہلے ہمارے آباء و اجداد کو بھی۔ یہ محض اگلوں کے فسانے ہیں۔ ۶۶-۶۸

ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا۔ ۶۹

اور ان کے حال پر غم نہ کرو اور نہ ان کی چالوں سے جو وہ چل رہے ہیں فکرمند ہو۔ اور یہ پوچھتے ہیں کہ یہ دھمکی کب ظہور میں آئے گی اگر تم سچے ہو! کہہ دو کہ بہت ممکن ہے کہ جس چیز کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو اس کا کوئی حصہ تمھارے پیچھے ہی لگا ہوا ہو۔ اور بے شک تمھارا رب لوگوں پر بڑے فضل والا ہے لیکن ان میں کے اکثر شکر گزار نہیں ہوتے۔ اور تمھارا رب خوب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور آسمان و زمین میں کوئی ایسی مخفی چیز نہیں ہے جو ایک واضح رجسٹر میں درج نہ ہو۔ ۷۰-۷۵

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر بھی ان بہت سی چیزوں کو واضح کر رہا ہے جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔ بے شک تیرا رب اپنے حکم ناطق کے ذریعہ سے ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور وہ غالب اور علم والا ہے۔ پس اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک واضح حق پر تمہی ہو۔ ۷۶ - ۷۹

تم مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے پھیر کر راہ پر لانے والے بن سکتے۔ تم تو بس انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں۔ پس وہی فرمانبردار بنیں گے۔ ۸۰-۸۱

اور جب ان پر بات پوری ہو جائے گی تو ہم ان کے لیے زمین سے کوئی جانور نکال کھڑا کریں گے جو ان کو بتائے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اور اس دن کا خیال کرو جس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکٹھا کریں گے جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے تھے پس ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ اکٹھے ہو جائیں گے تو پوچھے گا کہ کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا حالانکہ تمہارا علم ان کا احاطہ نہ کر سکا تھا یا کیا کرتے رہے تھے! اور ان پر بات پوری ہو جائے گی بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے پس وہ کچھ نہ بول سکیں گے۔ ۸۲ - ۸۵

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو تاریک بنایا تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشن بنایا تاکہ اس میں کام کریں۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۸۶

اور اس دن کا خیال کرو جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں

سب گھبرا اٹھیں گے۔ صرف وہی اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ چاہے گا اور سب اس کے آگے سرفگندہ ہوکر حاضر ہوں گے۔ اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرو گے کہ وہ ٹکے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے۔ یہ اس خدا کی کاریگری ہوگی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔ بے شک وہ ہر اس چیز سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ جو نیکی کے ساتھ حاضر ہوں گے تو ان کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے اور وہ اس دن ہر گھبراہٹ سے مامون رہیں گے۔ اور جو برائی کے ساتھ آئیں گے تو وہ اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے کہ تم کو بدلے میں وہی مل رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ ۸۷-۹۰

مجھے تو بس یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اس کو محترم ٹھہرایا اور جس کے اختیار ہی میں سب کچھ ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں فرماں برداری کرنے والوں میں سے بنوں اور قرآن کو سناؤں تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا وہ اپنے ہی فائدے کے لیے اختیار کرے گا اور جو گمراہی اختیار کرے گا تو تم کہہ دو کہ میں تو بس ایک آگاہ کر دینے والا ہوں۔ اور کہہ دو کہ سزاوار شکر اللہ ہے۔ وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم ان کو پہچان جاؤ گے اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس سے تمھارا رب غافل نہیں ہے۔ ۹۱-۹۳

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ط آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۵۹)

ایک بلیغ گریز اور خوبصورت حلقۂ اتصال

اس آیت کی نوعیت پیچھے اور آگے کے مطالب کے درمیان ایک بلیغ گریز اور نہایت خوب صورت حلقۂ اتصال کی ہے۔ اوپر جو واقعات مذکور ہوئے ہیں ان سے دو حقیقتیں نہایت واضح ہوکر سامنے آگئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اس کے عدل اور اس کی رحمت کی نشانیاں برابر اس میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ اس نے سرکشی کرنے والوں کو سزائیں بھی بڑی سخت دی ہیں اور

اپنے منتخب اور برگزیدہ بندوں کی نصرت بھی برابر فرماتی ہے۔

دوسری یہ کہ سارا اختیار و اقتدار اللہ وحدہ لا شریک ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے علاوہ جن کی پرستش کی گئی ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ وقت آنے پر نہ اپنے کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے اور نہ اپنے پجاریوں کو۔ دو حقیقتیں ایک

اب یہ آیت اسی خلاصہ کو سامنے پیش کر کے آگے توحید پر جو خطبہ آ رہا ہے اس کے لیے تمہید استوار کر رہی ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ تمھاری اور تمھاری پیش کردہ کتاب کی تکذیب کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ یہ سرگزشتیں جو تمھیں سنائی گئی ہیں ان سے یہ حقیقت سورج کی طرح روشن ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ شکر کا سزاوار صرف اللہ ہے جس نے اپنے عدل و رحمت کی یہ شانیں دکھائی ہیں اور یہ کہ سلامتی اور نجات اللہ کے ان بندوں ہی کے لیے ہے جن کو وہ دعوتِ حق اور خدمتِ خلق کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ ان کے دشمن کتنے ہی زور لگائیں لیکن وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ ان کی حفاظت فرماتا ہے اور ان کے ہاتھوں حق کا بول بالا ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اصل حقیقت تو یہ ہے جو تاریخ کے ان دلائل سے ثابت ہوئی تو ان سے پوچھو کہ کیا عبادت و شکرگزاری کے لیے اللہ بہتر ہے جس کی یہ شانیں بیان ہوئیں یا ان کے وہ مزعومہ شرکاء و شفعاء جو نہ اپنی کسی مدد پر قادر ہیں اور نہ اپنے پجاریوں کی، اب آگے اسی مضمون سے توحید کے بیان کے لیے گریز ہے۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَأَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ (۶۰)

اس آیت اور اس کے بعد کی آیات کے صحیح زور کو سمجھنے کے لیے عربیت کے اس اسلوب کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی طرف ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اشارہ کرتے آئے ہیں کہ اس قسم کے سوالیہ جملوں میں مقصود استفہام اور سوال و جواب نہیں ہوتا بلکہ افحام، اتمام حجت اور زجر و تنبیہ ہوتا ہے۔ متکلم پورے زورِ بیان کے ساتھ سوالیہ انداز میں حقائق کو پیش کرتا جاتا ہے اور مخاطب کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ گویا اس کی نزدیک ان میں کچھ کہنے کے لیے کوئی گنجائش کسی کے لیے سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس زورِ بیان کے تقاضے سے اس قسم کے جملوں میں بعض اجزائے کلام حذف کر دیے جاتے ہیں جن کو مخاطب خود سمجھ لیتا ہے یا اس کو سمجھ لینا چاہیے۔ کلام کے اس خلا کو متکلم کا زورِ کلام بھر دیتا ہے۔ خطبائے جاہلیت کے کلام میں اس حذف و ایجاز کی مثالیں بہت ہیں لیکن قرآن کے آگے ان کو پیش کرنا آفتاب کے آگے دیا جلانا ہے۔ اردو میں یہ اسالیب چونکہ نہیں ہیں اس وجہ سے ترجمہ میں ہم نے کلام کے محذوفات کھول دیے ہیں۔

'اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ' سے پہلے اتنی بات گویا محذوف ہے کہ بتاؤ، تمھارے یہ معبود بہتر ہیں جن کا نہ اس کائنات کی خلق و تدبیر میں کوئی حصہ ہے نہ تمھاری پرورش و پرداخت میں یا وہ ذات بہتر ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے اس نے آسمان سے پانی اتارا جس سے اس نے

عربیت کے / ایک خاص / اسلوب

اہتمام ربوبیت / توحید کی دلیل

خوش منظر باغ اگائے۔ جن کے درختوں کو اگا سکنے پر تم قادر نہیں تھے۔

فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهۡجَةٍ میں اسلوبِ کلام بدل گیا ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں غائب کے اسلوب میں بات فرمائی گئی تھی اس میں متکلم کا اسلوب آگیا ہے۔ یہ امتنان و احسان اور عنایت و ربوبیت کے اظہار کے لیے ہے۔

'ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ' یعنی بتاؤ کیا ان سارے کاموں کے کرنے میں خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی شریک رہا ہے! ظاہر ہے کہ نہیں۔ تو پھر تم نے ان کی پرستش کس حق کی بنا پر شروع کر دی۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جو ہم جگہ جگہ ذکر کرتے آرہے ہیں کہ مشرکین آسمان و زمین کا خالق یا ابر و ہوا کا مصرف خدا ہی کو مانتے تھے

'یعدلون' کا مفہوم

بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ يَّعۡدِلُوۡنَ۔ 'یَعۡدِلُوۡنَ' یہاں 'عَدَلَ یَعۡدِلُ عَدۡلًا' سے ہے جس کے معنی 'جَارَ وَ ظَلَمَ' کے آتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کے پاس اپنے معبودوں کے حق میں کوئی دلیل تو ہے نہیں لیکن یہ کج رو اور حق ناشناس لوگ ہیں اس وجہ سے یہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اوپر اسلوب خطاب کا تھا لیکن یہ اسلوب غائب کا آگیا۔ یہ نفرت و کراہت اور اظہار حسرت پر دلیل ہے۔ گویا بات ان سے منہ پھیر کر فرمائی گئی ہے۔

اَمَّنۡ جَعَلَ الۡاَرۡضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنۡهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَيۡنَ الۡبَحۡرَيۡنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (۶۱)

یہاں بھی سوال کا پہلا جزو محذوف ہے۔ یعنی بتاؤ، تمہارے یہ فرضی دیوی دیوتا مستحق عبادت ہیں یا وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا؟ 'قَرَارً' کے معنی سکون و قرار کی جگہ کے ہیں۔ زمین کو دوسرے مقامات میں گہوارہ اور بستر سے بھی تعبیر فرمایا ہے۔ وہی مضمون یہاں لفظ 'قَرَارً' سے ادا کیا گیا ہے۔

'وَجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنۡهٰرًا' یعنی جس طرح اس نے تمہاری پرورش کے لیے آسمان سے پانی اتارا اسی طرح اس زمین میں بھی دریا اور چشمے جاری کر دیے۔

'وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ' اور اس زمین کو اپنے محور و مستقر پر ٹکائے رکھنے کے لیے اس نے اس میں پہاڑ گاڑ دیے کہ کہیں یہ تم کو لیے ہوئے کسی جانب کو لڑھک نہ جائے۔

'وَجَعَلَ بَيۡنَ الۡبَحۡرَيۡنِ حَاجِزًا'۔ 'بَحۡرَيۡنِ' سے مراد، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، کھاری اور شیریں پانی کے دریا ہیں، فرمایا کہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ وہ ایک طرف سے شیریں پانی کے دریا کو چھوڑتا ہے اور دوسری طرف سے کھاری پانی کے سمندر کو، دونوں آپس میں ملتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ ایک غیر مرئی دیوار کھڑی کر دیتا ہے، مجال نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اس دیوار کو لانگ کر دوسرے کے حدود میں مداخلت کر سکے۔ فرمایا کہ بتاؤ، اس قدرت، اس

حکمت، اس اہتمامِ ربوبیت، اس تزئینِ اضداد اور اس قیامِ توازن و توافق میں خدا کے ساتھ تمھارے معبودوں کا بھی کوئی حصہ ہے! اگر نہیں ہے اور بالکل بدیہی طور پر معلوم ہے کہ نہیں ہے تو آخر خدا کی خدائی میں وہ کس حق کی بنا پر ساجھی بنا دیے گئے ہیں!

بَلۡ اَکۡثَرُھُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔ یہ غائب کا اسلوب یہاں اظہارِ حسرت و افسوس کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں تو بالکل بدیہی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان میں کے اکثر ان کو نہیں جانتے اور بتانے پر بھی ان کا حال یہ ہے کہ ان کو جاننا نہیں چاہتے۔

اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکۡشِفُ السُّوۡٓءَ وَیَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ (۶۲)

قبولیتِ دعا کے باب میں بعض حقائق

اس سے پہلے بھی اُسی طرح کا سوال محذوف ہے جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ یعنی بتاؤ، تمھارے یہ دیوی دیوتا بہتر ہیں جو نہ سنتے نہ دیکھتے، نہ ضرر پہنچا سکتے، نہ نفع، نہ کسی کی فریادرسی پر قادر نہ کسی کی مدد پر یا وہ ذات جو مضطر کی فریادرسی اور اس کے دکھ درد کا ازالہ کرتی ہے! یعنی جس کی بھی فریادرسی ہوتی ہے بہرحال اسی کی طرف سے ہوتی ہے، کسی اور کی طرف سے نہیں ہوتی۔ یہاں یہ امر یاد رکھیے کہ یہی مضمون قرآن کے دوسرے مقامات میں مشیت الٰہی کی قید کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت جس کے لیے مقتضی ہوتی ہے اس کے دکھ درد کو دور فرما دیتا ہے اور کسی حقیقی مضطر کی فریادرسی اگر بروقت نہیں ہوتی تو کسی دوسرے زیادہ موزوں تر وقت کے لیے اٹھا رکھی جاتی ہے اور اگر اس شکل میں نہیں ہوتی جس شکل میں وہ چاہتا ہے تو اس سے مختلف اور بہتر شکل میں پوری ہوتی ہے اور اگر اس دنیا میں نہیں ہوتی تو وہ آخرت میں اس کے لیے موجبِ اجر ہوگی۔ قبولیتِ فریاد و دعا کے باب میں ان باتوں کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس ٹکڑے کو ان تمام اصولی حقائق کی روشنی میں سمجھیے۔

قوموں کا ردوبدل تمام تر خدا کے اذن سے ہوتا ہے

وَیَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ۔ اسلوبِ بیان دلیل ہے کہ یہاں مراد ایک قوم کو ہٹا کر دوسری قوم کو اس کی جانشین بنانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں یہ جو دیکھتے ہو کہ ایک قوم مٹتی اور دوسری قوم اس کی جگہ لیتی ہے تو نہ یہ اتفاقی واقعات ہیں اور نہ یہ ردوبدل کرنے پر خدا کے سوا کوئی دوسرا قادر ہے۔ یہ سب کچھ خدا ہی کے حکم اور اسی کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اگر آج تم کو اس سرزمین میں اقتدار حاصل ہے تو یہ تمھارا اپنا حاصل کردہ نہیں ہے بلکہ یہ خدا ہی کا عطا کردہ ہے۔ یہ اقتدار دے کر وہ تمھارا امتحان کر رہا ہے کہ تم اس کو پا کر کیا بناتے ہو؟ اگر تم نے بھی وہی روش اختیار کی جو تم سے پہلے مفسدین نے اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمھارے سامنے بھی وہی انجام نہ آئے جو ان کے سامنے آیا۔ خدا کا معاملہ سب کے ساتھ ایک ہی اصول کے مطابق ہے۔

قوموں کی خود فراموشی

ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ۔ یعنی ان میں سے کون سا کام ایسا ہے جس کے

بارے میں تم کہہ سکتے ہو کہ اس میں خدا کے سوا کسی اور کی قدرت و مشیت کا بھی کوئی دخل ہے لیکن تم وہ خود فراموش لوگ ہو کہ بہت کم یاد دہانی حاصل کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جو تنبیہات اور آزمائشیں پیش آتی ہیں ان کے پیش آنے پر تو تم خدا خدا پکارتے ہو لیکن جب وہ گزر جاتی ہیں تو خدا کو بھول کر پھر اپنی خود فراموشیوں میں گم ہو جاتے ہو اور تمھیں یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی تم نے خدا کو پکارا بھی تھا اور اس سے کوئی قول و قرار بھی کیا تھا!

یہ مضمون دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت سے بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح تاریخ نے قوموں کے ردوبدل سے متعلق جو درسِ عبرت و موعظت تمھارے لیے محفوظ کیے ہیں وہ بھی تمھیں صرف اس وقت یاد آتے ہیں جب سب کچھ تمھارے اپنے سروں پر گزر جائے۔ گزر جانے کے بعد تمھارے لیے تاریخ بھی عہدِ ماضی کا ایک افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے دونوں ٹکڑوں اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ اور وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تم ان مصائب سے کوئی سبق حاصل کرتے ہو جو تمھاری انفرادی زندگیوں میں پیش آتے ہیں اور نہ اس ردوبدل ہی سے کوئی عبرت پکڑتے جس سے قوموں کو دوچار ہونا پڑتا ہے تو جن کی یادداشت اتنی کمزور ہو ان کو کون سبق پڑھا سکتا ہے!

اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (۶۳)

اس سے پہلے بھی اسی طرح کا سوال محذوف ہے جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ یعنی خشکی و تری کی تاریکیوں میں جو رستہ دکھاتا ہے اور ابرِ رحمت سے پہلے جو موسمی ہواؤں کو چلاتا ہے وہ لائق عبادت اور سزاوار شکر ہے یا تمھارے یہ ناکارہ معبود جو کسی مصرف کے نہیں ہیں! بر و بحر میں رستہ دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا ہے اس کی وضاحت قرآن میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ یہی مضمون دوسرے مقام میں وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ (النحل ۱۶) کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی خدا نے زمین میں بھی نشانات گاڑ دیے ہیں اور آسمان میں بھی ستاروں کے قمقمے لگا دیے ہیں جو خشکی و تری دونوں کی تاریکیوں میں مسافروں کی رہنمائی کرتے ہیں جو اس بات کی صاف شہادت ہے کہ اس کائنات کا خالق نہایت مہربان و کریم اور خشکی و تری اور آسمان و زمین ہر جگہ تنہا اسی کا اختیار و اقتدار ہے اور وہی ہے جو زمین کے خشک ہو جانے کے بعد موسمی ہواؤں کو اپنے ابرِ رحمت کی بشارت بنا کر بھیجتا ہے جو بادلوں کے ٹکڑے جمع اور ان کو تہ بہ تہ کرتی ہیں اور پھر وہ جہاں چاہتا ہے ان کو برسا دیتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آسمان کے خدا الگ، زمین کے خدا الگ، ابر کے دیوتا الگ اور ہواؤں کے خدا جدا ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے ان تمام اجزائے مختلفہ کے اس توافق اور ان کی اس ہم آہنگی کے مشاہدہ کے بعد بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس پر مختلف ارادے کارفرما ہیں اور خدا کی اس خدائی میں دوسرے دیوی دیوتا بھی شریک ہیں تو وہ نہایت کودن ہے۔ اس کائنات کا خالق ان فرضی دیویوں اور دیوتاؤں سے منزہ اور ارفع ہے! اللہ تعالیٰ جل شانہ کے ساتھ ان حقیر چیزوں

زمین و آسمان دونوں میں ایک ہی خدا کی خدائی ہے

کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۶۴)

ایک بدیہی حقیقت کا بدیہی نتیجہ

یہاں بھی سوال کا ایک حصہ محذوف ہے جو قرینہ سے واضح ہوتا ہے۔ یعنی تمہارے یہ اصنام و اوثان لائقِ عبادت ہیں یا وہ ذات جس نے اس خلق کا آغاز کیا اور ہر چیز کو وجود میں لاتی ہے؟ اس کے ساتھ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ملا کر ابدائے خلق کے ایک بدیہی نتیجہ کو ظاہر فرما دیا کہ جب وہی ہر چیز کا آغاز فرماتا ہے تو وہ اس کا اعادہ بھی کر سکتا ہے اور وہ ایسا لازماً کرے گا بھی۔ اگر وہ نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے یہ سارا کارخانہ بالکل عبث بنایا ہے۔ دوسرے مقامات میں یہ بات دلائل کی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ یہاں یہ ایک بدیہی حقیقت کے ایک بدیہی نتیجہ کے طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ جب اس کائنات کے ابداء سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے اعادہ میں شک کی گنجائش کہاں سے نکلی!

وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۔ یعنی خلق کے بعد وہی ہے جو تمہاری رزق رسانی اور پرورش کا سامان کرتا ہے اور اس کام میں وہ آسمان کو بھی استعمال کرتا ہے اور زمین کو بھی ـــ آسمان سے وہ تمہارے لیے پانی برساتا ہے اور زمین سے تمہارے لیے طرح طرح کی چیزیں اگاتا ہے۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ ان کاموں میں کوئی اور بھی شریک ہے!

خلاصۂ بحث

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ مطلب یہ کہ یہ ساری چیزیں جو مذکور ہوئیں ان کا کوئی فاعل ماننا تو ناگزیر ہے، بغیر کسی فاعل حکیم و قدیر کے یہ چیزیں وجود میں نہیں آ گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک خدائے حی و قیوم کا وجود تو برہان قطعی سے ثابت ہے اس وجہ سے اس کو تم مانتے ہیں اور تمہارے لیے بھی اس کے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اس ایک کے سوا کچھ اور خدا بھی ہیں تو ان کے ثبوت کے لیے دلیل پیش کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر ان کے حق میں تمہارے پاس کوئی برہان ہے تو اس کو پیش کرو۔

شرک کی دلیل مشرکین پیش کریں

اس ساری بحث کا خلاصہ دو لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ جو خدا کو نہیں مانتا ان سوالوں کا کوئی اطمینان بخش جواب دے جو اوپر مذکور ہوئے اور اگر مانتا ہے لیکن اس کے ساتھ دوسرے خداؤں کو بھی شریک کرتا ہے تو وہ ان خداؤں کے حق میں دلیل پیش کرے۔ دلیل و ثبوت کی ذمہ داری بہرحال منکروں یا مشرکوں پر ہے۔ خدا کے ماننے والوں پر کسی چیز کو ثابت کرنے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ وہ تو ایک بدیہی حقیقت کو مانتے ہیں۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۶۵)

یہ توحید و شرک کی اس بحث کی آخری بات ہے کہ اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہے کہ آسمانوں اور زمین

کے اندر غیب کا علم کسی اور کو بھی ہے اس وجہ سے وہ لائقِ عبادت ہے تو اس کی یہ غلط فہمی بھی دُور کر دی کہ غیب کا علم خدا کے سوا آسمانوں اور زمین میں کسی کو بھی نہیں ہے۔ جب آسمان والوں میں سے بھی کسی کو غیب کا پتہ نہیں تو زمین والوں کا کیا سوال! فرمایا کہ غیب کا علم تو درکنار ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے! یعنی جب انھیں اپنے اٹھائے جانے کی بھی خبر نہیں تو ان کی شفاعت کے بھروسہ پر ان کو معبود مان کر ان کی پرستش کرنے کے کیا معنی! یہ مضمون سورۂ نحل کی آیات ۲۰-۲۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے ہر پہلو پر بحث کر چکے ہیں۔

بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْهَا ۚ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ (۶۶)

'اِدّٰرَکَ' دراصل 'تَدَارَکَ' ہے جو بقاعدہ ادغام 'اِدّٰرَکَ' ہو گیا ہے جس طرح 'تَثَاقَلَ' سے 'اِثَّاقَلَ' بن گیا ہے۔ 'تَدَارَکَ الْقَوْمُ' کے معنی ہوں گے قوم کے اگلے پچھلے سب ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ قرآن مجید میں ہے: 'حَتّٰٓی اِذَا ادَّارَکُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا' (یہاں تک کہ جب وہ سب اس میں اکٹھے ہو لیں گے) یہیں سے اس کے اندر اختلاط اور گڈمڈ ہونے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ اس لیے کہ جب مختلف چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں تو وہ آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

آخرت کے باب میں مشرکین عرب کا ذہنی الجھن

یہ بات ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب کا موقف آخرت کے باب میں صریح انکار کا نہیں تھا بلکہ وہ ایک قسم کی ذہنی الجھن میں مبتلا تھے۔ اس کو ماننا چاہتے نہیں تھے اور اس کے صریح انکار کی گنجائش پاتے نہیں تھے۔ اس وجہ سے وہ ایک قسم کی گومگو کی حالت میں مبتلا تھے۔ بعض منہ پھٹ اور بالکل لاابالی قسم کے لوگ اگرچہ ضد کے جوش میں اس کا انکار بھی کر بیٹھتے تھے لیکن عام حالت یہ نہیں تھی بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک ذہنی الجھن ہی کی تھی۔ وہ اس کو نہ ماننے کی خواہش کے تحت ایک بہت ہی مستبعد بات قرار دیتے تھے کہ بعد مر جانے اور سڑگل جانے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اور ساری دنیا کا حساب کتاب اور ان کی جزا و سزا کس کے بس کی بات ہے! لیکن اس پر بھی ان کا ذہن پوری طرح مطمئن نہیں تھا اس وجہ سے اپنی تسلی کے لیے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی پڑا اور حساب کتاب کی نوبت آ ہی گئی تو ہمارے دیوی دیوتا اپنی سعی و سفارش سے ہمیں بچا ہی لیں گے۔ اس کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے ان کی اسی ذہنی کشمکش کو 'ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ' سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ نہایت ہی حقیقت افروز تعبیر ہے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین اس کی تاویل میں معلوم نہیں کس طرح الجھن میں پڑ گئے!

یہ آیت یہاں بالکل اسی محل میں ہے جس محل میں تمہید کی آیت ۵ ہے جس طرح وہاں فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ قرآن بالکل واضح ہے لیکن جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ہیں اور نہ ماننا چاہتے ہی ہیں وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اسی طرح توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال پر یہاں ناقابلِ انکار دلائل پیش کرنے کے بعد

فرمایا کہ یہ نہ خیال کرو کہ سورج کی طرح یہ روشن حقائق ان کی سمجھ میں نہیں آ رہے ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کے باب میں یہ سخت ذہنی الجھن میں مبتلا ہیں، اس کی طرف سے یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں بلکہ اس کی طرف سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حقائق سے گریز و فرار کی اصلی علت آخرت سے گریز و فرار ہی ہے۔ آخرت کو مان لینے سے چونکہ انسان پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس وجہ سے وہ اس سے بھاگتا ہے۔ اور فرار کے لیے چونکہ کوئی راہ نہیں ہے اس وجہ سے وہ چور دروازے تلاش کرتا ہے۔ یہ چیز اس کو ایک شدید ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ حقائق سے گریز کے لیے ان کے اندر شک کے پہلو ڈھونڈتا ہے۔ یہ غیر فطری جستجو اس کو شک کا مریض بنا دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے صریح حقائق سے آنکھیں بند کر کے اندھا بننا پڑتا ہے۔ گویا قرآن نے اس آیت میں ان کے مرض کے تدریجی ارتقاء کو واضح فرمایا کہ انھوں نے آخرت کو نہ ماننے کی خواہش کے تحت اپنے ذہن و فکر کو مریض بنایا۔ پھر جب وہ شک کے مریض بن گئے تو انھیں آفاق و انفس کے تمام شواہد و حقائق سے آنکھیں بند کر لینی پڑیں اس لیے کہ اس میں حقائق کا مواجہ ان کی طبیعت پر نہایت شاق گزرتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبَاؤُنَا أَئِنَّا لَمُخْرَجُونَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هَٰذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِن قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۶۷-۶۸)

یہ ان کے شک کی وضاحت ہے کہ اول تو ان کو یہی بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ سڑ گل کر مٹی ہو جائیں گے تو وہ از سر نو قبروں سے زندہ کر کے کس طرح نکالے جائیں گے!

دوسری یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ قیامت کی آمد آمد کا چرچا تو ہم بہت دنوں سے سن رہے ہیں۔ آج ہم کو اس سے ڈرایا جا رہا ہے، اس سے پہلے ہمارے اگلوں کو بھی ڈرایا گیا لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ یہ سب اگلوں کے فسانے ہیں جو ہر زمانے میں دہرائے گئے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (۶۹)

آنکھوں کے لیے سرمۂ بصیرت

یہ ان کے اس اندھے پن کا علاج بتایا ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں آیا ہے۔ مطلب یہ کہ آنکھیں کھولنے سے کھلتی ہیں اس لیے اپنے ملک میں آنکھیں کھول کر چلو پھرو اور پچھلی قوموں کے آثار پر عبرت کی نگاہ ڈالو تو تمھیں نظر آئے کہ اللہ کے رسولوں نے ان کو جس عذاب سے ڈرایا وہ کس طرح ان کے سامنے آیا۔ یہ آثار اللہ نے اس زمین میں اسی لیے محفوظ رکھے ہیں کہ یہ تمھارے لیے نشانِ عبرت اور سرمۂ بصیرت کا کام دیں۔ اس سے تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ محض اگلوں کا فسانہ نہیں بلکہ یکسر حقیقت ہے۔ اور اسی سے تم پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ جب مجرموں کا یہ انجام اس دنیا میں

ہوا ہے تو آخر اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن کیوں نہیں لائے گا جس میں اس کے کامل عدل اور اس کی کامل رحمت کا ظہور ہو!

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (۷۰)

آنحضرتؐ کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ تم ان کی اس روش پر غم نہ کرو۔ تم ان کو روٹی دے رہے ہو اور یہ پتھر مانگتے ہیں تو یہ ان کی اپنی محرومی و بدبختی ہے۔ تم اپنا فرض انجام دے کر ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان پر کڑھنے اور ان کی ہٹ دھرمی پر غم کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اسی طرح ان کی ان شرارتوں سے بھی ذرا دل تنگ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو وہ تمہارے ساتھیوں اور تمہاری دعوت کے خلاف کر رہے ہیں۔ ان کی ساری چالیں اور شرارتیں خدا کی مٹھی میں ہیں۔ وہ ان کی ہر چال بے کار کر دے گا اور تمہیں ہر شر سے محفوظ رکھے گا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ (۷۱-۷۳)

'رَدِفَ' بغیر صلہ کے بھی آتا ہے اور 'لِ' کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ کلام عرب میں دونوں کی نظیریں ملتی ہیں۔ اس کے معنی ہیں ایک شے کے دوسری شے کے پیچھے لگے ہوئے ہونے کے۔

مکذبین کا مطالبۂ عذاب اور اس کا جواب

اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک عذاب دنیا سے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً ظاہر ہوتا ہے دوسرے عذاب آخرت سے۔ اس انذار کا جواب ان کی قوموں نے ہمیشہ یہی دیا کہ 'مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ' یہ عذاب کب آئے گا؟ یعنی اگر تم سچے ہو تو یا تو قیامت لاؤ جس کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو، اگر قیامت نہیں تو وہ عذاب ہی لا کر دکھاؤ جو تمہاری تکذیب کی صورت میں تمہارے گمان کے مطابق لازماً ہم پر آنے والا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور دکھاؤ۔ اس کے بغیر ہم یہ ماننے والے نہیں ہیں کہ تم اپنے دعوے اور وعدے میں سچے ہو۔

'قُلْ عَسَىٰ أَن .... الآية' فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ عجب نہیں کہ جس چیز کے لیے تم جلدی مچاتے ہو اس کا کوئی حصہ تمہارے پیچھے ہی لگا ہوا ہو۔ 'الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ' سے قیامت مراد ہے جس کے لیے یہ ہی مچانے کا ذکر اوپر آیت ۶۸ میں بھی گزر چکا ہے اور آیت ۷۱ میں بھی۔ 'بَعْض' سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول کی تکذیب کا لازمی نتیجہ ہے۔ فرمایا کہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اب تو اس کا ظہور تمہارے رویے پر منحصر ہے۔ اگر تم ایمان نہ لائے تو قیامت کی عدالت کبریٰ کا ایک نمونہ تمہارے لیے ظاہر ہو کے رہے گا۔ یہ چیز رسول کی بعثت ہی کے اندر مضمر ہے۔ یہاں اس بات کو 'عَسَىٰ' کے لفظ سے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بہر حال عذاب کے ظہور کا انحصار قوم کے رویے پر تھا۔ وہ ایمان لا کر اس سے محفوظ بھی رہ سکتی تھی۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی اکثریت ایمان لائی اس وجہ سے اس پر

اس قسم کا کوئی عذاب نہیں آیا جس قسم کا عذاب پچھلی قوموں پر آیا۔

'وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ'۔ یہ عذاب اور قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کے حال پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو جو مہلت دیتا ہے وہ اپنے فضل و کرم سے محض اس لیے دیتا ہے کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے رویے کی اصلاح کریں اور اس کی رحمت کے مستحق بنیں، لیکن لوگوں کی ناشکری کا حال یہ ہے کہ وہ اس مہلت اور اس فضل کو اللہ کے رسول کے جھوٹے ہونے کی دلیل بنا لیتے ہیں اور جہاں سے ان کو رحمت لے کر اٹھنا چاہیے وہاں سے وہ اس کا غضب لے کر لوٹتے ہیں۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝ وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (۷۴-۷۵)

آنحضرتؐ کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے انذار

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور آپؐ کے مخالفین کے لیے انذار بھی۔ آپؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان سے بالکل بے خطر رہو۔ تمہارا رب ان کے سینوں کے مخفی منصوبوں سے بھی واقف ہے اور ان کے برملا اعلانات سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے ہر فتنہ کے تدارک کے لیے خود سامان فرمائے گا۔ یہ گویا 'لَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ' کے مضمون کی تاکید ہوئی۔

'وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ ... الآیۃ' میں مخالفین کو دھمکی ہے کہ وہ یاد رکھیں کہ آسمان و زمین کا ہر بھید خدا کے ہاں ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ وہ ہر چیز کا نوٹس لے گا اور اس سے کوئی راز بھی چھپایا نہ جا سکے گا۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ وَإِنَّهُ لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُم بِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ (۷۶-۷۸)

یہود کی طرف ایک اشارہ

یہ اشارہ یہود کی طرف ہے۔ اصلاً تو یہ سورہ قریش کے جواب میں ہے اس لیے کہ دعوت کے ابتدائی دور میں قرآن کے دوسرے مخالفین ——— یہود وغیرہ ——— صرف دور کے تماشائی تھے لیکن دعوت کے قدم جتنے ہی آگے بڑھتے گئے آہستہ آہستہ یہود نے بھی پس پردہ قریش کی حمایت شروع کر دی۔ چنانچہ قرآن نے بھی ان سے تعرض شروع کر دیا۔ ابتداءً تو ان کا ذکر اشارات ہی کی شکل میں ہوا لیکن پھر بالتدریج جس طرح وہ کھلتے گئے اسی طرح قرآن کا اندازِ بیان بھی کھلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھی پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔ زیرِ بحث آیات میں ان کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے۔ بعد کی سورتوں میں آپ دیکھیں گے کہ بالتدریج یہ اجمال تفصیل کا رنگ اختیار کرے گا۔ یہود کے معاملہ میں یہی اندازِ بحث پچھلے گروپوں میں بھی رہا ہے۔

فرمایا کہ قرآن جس طرح بنی اسماعیل (قریش) پر اتمامِ حجت کر رہا ہے اسی طرح یہ بنی اسرائیل پر بھی

ان بہت سے حقائق کو واضح کر رہا ہے جن سے وہ اختلاف میں پڑ کر محروم ہو گئے تھے۔ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، یعنی اگر وہ اس پر ایمان لانے والے بنیں تو یہ ان کو اختلافات کی بھول بھلیوں سے نکال کر دین کی صراطِ مستقیم پر لائے گا اور ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں موجبِ رحمت ہوگا۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ، یعنی اگر انھوں نے اس قرآن کی قدر نہ پہچانی اور اس کی رہنمائی نہ قبول کی تو یاد رکھیں کہ آج تو اللہ تعالیٰ ان کے اختلافات اس کتاب کے ذریعہ سے رفع کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے بعد وہ دن بھی آنے والا ہے جس میں وہ اپنے حکمِ ناطق کے ذریعہ سے ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ یہاں واضح قرینہ موجود ہے کہ یہ بات روزِ قیامت سے متعلق فرمائی گئی ہے اور 'حکم' سے مراد وہ حتمی و آخری فیصلہ ہے جس کے بعد کسی کے لیے زبان کھولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

'هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ'۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا حوالہ دیا ہے کہ یہود یاد رکھیں کہ اللہ عزیز و علیم ہے۔ نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا اور نہ کوئی چیز اس سے مخفی ہے۔

یہی مضمون بعینہٖ اسی طرح کے موقع و محل میں سورۂ یونس میں بھی گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ (یونس: ۹۳)	اور ہم نے بنی اسرائیل کو عزت و استحکام کا مقام بخشا اور ان کو اپنے پاکیزہ رزق و فضل سے نوازا تو علم پانے کے بعد انھوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا۔ بے شک تمہارا رب قیامت کے دن ان چیزوں کے باب میں ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

سورۂ ہود میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ۔ (ہود: ۱۱۰)	اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تو اس میں اختلاف پیدا کر دیا گیا اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور بے شک وہ اس کی طرف سے ایک الجھن میں ڈال دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں جس اختلاف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اس کی وضاحت سورۂ یونس اور سورۂ ہود کی مذکورہ بالا آیات کے تحت بھی ہو چکی ہے اور سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی۔ تورات کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ اس میں صرف تحریف ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ متناقض روایات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلانا ناممکن ہے کہ اس میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا باطل و محرف۔ تورات کے اس طرح مسخ ہو جانے کے سبب سے یہود خدا کی دی

ہوئی روشنی سے محروم ہو کر بالکل تاریکی میں گھر گئے تھے۔ قرآن نے ان کو اس تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانا چاہا لیکن انھوں نے اس روشنی کی قدر کرنے کے بجائے اس کو بجھانے کی کوشش کی۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَي الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۔ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۔ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۷۹-۸۱)

آنحضرتؐ کے لیے تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی چالوں اور مخالفتوں سے بالکل بے پروا ہو کر اپنے رب کی نصرت پر بھروسہ رکھو، واضح حق پر تمہی ہو۔ اس حق کا بول بالا ہو کر رہے گا اور تمھارے یہ مخالفین، خواہ قریش ہوں یا یہود، اپنے باطل کے ذریعہ سے تمھارا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری چالیں بیکار کر دے گا۔ اللہ کا کلمہ بلند ہو کر رہے گا۔

'اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى الاٰیۃ' یعنی اگر یہ لوگ تمھاری بات نہیں سنتے تو تم ان کے حال پر غم نہ کرو، تمھارا کام مُردوں کو سنانا نہیں ہے اور نہ بہروں کو سنانا ہے بالخصوص جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں۔ 'اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ' کی قید سے یہاں یہ بات نکلی کہ بہرے بھی اگر کان لگائیں اور دھیان کریں تو کچھ سن سکتے ہیں لیکن یہ تو وہ بہرے ہیں جو بہرے بھی ہیں اور پیٹھ پھیر کر بھاگے بھی جا رہے ہیں تو ایسے بدقسمتوں کو کوئی بات کس طرح سنائی جا سکتی ہے!

'وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ' یہاں 'عَنْ' اس بات کا قرینہ ہے کہ لفظ 'ھَادِیْ' کسی ایسے مفہوم پر متضمن مانا جائے جو 'عَنْ' کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔ یہ حرف چونکہ کسی کو کسی شے سے ہٹانے اور پھیرنے کے مفہوم پر بھی دلیل ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر ہدایت دینے والے نہیں بن سکتے۔

'اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ' یعنی تمھاری اس دعوت کا فیض پہنچ سکتا ہے تو انھیں لوگوں کو پہنچ سکتا ہے جو ہماری آیات پر ایمان لانا چاہیں۔ 'يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا' میں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے معنی میں ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر سننے اور سمجھنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں پایا جاتا وہ اس نعمت کی کیا قدر کریں گے! 'فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ' یعنی جن کے اندر سننے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہے وہ بے شک ایمان لائیں گے اور اپنے رب کے فرمانبردار بنیں گے۔

ہدایت کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ حقیقت یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر طلبِ ہدایت کا داعیہ ودیعت فرمایا ہے اور سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ اس داعیہ کی قدر کرتے ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ ہدایت کی مزید راہیں کھولتا ہے اور اگر کوئی اس داعیہ کی قدر نہیں کرتا تو صرف یہی نہیں ہوتا کہ اس کے لیے مزید ہدایت کے دروازے نہیں کھلتے بلکہ اس کا یہ فطری داعیہ بھی مُردہ ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو سیدنا مسیح نے یوں واضح فرمایا ہے

کہ اس سے وہ بھی لے لیا جاتا ہے جو اس کو دیا گیا۔"

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ (۸۲)

وقوع قول سے مراد — نشانیِ عذاب

'وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ' سے یہ مراد ہے کہ جب ان کے باب میں اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے گا اور سنتِ الٰہی کے مطابق جس چیز کے وہ مستحق ہیں اس کے ظہور کا وقت آ جائے گا۔

دابۃ

'عَلَيْهِمْ' میں ضمیر کا مرجع قریش ہیں جن سے اس سورہ میں خطاب ہے اور جو مطالبہ کر رہے تھے کہ قرآن ان کو جس عذاب یا قیامت کی خبر دے رہا ہے جب تک وہ ان کو یا ان کی کوئی نشانی دیکھ نہ لیں گے اس وقت تک وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ ان کے اس مطالبے کا ذکر آیات ۷۱، ۷۲ میں گزر چکا ہے۔

'تُكَلِّمُهُمْ' یہاں اس مفہوم میں ہے جس مفہوم میں سورۂ روم کی آیت ۳۵ میں ہے۔ فرمایا ہے۔

أَمْ أَنزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ (الروم: ۳۵)	کیا ہم نے اتارا ہے ان پر کوئی دلیل جو شہادت دے رہی ہو ان چیزوں کے حق میں جن کو یہ خدا کی شریک ٹھہراتے ہیں؟

یہاں ظاہر ہے کہ لفظ 'تکلم' اس عام معنی میں نہیں ہے جس معنی میں ہم بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم کسی چیز کے حق میں دلیل، نشانی یا شہادت ہوتا ہے۔

فرمایا کہ اگر یہ منکرین تمھاری بات اس وقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک تم ان کو کوئی نشانیِ عذاب نہ دکھا دو تو اس طرح کی کوئی نشانی دکھا دینا خدا کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ ان کو توبہ و اصلاح کے لیے مہلت دے رہا ہے اس وجہ سے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے ان کو تعلیم و تذکیر اور انذار و تبشیر کر رہا ہے لیکن جب اتمامِ حجت کا یہ وقت گزر جائے گا اور سنتِ الٰہی کے بموجب ان کے لیے عذاب ہی کا فیصلہ ہو جائے گا تو کوئی نشانی ظاہر کر دینے کے لیے خدا کو کوئی اہتمامِ خاص نہیں کرنا ہے۔ وہ زمین ہی سے کوئی جانور اٹھا کھڑا کرے گا جو اس بات کی شہادت دے دے گا کہ یہ نابکار لوگ اللہ کی آیات پر یقین کرنے والے نہیں ہیں اس وجہ سے قہرِ الٰہی کے مستحق ہیں۔ اس اسلوبِ بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابھی تو اللہ تعالیٰ آسمان سے اپنی ہدایت نازل فرما رہا ہے اور اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے ان پر حجت تمام کر رہا ہے لیکن ان کی شامتِ اعمال سے اگر ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو ہی گیا تو خدا زمین سے کسی جانور کے ذریعہ سے بھی ان پر شہادت دلوا دے گا۔

رسولوں کی تاریخ میں اس طرح کی نشانی کی ایک مثال ناقۂ ثمود ہے۔ حضرت صالحؑ کی قوم نے جب ان کی بات کسی طرح نہیں مانی اور برابر اس بات پر مصر ہی رہی کہ اس کو کوئی عذاب کی نشانی دکھائی جائے تو حضرت صالحؑ نے ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ عذاب کی نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو تم پر

قہرِ الٰہی ٹوٹ پڑے گا چنانچہ جونہی انھوں نے اس کو گزند پہنچایا اللہ کا عذاب ان پر آ دھمکا۔

اس آیت کی یہ تاویل، میرے فہم کے حد تک، قرآن کے الفاظ، نظام اور اس کے نظائر کی روشنی میں بالکل واضح ہے لیکن ہمارے مفسرین اس کے تحت ایک عجیب و غریب 'دابۃ' کا ذکر کرتے ہیں جو قیامت کے قریب ظاہر ہوگا۔ میرے نزدیک اس کا تعلق اس آیت سے نہیں بلکہ آثارِ قیامت کی روایات سے ہے۔ ان روایات کو نقدِ حدیث کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ اگر وہ اس کسوٹی پر پوری اتریں تو ان کو قبول کیجیے ورنہ رد کر دیجیے۔

یہاں یہ امر بھی یاد رکھیے کہ قریش کو یہ دھمکی جو دی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ جب ان کے بارے میں خدا کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اگر قریش اپنی ضد پر اڑے رہ جاتے تو ان کو لازماً اسی عذاب سے سابقہ پیش آتا جس کی اس آیت میں وعید ہے لیکن معلوم ہے کہ قریش کی اکثریت آہستہ آہستہ مشرف بہ اسلام ہو گئی اس وجہ سے ان پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جس قسم کا عذاب عاد و ثمود اور دوسری قوموں پر آیا بلکہ ان کے اشرار اہلِ حق کے ساتھ تصادم میں ختم ہو گئے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ (۸۳)

مکذبین کی حالت حشر کے دن

یہ روزِ حشر کی یاد دہانی فرمائی کہ اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ تعالیٰ ہر امت میں سے اپنی آیات کی تکذیب کرنے والوں کی ایک پوری فوج جمع کرے گا اور ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ لفظ 'یُوزَعُونَ' آیت ۱۷ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تحقیق کر چکے ہیں۔ یہ درجہ بندی ان کے جرائم کی نوعیت اور ان کی مقدار کے اعتبار سے ہوگی اور پھر جو پارٹی جس درجے کی سزا کی مستحق ہوگی اسی لحاظ سے دوزخ کے الگ الگ وارڈوں میں بھیج دی جائے گی۔ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ (الحجر: ۴۴) (اور دوزخ کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک معین حصہ ہوگا)۔

لفظ 'فوج' سے ان مکذبین کی کثرت کی طرف اشارہ ہے اور مقصود اس اشارے سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کی کثرت کے باوجود نہ ان کے جمع کرنے میں خدا کو کوئی زحمت پیش آئے گی اور نہ ان کے بسائی کی دوزخ میں جگہ کی قلت کا کوئی سوال ہوگا۔ وہ ان تمام افواج کو اپنے اندر ہضم کر لے گی اور اس کے بعد بھی 'هَلْ مِنْ مَزِيدٍ' پکارے گی۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۸۴)

مکذبین سے ایک سوال

جب یہ سارے مجرمین اکٹھے ہو لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے سوال فرمائے گا کہ بتاؤ کیا تم نے میری آیات کی تکذیب کی درآنحالیکہ تمھارے علم نے ان کا پورا پورا احاطہ نہیں کیا تھا یا تم کیا بلتے رہے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس روزِ حشر و نشر اور جزاء و سزا کو اس بنیاد پر جھٹلایا ہوتا کہ تمھارے پاس تمام اسرارِ کائنات

کا علم ہے تب تو تمھارا ایک موقف ہو سکتا تھا لیکن اس طرح کا محیط کل علم نہ رکھنے کے باوجود اگر تم نے میری تنبیہات کی تکذیب کی تو اب بتاؤ تمھارے پاس کیا عذر ہے؟

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے یہ چیز کافی ہے کہ اس کے دلائل و آثار عقل و فطرت اور آفاق و انفس میں موجود ہیں۔ محض اس بنیاد پر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے تمام اطراف و جوانب کا ہمارا علم احاطہ نہ کر سکا۔ اگر کوئی شخص اس بنیاد پر اس کی تکذیب کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام اسرار کائنات کے احاطہ کا مدعی ہے اور یہ چیز نہ کسی کو حاصل ہے اور نہ فاطر کائنات کے سوا کسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس احمق کی ہے جو ہمالہ کا انکار اس بنا پر کر دے کہ اس نے اس کی تمام چوٹیوں اور اس کی تمام وادیوں کا مشاہدہ نہیں کیا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُونَ (۸۵)

مکذبین کی بے بسی — یعنی اللہ تعالیٰ کے اس سوال کے جواب میں وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں گے۔ ان کی زبانیں بالکل گنگ ہو جائیں گی اور ان کے اعمال کی پاداش میں ان پر خدا کا فیصلۂ عذاب نافذ ہو جائے گا۔ یہاں بھی وہی 'وَقَعَ الْقَوْلُ' آیا ہے جس پر پیچھے بحث گزر چکی ہے لیکن یہاں روزِ حشر کا ماجرا بیان ہو رہا ہے اس وجہ سے اس سے اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ مراد ہے جو ان تمام مجرمین کو جہنم میں جھونک دینے کے لیے ہوگا۔ 'لَا يَنْطِقُونَ' کی وضاحت کے لیے سورہ یٰسین کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھیے۔ 'اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۶۵)' (آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے اعمال سے متعلق ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے)۔ اس آیت میں 'تُكَلِّمُنَا' بھی قابلِ توجہ ہے جس پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۸۶)

اس آیت میں، عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، مقابل الفاظ محذوف ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں 'مظلما' حذف ہے اور دوسرے ٹکڑے میں 'تعملوا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل۔ اس ایجاز کی بلاغت کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

فعل 'يُؤْمِنُوْنَ' یہاں ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔

عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو ملامت — یہ نشانیِ عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو ملامت ہے کہ آخر یہ محروم القسمت لوگ عذاب ہی دیکھنے کے لیے کیوں اڑے ہوئے ہیں؟ اس کائنات کی نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے! کیا ان کو ہماری ہر روز ظاہر ہونے والی یہ عظیم قدرت و حکمت نظر نہیں آتی کہ ہم نے رات کو تاریک و پرسکون بنایا تاکہ وہ اس میں سکون و راحت حاصل کریں اور دن کو روشن بنایا تاکہ وہ اس میں کام کریں! 'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'۔

اس میں ایک ہی نہیں بلکہ بہت سی نشانیاں موجود ہیں لیکن یہ نشانیاں ان لوگوں کو نظر آسکتی ہیں جن کے اندر ایمان لانے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔

شب و روز کی یکے بعد دیگرے آمد و شد، تضاد کے باوصف ان کے توافق اور خلق کے لیے ان کی نفع رسانی سے اس کائنات کے خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، توحید اور حشر و نشر پر قرآن نے جو دلیلیں قائم کی ہیں ان کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہاں لفظ 'اٰیٰتٍ' سے اجمالی اشارہ ان سب کی طرف ہے لیکن موقع و محل کے تقاضے سے خاص طور پر قیامت اور حشر و نشر کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ اس کا مشاہدہ تو اس دنیا میں ہر روز کر رہے ہو، جس طرح تم رات میں ہر روز سوتے ہو اور پھر صبح کو اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح مرنے کے بعد ایک وقت آئے گا کہ اٹھ بیٹھو گے۔ خدا ہر چوبیس گھنٹوں میں یہ مشاہدہ اسی لیے کرا رہا ہے کہ اصل حقیقت کی یاددہانی تمہیں ہر روز ہوتی رہے لیکن جو لوگ کسی بات کو ماننا ہی نہ چاہیں ان کی ہٹ دھرمی کا کیا علاج! سورۂ فرقان کی آیت ۴۷ میں اس حقیقت کی طرف یوں توجہ دلائی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (الفرقان: ۴۷)

اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے شب کو پردہ پوش، نیند کو دافع کلفت اور دن کو وقتِ نشور بنایا۔

اور اسی کی تذکیر وہ دعا کرتی ہے جو سو کر اٹھنے کے وقت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ (۸۷)

ہولِ قیامت کی یاددہانی

یہ قیامت کے ہول کی یاددہانی فرمائی ہے کہ اس کو کوئی آسان چیز نہ سمجھو۔ جب صور پھونکا جائے گا تو اس کے ہول سے سب گھبرا اٹھیں گے۔ 'اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ' صرف وہی لوگ اس دن کی ہلچل سے مامون رہیں گے جن کو اللہ اس سے مامون رکھے۔ اس اجمال کی وضاحت آگے آیت ۸۹ میں ان الفاظ ہوئی ہے۔ 'مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ' (جو نیکی کا توشہ لے کر آئیں گے ان کے لیے اس سے بہتر صلہ ہوگا اور وہ اس دن ہر گھبراہٹ سے بالکل مامون ہوں گے) 'وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ' یعنی بڑے چھوٹے اور لیڈر، پیرو سب اس دن خدا کے حضور میں نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ 'دٰخِرِيْنَ' کے معنی 'صٰغِرِيْنَ' کے ہیں۔ اس ذلت سے صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۸۸)

یہ اس دن کے ہول کی مزید تفصیل ہے کہ دوسری چیزوں کا تو کیا ذکر اس دن پہاڑوں کا بھی یہ حال ہوگا کہ

بظاہر وہ ٹکے ہوئے نظر آئیں گے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑتے ہوتے ہوں گے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ شعرائے عرب میں جو حکیم تھے ان تک کا حال یہ تھا کہ وہ دوسری تمام چیزوں کو تو فانی مانتے تھے لیکن پہاڑوں کو غیر فانی سمجھتے تھے۔ 'صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ' یہ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح 'وَعْدَ اللّٰهِ'، 'صِبْغَةَ اللّٰهِ' وغیرہ ترکیبیں قرآن میں ہیں۔ یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کسی شے کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اس خدا کی کاریگری ہوگی جس نے ہر چیز کو محکم کیا ہے۔ جب اسی نے ہر چیز کو محکم کیا ہے تو وہ یہ بھی کر دکھائے گا کہ پہاڑ جمے ہوئے بھی نظر آئیں گے اور وہ ہوا میں اڑتے ہوتے بھی ہوں گے۔

'اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ' یہ اس اصل چیز کا بیان ہے جس سے آگاہ کرنے کے لیے قیامت کے اس ہول کی تفصیل سنائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن اس کائنات میں ہلچل کا حال یہ ہوگا اور اللہ تمہاری اس ساری کرتوت سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو اور جب واقف ہے تو لازماً وہ اس کی جزا و سزا بھی دے گا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ۝ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۸۹-۹۰)

یہ اوپر والے ٹکڑے 'اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ' کا لازمی نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ جو نیکی کما کر اس دن حاضر ہوں گے ان کے لیے تو بہترین صلہ ہوگا اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے بالکل مامون اور نچنت ہوں گے لیکن جو لوگ بدی کی کمائی کر کے آئیں گے تو وہ اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے کہ یہ تمہارے اعمال ہی کا بدلہ ہے جو تمہیں مل رہا ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی جا رہی ہے۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ ؗ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ (۹۱-۹۲)

آنحضرتؐ کے مشن کی وضاحت

یہ آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے آپ کے مشن اور مقصدِ دعوت کی بالکل فیصلہ کن انداز میں وضاحت کرا دی تاکہ قریش اگر سنبھلنا چاہیں تو سنبھل جائیں ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک یہاں 'اِنَّمَآ اُمِرْتُ' سے پہلے لفظ 'قُلْ' بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ بعد میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے چنانچہ فرمایا ہے 'فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا الآیۃ' اور 'قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ'۔

فرمایا کہ ان لوگوں کو صاف صاف سنا دو کہ مجھے تو یہ ہدایت ہوئی ہے کہ میں اس سرزمین کے اس رب کی بندگی کروں جس نے اس کو محترم ٹھہرایا اور جس کے اختیار ہی میں سب کچھ ہے اور یہ کہ میں اسی کی اطاعت کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ اجمالی اشارہ ہے سرزمین مکہ اور بیت اللہ کی تاریخ کی طرف کہ جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو منتخب فرمایا اور اس کو محترم ٹھہرایا ہے اسی مقصد کے احیاء و تجدید

کے لیے مبعوث ہوا ہوں اس وجہ سے تم لوگ میری مخالفت میں خواہ کتنا ہی زور لگاؤ لیکن اس سے کوئی مجھے پھیر نہیں سکتا۔ یہ سرزمین ملتِ ابراہیم کا مرکز ہے اس وجہ سے میری دعوتِ توحید ہی وہ اصل کام ہے جو یہاں ہونا چاہیے اور میں وہی کام کر رہا ہوں۔ 'وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ' یعنی یہاں اس گھر کے رب کے سوا دوسروں کی جو پرستش ہو رہی ہے یہ بالکل ناروا ہے۔ میں ان کی پرستش سے بری ہوں۔ 'وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ' یعنی جس طرح مجھے اس گھر کے رب ہی کی عبادت کا حکم ہوا ہے اسی طرح اس بات کی بھی ہدایت ہوئی ہے کہ میں صرف اسی کی اطاعت کرنے والوں میں سے بنوں، اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کروں۔

'وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ الاٰيۃ' یعنی تم لوگ مجھے زچ کرنے کے لیے جو نت نئے مطالبات کر رہے ہو مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے مجھے صرف یہ ہدایت ہوئی ہے کہ میں یہ قرآن تم کو سناؤں تو جو اس کو سنے گا اور اس سے ہدایت حاصل کرے گا اس کا فائدہ اسی کو حاصل ہوگا اور جو اس کے بعد بھی اپنی گمراہی پر جما رہ جائے تو اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں تو بس ایک منذر ہوں۔ آگاہ کر دینے کے بعد میری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں سیدنا ابراہیمؑ کی اس دعا پر بھی نگاہ رہے جو انھوں نے ذریت اسماعیل کے اندر ایک رسول کی بعثت سے متعلق فرمائی تھی۔ اس میں بھی مبعوث ہونے والے رسول کا خاص کام 'يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ' بتایا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جس کام کے لیے اس مرکزِ توحید کے بانی نے دعا فرمائی تھی میں اس کارِ خاص پر مامور ہوا ہوں اور وہی کام کر رہا ہوں۔ اب جو اپنی بھلائی چاہتا ہے وہ اس برکت میں شریک ہو ورنہ اپنے انجام کا انتظار کرے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۳)

یعنی ان سے کہہ دو کہ اللہ ہی شکر کا سزاوار ہے جس نے مجھ پر قرآن کی یہ نعمت اتاری اور میں وہ تم کو سنا رہا ہوں۔ اگر تم اس کی قدر نہیں کر رہے ہو اور مجھ سے نشانیوں کا مطالبہ کر رہے ہو تو وہ وقت بہت جلد آ رہا ہے جب وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا اس وقت تمھیں پتہ چلے گا کہ میں نے تمھیں کتنی سچی باتیں بتائی تھیں لیکن تم نے اپنی بدبختی سے ان کی قدر نہیں کی۔ 'فَتَعْرِفُوْنَهَا' یعنی اس وقت تم جانو گے کہ کسی نے اس انجام سے تمھیں آگاہ کیا تھا لیکن تم نے اس کو جھٹلایا اور اپنی یہ شامت بلائی۔ مگر اس جاننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

'وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ' یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم جو شرارتیں کر رہے ہو خدا اس سے بے خبر ہے۔ وہ ہر چیز سے باخبر ہے اور تمھاری خبر لے گا لیکن اس کے ہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انجام کو پہنچی۔ فالحمد للہ علی ذٰلک

رحمان آباد

۲۱ فروری ۱۹۷۴ء

تدبرِ قرآن

۲۸

القصص

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ نمل ـــــ کا مثنیٰ ہے۔ اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ البتہ اجمال وتفصیل اور اسلوب بیان ونہج استدلال کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔ سابق سورہ میں حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا صرف اتنا حصہ اجمالاً بیان ہوا ہے جو ان کو رسالت عطا کیے جانے اور فرعون کے پاس جانے کے حکم سے متعلق ہے۔ اس سورہ میں وہ پوری سرگزشت، نہایت تفصیل سے بیان ہوئی ہے، جو ان کی ولادت باسعادت سے لے کر ان کو تورات عطا کیے جانے تک کے احوال ومشاہدات پر مشتمل ہے۔ سابق سورہ میں بنی اسرائیل کی طرف صرف ایک مخفی اشارہ تھا، اس سورہ میں ان کے صالحین ومفسدین دونوں کا رد یہ نسبۃً وضاحت سے زیر بحث آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یہود کھل کر سامنے آگئے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعینہٖ اسی مقصد سے سنائی گئی ہے جس مقصد سے سورۂ یوسف میں حضرت یوسفؑ کی سرگزشت سنائی گئی ہے کہ اس آئینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اچھی طرح دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی حفاظت وصیانت اور اپنی اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لیے اپنی کیا شانیں دکھاتا ہے اور آپؐ کے مخالفین بھی دیکھ لیں کہ اس دعوت کی مخالفت میں بالآخر ان کو کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

قریش پر اس سورہ میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جس طرح اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اسی طرح اس نے اس پیغمبر اور اس کتاب کو تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ تم پر اللہ کی ہدایت پوری طرح واضح ہو جائے اور تمہارے پاس گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

بنی اسرائیل پر یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول نہ ہوتے تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے ان گوشوں سے بھی یہ واقف ہوتے جن سے تم بھی صحیح صحیح اور اس تفصیل سے واقف نہیں ہو اور ساتھ ہی اس امر واقعی کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ جو ہدایت، اللہ نے تم پر نازل فرمائی تھی وہ تم نے اختلافات میں پڑ کر گم کر دی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اپنے اس رسول کے ذریعہ سے اس ہدایت کو از سر نو زندہ کرے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں یہ تسلی دی گئی ہے کہ اس قرآن کو تم نے اللہ سے مانگ کر نہیں لیا ہے بلکہ

اللہ نے خود تم پر اس کی ذمہ داریاں ڈالی ہیں تو جب اس نے خود تم پر اس کا بار ڈالا ہے تو تم مخالفوں کی مخالفت اور راہ کی مشکلات سے بے پروا ہو کر اپنا فرض انجام دو۔ جس اللہ نے یہ بوجھ تم پر ڈالا ہے وہ خود ہر قدم پر تمھاری رہنمائی و دست گیری فرمائے گا اور تمھیں کامیابی کی منزل پر پہنچائے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۲۸) حضرت موسیٰ کی سرگزشت ان کی ولادت باسعادت کے وقت سے لے کر تورات کے عطا کیے جانے تک۔

(۴۴-۴۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات جس میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ تم حضرت موسیٰ کی زندگی کے ان مراحل و مقامات سے واقف نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ان سے واقف کیا کہ تمھارے ذریعہ سے اللہ کی ہدایت و شریعت دنیا میں پھر زندہ ہو۔ یہ اللہ کا تمھارے اوپر بھی فضل ہے اور تمھاری اس قوم پر بھی جس کے اندر اب تک کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ اللہ نے یہ چاہا کہ ان کو کوئی سزا دینے سے پہلے تمھارے ذریعہ سے ان پر اپنی حجت تمام کر دے۔

(۴۷-۵۵) قریش کی طرف سے اس دعوتِ حق کی مخالفت اور اشرارِ یہود کی شہ پر یہ مطالبہ کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں دکھاتے جس قسم کے معجزے حضرت موسیٰ نے دکھلائے۔ اس معارضہ کا مسکت جواب اور ساتھ ہی ان اچھے اہل کتاب کی تحسین جو اپنی قوم کے تمام غوغا کے علی الرغم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی دعوت کی تائید کر رہے تھے۔

(۵۶-۶۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور قریش کے اس اندیشہ کا جواب کہ اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں گے تو اس سے ان کی تمام سیاست و معیشت تباہ ہو جائے گی۔

(۶۲-۷۵) ان شرکاء و شفعاء کی بے حقیقتی کی وضاحت جن کو مشرکین اپنی تمام کامیابیوں کا ذریعہ سمجھتے اور ڈرتے تھے کہ اگر ان کو انھوں نے چھوڑا تو ان پر تباہی آ جائے گی۔

(۷۶-۸۴) ایک یہودی سرمایہ دار کے انجام کا بیان جس سے مقصود اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ نعمتیں جو بھی ملتی ہیں سب خدا کی طرف سے ملتی ہیں لیکن بدبخت لوگ ان کو اپنی قابلیت کا ثمرہ اور اپنے فرضی معبودوں کا فضل و کرم سمجھتے ہیں۔

(۸۵-۸۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و عزیمت کی تلقین کہ تم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو۔ مخالفین کے غوغا کی پروا نہ کرو۔ جس خدا نے تم پر قرآن کی دعوت کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ تمھاری راہ کی ہر مشکل آسان کرے گا۔

سُوْرَةُ الْقَصَصِ (٢٨)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ٨٨

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمٓ ﴿١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿٢﴾ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ آیات ١-٤٦
نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٣﴾ اِنَّ فِرْعَوْنَ
عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ
يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ
الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٤﴾ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى
الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٥﴾ وَنُمَكِّنَ
لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا
كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿٦﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا
خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا
رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٧﴾ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ
فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا
كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ﴿٨﴾ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ
لَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ڰ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا

يَشْعُرُوْنَ ۝٩ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ۭ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ
بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٠ وَقَالَتْ
لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۡ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝١١
وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓي اَهْلِ
بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝١٢ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى
اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝١٣ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا ع
وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝١٤ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰي
حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ڭ هٰذَا مِنْ
شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ
عَلَي الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ڭ قَالَ هٰذَا
مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝١٥ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ
نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝١٦ قَالَ رَبِّ
بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝١٧ فَاَصْبَحَ
فِي الْمَدِيْنَةِ خَاۗىِٕفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ
يَسْتَصْرِخُهٗ ۭ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝١٨ فَلَمَّآ اَنْ
اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ
تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ڰ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا

فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ رَجُلٌ
مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی ؗ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِکَ
لِیَقْتُلُوْکَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا
یَّتَرَقَّبُ ؗ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ ع ۸
مَدْیَنَ قَالَ عَسٰی رَبِّیْۤ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ
مَدْیَنَ وَجَدَ عَلَیْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ ؗ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ
امْرَاَتَیْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُکُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ
الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰی لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤی اِلَی الظِّلِّ فَقَالَ
رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا
تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ ؗ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ لِیَجْزِیَکَ اَجْرَ مَا
سَقَیْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٝ
نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ؗ
اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ
اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ
اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِکَ ۚ وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْکَ ؕ
سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِکَ بَیْنِیْ وَ
بَیْنَکَ ؕ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی مَا
نَقُوْلُ وَکِیْلٌ ﴿۲۸﴾ فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ ع ۳

مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ
اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّآ
اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ
الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ
فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ
وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ
بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ
بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾
وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ
اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ
وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَ
مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ مُّوْسٰي بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ
قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰي رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَاۗءَ بِالْهُدٰى مِنْ
عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾
وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ
يٰهَامٰنُ عَلَي الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰي

وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ﴿۳۹﴾ فَأَخَذْنَاهُ وَ
جُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الظَّالِمِينَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ
لَا يُنصَرُونَ ﴿۴۱﴾ وَأَتْبَعْنَاهُمْ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ
هُم مِّنَ الْمَقْبُوحِينَ ﴿۴۲﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِن بَعْدِ ع ۴
مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً
لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۴۳﴾ وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا
إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿۴۴﴾ وَلَٰكِنَّا أَنشَأْنَا
قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ
تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنتَ
بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَٰكِن رَّحْمَةً مِّن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا
مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۴۶﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴۶

یہ طٰسٓمٓ ہے یہ واضح کتاب الٰہی کی آیات ہیں۔ ہم تمھیں موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا کچھ حصہ ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں ان لوگوں کی ہدایت کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۱-۳

بے شک فرعون سرزمینِ مصر میں بہت سرکش ہو گیا تھا۔ اور اس نے اس کے باشندوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس نے دبا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر چھوڑتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا، بے شک وہ زمین میں فساد برپا کرنے والوں

میں سے تھا۔ اور ہم یہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں دبا کر رکھے گئے تھے اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کو وراثت بخشیں اور ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون و ہامان اور ان کی فوجوں کو ان کے ہاتھوں وہ دکھائیں جس کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔ ۴-۶

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلاؤ، پس جب تمہیں اس باب میں اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو اور نہ اندیشہ کیجیو اور نہ غم۔ ہم اس کو تمہارے پاس لوٹا کر لائیں گے اور اس کو اپنے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔ ۷

تو فرعون کے گھر والوں نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ان کے لیے دشمن اور باعثِ غم بنے۔ بے شک فرعون و ہامان اور ان کے اہلِ لشکر سے بڑی چوک ہوئی۔ اور فرعون کی بیوی نے کہا، یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو قتل نہ کرو۔ کیا عجب کہ یہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں اور ان کو انجام کی کچھ خبر نہ تھی۔ ۸-۹

اور موسیٰ کی ماں کا دل بالکل بے چین ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ اس کے راز کو ظاہر کر دیتی اگر ہم اس کے دل کو نہ سنبھالتے کہ وہ اہلِ ایمان میں سے بنی رہے۔ اور اس نے اس کی بہن سے کہا کہ تو اس کے پیچھے پیچھے جا تو وہ اس کو دور سے دیکھتی رہی اور ان لوگوں کو اس کی خبر نہ ہونے پائی۔ ۱۰-۱۱

اور ہم نے اس کو پہلے ہی سے دودھ پلائیوں کے دودھ سے روک دیا تھا تو اس نے کہا کیا میں ایک ایسے گھر والوں کا آپ لوگوں کو پتہ دوں جو آپ لوگوں کی خاطر اس کو پالیں گے اور وہ اس کی بڑی خیر خواہی سے دیکھ بھال کریں گے! پس ہم نے اس کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کھائے اور تاکہ وہ اچھی طرح جان لے

کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہتا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ ۱۲-۱۳

پس جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور پورا ہوا تو ہم نے اس کو قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور علم بخشا اور خوب کاروں کو ہم اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ ۱۴

اور ایک دن لوگوں کی بے خبری میں وہ شہر میں داخل ہوا تو اس میں اس نے دو آدمیوں کو لڑتے پایا۔ ایک اس کے اپنے گروہ میں سے تھا اور دوسرا اس کے دشمنوں کے گروہ میں سے۔ تو جو اس کے گروہ میں سے تھا اس نے اس سے اس شخص کے مقابل میں مدد کی درخواست کی جو اس کے مخالفوں میں سے تھا تو موسیٰ نے اس کے گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ اس نے کہا یہ تو مجھ سے شیطانی کام صادر ہو گیا، بے شک وہ ایک کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔ اس نے دعا کی، اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا تو مجھے بخش دے۔ تو خدا نے اسے بخش دیا۔ بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ اس نے کہا، اے رب! چونکہ تو نے مجھ پر فضل فرمایا تو میں عہد کرتا ہوں کہ میں مجرموں کا مددگار کبھی نہیں بنوں گا۔ ۱۵-۱۷

پس دوسرے دن وہ شہر میں داخل ہوا ڈرتا، ٹوہ لیتا ہوا، تو دیکھا کہ وہی شخص، جو کل اس سے طالبِ مدد ہوا تھا، آج پھر اس کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے کہا، تم خود ایک کھلے ہوئے شریر آدمی ہو۔ پس جب اس نے ارادہ کیا کہ پکڑے اس کو جو ان دونوں کا دشمن تھا تو وہ بول اٹھا کہ اے موسیٰ، کیا تم آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح تم نے کل ایک شخص کو قتل کیا! تم تو اس ملک میں ایک جبار بننے کا ارادہ کر رہے ہو، تم اصلاح کرنے والوں میں سے نہیں بننا چاہتے۔ ۱۸-۱۹

اور شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ اے موسیٰ

اعیانِ حکومت تمہارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں۔ تو یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ تو وہ وہاں سے ڈرتا اور ٹوہ لیتا ہوا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی، اے رب! مجھے ظالموں کی قوم سے نجات دے۔ ۲۰-۲۱

اور جب اس نے مدین کا رخ کیا تو اس نے دعا کی، امید ہے کہ میرا رب میری رہنمائی سیدھی راہ کی طرف فرمائے گا۔ اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے اس پر لوگوں کی ایک بھیڑ دیکھی جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اور ان سے ورے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنی بکریوں کو روکے کھڑی ہیں۔ اس نے ان سے پوچھا تمہارا کیا ماجرا ہے؟ انھوں نے کہا، ہم اس وقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک چرواہے اپنی بکریاں ہٹا نہ لیں اور ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں۔ تو اس نے ان دونوں کی خاطر پانی پلایا پھر سائے کی طرف ہٹ گیا اور دعا کی، اے میرے رب! جو خیر بھی اس وقت تو میرے لیے اتارے میں اس کا حاجت مند ہوں۔ ۲۲-۲۴

پس ان میں سے ایک شرماتی ہوئی آئی۔ کہا کہ میرے باپ آپ کو بلاتے ہیں کہ آپ نے ہماری خاطر جو پانی پلایا اس کا آپ کو صلہ دیں۔ تو جب وہ اس کے پاس آیا اور اس کو سارا ماجرا سنایا، اس نے کہا، اب اندیشہ نہ کرو، تم نے ظالموں سے نجات پائی۔ ۲۵

ان میں سے ایک نے کہا، ابا جان! ان کو ملازم رکھ لیجیے۔ کیونکہ آپ کے لیے بہترین ملازم وہی ہو سکتا ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔ ۲۶

اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ اس شرط پر کر دوں کہ تم آٹھ سال میری ملازمت کرو۔ اور اگر تم نے دس سال پورے کر دیے تو یہ بات تمہاری مرضی سے ہوگی۔ میں تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا۔ ان شاء اللہ تم مجھے

ایک بھلا آدمی پاؤ گے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہے۔ دونوں میں سے جو مدت بھی پوری کر دوں تو اس معاملے میں مجھ پر کوئی جبر نہ ہو گا اور اللہ ہمارے اس قول و قرار پر، جو ہم کر رہے ہیں، گواہ ہے۔ ۲۷-۲۸

تو جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور اپنے اہل کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے طور کی جانب سے ایک آگ دیکھی۔ اس نے اپنے اہل سے کہا، مجھے آگ نظر آئی ہے، تم لوگ ٹھہرو کہ میں وہاں سے کوئی خبر یا آگ کا کوئی انگارا لاؤں تاکہ تم لوگ تاپو۔ ۲۹

تو جب وہ اس کے پاس آیا، خطۂ مبارک میں، وادیٔ ایمن کے کنارے سے، درخت سے اس کو آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ، عالم کا خداوند ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنا عصا ڈال دو تو جب اس نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا گویا سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پھر مڑ کے نہ دیکھا۔ اے موسیٰ! آگے آؤ اور ڈرو نہیں، تم بالکل مامون ہو۔ تم اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو وہ بغیر کسی مرض کے سفید نکلے گا اور سکیڑ لو اپنا بازو جس طرح خوف سے سکیڑ لیتے ہیں۔ پس یہ تیرے رب کی جانب سے دو نشانیاں ہیں فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جانے کے لیے۔ بے شک وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔ ۳۰-۳۲

اس نے کہا، اے رب! میں نے ان میں سے ایک آدمی کو قتل کیا ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اور میرے بھائی، ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں تو ان کو بھی میرے ساتھ مددگار کی حیثیت سے بھیج کہ وہ میری تائید کریں۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے۔ ارشاد ہوا کہ ہم تمہارے بھائی کو بھی تمہارے لیے قوتِ بازو بنائیں گے اور تم دونوں کو خاص دبدبہ عطا کریں گے تو وہ تم پر دست درازی نہ کر سکیں گے تو ہماری نشانیوں

کے ساتھ جاؤ، تم دونوں اور جو تمھاری پیروی کریں گے، غالب رہیں گے۔ ۳۲-۳۵

تو جب موسیٰ ان کے پاس ہماری نہایت واضح نشانیوں کے ساتھ آیا تو انھوں نے کہا، یہ تو محض گھڑا ہوا جادو ہے اور ہم نے اس طرح کی باتیں اپنے اگلوں میں تو سنی نہیں! ۳۶

اور موسیٰ نے کہا، میرا رب خوب جانتا ہے اس کو جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور جس کے لیے دارِ آخرت کا انجام خیر ہے۔ ظالم ہرگز فلاح پانے والے نہیں بنیں گے۔ ۳۷

اور فرعون نے کہا، اے درباریو! میں تو تمھارے لیے اپنے سوا کسی اور معبود سے واقف نہیں تو اے ہامان! تم مٹی کی اینٹوں کا پزاوہ لگواؤ اور میرے لیے ایک اونچا محل بنواؤ کہ میں موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو ایک جھوٹا آدمی خیال کرتا ہوں۔ ۳۸

اور اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق گھمنڈ کیا اور انھوں نے گمان کیا کہ ان کو ہماری طرف لوٹنا نہیں ہے تو ہم نے اس کو اور اس کی فوجوں کو پکڑا، پس ان کو سمندر میں پھینک دیا تو دیکھو، ظالموں کا انجام کیسا ہوا! اور ہم نے ان کو دنیا میں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیشوا بنایا اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہ ہو گی اور اس دنیا میں ہم نے ان کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے دن وہی خوار ہونے والوں میں سے ہوں گے۔ ۳۹-۴۲

اور ہم نے اگلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب عطا کی لوگوں کے لیے بصیرتیں بخشنے والی اور ہدایت و رحمت بنا کر تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۴۳

اور تم تو نہ پہاڑ کے جانب غربی میں موجود تھے جب کہ ہم نے موسیٰؑ کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا اور نہ تم انھی لوگوں میں تھے جو وہاں موجود تھے لیکن ہم نے بہت سی قومیں اٹھائیں تو ان پر ایک زمانہ گزر گیا اور وہ ہماری یاددہانی کو بھلا بیٹھے تو ہم نے تم کو رسول بنایا کہ ان کو

یاد دہانی کرو) اور تم اہلِ مدین میں بھی ہماری آیتیں سناتے مقیم نہ تھے لیکن ہم تم کو ایک رسول بنانے والے تھے (سو ہم نے ان احوال سے تم کو باخبر کیا) اور تم طور کے پہلو میں بھی موجود نہ تھے جب کہ ہم نے موسیٰ کو پکارا لیکن تم اپنے رب کی رحمت سے (مبعوث کیے گئے) کہ تم ایک ایسی قوم کو ہشیار کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ہشیار کرنے والا نہیں آیا تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ ۴۴-۴۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۱-۲)

حروفِ مقطعات پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ 'کتابِ مبین' کے اندر احسان، امتنان اور اتمامِ حجت کے جو پہلو ہیں، خاص طور پر اہلِ کتاب کے لیے، ان کی وضاحت بھی ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ کم و بیش انہی الفاظ سے سابق سورہ کی تمہید بھی شروع ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ دونوں کا مرکزی مضمون ایک ہی ہے۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۳)

موسیٰ و فرعون کی سرگزشت سنانے کا اصل مقصد

خطاب اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن آیت کے آخری الفاظ 'لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' خود شاہد ہیں کہ مقصود اس سرگزشت کے سنانے سے وقت کے فراعنہ یعنی قریش کے لیڈروں کے کان کھولنا ہے۔ 'بِالْحَقِّ' یعنی بالکل ٹھیک ٹھیک، غایت و مدعا اور عبرت و موعظت کے ساتھ۔ تورات میں حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت نہ تو ٹھیک ٹھیک بیان ہوئی ہے اور نہ اس سے وہ موعظت ہی سامنے آتی ہے جو اس کی اصل روح ہے۔ قرآن نے یہ سرگزشت اس کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سنائی ہے۔ 'لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' میں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔ یہ ٹکڑا اپنے اندر ایک قسم کی تنبیہ رکھتا ہے کہ ہم یہ سرگزشت سنا تو رہے ہیں لیکن اس کا فائدہ انہی کو پہنچے گا جن کے اندر ایمان لانے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ جو اندھے بہرے بن چکے ہیں وہ بدستور اندھے بہرے ہی بنے رہیں گے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۴)

سرگزشت سے پہلے اس کا خلاصہ

اصل سرگزشت سے پہلے یہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں اس غایت و مقصد کو سامنے کر دینے کے لیے

وارد ہوئی ہیں جس کو پیش نظر رکھ کر یہ سنائی جا رہی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب متعدد مقامات میں اختیار کیا گیا ہے کہ کوئی سرگزشت سنانے سے پہلے وہ مدعا مختصر الفاظ میں قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے جو اس کے سنانے سے پیشِ نظر ہوتا ہے تاکہ سرگزشت کے پھیلاؤ میں اصل حقیقت قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ سورۂ کہف میں اس کی مثال گزر چکی ہے۔

'اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ'۔ زمین میں 'علو' (سرکشی) یہ ہے کہ زمین کے اصل خالق و مالک کی مرضی اور اس کے احکام کو نظر انداز کر کے کوئی اس میں اپنی من مانی کرنے لگ جائے اور خدا کے بندوں کو خدا کی بندگی و اطاعت میں داخل کرنے کے بجائے ان سے اپنی بندگی و غلامی کرانے لگے۔

'وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ' یہ اسی 'علو' اور 'فساد فی الارض' کی وضاحت ہے کہ اس نے ملک کے باشندوں کو طبقات میں تقسیم کیا اور ان میں سے ایک گروہ کو اس نے بالکل دبا کر اور غلام بنا کر رکھا۔ جب راعی و رعیت سب خدا کی مملوک ہیں تو کسی ملک کے حکمران کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ رعایا کے درمیان کوئی تفریق و امتیاز برتے بلکہ راعی و رعیت سب کے لیے بلا امتیاز ایک ہی قانون اور ایک ہی نظامِ عدل و مساوات ہونا چاہیے لیکن فرعون نے بنی اسرائیل کو تو غلاموں کی حیثیت دے رکھی تھی اور خود خدا بن بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی اپنی قوم قبطیوں کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ بنی اسرائیل سے غلاموں کی طرح کام لیں۔

'يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ' اس جبر و ظلم کی ایک مثال ہے جو فرعون اور قبطیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر ہو رہا تھا۔ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کی سنگدلانہ اسکیم فرعون اور اس کے اعیان نے جس سیاسی اندیشہ کی بنا پر چلائی تھی اس کی وضاحت سورۂ طٰہٰ اور بعض پچھلی دوسری سورتوں میں ہو چکی ہے۔

'اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ' یعنی یہ خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا درآنحالیکہ اللہ اپنی زمین میں جس کو بھی حکمرانی کا منصب بخشتا ہے عدل و امن کے قیام کے لیے بخشتا ہے۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ (۵)

بنی اسرائیل کو پیشوائی بخشنے کا الٰہی فیصلہ

'نُرِيْدُ' سے پہلے، عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق، فعل ناقص محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان تو یہ ظلم و ستم ڈھائے ہوئے تھے اور ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں لیکن ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ہم مظلوموں پر احسان کریں، ان کو پیشوائی کا منصب بخشیں اور ظالموں کو ہٹا کر مظلوموں کو وراثت و خلافت عطا کریں۔ 'نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً' سے اشارہ اس دینی پیشوائی کی طرف ہے جو حضرت موسیٰ کی بعثت کے بعد بنی اسرائیل کو حاصل ہوئی۔ اور

'نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ' سے خلافت و حکومت مراد ہے جو ان کو ارضِ فلسطین میں ملی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں جس کے حدود نہایت وسیع ہو گئے یہاں تک کہ مصر کی حکومت بھی ان کی ایک باجگزار ریاست بن گئی۔

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (۶)

بنی اسرائیل کو اقتدار دینے کا خدائی فیصلہ

'تمکین فی الارض' سے مراد اقتدار و صولت و دبدبہ ہے۔ یعنی ارادۂ الٰہی یہ ہوا کہ ان دبائے ہوئے مظلوموں کو ایک مضبوط اور طاقت ور سلطنت عطا کرے اور فرعون و ہامان اور ان کی فوجوں کو وہ چیز دکھا دے جس کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔ 'مَا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ' سے اشارہ فرعون اور اس کے ہامان کے اس اندیشہ کی طرف ہے جس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ وہ بنی اسرائیل کی تعداد میں روز افزوں اضافہ سے بہت خائف تھے کہ اگر یہ قوت پکڑ گئے تو یا تو وہ خود ملک پر قابض ہو جائیں گے یا باہر کے دشمنوں سے مل کر یہاں سے قبطیوں کو بے دخل کر دیں گے۔ اسی خطرے کے سدباب کے لیے ان احمقوں نے بنی اسرائیل کے ذکور کے قتل کی وہ اسکیم بنائی تھی جس کی پوری تفصیل ہم پچھلی سورتوں میں پیش کر چکے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے مقابل میں ان کی ساری اسکیمیں اور پیش بندیاں بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔ ارادۂ الٰہی مظلوموں کے حق میں پورا ہو کے رہا اور ان کے دشمن تمام زور و سطوت اور تمام تدبیر و تدبر کے باوجود پامال ہوئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اسی حقیقت کو قریش کے اکابر و زعما کے سامنے رکھنے کے لیے وہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے جو آگے آ رہی ہے تاکہ لوگ اس قصہ کو قصہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس حق کو مدِ نظر رکھ کر سنیں جو اس کے اندر مضمر ہے۔

ہامان فرعون کا وزیر تھا

یہاں بالکل پہلی مرتبہ فرعون کے ساتھ 'ہامان' کا ذکر بھی آیا ہے اور اس طرح آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت فرعون کے وزیر کی تھی اور اس کو بنی اسرائیل کو دبائے رکھنے کے مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی۔ آگے بھی اس کا ذکر فرعون کے وزیر اعظم ہی کی حیثیت سے آ رہا ہے۔ تورات میں یہ نام نہیں آیا ہے لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوتا۔ کتنی باتیں ہیں جن میں قرآن نے تورات کے بیانات کی تصحیح کی ہے یا ان پر اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ بعض مستشرقین نے اس نام کو اعتراض کا ہدف بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مصر میں اس نام کا کوئی شخص نہیں تھا۔ ان لال بجھکڑوں کا یہ اعتراض بالکل ہی احمقانہ ہے۔ کیا یہ حضرات یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کو فرعون اور اس کے تمام وزرا، و اعیان اور اس عہد کے تمام اکابر مصر کے ناموں کی فہرست مل گئی ہے؟ وزراء و اعیان تو درکنار کیا یہ حضرات خود اس فرعون کے بارے میں متفق اللفظ ہیں جو حضرت موسیٰؑ کا ہم عصر تھا؟ قرآن کی مخالفت کے جنون میں اس قسم کی باتیں جو یہ

لوگ کہتے ہیں وہ بالکل ہی ناقابلِ التفات ہیں۔ یہ لوگ پائی ہوئی حقیقت کو گم کرنے میں تو بڑے ماہر ہیں۔ لیکن جب کسی چیز کا سراغ دیتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھایا ہے۔

بنی اسرائیل کے اندیشے سے فرعون کی فوجی تیاریاں

یہاں فرعون و ہامان کے ساتھ ساتھ خاص طور پر ان کی فوجوں کا جو ذکر بار بار آیا ہے اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان نے بنی اسرائیل کے مسئلہ کو ایک بالکل سیاسی رنگ دے دیا تھا۔ ان کی کثرتِ تعداد کو وہ اپنی حکومت کے لیے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے فرعون نے اپنے تمام امراء و اعیان کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں اپنی فوجوں کو بنی اسرائیل کے خطرے سے نمٹنے کے لیے بالکل چوکس رکھیں۔ چنانچہ جب اس نے بنی اسرائیل کے تعاقب کا فیصلہ کیا تو اپنے تمام امراء اور زوالوں کو ان کی فوجوں سمیت طلب کیا۔ فرعون کو اپنی ان افواج پر، جیسا کہ قرآن اور تورات دونوں سے واضح ہوتا ہے، بڑا ناز تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ سارا غرور و ناز چشم زدن میں ختم کر دیا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۷)

اصل سرگزشت کا آغاز

اب یہ اصل سرگزشت شروع ہوتی ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی ولادت ہوئی تو فرمایا کہ ہم نے موسیٰؑ کی ماں کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلاتی رہو۔ اگر تمھیں کوئی اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو اور ذرا فکر و غم نہ کیجیو، ہم اس کو تمھارے پاس واپس لائیں گے اور اس کو اپنے رسولوں میں سے بنائیں گے۔

'وحی' سے مراد یہاں ظاہر ہے کہ وہ اصطلاحی وحی نہیں ہے جو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ الہام و القاء یا رؤیا کے ذریعہ سے اس طرح دل میں کوئی بات ڈال دینا ہے جس سے دل کو اس پر فی الجملہ اطمینان ہو جائے۔

حضرت موسیٰ کی حفاظت کے لیے خدائی انتظامات

جس زمانے میں حضرت موسیٰؑ کی ولادت ہوئی ہے بنی اسرائیل کے بچوں کے ہلاک کرنے کی سکیم بڑے زوروں سے چل رہی تھی۔ اول اول تو یہ کام فرعون اور اس کے اعیان نے دائیوں سے لینا چاہا لیکن تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ دائیوں نے اس میں کچھ زیادہ تعاون نہیں کیا۔ بالآخر فرعون نے قبطیوں کو یہ عام حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو اولاد نرینہ پیدا ہو اس کو دریا میں پھینک دیا کریں۔ اسی خطرناک زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر ان کی والدہ ماجدہ کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا کہ معلوم نہیں کس وقت کسی ظالم کی نظر بچے پر پڑ جائے اور وہ اس کو اچک لے جائے۔ اسی خطرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ابھی تو تم اس کو دودھ پلاؤ۔ اگر اس طرح کا کوئی خطرہ محسوس ہو تو بے خوف و خطر بچے کو تم خود اپنے ہاتھوں دریا کے حوالہ کر دینا اور ذرا غم و فکر نہ کرنا۔ ہم اس کو

تمھارے پاس واپس بھی لائیں گے اور اس کو مستقبل میں اپنے شرفِ رسالت سے بھی مشرف کریں گے۔ دریا میں ڈالنے کی یہ ہدایت ظاہر ہے کہ اس وجہ سے فرمائی گئی کہ فرعون نے جو راستہ بچوں کی ہلاکت کے لیے اختیار کیا تھا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت موسیٰ کے لیے وہی راستہ نجات کا راستہ بنے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۳۹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک صندوق میں بچے کو رکھ کے صندوق کو دریا میں بہا دینے کی ہدایت ہوئی تھی۔ تورات میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔

"وہ عورت حاملہ ہوئی اور بیٹا جنا اور اس نے اسے خوب صورت دیکھ کے تین مہینے تک چھپا رکھا اور جب آگے اس کو نہ چھپا سکی تو سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور اس پر لاسا اور رال لگایا اور لڑکے کو اس میں رکھا اور اس نے اسے دریا کے کنارے پر جھاؤ میں رکھ دیا۔"

تورات کے بیان میں جو کمیاں اور غلطیاں ہیں ان کی طرف سورۂ طٰہٰ اور سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں خاص چیز جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ ماجدہ کو الہام کے ذریعے سے یہ تسلی دے دی گئی تھی کہ اس بچے کو ہم تمھارے پاس پھر واپس لائیں گے اور اس کو منصبِ رسالت پر سرفراز کریں گے اور یہ تسلی، اسلوبِ کلام دلیل ہے کہ ایک حتمی وعدے کی شکل میں دی گئی تھی۔ یہی چیز تھی جس کے اعتماد پر حضرت موسیٰ کی والدہ ماجدہ یہ بازی کھیل گئیں ورنہ کوئی ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو اس طرح دریا کی موجوں کے حوالہ کس طرح کر سکتی ہے!!

فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ (۸)

حضرت موسیٰ شاہی محل میں

اتنی بات بربنائے قرینہ یہاں پر محذوف ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ نے جب خطرہ محسوس کیا تو ہدایتِ خداوندی کے مطابق بچے کو ٹوکرے کے ایک صندوق میں رکھ کر صندوق کو دریائے نیل کے حوالہ کر دیا۔ تورات کی مذکورہ بالا روایت پر اعتماد کیجیے تو واقعہ کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ تین ماہ تک تو انھوں نے بچے کو کسی نہ کسی طرح چھپا رکھنے کی کوشش کی لیکن بالآخر انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ تدبیر کارگر ہونے والی نہیں ہے۔ چنانچہ ناچار انھیں وہ اقدام کرنا ہی پڑا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ دریائے نیل اسرائیلیوں کی بستی کے پاس سے گزرتا ہوا فرعون کے محل کی طرف جاتا تھا۔ وہاں دریا کی موجوں نے صندوق کو کنارے پر ڈال دیا۔ فرعون کے گھر کے لوگوں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ صندوق میں ایک موہنا بچہ پڑا ہوا ہے تو بادشاہ اور ملکہ کے حکم سے بچے کو شاہی محل میں لایا گیا۔ فرعون کی بیوی جیسا کہ سورہ تحریم سے واضح ہے، نہایت نیک دل تھیں۔ انھوں نے کہا اس بچے کو قتل نہ کرو، بہت ممکن ہے کہ یہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ اس طرح حضرت موسیٰ شاہی محل میں پہنچ گئے اور بادشاہ اور ملکہ دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئے۔ یہاں لفظ آلؔ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب

صندوق میں پڑے ہوئے ایک بچے کا ذکر شاہی محل تک پہنچا تو خاندانِ شاہی کے تمام چھوٹے بڑے موقع پر پہنچ گئے اور سب اس کو اٹھا کر محل میں لائے۔

تقدیرِ الٰہی کے بھید کسی کو معلوم نہیں

لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا۔ اس 'لِ' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ یہ غایت و انجام کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ انھوں نے تو بچے کو اس لیے اٹھایا کہ وہ ان کے لیے، جیسا کہ آگے ملکہ کے قول سے واضح ہوگا، آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا لیکن تقدیرِ الٰہی کا یہ بھید ان کو نہیں معلوم تھا کہ اس بچے کے ہاتھوں فرعونی اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ۔ یہ فرعون، ہامان اور ان کے فوجیوں کے رویے پر عام تبصرہ ہے کہ وہ اپنی حماقت کے سبب سے یہ سمجھے کہ تمام اختیار و اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے، وہ بنی اسرائیل کو ہمیشہ اسی طرح دبائے رکھیں گے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ اگر خدا چاہے گا تو ان کے سب سے بڑے دشمن کی پرورش ان کے شاہی محل میں، خود بادشاہ اور ملکہ کے ہاتھوں کرائے گا! اوپر آیت ۶ کے مضمون پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۹)

فرعون کی بیوی نہایت نیک دل تھیں

ملکہ نے جب بچے کو دیکھا تو اس کی موہنی صورت پر قربان ہوگئیں۔ فرعون سے کہا، یہ تو میری اور تمھاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو قتل نہ کرو۔ امید ہے یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں۔ ملکہ کے متعلق دوسرے مقام میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ نہایت نیک دل اور فرعون کے رویہ سے سخت بیزار تھیں۔ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا یہ بعینہٖ وہی بات ہے، جو عزیزِ مصر نے، حضرت یوسفؑ سے متعلق، اپنی بیوی کو خطاب کر کے کہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ملکہ کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اور اگر تورات کے بیان کو باور کر لیا جائے کہ جس نے حضرت موسیٰؑ کے صندوق کو سب سے پہلے دیکھا وہ فرعون کی لڑکی تھی تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت تک ان کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے اس توقع کا اظہار کیا کہ اول تو اس شکل و صورت کا بچہ فوائد و برکات سے خالی نہیں ہو سکتا، پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر کسی اولادِ نرینہ کے لیے ہماری امید پوری نہ ہوئی تو ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں گے۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ، یعنی بادشاہ اور ملکہ یہ سوچ رہے تھے، انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ قدرت اس پردے میں اپنی کیا شان دکھانے والی ہے!

وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا ۖ إِن كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَن رَّبَطْنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۱۰)

آزمائشوں میں اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے جب کوئی مفر نہ دیکھا تو جی کڑا کر کے صندوق دریا میں ڈالنے کو تو ڈال دیا لیکن اس کے بعد ان پر جو کچھ گزری یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا دل صبر و قرار سے بالکل خالی ہو گیا۔ قریب تھا کہ بے صبری میں ان سے کوئی ایسی بات صادر ہو جائے جس سے سارا راز فاش ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو سنبھال لیا تاکہ جس دولتِ ایمان سے وہ بہرہ مند تھیں اس پر اس آزمائش میں بھی وہ ثابت قدم رہیں۔ انسان بہرحال انسان ہے۔ کسی ماں کے لیے خود اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو دریا کی موجوں کے حوالہ کر دینا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ اگرچہ ایک اشارۂ غیبی کا سہارا ان کو حاصل تھا اور یہ سہارا نہ ہوتا تو بھلا وہ اس کا تصور بھی کس طرح کر سکتی تھیں تاہم جب اپنا حال یہ ہے کہ اس واقعہ کا تصور کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ دل سینہ سے نکل پڑے گا تو اس وقت حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے دل پر جو کچھ گزری ہو گی اس کا اندازہ ان کے رب کے سوا اور کون کر سکتا ہے! لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نازک موقع پر سنبھالا اور وہی سنبھال سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور بندیوں کو امتحان میں تو ڈالتا ہے کہ یہ امتحان اس کی سنت ہے اور یہ امتحان درجے اور مرتبے کے اعتبار سے سخت سے سخت تر بھی ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی یہ سنت بھی ہے کہ جو لوگ اس کے امتحان کی راہ میں بازی کھیل جاتے ہیں وہ ان کو سنبھالتا بھی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی والدہ ماجدہ نے چونکہ بچے کو دریا کی موجوں کے حوالہ کر کے اپنے ایمان و توکل کی شہادت دے دی تھی اس وجہ سے آگے کے مرحلے میں خود ربِ کریم نے ان کے دل کو سنبھال لیا کہ ان کے اس ایمان و توکل کی لاج قائم رہے، کوئی ایسی بات صادر نہ ہونے پائے جو اس کے منافی ہو۔ اپنے باایمان بندوں اور بندیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یوں ہی ہے لیکن اس کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں!

وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ فَبَصُرَتْ بِهِ عَن جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۱۱)

دل کی تسلی کے لیے آخری تدبیر

جب صندوق پانی میں بہتا ہوا آگے کو چلا تو انھوں نے حضرت موسیٰؑ کی بہن سے فرمایا کہ اس کے پیچھے پیچھے کنارے کنارے تم بھی جاؤ اور دیکھو کہ صندوق کدھر کو جاتا ہے۔ یہ دل کی تسلی کے لیے آخری تدبیر تھی جو وہ کر سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ صندوق کا تعاقب ایک خاص حد تک ہی ممکن تھا، بالآخر تو اس کو نگاہوں سے اوجھل ہونا ہی تھا لیکن جتنی دیر بھی اور جتنی دور تک بھی اس کو دیکھنا ممکن ہو سکے وہ اس سے محروم رہنا کس طرح گوارا کر سکتی تھیں! چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی بہن دور سے اس طرح اس کو دیکھتی رہیں کہ کسی کو اس واقعہ کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و احسان ہوا کہ ان کی یہ مہم کامیاب رہی۔ صندوق کا فرعون کے محل کے پاس ساحل پر لگ جانے اور ننھے بھائی کو محل میں لے جانے کا سارا ماجرا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی محل اسرائیلیوں کی بستی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ

وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ (۱۲)

اللہ تعالیٰ کی ایک اور کارسازی

اب یہ اس تدبیر کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ان کی والدہ کی طرف لوٹانے کے لیے اختیار فرمائی۔ اوپر گزر چکا ہے کہ بچے کو محل میں بڑے چاؤ پیار سے لے جایا گیا۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اس بات کی فکر ہوئی ہوگی کہ بچے کو کسی دایہ کا دودھ پلایا جائے۔ دایہ بلائی گئی تو حضرت موسیٰؑ نے اس کا دودھ نہیں پیا۔ دوسری بلائی گئی۔ تیسری بلائی گئی۔ یکے بعد دیگرے کئی دایائیں بلائی گئیں لیکن حضرت موسیٰؑ نے کسی کی چھاتی منہ سے نہیں لگائی۔ اس صورتِ حال سے حضرت موسیٰؑ کی بہن نے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر کہا اگر آپ لوگ کہیں تو میں ایک ایسے گھر والوں کا پتہ دوں جو پوری خیر خواہی اور محبت کے ساتھ بچے کی غور و پرداخت کریں گے۔ محل والے پریشان تو تھے ہی وہ فوراً راضی ہو گئے اور اس طرح حضرت موسیٰؑ کے اپنی ماں کے آغوش میں پہنچنے کی راہ کھل گئی۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۳)

حضرت موسیٰؑ اپنی ماں کے آغوش میں

اس تدبیر سے خدائے کارساز و کریم نے حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکلوایا اور پھر ان کو ان کی ماں کی گود میں پہنچا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ان کا غم دور ہو جائے۔

اصل نکتہ

'وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ' یہ اس وعدے کے ایفاء کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۷ میں گزرا کہ تم بچے کو بے خوف و خطر دریا میں ڈال دینا، ہم اس کی حفاظت کریں گے اور اس کو بعد میں تم سے ملائیں گے۔ فرمایا کہ اس طرح ہم نے اس کو دکھا دیا کہ ہم جو وعدہ کرتے ہیں، خواہ اس کا ایفا بظاہر کتنا ہی مستبعد کیوں نہ نظر آئے لیکن ہم اس کو پورا کر کے رہتے ہیں اور ہماری تدبیر کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ 'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ' یہ اصل نکتہ کی بات ارشاد ہوئی ہے کہ اکثر لوگ اپنی بلادت کے سبب سے اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وہ خدا کے وعدوں کو محض ہوائی باتیں خیال کرتے ہیں اور ان کے اعتماد پر کوئی بازی کھیلنے میں ان کو خسارہ اور خطرہ نظر آتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے دیکھ لیں تب مانیں گے حالانکہ اس دنیا میں اصل امتحان تو یہی ہے کہ لوگ اپنے رب کے ان وعدوں اور وعیدوں کے لیے جئیں اور مریں جن کی حقیقت ابھی سامنے آنی ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۱۴)

حضرت موسیٰؑ کی جوانی کا اصلی جمال

'بَلَغَ اَشُدَّهٗ' سے جوانی کو پہنچنا مراد ہے اور اس کے ساتھ لفظ 'اسْتَوٰٓى' عقلی و مزاجی اعتدال و توازن کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جسمانی اعتبار سے جوانی کو اور عقلی و مزاجی اعتبار سے اعتدال و توازن کی عمر کو پہنچے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جوانی بجائے خود کوئی بڑی وقیع چیز نہیں ہے اگر اس کے ساتھ عقلی و مزاجی اعتدال کا جمال نہ ہو۔

'حکم' سے مراد قوتِ فیصلہ اور 'علم' سے مراد خدا کی معرفت ہے۔ اس حکم و علم کے مختلف مدارج ہیں۔ اس کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں بعینہٖ ان الفاظ حضرات انبیاء علیہم السلام کے علم کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں لیکن یہاں ظاہر ہے کہ وہ علم و حکمت مراد نہیں ہے اس لیے کہ یہ حضرت موسیٰ کی ابتدائی زندگی کے احوال بیان ہو رہے ہیں۔ نبوت ان کو، جیسا کہ آگے تفصیل آرہی ہے، اس کے بہت بعد ملی ہے۔

فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ جوانی کو پہنچے اور ان کی عقل اور ان کے مزاج میں اعتدال و توازن آگیا تو ہم نے ان کو حکمت و معرفت سے نوازا۔ 'وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ' جو لوگ خوب کار ہوتے ہیں ہم ان کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ 'مُحْسِنِيْنَ' سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ان کے صحیح مصرف میں بالکل صحیح طریقہ پر استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کو ہم اپنے علم و حکمت میں سے حصہ دیتے ہیں۔ یہی علم و حکمت انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کا اصلی جمال و کمال ہے۔ اگر کوئی شخص یہ نہ حاصل کر سکا تو اس نے اپنی ساری صلاحیتیں بھی برباد کیں اور اپنی جوانی بھی غارت کی۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۖ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۱۵-۱۶)

'مدینۃ' سے مراد

'مدینۃ' سے مراد اصل شہر ہے جو شرفاء و اعیان کا مرکز اور حکومت کا مستقر تھا۔ بنی اسرائیل کی حیثیت چونکہ محض غلاموں اور خدمت گاروں کی تھی اس وجہ سے ان کی بستی اصل شہر سے الگ بسائی گئی تھی۔ وہ صرف مزدوروں اور خدمت گاروں کی طرح کام کے اوقات میں شہر میں جایا کرتے تھے۔

صالح جوانی میدانِ عمل میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جوان ہوئے اور ان کے اندر وہ قوت و مروت اور حمیت و غیرت پیدا ہوئی جو صالح جوانی اور علم و معرفت کا خاصہ ہے تو وہ وقتاً فوقتاً شہر میں اپنے مظلوم بھائیوں کا حال دیکھنے کے لیے جانے لگے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی حمیت و حمایت کے سبب سے قبطیوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے تھے اس وجہ سے انھیں یہ کام لوگوں کی نگاہوں سے بچ بچا کے ایسے اوقات میں کرنا پڑتا جن میں لوگ آرام کرتے ہیں۔ ایک دن وہ اسی طرح کے تجسس کے لیے شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک قبطی اور ایک اسرائیلی دونوں لڑ رہے ہیں۔ اسرائیلی نے جب حضرت موسیٰ کو دیکھا تو ان سے طالب مدد ہوا۔ حضرت موسیٰ اس کو مظلوم دیکھ کر، بتقاضائے فتوت و حمایت حق، اس کی مدد کے لیے بڑھے اور چاہا کہ بیچ بچاؤ کرا دیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قبطی اپنی رعونت کے سبب سے ان سے الجھ پڑا۔ انھوں نے اپنی مدافعت میں اس کو جو گھونسا مارا تو وہ ایسا بے ڈھب پڑا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت موسیٰ نہ تو قبطی کے قتل کرنے کا کوئی ارادہ

رکھتے تھے اور نہ ان کو اس صورتِ حال کے پیش آنے کا کوئی گمان تھا۔ بالکل بے ارادہ جب یہ حادثہ پیش آگیا تو انھیں فوراً اپنی غلطی پر سخت پشیمانی ہوئی اور انھوں نے اپنے رب سے معافی مانگی کہ اے رب میں نے اپنی جان پر سخت ظلم ڈھایا تو مجھے معاف فرما دے۔ چونکہ یہ غلطی ان سے بالکل بے ارادہ ہوئی تھی، پھر انھوں نے معافی بھی بلا تاخیر مانگی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو فوراً ہی معاف فرما دیا اور اس معافی کی غیبی طور پر ان کو بشارت بھی مل گئی۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اوپر یہ جو ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو بھرپور جوانی کے ساتھ اپنی حکمت و معرفت سے بھی نوازا تھا یہ اسی حکمت و معرفت کا کرشمہ ہے۔ اگر حضرت موسیٰؑ صرف ایک تگڑے جوان ہوتے تو اپنے گھونسے کی شہ زوری اور بے پناہی پر فخر سے پھولے نہ سماتے۔ بالخصوص ایک قبطی کے اس طرح قتل کو تو وہ اپنا ایک زندۂ جاوید کارنامہ سمجھتے لیکن انھوں نے اپنے دشمن کے معاملے میں بھی، اپنی ایک غیر ارادی غلطی کو، اپنا ایک جرم سمجھا اور اپنے رب سے اس کی فوراً معافی مانگی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ معاملہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے رب ہی کے درمیان کا معاملہ تھا۔ مصر میں اس وقت جو صورتِ حال تھی اس میں اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ حکومت اور قانون سے کسی انصاف کی توقع کرتے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ أَنۡعَمۡتَ عَلَيَّ فَلَنۡ أَكُونَ ظَهِيرٗا لِّلۡمُجۡرِمِينَ (۱۷)

آئندہ کے لیے احتیاط کا عہد

نعمت، صالحین کے لیے شکر گزاری میں اضافہ کرتی ہے اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ فضل فرمایا کہ ان کو معافی دے دی تو آئندہ کے لیے انھوں نے یہ عہد فرمایا کہ اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔ "مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا" سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ آپ نے اسرائیلی کی حمایت اس کو مجرم سمجھتے ہوئے کی۔ آپ نے تو جو کچھ کیا اس کو مظلوم سمجھتے ہوئے کیا، اس کی فریاد پر کیا اور وقت کے حالات کی بنا پر ان کو گمان یہی ہوا کہ قبطی ظالم اور اسرائیلی مظلوم ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کے معافی مانگنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تم بے قصور ہو، قبطی ظالم آدمی تھا، بلکہ ان کو ایک غلطی کا مرتکب قرار دیتے ہوئے معافی دی تو اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مظلوم کی حمایت کرنی چاہی لیکن معاملہ کی تحقیق نہ کرنے کے سبب سے مجھ سے ظالم کی حمایت صادر ہوگئی۔ اس وجہ سے آئندہ کے لیے آپ نے یہ عہد فرمایا کہ اب میں بلا تحقیق کسی کی حمایت نہیں کروں گا بلکہ صرف اسی کی حمایت کروں گا جس کا مظلوم ہونا معلوم ہو۔ چنانچہ دوسرے ہی دن آپ نے جب اسی اسرائیلی کو ایک دوسرے قبطی سے لڑتے دیکھا اور وہ حسبِ سابق پھر حضرت موسیٰؑ سے طالبِ مدد ہوا تو آپ نے اس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔

فَأَصۡبَحَ فِي ٱلۡمَدِينَةِ خَآئِفٗا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا ٱلَّذِي ٱسۡتَنصَرَهُۥ بِٱلۡأَمۡسِ يَسۡتَصۡرِخُهُۥۚ قَالَ لَهُۥ مُوسَىٰٓ إِنَّكَ لَغَوِيّٞ مُّبِينٞ (۱۸)

عہد کا احترام

دوسرے روز حضرت موسیٰؑ ڈرتے اور ٹوہ لیتے ہوئے پھر شہر میں داخل ہوئے۔ شہر میں جاتے ہوئے احتیاط تو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، پہلے بھی وہ کرتے تھے لیکن اب اس واقعہ کے سبب سے اور بھی طرح طرح کے اندیشے رہے ہوں گے کہ معلوم نہیں اس کا ردِّ عمل ان کے اور ان کی قوم کے خلاف کیا ہوتا ہے، زبانوں پر کیا چرچے ہیں اور ان کے بارے میں کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں! اتنے میں دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل ان سے طالبِ مدد ہوا تھا آج پھر فریاد کر رہا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے اس کو جھڑک دیا کہ تم خود ایک کھلے ہوئے شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اس کے کھلے ہوئے شریر آدمی ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل تو یہی تھی کہ کل بھی وہ ایک شخص سے الجھا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں ایک سنگین حادثہ پیش آ چکا تھا اور آج بھی ایک دوسرے شخص سے وہ لڑ رہا تھا۔ یہ واضح قرینہ اسی بات کا تھا کہ یہ شخص شر پسند ہے۔ اور دوسری وجہ وہ تھی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی معافی سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اسرائیلی کو مظلوم سمجھ کر اس کی حمایت کرنے میں ان سے غلطی صادر ہوئی، اس معاملے میں ان کو تحقیق کرنی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ وعدہ جو فرمایا تھا کہ آئندہ میں کسی مجرم کی پشت پناہی نہیں کروں گا اس موقع پر انھوں نے اس کا پورا احترام ملحوظ رکھا۔ اس مرتبہ وہ فوراً اس کی حمایت کے لیے نہیں اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ قرائن کو سامنے رکھ کر اسی کو تنبیہ کی کہ تم خود ایک جھگڑالو اور شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ (۱۹)

ایک اسلوب کی وضاحت

'اَنْ' سے پہلے یہاں کوئی مناسبِ موقع فعل محذوف ہے۔ یعنی جب معاملہ یوں ہوا یا جب بات یہاں تک پہنچی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے پہلے زبانی افہام و تفہیم سے فریقین کو ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس سے کام نہ چلا بلکہ قبطی نے کچھ اکڑ دکھائی تو آپ نے اس کو پکڑ کر علیحدہ کرنا چاہا۔ اس قبطی کو یہاں 'عَدُوٌّ لَّهُمَا' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ اور اسرائیلی دونوں کا دشمن۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ اسرائیلی کا تو وہ بالفعل دشمن تھا ہی اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس کی دشمنی قومی اعتبار سے بھی تھی اور اس پہلو سے بھی کہ وہ اپنی اصلاحی سرگرمیوں کے سبب سے تمام قبطیوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے تھے۔

اسرائیلی کی حماقت سے افشائے راز

حضرت موسیٰؑ نے پکڑنا تو چاہا قبطی کو لیکن انھوں نے پہلے جھڑکا اسرائیلی کو تھا اس وجہ سے اس نے گمان کیا کہ آج ہو نہ ہو ان کا گھونسا اس پر پڑنے والا ہے۔ اس گھبراہٹ میں وہ چلایا کہ کل تم نے ایک شخص کو جس طرح قتل کیا ہے اسی طرح آج معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ اس طرح اس نے اپنی حماقت سے راز کھول دیا۔ بعض لوگوں نے 'يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ' الخ کو قبطی کا قول قرار دیا ہے لیکن یہ قرینِ قیاس نہیں کیونکہ ایک تو قتل کا واقعہ ابھی راز تھا، دوسرے قبطی حضرت موسیٰؑ کو مصلح نہیں سمجھتے تھے۔

اِنْ تُرِیْدُ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ۔

سفلہ لوگوں کا کردار

'جَبَّار' کے معنی یہاں مطلق العنان اور قابو سے باہر کے ہیں۔ یعنی افشائے راز کے ساتھ ساتھ اس نے حضرت موسیٰ پر یہ چوٹ بھی کر ڈالی کہ ہم تو یہ گمان کر رہے تھے کہ تم اس ملک میں اصلاح کرنا چاہتے ہو لیکن معلوم ہوا کہ اصلاح نہیں کرنا چاہتے بلکہ ایک بالکل مطلق العنان اور بے قابو آدمی بن کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہو!۔۔۔ اس کے اس قول سے ایک طرف تو سفلہ لوگوں کا کردار سامنے آتا ہے کہ جب تک کوئی شخص ان کی مدد و حمایت کرے وہ اس کو بہت بڑا مصلح سمجھتے ہیں لیکن اگر وہ ان کو کسی برائی سے روکنے کی کوشش کرے تو وہ نہ صرف اس کو ایک بہت بڑا مفسد قرار دیتے ہیں بلکہ اس کے خلاف جاسوسی کرنے والے اور اس کے رازوں کو طشت از بام کرنے والے بھی بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف اس سے حضرت موسیٰ کا کردار بھی سامنے آتا ہے کہ وہ اسی زمانے سے اپنی قوم کے اندر ایک مصلح اور مرجع امید سمجھے جانے لگے تھے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَۃِ یَسْعٰی ز قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِکَ لِیَقْتُلُوْکَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ (۲۰)

[illegible] کا کردار

حضرت موسیٰ کی ذات تو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پہلے ہی سے فرعونیوں کی نظر میں کھٹک رہی تھی لیکن جب یہ واقعہ پیش آ گیا اور ایک اسرائیلی ہی کی زبان سے وہ افشا بھی ہو گیا تو قدرتی طور پر فرعونیوں کی آتش غضب پوری طرح ان کے خلاف بھڑک اٹھی اور وہ ان کے قتل کے منصوبے بنانے لگے۔

'وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَۃِ یَسْعٰی'۔ اصل شہر، جو حکومت اور اعیانِ حکومت کا مرکز تھا، وہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بنی اسرائیل کی بستی سے پرے تھا اس وجہ سے اس کو 'اَقْصَا الْمَدِیْنَۃِ' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا کہ وہاں سے ایک شخص یہ معلوم کر کے کہ اعیانِ حکومت حضرت موسیٰ کے قتل کے مشورے کر رہے ہیں، بھاگا ہوا حضرت موسیٰ کو اطلاع دینے آیا کہ آپ کے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں، میں آپ کا خیر خواہ ہوں اس وجہ سے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ یہاں سے فوراً نکل جائیں۔ اس شخص سے متعلق یہاں کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے لیکن سورۂ مومن میں ایک مومنِ آلِ فرعون کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے ان کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ یہ ابتدا ہی سے حضرت موسیٰ کے خیر خواہوں میں سے تھے اور بعد کے ادوار میں، جیسا کہ سورۂ مومن میں تفصیل آئے گی، انھوں نے اعیانِ حکومت کے سامنے حضرت موسیٰؑ کی بڑی پرزور حمایت کی۔ ان وجوہ سے ظن غالب یہ ہے کہ یہ اشارہ بھی انہی کی طرف ہے۔

'اِنِّیْ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ'۔ یہ صفائی انھوں نے اس وجہ سے پیش کرنی ضروری سمجھی کہ بدگمانی کی اس فضا میں جو اس وقت اسرائیلیوں اور قبطیوں کے درمیان تھی یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے حضرت موسیٰ یہ خیال کریں کہ ایک فرعونی اس طرح ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لفظ 'یَسْعٰی' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جونہی ان کو معلوم ہوا کہ معاملہ نہایت سنجیدہ بلکہ خطرناک ہو چکا ہے، وہ اعیانِ حکومت میں سے

ہونے کے باوصف، بھاگے ہوئے حضرت موسیٰ کے پاس ان کی بستی میں آئے۔ ان کی یہ سرگرمی ان کی ہمدردی و خیرخواہی کی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ ۖ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (٢١)

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈرتے اور بچتے بچاتے ہوئے مصر سے نکل کھڑے ہوئے اور چونکہ فرعونیوں کی طرف سے تعاقب کا اندیشہ تھا اس وجہ سے انھوں نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب مجھے ان ظالموں کے شر سے نجات دے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ (٢٢)

حضرت موسیٰ کا قصدِ مدین اور اللہ کی راہ میں کام کرنے والوں کے لیے ایک سبق

اسلوبِ کلام سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰ جس وقت مصر سے نکلے ہیں اس وقت انھوں نے اپنے سفر کی منزل متعین نہیں کی تھی۔ یہ فیصلہ انھوں نے بعد میں کیا کہ انھیں مدین کی طرف جانا چاہیے اور مدین کے معاملے میں بھی یہ بات ان کے ذہن میں واضح نہیں تھی کہ انھیں کس کے پاس اور کس مقام پر جانا چاہیے بلکہ بغیر کسی تعین کے مدین کی سمت کو اس امید کے ساتھ چل کھڑے ہوئے کہ رب کریم و کارساز سیدھی راہ کی طرف رہنمائی فرمائے گا اور کسی مستقر پر پہنچائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ کا یہ نکلنا اس نوعیت کی ہجرت نہیں تھا جس کا مرحلہ ان کی بعثت کے بعد پیش آیا۔ ہجرت کے معاملے میں تو سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ اس کا وقت بھی اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمایا ہے اور اس کے تمام مراحل و منازل بھی اپنے رسول پر خود واضح فرمائے ہیں لیکن اس سفر میں حضرت موسیٰ کے سامنے اس طرح کی کوئی واضح غیبی رہنمائی نہیں تھی۔ بس متوکلاً علی اللہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے اسی توکل نے ان کی دستگیری و رہنمائی کی۔ اس پہلو سے یہ واقعہ اللہ کے ان تمام بندوں اور بندیوں کے لیے نہایت سبق آموز ہے جن کو حق کی راہ میں کوئی ابتلاء پیش آئے۔ اگر وہ اللہ کے اعتماد پر کوئی قدم اٹھائیں گے تو ان کو خدا کی رہنمائی حاصل ہوگی اگرچہ اس کے لیے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح بشارت نہ ملی ہو۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِن دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۖ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ ۖ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ (٢٣)

'مآء' سے مراد

'مَاءٌ' سے مراد چشمہ بھی ہو سکتا ہے اور کنواں بھی۔ تورات میں کنویں ہی کا ذکر آیا ہے ویسے پہاڑی چشمے بھی کنووں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ بالعموم ان تک پہنچنے کے راستے نہایت تنگ ہوتے ہیں اس وجہ سے ان پر پانی پینا اور پلانا کوئی سہل کام نہیں ہوتا بالخصوص جب کہ پانی پینے پلانے والوں کی بھیڑ بھی ہو۔

ایک امر کا حضرت موسیٰ پر اثر

حضرت موسیٰ مدین پہنچے تو اس کے کنویں یا چشمے پر بیٹھ گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ چرواہوں کی ایک بھیڑ اپنے اپنے گلوں کو پانی پلا رہی ہے اور دو عورتیں اپنے گلے کو روکے ہوئے ان سے پرے

کھڑی ہیں۔ لفظ 'تَذُوْدٰنِ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا گلہ تو گھاٹ پر پہنچ کر پانی پینے کے لیے آگے بڑھنے کے لیے زور لگا رہا ہے لیکن ان بیچاریوں کو زبردستی اس کو پیچھے ہٹانا پڑ رہا ہے۔ انھوں نے ان سے پوچھا کہ تمھارے سامنے کیا مشکل ہے؟ یہاں آ کر تم اپنے گلے کو کیوں روکے کھڑی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے باپ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں گلے کی دیکھ بھال ہمیں کرنی پڑ رہی ہے اور ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس بھیڑ کے اندر گھس کر اپنے گلے کو پانی پلا سکیں اس وجہ سے ہمیں چرواہوں کے واپس ہونے تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جب تک وہ اپنے گلے ہٹا نہ لیں ہم اپنے گلے کو پانی نہیں پلا سکتے۔

فَسَقٰی لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓی اِلَی الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (۲۴)

حضرت موسیٰ کا جذبۂ حمایت ضعیف

ان شریف زادیوں کی یہ بات سن کر حضرت موسیٰ کا جذبۂ حمایتِ ضعیف بھڑک اٹھا۔ وہ اٹھے اور ان کی بکریوں کو انھوں نے پانی پلایا۔ اور پانی پلا کر پھر اسی سایہ میں آ کر بیٹھ گئے جس کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور دعا فرمائی کہ اے رب! اس وقت جو چیز بھی تو میرے لیے نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔

چند قابل توجہ باتیں

یہاں چند باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت موسیٰ کو یہ بات نہایت اہم محسوس ہوئی کہ دو شریف لڑکیوں کو بکریاں چرانے کا پُر مشقت کام کرنا پڑ رہا ہے اور وہ اس بے بسی کے ساتھ عین گھاٹ کے سامنے اپنی بکریوں کو روکے کھڑی ہیں۔ حضرت موسیٰ کے اس احساس کا اظہار ان کے 'مَا خَطْبُکُمَا' کے سوال سے ہو رہا ہے۔ عربی میں لفظ 'خَطْبٌ' کسی امر عظیم و اہم ہی کے لیے آتا ہے اس وجہ سے ان کے اس سوال کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ تمھیں کیا افتاد اور مشکل پیش آئی ہے کہ بکریوں کی چرواہی کی یہ پُر مشقت خدمت تمھیں انجام دینی پڑ رہی ہے اور تم اس طرح اپنی بکریوں کو یہاں روکے کھڑی ہو۔ صاحبزادیوں نے حضرت موسیٰ کے سوال کو بالکل ٹھیک ٹھیک سمجھ کر جواب دیا کہ یہ خدمت ہمیں اس لیے انجام دینی پڑ رہی ہے کہ ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں اور ہم اپنی بکریوں کو اس لیے روکے کھڑی ہیں کہ ہم مردوں کی اس بھیڑ میں نہیں گھس سکتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دور میں بھی عورتوں اور مردوں کے دائرۂ کار الگ الگ سمجھے جاتے تھے اور اگر عورتوں کو کسی مجبوری کے سبب سے کوئی اس طرح کی خدمت انجام دینی ہی پڑتی تھی جو مردوں کے دائرۂ کار سے تعلق رکھنے والی ہو تو اس کو انجام تو دیتی تھیں لیکن محض بربنائے مجبوری اور وہ بھی مردوں کے شانہ بشانہ اور ان کے اندر گھل مل کر نہیں بلکہ پوری احتیاط اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ، حتی الامکان مردوں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے۔ ایک طرف حضرت شعیبؑ کے زمانے کے اس معاشرتی تصور کو سامنے رکھیے جس کی شہادت حضرت شعیبؑ کی صاحبزادیوں اور حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ سے ملتی ہے۔ دوسری طرف اپنی قوم کے ان سماجی مصلحین کے دعوے پر غور کیجیے جو کہتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں کا دائرۂ کار بالکل ایک ہی ہے اس لیے دونوں کو ہر میدان میں بالکل شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے۔ یہ حضرات دلیل تو اپنے

دعوے پر دیہاتوں کی غریب عورتوں کی زندگی سے پیش کرتے ہیں لیکن نتیجہ اس سے شہروں کی بیگمات کے لیے اخذ کرتے ہیں۔

دوسری چیز اس واقعہ میں قابلِ توجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حمایتِ ضعیف کا حق تو فوراً پوری مستعدی سے ادا کر دیا کہ یہ ان کی فتوت و مروّت کا تقاضا تھا لیکن اس کے بعد ایک حرف بھی ان صاحبزادیوں کے سامنے ان کی زبان سے ایسا نہیں نکلا جس سے ان کی کسی پریشانی یا مسافرت یا ضرورت کا اظہار ہو بلکہ جس سایہ سے ان کی مدد کے لیے اٹھے تھے اسی سایہ میں آ کر پھر بیٹھ گئے اور اپنے رب سے دعا کی کہ اے رب جس منزل کو سامنے رکھ کر میں نے ادھر کا رخ کیا تھا وہ تو آ گئی اب بس تیرے فضل و رحمت کا انتظار ہے، تو جو خیر بھی اس مرحلے میں میرے لیے نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔ اس دعا کی بلاغت کی تعبیر سے زبانِ قلم قاصر ہے۔ صرف اہلِ ذوق ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ چونکہ یہ دعا بالکل صحیح وقت پر، صحیح جذبے کے ساتھ اور بالکل صحیح الفاظ میں زبان سے نکلی اس وجہ سے اس کا اثر بلا کسی تاخیر کے ظاہر ہوا۔ صاحبزادیوں نے حضرت موسیٰؑ کے اس احسان کا ذکر اپنے باپ سے کیا اور اس طرح حضرت موسیٰؑ کے لیے اس خیر کی راہ کھل گئی جس کے لیے انھوں نے دعا فرمائی تھی۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۲۵)

حضرتِ موسیٰؑ کے لیے خیر کی راہ

حضرت موسیٰؑ ابھی سایہ ہی میں بیٹھے تھے کہ ان میں سے ایک صاحبزادی لجاتی شرماتی ہوئی آئیں اور بولیں کہ آپ کو ہمارے والد ماجد بلاتے ہیں کہ آپ نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا آپ کو صلہ دیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز صاحبزادیاں چونکہ معمول کے خلاف وقت سے پہلے فارغ ہو کر گھر پہنچ گئیں اس وجہ سے حضرت شعیبؑ نے ان سے پوچھا کہ آج تم اتنی جلدی کیسے چلی آئیں؟ اس پر انھوں نے بتایا کہ آج ایک مصری نے ہم پر یہ احسان کیا کہ اس نے ہماری بکریوں کو خود بھر کر پانی پلا دیا۔ حضرت شعیبؑ نے ان سے فرمایا تم نے ان کو چھوڑ کیوں دیا؟ جا کر ان کو بلا لاؤ کہ ہمارے ہاں روٹی کھائیں۔ باپ کے حکم کی تعمیل میں ایک صاحبزادی حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بولیں کہ آپ کو ہمارے والد بلاتے ہیں کہ آپ نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا صلہ دیں۔ حضرت موسیٰؑ اس وقت اس طرح کی کسی مدد کے نہایت محتاج تھے۔ اس کو انھوں نے ایک تائیدِ غیبی سمجھا اور فوراً اس کے ساتھ ہو لیے۔

شریف بیبیوں کے اطوار

یہاں تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ کے الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اوپر مِنْ دُوْنِهِمُ کے الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ وہ چرواہوں کی بھیڑ سے بالکل الگ کھڑی ہوتی تھیں۔ یہ بات بھی اوپر گزر چکی ہے کہ انھوں نے اپنی اس کنارہ کشی کی علت یہ بیان فرمائی کہ مردوں کی بھیڑ سے بچنے کے لیے انھیں یہ زحمت اٹھانی پڑتی ہے کہ جب تک چرواہے یہاں سے ہٹ نہ جائیں وہ انتظار کرتی ہیں۔ پھر یہاں

فرمایا کہ جب وہ حضرت موسیٰ کو بلانے کے لیے آئیں تو شرماتی ہوئی آئیں۔ یعنی یہ نہیں کیا کہ آکر بے دھڑک حضرت موسیٰ کے سامنے کھڑی ہو جائیں بلکہ سمٹی سمٹائی، کپڑوں کو سنبھالے اور اپنی احتیاط کی جگہوں کو محفوظ کیے ہوئے آئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ واقعہ کی یہ جزئیات قرآن نے اس تجزرسی کے ساتھ کیوں بیان فرمائی ہیں؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن ہر قدم پر یہ نمایاں کرنا چاہتا ہے کہ شریفانہ زندگی کے عادات و اطوار کیا ہیں اور شریف بی بیوں کو مردوں کے معاملے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہی شریفانہ عادات و اطوار ہیں جن کو قرآن نے ایک ضابطہ کی صورت میں سورۂ نور اور سورۂ احزاب میں ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ سورۂ نور کی تفسیر میں اس ضابطہ کی وضاحت ہم کر چکے ہیں اور خدا نے چاہا تو احزاب کی تفسیر میں اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رکھیے کہ یہ ان خواتین کے عادات و اطوار بیان ہوئے ہیں جنھیں اپنی بکریوں کی چرواہی کرنی پڑتی تھی۔ تو جب ان کے لیے عند اللہ پسندیدہ روش یہ ہے تو ان خواتین کے لیے پسندیدہ روش کیا ہو گی جن کو اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں ہے!

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔

حضرت موسیٰ حضرت شعیبؑ کی خدمت میں

حضرت شعیبؑ کی اس دعوت پر حضرت موسیٰ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنی ساری داستان سنائی۔ حضرت شعیبؑ نے ان کا سارا ماجرا سن کر فرمایا کہ اب تم کوئی اندیشہ نہ کرو۔ خدا نے ظالموں سے تمھیں نجات دی۔ گویا اس طرح حضرت موسیٰؑ کو ان کی اس دعا کی قبولیت کی بشارت مل گئی جو انھوں نے مصر سے نکلتے ہوئے بدیں الفاظ فرمائی تھی۔ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۖ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (۲۶)

یہاں اِحْدٰىهُمَا کے اعادے سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰ کے حق میں یہ سفارش حضرت شعیبؑ کی دوسری صاحبزادی نے فرمائی۔ اگر انھی نے یہ سفارش کی ہوتی جو ان کو بلانے کے لیے گئی تھیں تو یہاں فاعل کے اعادے کی ضرورت نہیں تھی۔

صاحب کردار کے کردار کا اندازہ ایک نظر میں ہو جاتا ہے

حضرت شعیبؑ کو اپنے گلے کی دیکھ بھال کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تو تھی ہی اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ کسی موزوں آدمی کی تلاش میں بھی تھے۔ اس وجہ سے صاحبزادی صاحبہ نے سفارش کی کہ انھی کو ملازم رکھ لیجیے۔ بہترین ملازم وہی ہوتا ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔ یہ قوی بھی ہیں اور ساتھ ہی امانت دار بھی۔ جہاں تک جسمانی صحت و قوت کا تعلق ہے یہ ایک ایسی کھلی ہوئی چیز ہے کہ آدمی بیک نظر اس کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن امانت و دیانت کا تعلق کردار سے ہے جس کا صحیح صحیح اندازہ تجربہ سے ہوتا ہے۔ یہ تجربہ عام حالات میں تو بہت دیر میں ہوتا ہے لیکن بعض حالات میں بالکل باول وہلہ ہو جاتا ہے۔ آدمی کی پیشانی اور اس کی نگاہیں گواہی دیتی ہیں کہ یہ کس کردار کا آدمی ہے۔ صاحبزادی صاحبہ نے حضرت موسیٰؑ کی مروت، بے نیازی اور پاکیزہ نگاہی کا تجربہ تو خود ہی کر لیا تھا پھر ان کی نبوت کی وہ سرگزشت، جو

حضرت موسیٰ نے حضرت شعیب کو سنائی، سن کر ان پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی کہ اس عزم و ہمت کے آدمی کے اندر اگر امانت و دیانت نہ ہوگی تو بھلا کس میں ہوگی!

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۲۷)

حضرت شعیب کا پیشکش

حضرت شعیب نے حضرت موسیٰ کے سامنے یہ پیش کش فرمائی کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح اس شرط پر تمھارے ساتھ کر دوں کہ تم آٹھ سال میری خدمت کرو اور اگر تم نے دس سال پورے کر دیے تو یہ تمھاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں اس معاملے میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ ویسے ان شاءاللہ تم مجھے بھلے آدمیوں میں سے پاؤ گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ حضرت شعیبؑ نے یہ پیش کش اشارۂ غیبی پر فرمائی ہوگی اور ان کا یہ ارشاد کہ 'وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ' حضرت موسیٰ کو معاملہ پر غور کر کے فیصلہ کرنے کے لیے ایک مہلت تھی کہ وہ اس شرط پر اچھی طرح غور کر کے فیصلہ کریں، ان کے دباؤ میں آ کر مجبورانہ کوئی فیصلہ نہ کریں۔

یہاں مہر کے معاملے پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ مہر کا تعلق کلیۃً لڑکی کی مرضی سے ہے۔ اگر باپ اس کا نکاح کسی ایسی شرط پر کر دے جو جائز ہو اور لڑکی اس پر راضی ہو تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

قَالَ ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكَ ؕ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ (۲۸)

حضرت موسیٰ کی طرف سے پیش کش کی منظوری

حضرت موسیٰ نے یہ پیشکش اور یہ شرط دونوں منظور کر لیں۔ فرمایا کہ ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر سکا مجھے اس کا اختیار حاصل رہے گا۔ 'نَقُوْلُ' یہاں قول و قرار اور عہد و پیمان کے مفہوم میں ہے یعنی اس وقت ہم جو قول و قرار کر رہے ہیں اس پر ہم اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ (۲۹)

مصر کو واپسی اور جلوۂ طور کا مشاہدہ

حضرت موسیٰ موعودہ مدت پوری کرنے کے بعد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مصر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس بات کی تصریح قرآن یا تورات میں نہیں ہے کہ انھوں نے آٹھ سال کی مدت پوری کی یا وہاں دس سال گزارے۔ البتہ تورات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ بیوی کے سوا آپ کے دو بچے بھی تھے۔ جب جبل طور کے قریب پہنچے تو رات اندھیری تھی اور سردی بھی تھی۔ اندھیرے میں راستہ کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اتنے میں طور کی جانب سے آگ کی ایک چمک سی دکھائی دی۔ آپ نے بیوی بچوں سے فرمایا، تم لوگ یہیں

ٹھہرو۔ مجھے آگ کی جھلک نظر آئی ہے ـــ میں وہاں جاتا ہوں ـــ اگر وہاں کچھ لوگ ہوئے تو راستہ کی خبر لاتا ہوں ورنہ آگ ہی کا ایک انگارہ لاؤں تاکہ تم لوگ تاپ سکو۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیِٔ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۳۰)

اس آیت کے تمام اجزاء کی وضاحت سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نمل وغیرہ کی تفسیر میں پیچھے گزر چکی ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ اس جگہ پہنچے جہاں سے ان کو آگ نظر آئی تھی تو وادیٔ مبارک کے کنارے سے، جو مبارک خطہ میں تھی، ایک خاص درخت سے یہ آواز آئی اے موسیٰ! یہ تو میں ہوں، اللہ، عالم کا خداوند۔

یہاں آواز کی نشان دہی کے لیے تین ظرف مذکور ہوئے ہیں، ایک یہ کہ یہ آواز وادیٔ مبارک کی سمت سے آئی، دوسرا یہ کہ یہ وادی، مبارک خطہ میں تھی، تیسرا یہ کہ یہ آواز ایک خاص درخت سے آئی۔ ان تمام تعینات کے ذکر سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت موسیٰ کو یہ آواز فضائے لامتناہی کے اندر ایک مبہم و بے جہت آواز کی صورت میں نہیں بلکہ متعین جہت و مقام کے ساتھ ایک مبارک وادی، ایک مبارک خطہ اور ایک مبارک درخت سے سنائی دی۔ کسی وادی یا خطہ یا درخت کا مبارک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے نور و ظہور کے لیے انتخاب فرمایا اور اس کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ اس کے تقدیسوں کی جلوہ گاہ اور ہر قسم کی شیطانی دراندازی سے پاک و محفوظ ہو۔ سورۂ نمل کی آیت ۸ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

پہلی آواز جو حضرت موسیٰؑ کو سنائی دی

'اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ' اوپر کے ٹکڑے میں آواز کے محل و مقام کی پاکی و برتری کا اظہار تھا۔ یہ وہ آواز ہے جو سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کو سنائی دی۔ ارشاد ہوا کہ تم تو آگ سمجھ کر یہاں آگ لینے آئے ہو لیکن یہاں آگ نہیں بلکہ میں ہوں، اللہ، عالم کا خداوند! یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات والا صفات کا تعارف کرایا ہے۔ 'رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ' کے مضمرات بہت وسیع ہیں اس وجہ سے بعض مقامات میں یہی مضمون دوسرے الفاظ میں بھی وارد ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ نمل میں ہے اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ' یہ اسی 'رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ' ہی کے مضمون کی وضاحت دوسرے الفاظ میں ہے۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ (۳۱)

پہلا معجزہ

ساتھ ہی یہ ہدایت ہوئی کہ اپنا عصا زمین پر ڈال دو۔ حضرت موسیٰؑ نے اس ہدایت کی تعمیل کی تو دیکھا کہ عصا سانپ کی طرح حرکت کرنے لگا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ سخت دہشت زدہ ہوئے اور اس طرح پیچھے کو بھاگے کہ اس کی طرف مڑ کے دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کی۔ 'وَلَمْ یُعَقِّبْ' کی وضاحت سورۂ نمل کی آیت کے تحت ہو چکی ہے۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو نبوت کے ابتدائی مشاہدات بالکل بے سان گمان پیش آتے ہیں، نہ ان کے ذہن میں پہلے سے ان کا کوئی تصور ہوتا، نہ ارمان، اس وجہ سے شروع شروع میں وہ ان سے گھبراتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو بالتدریج ان سے مانوس کر دیتا ہے۔ ساحروں، کاہنوں، متنبیوں اور مفتریوں کے ذہن میں تو پہلے سے ایک اسکیم ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے بہت سے پاپڑ بیلتے ہیں اور جب ان کو عوام فریبی کے لیے کوئی اشغلہ ہاتھ آجاتا ہے تو اس کو اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھتے ہیں لیکن حضرات انبیائے کرام اس قسم کے وساوس سے بالکل پاک ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو کوئی معجزہ دیا جاتا ہے تو وہ ان کے لیے ایک بالکل انوکھی چیز ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ جس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے جانے والے تھے اس کے ساحروں کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنا دیتے اور اس فن کو حاصل کرنے کے لیے نہیں معلوم وہ کیا کیا ریاضتیں کرتے اور جب اس میں کامیاب ہو جاتے تو سمجھتے کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی مراد حاصل ہو گئی لیکن حضرت موسیٰؑ کا حال یہ ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی لاٹھی کو سانپ بنا دیا تو وہ اس سے خوف زدہ ہو کر بھاگے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے اس ابتدائی مشاہدہ کے اس پہلو کو خاص طور پر اسی لیے نمایاں فرمایا ہے کہ آپ کے جس معجزے کو فرعونیوں نے سحر و ساحری کا کرشمہ قرار دیا اس کو دیے جانے کے وقت حضرت موسیٰؑ پر کیا گزری!

حضرات انبیاءؑ پر ابتدائی مشاہدات کا اثر

یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ قف اِنَّکَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ۔ حضرت موسیٰؑ پر یہ اضطراری دہشت جب طاری ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے نہایت رافت کے ساتھ ان کو اطمینان دلایا کہ اے موسیٰؑ! آگے بڑھو، اس کو اٹھاؤ، اس سے تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ خطرہ ہے تو تمہارے دشمنوں کے لیے ہے تم ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو۔ سورۂ نمل میں یہی مضمون لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی تم تو ہمارے ایک رسول ہو۔ ہم اپنے رسولوں کو اپنے خاص اسلحہ سے مسلح کرتے ہیں۔ ان سے جو خطرہ پیش آتا ہے وہ ہمارے دشمنوں کو پیش آتا ہے نہ کہ ہمارے رسولوں کو۔

اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ز وَّاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ فَذٰنِکَ بُرْھَانٰنِ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِہٖ ط اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ (۳۲)

دوسرا معجزہ اور اس کے ظہور کا طریقہ

یہ دوسرے معجزے کے ظہور کا طریقہ بتایا گیا کہ تم اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو، پھر جب اس کو نکالو گے تو وہ بغیر کسی مرض کے چٹا سفید نکلے گا۔ وَاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ' یہ ہاتھ کو گریبان میں ڈالنے کا طریقہ بتایا گیا کہ جس طرح کوئی شخص ڈر سے اپنے بازو بھینچ لیتا ہے اسی طرح تم اپنا ہاتھ بازو کے اندر ڈال کر اس کو بھینچ لو۔ یہی مضمون سورۂ طٰہٰ میں یوں بیان ہوا ہے۔

وَاضْمُمْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ	اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان کی طرف سکیڑ لو وہ
بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (۲۲)	وہاں سے بغیر کسی مرض کے سفید برآمد ہوگا۔

مِنَ الرَّهْبِ' یہاں اسی طرح آیا ہے جس طرح دوسرے مقامات میں 'مِنَ الذُّلِّ' یا 'مِنَ الرَّحْمَةِ' وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۔

'اِلٰی' سے پہلے یہاں کوئی فعل محذوف ہے جس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں، آگے بھی آرہی ہیں۔ یعنی اپنے رب کی طرف سے ان دو واضح نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جاؤ۔ 'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ' میں اس بات کی توجیہ ہے کہ تمھیں ان عظیم نشانیوں سے کیوں مسلح کیا گیا ہے اور فرعون اور اس کی قوم کے پاس تمھیں کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ اس لیے کہ وہ بڑے ہی نافرمان اور سرکش ہو گئے ہیں۔ ان کو اس سرکشی کے انجام سے آگاہ اور ان واضح نشانیوں کے ذریعہ سے ان پر حجت تمام کر دو۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (۳۳)

حضرت موسیٰؑ کا ایک اندیشہ

حضرت موسیٰ اس عظیم مہم کے لیے حکم الٰہی کی تعمیل میں تیار تو ہو گئے لیکن ساتھ ہی اپنے ایک اندیشہ کا بھی انھوں نے اظہار فرمایا کہ میں نے ان کے ایک آدمی کو قتل کیا ہے اس وجہ سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے دیکھتے ہی قتل کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ کا مطلب یہ تھا کہ یوں تو میں آٹھ دس سال باہر گزارنے کے بعد مصر جا رہا ہوں اس وجہ سے گمان ہے کہ شاید وہ اس واقعہ کو بھول چکے ہوں لیکن ایک رسول کی حیثیت سے اگر میں ان کے پاس گیا تو بھلا وہ کب مجھے معاف کرنے والے ہیں۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِیْٓ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ (۳۴)

'رِدْءًا' کے معنی مددگار و معین کے ہیں۔ دوسرے مقامات میں اسی مفہوم کے لیے 'وزیر' استعمال ہوا ہے۔

'يُّصَدِّقُنِیْ' یعنی 'يُؤَيِّدُنِیْ' وہ میری مدد کریں۔

حضرت ہارونؑ کے تعاون کی درخواست

یہ حضرت موسیٰ نے اپنی ایک اور مشکل کا اظہار فرمایا۔ سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وہ اپنی اس عظیم ذمہ داری کے اعتبار سے اپنی قوتِ بیان میں کمی محسوس فرماتے تھے اس وجہ سے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست بھی کی کہ میرے بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں، انھیں اس کام میں میرا مددگار بنا دے کہ وہ میری تائید و مدد کریں۔ یہی بات دوسرے مقام میں یوں مذکور ہوئی ہے كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا (طٰہٰ ۳۳-۳۴) (تاکہ ہم دونوں مل کر تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح کریں اور تیرا زیادہ سے زیادہ چرچا پھیلائیں) ـــــ 'اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ' یعنی مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ میری بات آسانی سے نہیں مانیں گے بلکہ مجھے جھٹلانے کی کوشش کریں گے اس وجہ سے میری مدد ایک فصیح اللسان

آدمی کے ذریعہ سے فرما کہ ہم دونوں مل کر پوری قوت سے ان پر اتمام حجت کریں۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ أَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُونَ (۳۵)

'سُلْطٰنٌ' سے مراد یہاں غلبہ، دبدبہ اور ہیبت ہے۔

'بِاٰیٰتِنَا' میں دو امکان ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو 'نَجْعَلُ لَکُمَا سُلْطٰنًا' سے متعلق مانیے یعنی ہم اپنے معجزات کے ذریعہ سے فرعونیوں پر تمہارا دبدبہ قائم کر دیں گے۔ دوسرا یہ کہ اس سے پہلے کوئی محذوف مانیے جس کی مثال اوپر آیت ۳۲ میں گزر چکی ہے۔

فرعونیوں پر حضرت موسیٰؑ کا رعب

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی درخواست حضرت ہارونؑ کے بارے میں منظور فرمالی اور ساتھ ہی ان کو یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ تم خاطر جمع رکھو، ہم فرعونیوں پر تمہارا ایسا رعب و دبدبہ قائم کر دیں گے کہ وہ تم پر دست درازی کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان پہلے ہی مقابلے میں حضرت موسیٰؑ سے اتنے مرعوب ہو گئے کہ ان سے پیچھا چھڑانے کی دلی تمنا رکھنے اور اپنی تمام سطوت و طاقت کے باوجود ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس کا بڑا سبب جو تورات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے یہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان حضرت موسیٰؑ کو جھوٹا آدمی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو یقین تھا کہ یہ سچے آدمی ہیں۔ لیکن ان کی دعوت چونکہ ان کو اپنے مفاد کے خلاف نظر آتی تھی اس وجہ سے اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تاہم وہ جانتے تھے کہ اگر ہم نے ان کو کوئی گزند پہنچایا تو ہماری خیر نہیں ہے۔ اس وجہ سے تمام عناد و مخاصمت کے باوجود انھوں نے ان کے قتل کی جرأت نہیں کی۔ تورات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ جب مصر پر کوئی آفت آتی تو وہ حضرت موسیٰؑ ہی سے درخواست کرتے کہ وہ اپنے رب سے دعا کریں کہ یہ آفت ٹل جائے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۳۶)

حضرت موسیٰؑ کے معجزات اور ان کی دعوت کی مخالفت

جب حضرت موسیٰؑ ان روشن اور ناقابلِ تردید نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس آئے تو انھوں نے ان کے معجزات کو تو جادو کا کرشمہ قرار دیا اور ان کی دعوتِ توحید کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ یہ ہمارے آباؤ اجداد کی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ 'سِحْرٌ مُّفْتَرًی' یعنی حضرت موسیٰؑ یہ کرشمے دکھاتے تو ہیں اپنے جادو کے زور سے لیکن ہم پر رعب جمانے کے لیے جھوٹ دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ معجزے ہیں جو ان کو خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ 'مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ' کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ توحید کی طرف ہے۔ یعنی ان کا یہ دعویٰ کہ یہ رب العلمین کے رسول ہیں بالکل انوکھا اور نرالا دعویٰ ہے۔ ہم نے اپنے اگلوں سے کسی رب العالمین کا ذکر کبھی نہیں سنا۔ آگے آیت ۳۸ میں اس کی

وضاحت آرہی ہے۔ یہ بعید کی بات ہے جو دوسرے مقامات میں مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ کے الفاظ میں گزر چکی ہے۔

وَقَالَ مُوسٰى رَبِّيْ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۳۷)

مستقبل سے متعلق حضرت موسیٰ کا چیلنج — یہ مستقبل سے متعلق حضرت موسیٰ کا ان کو چیلنج ہے کہ تم لوگ مجھے مفتری قرار دے رہے ہو تو میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور کون لوگ جانتے بوجھتے اس کو جھٹلا رہے ہیں؟ کن کو انجام کار کی کامیابی حاصل ہونے والی ہے اور کون مغلوب و نامراد ہونے والے ہیں؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ حضرت موسیٰ نے نہایت بلیغ اور شائستہ اسلوب میں یہ اعلان فرما دیا کہ میں اور میرے ساتھی ان شاء اللہ غالب و فتحمند رہیں گے اور تم لوگ ذلیل و خوار ہو کر رہو گے۔

یعنی یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کی تکذیب کریں گے وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور یہ ظالم ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ اسلوب کلام دلیل ہے کہ یہاں مقابل کا جملہ حذف ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (۳۸)

'ھامان' کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ یہاں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو فرعون کے وزیر اعظم یا کم از کم وزیر تعمیرات کی حیثیت حاصل تھی۔

فرعون کا استہزاء — 'اَوْقِدْ عَلَى الطِّيْنِ' کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اینٹوں کا پزاوہ لگوا اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مٹی کی عمارت بنوا کر اس پر آگ دہکا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نینوا اور مصر وغیرہ میں تعمیر کا یہ طریقہ معروف رہا ہے کہ مٹی کا مکان بنا کر اس پر خوب آگ دہکاتے جس سے دیواروں پر مینا کاری کی صورت پیدا ہو جاتی اور وہ بارش و ہوا کے اثرات سے بالکل محفوظ ہو جاتیں۔

'لَعَلِّيْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى' میں 'اِلٰى' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تضمین ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے: 'لعلّی اَطّلع علی الصرح فانظر الی الٰہ موسٰی' ظاہر ہے کہ اس نے یہ بات محض حضرت موسیٰ کا مذاق اڑانے کے لیے کہی۔ سورۂ زخرف کی آیت ۴۶ سے بھی اس کی نوعیت محض مذاق و استہزاء ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

فرعون نے پہلے تو اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے کہا کہ موسیٰ (علیہ السلام) جس رب العالمین کے رسول بن کر وارد ہوتے ہیں مجھے تو اس رب العٰلمین کا کوئی علم نہیں ہے۔ تمہارا معبود اپنے سوا میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس فتنہ سے تم لوگ ہوشیار رہو۔ اس کے بعد ہامان سے مخاطب ہو کر اس نے کہا کہ اے ہامان!

تم پر کرو کہ اینٹوں کا پزاوہ لگوا کر ایک اونچی عمارت بنواؤ تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے رب کو جھانک کر دیکھوں کہ وہ کہاں بیٹھا ہوا ہے! میں تو اس شخص کو بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ فراعنہ و متمردین بسا اوقات نہایت واضح حقائق کا اسی طرح مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے اندھے پیروکاروں کے لیے یہی مذاق دلیل بن جاتا ہے بلکہ کتنے احمق تو اس کے مذاق کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ فرعون کے پرستاروں کے لیے کچھ بعید بھی نہیں کہ وہ اس کو حقیقت سمجھے [illegible] رہے ہوں۔ اس کی حیثیت مصریوں کے نزدیک ان کے سب سے بڑے دیوتا — سورج — کے اوتار کی تھی۔ ایک اوتار کے لیے آسمانوں کے اطراف و جوانب میں جھانک لینا کیا مشکل ہے! سورۂ مومن میں اس کا یہ قول یوں نقل ہوا ہے۔ یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ (المومن ۴۰: ۳۶-۳۷) (اے ہامان، میرے لیے ایک اونچی عمارت بنوا تاکہ میں آسمانوں کے اطراف میں پہنچوں) اس پہلو سے اس کی یہ بات اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ (۳۹)

استکبار بغیر الحق

'یَبْغُوْنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ وہی مفہوم 'اِسْتِکْبَارٌ بِغَیْرِ الْحَقِّ' کا بھی ہے۔ اس زمین و آسمان میں استکبار کا حق صرف اس کو حاصل ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کے نظام کو چلا رہا ہے۔ جن کو نہ ان کے خلق میں کوئی دخل اور نہ جن کا ان کے تدبیر و انتظام میں کوئی حصہ، اگر وہ اس میں اکڑیں اور اپنی مالکیت کے مدعی بن کر اٹھیں تو یہ ان کی شامت کی دلیل ہے۔ اس قسم کے استکبار کو اس کائنات کا خالق زیادہ مہلت نہیں دیتا۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اس زمین کے بادشاہ حقیقی کے حکم و قانون کے خلاف کوئی قانون اس میں جاری کرنا بھی 'استکبار بغیر الحق' میں داخل ہے اور یہ ٹھیک ٹھیک اسوۂ فرعون کی پیروی ہے۔

'وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ'۔ یہ اس استکبار کی علت بیان ہوئی ہے کہ وہ اس وجہ سے اس میں مبتلا ہوئے کہ انھوں نے یہ گمان کیا کہ خدا نے ان کو شترِ بے مہار بنا کر چھوڑا ہے اور ان کو اس کے سامنے کبھی جواب دہی کے لیے حاضر ہونا نہیں ہے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۴۰)

استکبار کا انجام

یہ اس استکبار کا انجام بیان فرمایا کہ ہم نے فرعون اور اس کی فوجوں کو پکڑا اور ان کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ ان کے پکڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو تدبیر اختیار فرمائی اس کی پوری تفصیل پچھلی سورتوں، بالخصوص سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں، گزر چکی ہے۔ 'فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ' یہ اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کو واضح کرنے ہی کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور ان فرعونوں کے لیے تنبیہ و تذکیر بھی جو آنحضرتؐ

اور آپ کی دعوت کے معاملے میں بالکل اسی روش پر چل رہے تھے جو روش حضرت موسیٰؑ کے مقابل میں فرعون اور اس کے اعوان و انصار نے اختیار کی تھی۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ (۴۱)

'جَعَلْنَا' یہاں 'اَمْهَلْنَا' کے مفہوم پر متضمن ہے جس کی مثالیں گزر چکی ہیں اور 'يَدْعُوْنَ' سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔

یہ اسی استکبار کے انجام کی مزید تفصیل ہے کہ ہم نے دنیا میں ان کو ڈھیل دی اور وہ جہنم کی طرف دعوت دینے والے لیڈر بنے رہے اور قیامت کے روز ان کا حال یہ ہوگا کہ کسی طرف سے ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ دنیا میں وہ جن کے امام و پیشوا بنے رہے وہ سب ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت ہوگی۔ نہ لیڈر پیرؤوں کے کچھ کام آسکیں گے اور نہ پیرو لیڈروں کے۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ (۴۲)

جس دنیا میں وہ لیڈری اور پیشوائی کرتے رہے اور لوگوں سے اپنے نعرے لگواتے رہے، فرمایا کہ اس میں ہم نے ان کے پیچھے ہمیشہ کے لیے لعنت لگا دی اور آخرت میں بھی وہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ یہی مضمون سورۂ ہود میں یوں بیان ہوا ہے۔

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۝ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝ (هود: ۹۷-۹۹)	تو انھوں نے فرعون کی رائے کی پیروی کی اور فرعون کی رائے صائب نہ تھی۔ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ کے گھاٹ پر اتارے گا اور کیا ہی برا ہوگا یہ گھاٹ! اور اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی، اور کیا ہی برا ہوگا یہ صلہ جو ان کو ملے گا!

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۴۳)

مظلوموں پر انعام

ظالموں کا انجام واضح کرنے کے بعد یہ اس فضل و انعام کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مظلوموں پر فرمایا۔ اور جس کی طرف اس سرگزشت کی تمہید میں 'وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا ... الآیۃ' کے الفاظ سے اشارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے پچھلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰؑ کو کتاب عطا کی۔ اس کتاب کی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگوں کے لیے بصیرت، ہدایت اور رحمت تھی۔ 'بصیرت' یعنی دل و دماغ کی صلاحیتیں اور تعقل و تفکر کی قوتیں بیدار کرنے والی۔ اس کو بصورت جمع لانے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے

کہ وہ ایسی آیات اور ایسے دلائل پر مشتمل تھی جو آنکھیں کھول دینے والی تھیں۔ 'ھُدًی' و 'رَحْمَۃً' کی وضاحت ہم کر چکے ہیں کہ یہ دونوں لفظ جب ساتھ ساتھ آتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آغاز، یعنی اس دنیا کی زندگی میں، ہدایت اور انجام، یعنی آخرت کی زندگی میں رحمت۔

یہ واضح رہے کہ کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب و شریعت کا دیا جانا دنیا کی امامت و پیشوائی دیے جانے کے ہم معنی ہے بشرطیکہ وہ اس نعمت کی قدر کرے۔ بنی اسرائیل کو یہ نعمت سب سے پہلے دی گئی۔ یہاں 'مِنْ بَعْدِ مَآ اَھْلَکْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰی' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ باقاعدہ کتابی شکل میں، اللہ کی یہ سب سے بڑی نعمت سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل ہی کو ملی لیکن انھوں نے اس کتاب کے ساتھ نہایت بے دردانہ سلوک کیا جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وَمَا کُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَآ اِلٰی مُوْسَی الْاَمْرَ وَمَا کُنْتَ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ (۴۴)

آنحضرتؐ کی رسالت کا اثبات

سرگزشت کے آخر میں یہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں جن میں آپؐ کی نبوت کا اثبات ہے اور کلام کا رخ یہود کی طرف بھی ہے اور قریش کی طرف بھی۔ فرمایا کہ تم موسیٰؑ کو کتاب دیے جانے کے وقت نہ تو طور کے مغربی جانب ہی میں موجود تھے جب کہ ہم نے معاملہ کا فیصلہ کر کے اس سے موسیٰؑ کو آگاہ کیا اور نہ ان لوگوں کے ساتھ ہی موجود تھے جو اس وقت پہاڑ کے نیچے موسیٰ کی قوم میں سے تورات کے انتظار میں تھے۔

'بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ' یعنی بجانب الطور الغربی۔

'قَضَیْنَآ اِلٰی مُوْسَی الْاَمْرَ'۔ 'قَضَیْنَا' یہاں 'عَھِدْنَا' کے مفہوم پر متضمن ہے جس طرح دوسرے مقام میں 'عَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ' آیا ہے۔

'وَمَا کُنْتَ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ' میں 'شَاھِدِیْنَ' سے مراد حضرت موسیٰؑ کی قوم کے لوگ ہیں۔ یہ اس وقت کی بات کا حوالہ ہے جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو دامن کوہ میں چھوڑ کر، اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق تورات لینے، تنہا طور پر تشریف لے گئے ہیں۔ اس اثناء میں قوم، طور کے نیچے حضرت موسیٰؑ کا انتظار کرتی رہی اور اسی موقع پر سامری کا فتنہ پیش آیا ہے۔ تفصیل ان تمام واقعات کی پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔

مقصود کلام یہ ہے کہ تورات دیے جانے کے وقت نہ تو تم حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہی موجود تھے اور نہ ان کی قوم ہی کے ساتھ تو آخر یہ ساری سرگزشت اس صحت و صداقت اور اس تفصیل کے ساتھ تمھیں کس طرح معلوم ہوئی؟ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اللہ نے ان باتوں سے تمھیں اپنی وحی کے ذریعہ سے آگاہ فرمایا اور تم اس کے رسول ہو۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ کی سرگزشت جس تفصیل اور جس صحت و صداقت کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہے اس تفصیل و صحت کے ساتھ تورات میں نہیں بیان ہوئی ہے۔ اگر آپ سرگزشت کے اتنے ہی حصے کو لے کر، جتنی اس سورہ میں بیان ہوئی ہے، تورات کے بیان سے اس کا موازنہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن کے بیان کے مقابل میں تورات کا بیان بے ربط اور محرف بھی ہے اور ان تمام ضروری اجزاء سے خالی بھی جو اس سرگزشت کی اصل روح ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ساری باتیں اس صحت و صداقت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح معلوم ہوئیں؟ اگر کوئی ہٹ دھرم یہ کہے کہ آپ نے یہ باتیں اہل کتاب سے سن کر نقل کیں تو یہ بالبداہت غلط ہے۔ جو شخص سنی سنائی بات نقل کرتا ہے وہ مشہور روایت کے مطابق نقل کرتا ہے نہ کہ اس سے بالکل مختلف۔ اور وہ بھی ایسی صحت و تنقید کے ساتھ کہ جو منصف بھی اس کو سنے پکار اٹھے کہ واقعہ کی اصل نوعیت یہ ہے جو قرآن نے بیان کی ہے نہ کہ وہ جو تورات کے راویوں نے پیش کی ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں قرآن اور تورات دونوں کے بیانات کا مقابلہ کر کے دکھاتا کہ تورات میں سرگزشت کے اصل اجزاء یا تو غائب ہیں یا بالکل مسخ شدہ صورت میں ہیں۔ برعکس اس کے قرآن نے واقعہ کے تمام فطری اجزاء ایسے منطقی ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیے ہیں کہ ان کی موعظت و حکمت آپ سے آپ دل میں اترتی جاتی ہے۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (۴۵)

اس آیت کے ابتدائی ٹکڑے کا تعلق اوپر والی آیت سے ہے یعنی تم ان احوال سے واقف نہیں تھے لیکن ہم نے تم کو واقف کیا، اور یہ اس لیے کیا کہ موسیٰ کے بعد ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں تو ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور لوگ ہماری اس کتاب کو بھلا بیٹھے جو ہم نے ان کو ہدایت و رحمت بنا کر عطا کی تھی۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ ہم تمہارے ذریعہ سے اس ہدایت کو از سر نو زندہ کریں۔ یہاں فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ کے بعد فَنَسُوا التَّذْكِرَ یا اس کے ہم معنی الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ۔ یعنی جس طرح تم موسیٰ کو تورات دیے جانے کے وقت، طور کے جانب غربی میں موجود نہیں تھے اسی طرح مدین میں بھی موجود نہ تھے کہ حضرت موسیٰ کے اس دور کے حالات سے واقف ہوسکتے جو انھوں نے مدین میں گزارا یا حضرت شعیب کی دعوت اور ان کی قوم کے انجام سے واقف ہوتے۔ ان چیزوں میں سے تم کسی چیز سے بھی واقف نہ تھے لیکن ہم نے تم کو ان سے واقف کیا کہ جس طرح ہم نے پہلے رسول بھیجے اسی طرح تمہیں رسول بنائیں۔ كُنَّا مُرْسِلِيْنَ اسی طرح کا اسلوب ہے جس طرح كُنَّا فٰعِلِيْنَ ہے۔ یہ اسلوب کلام کسی فیصلہ قطعی اور عزم جازم کے اظہار کے لیے آتا ہے۔

اہلِ مدین کے بعد تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا کے اضافہ سے یہاں اشارہ حضرت شعیبؑ کی سرگزشت کی طرف بھی ہوگیا جو قرآن کی متعدد سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں پر انذار و تبشیر کا فرض انجام دینے پر تم تو مامور نہ تھے لیکن خدا نے تم کو وہاں کے حالات سے بھی باخبر کیا۔ یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ تم سے بھی وہی کام لے جو تم سے پہلے مبعوث ہونے والے رسولوں سے اس نے لیا۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس حقیقت کو نہ سمجھیں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۴۶)

یعنی جس طرح تم مدین میں موجود نہ تھے اسی طرح تم طور کے پہلو میں بھی اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو آواز دی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس آواز دینے کی طرف جس کا ذکر آیت ۳۰ میں گزرا ہے فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ۔ الآیۃ۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان ساری باتوں سے بے خبر تھے لیکن رحمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ وہ تم کو رسول بنائے اس وجہ سے اس نے تم کو ان باتوں سے باخبر کیا اور یہ تمھاری رسالت کی نہایت واضح دلیلیں ہیں۔ رَحْمَةً سے پہلے اَرْسَلْنٰكَ یا اس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف ہے۔

آنحضرتؐ کی بعثت کا مقصد

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ یہ آنحضرتؐ کے اصل مقصد بعثت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارا اہتمام اس لیے فرمایا کہ تم اس قوم کو انذار کرو جس کے پاس اس سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ یہ اشارہ بنی اسماعیل کی طرف ہے۔ یہ لوگ کتاب و شریعت سے بے خبر امی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ان کے اندر کسی رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مطابق، جس کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں، ان کی ہدایت کے لیے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی کے اندر سے مبعوث فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی رحمت ہے، جو ان پر نازل ہوئی ہے اگر یہ اس کی قدر کریں۔ اور اس کے اندر یہ اشارہ بھی ہے کہ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یہ ان کے لیے بہت بڑی نقمت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اگر کوئی قوم خدا کے بھیجے ہوئے منذر کے انذار سے یاددہانی نہیں حاصل کرتی تو وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۷-۶۱

اوپر کی آیات التفات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

آپؐ کی بعثت بہت بڑی رحمت ہے اگر وہ اس کی قدر کریں گے اور یہ بہت بڑی نقمت بھی ہو سکتی ہے انھوں نے اس کی ناقدری کی۔ آگے اسی مضمون کی مزید وضاحت فرمائی ہے کہ اس رسول کی بعثت سے مقصود اتمام حجت ہے۔ اب اگر یہ لوگ کسی عذاب کی گرفت میں آئے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے آگاہ نہیں کیا۔ لیکن ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہ یہودیوں سے سیکھ کر ہمارے پیغمبر پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کو بھی اس قسم کے معجزے کیوں نہیں دیے گئے جس قسم کے معجزے حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے۔ ان سے پوچھو کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم نے کب ان کے معجزات کی قدر کی جو تم سے یہ توقع کی جائے کہ اگر اس قسم کے معجزے تم کو دکھائے گئے تو تم ان کی قدر کرو گے! اسی ضمن میں ان اہل کتاب کی تحسین کی گئی ہے جو اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر قرآن کی تائید اور بڑے صبر کے ساتھ اپنی قوم کے غوغا کا مقابلہ کر رہے تھے۔ نیز قریش کے اس خدشہ کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے قرآن کی دعوت قبول کر لی تو اس ملک سے ان کی جڑ اکھڑ جائے گی۔ ان کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اس دعوت کے قبول کرنے کی صورت میں تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ البتہ اگر انھوں نے اس کو رد کر دیا تو سنتِ الٰہی کے بموجب ان کی تباہی یقینی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۷-۶۱ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا
لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ
اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ۭ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى
مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۣ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾
قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا
يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَاۗءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى
مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا ع ۵
لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ

قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿٥٣﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ
اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٥٤﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ
وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي
الْجٰهِلِيْنَ ﴿٥٥﴾ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى
مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا
يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ
مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ
الْوٰرِثِيْنَ ﴿٥٨﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ
اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى
اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ
ع ٦ ١٠ ٩ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٠﴾
اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿٦١﴾

ترجمۂ آیات ۴۷-۶۱

(اور ہم رسول نہ بھیجتے) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے اعمال کے سبب سے کوئی

آفت آئی تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے بنتے۔ تو جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو کہتے ہیں کہ جس طرح کی چیز موسٰی کو ملی تھی اس طرح کی چیز ان کو کیوں نہ ملی! کیا اس طرح کے لوگوں نے اس چیز کا انکار نہیں کیا جو اس سے پہلے موسٰی کو دی گئی؟ انھوں نے کہا، دونوں ماہر جادوگر ہیں جنھوں نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور کہا کہ ہم ان سب کے منکر ہیں۔ ۴۷ - ۴۸

ان سے کہو کہ اگر تم اس کو جھٹلاتے ہو تو اللہ کے پاس سے کوئی اور کتاب لاؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو، میں اسی کی پیروی کروں گا، اگر تم سچے ہو۔ اگر وہ تمھارا یہ چیلنج قبول نہ کریں تو یقین کرو کہ بس یہ اپنی خواہشوں کے پیرو ہیں۔ اور ان سے بڑھ کر گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔ اللہ ظالموں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۴۹ - ۵۰

اور ہم نے ان کے لیے کلام کے تسلسل کو قائم رکھا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی اس سے پہلے، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب وہ ان کو سنائی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، ہم اس کے آنے سے پہلے سے اس کو ماننے والے رہے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کو دہرا اجر ملے گا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے اور ہم نے جو رزق ان کو دے رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب یہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں

اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، پس ہمارا سلام لو، ہم جاہلوں سے الجھنا پسند نہیں کرتے۔ ۵۱-۵۵

تم جن کو چاہو، ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔ ۵۶

اور وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم تمھارے ساتھ ہو کر اس ہدایت کے پیرو بن جائیں تو ہم اپنے ملک سے اُچک لیے جائیں گے۔ کیا ہم نے ان کو متمکن نہیں کیا ایک مامون حرم میں جس کی طرف خاص ہمارے فضل سے ہر چیز کی پیداواریں کھنچی چلی آرہی ہیں؛ لیکن ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ ۵۷

اور کتنی قومیں اپنے سامانِ معیشت کی ناشکری کرنے والی ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا۔ پس یہ ہیں ان کی بستیاں جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئیں مگر بہت کم، اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔ اور تیرا رب بستیوں کا ہلاک کرنے والا نہیں بنتا جب تک ان کی مرکزی بستی میں کوئی رسول نہ بھیج لے جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنا دے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں بنتے مگر اسی وقت جب ان کے باشندے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بن جاتے ہیں۔ ۵۸-۵۹

اور جو چیز بھی تمھیں عطا ہوئی ہے تو یہ بس حیاتِ دنیا کی متاع اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں! کیا وہ جس سے ہم نے ایک خوش آئند وعدہ کر رکھا ہے پس وہ اس موعود کو لازماً پا کے رہے گا اس کے مانند ہو گا جس کو ہم نے حیاتِ دنیا کی متاع دی ہے پھر وہ قیامت کے دن حاضر کیے جانے والوں میں سے بننے والا ہے۔ ۶۰-۶۱

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْلَآ أَن تُصِيبَهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَيَقُولُوا رَبَّنَا لَوْلَآ أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا
فَنَتَّبِعَ ءَايَٰتِكَ وَنَكُونَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ (۴۷)

'لَوْلَا' کا جواب، اگر قرینہ واضح ہو تو حذف ہو جایا کرتا ہے۔ یہاں بھی حذف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

بنو اسماعیل پر احسان و ان کو تنبیہ

یہ قریش یا بالفاظ دیگر بنی اسماعیل پر احسان بھی ہے اور ان کو تنبیہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو بغیر کسی رسول کی بعثت کے بھی، ان کے اعمال کی پاداش میں، ان کو پکڑ لیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تاکہ وہ یہ عذر نہ کر سکیں کہ اگر ہمارے پاس خدا کوئی رسول بھیجتا تو ہم اللہ کی آیات کی پیروی کرنے والے اور رسول پر ایمان لانے والے بنتے۔ ان کے اس عذر کو ختم کر دینے اور ان پر حجت تمام کر دینے کے لیے ہم نے ان کے اندر اپنا رسول بھی بھیج دیا ہے۔ اب اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یاد رکھیں کہ ان پر اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور فطرت کی جو روشنی عطا فرمائی ہے وہ بھی انسان کو گمراہی اور بدعملی کی زندگی سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ مجرد اس فطری ہدایت ہی کی بنا پر لوگوں کو ان کی بدعملیوں کی سزا دیتا تو یہ بات عدل کے خلاف نہ ہوتی لیکن مزید اتمام حجت و قطع عذر کے لیے اس نے اپنے رسول بھی بھیج دیے جس کے بعد کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اسی وجہ سے سنت الٰہی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جس قوم نے بھی رسول کی تکذیب کی وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ ٱلْحَقُّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا لَوْلَآ أُوتِيَ مِثْلَ مَآ أُوتِيَ مُوسَىٰٓ ۚ أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَآ أُوتِيَ
مُوسَىٰ مِن قَبْلُ ۖ قَالُوا سِحْرَانِ تَظَٰهَرَا وَقَالُوٓا إِنَّا بِكُلٍّ كَٰفِرُونَ (۴۸)

لفظ 'حق' یہاں رسول اور کتاب دونوں پر مشتمل ہے اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے بالکل ایک ہیں۔ 'مِنْ عِنْدِنَا' اس حق کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حق ہے اس وجہ سے اب وہ سب کچھ جو اس کے خلاف ہے باطل اور مٹ جانے والی چیز ہے۔

یہود کا سکھایا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب

فرمایا کہ ہم نے تو اتمام حجت، قطع عذر اور شکوک و اوہام کے ازالہ کے لیے خاص اپنے پاس سے حق نازل فرمایا لیکن یہ لوگ یہ معارضہ کر رہے ہیں کہ ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں دیے گئے جس قسم کے حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے!

قرینہ دلیل ہے کہ اس اعتراض کو پھیلایا تو قریش نے لیکن اس کے سکھانے والے یہود تھے۔ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ اس دور میں یہود نے قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکسانے

کے لیے درپردہ ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ یہ انھی کا چھوڑا ہوا شوشہ ہے۔ انھوں نے قریش کو یہ سکھایا کہ یہ اللہ کے رسول ہونے کے مدعی ہیں لیکن رسول یوں ہی نہیں آیا کرتے۔ ہمارے رسول کو تو فلاں فلاں معجزے عطا ہوئے تھے تو آخر اللہ تعالیٰ نے اس طرح کا کوئی معجزہ ان کو کیوں نہیں دیا۔ قریش اپنی سادہ لوحی کے سبب سے یہود کی چال نہ سمجھ سکے اور بے سمجھے بوجھے یہ اعتراض بھی انھوں نے نقل کرنا شروع کر دیا۔ قرآن نے یہاں اسی کا جواب دیا ہے۔ فرمایا اَوَلَمۡ یَکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ 'کیا انہی کے بھائی بندوں نے ان معجزات کا انکار نہیں کیا جو حضرت موسیٰ کو دیے گئے'۔ یہاں فعل کی نسبت مشابہت قلوب کی بنا پر کی گئی ہے۔ عربی میں فعلوں اور ضمیروں کا اس طرح استعمال معروف ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔ یعنی جب ان کے دلوں کے اندر بھی وہی رعونت ہے جو فرعونیوں کے دلوں میں تھی تو ان کا عمل گویا انہی کا عمل ہے۔ اس جواب کی بلاغت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اس بات کو بھی پیش نظر رکھیے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ اس اعتراض کے سکھانے والے دراصل یہود تھے۔

'قَالُوۡا سِحۡرٰنِ تَظٰہَرَا' لفظ 'سحر' یہاں ساحر کے مفہوم میں ہے لیکن اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے جس طرح 'زید عدل' استعمال ہوتا ہے۔ اور 'تظاہر' کے معنی تعاون اور گٹھ جوڑ کرنے کے ہیں۔ یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ نے جو شاندار معجزے دکھائے تو ان پر ایمان لانے کے بجائے فرعون اور اس کے اعیان نے کہا کہ یہ دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں اور انھوں نے ہمارے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ 'وَقَالُوۡۤا اِنَّا بِکُلٍّ کٰفِرُوۡنَ' یعنی خواہ یہ کچھ ہی کرتب دکھائیں اور کتنا ہی زور لگائیں ہم ان پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ہم ان دونوں کے بھی منکر ہیں اور ان کے ان سارے کرشموں کے بھی۔

قُلۡ فَاۡتُوۡا بِکِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ہُوَ اَہۡدٰی مِنۡہُمَاۤ اَتَّبِعۡہُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (۴۹)

قریش سے ایک مطالبہ

یعنی یہ لوگ مخالفت کے جوش میں حضرت موسیٰ کے معجزات اور ان کے فضل و کمال کا حوالہ تو دیتے ہیں لیکن یہ محض تمھارے اوپر اعتراض کے لیے ایک بہانہ ہے۔ اگر ان کی اس بات میں سچائی کا کوئی شائبہ ہے تو آخر یہ حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والے کیوں نہ بنے! تو ان سے کہو کہ اگر ان دونوں (یعنی قرآن اور تورات) سے بھی زیادہ ہدایت بخشنے والی کوئی کتاب ہے تو اس کو لاؤ، میں اس کی پیروی کرنے کو تیار ہوں۔

ہدایت کی جستجو فطرت کا تقاضا ہے

مطلب یہ ہے کہ ہدایت کی جستجو تو ہر سلیم الفطرت انسان کی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ جس کے اندر ہدایت کی جستجو نہیں ہے وہ جوہر انسانیت سے عاری ہے۔ فطرت کے اسی تقاضے کے تحت میں تورات کو بھی مانتا ہوں اور اس سے زیادہ ہدایت بخشنے والے قرآن کو بھی۔ اور اگر تم ان دونوں سے بھی زیادہ ہدایت بخش کوئی کتاب پیش کرو تو میں اس کی پیروی کے لیے بھی آمادہ ہوں لیکن تمھارا ماجرا عجیب ہے کہ تم نہ تو تورات کو مانتے، نہ قرآن کو البتہ مجھ سے معارضہ کرنے کے لیے یہ اعتراض لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہو کہ میں اس طرح کے معجزے کیوں نہیں دکھاتا جس طرح کے معجزے حضرت موسیٰ نے دکھائے۔ 'اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ' یعنی

حضرت موسیٰ کی حمایت میں تمہارا یہ جوش و خروش محض ہدایت سے فرار کے لیے ایک بہانہ ہے ورنہ اس کے کیا معنی کہ پیروتو تم نہ موسیٰ کے بنتے ہو اور نہ میرے، البتہ یہ اعتراض تمہیں ہے کہ میرے اندر حضرت موسیٰ کے کمالات نہیں ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن تورات کا مکذب نہیں بلکہ اس کا مصدق ہے۔ قرآن اگر تردید کرتا ہے تو صرف اس کی تحریفات کی تردید کرتا ہے۔ تورات کے مقابل میں قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ صرف وہی ہدایت کا صحیفہ ہے بلکہ وہ صرف اپنے 'اَهْدٰى وَاَقْوَمُ' ہونے کا مدعی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اس نے اللہ کی ہدایت کو تمام تحریفات سے پاک کر کے پیش کیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کی آخری اور کامل ہدایت کا صحیفہ ہے جس کی پیشین گوئی خود تورات میں بھی موجود ہے۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۰)

یت کی پیروی
رنے والا اپنی
ات کا
رہے

یعنی اگر تمہارے اس چیلنج کے جواب میں یہ ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخش کوئی کتاب پیش بھی نہیں کرتے اور ان میں سے کسی کی پیروی کے لیے بھی تیار نہیں ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے نفس کی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو جو اللہ کی ہدایت کے بغیر محض اپنی خواہشوں کا پیرو ہے اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہو گا! نفس کی خواہشیں صرف اپنے مطالبے پورا کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے اندر حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت نہیں ہے اور بسا اوقات وہ اتنی زور آور ہو جاتی ہیں کہ بڑی آسانی سے انسان کی عقل کو بھی مغلوب کر لیتی ہیں اس وجہ سے انسان کے لیے فلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ان خواہشوں کی پیروی اللہ کی ہدایت کی روشنی میں کرے۔ اگر اس روشنی کے بغیر وہ ان کے پیچھے چل پڑے گا تو لازماً وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خواہشوں کے اسی مہلکہ سے بچانے ہی کے لیے اپنی ہدایت نازل فرمائی ہے تو بدقسمت ہے وہ جو اس ہدایت کی قدر نہ کرے اور اپنی باگ اندھی بہری خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دے۔ ایسے لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور سنتِ الٰہی کے بموجب وہ ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۵۱)

قرآن اہلِ کتاب
کے لیے جانی
پہچانی ہوئی
چیز ہے

یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت ہی کی خاطر یہ اہتمام فرمایا کہ اپنی تعلیم و تذکیر کے سلسلہ کو کبھی منقطع نہیں ہونے دیا بلکہ اس کے تسلسل کو برابر قائم رکھا۔ حضرت موسیٰ کو جو کتاب عطا ہوئی جب اس کے حاملوں نے اس کو فراموش کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اوپر آیات ۴۵-۴۶ میں جو مضمون گزر چکا ہے ایک نئے اسلوب سے یہ اسی کا اعادہ ہے۔ مطلب

یہ ہے کہ یہ قرآن کوئی انوکھی اور متوحش ہونے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک جانی پہچانی ہوئی چیز ہے اس وجہ سے سب سے پہلے تو اہل کتاب کا فرض ہے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں اس لیے کہ جو نعمت ان کو پہلے ناتمام شکل میں ملی تھی اب وہ اپنی کامل شکل میں ان کو دی جا رہی ہے۔ پھر بنی اسماعیل کی سعادت بھی اسی میں ہے کہ اس کو سینہ سے لگائیں اس لیے کہ اب اللہ تعالیٰ نے ان کو براہِ راست اپنی نعمت سے نوازا ہے۔ اب تک ان کے اندر نہ کوئی رسول آیا تھا نہ ان کے لیے کوئی کتاب نازل ہوئی تھی۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِن قَبْلِهِ هُم بِهِ يُؤْمِنُونَ ۝ وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ (۵۲ - ۵۳)

صالحین اہل کتاب کے رویہ کی تحسین

'آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ' سے صالحین اہل کتاب مراد ہیں۔ ان کے لیے معروف کے صیغہ کا استعمال بھی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، اس بات کا قرینہ ہے اور قرآن کے باب میں ان کا رویہ بھی، جو یہاں مذکور ہوا ہے، اس پر شاہد ہے۔

یہ قرآن کے حق میں ایک سند کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر لاخبرے دنا قدرے قسم کے لوگ اس قرآن سے بدک رہے ہیں تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ آخر صالحین اہل کتاب بھی تو ہیں جو اس نعمت کی قدر کر رہے ہیں اور آگے بڑھ کر اس پر ایمان لا رہے ہیں! ان کا حال تو یہ ہے کہ جب ان کو یہ کتاب سنائی جاتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں کہ بے شک یہی حق ہے ہمارے رب کی جانب سے اور ہم تو اس کے پہلے سے ماننے والے رہے ہیں۔

'إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا' میں جو حصر و تاکید ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن نے پچھلے صحیفوں کی جن تحریفات سے پردہ اٹھایا ان کے باب میں بھی انھوں نے اپنی قوم کے مفسدین کے علی الرغم، صدق دل سے قرآن کے بیان کی تائید کی اور ساتھ ہی قریش کے لیڈروں کو بھی انھوں نے رہنمائی دی کہ قرآن بالکل حق اور خدائی کتاب ہے اس وجہ سے وہ اس کی قدر کریں، اس کی مخالفت کر کے اپنی شامت کو دعوت نہ دیں۔

'إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ' یعنی ہم تو اس کے نزول سے پہلے ہی سے اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے ماننے والے رہے ہیں۔ یہ مضمون بقرہ ۱۴۶، انعام ۱۱۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ ایک نظر ان پر بھی ڈال لیجیے۔ لفظ 'مسلمین' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہم پہلے ہی سے اپنے آپ کو اس کتاب اور اس رسول کے حوالے کر دینے کے لیے منتظر تھے چنانچہ جب ہم نے ان کو پایا تو ان کی اطاعت میں داخل ہو گئے۔

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (۵۴)

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جو اپنی اس استقامت کے صلہ میں دہرا اجر پائیں گے۔ ایک اجر تو انھیں اس بات کا ملے گا کہ ان کو جو دین حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے ملا، اپنی قوم کے عام بگاڑ کے باوجود، وہ اس پر ثابت قدم

رہے۔ دوسرا اس بات کا کہ جس نبی خاتم اور دینِ کامل کی پیشین گوئی حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے کی تھی وہ برابر اس کے لیے چشم براہ رہے اور جب وہ آیا تو انھوں نے یوسفِ گم گشتہ کی طرح اس کا استقبال کیا۔ 'بِمَا صَبَرُوْا' کی صفت کے حوالہ کا یہاں ایک خاص محل ہے جس کو نگاہ میں رکھیے۔ وہ یہ کہ ان لوگوں کو اپنے سابق دین پر قائم رہنے کے لیے بھی بڑے زہرہ گداز مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو ان کو اپنی قوم اور قریش دونوں کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا لیکن ان تمام مخالفتوں کا انھوں نے پوری پامردی سے مقابلہ کیا۔ نصاریٰ میں سے شمعون کے پیرووں نے اپنی قوم کے مبتدعین و محرفین کے ہاتھوں جو مصائب جھیلے ان کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں بھی موجود ہے اور ہم نے بھی اس کتاب میں جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ یہی اہلِ حق تھے جن کو قرآن کی دعوت قبول کرنے کی توفیق حاصل ہوئی اور قرآن نے متعدد سورتوں میں ان کی حق دوستی و ثابت قدمی کی تعریف فرمائی ہے۔

صالحین اہل کتاب کا کردار

'وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ'۔ 'حَسَنَةٌ' سے مراد یہاں صبر و عزیمت اور عفو و درگزر ہے اور 'سَيِّئَةٌ' سے مخالفین کے اعتراضات و مطاعن اور ان کے سب و شتم کی طرف اشارہ ہے۔ ان لوگوں نے جب اپنے قبولِ اسلام کا اظہار کیا تو ان کی قوم نے بھی ان کو دینِ آبائی کا دشمن اور ملت کا غدار قرار دیا اور دوسرے اعدائے حق نے بھی ان کو اپنے لعن طعن کا ہدف بنا لیا لیکن ان لوگوں نے ہر حملہ کا جواب مومنانہ شرافت اور کریمانہ عفو و درگزر سے دیا۔

'وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ' کا بھی یہاں ایک خاص محل ہے جس کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ قرآن نے جگہ جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اہلِ کتاب بالخصوص یہود کے لیے قبولِ اسلام کی راہ میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ بنی وہ ان کی زر پرستی ہے۔ اس سورہ میں بھی آگے ان کے قارون کا ذکر آ رہا ہے اور دوسری سورتوں میں بھی ان کی قارونی اور زر پرستانہ ذہنیت کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ جن لوگوں کو زر پرستی کا روگ لگ جاتا ہے وہ کبھی حق قبول کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ سیدنا مسیحؑ نے فرمایا کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح دولت مند خدا کی بادشاہی میں نہیں داخل ہو سکتا۔ سورۂ لہب سے واضح ہوتا ہے کہ ابولہب کی عداوتِ اسلام میں بھی سب سے زیادہ دخل اس کی زر پرستی اور حرصِ مال ہی کو تھا۔ یہاں ان صادقین کی صفت 'مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ' کا حوالہ دے کر قرآن اسی حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو طمعِ مال کی بیماری نہیں لگی تھی اس وجہ سے ان کو قبولِ اسلام کی توفیق حاصل ہوئی۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (۵۵)

مخالفین سے

'يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ' کی مزید وضاحت ہے کہ یہ لوگ جب مخالفین کی بکواس سنتے ہیں

توان سے الجھنے کے بجائے اعراض کرتے ہیں وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ یہ ان کے اعراض کا طریقہ بیان ہوا ہے کہ جب مخالفین و معترضین ان سے الجھتے ہیں تو وہ ان سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اچھا بھائی! زیادہ بحث و جدال سے کیا فائدہ، ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں، آپ اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو، ہمیں ہماری اختیار کردہ راہ پر چلنے دو، آپ اپنی راہ پر چلو!

'سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ' یہ سلام، مفارقت کے مفہوم میں ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو سلام کیا تھا۔ یہ کسی سے پیچھا چھڑانے کا ایک نہایت شائستہ طریقہ ہے۔ 'لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ' یہ ان کے طرزِ عمل کی تعبیر ہے کہ وہ دل میں یہ خیال کر کے کہ جاہلوں سے الجھنے سے کچھ فائدہ نہیں، ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس طریقۂ تعبیر کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ بسا اوقات آدمی کا طرزِ عمل ہی اس کے قول کا قائم مقام بن جاتا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۵۶)

آنحضرتؐ کو تسلی

'ھدایت' یہاں ہدایت یافتہ بنا دینے کے مفہوم میں ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ تم ان لوگوں کے پیچھے زیادہ ہلکان نہ ہو۔ تمہارا کام صرف لوگوں تک پیغامِ حق پہنچا دینا ہے یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے کہ تم جس کو چاہو ہدایت یافتہ بنا دو بلکہ یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت پانے کا اہل ہے، کون نہیں ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں جو سنتِ الٰہی ہے اس کی وضاحت ہم برابر کرتے آرہے ہیں۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۵۷)

خدائی نظام کی مخالفت کرنے والے شیاطین کا مخصوص حربہ

یہ قریش کے ایک اور اعتراض کو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس دین کو قبول کرنے کے معاملے میں ہم تمہارے ساتھی بن جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے گردوپیش کی ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیں اور یہ دشمن مل کر ہمیں ہمارے اس ملک سے اچک لے جائیں۔

قریش کو پورے ملک پر جو اقتدار حاصل تھا وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے دینِ شرک کی برکت سے ان کو حاصل ہوا ہے۔ وہ اپنے دیویوں دیوتاؤں کو تو تمام خیر و برکت کا ذریعہ مانتے ہی تھے۔ مزید برآں انھوں نے پورے ملک پر اپنی مذہبی و سیاسی دھاک قائم رکھنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی تھی کہ تمام قبائلِ عرب کے اصنام خانہ کعبہ میں جمع کر دیے تھے اور اس طرح گویا وہ سب کے امام و پیشوا بن گئے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ توحید بلند کی تو اس کے خلاف انھوں نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر بھی بھڑکایا کہ اگر ہم اپنے تمام دیویوں دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کے بن کر رہ جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری تمام جمعیت پارہ پارہ ہو جائے گی، تمام عرب ہمارا دشمن بن کر اٹھ کھڑا ہوگا اور اس ملک سے ہماری جڑ

اکھڑ جائے گی۔ یہ بعینہٖ وہی اعتراض ہے جو آج ہمارے لیڈر حضرات اسلامی نظام، اسلامی معاشرت، اسلامی حدود و تعزیرات اور اسلامی نظامِ معیشت کے خلاف اٹھاتے ہیں کہ اگر ہم ان کو اختیار کر لیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے تمام نظامِ معیشت و معاشرت کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیں اور ساری دنیا میں نکو بن کے رہ جائیں۔ یاد ہو گا یہی اعتراض فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسیٰؑ کی تعلیم و دعوت کے خلاف بھی اٹھایا تھا کہ یہ شخص ہماری اعلیٰ تہذیب (طَرِیۡقَتِکُمُ الۡمُثۡلٰی) کو مٹانے کے درپے ہے۔ خدائی نظام کی مخالفت میں شیاطین کا سب سے زیادہ کارگر حربہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔

بیت اللہ کی برکات

اَوَلَمۡ نُمَکِّنۡ لَّہُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجۡبٰۤی اِلَیۡہِ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا۔ یہ ان کے اعتراض کا جواب دیا کہ ان بے خبروں کو پتہ نہیں کہ جس زمانے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کو اس سرزمین میں بسایا ہے نہ یہاں کسی کی جان کے لیے امان تھی، نہ زندگی بسر کرنے کے معاشی وسائل ہی یہاں موجود تھے لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو بسایا اور اس کے ساکنوں کے لیے رزق و امن کی دعا کی جس کی برکت سے یہ حال ہوا کہ آج ہر علاقے سے ہر قسم کی پیداوار یہاں کھنچی چلی آ رہی ہے۔ حج اور اشہرِ حُرُم کی بدولت مکہ کی رفاہیت میں جو برکتیں ظاہر ہوئیں ان پر پچھلی سورتوں میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ انہی کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری برکتیں حاصل تو ہوئیں ان کو اللہ کے فضل اور حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی برکت سے لیکن آج ان شامت زدوں کا حال یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس دین کو اختیار کر لیا جس کی قرآن دعوت دے رہا ہے اور جو اصلاً حضرت ابراہیمؑ ہی کا دین ہے، تو یہ تباہ ہو کے رہ جائیں گے!

وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔ یہ ان کے حال پر اظہارِ افسوس ہے کہ ان کی اکثریت آج اپنی تاریخ سے کس درجہ بے خبر ہو کر رہ گئی ہے۔

سورۂ عنکبوت میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ	کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان کے لیے تو ایک
یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِہِمۡ ؕ	مامون حرم بنایا اور ان کے گرد و پیش کا حال یہ ہے
اَفَبِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ وَ بِنِعۡمَۃِ	کہ لوگ اچک لیے جاتے ہیں تو کیا وہ باطل پر ایمان
اللّٰہِ یَکۡفُرُوۡنَ (عنکبوت: ۶۷)	رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔

لفظ 'ثَمَرٰتُ' پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بحث کر چکے ہیں کہ یہ صرف 'فواکہ' کے لیے نہیں آتا بلکہ ہر قسم کی غذائی اجناس کے لیے بھی آتا ہے۔

نُمَکِّنۡ لَّہُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا۔ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح سورۂ نور میں وَلَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ (۵۵) ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حرم کو بجائے خود بالکل محفوظ و مامون بنایا ہے۔ یہ دوسروں کی حفاظت کا محتاج نہیں بلکہ خود دوسروں

کا محافظ ہے۔ سورۂ قریش میں ان شاء اللہ اس حقیقت کی وضاحت ہم تفصیل سے کریں گے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۵۸)

[illegible] کا ایک [illegible]

'بطر' کے معنی اکڑنے، اترانے اور فخر و ناز کرنے کے ہیں۔ چونکہ اس کا استعمال بطور متعدی معروف نہیں ہے اس وجہ سے 'مَعِيْشَتَهَا' کے نصب کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ عام طور پر لوگوں نے یہاں یا تو حرف جر محذوف مانا ہے یا ظرف۔ اسناد امام کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ 'مَعِيْشَتَهَا' 'اَهْلَكْنَا' کا مفعول ہے۔ لیکن مجھے ان اقوال میں سے کسی قول پر بھی اعتماد نہیں ہے۔ بعضوں نے 'بَطِرَتْ' کو 'كَفَرَتْ' کے مضمون پر متضمن قرار دیا ہے۔ یہ رائے اقرب الی الصواب ہے۔ عربی میں 'بَطِرَ الْحَقَّ' کا استعمال 'تَكَبَّرَ عَنْهُ' کے مفہوم میں معروف ہے۔ یعنی اس نے حق سے متکبرانہ اعراض کیا۔ اسی طرح اگر کہیں 'بَطِرَ فُلَانٌ نِعْمَةً' تو اس کا مفہوم ہوگا 'اِسْتَخَفَّهَا فَكَفَرَهَا' (اس نے اس نعمت کو حقیر سمجھ کر اس کی ناشکری کی)۔ میرے نزدیک ان استعمالات کی بنیاد تضمین ہی کے اصول پر ہے اور آیت میں بھی یہ لفظ اسی اصول پر استعمال ہوا ہے۔

رفاہیت پر اترانے والی قوموں کا انجام

یہ قریش کو انذار و تنبیہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ اس سرزمین میں تم کو جو امن و رفاہیت حاصل ہے یہ تمھاری اپنی تدبیر و تدبر کا کرشمہ ہے اس وجہ سے تمھیں اس پر بڑا ناز و فخر ہے حالانکہ یہ جو کچھ تمھیں حاصل ہوا ہے خدا ہی کے فضل و کرم سے حاصل ہوا ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ تم اس پر اترانے کے بجائے خدا کے شکر گزار بنو ورنہ یاد رکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں گزری ہیں جو تمھاری ہی طرح خدا کی نعمتوں کو اپنا حق سمجھ کر ان پر اترائیں تو اس کی پاداش میں ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کی بستیاں تم سے دور نہیں ہیں۔ تم ان پر سے گزرتے ہو۔

'فَتِلْكَ' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بستیاں مخاطب کی جانی پہچانی ہوئی ہیں۔ یہ اشارہ ثمود اور قوم لوط وغیرہ کی بستیوں کی طرف ہے جو قریش کی تجارتی گزرگاہوں پر تھیں۔ 'لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا' میں میرے نزدیک وہی مضمون ہے جو سورۂ ہود میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔ 'ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ' (۱۰۰) (یہ بستیوں کی سرگزشتیں ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض قائم ہیں اور بعض ختم ہو چکی ہیں) وہاں ہم اس آیت کی تفسیر کر چکے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ میرے نزدیک عربیت کے اعتبار سے یہ مفہوم لینے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ویسے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان بستیوں کا سارا کر و فر تو اجڑ گیا یہ الگ بات ہے کہ کبھی گڈریوں، چرواہوں اور خانہ بدوشوں نے ان میں اپنے ڈیرے ڈال لیے ہوں تو ڈال لیے ہوں۔

'وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ' یعنی وہ تو سب فنا ہو گئے جو اپنے آپ کو ان کا مالک و حکمران گمان

کرتے تھے اور ان کی وراثت ہماری طرف لوٹ آئی اس لیے کہ تمام آسمان و زمین کے حقیقی مالک و وارث ہم ہی ہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۵۹)

ہلاکت پیغمبر کی بعثت کے بعد

یہ وہی انذار کا مضمون مزید واضح اور تیز ہوگیا ہے۔ فرمایا کہ قوموں پر فیصلہ کن عذاب کے معاملے میں سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا جب تک اس کی مرکزی بستی میں اپنا ایک رسول بھیج کر لوگوں کو اپنی آیات اچھی طرح سنا نہ دے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک قریش کا تعلق ہے اس سنتِ الٰہی کا ایک مرحلہ پورا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مرکزی بستی — مکہ — میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جو رات دن لوگوں کو اللہ کی آیات کے ذریعہ سے انذار کر رہا ہے۔ اب عذاب کا انحصار ان کے رویہ پر ہے۔

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ۔ یہ اسی سنتِ الٰہی کے دوسرے مرحلے کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتا جب تک اس کے باشندے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے نہ بن جائیں — 'ظلم ڈھانے' سے مراد یہ ہے کہ رسول کی اس تمام تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی وہ اپنے شرک و کفر پر اڑے ہی رہیں اور رسول کی تکذیب کر دیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اب قریش اور ان کے اعوان و انصار کے لیے یہ آخری مرحلہ درپیش ہے۔ اگر انھوں نے رسول کی قدر نہ پہچانی، اپنی ضد پر اڑے رہ گئے، تو ایک خاص وقت تک مہلت دینے کے بعد وہ لازماً عذابِ الٰہی کی زد میں آجائیں گے اور یہ خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۶۰)

قریش کو براہِ راست تنبیہ

اوپر کی تنبیہات بالواسطہ تھیں۔ اب یہ براہِ راست قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے متنبہ فرمایا کہ جو رفاہیت و خوش حالی تمھیں حاصل ہے اس پر اتراؤ نہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہے بس حیاتِ چند روزہ کی متاع اور عارضی رونق ہے۔ اصل چیز جو بہتر اور غیر فانی ہے وہ خدا کے پاس ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو آخرت کے طالب بنیں گے اور اس کے لیے جدوجہد کریں گے تو اس متاعِ عارضی اور وقتی چمک دمک پر ریجھ کر حیاتِ ابدی کے خزانوں کو ضائع نہ کرو۔ عقل سے کام لو۔ 'اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ' کیا تم لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے!

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ (۶۱)

'احضار' یہاں مجرموں کی طرح پکڑ کر حاضر کیے جانے کے مفہوم میں ہے اس وجہ سے 'مُحۡضَرِیۡنَ' کے اندر ذلت کے ساتھ حاضر کیے جانے کا مفہوم خود پیدا ہو گیا ہے۔

یعنی سوچو کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جن سے اللہ نے آخرت کی ابدی بادشاہی کا وعدہ کر رکھا ہے اور یہ ابدی بادشاہی لازماً پا کے رہیں گے، اس لیے کہ اللہ کے وعدے سے سچا وعدہ کس کا ہو سکتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے حیاتِ چند روزہ کی متاعِ فانی تو دی ہے مگر بالآخر قیامت کے دن نہایت ذلت کے ساتھ وہ خدا کے حضور پیشی کے لیے گھسیٹ کر لائے جائیں گے۔ بتاؤ کہ ان میں سے بہتر اور لازوال (خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی) انجام والا کون ہو گا!

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۶۲-۷۵

اب آگے اوپر کے مضمون کی تائید کے لیے شرک اور شرکاء کی تردید ہے کہ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ آخرت میں ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کچھ کام آنے والے نہیں گے تو وہ اس وہم کو اپنے دماغ سے نکال دے۔ ان شرکاء کو نہ اس دنیا کے انتظام و انصرام میں کوئی دخل ہے، نہ یہ آخرت میں کام آنے والے ہیں۔ ان بے حقیقت چیزوں کے بل پر جو لوگ قرآن کی دعوت کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنا انجام اچھی طرح سوچ لیں۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۶۲-۷۵ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾
قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَآءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا
أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ﴿٦٣﴾
وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا
الْعَذَابَ ۚ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿٦٤﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ
مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦٥﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنبَآءُ يَوْمَئِذٍ
فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُونَ ﴿٦٦﴾ فَأَمَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا
فَعَسَىٰ أَن يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴿٦٧﴾ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ

وَيَخْتَارُ ۭ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾
وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ
وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٧٠﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ
سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَاۗءٍ ۭ
اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ
سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ
تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ
كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا
بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
ع ١٠ يَفْتَرُوْنَ ﴿٧٥﴾ ع

ترجمۂ آیات ٦٢-٧٥

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن خدا ان کو پکارے گا پھر پوچھے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم میرا شریک گمان کرتے رہے ہو! تو جن پر خدا کی بات پوری ہو چکی ہو گی وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا، ہم نے ان کو اسی طرح گمراہ کیا جس طرح ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم تیرے حضور ان سے اعلان براءت کرتے ہیں۔ یہ ہم کو نہیں پوجتے رہے ہیں۔ ٦٢-٦٣

اور ان سے کہا جائے گا کہ اب اپنے شریکوں کو بلاؤ تو وہ ان کو پکاریں گے لیکن وہ ان کو جواب نہ دیں گے اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے، کاش وہ ہدایت اختیار کرنے والے بنے ہوتے! ۶۴

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن خدا ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تو اس دن ان کی سٹی بھول جائے گی تو وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ہاں! جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عمل صالح کیا، وہ توقع ہے کہ فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔ ۶۵-۶۶

اور تیرا رب ہی پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اللہ پاک و برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی شکر کا حق دار ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اسی کے اختیار میں فیصلہ ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۶۸-۷۰

ان سے کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے، تا قیامت رات ہی کو مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے پاس روشنی لائے گا، تو کیا تم لوگ سنتے نہیں! کہو، تم لوگ بتاؤ، اگر تم پر دن ہی کو ہمیشہ کے لیے، تا قیامت مسلط رکھے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے لیے رات کو لائے گا جس میں تم سکون پاتے ہو۔ تو کیا تم لوگ دیکھتے نہیں! اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمھارے لیے رات اور دن کو بنایا ہے کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو۔ اور تاکہ تم شکر گزار ہو۔ ۷۱-۷۳

اور اس دن کا خیال کرو جس دن ان کو پکارے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کو تم میرا شریک گمان کرتے تھے۔ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو الگ کریں گے اور لوگوں سے کہیں گے کہ اپنی دلیل پیش کرو تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ حق بجانب اللہ ہے۔ اور جو کچھ وہ افترا کرتے رہے تھے وہ سب ہوا ہو جائے گا۔ ۷۴-۷۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ (۶۲)

مشرکین اور اہل شرک کا انجام

یہ اور آگے کی تمام آیات مسلسل تنبیہات کی نوعیت کی ہیں جن میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن شرک کرنے والوں، شرک کے داعی لیڈروں اور خود شرکاء کا کیا حشر ہوگا۔ فرمایا کہ اس دن کو نہ بھولو جس دن خدا تمام مشرکین کو اپنی عدالت میں پیشی کے لیے پکارے گا اور ان کو حکم دے گا کہ میرے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم میرا شریک گمان کرتے رہے ہو! 'أَيْنَ شُرَكَائِيَ' کے ابہام کے اندر مشرکین کے ساتھ ساتھ ان کے مزعومہ شرکاء پر جو قہر و غضب مضمر ہے وہ اصحاب ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کو پیش کرو تاکہ تم بھی اور تمہارے ساتھ وہ بھی اپنا انجام دیکھ لیں۔

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ (۶۳)

گمراہ لیڈروں اور ان کے پیرووں کی جوتی پیزار

'حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ' سے مراد مشرکین کے وہ لیڈر ہیں جن کے لیے خدا کا فیصلۂ عذاب صادر ہو جائے گا۔ فرمایا کہ گمراہ لوگ آخری عذر کے طور پر اپنے لیڈروں کی طرف اشارہ کریں گے کہ اے ہمارے رب! دراصل یہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا، اگر یہ ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم گمراہ نہ ہوتے۔ 'أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا' ان کے لیڈر جھٹ جواب دیں گے کہ ہم جو کچھ خود تھے وہی ہم نے ان کو بنایا۔ یہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے ہماری پیروی کی۔ 'تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ' یعنی ہم ان کے اعمال کی ذمہ داری سے تیرے حضور میں اپنی براءت کا اعلان کرتے ہیں۔ 'مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ' یہ لوگ ہماری پرستش نہیں کرتے رہے ہیں کہ ہمارے اوپر ان کی کوئی ذمہ داری ہو۔ یہ اپنی آزادیٔ رائے اور اپنی پسند سے ہماری باتیں مانتے رہے ہیں — گمراہ لیڈروں اور ان کے پیرووں کی یہ جوتی پیزار قرآن مجید میں کئی جگہ مذکور ہوئی ہے۔ ہم ایک مثال اعراف سے پیش کرتے ہیں۔

قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ فِي النَّارِ ۖ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝ (الاعراف: ۳۸-۳۹)

حکم ہوگا، داخل ہو جاؤ دوزخ میں ان گروہوں کے ساتھ جو جنوں اور انسانوں میں سے تم سے پہلے داخل ہوئے۔ جب جب داخل ہوگا کوئی گروہ وہ اپنے ہم مشربوں پر لعنت کرے گا۔ یہاں تک کہ جب سب اس میں اکٹھے ہو لیں گے، پچھلے اگلوں کے باب میں کہیں گے، اے ہمارے رب! یہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تو ان کو دونا عذاب دوزخ دے۔ ارشاد ہوگا، تم میں سے ہر ایک کے لیے دونا عذاب ہے لیکن تم جانتے نہیں۔ اور اگلے پچھلوں سے کہیں گے، تمھیں بھی تو ہم پر کوئی فضیلت نہ حاصل ہوئی تو اپنے عمل کی پاداش میں اب عذاب چکھو۔

حٰمٓ السجدۃ ۔ آیت ۴۸ کے تحت ان شاء اللہ، ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ (۶۴)

مشرکین کے معبودوں کی بے حقیقتی

یعنی اپنے جن لیڈروں پر وہ اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈالنا چاہیں گے، جب وہ صاف صاف ان سے اعلانِ برأت کر دیں گے تو ان سے پھر کہا جائے گا کہ اب بولو، تمھارے ان لیڈروں نے تو تم سے برأت کا اعلان کر دیا تو تمھارے وہ معبود کہاں ہیں جن کی پرستش کرتے رہے ہو! اس وقت وہ گھبراہٹ میں اپنے ان شریکوں کو پکاریں گے جن کے وہ بت پوجتے رہے تھے۔ مثلاً لات، منات، عزیٰ اور نائلہ وغیرہ کو، لیکن وہ ان کی کوئی فریاد رسی نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوگا۔ وہ محض خیالی ہستیاں تھیں۔ آخرت میں راز کھل جائے گا کہ انھوں نے محض گمان کی پرستش کی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں ذکر مشرکینِ عرب کا ہے جن کے تمام اصنام و الٰہ محض خیالی اور خود تراشیدہ تھے۔ جن قوموں نے کسی واقعی ہستی کی پرستش کی ہے مثلاً نصاریٰ، جنھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پرستش کی، ان کا ذکر قرآن میں الگ ہوا ہے کہ قیامت کے دن حضرت مسیح اپنے پرستاروں سے اعلانِ برأت کر دیں گے کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کچھ احمق لوگوں نے میری پرستش کی ہے۔ میں نے تو سب کو اللہ واحد کی بندگی کی دعوت دی تھی۔

وَرَأَوُا الْعَذَابَ یعنی جن کی شفاعت کی امیدوں پر جیے اور مرے ان کا پکارنا بالکل صدا بصحرا

ثابت ہوگا۔ البتہ خدا کا عذاب سامنے ہوگا اور اس سے انھیں سابقہ پیش آئے گا۔

'لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ' یہ ان کے حال پر اظہارِ حسرت و افسوس ہے کہ کاش وہ ہدایت حاصل کرنے والے بنے ہوتے کہ اس عذاب سے دوچار نہ ہوتے۔ اس سے اس عذاب کی ہولناکی اور بے پناہی واضح ہوتی ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ○ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ (۶۵-۶۶)

مشرکوں کی بدحواسی قیامت کے دن

یہ بھی روزِ قیامت کے احوال ہی کے سلسلہ کی بات ہے کہ اس دن ہر امت کی پکار ہوگی اور ان سے سوال ہوگا کہ خدا نے جو رسول تمھاری ہدایت کے لیے بھیجے ان کی دعوت کا تم نے کیا جواب دیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال بھی ان سے ان کے جرم کی سنگینی واضح کرنے کے لیے ہوگا کہ خدا نے تو تمھاری ہدایت کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ اپنے رسول بھیجے کہ ہر پہلو سے حق تم پر واضح ہو جائے تو تم بتاؤ، تم نے اس اہتمام کی کیا قدر کی!

'فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ' کا مفہوم ٹھیک وہی ہے جو ہم اپنے محاورے میں سٹی بھول جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت سب پر ایسی بدحواسی طاری ہوگی کہ کسی سے کوئی بات بنائے نہیں بنے گی۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے!

'فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ' یعنی وہ ایسی حالت سراسیمگی میں گرفتار ہوں گے کہ اس سوال کے جواب کے لیے کسی سے کچھ پوچھ پاچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ایسے اوقات میں مرجع امید لیڈر ہوا کرتے ہیں لیکن ان کا ماجرا اوپر گزر چکا کہ انھیں خود اپنی پڑی ہوگی وہ دوسرے کی کیا نبیڑیں گے! یہ مضمون مائدہ کی آیت ۱۰۹ میں بھی گزر چکا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ (۶۷)

اہل ایمان کے لیے فلاح کی بشارت

'عسٰی' جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کے ساتھ آئے تو اس کے اندر، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، وعدہ اور بشارت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔

جو لوگ شرک ہی پر جیے اور مرے ان کا انجام واضح کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کو بشارت دی ہے جو شرک و شفاعتِ باطل کے عقیدہ سے توبہ کر کے ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر لیں گے۔ فرمایا کہ یہ لوگ توقع ہے کہ فلاح پانے والوں میں سے بنیں۔ یعنی یقین تو انھیں بھی اپنی فلاح کا نہیں کر بیٹھنا چاہیے اس لیے کہ نجات و فلاح جس کو بھی حاصل ہوگی خدا کے فضل ہی سے حاصل ہوگی لیکن توقع کا حق وہ رکھتے ہیں اس لیے کہ خدا غفور رحیم ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۗ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۶۸)

فرشتوں کی حیثیت

یہاں 'یَخْتَارُ' کے بعد بھی 'مَا یَشَآءُ' بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یہ فرشتوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو بھی خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور اگر ان کو اپنا مقرب و برگزیدہ بنایا ہے تو اسی نے بنایا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (الحج: ۷۵) (اللہ منتخب کرتا ہے اپنے رسول فرشتوں میں سے بھی اور لوگوں کے اندر سے بھی) مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کو جو برتری باعتبار خلق یا باعتبار تقرب حاصل ہے، وہ خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔ اس چیز کی بنا پر ان کو یہ درجہ حاصل نہیں ہو گیا ہے کہ ان کو خدا کی خدائی میں شریک بنا دیا جائے۔ 'مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ' ان کو بذات خود کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ 'سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' اللہ تعالیٰ اس قسم کی تمام نسبتوں سے پاک اور برتر ہے۔ اگر کسی کو اس کے اختیارات اور اس کی صفات میں شریک بنا دیا جائے تو اس سے اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی ہو جاتی ہے ـــــ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اوپر آیت ۶۲ میں جن شرکاء کا ذکر آیا ہے، وہ مشرکین عرب کے تصور کے مطابق، ملائکہ ہی کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے تھے اس وجہ سے قرآن نے یہاں فرشتوں کی اصل حیثیت واضح فرما دی کہ ان کو خدا کی مخلوقات میں فی الجملہ برتری تو حاصل ہے لیکن یہ خداداد ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ان کی ذاتی نہیں ہے۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۶۹)

احاطۂ علم الٰہی کی دلیل سے شرک کا ابطال

یہ احاطۂ علم الٰہی کی دلیل سے شرک کا ابطال فرمایا ہے کہ جب تیرا رب ان کے سر و علانیہ ہر چیز سے خود اچھی طرح باخبر ہے تو اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک و سہیم بنائے! وہ اپنی مملکت میں دوسروں کو شریک تو جب بنائے جب وہ لوگوں کے احوال و معاملات سے باخبر رہنے کے لیے کسی کا محتاج ہو اور اس کے ہاں کسی کے باب میں کسی کی سفارش کی ضرورت تو جب پیش آئے جب کوئی اس کے علم میں اضافہ کرنے کی پوزیشن میں ہو کہ فلاں کے باب میں نعوذ باللہ خدا کو خبر نہیں ہے، اسے ہے۔ جب اس طرح کی کوئی بات فرض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو فرشتوں کو اس مفروضہ پر پوجنے کے کیا معنی کہ وہ خدا کے ہاں کسی کے لیے تقرب و سفارش کا وسیلہ ہیں!

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۷۰)

خلاصۂ

یہ اوپر کی ساری بحث کا خلاصہ یک جا کر دیا ہے کہ بس وہی اللہ معبود حقیقی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کے سوا جن کو بھی معبود بنایا گیا ہے سب باطل ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ کو معبود اعظم کی حیثیت سے اہل عرب بھی مانتے تھے لیکن ساتھ ہی اس کے شریک بھی مانتے تھے۔ یہ ان کے شرک کی نفی کر دی۔

'لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ' یعنی دنیا میں بھی جو نعمت انسان کو ملی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف

سے ملا ہے اور آخرت میں بھی جو نعمت حاصل ہونے والی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ملے گی۔ اس وجہ سے اس دنیا میں بھی حمد و شکر کا سزاوار وہی ہے اور آخرت میں بھی وہی حمد و شکر کا سزاوار ہوگا، کسی دوسرے کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ آخرت میں اتمام نعمت کے بعد اہلِ جنت کی زبانوں پر جو ترانۂ حمد جاری ہوگا سورہ یونس میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

'وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' ہر ایک کا فیصلہ اسی کے اختیار میں ہوگا اور سب کی پیشی اسی کے حضور میں ہونی ہے۔ کوئی اور مرجع و مولیٰ بننے والا نہیں ہے۔

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِن جَعَلَ ٱللَّهُ عَلَيْكُمُ ٱلَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ ٱلْقِيَـٰمَةِ مَنْ إِلَـٰهٌ غَيْرُ ٱللَّهِ يَأْتِيكُم بِضِيَآءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ۝ قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِن جَعَلَ ٱللَّهُ عَلَيْكُمُ ٱلنَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ ٱلْقِيَـٰمَةِ مَنْ إِلَـٰهٌ غَيْرُ ٱللَّهِ يَأْتِيكُم بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۷۱-۷۲)

مخاطب کے مسلّمات سے استدلال

'قُلْ' یہاں سوال کرنے اور پوچھنے کے معنی میں ہے جب سوال بالکل بدیہی نوعیت کا ہو، جس کے جواب میں مخاطب کے لیے کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو تو اتمامِ حجت کے پہلو سے یہی لفظ زیادہ موزوں رہتا ہے۔ یہ بات مشرکین عرب کو بھی تسلیم تھی کہ آسمان و زمین اور روز و شب کا خالق خدا ہی ہے۔ ان کے اسی مسلمہ کو بنیاد بنا کر سوال فرمایا کہ بھلا بتاؤ تو سہی کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر ہمیشہ کے لیے رات ہی کو مسلط کر دے تو تمہارے معبودوں میں سے کوئی ہے جو تمہارے لیے دن کی روشنی نمودار کر سکے! اسی طرح بتاؤ کہ اگر وہ تمہارے اوپر قیامت تک کے لیے دن ہی کو مسلط کر دے تو کیا تمہارے معبودوں میں سے کسی کے اندر یہ بوتا ہے کہ وہ رات کو لا سکے جس میں تم دن کے تھکے ماندے سکون حاصل کرتے ہو! مطلب یہ ہے کہ جب اس کائنات کے ان تصرفات میں، جن پر تمام مخلوقات کے بقا کا انحصار ہے، تمہارے ان دیویوں دیوتاؤں کو کوئی دخل نہیں ہے تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم نے ان کو خدا کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے!

اسلوبِ بیان کی بلاغت

یہاں اسلوبِ بیان کی یہ بلاغت بھی قابلِ توجہ ہے کہ شب کے ذکر کے بعد تو فرمایا کہ 'أَفَلَا تَسْمَعُونَ' (کیا تم لوگ سنتے نہیں) اور دن کے ذکر کے ساتھ فرمایا کہ 'أَفَلَا تُبْصِرُونَ' (کیا تم لوگ دیکھتے نہیں) یہ اسلوب تصویرِ حال کے لیے ہے۔ گویا پہلی بات شب کے اندھیرے میں فرمائی جا رہی ہے کہ اگر رات کے اندھیرے میں تمہیں سجھائی نہیں دے رہا ہے تو کیا سنائی بھی نہیں دے رہا ہے تو آخر اس بات کو سنتے کیوں نہیں! اسی طرح دوسری بات گویا دن کی روشنی میں فرمائی جا رہی ہے کہ اس وقت تو پورے دن کی روشنی موجود ہے تو کیا اس روشنی میں بھی تمہیں یہ بدیہی حقیقت نظر نہیں آ رہی ہے!

اس میں یہ بلاغت بھی ہے کہ معقولات کو محسوسات کی حیثیت دے دی گئی ہے جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بدیہیات ہیں جن کو سمجھنے کے لیے زیادہ تامل و فکر کی ضرورت نہیں ہے، بس کافی ہے کہ آدمی کے کان اور اس کی آنکھیں کھلی ہوں۔ لیکن تمہارا حال تو یہ ہے کہ شب کے سکون میں تمہیں کچھ سنائی دیتا

نہ دن کے اجالے میں کچھ دکھائی دیتا۔

ایک چیز ان آیات میں اور بھی قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ رات کے ساتھ اس کی صفت 'تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ' تو مذکور ہوئی لیکن دن کے ساتھ اس کی کسی صفت کا ذکر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے جگہ جگہ اشارہ کیا ہے کہ بعض مرتبہ کلام کے متقابل اجزاء بتقاضائے ایجاز و بلاغت، حذف کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں دن کا فائدہ چونکہ بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا۔ آگے والی آیت میں اس حذف کی وضاحت ہو گئی ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۷۳)

خدا کے انعامات کا حق شکر

یعنی یہ رات اور دن کا لانا صرف خدا کے فضل و رحمت ہی کا کرشمہ ہے کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور تمہارا خدا پر کوئی حق بھی قائم نہیں تھا کہ وہ تمہارے لیے یہ اہتمام کرتا کہ رات آ کر تمہارے لیے راحت و سکون کا بستر بچھائے اور پھر دن طلوع ہو کر تمہارے لیے تلاشِ رزق و فضل کا میدان گرم کرے۔ یہ سب کچھ مجرد خدا کی رحمت کا ظہور ہے تاکہ تم ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے اس رب کے شکرگزار رہو جس نے تمہارے لیے یہ کچھ اہتمام کیا ہے۔ آیت میں 'لِتَسْكُنُوْا' کا تعلق رات سے ہے اور 'وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ' کا تعلق دن سے۔ انسان کسبِ رزق کے لیے جو جد و جہد کرتا ہے اس کو 'ابتغائے فضل' سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ خدا کے پیدا کیے ہوئے اسباب و وسائل سے انسان کی ساری جد و جہد اسی کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خدا کے دیے ہوئے اسلحہ کو خدا کے خلاف استعمال کرتا ہے اور اس طرح وہ اس کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۷۴-۷۵)

آخری اتمام حجت

آیت ۷۴، بعینہٖ اس سلسلۂ بحث کے آغاز میں بھی گزر چکی ہے۔ یہاں یہ ایک اور ماجرے کی تمہید کے طور پر آئی ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مشرکوں پر آخری اتمامِ حجت کے لیے یہ بھی کرے گا کہ ہر امت پر اپنے رسولوں کے ذریعہ سے یہ گواہی دلوا دے گا کہ انھوں نے ان کو دینِ توحید کی تعلیم دی تھی، شرک کی تعلیم نہیں دی۔ رسولوں کی اس گواہی کے بعد اللہ تعالیٰ امتوں سے پوچھے گا کہ اب بتاؤ تم نے کس سند کی بنا پر خدا کے شریک ٹھہرائے، اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو، اس وقت سب پر واضح ہو جائے گا کہ حق بجانب اللہ ہے اور ان کے تمام خود تراشیدہ معبود بالکل بے حقیقت ثابت ہوں گے۔

'شَهِيْد' سے مراد اللہ کے وہ رسول ہیں جو ہر امت کی طرف بھیجے گئے۔ ان کو 'شَهِيْد' کے لفظ سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ انھوں نے خدا کے دین کی گواہی اپنی اپنی امتوں پر اس دنیا میں بھی دی ہے اور

آخرت میں بھی وہ گواہی دیں گے کہ انھوں نے خدا کا دین ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا تھا، اگر بعد والوں نے اس میں بدعتیں داخل کی ہیں تو یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہے، وہ ان سے بری ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ہر امت اپنے شرک و بدعت کی تائید میں اپنے رسولوں اور نبیوں ہی کا حوالہ دیتی ہے کہ یہ انھی کی تعلیم ہے جس پر وہ عمل کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی شہادت کے ذریعہ سے ان پر آخری حجت تمام کر دے گا جس کے بعد کسی کے لیے لب کشائی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ سورۂ مائدہ کی آیات ۱۱۶-۱۱۷ کے تحت اس شہادت کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔ وضاحت مطلوب ہو تو ایک نظر ان پر بھی ڈال لیجیے۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تاویل مریم کی آیت ۶۹ اور حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۴۷ کی روشنی میں کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اس پر اطمینان نہیں ہے۔ میں نے جو تاویل کی ہے دوسرے مفسرین کی تاویل بھی یہی ہے اور قرآن کے واضح نظائر اسی کے حق میں ہیں۔ والعلم عند اللہ۔

۶- آگے کا مضمون ــــ آیات ۷۶-۸۴

آگے کا مضمون اوپر آیت ۵۸ سے مربوط ہو گیا ہے۔ اوپر یہ بیان ہوا تھا کہ اپنی رفاہیت و خوشحالی پر اترانے والی کتنی قومیں گزری ہیں جن کو خدا نے تباہ کر دیا اور ان کو اپنے جن معبودوں پر ناز تھا وہ ان کو خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے۔ اس کے بعد ضمناً ردِ شرک کا مضمون آگیا جو آیت ۷۵ پر تمام ہوا۔ اس کے بعد پھر اسی اوپر والے مضمون کو از سرِ نو لے لیا اور ایک یہودی سرمایہ دار ــــ قارون ــــ کے فخر و غرور اور اس کے عبرت انگیز انجام کو بطور مثال ذکر کر کے ان لوگوں کو متنبہ فرمایا جو دنیا کی زینتوں پر ریجھ کر خدا اور آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں قارون کا مماثل ابولہب تھا۔ اس کو بھی اپنی دولت پر بڑا ناز تھا اور اس کی یہ دولت مندی خود اس کے لیے بھی اور دوسرے بہتوں کے لیے بھی فتنہ بنی ہوئی تھی۔ اس مثال سے مقصود اسی طرح کے لوگوں کی آنکھیں کھولنا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۶-۸۴

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ
الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوأُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ
لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿۷۶﴾ وَابْتَغِ
فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٧٧﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ
اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ
اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْـَٔـلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٧٨﴾
فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿٧٩﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿٨٠﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ
بِدَارِهِ الْاَرْضَ ۣ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ ۤ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿٨١﴾ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ
بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ
عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ
لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٢﴾ ۧ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ ع ۸ / ۷ / ۱۱
لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٨٣﴾
مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا
يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾

ترجمۂ آیات: ۷۶ - ۸۴

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا تو اس نے ان کے مقابل میں سر اٹھایا۔ اور ہم
نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے جن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت سے مشکل سے

اٹھتی تھیں۔ جب کہ اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا کہ اترا مت! اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو کچھ خدا نے تمھیں دے رکھا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو، اور دنیا میں سے اپنے حصّہ کو نہ بھولو۔ اور جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو۔ اور زمین میں فساد کے طالب نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ فساد چاہنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۷۶ - ۷۷

اس نے جواب دیا کہ مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم کی بدولت ملا ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں جانا کہ خدا نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چھوڑا جو قوت میں اس سے بڑھ چڑھ کر اور جمعیت میں اس سے زیادہ تھیں اور مجرموں سے ان کے جرموں کی بابت سوال بھی نہیں کیا جاتا۔ ۷۸

پس وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے نکلا تو جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے انھوں نے کہا کاش ہمیں بھی وہی کچھ حاصل ہوتا جو قارون کو حاصل ہے، بے شک وہ بڑا ہی نصیبہ ور ہے! اور جن لوگوں کو علم عطا ہوا تھا انھوں نے کہا، شامت زدو! ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے خدا کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے اور یہ حکمت صرف صابروں ہی کو عطا ہوتی ہے۔ ۷۹ - ۸۰

پس ہم نے اس کو اور اس کے گھر سمیت زمین کو دھنسا دیا تو نہ اس کے لیے کوئی جماعت ہی ایسی اٹھی جو خدا کے مقابل میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود ہی اپنی مدافعت کرنے والا بن سکا۔ اور وہ لوگ جو کل اس کی جگہ کے متمنّی تھے پکار اٹھے کہ لاریب! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے

چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔ اگر اللہ کا ہم پر فضل نہ ہوا ہوتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا۔ لاریب، کافر فلاح نہیں پائیں گے!۸۱-۸۲

یہ دارِ آخرت ہم انھیں لوگوں کے لیے خاص رکھیں گے جو زمین میں غرور اور فساد کے چاہنے والے نہیں ہیں اور انجام کار کی کامیابی خدا ترسوں ہی کے لیے ہے۔ جو نیکی کما کر لائے گا تو اس کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے اور جو بدی کما کر لائے گا تو بدی کمانے والوں کو وہی بدلہ میں ملے گا جو وہ کر کے آئیں گے۔ ۸۳-۸۴

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوأُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (۷۶)

قارون کا حضرت موسیٰؑ پر حسد

قارون کا ذکر تورات کی کتاب گنتی باب ۱۶ میں آیا ہے۔ تورات میں اس کا نام قورح مذکور ہوا ہے، اس کے نسب نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات موسیٰؑ و ہارونؑ کے خاندان — بنی لاوی — سے اور رشتہ میں حضرت موسیٰؑ کے سگے چچا کا لڑکا تھا۔ اس کو حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی امامت و سیادت کا بڑا حسد تھا اس وجہ سے اس نے یہ نعرہ بلند کیا کہ خاندان کے تمام آدمی یکساں مقدس اور دیندار ہیں تو آخر موسیٰؑ و ہارونؑ (علیہما السلام) ہی کو کیا ایسے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ قوم کی امامت و پیشوائی کریں۔ دوسروں کو یہ حق کیوں حاصل نہیں ہے! چنانچہ وہ خاندان کے کچھ لوگوں کو ملا کر حضرت موسیٰؑ کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ تورات کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> "اور قورح بن اضہار بن قہات بن لاوی نے بنی روبن میں سے الیاب کے بیٹوں داتن اور ابیرام اور پلت کے بیٹے اون کے ساتھ مل کر اور آدمیوں کو ساتھ لیا اور وہ اور بنی اسرائیل میں سے ڈھائی سو اور اشخاص، جو جماعت کے سردار اور چیدہ اور مشہور آدمی تھے، موسیٰ کے مقابل میں اٹھے اور وہ موسیٰ و ہارون کے خلاف اکٹھے ہو کر ان سے کہنے لگے تمہارے تو بڑے دعوے ہو چلے کیونکہ جماعت کا ایک ایک آدمی مقدس ہے اور خداوند ان کے بیچ رہتا ہے سو تم اپنے آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا کیونکر ٹھہراتے ہو۔" (گنتی باب ۱۶: ۱-۳)

اس کی اسی بغاوت کو قرآن نے یہاں 'فَبَغٰى عَلَيْهِمْ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

قارون کی دولت مندی

وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ' یہ اس کی سرمایہ داری اور دولت مندی کا ذکر فرمایا جس سے مقصود اس کی اس سرکشی اور استکبار کے سبب پر روشنی ڈالنا ہے کہ چونکہ وہ بڑا مالدار آدمی تھا اس وجہ سے اس کو یہ بات کھلتی تھی کہ وہ اپنے مقابل میں اپنے خاندان اور اپنی قوم پر حضرات موسیٰؑ و ہارونؑ کی برتری تسلیم کرے۔ فرمایا کہ ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت سے اٹھتی تھیں۔ یہ کوئی مبالغہ کا اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ بیان واقعہ ہے۔ اس زمانے میں خزانوں کی حفاظت کے لیے اس طرح کی تجوریاں، آہنی الماریاں اور سیف نہیں ہوتے تھے جس طرح کے ہمارے زمانے میں ہوتے ہیں اور نہ اس طرح کے صیقل کردہ قفل اور کنجیوں ہی کا رواج تھا جن کا اب ہے۔ اس زمانے کے بڑے سرمایہ دار بالعموم زمین دوز خزانے بناتے اور ان کو محفوظ کرنے کے لیے ان کے پھاٹکوں اور دروازوں میں بڑے بڑے آہنی کنڈے لگا کر ان میں بھاری بھاری آہنی اڑنگے، جو خاص اسی غرض کے لیے تیار کیے جاتے، پھنساتے۔ ان اڑنگوں کو پھنسانا اور ان کو کھولنا دونوں ایک مشکل کام ہوتا اور ان کے تمام لوازم مل ملا کر ایک بھاری بوجھ بن جاتے۔ جب بھی ان کو پھنسانے یا اٹھانے کی ضرورت پیش آتی تو ایک طاقت ور جماعت کی ضرورت ہوتی۔ یہی طریقہ اس زمانے میں شہر پناہوں اور قلعوں کے آہنی دروازوں کو بند کرنے کے لیے بھی اختیار کیا جاتا۔ اس طریقہ کی بعض یادگاریں اب بھی ہماری دیہاتی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ آیت میں اسی طرح کی کنجیوں کی طرف اشارہ ہے۔ عرب میں جس طرح کسی کے پاس بھاری بھاری دیگوں کا پایا جانا اس کی فیاضی کی دلیل تھا اسی طرح اس قسم کی کنجیوں کا پایا جانا اس کی سرمایہ داری کی نشانی تھا۔

قوم کے دانشمندوں کی قارون کو نصیحت

'اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ ... الاٰیۃ' جب اس نے سرکشی کی یہ روش اختیار کی تو اس کی قوم کے دانشمند لوگوں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کے غرور میں خدا ہی کے خلاف نہ اکڑو، یاد رکھو کہ خدا اکڑنے اور اترانے والوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ یہ شائستہ الفاظ میں اس کو تنبیہ تھی کہ یہ روش اختیار کرنے والے بالآخر خدا کی پکڑ میں آجاتے ہیں۔ لفظ قوم اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد قوم کے اصحاب علم ہیں۔ آگے آیت ۸۰ میں اس کی وضاحت ہوگئی ہے۔ یہاں عام لفظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قوم کی اکثریت حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھی صرف تھوڑے سے مفاد پرست تھے جن کو قارون نے اپنے ساتھ ملا کر اپنی پارٹی بنالی تھی۔

وَابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۷۷)

یہ اسی نصیحت کی مزید تفصیل ہے جو انھوں نے قارون کو کی۔ اس کا ایک ایک فقرہ حکمت و معرفت کا

خزانہ ہے۔

وَابْتَغِ فِیْ مَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ۔ یعنی خدا نے تمھیں یہ رفاہیت جو بخشی ہے اکڑنے اور اترانے کے لیے نہیں بخشی ہے بلکہ اس لیے بخشی ہے کہ تم اس کو آخرت کی فوز و فلاح حاصل کرنے کا ذریعہ بناؤ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ بھی تمھیں حاصل ہے نہ تمھارے اب و جد کی میراث ہے اور نہ تمھاری قابلیت و استحقاق کا کرشمہ ہے بلکہ یہ سرتاسر خدا کی بخشش ہے اور اس کو رے کر خدا نے تمھارا امتحان کیا ہے کہ اس کو پا کر تم اس کے پرستار بن کر بیٹھ جاتے ہو یا اس کو خدا کی خوشنودی و رضا طلبی کا ذریعہ بناتے ہو۔

وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا۔ یہ نہایت حکیمانہ تنبیہ ہے کہ یاد رکھو کہ اس دنیا کی ہر چیز آنی و فانی ہے۔ اس کی کسی چیز کو بھی بقا نہیں ہے۔ تمھاری ابدی زندگی میں اس میں سے تمھارے کام آنے والی چیز وہی بنے گی جو تم آج خدا کی راہ میں صرف کرو گے۔ اگر تم خدا اور اس کے بندوں کے حقوق سے آنکھیں بند کیے ہوئے سونے اور چاندی کے اس ڈھیر کی پوجا کرتے رہے تو یاد رکھو کہ وبال اور نکال کے سوا تم اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ تم اس دنیا میں سے بھی اپنا حصہ نظر انداز نہ کرو، ہم یہ نہیں کہتے کہ آخرت کی خاطر اس دنیا کو تج دو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ آخرت کو بھی فراموش نہ کرو۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل غلط ہے اور گوناگوں پہلوؤں سے غلط ہے لیکن صحیح مطلب واضح کر دینے کے بعد اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ۔ یعنی جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ یہ اچھا معاملہ کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ خدا اپنی صفات کا عکس اپنے بندوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ یاد رکھو کہ جو خدا محسن ہے وہ کبھی ان لوگوں کو پسند نہیں کر سکتا جو اس کے بندوں کے معاملے میں تنگ دل ہوں۔

فساد فی الارض کی حقیقت

وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ۔ یہ اسی موعظت کی وضاحت اس کے منفی پہلو سے ہے۔ فَسَادٌ فِی الْاَرْضِ کی وضاحت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ زمین میں فساد صرف چوری رہزنی اور ڈکیتی ہی نہیں ہے۔ یہ تو محض اس کے بعض مظاہر ہیں۔ اصل فساد علو و استکبار ہے۔ استکبار کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے حدودِ بندگی سے تجاوز کر کے خدا کے حدود و حقوق میں مداخلت کرے۔ جو لوگ اس جرم کے مرتکب ہیں وہ مفسدین فی الارض میں شامل ہیں، خواہ وہ یہ کام کتنی ہی دانش فروشیوں کے ساتھ کریں۔ ایسے لوگوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ وہ ان لوگوں کو کیسے پسند کر سکتا ہے جو اس کے مقابل میں سر اٹھائیں اور اس کے حرم میں دراندازی کریں۔ اور جب وہ ان کو پسند نہیں کرتا تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ ان کی حیثیت اس کے چمن میں خود رو جھاڑیوں اور اس کے خوانِ کرم پر ناخواندہ مہمانوں

کی ہے۔ بالآخر ایک وقت آئے گا کہ خودرو جھاڑیاں اکھاڑی جائیں گی اور ناپسندیدہ لوگ کھدیڑے جائیں گے!

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْــَٔـلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (۷۸)

قارون کا جواب

قارون نے جواب دیا کہ یہ مال و متاع جو مجھے حاصل ہے میری حسنِ تدبیر، مہارتِ فن اور قابلیت کا ثمرہ ہے، اس کو خدا سے کیا تعلق کہ اس میں اس کا کوئی حق قائم ہوا اور مجھ پر اس کے ادا کرنے کی ذمہ داری ہوا۔ لفظ 'عِنْدِیْ' سے اس کے ذہن کا یہ مخفی پہلو ظاہر ہوتا ہے کہ اس تمام دولت کا سرچشمہ خود میرے اندر ہے نہ کہ خدا کے اندر اس وجہ سے مجھے اس باب میں خدا یا کسی اور سے کوئی اندیشہ نہیں ہے مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگوں کا یہ سارا وعظ میرے آگے بالکل بے سود ہے، یہ وعظ کسی اور کو سنائیے!

اللہ تعالیٰ کی تنبیہ

'اَوَلَمْ یَعْلَمْ الآیۃ' یہ اس کے قول پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبصرہ ہے کہ اس بدقسمت نے یہ لاف زنی کرتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ اس سے پہلے کتنے گزر چکے ہیں جو قوت و جمعیت میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوئے لیکن خدا نے ان کو چشم زدن میں تباہ کر دیا! یہ امر ملحوظ رہے کہ اس سے کچھ ہی پہلے فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ پیش آچکا تھا جس کو اگر اس نے دیکھا نہیں تو سنا تو بہرحال ہوگا۔ یہاں 'اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً' میں اسباب و وسائل، خدم و حشم اور اسلحہ و آلات کی قوت مراد ہے اور 'اَكْثَرُ جَمْعًا' میں 'جمع' سے قبیلہ و خاندان کی جمعیت مراد ہے۔

'وَلَا يُسْــَٔـلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ' جب خدا اس قسم کے مجرموں کو پکڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر ان کو اتنی مہلت بھی نہیں دی جاتی کہ ان سے ان کے جرم کی بابت کچھ پوچھ لیا جائے اور اگر ان کے پاس کوئی جواب ہے تو وہ سن لیا جائے۔ بلکہ اس کا عذاب ان کو فوراً دبوچ لیتا ہے اور قیامت کے دن بھی خدا کو کسی سے اس کے جرائم کی بابت کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہر مجرم کی پیشانی اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے اعضاء و جوارح خود اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ (رحمٰن: ۴۱)

فَخَـرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (۷۹)

قارون کا جلوس اور عوام پر اس کا اثر

معلوم ہوتا ہے اس نے اسی دوران میں اپنے زور و اثر اور اپنی قوت و جمعیت کی نمائش کے لیے کوئی جلوس نکالا تاکہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کو مرعوب اور اپنی جمعیت میں اضافہ کرے۔ 'فِیْ زِیْنَتِہٖ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس موقع پر اس نے اپنی دولت و حشمت کا خاص طور پر مظاہرہ کیا اس لیے کہ عوام کالانعام کو سب سے زیادہ یہی چیز متاثر کرتی ہے۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کی حرکت ہے جس،

کے تماشے آئے دن آپ کے لیڈر حضرات آپ کے شہروں اور قصبوں میں دکھاتے رہتے ہیں۔ اس کا اثر، ان لوگوں پر جو اسی دنیا کی دولت کو سب کچھ سمجھتے ہیں، یہ پڑا کہ وہ اس کا نعرہ لگانے لگے کہ بے شک قارون بڑا ہی نصیبہ ور ہے!

وَقَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَیۡلَکُمۡ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّمَنۡ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوۡنَ (۸۰)

قوم کے اہل دانش کا رد؟

قوم میں جو لوگ علم و دانش رکھنے والے تھے انھوں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل چیز مال و دولت اور اس کی نمائش نہیں ہے بلکہ ایمان و عمل صالح اور اس کا اجر و ثواب ہے جس کے لیے انسان کو اپنی زندگی وقف کرنی چاہیے۔ لیکن یہ حکمت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، صرف انہی کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر دنیا کی رغبات و مطامع کے مقابل میں ایمان و عمل پر جمے رہنے کی ہمت و عزیمت ہوتی ہے۔

حقیقی علم خدا کی معرفت اور آخرت کا علم ہے

'اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ' میں 'علم' سے مراد علم حقیقی ہے یعنی خدا کی معرفت اور آخرت کا علم۔ یہی علم ہے جس سے انسان کو اصل روشنی حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ علم کسی کو حاصل نہ ہو تو وہ تاریکی میں ہے، اگرچہ وہ دوسرے علوم میں کتنا ہی شاطر ہو۔ قارون مالیات کے فن کا بہت بڑا ماہر تھا اور اوپر واضح ہو چکا ہے کہ اس کو اس فن میں مہارت کا دعویٰ بھی تھا لیکن علم حقیقی سے وہ محروم تھا اس وجہ سے اتنی دولت رکھنے کے باوجود اس کی حیثیت ایک مارِ گنج سے زیادہ نہ بن سکی۔ بالکل یہی حال دوسرے علوم کا بھی ہے۔ وہ بھی انسان کے لیے نافع اسی وقت بنتے ہیں جب اس کو علم حقیقی کا نور حاصل ہو۔ اگر اس نور سے وہ محروم ہو تو ان سے وہ چالاک، کاردان اور شاطر تو بن جاتا ہے لیکن انسان نہیں بنتا۔ اور بغیر انسان بنے چالاکی و ہوشیاری نہایت خطرناک چیز ہے۔ یہ نادان کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھیے کہ جہاں تک مجرد چالاکی و ہوشیاری کا تعلق ہے اس فن میں شیطان کسی سے پیچھے نہیں ہے بلکہ وہ تمام چالاکوں کا مرشد و امام ہے۔

حکمت صابروں کو حاصل ہوتی ہے

'وَلَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوۡنَ' میں ضمیر کا مرجع وہ حکمت و موعظت ہے جس کی ان اصحاب علم نے تلقین فرمائی۔ اس طرح ضمیر لانا عربی میں معروف ہے اور اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ علم حقیقی اور صبر دونوں بالکل توام ہیں اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اصل حکمت صرف انہی کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر صبر ہو۔ یعنی جو آخرت کی طلب میں اس دنیا کی بڑی سے بڑی دولت و شوکت کو قربان کرنے کی اپنے اندر ہمت رکھتے ہوں۔ جن کے اندر یہ حوصلہ اور ظرف نہ ہو وہ اس حکمت کے حامل نہیں بن سکتے۔

اس ٹکڑے کے متعلق ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ انہی اصحاب علم کے قول کا جزو ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین ان کی تحسین ہے۔ اس بارے میں ابھی جزم کے ساتھ کوئی بات

میں نہیں کہہ سکتا لیکن اس طرف ذہن جاتا ضرور ہے اور قرآن میں اس کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ اس صورت میں اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ حکمت ان لوگوں کو اس وجہ سے عطا ہوئی کہ یہ صابرین میں سے تھے۔ قارون کی دولت و حشمت اور اس کے طمطراق سے مرعوب ہو کر پھسل جانے والے لوگ نہیں تھے۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِينَ (۸۱)

قارون پر حضرت موسیٰ کی لعنت اور اس کا عبرتناک انجام

یہاں قارون کے اس قصہ کا ایک حصہ محذوف ہے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ سامری کے فتنہ کے بعد ان کی قوم میں ایک اور فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے تو انھوں نے قارون اور اس کے ساتھیوں کو خیمۂ اجتماع کے سامنے مباہلہ کی دعوت دی تاکہ واضح ہو جائے کہ خدا کی نظروں میں مقبول اور پسندیدہ کون ہے۔ تورات میں اس کی تفصیل طویل ہے۔ ہم صرف اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔

اور داتن اور ابیرام اپنی بیویوں، بیٹوں اور بال بچوں سمیت نکل کر اپنے خیموں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے۔ تب موسیٰ نے کہا، اس سے تم جان لو گے کہ خداوند نے مجھے بھیجا ہے کہ میں یہ سب کام کروں کیونکہ میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔ اگر یہ آدمی (اشارہ قارون اور اس کے جتھہ کی طرف ہے) ویسی ہی موت مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا ان پر ویسے ہی حادثے گزریں جو سب پر گزرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں۔ پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو ان کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ اس نے یہ باتیں ختم ہی کی تھیں کہ زمین ان کے پاؤں تلے پھٹ گئی اور زمین نے اپنا منہ کھول دیا اور ان کو اور ان کے گھر بار کو اور قورح کے ہاں کے سب آدمیوں کو اور ان کے سارے مال و اسباب کو نگل گئی۔ سو وہ اور ان کا سارا گھر بار پاتال میں سما گئے اور زمین ان کے اوپر برابر ہو گئی اور وہ جماعت میں سے نابود ہو گئے اور سب اسرائیلی جو ان کے آس پاس تھے ان کا چلانا سن کر یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ کہیں زمین ہم کو بھی نہ نگل لے۔ (گنتی باب ۱۶ : ۲۸ - ۳۴)

اس سے معلوم ہوا کہ قارون اور اس کے ساتھیوں کے زمین میں دھنسائے جانے کا واقعہ حضرت موسیٰ کی لعنت اور بد دعا کے نتیجے میں ظہور میں آیا۔ اور اس طرح پیش آیا کہ نہ قارون اپنی مدافعت میں کچھ کر سکا اور نہ اس کا وہ جتھہ اس کے کچھ کام آ سکا جس کے بل پر اس نے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرنا چاہا تھا۔

وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيْكَأَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَا أَنْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۖ وَيْكَأَنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (۸۲)

عوام کی زود پشیمانی

خام ذہن کے لوگ کسی کو اقتدار یا دولت مند دیکھتے ہیں تو اس پر رشک سے مرنے لگتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ اقتدار اور اس کی یہ دولت لازوال ہے۔ ان کو لاکھ سمجھائیے کہ یہ چیزیں عارضی و فانی ہیں لیکن یہ بات کسی طرح ان کے دل میں نہیں اترتی البتہ جب وہ چاروں شانے چت گرتا ہے تب ان کو ناصحوں کی باتیں یاد آتی ہیں اور وہ بھی پکار اٹھتے ہیں کہ ہاں بھائی! ٹھیک کہا تھا جس نے کہا تھا کہ اللہ ہی کے اختیار میں سب کا رزق و فضل ہے، وہی جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ یہی حال قارون کے طمطراق پر فریفتہ ہونے والوں کا بھی ہوا۔ انھوں نے بھی جب اس کا انجام دیکھا تو بول اٹھے کہ یہ اللہ کا بڑا احسان ہوا کہ ہم اس کے ساتھی نہ بنے ورنہ ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا ہوا۔ ان لوگوں کی بات سچی نکلی جو کہتے تھے کہ کافروں کو فلاح حاصل نہیں ہوتی!

'امس' کا محلِ استعمال

لفظ 'امس'، فصیح عربی میں صرف گزرے ہوئے کل کے لیے نہیں آتا بلکہ ماضی قریب کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں 'یہ تو کل کی بات ہے' یہاں بھی یہ اسی مفہوم میں ہے یعنی ابھی کل تک جو لوگ قارون کی شان و شوکت پر مرتے تھے وہ یہ کہنے لگے۔

'وی' کا محلِ استعمال

'وَيْكَأَنَّ' میں 'وَيْ' تنبیہ کا کلمہ ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں ارے کہتے ہیں اسی طرح عربی میں 'وَيْ' ہے۔ اس کے ساتھ جب 'كَأَنَّ' یا 'كَأَنَّهٗ' مل جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ 'ارے! یہ تو گویا کہ وہی بات ہوئی ......'

'يَبْسُطُ' کے بعد 'لِمَنْ يَّشَآءُ' تقابل کے معروف اصول کے مطابق حذف ہوگیا ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

قارون اور ابولہب میں مماثلت کے بعض پہلو

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قارون کی یہ حکایت محض ماضی کی ایک حکایت کی حیثیت سے نہیں بیان ہوئی ہے بلکہ اس کے پردے میں ابولہب اور اس کے ساتھیوں کا کردار اور انجام پیش کیا گیا ہے۔ جس قسم کا فتنہ حضرت موسیٰؑ کی قوم میں قارون تھا اسی قسم کا فتنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں ابولہب تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن دونوں کی مماثلت کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ اس قصہ کی اصلی حکمت واضح ہو سکے۔

(۱) جس طرح قارون حضرت موسیٰؑ کے خاص خاندان ـــ بنی لاوی ـــ کا سب سے بڑا دولت مند تھا اسی طرح ابولہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان ـــ بنی ہاشم ـــ میں سب سے بڑا دولت مند تھا۔ رشتہ کے اعتبار سے بھی دونوں میں بڑی مماثلت تھی۔ ابولہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا اور قارون، اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں، حضرت موسیٰؑ کا برادر عم زاد تھا۔

(۲) دونوں بڑے اونچے درجے کے سرمایہ دار تھے۔ قارون کی دولت مندی کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ ابولہب کی دولت کا ذکر ان شاء اللہ سورۂ ہمزہ اور سورۂ لہب کی تفسیر میں آئے گا۔ ابولہب خانہ کعبہ کا کلید بردار

اور رفادہ کے پورے خزانے پر تنہا قابض و متصرف تھا۔ اس طرح اس نے حرام و حلال کے تمام راستوں سے بے شمار دولت اکٹھی کرلی تھی۔

(۳) دونوں نہایت بخیل، متکبر اور قسی القلب تھے۔

(۴) اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ دونوں کے عناد کی نوعیت بھی ایک ہی تھی۔ قارون یہ چاہتا تھا کہ خاندان کی مذہبی پیشوائی اسے حاصل رہے تاکہ اس کی سرمایہ داری پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ابولہب بھی یہی چاہتا تھا کہ خانہ کعبہ کی کلید برداری اور رفادہ کی دولت پر اس کا قبضہ رہے، اس سے اسے کوئی محروم نہ کرنے پائے۔

(۵) انجام کے اعتبار سے بھی دونوں میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں خدا کے قہر و غضب کے ہدف ہوئے۔ قارون کا انجام اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ابولہب کا انجام ان شاء اللہ، سورۂ لہب کی تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوگا۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہاں قارون کے پردے میں درحقیقت ابولہب اور ابولہب پرستوں کا ذکر ہوا ہے۔ جب تک قرآن میں بیان کردہ واقعات کا یہ پہلو سامنے نہ ہو اس وقت تک ان کی اصلی حکمت واضح نہیں ہوتی۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۸۳)

اوپر کی موعظت کا خلاصہ

یہ اوپر کی بیان کردہ موعظت کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ دارِ آخرت جس کا ذکر ہوا، ہم نے ان لوگوں کے لیے خاص کر رکھا ہے جو خدا کی زمین میں استکبار اور فساد کے طالب نہیں بنیں گے بلکہ اس کے بندے بن کر زندگی بسر کریں گے اور اس کے اندر اس نظامِ حق و عدل کے حامی و علم بردار ہوں گے جس کو خدا نے پسند فرمایا ہے۔ یہی لوگ متقی ہیں اور انجام کار فوز و فلاح ان متقیوں ہی کے لیے ہے۔ نَجْعَلُهَا یہاں خاص کرنے کے مفہوم میں ہے اور یہ بات فحوائے کلام سے واضح ہے کہ اصل متقی وہی لوگ ہیں جن کے سینے استکبار سے اور جن کے اعمال فساد سے پاک ہوں۔

مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۸۴)

نیکوں کے ساتھ فضل اور بدوں کے ساتھ عدل کا معاملہ

یہ وہ اصول بیان فرما دیا جس کے مطابق آخرت میں نیکوں اور بدوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ معاملہ کرے گا۔ فرمایا کہ جو نیکی کی کمائی کر کے آئیں گے ان کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے مطابق معاملہ کرے گا، ان کو ان کی نیکیوں سے کہیں بہتر صلہ دے گا۔ اور جو بدی کی کمائی کر کے آئیں گے ان کے ساتھ اپنے عدل کے مطابق معاملہ کرے گا۔ جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا اس کا ثمرہ ان کے آگے رکھ دیا جائے گا کہ یہ تمھاری اپنی ہی لوئی ہوئی فصل کا حاصل ہے، اب اس کا مزا چکھو!

۸- آگے کا مضمون ــــ آیات ۸۵-۸۸

خاتمۂ سورہ آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اس قرآن کو تم نے خدا سے مانگ کر تو اپنے اوپر اتروایا نہیں ہے کہ اس کی فکر میں گھلے جا رہے ہو۔ جس خدا نے تم پر اس کو اتارا ہے وہی اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ کرنے میں تمہارا مددگار رہے گا۔ وہ تم کو بہر حال کامیابی کی منزل تک پہنچائے گا۔ تو تم ان مخالفین کی ذرا پروا نہ کرو۔ اپنی دعوت پر جمے رہو۔ یہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے موقف میں ذرا بھی تبدیلی یا نرمی نہ آنے دو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے ــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸۵-۸۸

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ
مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨٥﴾ وَمَا كُنتَ تَرْجُو
أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ
ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ ﴿٨٦﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ
إِلَيْكَ ۖ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٨٧﴾ وَلَا تَدْعُ
وقف لازم مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ
ع ۹ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٨﴾

ترجمۂ آیات ۸۵-۸۸

بے شک جس نے تم پر قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ تمہیں ایک اچھے انجام تک پہنچا کے رہے گا۔ کہہ دو کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہے اور کون ہے جو کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ ۸۶

اور تم تو متوقع نہ تھے کہ تم پر کتاب اتاری جائے، یہ تو بس تمہارے رب کا فضل ہوا ہے اور تم ان کافروں کے پشت پناہ نہ بنو۔ اور یہ تم کو اللہ کی آیات سے روکنے نہ پائیں جب کہ وہ تمہاری طرف اتاری جا چکی ہیں اور تم اپنے رب کی دعوت دو اور مشرکوں میں سے

نہ بنو اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ اسی کے اختیار میں ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۸۶ - ۸۸

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۸۵)

آنحضرت کو شاندار کامیابی کی بشارت

'معاد' کے معنی مرجع، نہایت اور انجام کار کے ہیں۔ اس کی تنکیر یہاں تفخیم شان پر دلیل ہے اس وجہ سے یہ 'مَعَادٍ حسن' کے مفہوم میں ہوگا یعنی شاندار انجام اور اعلیٰ مرجع۔

اوپر کے مباحث کے بعد بطور خلاصہ بحث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ تم ان مخالفوں کی مخالفت کی ذرا پروا نہ کرو۔ جس نے تمھارے اوپر اس قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ اس کے فرائض کی ادائیگی کی راہ میں ہر قدم پر تمھاری مدد فرمائے گا اور دنیا و آخرت دونوں میں تمھیں شاندار انجام سے ہم کنار کرے گا۔ 'لَرَادُّكَ' کے اندر ایک فیصلۂ حتمی و قطعی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ بات علی رغم اعداء ہو کے رہے گی۔ جس طرح خدا نے اپنے تمام رسولوں کو فائز المرام کیا اسی طرح تمھیں بھی فائز المرام کرے گا۔ رسولوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ بالکل اٹل ہے۔

'قُل رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ' یعنی اب اپنے ان مخالفین سے بحث بند کر دو اور ان سے یہ آخری بات کہہ دو کہ خدا خوب جانتا ہے کہ کون اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک افہام و تفہیم کا تعلق ہے تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہی پر۔ 'الْهُدَىٰ' سے مراد ہدایت الٰہی ہے۔ اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ خدا کی ہدایت کے بعد اگر کوئی شخص گمراہی میں پڑا رہے تو وہ ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ جس طرح کوئی شخص پورے دن کی روشنی میں بھٹکتا پھرے۔

[illegible]

وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ (۸۶)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ تم نے یہ کتاب اپنے اوپر خدا سے مانگ کر تو اتروائی

نہیں ہے کہ اس کی ساری ذمہ داری خدا تم پر ڈال کر اس سے بے تعلق ہو جائے۔ یہ تو تمھارے رب کی رحمت ہے جو اس نے تم پر تمھاری طلب و تمنا کے بغیر، نازل فرمائی ہے تو جس کام کے لیے اس نے تمھیں خود منتخب فرمایا ہے وہی اس کے حقوق و فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر گام پر تمھاری رہنمائی بھی فرمائے گا اور چونکہ یہ رحمت ہے، کوئی زحمت نہیں ہے اس وجہ سے بہرحال اس کا انجام تمھارے حق میں بھی اور ان لوگوں کے حق میں بھی جو اس کو قبول کریں گے، رحمت ہی کا باعث ہو گا۔ اگر ناشکرے لوگ اس کی ناقدری کر رہے ہیں تو وہ اپنے ہی کو خدا کی رحمت سے محروم کر رہے ہیں۔

قریش کو بالواسطہ تنبیہ — فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ۔ یہ خطاب اگرچہ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو تنبیہ و عتاب مضمر ہے اس کا رخ مکذبینِ قرآن کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز تمھیں خدا کی طرف سے ملی ہے اس کو بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر وہ تمھیں کچھ دبانا اور نرم کرنا چاہتے ہیں تو تم اس میں کسی تبدیلی یا مداہنت کے مجاز نہیں ہو۔ تم خدا کے آگے مسئول ہو، ان کے آگے مسئول نہیں ہو۔ اگر ان کی خاطر سے تم نے کوئی مداہنت کی تو تم مجرموں کے مددگار اور پشت پناہ بن جاؤ گے۔ یہ قریش کے لیڈروں کو سنا کر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو متنبہ کر دیا تاکہ اگر وہ اپنے دل کے کسی گوشے میں یہ امید دبائے بیٹھے ہوں کہ ان مخالفتوں سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نرم کر لیں گے تو اس سے آخری درجے میں مایوس ہو جائیں۔

نبوت ایک موہبتِ ربانی ہے — اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ نبوت و رسالت ایک موہبتِ ربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے اس کارِ خاص کے لیے منتخب فرماتا ہے اور وہی، جس کو منتخب فرماتا ہے اس کی تربیت فرماتا ہے۔ نبی کو یہ منصب بغیر کسی طلب و تمنا اور کسی انتظار و توقع کے ملتا ہے اور خدا ہی اس منصب کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اس کی مدد فرماتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ انسانی فطرت کی مضمر صلاحیتوں ہی کا ایک بروز ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے — انشاء اللہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث آخری گروپ کی سورتوں میں آئے گی۔

جو عہدہ بغیر طلب و تمنا کے کسی کو دیا جائے اس میں خدا اس کی مدد فرماتا ہے۔ — دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی پر اگر کسی منصب و عہدہ کی ذمہ داریاں اس کی طلب و تمنا کے بغیر عائد ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس میں اس کی مدد فرماتا ہے اور اگر وہ کسی عہدہ کا طالب بن کر اس کو حاصل کرتا ہے تو خدا اس کو اس کے عہدہ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس بات کی وضاحت احادیث میں بھی نہایت مؤثر انداز میں ہوئی ہے۔

قرآن کے معاملہ میں مداہنت کرنے والا مجرموں کا ساتھی ہے — تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کے معاملے میں ہمیں ہرگز کسی نرمی و مداہنت کو گوارا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم مجرموں کے ساتھی اور ان کے مددگار بن جائیں گے۔

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۸۷)

مشرکین کو جس چیز سے سب سے زیادہ چڑ تھی اس پر سب سے زیادہ زور

یہ اسی اوپر والے مضمون کی وضاحت مزید تاکید کے ساتھ ہے کہ خواہ یہ مخالفین کتنا ہی زور لگائیں لیکن یہ اللہ کی آیات سے تمھیں روکنے نہ پائیں۔ یہ جن باتوں سے چڑتے ہیں ان کو برملا کہو اور ڈنکے کی چوٹ کہو۔ خدا کی جو بات تم پر نازل ہو چکی ہے اب نہ وہ واپس ہو سکتی اور نہ دبائی جا سکتی۔ اب اس کے بلاغ کی ذمہ داری تم پر عائد ہو چکی۔ خدا کی بات کے ہوتے اس سے انحراف ہلاکت کی راہ پر چلنا ہے۔

'وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ' اپنے رب کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور مشرکین میں سے نہ بنو۔ یہ خطاب بھی اسی طرح کا ہے جس طرح کا خطاب اوپر کی آیت میں گزر چکا ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ قریش کے لیڈروں کو سب سے زیادہ چڑ دعوتِ توحید سے تھی اس وجہ سے سب سے زیادہ زور اسی پر دیا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ اگر تم ان لوگوں کی مخالفت سے مرعوب ہو کر توحید کی دعوت میں کوئی مداہنت کی روش اختیار کرو گے تو تم بھی مشرکین میں سے بن جاؤ گے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۣ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۸۸)

مداہنت کے ہر امکان کا سدباب

یہ آخر میں اسی بات کی مزید وضاحت فرما دی کہ مداہنت کے ہر امکان کا سدباب ہو جائے۔ فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، معبود صرف وہی ہے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ کا تمام اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اور قیامت کے دن سب کی واپسی اسی کی طرف ہونی ہے۔ کوئی اور مولیٰ و مرجع نہیں ہے۔

توفیق ایزدی آج بروز جمعۃ المبارک ۱۰ بجے دن اس سورہ کی تفسیر اختتام کو پہنچی۔ فالحمد للہ علی ذٰلک۔

رحمان آباد

۲۹ مارچ ۱۹۷۴ء

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ الانبیاء - ۲۱

تفسیر سورۃ النور ـ ۲۴

تفسیر سورۃ الفرقان-۲۵

تفسیر سورۃ الشعراء - ۲۶

تفسیر سورۃ النمل-۲۷

تفسیر سورۃ القصص ۲۸

خطاطی ——— عبدالغفور کیلانی